کال بیل
یما غزل

بار اوّل ــــــــــ ۱۹۹۹ء
مطبع ــــــــــ نوائے ڈی پرنٹرز، لاہور
کمپوزنگ ــــــــــ ہاشمی کمپوزنگ سنٹر، لاہور
قیمت ــــــــــ ۱۵۰/- روپے

ISBN 969-8429-68-9

اہتمام
علی بُک سٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال
لاہور فون: ۷۲۲۳۸۵۳

دیباچہ

یہ پوری کائنات اسرار سے بھری ہوئی ہے بلکہ کائنات کا وجود بذات خود اسرار ہے۔ قدم قدم پر ہونے والے واقعات' دنیا کے مختلف علاقوں میں بکھرے عجوبے' اور ایسی ہزاروں بلکہ لاکھوں چیزیں ہیں جن کی نہ کوئی توجیہہ نظر آتی ہے' نہ سجھائی دیتی ہے۔ میں تو خیر بہت کم علم ہوں' دنیا کے بڑے بڑے سائنس دان' ماہرین ارض و فلکیات آج بھی مختلف چیزوں اور واقعات پر ریسرچ کر رہے ہیں' برسوں سے وہ سر جھکائے تحقیقات میں غرق ہیں اور جانے کتنی صدیوں تک غرق رہیں گے' وہ بھی آج تک بعض چیزوں اور واقعات کے بارے میں وضاحت کرنے سے قاصر ہیں۔

کوئی چیز' شکل یا ہیئت ایسی نہیں جس کے بارے میں آدمی سوچ سکتا ہو اور اس کا کہیں اور کبھی وجود نہ پایا گیا ہو......... جو کچھ انسان کے تصورات میں آ سکتا ہے' وہ کبھی نہ کبھی' کہیں نہ کہیں' دیکھا محسوس کیا یا سمجھا گیا ہے......... گویا کسی بھی ایسی چیز کا تصور آدمی کر ہی نہیں سکتا جس کے بارے میں وہ قطعی کچھ نہ جانتا ہو......... اگر میں آپ سے کہوں کہ آپ کسی ایسی چیز کے بارے میں سوچیں جس کا کبھی وجود نہ رہا ہو تو آپ کا ذہن کورا رہے گا گویا آج ہمارے تصورات میں جو کچھ ہے اس کا وجود کبھی نہ کبھی ضرور رہا ہے......... خواہ وہ کسی بھی خطے میں' کسی بھی شکل میں اور کسی بھی نام کے ساتھ رہا ہو۔

دیوتاؤں نے روز اول سے ذہنوں پر حکمرانی کی ہے۔ وہ ہر قوم میں' ہر دور میں مختلف اشکال اور ناموں کے ساتھ ہمیشہ رہے ہیں اور شاید ہمیشہ رہیں گے......... ہم اپنے مذہب کی بنیاد پر ان چیزوں کو نہیں مانتے مگر وہ لوگ دنیا میں آج بھی موجود ہیں جو ان دیوتاؤں کو [illegible]ت کا منبع تسلیم کرتے ہیں۔ "کال بیل" ایک ایسی ہی دیوی کی سنائیوں کی داستان [illegible] مختلف اقوام میں صدیوں سے موجود ہے......... جس کی تفصیل آپ کو اس ناول میں [illegible] گی۔

یہ کیا اسرار ہے' یہ نہ میں جان سکی ہوں نہ شاید کوئی اور جان پائے......... مگر صرف اتنا کہوں گی کہ خدا نے اپنی کتاب' کلام پاک میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بار...

میں ارشاد فرمایا ہے کہ "ہم نے تمہیں تمام عالموں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔"
.... ہم تو آج تک بھی نہیں جان پائے کہ اس عالم کے سوا دوسرا عالم کون سا ہے......... پراسراریت' انسان کی کمزوری رہی ہے......... شاید اس لیے کہ وہ خود ایک ایسا اسرار ہے جس کے بارے میں وہ جان ہی نہیں پایا ہے......... شاید کبھی جان بھی نہ پائے......... اربوں سال گزرنے کے باوجود آج تک انسان پر تحقیقات ہو رہی ہیں اور ہر دور میں ایک نہ ایک نئی چیز کی دریافت یہ ثابت کرتی ہے کہ انسان' ابھی انسان پر دسترس حاصل نہیں کر سکا......... میں اس بارے میں زیادہ نہیں کہوں گی سوائے اس کے کہ اسے صرف ذہنی اختراعات سمجھئے گا بہ سوا ارائی ادنشل کے علاوہ دنیا کے آنجہ بجو ایسے موجود ہیں جو آپ کی سوچ کو لمحہ بھر کے لئے بے حس و حرکت کر دیتے ہیں۔ قارئین کی شکر گزار ہوں کہ انھوں نے ہمیشہ میری تحریروں کو پذیرائی بخشی ہے جو مجھ میں ہمیشہ لکھتے رہنے کی تحریک پیدا کرتی ہے۔

اپنے پبلشرز کی ممنون ہوں کہ وہ مجھے "رائٹر" بنانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں اور تھکتے نہیں' اللہ انہیں اور قارئین کو حوصلہ دے اور مجھے انکساری کی توفیق.........
اگر کچھ غلط لگے تو مجھے معاف کر دیجئے گا کہ کم علم ہوں نہ کچھ جانتی ہوں' نہ اتنا پڑھ پائی ہوں جتنا کچھ جاننے کے لیے پڑھنا ضروری ہے۔ خواہش ہے کہ سب کچھ جان لوں......... دعا کیجئے گا کہ آرزو پوری ہو اور میں آپ کے لیے بہتر سے بہتر لکھ سکوں۔

ناچیز

سیما غزل

کال بیل

"کال بیل نہیں بجانا۔"
حسنین بھائی کی آواز سن کر جیسے میرا دل حلق میں آ کر دھڑکنے لگا۔ میں نے بجلی کی سی سرعت سے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ متوحش نظروں سے انہیں دیکھا۔ ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ آنکھیں مارے خوف کے سرخ ہو چکی تھیں۔ میں ان کی یہ حالت دیکھ کر سراسیمہ ہو گئی۔ "کیا بات ہے حسنین بھائی!"
"تم ایک بے وقوفی کرنے جا رہی تھیں۔"
"نہیں.... میں تو شاخ ہٹا کر نام پڑھنا چاہتی تھی۔"
"اوہ....! ٹھیک ہے۔ لیکن یاد رکھو۔ کبھی کال بیل نہیں بجانا.........۔"

☆===============☆===============☆

شاہ بابا کے متعلق مجھے حسنین بھائی نے بتایا تھا۔ ان سے ملوانے کا وعدہ بھی کیا پھر کہا کہ اس کے لئے شاہ بابا سے اجازت لینا ہوگی۔ کئی روز بعد آئے' بڑی گہری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ بولے۔ "وہ تیار ہیں مگر......... کیا تم سمجھتی ہو کہ ان کے قریب رہ کر ان کی تمام داستان سن لو گی؟"
"ہاں' ظاہر ہے۔ اس کے سوا چارہ کیا ہے؟" میں نے سرسری سا جواب دیا۔
"نہیں سیما! میرا خیال ہے کہ میں ٹیپ کر کے لا دوں تو......!؟"
"نہیں۔" میں نے بات کاٹ دی۔ "اس طرح میں شخصیت اور واقعات کے ذکر میں تاثر پیدا نہیں کر سکتی۔ دیکھ لینا' سن لینے سے بہتر ہوتا ہے۔"
انہوں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "میری اور بات ہے مگر میرا خیال ہے کہ تم جتنی نڈر اور بہادر بنتی ہو' اتنی ہو نہیں۔"
"کیا مطلب ہے؟" میں چونک اٹھی۔
"تم پہلے ان سے مل لو پھر بات کریں گے۔"

☆======☆======☆

اور اسی روز وہ شام سات بجے آنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔ میں حیرت میں غرق رہ گئی تھی۔ شاہ بابا کے متعلق ان کے کہے ہوئے وہ تمام جملے مجھے یاد آتے رہے جو انہوں نے مختلف اوقات میں کہے تھے مثلاً "وہ بہت خوبصورت آدمی ہیں' دیکھنے والا سحرزدہ رہ جاتا ہے۔"

"میں نے اتنا نیک آدمی اب سے پہلے نہیں دیکھا!"

"علم کا سمندر ہیں اور علم کا یہ سفر انہوں نے کن عذابوں میں کاٹا' یہ سننے والی داستان ہے۔"

"ان کی پوری زندگی پُراسراریت کے ہیبت ناک واقعات سے بھری پڑی ہے۔"

"تم ان کے بارے میں کچھ جان گئیں تو دہشت زدہ ہو جاؤ گی۔"

"لیکن ان سے مل کر تم خود کو بڑا پُرسکون محسوس کرو گی۔ بہت متاثر ہو جاؤ گی۔"

"میں تمہیں ضرور ملواؤں گا اگر وہ کہانی سنانے پر راضی ہو گئے تو سمجھو تم نے تیر مار لیا۔"

"ان کی زندگی کا بڑا حصہ خوفناک گناہوں کی دلدل میں گزرا ہے مگر وہ بے قصور ہیں۔"

یہ سب متضاد جملے اس بار مجھے شدت سے یاد آ رہے ہیں۔ میں نے سوچا تو میں قطعی فیصلہ نہیں کر سکی کہ حسنین بھائی کیا کہنا چاہتے ہیں۔ میرا کسی کام میں جی نہیں لگ رہا تھا۔ رہ رہ کر ان کی خیالی شخصیت نگاہوں میں گھوم رہی تھی۔ آخر میں جھنجھلا گئی۔ جو کچھ تھا' وہ شام کو سامنے آ جانا تھا۔

شام کو حسنین بھائی وعدے کے مطابق آ گئے۔ میں تیار تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ میری ٹانگوں میں ہلکی سی کپکپاہٹ ہے جو میرے برداشت کرنے کی شعوری کوشش سے لرزش میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہ میرا خیال ہے کہ میں اعصابی طور پر بڑی مضبوط ہوں مگر اس وقت میری کیفیت نے میری پول کھول دی تھی اور میں اپنے بارے میں جان کر سخت مایوسی کا شکار تھی۔ ہم گاڑی میں آ بیٹھے۔ حسنین بھائی نے گاڑی اسٹارٹ کرنے سے پہلے اچانک میری طرف دیکھا۔ مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔ ان کی آنکھوں میں خوف کی لہریں دوڑتی نظر آئیں۔ بلکہ ان میں تذبذب بھی تھا اور اشتباہ بھی۔

"جی!" میں جانتی تھی کہ یہ سوال میرے چہرے پر چسپاں ہے مگر پھر بھی بول اٹھی۔

"میرا خیال ہے کہ......... چھوڑو........."

"کیوں؟"

"شاہ بابا جس آسانی سے تم سے ملنے کو تیار ہو گئے ہیں' اس نے مجھے خوف زدہ کر دیا ہے۔ وہ تو اکثر بیشتر اس گفتگو سے اجتناب کیا کرتے تھے مگر جب میں نے بتایا تو......... ان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ میں تو یہی سمجھا تھا کہ اب وہ ہنس کر ٹال دیں گے مگر........." انہوں نے دونوں ہاتھوں کو بالوں پر پھیرا۔ یہ ان کے بے پناہ اضطراب کا ثبوت تھا۔

"چھوڑیں حسنین بھائی! آپ بس مجھے ان سے ملا دیں۔ باقی کام میں خود کر لوں گی۔"

وہ کچھ دیر مجھے دیکھتے رہے پھر انہوں نے گاڑی جھٹکے سے اسٹارٹ کی۔ ہم تقریباً آدھے گھنٹے بعد گرومندر کے ان گھروں کے درمیان پہنچ گئے جو برسوں پرانے ہیں اور ہندوؤں کے بنوائے ہوئے ہیں۔

(میں اس گھر کے بارے میں آپ کو ضرور بتاتی مگر مجھے شاہ بابا نے منع کر دیا ہے۔)

گاڑی سیاہ گیٹ کے پاس رکی تو اس کی ویرانی باہر ہی سے عیاں تھی۔ یہ ایک اجاڑ عمارت تھی جہاں باہر سے تو زندگی کے آثار محسوس ہی نہیں ہوتے تھے۔ پہلے تو میں یہی سمجھی کہ ہم غلط جگہ رک گئے ہیں اور ابھی حسنین بھائی کو اپنی غلطی کا احساس ہو گا مگر جب انہوں نے گاڑی سے اترتے ہوئے مجھے بھی نیچے آنے کو کہا تو میں نے باہر سے عمارت پر ایک بھرپور نگاہ ڈالی۔

باہر دائیں جانب گیٹ کے برابر میں سیمنٹ سے ابھار کر مکان کا نمبر اور رہنے والے کا نام لکھا گیا تھا۔ اس پر بے پناہ مٹی جمی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ اندرا گی ایک بیل کی گھنی ٹہنی بھی اس پر جھکی ہوئی تھی جس کے خشک پتوں نے نام کو تقریباً چھپا دیا تھا۔ میں نے بیل کو ہٹانے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو حسنین بھائی کی آواز سن کر اچھل پڑی۔ وہ تقریباً چیخ اٹھے تھے۔

☆======☆======☆

"پھر انہیں کیسے پتا چلے گا کہ ہم آئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ گیٹ سے اندرونی عمارت کافی فاصلے پر ہے۔" میں نے اچک کر گیٹ کے اوپر سے جھانکا۔ ایک دم میرا دل گھبرانے لگا اندر اس قدر ویرانی اور اندھیرا تھا کہ میں عجیب سا خوف محسوس کرنے لگی۔ اسی اثنا میں حسنین بھائی نے گیٹ پر لگا لوہے کا گول کنڈا بجا دیا۔ مجھے قطعی امید نہیں تھی کہ اندر کوئی ذی روح بھی ہوگا اور اس آواز پر گیٹ کھول دے گا مگر صرف چند لمحوں بعد ہی خشک پتوں پر کسی کے چلنے کی آواز آنے لگی۔ چرمراتے پتے گویا چیخ رہے تھے۔ آنے والا بھاری قدم اٹھاتا ہوا گیٹ کے قریب آیا تو آنے والے کو دیکھ کر میں حیران رہ گئی۔ وہ اس قدر لمبا تھا کہ گیٹ اس کے سینے تک ہی آ رہا تھا۔ باہر اور اندر لگے درختوں کا سایہ اس کے وجود کو سائے میں تبدیل کر رہا تھا۔ اندر باہر کوئی بلب روشن نہیں تھا جہاں سے چند کرنیں بھی اس تک پہنچ پاتیں۔ مجھے پہلی بار خیال آیا کہ یہ وقت بہت مناسب ہے۔

"اوہ! تم ہو!" اس کی آواز بھاری سحرزدہ کر دینے والی تھی۔ پھر کنڈی کے کھلنے کی آواز دیر تک گونجتی رہی۔ پتا نہیں کتنی لمبی کنڈی تھی جو کھل کے ہی نہیں دے رہی تھی۔

میں نے حسنین بھائی کی طرف دیکھا۔ وہ رومال سے پسینا پونچھ رہے تھے۔ دروازہ کھل گیا تو حسنین بھائی نے پہلے مجھے اندر چلنے کا اشارہ کیا۔ جس لمبے تڑنگے شخص نے ہمارے لئے دروازہ کھولا تھا وہ پلٹ کر ہماری طرف دیکھے بغیر عمارت کے اندرونی حصے کی جانب بڑھ رہا تھا۔ خشک پتوں پر میں بھی چل رہی تھی' حسنین بھائی بھی چل رہے تھے مگر جانے کیا بات تھی کہ جو پتے اس کے پیروں تلے روندے جا رہے تھے' ان کی چرچراہٹ میں بلا کا کرب تھا اور بڑھنے والے ہر قدم کی دھمک سفاک سی لگ رہی تھی۔ کہیں دور سے آنے والی ملگجی سی روشنی اب اس کے ہیولے کو واضح کر رہی تھی۔ وہ چوڑے شانوں اور مضبوط ہاتھ پیروں والا تقریباً سات فٹ کا آدمی تھا۔ میں نہیں جانتی تھی کہ وہ کون ہے؟ وہ ہم سے اتنی دور بھی نہیں تھا کہ میں حسنین بھائی سے پوچھتی کہ یہ کون ہے۔

ہم آگے پیچھے چلتے ہوئے اندر بنی عمارت کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میں نے چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ عمارت خالی احاطے کے بیچوں بیچ بنی ہوئی تھی۔ چاروں طرف لگے اونچے اونچے برگد کے درختوں کے علاوہ کہیں کہیں خودرو جھاڑیاں بھی تھیں۔ ابھی آسمانوں کے اندھیرے بہت گہرے نہیں ہوئے تھے مگر یہاں مکمل تاریکی پھیلی ہوئی تھی

جس کی سو فیصد وجہ یہ درخت تھے۔ انہی درختوں کی وجہ سے یہاں خنکی بھی زیادہ تھی۔ ہم تقریباً پچاس ساٹھ قدم کے فاصلے پر بنی عمارت کی سیڑھیوں تک پہنچ گئے۔ یہاں آٹھ دس سیڑھیاں چڑھنے کے بعد ہم برآمدے میں پہنچ گئے جس کے فرش پر سیاہ اور سفید رنگ کے ٹائلز لگے تھے۔ بالکل سامنے دو پٹ والا' پرانے اسٹائل کا لکڑی کا دروازہ تھا۔ اس کے دائیں بائیں کھڑکیاں تھیں۔ جتنی گندگی ان سیڑھیوں سے نیچے تھی' اتنی ہی صفائی ان سیڑھیوں کے بعد تھی۔ سفید وارنش کئے ہوئے دروازے کے پٹ چمک رہے تھے۔ واضح کر دوں کہ اونچائی پر سڑک کے باہر لگا بلب اپنی روشنی یہاں تک پھیلا رہا تھا۔ اس کے علاوہ کھڑکیوں کے اندر سے چھن کر آنے والی روشنی بھی یہاں کی تاریکی کو چیرنے میں معاون تھی۔ کھڑکی کے چوکھٹوں کے درمیان لگے کھردرے' شیشے بہت صاف اور چمک دار تھے۔ اوپر کی طرف روشندان تھے مگر ان شیشوں کا رنگ گہرا نیلا تھا۔

☆==================☆==================☆

اس روشنی میں آتے ہی میں نے ایک جانب سے آگے جانے والے کے چہرے کی طرف دیکھنا چاہا مگر پھر بھی اس کے نقوش واضح طور پر نہ دیکھ سکی۔ میرا یہ اضطراب بے وجہ تھا۔ ابھی کچھ ہی دیر میں ہمیں اندر داخل ہونا تھا اور اندر سے باہر آنے والی روشنی کی کرنیں اس بات کا ثبوت تھیں کہ اندر کافی روشنی ہے اور میں اسے بہت جلد خوب اچھی طرح دیکھ سکوں گی۔

وہ دروازے پر رک گیا۔ اس نے بڑے مدھم سے انداز میں دروازے پر جیسے ایک مخصوص سی تال میں دستک دی۔ چند لمحے انتظار کے بعد پھر ایک بار اس نے دائیں ہاتھ کی ایک انگلی سے دستک دی۔ دستک کی آواز اندر گونجتی ہوئی سی محسوس ہوئی۔ اس نے پھر توقف کیا۔ میں الجھنے لگی تھی۔ مجھے غصہ آ رہا تھا کہ جب وہ شخص اس عمارت سے نکل کر دروازہ کھولنے گیٹ تک آیا تھا تو پھر کسی کو کیا ضرورت تھی کہ اندر سے دروازہ بند کرتا۔ اس کی واپسی کا انتظار تو کرنا چاہیئے تھا اس کے علاوہ حسنین بھائی مقرر کردہ ٹائم پر آئے تھے جس کا واضح مطلب یہ تھا کہ مکینوں کو ہمارے آنے کا علم بھی ہے۔

جھنجلاہٹ میں وقت ربر کی طرح کھنچتا محسوس ہوتا ہے۔ میں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ حسنین بھائی ساکت و جامد' بے حس و حرکت کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھ میں رومال تھا اور وہ ہر تھوڑی دیر کے بعد رومال کو چہرے پر زور زور سے رگڑ رہے تھے۔

مجھے سب سے زیادہ حیرت حسنین بھائی کے رویے پر تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ بن بلائے کسی ایسی جگہ پر آ گئے ہوں جو ان کے خواب و خیال سے بھی ماورا ہو حالانکہ ملاقات کی یہ ساری کارروائی کئی روز پہلے سے شروع ہو چکی تھی۔ وہ شاہ بابا اور میرے درمیان رابطہ بنے ہوئے تھے پھر انہوں نے ہی آکر بتایا تھا کہ شاہ بابا نے آنے والی جمعرات کو شام سات بجے ملاقات کا وقت دیا ہے۔

میں ابھی یہ سوچ ہی رہی تھی کہ اندر آہٹ محسوس ہوئی پھر اچانک معدوم ہو گئی اور پھر دوبارہ وہی گہرا سناٹا چھا گیا جبکہ میں آوازوں کی منتظر تھی۔ کنڈی کھولنے کی آواز' استقبالیہ جملوں کی آواز' دروازہ کھولنے اور بند کرنے کی آواز مگر گہرے سناٹے میرے اندر اتر رہے تھے۔ میری تمام حسیں بیدار تھیں۔ سماعت دروازے سے چپکی ہوئی تھی۔ مگر اس وقت میں حیران ہو گئی جب سماعت کی ساکت جھیل میں کسی آواز نے ارتعاش پیدا ہوئے بغیر دروازہ بے آواز کھلتا چلا گیا۔

"تھینک یو زیوسا!!"

ہمارے آگے موجود شخص نے کہا اور اندر داخل ہو گیا۔ اس کے پیچھے میں اور میرے پیچھے حسنین بھائی تھے۔ میں پھر ٹھٹک رہ گئی۔ یعنی اندر مجھے دروازہ کھولنے والا کوئی شخص نظر نہیں آیا۔ کمرا خالی تھا مگر وہ شخص اب بھی ایک جانب دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ اب میں نے اس شخص پر نگاہ ڈالی۔ یقین کیجیے مجھے یوں لگا تھا جیسے اس کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی مجھ میں کرنٹ دوڑ گیا ہو۔ یہ کرنٹ دوڑنے والا محاورہ نہیں ہے۔ میں نے یقینی طور پر ہلکا سا جھٹکا محسوس کیا تھا۔ میرا بدن لمحہ بھر کو سن ہو گیا تھا۔ نہ معلوم اس شخص کے وجود میں ایسی کیا بات تھی جس نے میرے اندر ایک طوفانی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ میرا بدن ساکت تھا۔ صرف میری نگاہیں تھیں جو اس کے سراپے سے چپک کر رہ گئی تھیں۔ قارئین! میں نے اتنا پرکشش' اتنا حسین اور اتنا پُروقار کسی کو نہیں پایا۔

کس قدر مردانہ وجاہت تھی! کیسا عجیب سا طمطراق تھا۔ اس کی آنکھوں میں بے خود کر دینے والا سحر تھا۔ میں پہلے ہی بتا چکی ہوں کہ میرا خیال ہے کہ میں بڑے مضبوط اعصاب کی مالک ہوں۔ یہ دوسرا واقعہ تھا جو مجھے خود آگہی دے گیا۔ مجھ میں نہ نگاہ جھکانے کی ہمت تھی' نہ پلک جھپکنے کی سکت۔

"زیوسا!!"

اچانک اس کی آواز نے مجھے جیسے کسی ذہنی حصار سے باہر کھینچ لیا۔ "میرے مہمان آئے ہیں۔ حسنین کو تو تم جانتی ہو۔ یہ سیماغزل ہیں۔ اگر تم اجازت دو تو......"

انہوں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا پھر ان کی نگاہیں سفر کرتی ہوئی اندر کے دروازے تک چلی گئیں۔ ان کے چہرے پر تشکرانہ مسکراہٹ تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ جس ہستی یا غیر مرئی مخلوق سے مخاطب تھے' کمرے سے باہر چلی گئی ہو۔

"تھینک یو زیوسا!!" انہوں نے اس بار پکار کر کہا پھر گہرا سانس لیا۔ ہماری طرف مڑے' اب ان کے چہرے پر استقبالیہ مسکراہٹ تھی۔ "آپ بیٹھیں ناں!" انہوں نے وکٹورین طرز کے صوفوں کی طرف اشارہ کیا۔

اب میں نے کمرے پر نگاہ ڈالی۔ جب وہ بولے تو مجھے یوں لگا جیسے میں ان کے طلسمی حصار سے باہر آ گئی ہوں یا میں نے اپنی اعصابی کمزوری پر قابو پا لیا۔ یہ کمرا کافی بڑا تھا۔ اندر کی طرف جو رنگ دیواروں پر تھا' وہ سنہرا تھا۔ جس کی وجہ سے جگہ جگہ لگے بلب کی روشنی میں دیواروں سے بھی شعاعیں سی پھوٹتی محسوس ہو رہی تھیں۔ ان سنہری دیواروں پر سیاہ رنگ کے بڑے بڑے فریم تھے اور ان فریموں میں کچھ عجیب و غریب قسم کی تصویریں تھیں۔ دیوار کے ساتھ ساتھ تین طرف سیاہ رنگ کے کپڑے کے صوفے تھے۔ فرش پر ہلکا براؤن قالین تھا جس پر جگہ جگہ سیاہ مکڑی کا ساڈیزائن بنا ہوا تھا۔ قالین بے پناہ موٹا' نرم و گداز اور چمکدار تھا۔

دیواروں پر بنی کارنس پر سیاہ لیمپ رکھے تھے جن کے شیڈز سنہرے تھے۔ مختلف کونوں میں رکھی لکڑی کی چوکور میزوں پر سیاہ شیشے کی بڑی بڑی بوتلیں تھیں جن میں زیادہ تر سنہرے پھول تھے جو سبز پتوں کے ساتھ بڑے حسین اور پرکشش لگ رہے تھے۔ دروازوں اور کھڑکیوں میں سیاہ پردے تھے جن پر سنہرے' چمک دار دھاگے سے مکڑی کے جالے کا ساڈیزائن بنا ہوا تھا۔ جس دروازے سے ہم داخل ہوئے تھے' اس کے سامنے بڑا سا ریشم کا پائیدان پڑا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے عجیب سا خوف محسوس ہوا۔ کیونکہ ان کی شکل ہو بہو ایک جناتی سائز کی مکڑی جیسی تھی اور یوں لگتا تھا جیسے یہ ابھی رینگنے لگے گی۔ یہ سوچ کر ہی میرے بدن میں سنسنی دوڑ گئی کہ میں اس پر پاؤں رکھ کر اندر داخل ہوئی ہوں۔

مکڑی نما پائیدان کو دیکھ کر میرے بدن میں جھرجھری سی پیدا ہوئی۔ میں نے نگاہ

اٹھا کر سامنے بیٹھے شخص کو دیکھا۔ وہ حسنین بھائی سے رسمی باتوں میں مصروف تھے۔ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ انہوں نے جان بوجھ کر مجھے موقع دیا ہے کہ میں چاروں اطراف کا جائزہ لے لوں۔ اب میں انہیں دیکھ رہی تھی اور میرا خیال ہے کہ وہ میری نگاہوں کے بدلتے زاویوں سے بھی واقف تھے۔

دھیمی مسکراہٹ اور چہرے سے پھوٹتی روشنی کے حامل یہ صاحب مجھے بہ مشکل پینتالیس برس کے لگے۔ بھاری جبڑوں کے باوجود چہرے پر عجیب سی نرمی تھی۔ آنکھوں کی خوب صورت بناوٹ، آنکھوں کی بے پناہ چمک کی وجہ سے عجیب سحرزدہ سی لگ رہی تھی۔ کھڑی ناک اور ہونٹوں کے کونوں پر پڑنے والے چھوٹے چھوٹے سے بھنور چہرے کے وقار میں اضافہ کر رہے تھے۔ سنہرے رنگ کے مضبوط ہاتھ پیر، چوڑی کلائیوں پر سیاہ بالوں کے گچھے، انگلی میں چاندی کی چمک دار انگوٹھی میں جڑا سیاہ رنگ کا پتھر، لمبی اور اوپر کو بل کھائی ہوئی گھنی پلکیں۔

میں اتنی خوب صورتی ایک ہی شخص میں دیکھ کر مبہوت رہ گئی تھی۔ وہ سفید براق کرتے پاجامے میں ملبوس تھے۔ کرتا آدھے گلے کا تھا جو بٹن کی بجائے باریک ڈوری سے بندھا تھا۔ اوپری حصے سے ڈوری لٹک رہی تھی۔ گلے کا کونا گرا ہوا تھا اور سینے کے اوپری حصے کے سیاہ بال صاف دکھائی دے رہے تھے۔ سر کے بال بھی گھنے، گھنگریالے اور بالکل سیاہ تھے جبکہ قلموں کے بالوں میں سرمئی رنگ چمک رہا تھا۔

اچانک وہ میری طرف مڑے۔ اپنی مخمور نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ میں سنبھلنے کے چکر میں پھر لڑکھڑا سی گئی۔ وہی بجلی کا جھٹکا سا محسوس ہوا مگر اس بار اس کی شدت قدرے کم تھی۔

”سیما بی بی! کیسی ہیں آپ؟“ انہوں نے بے حد شائستہ انداز میں مسکراتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

مجھے لگا جیسے میرا حلق خشک ہو۔ میں نے پہلی بار بولنے کے لئے قوت صرف کی۔

”جی........! اچھی ہوں۔“

”حسنین نے بتایا تو تعجب ہوا تھا۔ پہلی بات تو یہی عجیب لگی کہ کوئی خاتون پُراسرار واقعات میں دلچسپی رکھتی ہوں اور پھر یہ بھی حیرت ہوئی کہ وہ کسی ماہنامے میں باقاعدہ لکھتی بھی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تم........ پُراسراریت سے واقف نہیں ہو۔“

آخری جملہ انہوں نے خاصی بے تکلفی سے کہا۔ اس بے تکلفی نے مجھ میں بڑا اعتماد پیدا کیا۔ مجھے لگا کہ میں جو سکڑی سمٹی بیٹھی تھی، ایزی ہو گئی ہوں۔

”میرا مطلب ہے کہ تم پُراسراریت کو صرف قصہ کہانی سمجھتی ہو۔ اس پر یقین نہیں رکھتیں، ورنہ کبھی یہ خطرہ نہ مول لیتیں۔“

”جی........! نہیں........ یہ تو میں بھی جانتی ہوں کہ........ لیکن........“ میں بوکھلاہٹ کا شکار ہو گئی۔ یہ احساس بھی مجھے پہلی بار ہوا کہ میں واقعی پُراسراریت کے بارے میں کوئی حتمی رائے نہیں رکھتی۔ جو واقعات میں نے سنے یا لکھے تھے، ان میں سارا اعتماد ان شخصیات پر رہا تھا جن سے واقعات سنے تھے۔ خود کسی واقعے کی میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں تھی۔

”کوئی بات نہیں۔“ وہ دھیرے سے مسکرائے اور بولے۔ ”ایسا ہوتا ہے۔ کوئی بھی شخص سنی ہوئی باتوں پر یقین نہیں کرتا۔ بالخصوص وہ لوگ جو واضح عقائد اور مضبوط سوچ کے بعد کسی بھی چیز کسی شخص یا کسی واقعے کے بارے میں رائے رکھتے ہیں یا ان کے اپنے نظریات ہوتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ لوگوں کے نظریے وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ کسی خاص عمر کی سوچ آنے والے کسی بھی لمحے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ بس عقائد ہی ہیں جو آدمی کو ستون کی طرح کھڑا کئے رہتے ہیں لیکن کبھی کبھی ان پر بھی زو پڑ جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح میں ڈھے گیا۔“

”جی! میں نے واقعی کبھی ان سنے ہوئے واقعات یا سنانے والے کو وہ اہمیت نہیں دی جو شاید دینی چاہئے۔“ میں نے کھل کر اعتراف کر لیا۔

”اگر کبھی ایسا ہو کہ تم خود کسی پُراسراریت کا شکار ہو گئیں تو........“ انہوں نے عجیب سا سوال کر لیا۔

”تو........ پتا نہیں........“ اچانک مجھے ڈر لگنے لگا۔ ان کا یہ سوال صرف سوال نہیں لگا۔ یوں لگا جیسے وہ مجھے چیلنج کر رہے ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ پُراسرار کہانیاں لکھنا بڑا آسان ہے مگر اسے بھگتنا بہت مشکل۔ مجھے اپنا حلق خشک ہوتا محسوس ہوا۔

”شاہ بابا!؟“

میرے مزید کچھ کہنے یا شاہ بابا کے کچھ کہنے سے پہلے، حسنین بھائی بول اٹھے۔ میں نے دیکھا، وہ پہلے کی نسبت اب کافی پُرسکون تھے۔ ”سیما آپ کی کہانی سننے کے لئے آئی

ہیں اور میں بتا چکا ہوں کہ اسے چھاپنے کا پروگرام بھی رکھتی ہیں۔ اب اگر آپ مناسب سمجھتے ہیں تو.........."

"ہاں......ہوں..... میری زوبیا سے بات ہوئی تھی۔" انہوں نے گہرا سانس لے کر صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر کہا۔ "میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ جو باتیں میں آپ کو بتاؤں' اسے سو فی صد حقیقت سمجھا جائے۔ سچائی میں جھوٹ شامل نہ کیا جائے۔ زوبیا کو اس طرزِ عمل سے بے پناہ نفرت ہے اور خود میں بھی پسند نہیں کرتا کہ سیدھی سادی بات کو ڈرامائی رنگ دینے کے چکر میں بات کا مفہوم بدل دیا جائے جیسے کہ عام طور پر لوگ کرتے ہیں۔"

"آپ کو ایسی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔" میں نے پُرجوش انداز میں جواب دیا۔

وہ دھیرے سے مسکرائے۔ "دوسری بات یہ کہ تم خوفزدہ نہیں ہونا۔ ہو سکتا ہے کہ تم کہانی سننے کے دوران میں کچھ باتیں یا واقعات عجیب و غریب محسوس کرو مگر میں کوشش کروں گا کہ ان کی وضاحت کرتا رہوں یا حتی الامکان ایسی کوئی بات نہ ہونے دوں۔"

"بہت' بہت شکریہ شاہ بابا!" میں نے پہلی بار انہیں "شاہ بابا" کہا۔

"تمہیں پوری کہانی سننے کے لئے بہت وقت دینا پڑے گا۔" انہوں نے مجھ سے کہا پھر بے اختیار دروازے کی طرف دیکھا۔

"میں جانتی ہوں۔" میں نے جواب دے کر ان کی نگاہوں کا تعاقب کیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا مگر شاہ بابا اٹھے جیسے دروازے پر کوئی کھڑا ہو۔ میں نے لمحہ بھر کو حسنین بھائی کی طرف دیکھا۔ وہ بھی شاہ بابا کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہاں سے میں نے جوں ہی نگاہ ہٹا کر شاہ بابا کی طرف دیکھا' ان کے ہاتھ میں ٹرے تھی اور وہ ہم سے بہت قریب تھے۔ یوں لگا جیسے یہ ٹرے کوئی اور لے کر آیا تھا اور جسے شاہ بابا نے لے لیا حالانکہ میں نے شاہ بابا کے ہاتھ میں اب سے پہلے یا کمرے میں کوئی ٹرے نہیں دیکھی تھی۔

ٹرے پر اسکواش سے بھرا جگ اور سیاہ رنگ کے شیشے کے خوب صورت گلاس رکھے تھے۔ کچھ نمکین چیزیں بھی تھیں۔ یہ پلیٹیں سیاہ تھیں اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ ان گلاسوں' پلیٹوں اور جگ پر بھی سنہری رنگ سے مکڑی کے جالے کا سا ڈیزائن بنا ہوا تھا۔ یہ میٹنگ میچنگ اور کلر کمبی نیشن بہت خوبصورت لگ رہا تھا مگر اس کمبی نیشن کو

دیکھ کر نہ معلوم کیوں ذہن بوجھل سا ہونے لگا تھا۔ شاید.......... بلکہ یہ یقیناً شاہ بابا کے ذوق کا نتیجہ ہوگا مگر جو کچھ یہ سب دیکھ کر محسوس ہوتا تھا' وہ شاہ بابا کو دیکھ کر محسوس نہیں ہوا تھا۔

"لیجیے۔"

شاہ بابا کی خوبصورت آواز سن کر میں چونک اٹھی۔ میں نے دزدیدہ نگاہوں سے حسنین بھائی کی طرف دیکھا۔ وہ نارمل تھے۔ ان کے چہرے پر حیرت یا خوف کے اثرات نہیں تھے۔ میں اس گلاس کی طرف متوجہ ہوگئی جو شاہ بابا میری طرف بڑھا رہے تھے۔

شاہ بابا نے گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ چھوٹا سا گھونٹ لے کر وہ میری پشت پر دیوار کو تکنے لگے۔ کمرے میں گہرا سناٹا چھا گیا تھا۔ میری نگاہیں ان کے چہرے کا احاطہ کئے تھیں۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے وہ سنانے کو واقعات ترتیب دے رہے ہیں۔

میں نے ٹیپ ریکارڈر آن کر دیا۔ حسنین بھائی سگریٹ سلگا کر صوفے ٹیک لگا کر آرام سے بیٹھ گئے۔

☆--------------------☆--------------------☆

"اس وقت میں بہ مشکل آٹھ نو برس کا تھا۔ میرے ابا کو سیاحت کا شوق تھا۔ وہ چونکہ سب سے چھوٹے اور لاڈلے تھے اسی لئے اپنی من مانی کیا کرتے تھے۔ دادی بتاتی ہیں کہ ان کے پیروں میں زنجیر ڈالنے کو ان کی شادی کی گئی تھی مگر میری ماں بلا کی سعادت مند اور وفاشعار بیوی تھیں۔ انہوں نے کبھی ابا کے سامنے چوں نہ کی۔ ابا نے بھی کبھی ان کی پروا نہیں کی اور جو ان کے دل میں آئی' وہ کیا اور اماں اسی پر اتنی خوش تھیں جیسے خدا اس وفاشعاری اور فرمانبرداری کے بدلے انہیں جنت نصیب کرے گا۔ مجھ سے بڑے تین بھائی تھے۔ دو بہنیں تھیں۔ ابا چھوٹی عمر میں ہی باپ بن گئے تھے مگر احساس ذمے داری بڑھاپے تک پیدا نہ ہوا۔ جوائنٹ فیملی سسٹم نہ ہوتا تو اماں کو یقیناً اولاد کی تعلیم و تربیت کے لئے ابا کی کمی محسوس ہوتی مگر ایک حویلی میں چار پانچ خاندان آباد تھے۔ دادا نے سارا انتظام سنبھالا ہوا تھا۔ وہ خود بھی ابا کو اس قابل نہیں سمجھتے تھے کہ کوئی ذمے داری ڈالتے۔ ان کے خیال میں وہ ابھی بچے تھے۔ وہ تو دادی کی ضد کی وجہ سے ان کی شادی ہوگئی اور وہ باپ بن گئے ورنہ ان کے تو خود کھیلنے' کھانے کے دن تھے۔ میری پیدائش سے پہلے ابا کئی ممالک کی سیر کر چکے تھے۔ وہ ہر سال کہیں نہ کہیں جانے کا پروگرام بنا لیتے تھے۔ انہیں گھومنے پھرنے کے علاوہ کوئی شوق نہ تھا۔

وہ پتا نہیں ہندوستان کے یا کسی ملک کے کون سے علاقے میں گئے اور اپنے پیچھے ایک عذاب لگا لائے تھے۔ وہ اتوار کا دن تھا۔ سردیوں کی صبح تھی مگر دھوپ بہت چمکیلی تھی۔ ہمارے گھر کے لوگ سویرے اٹھنے کے عادی تھے۔ نماز' روزوں کے پابند تھے۔ دادا ابو گھر کے تمام مردوں کے ساتھ مسجد جایا کرتے تھے۔ فجر کی نماز سب ساتھ پڑھتے تھے پھر ہر شخص اپنے اپنے کام پر نکل جاتا۔ زمینیں ہونے کے باوجود سب پڑھے لکھے تھے۔ ملازمتیں کرتے تھے۔ شام گئے لوٹتے۔ ابا کو اکثر رات ہو جایا کرتی مگر دادا کا حکم تھا کہ سب عشاء کی اذان سے پہلے گھر پہنچ جائیں۔ علاوہ ابا کے سب پابندی کرتے تھے۔ کیونکہ عشاء

کی نماز بھی سب ساتھ پڑھتے تھے۔

ہاں' تو میں بتا رہا تھا کہ وہ اتوار کا دن تھا۔ چمکیلی صبح تھی۔ اماں حسب معمول اپنے کاموں میں مصروف تھیں۔ مرد گھروں سے جا چکے تھے۔ ابا چونکہ لمبا سفر کر کے آئے تھے اس لئے فجر کی نماز کے بعد پھر سو گئے تھے۔ گھر کے دوسرے افراد دھوپ سینک رہے تھے۔ سارے کام آنگنوں میں بھری دھوپ میں انجام دیئے جا رہے تھے۔ بہنیں ساگ کاٹ رہی تھیں۔ چچی چھوٹے بچے کو مالش کر رہی تھیں' پھوپیاں کپڑے دھوبی کو دینے کے لئے نکال کر گن رہی تھیں۔ میں اپنے دوسرے چھوٹے بھائی بہنوں زینت' فرحت اور زین کے ساتھ آنگن کے ایک کونے میں مٹی لیپ کر گھر بنانے میں لگا ہوا تھا۔ یہ ہمارا خاص کھیل تھا۔ تحسین خالہ نے فرحت اور زینت کو کپڑے کی گڑیا بنا کر دی تھی۔ زین کو اور مجھے گڈے بنا دیئے تھے۔ ہم ان کی آپس میں شادی رچانے کے سلسلے میں کافی پُرجوش تھے۔ زینت کی گڑیا سے زین کے گڈے کی شادی کر رہے تھے اور فرحت کی گڑیا میرے گڈے کی دلہن بننے والی تھی۔

گھر بنانے کی شرط فرحت نے رکھی تھی۔ گھر.......... اس کی کمزوری تھی۔ اسے بڑی شدت سے احساس تھا کہ اس کا اپنا کوئی گھر نہیں ہے۔ فرحت' تحسین فاطمہ کی اکلوتی بیٹی تھی جبکہ زین اور زینت بڑے چچا صاحب کے بچے تھے۔ وہ اور اس کی اماں ہماری گھر میں رہتی تھیں۔ اس احساس کی شدت کا سبب بھی میں ہی تھا۔ میں فطرتاً بہت کمینہ تھا۔ اتنی چھوٹی عمر میں بھی اکثر اسے جتا چکا تھا کہ اس کا اپنا گھر نہیں ہے اور وہ ہمارے گھر رہتی ہے للذا اسے میرا ہر کام بلا چوں چرا کرنا چاہئے۔ کسی چیز کو بھی اپنی ملکیت نہیں سمجھنا چاہئے۔ ہر چیز لینے سے پہلے اسے میرا عندیہ لینا چاہئے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جب میں نے اس کی گڑیا سے اپنے گڈے کی شادی کرنے کی بات کی تو اس نے سب سے پہلے گڑیا کے لئے علیحدہ گھر کی شرط لگا دی۔ میں ہر روز گھر بناتا اور ہر رات صرف اس لئے گرا دیا کرتا تھا کہ اسے فرحت میرے گڈے کے بغیر استعمال نہ کرے' نہ اسے زین ہتھیا لے۔

بہرحال اس پہلے عجیب و غریب واقعے اور گھر پر ٹوٹنے والی پہلی قیامت کا سبب بھی میں ہی تھا۔ ہوا یہ کہ جس روز ہم ان گڑیوں کی منگنی کر رہے تھے' اسی روز میں نے عصمت آپا کی منت کرتے ہوئے سرخ جوڑا سلوایا تھا۔ میں وہ جوڑا خوب چھپا کر رکھ رہا تھا تاکہ زین اس جیسا جوڑا نہ بنوا سکے۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ گڑیا کے لئے زیور بھی ہوتا

چاہیئے۔ میں نے سب سے ہار بندے مانگے مگر بہنوں نے منع کر دیا۔ اماں بھی یہ کہہ کر ٹال گئیں کہ موتی پرو کر بنا دیں گی مگر ابھی نہیں۔ مجھے بھی ضد ہو گئی تھی کہ مجھے تو آج ہی چاہیئے۔ میں نے سوچ لیا کہ دوپہر کو اماں وغیرہ کے سونے کے بعد بکسوں کی تلاشی لوں گا۔ بہنوں کی الماریاں ٹٹولوں گا اور کوئی اچھا سا زیور چرا لوں گا۔ میں نے اسے چھپانے کی ترکیب سوچ لی تھی کہ رات کو اسی مٹی کے گھر کو ڈھا کر اس کی مٹی میں دبا دیا کروں گا۔

ہم دوسری تیاریاں کرتے رہے۔ تحسین خالہ نے سنا کہ ہم گڑیا کی منگنی کر رہے ہیں تو انہوں نے ہماری بہت مدد کی۔ نمکین اور میٹھی کچھ چیزیں بنا کر دیں۔ فرحت کی گڑیا کے لئے چار جوڑے بنائے۔ اسے چوڑیاں پہنائیں' کانوں میں چاندی کی بالیاں ڈال دیں جو ان کے پاس جانے کب سے پڑی تھیں۔ میں یہ سب دیکھ کر بہت خوش تھا مگر فرحت کے چہرے پر جو ایک فخر سا پھیل گیا تھا' وہ مجھے برا لگ رہا تھا۔ مجھے اس بات سے حسد محسوس ہو رہا تھا کہ فرحت کی گڑیا کے پاس میرے گڈے سے زیادہ زیور موجود ہے۔ حالانکہ وہ غریب ہے۔ یہ اس کا گھر بھی نہیں پھر اس نے اتنا کچھ کر لیا۔ مجھے ہر حال میں اس پر سبقت لینا تھی۔ میں اپنا مان رکھنے کے لئے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں اس سے بھی زیادہ اچھا زیور لے کر جاؤں گا۔

جانے وہ دن کیسے ڈھلا۔ دوپہر ہوئی۔ اماں نے حسب معمول ہم سب کو گھیر کر بڑے کمرے میں جمع کر دیا۔ زین' زینت اپنے کمرے میں اپنی اماں کے ساتھ لیٹ گئے۔ فرحت' تحسین خالہ کے پاس تھی مگر میں جانتا تھا کہ تحسین خالہ اسے کھیلنے سے نہیں روکیں گی۔ انہیں پتا تھا کہ آج دوپہر گڑیوں کی منگنی ہے۔ وہ تو اس کے ساتھ پوری طرح شریک تھیں۔ میں' اماں اور بہنوں کے سونے کا منتظر تھا ابا اپنے کمرے میں تھے جس کا ایک دروازہ اس بڑے کمرے میں بھی کھلتا تھا۔ اماں اور بہنوں کے سوتے ہی میں دبے پاؤں اٹھ گیا۔ میں جانتا تھا کہ عصمت آپا کی سندوقچی کہاں رکھی رہتی ہے۔ اس میں سب کا زیور تھا مگر جب میں وہ صندوقچی کھولنا چاہی تو میرا جی چاہا کہ پھوٹ پھوٹ کر روؤں۔ وہ بند تھی۔ اوپر والا تالا پڑا تھا۔ میں سخت پریشان ہوا۔ میں الماری کے پاس کھڑا تھا کہ اماں نے کروٹ لی۔ ابا کے کمرے کا دروازہ بالکل الماری کے قریب تھا۔ اماں کو کسمساتا دیکھ کر میں غڑاپ سے ابا کے کمرے میں گھس گیا۔ بعد میں ابا کا خیال آیا مگر وہ تو بے خبر سو رہے تھے۔

میں ان کی مسہری کے سرہانے کی طرف جھک کر بیٹھ گیا۔ کافی دیر وہیں بیٹھا رہا۔ مجھے وقت گزرنے کا شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ اب تک زینت' زین اور فرحت ہماری مقررہ جگہ پر پہنچ چکے ہوں گے' یہ سوچ کر بھی پریشان ہو رہی تھی۔ مگر زیورات کے بغیر جانے میں میری بڑی سبکی تھی۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ میں اماں کو جگا کر روتا چلاتا' ضد کرتا تو وہ کچھ نہ کچھ ضرور کرتیں مگر اس طرح ایک تو ابا اٹھ جاتے پھر فرحت وغیرہ کے سامنے میری بے عزتی بھی ہوتی اس لئے میں نے اس طریقے کو مناسب نہ جانا۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ آخر میں نے فیصلہ کر لیا کہ ادھر نہیں جاؤں گا اور شام کو اگر وہ لوگ پوچھیں گے تو کہہ دوں گا کہ مجھے لیٹتے ہی نیند آ گئی تھی اس لئے منگنی کے لئے کل کا دن مقرر کر لیا جائے پھر اتنے عرصے میں' میں ضرور کوئی بندوبست کر لوں گا۔ یہ فیصلہ تو میں نے کر لیا مگر میری جو کیفیت تھی' وہ میں ہی جانتا تھا۔ عجیب شکست خوردگی سی طاری تھی مگر اب اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ میں چپکے سے اٹھا اور اپنے کمرے میں جانے لگا۔ اسی وقت میری نگاہ ابا کی مسہری کے دائیں جانب رکھی ٹیبل پر ایک چاندی کے ڈبے پر پڑی۔ وہ منقش' باریک جالی والا ڈبا تھا جس میں سرخ فیروزی اور سفید نگ جڑے تھے۔ بہت خوبصورت ڈبا تھا۔ میرے ذہن میں ایک بات آئی مگر دوسرے ہی لمحے میں لرز گیا۔ میرے دل میں خیال آیا تھا کہ میں وہ ڈبا غائب کر لوں اور پھر گڑیا کے کپڑے اور زیورات اس ڈبے میں رکھ کر دوں تو میری بڑی واہ واہ ہو جائے گی مگر ابا کے غصے سے بھی واقف تھا۔ وہ ساری دنیا کے لئے انتہائی شریف اور خوش اخلاق آدمی تھے مگر میرے چچوں کا خیال تھا کہ ان جیسا بداخلاق اور آدم بیزار کوئی دوسرا نہیں۔ ان کی گھر میں کسی سے بنتی نہیں تھی۔ وہ ہر وقت غصے میں بھنائے رہتے تھے۔ انہوں نے کبھی ہم لوگوں سے سیدھے منہ بات نہیں کی تھی۔

بہرحال ان کا خوف آڑے آ گیا۔ میں جانتا تھا کہ انہیں اگر پتا چل گیا کہ ان کے کمرے سے کوئی چیز غائب ہوئی ہے تو وہ بہت واویلا مچائیں گے اور اگر خدانخواستہ وہ چیز میرے پاس سے برآمد ہو گئی تو میری سب سے زیادہ بے عزتی ہو گی بالخصوص' فرحت کے سامنے تو میں سر اٹھانے کے قابل بھی نہ رہ سکوں گا اور ایسا مجھے مر کر بھی منظور نہ تھا لیکن اس کے باوجود میں اپنے تجسس کو دبا نہ سکا۔ اسے حاصل کرنا تو ناممکن تھا مگر میں نے اسے ہاتھ میں لے کر خوب غور سے دیکھا۔ اسے کھولا اور یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ اس

میں چاندی اور سونے کی بہت سی چھوٹی موٹی چیزیں تھیں۔ انگوٹھیاں' بریسلیٹ' گلے کی زنجیراں اور جانے کیا کیا۔

ایک انتہائی باریک اور چھوٹی سی چین میں نے غیرارادی طور پر اس میں سے نکال کر اپنی مٹھی میں دبالی۔ گو میری مٹھی ایک دم پسینے سے تر ہو گئی مگر میرا حوصلہ پست نہ ہوا۔ مجھے یقین تھا کہ اتنی بہت سے چیزوں میں سے ایک چیز کے غائب ہونے کا انہیں پتا بھی نہ چلے گا۔ چین لینے کے بعد میں وہاں نہیں رکا۔ میں نے ڈبا بند کر کے آہستگی سے رکھ دیا اور تیزی سے اپنے کمرے میں آگیا۔ وہاں سب سوئے ہوئے تھے۔ میں نے چین اپنی جیب میں رکھی۔ تکیے کے نیچے .کھا گڈا لیا اور چپکے سے باہر آگیا۔

فرحت' زینت اور زین میرے انتظار میں سوکھ رہے تھے۔ ان تک پہنچتے پہنچتے میرا سینہ چوڑا ہو گیا۔ جب میں نے وہ چین نکال کر فرحت کی گڑیا کے گلے میں ڈالی تو وہ تینوں حیران رہ گئے۔ میں نے خود بھی اسے پہلی بار غور سے دیکھا تھا۔ سونے کی زنجیر پر باریک باریک ہر تین کڑیوں کے بعد اس میں ننھے ننھے فیروزے لگے تھے اور ہر تین فیروزوں کے بعد سونے کی ایک مکڑی سی بنی تھی۔" وہ سانس لینے کو رکے۔

☆==============☆==============☆

میں "مکڑی" کے نام پر چونک گئی۔ یہ مکڑی تو اب میرے حواسوں پر سوار ہوتی جا رہی تھی پھر ایک الجھن اور بھی تھی "زیوسا" شاہ بابا نے کمرے میں داخل ہو کر جس کا یوں شکریہ ادا کیا تھا جیسے دروازہ اس نے کھولا ہو۔ شربت وہی لائی ہو' میں تو سمجھ رہی تھی کہ شاہ بابا کہانی شروع کرنے سے پہلے زیوسا کا تعارف کرائیں گے مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ میں انہیں ٹوکنا نہیں چاہتی تھی۔ میری ہمت ہی نہیں تھی کہ میں انہیں ٹوکتی مگر گھر کی ڈیکوریشن سے لے کر برتنوں تک پہ مکڑی کا یہ جالا تنا تھا جس نے مجھے بہت مضطرب کر دیا تھا۔ اتنا میں جان گئی تھی کہ شاہ بابا کی کہانی کا تعلق کسی نہ کسی حوالے سے مکڑی سے ضرور رہا ہے۔ تبھی تو یہاں ہر چیز پہ مکڑی کی چھاپ ہے۔ مجھے اس بات کا تجسس بھی تھا کہ مکڑی جیسی غیراہم اور بے ضرر مخلوق شاہ بابا کی زندگی میں کس انداز سے دخیل ہے مگر میں نے پوچھنا مناسب نہ سمجھا کہ مناسب سمجھا تو وہ خود بتا دیں گے۔ اس لئے میں پھر ہمہ تن گوش ہو گئی۔

☆==============☆==============☆

"وہ چین دیکھ کر ان تینوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔" انہوں نے پھر کہنا شروع کیا۔ "میں نے باتوں باتوں میں ان تینوں کو دھمکایا کہ وہ اس چین کا ذکر کسی سے نہ کریں۔ جب انہوں نے وجہ پوچھی تو میں نے ان پر رعب ڈالنے کو کہہ دیا کہ وہ چین میرے ایک جن دوست نے دی ہے جو باہر کے برگد کے درخت پر رہتا ہے اور وہاں ایک چڑیا کے گھونسلے میں میرے لئے چیزیں لا لا کر رکھتا ہے۔ وہ تینوں مجھ سے چھوٹے اور کافی بے وقوف تھے۔ فرحت تو جنوں سے بہت ڈرتی تھی۔ ان تینوں نے میری بات پر یقین کر لیا اور وعدہ کیا کہ وہ کسی سے کچھ نہیں کہیں گے۔ میں اس طرف سے مطمئن ہو گیا۔ بس تحسین خالہ کی طرف سے مجھے خطرہ تھا کہ اگر ان کی نظر اس چین پر پڑ گئی تو وہ ضرور اماں سے ذکر کر دیں گی یا مجھ سے لے کر اماں کو دے دیں گی۔ اس کی ترکیب میں نے یہ سوچی کہ روز اس چین کو گڑیا کے گلے سے اتار کر گھروندے کے ملبے میں دبا دیا کروں گا۔ فرحت گڑیا کو اس وقت تک اپنے پاس رکھنے کا حق رکھتی تھی' جب تک اس کی شادی نہ ہو جاتی۔ اس کے بعد تو گڑیا میری ہو جاتی اور میں اسے چین اتارے بغیر ہی چھپا سکتا تھا۔

میں نے اسی دن زینت اور زین سے کہہ دیا کہ وہ لوگ بھی جلدی سے شادی کی تیاری کر لیں۔ اب مجھ میں صبر نہیں رہا تھا۔ گھر کے لوگ میرا مذاق اڑاتے تھے کہ میں لڑکا ہو کر گڑیوں سے کھیلتا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرا یہ بے ضرر سا کھیل میری زندگی کا سب سے خطرناک کھیل بن جائے گا۔ تو سیما بی بی! پہلی قیامت اسی روز' اسی رات کو آئی۔ میں نے جسب ارادہ منگنی کی۔ تحسین خالہ نے جب ہمیں مہمان بنا کر اپنے کمرے میں بٹھا کر دودھ کا گلاس اور نمکین میٹھی چیزوں سے ہماری تواضع کی تو سارا وقت میں گڑیا کو دوپٹے میں لپیٹے رہا تاکہ اس کے گلے میں پڑی چین انہیں دکھائی نہ دے۔ فرحت اور زینت نے سلائی مشین کا ڈھکنا بجا کر ڈھولک گیت گائے۔ اسی روز تحسین خالہ نے وعدہ کیا کہ وہ گڑیا کی شادی دھوم دھام سے کریں گی اور گھر کے سارے افراد کو اس میں شرکت پر تیار کریں گی۔

اس وقت میں ڈر گیا مگر میں کچھ کہہ نہ سکا۔ باقی تینوں اس خبر پہ خوش تھے۔ سب کے شامل ہونے سے خوشی تو مجھے بہت ہوتی اگر یہ چین والا چکر نہ چلا ہوتا۔ میرے لئے تو فرحت کی آنکھوں میں بھری حیرت اور احساس کمتری کا تاثر ہی سب کچھ تھا جس نے مجھے منتاز کرنے والی کیفیت سے دوچار کر دیا تھا۔ اس وقت تو میں چپ ہو گیا مگر مجھے یقین تھا کہ

اس خطرے سے بچنے کا بھی کوئی نہ کوئی حل نکال ہی لوں گا۔ منگنی ہو گئی۔ میں نے حسب عادت اور حسب معمول گھروندہ ڈھا دیا۔ چھن مٹھی میں دبا کے اور گڑیا ننگی بچی کر کے فرحت کے ہاتھ میں تھما دی۔ میں نے اسے دیا ہوا سوٹ بھی اتار لیا تھا۔ فرحت کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے مگر میں نے صاف کہہ دیا کہ یہ سب میں گڑیا کو شادی پر دوں گا۔ وہ اسے ایک رومال میں چھپا کر چلی گئی تب میں نے گڑیا کے کپڑے اور وہ چھن ایک تھیلے میں لپیٹ کر اپنے بنائے ہوئے گھر میں رکھی اور اسے ڈھا دیا تھا۔

☆==============☆==========☆

شام کو ہم سب معمول کے مطابق دادی کے پاس بیٹھے سیپارہ پڑھ رہے تھے کہ ابا کی دھاڑ سنائی دی۔ امی سارے کام چھوڑ کر ان کے کمرے کی طرف بھاگیں۔ دوسرے لوگ دم بخود رہ گئے۔ سب کے کان ان کے کمرے کی آوازوں پر لگے تھے۔ وہاں سے اٹھا پٹخ کی آوازیں آ رہی تھیں مگر ان آوازوں میں اماں کی کوئی چیخ نہ تھی البتہ ابا مسلسل کسی بات پر برس رہے تھے۔ عام طور پر یہ ان دنوں ہنگامہ ہوا کرتا تھا جب ابا لمبے سفر سے لوٹا کرتے تھے۔ دادا اندرونی حصے میں کم ہی آیا کرتے تھے اس لئے اکثر انہیں پتا بھی نہ چلتا۔ دادی کی ہمت نہ تھی کہ ابا کے سامنے جاتیں۔ ان کا کہنا تھا کہ اس کے منہ لگنا' اپنی بے عزتی کروانا ہے کیونکہ وہ اماں کے سامنے انہیں کچھ کہہ کر اماں کو سر اٹھانے اور زبان کھولنے کا موقع بھی نہیں دینا چاہتی تھیں۔ چچا' چچیاں پہلے ہی ابا سے جیلس تھے۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ دادا نے ان کا حق مار کر ابا کو نوازا ہے جس کا اجر اب وہ حویلی میں واویلا مچا کر دیتے ہیں۔

اگر کبھی یہ ہنگامہ دادا کے سامنے ہوا تو انہوں نے ہمیشہ اماں کو الزام دیا کہ وہ عطا کا خیال نہیں رکھتی۔ ہاں' یہ بتاتا چلوں کہ میرے ابا کا نام عطاء الرب رضوی تھا۔ دادی نے ہمیشہ اصل بات ان سے چھپائی تھی ورنہ وہ ان پر گرم ہوتے کہ اتنے سے بچے کو شادی جیسی زنجیر میں جکڑنے والی دادی ہی تھیں۔

اس وقت دادا تھے بھی نہیں۔ جو لوگ آنگن میں جمع تھے' وہ چپکے سے سرک لیے۔ بہنیں اور ہم بچے رہ گئے۔ دادی کا دل سیپارہ پڑھانے سے اچاٹ ہو گیا۔ انہوں نے ہمیں یاد کرنے کے لئے سبق دیا اور اٹھ گئیں۔ ایسے میں وہ بھی اپنے کمرے میں بند ہو جایا کرتی تھیں۔ تھوڑی دیر میں صحن سنسان ہو گیا۔ فرحت اور زینت کو میں نے یہ سوچ

کر ان کے کمروں میں بھیج دیا کہ کہیں یہ ہنگامہ ابا نے اسی چھن کے گم ہونے پر نہ مچایا ہو۔ اس بات کا خیال آتے ہی مجھے خوف آنے لگا۔ میرے دونوں بڑے بھائی' عظمت اللہ کے گھر پڑھنے گئے ہوئے تھے۔ عظمت اللہ' کالج میں پروفیسر تھے۔ میرے دونوں بڑے بھائیوں' شجاع اور رضا کو وہی پڑھایا کرتے تھے۔ بڑی آپا زہرہ ساگ کاٹتے کاٹتے انگلی کاٹ بیٹھیں اور اب رو رہی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ انہیں رونا اماں کی حالت پر آ رہا تھا۔ انگلی کٹنے کا تو بہانہ تھا۔ عصمت آپا ویسے ہی گم صم بیٹھی تھیں۔ وہ ذرا سخت دل کی تھیں۔ سب کچھ سپاٹ انداز میں برداشت کر لیا کرتی تھیں۔ ضدی اور ہٹ دھرم بھی میری طرح تھیں جبکہ آپا زہرہ نازک مزاج سی' ہر بات پر رو دینے والی' ہر آہٹ پر خوف زدہ ہو جانے والی اور ہر وقت سہمی رہنے والی تھیں۔

وقت گزر رہا تھا۔ آنگن کی وہ رونق جو ہر شام ہوا کرتی تھی اور ہم سب کو پسند تھی کہ اس کے انتظار میں ہم سبھی دوپہر میں کروٹیں بدلتے گزارا کرتے تھے' اجڑ گئی تھی اور ابا کی موجودگی میں اکثر ایسا ہوا کرتا تھا۔ میں نے ہمیشہ اماں سمیت سب کو ان کے نئے سفر کی خبر پر گہرے اطمینان کے سانس لیتے دیکھا تھا۔ صرف دادی اور دادا تھے جو افسردہ ہو جایا کرتے تھے اور میرے خیال میں یہ افسردگی بھی ان کی خود غرضی ہوا کرتی تھی کیونکہ انہیں صرف ایک ہی ڈر ہوتا تھا کہ اس بار کہیں بیٹے کی غیر موجودگی میں ان کی آنکھ بند نہ ہو جائے اور وہ دل میں کسک لئے مر جائیں۔ ابا کو تو اوروں کی طرح ان سے بھی کچھ لینا دینا نہ تھا۔ وجہ یہ تھی کہ دادا انہیں بن مانگے ہی اتنا دے دیا کرتے تھے۔

بہر حال وقت گزرتا جا رہا تھا۔ آنگن ویران پڑا تھا۔ ابا کے کمرے سے آوازیں اب بھی آ رہی تھیں مگر واضح کوئی بھی آواز نہ تھی۔ یہ پتا نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں یا اماں کیا جواب دے رہی ہیں؟ میں چپکے سے ابا کے کمرے کی طرف بڑھا۔ آپا زہرہ تو مجھے اس طرف جاتا دیکھ کر سفید ہو گئیں۔ "اے.........! ہشت......... ہشت.........!"

انہوں نے اشاروں ہی اشاروں میں مجھے وہاں جانے سے منع کیا مگر عصمت آپا ویسے ہی بیٹھی دیکھتی رہیں۔ میں نے ہاتھ ہوا میں لہرا کر آپا زہرہ کو جھڑک دیا اور دروازے کے قریب پہنچ گیا۔ اب اندر کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ اٹھا پٹخ کی تو اب کوئی آواز نہ تھی مگر ابا مسلسل چیخ رہے تھے۔

"میں کہتا ہوں کون آیا تھا میرے کمرے میں؟"

"کوئی بھی نہیں آیا۔" اماں کھسیا کر بولیں۔ "آپ خود ہی کہیں رکھ کر بھول گئے ہوں گے۔ بچیاں تو اس طرف آئی بھی نہیں۔ شجاع اور رضا کالج سے آکر اپنے کمرے میں آرام کرتے رہے۔ کھانا کھا کر اور نہا دھو کر پڑھنے چلے گئے۔ انہیں کبھی دیکھا ہے آپ نے ادھر آتے؟"

اماں کی روہانسی آواز میرے کانوں میں سیسہ پگھلا رہی تھی۔ وہ یقیناً رو رہی تھیں۔ مجھے ابا سے سخت نفرت کا احساس ہوا۔ ان سے محبت تو میں نے اب سے پہلے بھی کبھی محسوس نہیں کی تھی مگر نفرت پہلی بار محسوس ہو رہی تھی۔

"صالحہ تم سمجھ نہیں رہی ہو کہ پھر کیا ہوگا!! اف میرے خدا! میں نے کس مصیبت سے حاصل کیا تھا اسے۔ جانتی ہو کہ میں نے اسے حاصل کرنے کے لئے قتل جیسا جرم کیا ہے۔"

وہ حلق پھاڑ کر چیخے۔ شاید بھول گئے ہوں گے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں ورنہ اتنے بڑے جرم کا اقرار یوں کر لینا آسان نہ تھا۔

"کک! کیا کہہ رہے ہیں آپ.........؟" اماں کی پھٹی پھٹی آواز سنائی دی۔ "چپ ہو جائیے......... خدا کے واسطے......... یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ.........؟"

پھر شاید اماں لپک کر دروازے کے قریب آئی تھیں اور انہوں نے بھڑا ہوا دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی تھی۔ اب آواز زیادہ واضح سنائی نہیں دے رہی تھی۔ مجھے اس وقت قتل کی حقیقت کا تو ادراک نہیں تھا۔ یعنی میں یہ نہیں جانتا تھا کہ قتل کرنے سے ان کی کیا مراد تھی مگر اتنا مجھے معلوم تھا کہ کسی کو مار دینے کو "قتل کر دینا" کہتے ہیں۔ ایک قتل ہماری ہی زمین پر چار مزارعوں کا ہو چکا تھا۔ بڑا لمبا چکر چلا تھا۔ اکثر پولیس پارٹی دادا کے پاس آتی رہتی تھی اور جس وقت وہ قتل ہوا تھا' گھر کے سب افراد سراسیمہ ہو گئے تھے۔ تب میں بھی سمجھ گیا تھا کہ کوئی غلط بات ہو گئی ہے۔ سہما دینے والی۔

"ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ اگر وہ چین مجھے نہ ملی تو یاد رکھو' ایک نہیں' سو قتل ہوں گے۔"

ابا کی آواز اس بار دبی دبی سی تھی۔ اب اماں کے باقاعدہ رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں ڈر گیا۔ خیال آیا کہ اسی وقت جا کر اپنے گھروندے سے وہ چین نکال کر لاؤں اور ابا کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا کر انہیں دے دوں اور ابا سے [illegible]

آخری بار کہہ دوں کہ آئندہ اگر آپ نے اماں کو کچھ کہا تو اچھا نہیں ہوگا مگر اسی وقت آپا زہرہ میرا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی بڑے کمرے میں لے گئیں۔ وہاں عصمت آپا بھی تھیں۔

"اگر ابا نے دیکھ لیا تو کھال ادھیڑ دیں گے۔" آپا زہرہ کچا کم رہی تھیں اور کھسیا زیادہ رہی تھیں۔ "بیٹھ ادھر۔" انہوں نے مجھے پلنگ پر دھکا دیا۔ میں جیسا گرا تھا' ویسا ہی پڑا رہا اور ابا کے الفاظ پر غور کرتا رہا کہ میں نے اسے حاصل کرنے کے لئے قتل کیا ہے۔

"تو کیا وہ چین ابا نے بھی کسی اور کے کمرے سے چرائی ہے؟ ممکن ہے جب ابا وہ چین چرا رہے ہوں تو وہ آدمی اٹھ گیا ہو۔ اس نے ابا کو پکڑ لیا ہو۔ ابا نے خود کو چھڑانے کے لئے اسے مار دیا ہو مگر وہ آدمی کون تھا؟ میں اوٹ پٹانگ باتیں سوچنے میں لگ گیا اور اصل معاملہ میرے ذہن سے نکل گیا یعنی وہ چین ابا کو واپس کرنے والا۔"

شاید میں وہاں کھڑا رہتا اور اماں پر انہیں چیختے چلاتے دیکھتا رہتا تو فرحت اور زینت وغیرہ کا خیال کئے بغیر وہ چین لا کر واپس کر دیتا اور پھر وہ سب کچھ نہ ہوتا جو ہوا مگر جو خدا کو منظور ہوتا ہے' وہ اس کی سبیل خود ہی پیدا کر دیتا ہے۔ کچھ دیر کے بعد اماں کمرے میں لوٹ آئیں۔ ابا کے کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ اماں کی آنکھیں سرخ تھیں۔ ان کے دائیں کان کے پاس والی کھال بہت سرخ ہو رہی تھی۔ وہ اپنے ایک گھٹنے کو بار بار دبا رہی تھیں۔ کبھی کبھی وہ دائیں بازو کو بھی دبانے لگتیں۔ اتنی دیر میں چھوٹے چچا یعنی وہاب چاچو آ گئے۔ انہوں نے جیسے ہی کمرے میں قدم رکھا' اماں ایک دم سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں۔ ان کے چہرے سے کرب غائب ہو گیا۔ اس کی جگہ مسکراہٹ نے لے لی۔ مجھے اماں کی اداکاری پر حیرت ہوئی۔ وہ ایک دم بہت خوش اور ہشاش بشاش دکھائی دینے لگی تھیں۔ وہاب چاچو کے استفسار پر انہوں نے ہنس کر کہہ دیا کہ شیروانی نہیں مل رہی تھی۔ واویلا مچانا ان کی عادت ہے۔

بات انہوں نے اتنے سرسری انداز میں کہی کہ اس کی ساری سنسنی مٹ گئی۔ میں جانتا تھا کہ وہاب چاچو لاؤڈ اسپیکر ہیں۔ ابھی سارے گھر میں یہ بات پھیل جائے گی۔ کھنچاؤ باقی رہے گا مگر پھر لوگ خول سے باہر آ کر معمولات میں مصروف ہو جائیں گے۔

☆============☆============☆

اماں ہمیشہ یہی کرتی تھیں۔ سارے عذاب خود جھیل لیتیں۔ وہ جو دادا کے سامنے نظر بھی نہ اٹھا پاتی تھیں اگر کہیں ابا پر بات آ رہی ہو تو دیوار بن کر تن جاتیں۔ دادی کی

ہاں میں ہاں ملا کر ابا کو صاف بچا لے جاتی تھیں مگر اکثر رات کو ان کے پہلو میں لیٹے لیٹے مجھے یوں لگتا جیسے اماں کا بدن ہولے ہولے جھٹکے کھا رہا ہو۔ بار بار ناک سڑکنے کی آواز سے میں جان جاتا کہ اماں رو رہی ہیں۔ ان کا ایک بازو ان کی آنکھوں پر دھرا ہوتا مگر کان کی لو بھیگ جاتی۔ میرا جی چاہتا کہ میں ان کے چہرے سے ہاتھ ہٹا کر ان کے آنسو پونچھ دوں۔ ان سے کہہ دوں کہ وہ ابا سے بات کرنا چھوڑ دیں مگر میں جانتا تھا کہ وہ ایسا کرنے پر کہہ دیں گی کہ ان کی آنکھیں خراب ہو گئی ہیں' پانی رس رہا ہے یا کوئی چیز اڑ کر چلی گئی ہے اور یہ بھی نہ کہہ سکیں تو پیٹ میں درد ہونے کا بہانہ بنا کر مجھے تھپکنے لگیں گی۔

ان حالات میں ابا سے میری نفرت بڑھ رہی تھی اور یہ احساس اماں کو نہیں تھا کہ ان کے سارے بہانے بیکار جا رہے ہیں۔ ابا کے گھر میں گھستے ہی میں چوکنا ہو جاتا تھا۔ کبھی جاسوسوں کی طرح اماں کی نگرانی شروع کر دیتا اور اس وقت تک نہ سوتا جب تک اماں بے خبر نہ ہو جاتیں۔

ہاں' تو میں بتا رہا تھا کہ اماں نے اس روز ساری بات چھپائی۔ آنگن میں چہل پہل ہو گئی مگر خاموشی ویسی ہی چھائی رہی۔ ابا اپنے کمرے میں ہی تھے۔ اماں پھر باورچی خانے میں جا بیٹھیں۔ میں جو کافی کاشس (متجسس) تھا' اب بھی اماں پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ کچھ ہی دیر میں دادی باورچی خانے پہنچ گئیں۔ اماں سے کھسر پھسر کرنے لگیں۔ پتا نہیں اماں نے ان کو کیا جواب دیا۔ وہ تیر کی طرح ابا کے کمرے میں پہنچ گئیں۔ اگر اسی وقت شجاع بھائی نہ آگئے ہوتے تو میں دادی کے پیچھے چل دیتا۔

شجاع بھائی مجھے پڑھاتے تھے۔ میرا دل بالکل پڑھنے میں نہیں لگا اس لئے میری پٹائی ہو گئی۔ میں نے دل کی ساری بھڑاس زور زور سے رو کر نکال لی۔ اماں نے شجاع بھائی کو ابا کا نام لے کر دھمکایا۔ بتایا کہ وہ غصے میں ہیں تو وہ بھنا کر بولے۔

"اماں! کوئی نئی بات بتائیں۔"

''چپ رہو۔ بے ادب!'' اماں نے ڈانٹا۔

میں آنسو پونچھ کر جلدی سے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا کہ شجاع بھائی کچھ اور کہیں اور ای پھر انہیں ڈانٹیں تو میں بھی کچھ کہہ دوں مگر اماں شجاع بھائی کو گھورتی رہ گئیں۔

''ابا اب جا رہے ہیں اماں؟'' یہ رضا بھائی تھے۔ انہوں نے جس اشتیاق سے پوچھا تھا' اماں کے چہرے پر دکھ پھیل گیا۔ یقیناً انہیں احساس ہوا ہوگا کہ ساری اولاد ان سے

بیزار ہے۔

''ارے کمبختو! حرام خورو! بددعائیں ہی دیتے رہتے ہو میرے بیٹے کو۔'' دادی' جو اب ہمارے قریب پہنچ گئی تھیں' جانے کس بات پر چڑی ہوئی تھیں۔

''ابا سے پوچھئے دادی! وہ ہمارا منہ چوم لیں گے یہ سن کر۔'' شجاع بھائی مسکرائے۔

''زندگی میں پہلی بار۔'' میں نے ایک دم کہا۔ اماں کا چہرہ زرد ہو گیا۔ دادی بڑبڑاتی دوسری طرف چلی گئیں اور معاملہ دب گیا۔

☆--------------------☆--------------------☆

میں رات کا منتظر تھا۔ جانتا تھا کہ بات دبی نہیں ہے۔ شعلہ راکھ میں دب بھی جائے تو انگارہ بن جاتا' وہ بھی دبا رہے تو چنگاریوں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ چنگاریاں اماں کا دامن چھید کر ہی سرد ہوتی تھیں اور یہاں تو یہ امید بھی نہیں کہ چنگاریاں کبھی سرد بھی ہوں گی۔ جب تک ابا کو وہ چین نہ ملتی' ابا آتش فشاں بنے رہتے اور اب میں چین دینے کا ارادہ ہی ترک کر چکا تھا۔ رات بھی ہو گئی۔ سب گھر والے تو اس معاملے کو بھول گئے مگر عصمت آپا' آپا زہرہ اور اماں کے چہرے کی زردی' اترتی رات کی تاریکی کی طرح گہری اور گہری ہوتی جا رہی تھی۔

وہاں سرشام کمروں میں بند ہونے کا رواج تھا۔ آج کی طرح زندگی رات گئے تک سڑکوں پر نہیں ناچا کرتی تھی۔ گھروں پر مغرب کے بعد ہی خاموشی چھا جایا کرتی تھی۔ چند اوطاقیں' بیٹھکیں اور مردان خانے ہی رات بھر زندہ رہا کرتے تھے۔ ابا کو ان مردان خانوں کے نشے کی بھی علت تھی۔ دن بھر وہ قبرستان جیسے کمرے میں سوتے گزارتے اور جب آنگن میں یا کمروں میں پلنگوں کے بچھنے کی آوازیں گونج رہی ہوتیں' ان کے قدم بیرونی دروازے کی دہلیز پر ہوتے اور نظریں دادا کے کمرے کے دروازے پر۔ اس وقت اماں چوروں کی طرح سب کے کمروں اور کھڑکیوں کی طرف دیکھا کرتیں کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا اور دادی ہاتھ میں تھامی تسبیح کے دانے بغیر کچھ پڑھے ہی زور زور سے گرانے لگتیں۔ انہیں کافی دیر بعد یاد آتا کہ وہ الحمد کی تسبیح پڑھ رہی تھیں کہ سبحان اللہ کی۔

اس رات میں بھی جاگ رہا تھا۔ عصمت آپا اور آپا زہرہ بھی چپکی لیٹی تھیں۔ پتا نہیں سوئی تھیں کہ نہیں۔ اماں مجھے لے کر لیٹ گئیں۔ جس رات اماں مجھے لپٹتے ہی زور زور سے تھپکنے لگتیں' اسی رات میں الرٹ ہو جایا کرتا تھا۔ آج بھی انہوں نے لپٹتے ہی

مجھے تھپکنا شروع کر دیا مگر آج تو میں لیٹنے سے پہلے ہی چوکنا تھا۔ میں نے تو منہ میں مصری کی ڈلی دبائی ہوئی تھی کہ کہیں اچانک نیند نہ آ جائے لیکن کروٹ لے کر ایسا بن گیا کہ اماں سمجھیں، سو گیا۔ وہ سر اٹھا کر بہنوں کے پلنگ کی طرف دیکھتی رہیں پھر دبے انداز میں اٹھ گئیں۔ میری توقع کے عین مطابق وہ ابا کے کمرے کی طرف بڑھیں۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں جلدی سے آڑ میں ہو کر کھڑا ہو گیا پھر عصمت آپا اور زہرہ آپا کے ڈر کی وجہ سے زمین پر بیٹھ گیا۔

"کیا ہوا............ ملی؟" ابا کی کرخت آواز سنائی دی۔

"نن............ نہیں............ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جو چیز بقول آپ کے، کمرے میں تھی، اسے میں کہاں تلاش کروں۔ اسی کمرے میں ڈھونڈتی ہوں۔" اماں نے دبی آواز میں کہا۔

"میں کونا کونا چھان چکا ہوں۔ یہاں نہیں ہے۔" ابا کا پارہ آہستہ آہستہ بڑھتا جا رہا تھا۔ "دوسروں سے پوچھتیں۔ یہ وہاب تو اس طرف نہیں آیا تھا؟"

"نہیں............ وہاب تو سویرے کا نکلا آپ کی چیخ پکار کے وقت ہی گھسا ہے اور کس سے پوچھوں۔ یہ تو الزام ہو گا۔ ہنگامہ ہو جائے گا اور پھر ابا تک بات پہنچی تو!؟"

"ہنگامہ............" ابھی تم جانتی نہیں ہو ہنگامہ کسے کہتے ہیں............ یاد رکھو اگر وہ چین نہ ملی تو............ تو ہنگامہ تو ایسا ہو گا کہ دنیا دیکھے گی۔"

"ایسی کون سی قیامت کی چیز تھی؟" اماں خوف زدہ ہونے کے باوجود الجھی ہوئی تھیں۔

"ہاں! لوگ کہتے ہیں کہ قیامت کی چیز ہے۔ وہ تو مجھے دے بھی نہیں رہے تھے۔ میں نے ہی بڑہانکیں تھیں۔ اب لگتا ہے اس گھمنڈ کا نتیجہ بھی مجھے ہی بھگتنا پڑے گا۔ وہ مجھے ایک یونانی نے دی تھی۔ ویسے جو کچھ وہ بتا رہا تھا، اس پر مجھے یقین نہیں ہے مگر............ خیر............ میں نے سوچ لیا ہے۔ میں آج شیوا جی سے ملوں گا۔"

"آئے ہائے! اس سے............؟ کیوں؟"

"اب وہی کچھ کر سکے گا۔"

پھر ایسا لگا جیسے وہ باہر آنے والے ہوں۔ میں بھاگ کر بستر پر جا لیٹا۔ مجھے حیرت تو یہ تھی کہ ابا اس وقت غصے میں نہیں تھے مگر پریشان لگ رہے تھے۔ اماں کچھ دیر کے بعد

واپس آ گئیں۔ ابا کے آگے آگے تھے۔ میں نے چپکے سے ان کی طرف دیکھا۔ وہ خاصے پریشان تھے اور سچی بات یہ ہے کہ میں انہیں پریشان دیکھ کر بہت خوش تھا۔ مجھے اس بات کی بھی خوشی تھی کہ آج اماں سکون سے سو جائیں گی، رات گئے تک پلنگ کو ہلکے ہلکے جھٹکے نہیں لگیں گے اور میری نیند بھی خراب نہیں ہو گی۔

☆--------------☆--------------☆

اگلی صبح میں جلد ہی اٹھ گیا۔ گھر کا ماحول قدرے بہتر تھا۔ ہم سب کا کھانا پکانا ساتھ ہی تھا مگر زیادہ تر لوگ اپنے اپنے کمروں میں ہی کھاتے تھے۔ صرف رات کا کھانا اس روز ساتھ کھایا جاتا تھا جب دادا کا گھر میں کھانے کا پروگرام ہوتا ورنہ زیادہ تر وہ بھی مردان خانے میں کھایا کرتے تھے کیونکہ اکثر ان کے پاس مہمان ہوتے جو کھانا کھا کر ہی جاتے تھے۔ جمعرات کو البتہ دادا شام گھر والوں کے ساتھ گزارتے۔ اس روز کھانے پینے کا خاص اہتمام ہوتا۔ گھر کے سبھی مرد جلدی آ جاتے۔ عشاء کی نماز کے فوراً بعد کھانا لگا دیا جاتا۔ بچے، بوڑھے، جوان سب ایک دسترخوان پر ہوتے۔ وہ دن مجھے سب سے زیادہ اچھا لگتا تھا اور وہ بھی صرف اس لئے کہ اس روز دادا شام ہی کو تانگا بھیج کر بی جان میری نانی اور کاکا جان یعنی میری بڑی خالہ کو بھی بلوا لیا کرتے تھے۔ کاکا جان کے بچے جوان تھے۔ شادی شدہ تھے۔ میاں دہلی میں دواخانہ کرتے تھے۔ مانے ہوئے طبیب تھے، مہینے میں صرف ایک اتوار کو گھر آیا کرتے تھے۔ ان سے ملنے ہم لوگ جایا کرتے تھے۔

میری نانی ہم سب سے بہت پیار کرتی تھیں۔ میں دادی کی نسبت انہیں زیادہ چاہتا تھا۔ دادی سے چڑتا تھا اور شاید اس کی وجہ ابا کی بے جا طرف داری تھی۔ ہاں، تو میں اس روز جلدی اٹھ گیا تھا۔ سب کے چہروں پر اطمینان دیکھ کر سکون ہوا کہ ابا نے پھر واویلا نہیں مچایا۔ مجھے یقین تھا کہ ابا پڑے سو رہے ہوں گے۔ اماں نے مجھے ناشتا کروا کر اسکول بھیج دیا۔ فرحت، زینت اور زین بھی میرے ساتھ ہی اسکول جاتے تھے۔ سارے راستے میں فرحت وغیرہ پر رعب گانٹھتا رہا۔ فرحت چاہتی تھی کہ اسکول سے گھر جاتے ہی ہم گڑیا کا گھر بنا کر کھیلیں مگر میں نے منہ بنا کر کہہ دیا کہ میں تھکا ہوا ہوں۔ دن کو آرام کر کے شام کو کھیلوں گا۔ میں جانتا تھا کہ وہ لوگ گڑیا کے گلے میں وہ چین دیکھنا چاہتے ہیں۔ فرحت نے تو مجھ سے یہ بھی پوچھ لیا کہ جن اپنی دی ہوئی چین واپس تو نہیں لے گا۔ میں نے بڑی رعونت سے جواب دیا۔

"جن دی ہوئی چیز واپس نہیں لیتے۔"

"ایسا کہتے ہوئے میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ سچ بھی ہو سکتا ہے۔ فرحت کو مرعوب دیکھ کر میرا سینہ پھول کر کپا ہو گیا۔ زین بڑا مریل سا لڑکا تھا۔ اعتماد تو اس میں نام کو بھی نہ تھا۔ وہ زینت کی گڑیا کے لئے گھروندا بھی نہیں بنا سکتا تھا۔ یونہی مٹی کی ڈھیری اونچی کر کے بے ڈھب سا گھروندا بنا دیا کرتا تھا۔ اسے دیکھ کر لگتا تھا جیسے اسے کہیں جانے کی جلدی ہے۔ وہ بولتا ہی ایسے تھا جیسے الفاظ اس کے منہ سے لڑھک کر باہر آ رہے ہیں۔ الفاظ کی پوری ادائیگی جیسے اس کے بس میں نہ ہو یا لفظ اس کے ہاتھوں سے نکلے جا رہے ہوں۔

میں شاید وضاحت نہیں کر پا رہا......... بس یوں سمجھیں کہ وہ ابنارمل تھا۔ ان سب باتوں کے سوا اس میں ایک خوبی یہ تھی کہ وہ میری ہر بات پر آنکھ بند کر کے ایمان لے آتا تھا شاید اسی لئے میں اس کی موجودگی کو بہت اہمیت دیتا تھا۔ مجھے لوگوں میں ممتاز ہونے کا شوق تھا' اور میرے گرد لوگوں میں زین سب سے بہترین آدمی تھا جو ہر لمحے میرے اعتماد کو بڑھاوا دینے میں بہترین معاون تھا۔

☆-----------☆-----------☆

ہم اسکول سے گھر پہنچے تو دنگ رہ گئے۔ ہمارے اس بڑے سے مکان پر لوگوں کا ہجوم تھا۔ گھر کے قریب پہنچے تو اندر سے ہزاروں آوازیں آتی محسوس ہوئیں۔ میں تو بھاگتا ہوا اندر چلا گیا۔ اندر عصمت آپا پچھاڑیں کھا رہی تھیں۔ زہرہ آپا غالباً بے ہوش تھیں۔ چچی ان کے ہاتھ اور ملازمہ ان کے پاؤں سہلا رہی تھی۔ اماں پر الگ غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ تحسین خالہ ان سے لپٹی رو رہی تھیں۔ بار بار وہ انہیں سنبھالتیں پھر اپنا سینہ کوٹ لیتیں۔ دادا اور گھر کے دوسرے مرد بھی پریشان تھے۔ رضا بھائی اور شجاع بھائی الگ کھڑے رو رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی شجاع بھائی نے مجھے کھینچ کر سینے سے لگا لیا۔ اماں اور بہنوں کے گرد محلے اور خاندان بھر کی عورتوں کا جمگھٹا تھا۔

"ضیاء! ابا گزر گئے۔" وہ بھرائی آواز میں بولے۔

یہ جملہ نہیں' بم کا دھماکا تھا۔ میں جو اب تک حیران سخت پریشان تھا' ہکا بکا رہ گیا۔ مجھے ان کی بات پر ذرا یقین نہیں آیا۔ میری نگاہ ابا کے کمرے کی طرف اٹھی۔ وہاں کافی لوگ جمع تھے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ علاقے کے پولیس افسران بھی وردیوں میں موجود

تھے۔ میں شجاع بھائی کی گرفت سے نکل کر اس طرف دوڑا۔ اندر کا منظر مجھے دہشت زدہ کر گیا۔ ابا اپنے کمرے کی چھت میں لگے کنڈے سے لٹک رہے تھے۔ وہی سلکی شیروانی۔ وہی سفید پاجامہ تھا مگر چہرہ وہ نہیں تھا۔ عجیب سا ہیبت ناک ہو گیا تھا۔ اتنا دہشت خیز کہ میرے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی۔ میری چیخ سنتے ہی کافی لوگ ایک دم پیچھے مڑے۔ میں وہاب چاچو کی بغل میں گھسا دیوار سے ٹیک لگائے' منہ پر دونوں ہاتھ رکھے سہما کھڑا تھا۔

وہاب چاچو اور بڑے چاچا صاحب مجھے دیکھتے ہی میری طرف لپکے۔ وہاب چاچو نے مجھے گود میں اٹھا لیا۔ میرا سر کندھے پر لگا کر اس پہ ہاتھ رکھ لیا اور مجھے لئے باہر نکل آئے۔

"یہ یہاں کیسے آیا؟"

"منع کرو بچوں کو۔"

"شجاع سے کہو بچوں کو دوسری طرف لے جائے۔"

مختلف آوازیں آنے لگیں پھر ایک بھاری بھرکم آواز گونجی۔

"پلیز! آپ لوگ دروازہ بند کر دیں۔"

غالباً یہ اس پولیس افسر کی آواز تھی جو کافی اندر کھڑا تھا مگر سب سے لمبا ہونے کی وجہ سے مجھے بھی صاف دکھائی دے گیا تھا۔

وہاب چاچو نے شجاع بھائی کو جھڑکا۔ "اسے سنبھالو۔ تم تو بڑے ہو۔ خیال رکھو۔ خود پر قابو پانے کی کوشش کرو۔ دلہن بھابی اور عصمت' زہرہ کی حالت ایسی نہیں ہے کہ وہ اسے سنبھال سکیں۔"

یہ کہہ کر انہوں نے مجھے گود سے اتارا۔ پیار کیا۔ آنکھوں میں آئے آنسو پونچھے اور پلٹ گئے۔ میں تو طوفان بنا ہوا تھا۔ اب بھی شجاع بھائی کی گرفت سے نکل بھاگا اور جا کر غش کھائی اماں سے لپٹ کر رو پڑا۔ یقین کیجئے کہ میں اماں کی حالت دیکھ کر رو دیا تھا۔ ابا کی حالت دیکھ کر تو ڈر گیا۔ خوفزدہ ہو گیا تھا۔

تحسین خالہ نے مجھے گود میں بھر لیا۔ اماں نے مجھے لپٹا لپٹا لیا۔ ایک ہنگامہ تھا۔ شور تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ دادی کی چیخیں تو آسمان سے باتیں کر رہی تھیں۔ وہ ابا کا نام لے لے کر ایسے پکار رہی تھیں کہ ہر آنے والا بلکنے لگا تھا۔ دادا بڑے حوصلے

سے خود کو سنبھالے ہوئے تھے مگر میں جانتا تھا کہ دادا کی حالت سب سے زیادہ خراب ہوگی۔ جوان بیٹے کی موت کا بوجھ سہارنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ یہ قیامت کا منظر جیسے میرے ذہن میں منجمد ہوگیا۔ لوگوں کے جملوں سے جو کچھ میں اخذ کرپایا وہ یہ تھا کہ ابا نے خودکشی کرلی۔

کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ اس بار سفر سے لوٹے تو کچھ عجیب سے تھے۔ بہت پریشان تھے۔ گھر والوں کے خیال میں ان کا ذہنی توازن بگڑ رہا تھا۔ وہ بے وجہ ہنگامہ آرائی کیا کرتے تھے مگر کچھ لوگوں کا خیال یہ بھی تھا کہ وہ پھر کسی نئے سفر کی تیاری میں لگے تھے۔ باپ نے پیسا دینے سے انکار کردیا ہوگا اس لئے دل برداشتہ ہوکر انہوں نے جان دے دی مگر کچھ عرصے کے بعد میں نے دوسری قسم کی باتیں بھی سنیں مثلاً یہ کہ ان کا کسی طوائف زادی سے عشق چل رہا تھا۔ انہی کا ایک غیر ملکی دوست ان کا رقیب بن گیا تھا اور اس طوائف زادی کو لے کر اپنے ملک چلا گیا تھا۔ ابا کو اس طوائف زادی سے زیادہ' اپنے دوست کو کھو دینے کا قلق تھا۔

کچھ لوگوں نے اس خودکشی کو پراسرار قتل بھی قرار دیا۔ ان کے خیال میں اس طوائف زادی کے محافظ بدمعاشوں نے ابا کو کسی طرح انہی کے کمرے میں پھانسی کے پھندے سے لٹکا دیا تھا مگر جلد ہی اس خیال کو بھی خارج از امکان قرار دے دیا گیا کیوں کہ ابا کا کمرا دوسرے کمروں کے بیچوں بیچ تھا۔ ان کے کمرے میں آنے والے کو پہلے دوسرے کمروں میں سے گزر کر آنا پڑتا تھا۔ بالخصوص اس کمرے سے جو ہم سب کا مشترک تھا' جہاں بہنوں کے علاوہ میں اور اماں بھی سوتے تھے۔

مجھے اتنا تو یاد تھا کہ رات اماں بھی سکون سے سوئی تھیں اور میں بھی۔ مجھے تو لیٹتے ہی نیند آگئی تھی۔ اماں کو بھی یقیناً آگئی ہوگی اور کئی راتوں کی جاگی ہوئی اماں ٹوٹ کر سوئی ہوں گی۔ جب انہیں یا کسی کو بھی ابا ہی کی آمد کا پتا نہ چلا تو کسی اور کی آمد کا کیا پتا چلتا مگر جب آپا زہرہ نے بتایا کہ ابا کی آمد پر ان کی آنکھ کھل گئی تھی۔ ابا کے کمرے میں جانے اور کنڈی لگا لینے کے بعد ہی وہ سو سکی تھیں تو بات کسی حد تک صاف ہوگئی۔ بہرحال اس تمام کارروائی کا نتیجہ کیا ہوا! یہ تو مجھے بہت بعد میں پتہ چلا تھا اس لئے میں اسے اپنے وقت پر بیان کروں گا۔

☆==========☆==========☆

ابا کی موت نے پورے گھر کو افسردہ کردیا تھا۔ اماں کی حالت تو سب سے زیادہ خراب تھی۔ دادی ہر وقت اماں کی اور اماں ہوش میں آتے ہی دادی کی دلجوئی کیا کرتی تھیں۔ تحسین خالہ کیونکہ خود بھی بیوہ تھیں اس لئے اماں کے دکھ سے واقف تھیں۔ وہ بھی اماں کی دلجوئی کرتی رہتی تھیں۔ شاید ایسے موقع پر ان کا اپنا زخم بھی تازہ ہوگیا تھا اس لئے بہت روتی تھیں۔ میں' فرحت' زینت اور زین گڑیا کا کھیل بھول گئے تھے۔ وہ گھروندہ اس شام نہ بن سکا۔ وہ چین اور گڑیا کے کپڑے اسی طرح تھیلے میں لپٹے اسی ڈھیر میں دبے رہے۔ میں تو اماں' بہنوں کے رونے پر سب ہی کچھ بھول گیا تھا۔ شجاع بھائی اور رضا بھائی ایک دم سنجیدہ ہوگئے تھے۔ اب وہ مجھے بات بات پر جھڑک بھی نہیں رہے تھے۔ آپا زہرہ کے آنسو ہی نہ تھمتے تھے جبکہ عصمت آپا پھر پتھر کی مورتی میں تبدیل ہوچکی تھیں اور چچیوں اور پھوپیوں کے ساتھ مل کر دور سے آنے والے خاندان والوں اور دوسرے مہمانوں کی میزبانی میں لگی ہوئی تھیں۔ بی جان' کاکا جان تو اماں سے لگ کر ہی بیٹھ گئی تھیں۔ جس دن ابا کو دفنایا گیا' اس رات بی جان نے اماں کو رات بھر پلک بھی نہ جھپکنے دی۔ جب ان کی آنکھ بند ہوتی' بی جان کی سرسراتی آواز آتی۔

"تحسین.......! اسے سونے نہ دینا۔ مردے کی قبر میں پہلی رات ہے۔"

اور تحسین خالہ انہیں کوئی نہ کوئی ایسی بات یاد دلا دیتیں کہ اماں کی بوجھل آنکھیں پھر آنسو برسانے لگتیں۔ خود تحسین خالہ بھی رونے لگتیں۔ میں بھی رو پڑتا اور فرحت بھی۔ زین اور زینت کو تو پھوپھی اپنے کمرے میں لے گئی تھیں۔ زین رویا تو نہیں تھا مگر سکتے کی سی کیفیت میں رہ گیا تھا۔ اسی رات دادا کی حالت بگڑ گئی۔ انہیں اسپتال لے جایا گیا۔ وہ کئی گھنٹے وہاں رہے۔ صبح کہیں جاکر ان کی حالت سنبھلی تو گھر واپس آئے۔

ہمارے ہاں دور دور سے مہمان آرہے تھے۔ سوئم کے روز تو پوری حویلی بھری ہوئی تھی۔ یہ مہمان داری دس روز تک جاری رہی۔ اماں کو عدت میں بٹھا دیا گیا۔ ابا کی موت پر کچھ غیر ملکی بھی آئے تھے۔ ان میں سے ایک لمبا چوڑا آدمی' جو بہت خوبصورت تھا' شجاع بھائی سے بہت دیر تک باتیں کرتا رہا تھا۔ وہ انگریزی میں بات چیت کر رہا تھا اس لئے میرے پلے کچھ نہیں پڑا مگر ایک موقع پر جب شجاع بھائی کسی کام سے اندر گئے تو میں جو وہیں بیٹھا مسلسل اسے دیکھ رہا تھا' بول اٹھا۔

"آپ ابا کے دوست ہیں؟" میں بھول گیا تھا کہ وہ غیر ملکی ہے اور اردو نہیں سمجھ

سکے گا مگر اس وقت مجھے شدید حیرت ہوئی جب اس نے بڑی شستہ اردو میں مجھے جواب دیا۔

"ہاں بیٹا! میں آپ کے ابو کا دوست ہوں۔ مجھے ان کی موت کا سخت صدمہ ہے اور اس سے زیادہ صدمہ اس بات کا ہے کہ انہوں نے جس کام میں بڑی ہمتوں کے بعد ہاتھ ڈالا تھا' وہ اسے پورا نہیں کر سکے۔"

میں نے حیران ہو کر انہیں دیکھا۔ "کون سا کام؟"

"ہے ایک کام۔ میں یہی دیکھنے آیا تھا کہ ان کی اولادوں میں سے کون ہے جو یہ کام کر سکتا ہے۔"

"مجھے بتایئے۔ میں وہ کام کر لوں گا۔"

میری بات سن کر وہ دھیرے سے مسکرایا۔ اس نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا پھر یوں دوسری طرف دیکھنے لگا جیسے اسے مجھ میں وہ خاص چیز نظر نہ آئی ہو' جسے وہ دیکھنا چاہتا تھا۔ اسی دوران میں شجاع بھائی آ گئے۔

"کیا ہوا؟" اس غیر ملکی نے اردو میں سوال کیا۔

"اماں کی حالت تو ایسی نہیں ہے کہ میں ان سے کچھ پوچھوں مگر میں آپا کے کمرے میں ڈھونڈ آیا ہوں۔ مجھے کہیں بھی ایسی کوئی چین نہیں دکھائی دی۔"

چین کے ذکر پر میرے کان کھڑے ہو گئے۔ مجھے سخت حیرت ہوئی کہ اس شخص کو کیسے پتا چلا اور یہ کیوں اس چین کے بارے میں جاننا چاہتا ہے؟

"وہ بہت ضروری ہے شجاع بیٹے! محض اس کی وجہ سے میں نے سیٹ کینسل کروائی ہے اور میں اب اس وقت تک یہاں سے نہیں جا سکتا جب تک وہ چین مجھے نہ مل جائے۔"

"مگر ہم نے ایسی کوئی چین ان کے پاس نہیں دیکھی۔ ابا صرف ایک چاندی کی انگوٹھی پہنے ہوئے تھے' وہ اماں کے پاس ہے۔ سونا پہننا تو حرام ہے اس لئے وہ اسے نہیں پہن سکتے تھے۔"

"نہیں' اسے پہننے کا تو سوال ہی نہیں تھا مگر وہ انہی کے پاس تھی۔ وہ بہت اہم چیز ہے۔"

اب وہ غیر ملکی بھی پریشان ہو گیا تھا۔ میں بڑے تجسس سے ساری گفتگو سن رہا تھا۔

مجھے خیال آیا کہ میں اسے بتا دوں کہ وہ چین میرے پاس ہے مگر پھر یہ سوچ کر چپ ہو گیا کہ وہ تو ابا کی تھی اور ابا تو مر گئے پھر میں اسے کیوں دے دوں اور یوں بھی اس چین کی وجہ سے میری اہمیت اور حیثیت میں جو اضافہ ہوا تھا' وہ میں فرحت' زینت اور زین کی آنکھوں میں صاف دیکھ سکتا تھا پھر میں نے سوچا' اب میں اس چین کی حفاظت پہلے سے بھی زیادہ کروں گا۔ پہلے تو صرف ابا ہی اس کے بارے میں جانتے تھے اور انہوں نے اماں کو بھی بتا دیا تھا۔ ابا تو مر گئے تھے اور اماں سے چھپانا اتنا مشکل نہ تھا مگر اب تو یہ غیر ملکی اور شجاع بھائی بھی جان گئے تھے کہ ابا کی کوئی چین غائب ہو گئی ہے۔ اب تو مجھے اس کی بہت زیادہ حفاظت کرنا تھی۔ ایک تو اس لئے کہ وہ اگر میرے پاس سے برآمد ہو جاتی تو میں چور مشہور ہو جاتا' دوسرے یوں کہ میری بنی بنائی عزت خاک میں مل جاتی اور چین بھی مجھ سے چھن جاتی۔ وہ لوگ باتیں کر رہے تھے اور میں اپنے آپ کو پکا کر رہا تھا۔ اچانک میں چونک اٹھا۔ غیر ملکی عجیب سے لہجے میں شجاع بھائی سے باتیں کر رہا تھا۔ میں اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"دیکھو شجاع!......... میری بات کو غور سے سنو! وہ ایک پُراسرار چین ہے۔ ایک عجیب و غریب چیز! اسے ہم نے ایک قبرستان کے اندر بنی قبر میں دفن کئے ہوئے مردے کے گلے سے اتارا تھا۔"

شجاع بھائی نے چونک کر اس غیر ملکی کی طرف غور سے دیکھا۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ ہمیں ایک خاص مدت تک اسے اپنے پاس رکھ کر کسی کو تلاش کرنا تھا۔ میں ساری تفصیل تمہیں نہیں بتا سکتا مگر یہ بھی نہیں چاہتا کہ تم لوگ انجانے میں کسی مصیبت کا شکار ہو جاؤ۔ تم میرے ایک اچھے دوست کی اولاد ہو۔ میں پہلے اس کا اور پھر اس کی نسل کا نقصان نہیں چاہتا۔ جس انداز میں وہ ہمیں چھوڑ کر گیا ہے' اس سے میں خوف زدہ ہوں۔ میرا خیال ہے کہ یہ......... یہ موت بھی ایک پُراسرار واقعہ ہے۔ وہ رات کے تین بجے ہمارے درمیان سے اٹھ کر گیا تھا۔ اس نے یہ تو کہا تھا کہ وہ چین کہیں کھو بیٹھا ہے مگر اسے یقین تھا کہ وہ اسی گھر میں کہیں موجود ہے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ آج اسے ضرور حاصل کر لے گا۔ وہ بالکل ٹھیک تھا۔ اتنا ہی پُرجوش' جتنا یہ کام شروع کرنے سے پہلے تھا۔ وہ بڑے ٹھنڈے ذہن کا آدمی تھی۔ دکھ' غصہ' مایوسی اسے اتنا دل برداشتہ کبھی نہیں کر سکتی تھی کہ وہ خودکشی کر لیتا۔ امید ہے تم میری بات سمجھ

رہے ہو گے۔ پلیز! میری مدد کرو۔ یقین کرو میں تم سب کو کسی بھی پُراسراریت سے بچانے کے لئے ایسا کر رہا ہوں۔"

وہ بڑی ہی سنجیدگی سے اور بے تابی سے شجاع بھائی کو یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا مگر میں جانتا تھا کہ شجاع بھائی پر اس کی کسی بات کا اثر نہیں ہو رہا۔ وہ یک ٹک اسے دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہرے یا آنکھوں میں کہیں خوف یا کوئی دوسرا تاثر نہیں تھا۔ ان کا چہرہ بالکل سپاٹ نظر آ رہا تھا۔ انہوں نے سپاٹ ہی لہجے میں جواب دیا۔

"میں سمجھ رہا ہوں۔ آپ کے خلوص پر مشکور ہوں۔ آپ میرے والد کے دوست ہیں، میرے والد کی جگہ ہیں۔ میں آپ سے وعدہ تو نہیں کرتا کہ میں اسے ڈھونڈ نکالوں گا مگر میں کوشش ضرور کروں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔"

ان کے چپ ہوتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "تھینک یو مسٹر شجاع! تھینک یو! میں امید رکھوں گا کہ تم اسے ضرور ڈھونڈ لو گے۔" اس نے پہلے شجاع بھائی سے پھر مجھ سے ہاتھ ملایا اور رخصت ہو گیا۔

☆-------------☆-------------☆

"ڈرا رہا تھا۔" شجاع بھائی نے اس کے جاتے ہی کہا۔

"کیوں؟" میں چونک گیا۔

"کیا پتا کیوں؟ اسے چین چاہیے اس لئے۔ حالانکہ وہ نہ بھی ڈراتا تو میں اسے تلاش کرنے کی کوشش ضرور کرتا مگر میں اماں یا دادا سے پوچھے بغیر ابا کی کوئی چیز اس کے حوالے نہیں کرتا جبکہ وہ چاہتا ہے کہ میں اسے چپکے سے وہ چین دے دوں۔ پتا نہیں کیا مصیبت ہے؟ میں تو جانتا بھی نہیں کہ وہ کون سی چین ہے۔ اتنا سمجھ میں آ رہا ہے کہ کوئی قیمتی چین ہو گی۔"

"اگر وہ آپ کو مل گئی تو کیا آپ اسے دے دیں گے؟" میں نے اپنا اطمینان کرنا چاہا۔

"نہیں.......... میں اماں یا دادا سے پوچھوں گا۔"

"ہمیں ابا کی کوئی چیز کسی کو نہیں دینی چاہئے۔"

"ہاں اور کیا.........."

ان کی تائید نے میرے حوصلے بڑھا دیے۔ انہی دنوں شجاع بھائی کو کسی نے بلا

لیا۔ تمام عورتیں اور بچے، بڑے کمرے یا اس کے ساتھ والے برآمدے میں تھے۔ مرد، مردانہ حصے میں تھے۔ جہاں ہم نے گڑیا کا گھروندا بنایا تھا، وہاں درمیان میں ایک چھوٹی سی ادھوری دیوار بنی ہوئی تھی جو اس حصے کو سامنے والے حصے سے علیحدہ کرتی تھی۔ ایک طرف ہینڈ پمپ لگا ہوا تھا جسے کنویں سے پانی نکالنے کے لئے لگایا تھا۔ دوسری طرف دیوار کے ساتھ غالباً ادھوری رہ جانے والی دیوار کی اینٹیں چنی ہوئی رکھی تھیں جو اوپر تک چلی گئی تھیں۔ اسی حصے کے کونے کو ہم نے کھیل کے لئے مخصوص کیا ہوا تھا کیونکہ ہم لوگ عموماً دوپہر میں سب کے سونے کے بعد یہاں آتے تھے اس لئے سب کی نگاہوں سے محفوظ بھی رہتے تھے اور یہ حصہ اتنی دور تھا کہ ہماری آوازیں بھی ان تک نہ پہنچتی تھیں۔ جب تک کوئی خاص طور پر اس طرف نہ آئے، ہمیں نہیں دیکھ سکتا تھا۔

بار بار اس چین کے ذکر نے میرے تجسس کو بہت بھڑکا دیا تھا۔ میں سب کی آنکھ بچا کر اس طرف چلا گیا۔ میں اسے نکال کر اچھی طرح دیکھنا چاہتا تھا۔ جب میں نے وہ چین چرائی تھی تو مجھے اس کی اہمیت کا اندازہ بالکل نہ تھا۔ مجھے تو بس اپنی گڑیا کے لئے زیور چاہئے تھا۔ اگر اماں مجھے موتی پرو کر ہار بنا دیتیں تو شاید میں اس جرم کا ارتکاب نہ کرتا۔ نہ یوں اس چین کا قصہ اہمیت اختیار کرتا اور بہ قول اس غیر ملکی کے، ابا بھی نہ مرتے۔ (اس کا خیال تھا کہ ابا کی موت اس چین کی پراسراریت کا ایک حصہ تھی۔) اور خود وہ بھی اتنا پریشان نہ ہوتا مگر اب وہ چین میرے لئے بہت اہم ہو چکی تھی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اسے فرحت، زینت اور زین کی نگاہوں سے بھی چھپا لوں گا۔ مبادا کبھی وہ ذکر کر ہی دیں اور میری شامت آ جائے۔

میں اس حصے میں پہنچا۔ گھروندہ مٹی کے ڈھیر کی صورت میں اسی طرح پڑا تھا۔ میں محض یہ جاننے کے لئے کہ کہیں اسے زین، زینت یا فرحت نے نہ چھیڑا ہو، اس ڈھیر پر ایک پتھر رکھا تھا۔ اس پتھر کو جوں کا توں دیکھ کر میری جان میں جان آئی ورنہ اس طرف آتے وقت میں خاصا پریشان تھا۔ زیادہ پریشان زین کی طرف سے تھا۔ وہ اپنا دل تھا۔ اس سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ مارے خوف کے وہ چین نکال کر اسے اماں یا دادا کے حوالے کر دیتا مگر یہ بھی غنیمت تھا ابھی تک چین والا قصہ عام نہیں ہوا تھا۔ اماں نے بھی کسی کو نہیں بتایا تھا اور شجاع بھائی سے بھی امید نہیں تھی کہ وہ یہ بات کسی کو بتائیں گے۔

ابھی میں اس چین کو وہاں سے نکالنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے کسی کی آواز آئی۔

آواز ان اینٹوں کے قریب سے آئی تھی جو دیوار کے ساتھ ساتھ چنی ہوئی تھیں۔ میں نے پوری توجہ سے آواز سننا چاہی مگر الفاظ سمجھ میں نہیں آسکے۔ میں دیوار سے کچھ اور قریب ہوگیا۔ اب یہ سمجھ میں آ رہا تھا کہ کوئی مرد تیزی سے کسی نامانوس زبان میں کچھ پڑھ رہا ہے۔ جوں جوں میں نے غور کرنا شروع کیا' میرے اندر گھبراہٹ بڑھنے لگی۔ عجیب سے الفاظ تھے جن کا تلفظ بڑا گراں گزر رہا تھا۔ یہ اتنی تفصیل سے تو میں بعد میں سمجھ پایا ہوں ورنہ اس وقت تو وہ آواز اور الفاظ برے لگ رہے تھے۔ آواز آہستہ آہستہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اب میں نے ان چنی ہوئی اینٹوں کے پیچھے دیکھنا چاہا مگر وہاں کسی کے ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ زیادہ تر اینٹیں بالکل دیوار سے لگی ہوئی تھیں اور جو اینٹیں دیوار سے ہٹی ہوئی تھیں' وہاں بھی اتنی جگہ نہیں تھی کہ کوئی سما سکے پھر یہ بھی احساس ہو رہا تھا کہ آواز وہیں سے آ رہی ہے۔

میں بچہ تھا۔ کتنا بھی سخت جان سہی' کتنا بھی ذہین سہی' آخر عمر کا بھی تقاضا ہوتا ہے۔ جوں ہی ذرا یہ بات سمجھ میں آئی کہ یہاں کوئی نہیں مگر آواز یہیں سے آ رہی ہے' سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ اکثر عصمت آپا اور زہرہ آپا مجھے ایسے قصے سنایا کرتی تھیں۔ جن میں جنوں' بھوتوں' چڑیلوں اور چھلاوں پریوں کا ذکر ہوتا تھا۔ سنتے وقت تو میں بڑی دلچسپی لیا کرتا تھا مگر اکیلا ہوتے ہی سب بھولا ہوا یاد آنے لگتا اور میں خوفزدہ ہو جایا کرتا تھا۔

اس وقت بھی وہی ہوا۔ عصمت آپا نے بتایا تھا کہ وہ بچپن میں بی جان کے گھر کے پیچھے بنے ایک خالی کمرے میں کھیلا کرتی تھیں۔ محلے کی دوسری لڑکیاں بھی آ جاتی تھیں۔ ایک روز وہ لوگ وہاں کھیل رہے تھے کہ اچانک عجیب عجیب سی آوازیں آنے لگیں۔ انہوں نے باہر نکل کر دیکھا تو ایک بھیبت ناک شکل کا آدمی اس کمرے کی پچھلی دیوار پر کسی چھپکلی کی طرح چپکا ہوا نہ جانے کیا پڑھ رہا تھا۔ اس کی شکل دیکھتے ہی لڑکیاں چیخ مار کر یہاں وہاں مڑ گئیں۔ عصمت آپا بھی روتی چیختی گھر کے اندرونی حصے کی طرف بھاگیں تو بی جان اور کاکا جان کو پتا چلا۔

بی جان نے ملازم کو بلا کر خوب لتاڑا کہ اس کمرے کے گرو لگا کانٹوں والا جنگلا کس نے صاف کیا اور کمرے کو کس نے کھولا تھا۔ بی جان نے عصمت آپا کو بھی ادھر جانے پر ڈانٹا تھا اور بتایا تھا کہ اس کمرے میں بھوت رہتے ہیں۔ یہ قصہ اس وقت مجھے اپنی پوری

جزیات سمیت یاد آگیا۔ یوں لگا جیسے باہر کی طرف ایک شخص چھپکلی کی طرح دیوار پر چپکا ہوگا اور وہی کچھ پڑھ رہا ہوگا۔ میں چھن اور گھروندا بھول بھال کر بھاگا اور اماں کے کمرے میں جا کر پناہ لی۔ بات اس چھن کو چھپانے والی نہ ہوتی تو شاید میں پورے گھر کو سر پر اٹھا لیتا حالانکہ میں اب بھی ایسا کر سکتا تھا۔ وہاں جانے والا بھلا کب جان پاتا کہ وہاں ایک کونے میں پڑے مٹی کے اس ڈھیر میں' میں نے چھن چھپائی ہے مگر دل میں چور تھا اس لئے بستر پر دبک گیا۔

مغرب کا وقت تھا' فاتحہ ہونے والی تھی۔ ابا کے مرنے والے روز سے یہ فاتحہ اب تک جاری تھی۔ روز فاتحہ ہوتی تھی۔ چالیس غریبوں کو کھانا کھلایا جاتا تھا۔ گھر کے افراد سب مصروف تھے' بس اماں کمرے میں ایک بستر پر نڈھال پڑی تھیں۔ تحسین خالہ' بی جان اور کاکا جان ان کے پاس تھیں۔ میں تحسین خالہ کے پیچھے چھپ کر لیٹ گیا۔ اماں کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ بے ساختہ رو پڑیں۔ "میرا بچہ..........! میرا بچہ..........! ہائے میرا بیٹا..........! اتنی سی عمر میں کیوں یتیم ہوگیا اماں!؟" وہ دھاڑنے لگیں۔ بی جان نے اماں کو سینے میں بھرلیا۔ "صبر کر میرے بچے!.......... صبر کر۔"

شاید وہ سمجھ رہی تھیں کہ میں اپنا یتیمی کا دکھ سہنے کے لئے یہاں لیٹا ہوں یا ابا مجھے یاد آ رہے ہیں حالانکہ سچی بات تو یہ ہے کہ اتنے سے دنوں میں' میں ابا کا چہرہ ان کے نقوش تک بھول گیا تھا۔ ہاں' ایک واضح ہیولے کی مانند وہ مجھے اب بھی یاد تھے۔ سلکی شیروانی' سفید کلف دار پاجامہ' تیل سے چمکتے ہوئے بال' چاندی کے کام والے سلیم شاہی جوتے اور ان کی گرجتی گونجتی آواز بھی مجھے یاد تھی۔ میں ذرا سا زور دیتا تو شاید مجھے ان کے وہ الفاظ بھی یاد آ جاتے جو وہ اماں کو لتاڑتے وقت ادا کرتے تھے مگر وہ مجھے محض باپ یا شفیق باپ کی حیثیت سے یاد نہیں آسکتے تھے۔ میں اس وقت چپ تھا۔ کچھ کہنا بھی فضول تھا۔ یہ اماں کا خیال تھا اور اس کے اظہار پر مجھے کوئی اعتراض نہ تھا۔ مجھے تو ان کی نرم گرم آغوش اچھی لگی۔ میرا خوف کم ہوگیا۔ اس وقت میں نے حیرت انگیز حد تک ان کی آغوش کو نرم اور گرم محسوس کیا تھا۔ شاید روتے ہوئے عورت میں ایسی کوئی خصوصیت پیدا ہو جاتی ہو۔

بہرحال یہ قصہ میں نے اس روز تو کسی کو نہ بتایا اور جانے کیسے اس کی وحشت کو اکیلے برداشت کر گیا۔ اگلے ہی روز جب فرحت نے مجھے گڑیا کے کھیل کھیلنے کو کہا تو میں

بدک گیا۔ "دیکھتی نہیں ہو کہ ابا مر گئے۔" میں نے یوں آنکھیں نکالی تھیں جیسے ان کے مرنے کا سارا تعلق مجھ سے ہی ہو۔

"اب تو بہت دن ہوگئے ضیا! اب تو کوئی نہیں روتا۔" اس نے بڑی معصومیت سے کہا۔

"تمہیں کیا پتا! تم تو اپنے کمرے میں سوتی ہو ناں! اماں' بہنیں اور دادی تو ساری رات روتی ہیں۔" یہ میں نے سراسر جھوٹ بولا تھا۔ دادی تو خیر کبھی کبھی رو لیتی تھیں مگر اماں اور بہنوں کو شاید صبر آچکا تھا۔ اماں اگر میرے سونے کے بعد روتی ہوں تو پتا نہیں۔ فرحت میری بات سن کر چپ رہ گئی۔ یوں بھی ان دنوں گڑیا کی شادی کی بات تو ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ بی جان اور کاکا جان ابھی تک یہیں تھیں۔ تحسین خالہ ہی تھیں جو اماں کے ساتھ ان دونوں کی خدمت میں لگی ہوئی تھیں۔ انہیں بھی کب فرصت تھی کہ گڑیا کا جہیز تیار کرتیں۔ یہ احساس مجھے ہوگیا تھا اسی لئے میں نے فرحت سے کہہ دیا کہ میں بغیر جہیز کے اس کی گڑیا کی شادی اپنے گڈے سے نہیں کروں گا۔ زین کا گڈا اسے پسند نہیں تھا ورنہ میں نے تو اسے کھلی آفر دی تھی کہ اگر اسے جلدی ہے تو وہ اپنی گڑیا کی شادی زین کے گڈے سے کر دے مگر شاید وہ چین وہ بھی نہیں بھولی تھی۔ فوراً مجھے منانے میں لگ گئی۔ میں نے کہہ دیا کہ جب سب مہمان چلے جائیں گے' تب دیکھا جائے گا۔

اس طرح میں نے کچھ دنوں کے لئے سب کا دھیان اس طرف سے ہٹا دیا۔ میں چاہ رہا تھا کہ اماں ٹھیک ہو جائیں تو ان سے موتیوں کا زیور بنوا لوں گا پھر وہ چین غائب کرکے دوسرا زیور پہنا دوں گا۔ میں کئی روز تک اکیلا اس طرف نہیں گیا۔ بہانے بہانے کبھی زین کو اور کبھی فرحت کو ادھر لے جاتا۔ دور سے ہی مٹی کے ڈھیر پر نگاہ ڈالتا' پتھر کو جوں کا توں دیکھ کر مطمئن سا واپس چلا آتا۔

☆-----------------☆-----------------☆

آہستہ آہستہ گھر مہمانوں سے خالی ہونے لگا۔ دادی اماں کی خاموشی بڑھنے لگی۔ اماں کی خاموشی ٹوٹنے لگی۔ عصمت آپا تو اکثر گنگنانے لگتیں۔ بی جان اور کاکا جان گھر کو لوٹ گئیں۔ اماں کی عدت ختم ہوگئی۔ گھر پر چھایا وہ افسردہ سا سکوت ہلکی سی ہلچل میں تبدیل ہوگیا۔ آنگن میں شام کو چہل پہل ہونے لگی۔ دادا' جنہوں نے تنہائی کو اپنے گرد کسی دیوار کی طرح تان لیا تھا' اب کچھ نارمل ہو رہے تھے اور آج تو گھر میں کافی اہتمام ہو

رہا تھا۔ ایک تو آج اماں کی عدت ختم ہوئی تھی' دوسرے آج جمعرات تھی۔ ابا کے مرنے کے بعد سے لے کر آج تک یہ پہلی جمعرات تھی جب دادا نے گھر میں کھانا کھانے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ دونوں چچیاں اور اماں کھانے پکانے میں مصروف تھیں۔

رات کو آنگن میں دسترخوان بچھ گیا۔ گھر کے سب افراد بہت دنوں بعد ساتھ کھانا کھا رہے تھے۔ مجھے اچھا لگ رہا تھا اور میں نے فرحت سے آج شام ہی تو کہہ دیا تھا کہ ہم لوگ یعنی دلہا والے کل تمہارے گھر (یعنی تمہارے کمرے میں) آ رہے ہیں۔ وہ خوش ہوگئی تھی۔ گھر کے سب افراد شام ہی سے گھر پہنچ گئے تھے۔ دادا بھی جلدی اندر آگئے۔ ان کے آتے ہی گھر میں گہری اداسی چھا گئی۔ اماں باورچی خانے میں بیٹھے بیٹھے دوپٹے سے منہ چھپا کر رو دیں۔ دادی اماں کی جھریوں میں چھپی آنکھیں پانی سے بھرا کٹورا بن گئیں۔ زہرہ آپا چپکے سے سر گھٹنوں میں دے کر بیٹھ گئیں۔ وہ بھی یقیناً رو رہی تھیں' انہیں تو رونے میں ذرا سی بھی دیر نہیں لگتی تھی۔ ان سب کو شاید ابو یاد آگئے تھے۔ بہت دیر گھر کی فضا سوگوار رہی۔ میں بے چینی سے پہلو بدلتا رہا۔ میرا بس چلتا تو میں جادو کی چھڑی گھما کر پورے ماحول کو بدل دیتا مگر میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

دسترخوان لگا۔ سب گھر والے بے حد خاموشی سے کھانا کھانے لگے۔ یوں لگتا تھا جیسے اس پوری حویلی میں کوئی ذی روح ہی موجود نہیں ہے۔ چند سائے ہی ہیں جو ایک جگہ بیٹھے ہل رہے ہیں یا صرف منہ ہلا رہے ہیں۔ اس روز بڑی اچھی اچھی چیزیں پکی تھیں ورنہ شاید میں کسی بہانے اٹھ جاتا۔ ویسے دادا کے سامنے یہ بے ادبی کرنا بڑی ہمتوں کی بات تھی۔ باقی لوگ تو ان کے بیٹھنے سے پہلے بیٹھتے تھے' نہ اٹھنے سے پہلے اٹھتے تھے۔ پتا نہیں کتنا سنگین وقت گزر گیا۔ دادا ابو نے پانی پیا۔ چند لمحے آنکھیں بند کرکے خدا کا شکر ادا کیا پھر آنکھیں کھولیں تو اماں پر نگاہیں جما دیں۔

"یہ سونے کی زنجیر کا کیا قصہ ہے؟"

ان کی بھاری آواز نے سب کو چونکا دیا۔ سب انہیں دیکھنے لگے تب پتا چلا کہ وہ اماں سے مخاطب ہیں۔ اماں اس غیر متوقع سوال سے گھبرا گئی تھیں۔ میرا دل تو اچھل کر حلق میں آگیا تھا۔ میں بے اختیار تحسین خالہ کے پیچھے کی طرف تھوڑا سا سرک گیا تھا۔

"وہ........ پتا نہیں بابا جانی! میں نے تو دیکھی نہیں۔ کہہ رہے تھے کہ کوئی........ کوئی لے گیا ہے یا شاید کہیں رکھ کر بھول گئے ہیں۔ کہیں گرا دی ہوگی انہوں

نے۔" اماں کافی بوکھلا گئی تھیں۔ میں نے آنکھیں بچا کر فرحت' زینت اور زین کی طرف دیکھا۔ وہ تینوں اپنی کھسر پسر میں لگے ہوئے تھے۔

"رابرٹ آیا تھا۔ کہتا ہے' نہیں ہے۔ یہ بات اسے شیوا جی نے بتائی ہے۔" انہوں نے بڑے سرد اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

ان کے لہجے کی سرد مہری جانے کیسے میری ریڑھ کی ہڈی تک پہنچ گئی۔ چوری بہت بڑا جرم تھا اور اپنے ہی باپ کی چوری اور وہ بھی اس عمر میں بہت ہی سنگین جرم تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ شیوا جی کے نام پر گھر کے افراد سفید پڑ گئے۔ یہ نام سنا تو میں نے بھی تھا۔ بڑی دھوم تھی ان کی۔ سنا تھا' بڑے پہنچے ہوئے ہیں۔ موڈ میں ہوں تو سارا مستقبل آئینے کی طرف صاف صاف بتا دیتے ہیں۔ جی میں آجائے تو دل کھول کر مدد کرتے ہیں۔ جو مریض موت کے قریب ہوں' انہیں زندگی کی طرف لوٹا دیتے ہیں۔ کھوئی ہوئی چیزوں کے بارے میں تو منٹوں میں بتا دیتے۔

"کیسی زنجیر دلہن..........!" بڑے چچا نے حیرت سے اماں کو دیکھا۔

اماں اس سارے قصے کو اب تک سب سے چھپائے ہوئے تھیں' اب انہیں سب کے سامنے وضاحت کرنا پڑی مگر شاید خدا نے میری سن لی۔ دادا نے ہاتھ اٹھا کر چچا کو چپ کرا دیا۔

"تم میرے کمرے میں آنا۔ مجھے تم سے کچھ باتیں کرنا ہیں۔"

وہ اماں سے اتنا کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے اماں کی طرف دیکھا۔ ان کا رنگ سفید ہو گیا۔ ایک دفعہ پھر میرے حوصلے پست ہونے لگے۔ جی چاہا' اماں کی جان اس عتاب سے چھڑا لوں مگر اسی لمحے مجھ پر ایک سنگین انکشاف ہوا کہ گزرتا وقت مجھے ایک عجیب و غریب جال میں جکڑتا جا رہا ہے۔ اگر میں اس موقع پر زنجیر چرانے کا اعتراف کر لیتا تو ابا کی موت کا الزام سراسر مجھ پر آجاتا۔ میرا جرم زیادہ سنگین ہو چکا تھا اس لئے میرا چپ رہنا ہی بہتر تھا۔ سو میں ساکت بیٹھا رہ گیا۔ دادا کے اٹھتے ہی سرگوشیاں تیز ہو گئیں۔ اماں سر جھکا کر بیٹھ گئیں۔ دادی نے سب کو چپ کرا دیا۔ سب سے زیادہ شجاع بھائی کھول رہے تھے۔ وہ اشارہ کر کے اماں کو کمرے میں لے آئے اور انہیں بتا دیا کہ رابرٹ ہمیں بے وقوف بنا رہا ہے۔ اگر ابا کے پاس ایسی کوئی چیز تھی بھی تو اس پر اس کا قطعی کوئی حق نہیں۔ بات انہوں نے اس طرح کی کہ اماں فوراً قائل ہو گئیں بلکہ انہوں نے تو یہاں

تک کہہ دیا کہ اسی موئے رابرٹ نے چرائی ہوگی۔ اب دیکھا کہ ان کا انتقال ہو گیا ہے تو ان پر الزام رکھ دیا۔

اب وہ دادا کے پاس جاتے ہوئے کافی سنبھلی ہوئی تھیں۔ اندھیرا چاروں طرف اتر آیا تھا۔ اب میں محسوس کر رہا تھا کہ مجھے چین وہاں سے ہٹا لینا چاہیئے۔ اب بات پھیل گئی تھی۔ کسی بھی وقت زین' زینت یا فرحت آتش فشاں کا دہانہ کھول سکتے تھے۔ اس سے پہلے ہی میں کوئی ایسی کہانی بنا دینا چاہتا تھا کہ میری جان بچ جائے۔ باوجود اس کے کہ رات گہری ہو گئی تھی اور مجھے اس طرف جانے سے خوف آ رہا تھا' میں وہاں جانے پر مجبور تھا۔ میں نے شجاع بھائی کے پڑھنے کی میز کے دراز سے ٹارچ نکال لی۔ اسے قمیض کے دامن میں چھپا کر باہر نکل آیا۔ انتہائی دائیں جانب تحسین خالہ کا کمرا تھا۔ میں اس طرف کو ٹہل گیا۔ میں جانتا تھا کہ سب کا دھیان فی الحال دادا اور اماں کی گفتگو پہ لگا ہوگا۔ میں اس طرف سے اچانک بائیں طرف مڑ کر مطلوبہ جگہ پہنچ سکتا تھا۔

مجھے وہاں تک پہنچنے میں ذرا دشواری نہ ہوئی۔ دیوار کی آڑ میں پہنچتے ہی میں نے زمین کی طرف رخ کر کے ٹارچ کو روشن کر لیا۔ گھروندے کے ڈھیر کے قریب بیٹھ کر میں نے جلدی جلدی دونوں ہاتھوں سے مٹی ہٹانا شروع کر دی۔ ذرا سی دیر میں تھیلا میرے سامنے تھا۔ میں نے اسے بڑی احتیاط سے کھولا۔ گڑیا کے جوڑے میں لپٹی چین کو محسوس کیا۔ اس لمحے مجھے لگا جیسے میری انگلیاں کسی نرم نرم کسی گداز چیز سے ٹکرائی ہیں پھر میں نے محسوس کیا کہ وہ جوڑا خود بخود ہل رہا ہے۔ میں نے جلدی سے اس کی تہیں کھولیں اور پھر میری آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

میرے ہاتھ سے وہ جوڑا گر گیا۔ اس میں ننھے ننھے سے ہلکے براؤن رنگ کے کیڑے تھے۔ خوف کی وجہ سے میں نے انہیں غور سے دیکھا پھر ٹارچ بھی میرے ہاتھ سے گر پڑی تھی۔ میں چھلانگیں مارتا ہوا وہاں سے بھاگ اٹھا۔ اس وقت مجھے یہ ہوش بھی نہیں تھا کہ کوئی دیکھ لے گا تو کیا ہوگا؟ میں سیدھا تحسین خالہ کے کمرے میں گھس گیا۔ بدحواسی شاید میرے چہرے سے عیاں تھی۔ تحسین خالہ اس وقت لیٹی ہوئی فرحت کو کوئی کہانی سنا رہی تھیں۔ مجھے یوں گھستا دیکھ کر چونک اٹھیں۔

"کیا ہوا ضیاء.......... بی آپا کو..........!" شاید وہ سمجھی تھیں کہ دادا نے اماں کو کچھ کہا ہے۔

"وہ خالہ.........! وہاں........ وہاں کوئی ہے.........." میں بے ساختہ بول اٹھا۔

"کیا.........؟" وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ دروازے پر آئیں۔ چاروں طرف دیکھا۔ فرحت حیران سی ٹانگیں سکیڑے بیٹھی تھی۔ مجھے سوچنے کا وقت مل گیا۔ یہ بات میں جان چکا تھا کہ کسی بھی حال میں مجھے اس چیز کے بارے میں کچھ نہیں بتانا ہے بلکہ جیسے بھی ہو' ان سب کو اس جگہ سے دور رکھنا ہے۔ میں اس وقت تو چین وہاں سے نہیں نکال سکا مگر صبح سویرے اسے وہاں سے اٹھا سکتا تھا۔

"کیا بات ہے ضیاء! باہر تو کوئی بھی نہیں ہے۔" وہ پلٹ کر میرے قریب آ بیٹھیں۔ میں اتنی دیر میں خود کو کافی حد تک سنبھال چکا تھا۔ "پتا نہیں خالہ! مجھے ایسا لگا تھا جیسے کوئی بھوت میرا پیچھا کر رہا ہے۔" میں نے انتہائی چالاکی سے بڑا معصوم بن کر کہا۔

وہ ہنس پڑیں۔ "لو بھلا! "بھوت" کے پیچھے بھوت کیوں پڑنے لگا؟"

فرحت بھی ہنس پڑی۔ اماں کے ساتھ کیا ہوا' دادا نے کیا کہا' شجاع بھائی نے اماں کا ساتھ دیا اس انگریز یا یونانی کا' مجھے پتا نہیں۔ میں تو تمام رات جاگتا رہا۔ میں نے تحسین خالہ سے اماں کو کہلوا دیا کہ میں آج ان کے پاس سوؤں گا۔ اماں پہلے ہی دادا والے معاملے میں الجھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے اس بات کا نوٹس نہیں لیا ورنہ عام طور پر وہ مجھے کبھی اس کی اجازت نہ دیتیں۔

وہ رات کیسی گزری' یہ میں ہی جانتا ہوں۔ ذرا سی دیر کو آنکھ لگتی تو یوں لگتا جیسے میرے بدن پر کیڑے رینگ رہے ہیں۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھتا۔ کھڑا ہو کر کپڑے جھاڑتا۔ کبھی کمر کھجاتا تو کبھی ٹانگیں۔ فرحت اور تحسین خالہ بے خبر سو رہی تھیں ورنہ وہ دونوں میری حالت دیکھ کر ضرور پریشان ہو جاتیں۔ حیرت کی بات ہے کہ مجھے خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ مطلب یہ کہ میں اس بات سے قطعی خوف زدہ نہیں تھا کہ وہ آواز کیسی تھی یا یہ کہ اس جوڑے میں وہ کیڑے کہاں سے آ گئے؟ ظاہر ہے وہ جوڑا میں نے زمین میں دبایا تھا۔ مٹی میں دس طرح کے کیڑے ہوں گے۔ رینگ کر وہ اس جوڑے کے اندر چلے گئے ہوں گے۔ وہ تو رات کا وقت نہ ہوتا' کسی کے دیکھ لینے کا خوف بھی نہ ہوتا تو۔ جبھی اتنا بڑا سکینڈل نہ بن گئی ہوتی تو میں یوں وہاں سے نہ بھاگتا۔ رات کو میری ادھر جانے کی ہمت نہیں ہوئی تھی ورنہ میں وہ چین لے آتا۔ تمام رات میں اس چکر میں جاگا تھا کہ وہ چین جو میں نے چھپا کر رکھی تھی' اس وقت مٹی کے ڈھیر پر ہی پڑی ہے۔ وہ کسی کے ہاتھ لگ

جاتی تو جانے کیا ہو جاتا۔

مجھے یاد ہے' ابھی آنگن میں لگے پیڑ پر چڑیوں نے اپنے پر ہی پھڑپھڑائے ہوں گے کہ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پرندوں کی چہچہاہٹ اور اذان کی آواز ساتھ ہی آئی تھی مگر باہر اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ اس وقت میرا باہر نکلنا زیادہ خطرناک تھا۔ سبھی نماز کے لئے اٹھتے تھے۔ گویا ابھی مجھے کم از کم آدھے گھنٹے انتظار کرنا تھا۔ دادا تو مردان خانے ہی سے مسجد چلے جاتے تھے مگر چچا اور بھائی وغیرہ اکثر گھر میں نماز پڑھتے تھے اور باقی سب لوگ بھی۔ مجھے غسل خانوں سے پانی گرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ اب میری آنکھوں میں سوئیاں سی چبھ رہی تھیں۔ رہ رہ کر آنکھوں میں پانی بھر آتا تھا۔ جمائیاں آ رہی تھیں اور میں بار بار سر جھٹک کر نیند کو بھگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ نماز پڑھنے کے بعد سب لوگ تھوڑی تھوڑی دیر کو لیٹ جاتے تھے اس لئے کہ دادا پورے آدھے گھنٹے بعد مسجد سے لوٹتے تھے اور تبھی گھر میں زندگی دوڑتی تھی۔ صبح کاذب' صبح صادق میں ڈھل جاتی تھی۔

اب مجھے بہت چوکنا رہنا تھا۔ تحسین خالہ ابھی تک نہیں اٹھی تھیں۔ میں حیران تھا کہ اذان کی آواز نے ان کی نیند کیوں نہیں توڑی؟ کئی بار سوچا کہ انہیں جگا دوں ورنہ ان کی نماز نکل جائے گی مگر میرا اپنا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ تحسین خالہ اٹھیں اور مجھے اس طرف جاتا دیکھیں سو میں چپ چاپ پڑا رہا۔ جب گھر میں آہٹیں معدوم ہو گئیں' پانی گرنے کی آوازیں بند ہو گئیں اور دور دور تک سناٹا چھا گیا تو میں نے سر اٹھا کر آخری بار تحسین خالہ اور فرحت کو دیکھا۔ فرحت کروٹ لئے ہوئے تھی مگر بے سدھ تھی۔ تحسین خالہ چت لیٹی تھیں۔ ان کے لیٹنے کا انداز بڑا "غیر فطری" سا تھا اس کا احساس مجھے آج ہوتا ہے۔ ان کا چہرہ بالکل زرد تھا۔ وہ بھی بے حس و حرکت تھیں۔

میں رکے بغیر دبے پاؤں ان کے کمرے سے نکل آیا۔ آنگن سنسان پڑا تھا۔ میں نے سر گھما کر چاروں طرف دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ اب چپکے چپکے آگے بڑھا۔ مٹی کا گھروندا ویسے ہی تھا۔ اوپر ہی میری گڑیا کا سرخ جوڑا پڑا تھا۔ اس کی تہیں کھلی ہوئی تھیں۔ چین جوں کی توں موجود تھی۔ وہاں کوئی کیڑا نہیں تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر چین کو مٹھی میں دبا لیا۔ گڑیا کا سرخ جوڑا پھر گھروندے کی مٹی میں دبا دیا تا کہ فرحت زین اور نزہت کو احساس نہ ہو کہ اسے کھولا یا نکالا گیا ہے۔ میں پلٹنے ہی والا تھا کہ میری نگاہ چند

قدم کے فاصلے پر پڑی۔ وہاں ننھے ننھے سے کیڑے کلبلا رہے تھے۔ وہ سب ایک جتھے کی شکل میں تھے۔ کسی چیز سے چپکے ہوئے۔ اب ہلکا ہلکا اجالا پھیل چکا تھا۔ مجھے خوف بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا اس لئے میں اس جتھے کے قریب بیٹھ گیا اور تب میری آنکھ حیرت سے پھٹی رہ گئیں۔ وہ سب چھوٹی چھوٹی مکڑیاں تھیں۔ سنہری رنگ کی۔ ان کے جسم پر باریک سونے کے تاروں جیسے بال تھے۔ سب سے زیادہ حیرت مجھے اس بات سے ہو رہی تھی کہ وہ سب چھوٹی چھوٹی مکڑیاں ایک بڑی اور مری ہوئی مکڑی میں سے نکل رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا' جیسے وہ بڑی مکڑی کچل گئی ہے اور اس کے روئیں روئیں سے وہ ننھی ننھی مکڑیاں جنم لے رہی ہیں۔ مجھے یاد آگیا کہ کل رات میں نے گڑیا کے جوڑے کے اندر انہی مکڑیوں کو کلبلاتے دیکھا تھا۔

شاید میں کچھ اور دیر تک وہاں بیٹھتا مگر اسی وقت مجھے بیرونی دروازے پر دادا کی مخصوص کھنکار سنائی دی۔ یہ ان کا خاص طریقہ تھا۔ نماز کے بعد وہ جب بھی گھر میں داخل ہوتے' بجائے کسی کو آواز دینے کے' اسی طرح کھنکارا کرتے تھے اور یہی کھنکار سب کو کمروں سے باہر آنے کا سگنل دیتی تھی۔ میں جلدی سے اٹھ گیا۔ پھر گھبرا گیا۔ وہ چین میری مٹھی میں تھی۔ اسے کہیں چھپانا بے حد ضروری تھا۔ فی الحال تو میں نے اسے کرتے کی جیب میں ڈال لیا اور تیزی سے اٹھ کر تحسین خالہ کے کمرے کی طرف بڑھا پھر وہاں سے اندر جانے کی بجائے اماں کے کمرے کی طرف پلٹ گیا۔ اماں جاگ رہی تھیں۔ زہرہ آپا اور عصمت آپا ناشتا بنایا کرتی تھیں۔ اس لئے وہ دونوں کمرے میں نہیں تھیں۔ شجاع بھائی اور رضا بھائی کالج جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اماں نے دونوں ہاتھ پھیلا دیے۔

"وہاں کیوں سوگئے تھے تم؟" انہوں نے مجھے پیار کرتے ہوئے قریب لٹا لیا۔ میری آنکھوں میں بھری نیند انہیں بھی نظر آگئی تھی۔

"وہ......... خالہ کہانیاں سنا رہی تھیں اس لئے........" میں نے اونگھتے ہوئے انداز میں کہا۔ اب نیند مجھ پر بری طرح حاوی ہو رہی تھی۔

"پاگل ہے۔ کہا بھی ہے کہ رات کو بچوں کو کہانیاں نہیں سناتے۔" اماں نے مجھے سیدھا لٹا کر تھپکتے ہوئے کہا۔

"تو کیا رات کو بڑوں کو کہانیاں سناتے ہیں؟" رضا بھائی ہنس کر بولے۔ "اسے کہاں

سنا رہی ہیں؟ اسکول جانا ہے اسے۔"

یہ سن کر میں کسمسا کر اماں کی بغل میں گھس گیا پھر پتا نہیں کہ اماں نے رضا بھائی سے کیا کہا' مجھے تو کچھ ہوش نہیں رہا۔ اتنی گہری نیند سویا کہ گھر میں گزرنے والی قیامت پر بھی آنکھ نہ کھلی۔ جانے کب مجھے زین نے جھنجوڑ کر اٹھایا۔

"ضیا........! ضیا........ دیکھو تو........ کیا ہوگیا؟" وہ بری طرح ہکلا رہا تھا۔

"کیا ہوگیا........؟" میں اٹھ بیٹھا مگر میری آنکھوں میں شدید جلن تھی اور پانی بہہ رہا تھا۔

"تحسین خالہ بھی مرگئیں۔" زین نے گھبرا کر کہا۔

"کیا!" میں اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ "کیسے؟ کب؟ میں نے گھبرا کر سوال کیا مگر اس کا جواب نہیں سنا۔ وہ جواب دینے کی پوزیشن میں ہی نہیں لگ رہا تھا۔ لرزہ طاری تھا اس پر۔ میں چھلانگیں مارتا ہوا باہر نکل آیا۔ باہر نکلا تو عجیب واویلا تھا۔ فرحت دھاڑیں مار رہی تھی۔ تحسین خالہ بیچ آنگن میں رکھی چارپائی پر بے حس و حرکت پڑی تھیں اور ان پر سفید چادر پڑی تھی۔ اماں اور گھر کی دوسری خواتین کا حال برا تھا۔ بین کی آوازیں دل لرزائے دے رہی تھیں۔ رضا بھائی اور شجاع بھائی کے سوا سب مرد موجود تھے۔ شاید سبھی کو اطلاع ہوگئی تھی اور وہ سب آگئے تھے۔ دادا نڈھال تھے جبکہ دادی ویسی ہی مطمئن تھیں۔ میں حسب عادت سب کے درمیان سے ہوتا ہوا' تحسین خالہ کے قریب پہنچ گیا۔ اس لمحے چادر کا کونا ہوا سے اڑا اور میں ان کا چہرہ دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ ان کا چہرہ بالکل نیلا تھا۔ اماں نے اسی وقت لپک کر چادر ٹھیک کر دی اور پاس ہی روتی ہوئی فرحت کو خود سے لپٹا لیا۔ وہ ہم دونوں کو لئے کمرے میں آگئیں۔ پیار کرنے لگیں۔ خود ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ مجھے رونا آگیا تھا مگر اماں کو اور فرحت کو یوں روتا دیکھ کر اپنا رونا بھول کر ان دونوں کو تسلیاں دینے لگا۔

اماں فرحت کو میرے حوالے کرکے خود باہر چلی گئیں۔ باہر جا کر انہوں نے زہرہ آپا کو بھی ہمارے پاس بھیج دیا۔ شاید اس لئے کہ وہ ہمیں سنبھالیں مگر انہیں تو خود مجھے "سنبھالنا" پڑا۔ ان کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔ وہ فرحت کو گود میں لئے رو رہی تھیں۔

"زہرہ آپا! کیا ہوا تھا خالہ کو؟" میں نے ان کے آنسو پونچھتے ہوئے پوچھا۔

"پتا نہیں........؟ ہمیں تو فرحت نے آکر بتایا کہ وہ اٹھیں نہیں۔ اماں نے جا

کر دیکھا تو......... شاید انہیں سانپ نے ڈس لیا۔"

"سانپ نے.........!" میں حیران رہ گیا۔ اس سے پہلے تو کبھی نہیں سنا تھا کہ یوں سوتے میں گھر کے اندر کسی کو سانپ نے ڈس لیا ہو اور وہ تو بڑی مسہری پر سوئی تھیں۔ سانپ مسہری پر کیسے چڑھ سکتا تھا؟ میں کچھ بولا نہیں مگر سوچتا رہ گیا۔

☆---------------☆---------------☆

وہ تمام دن بڑے عذاب کا تھا۔ ابا کے بعد دوسری مرتبہ گھر میں قیامت کا شور تھا۔ آنے والے مہمانوں میں بھی چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں کہ گھر میں ضرور سانپ آگیا ہوگا۔ سب کا یہی خیال تھا مگر فرحت کا دکھ ویسا کا ویسا تھا۔ میں نے فرحت کو کبھی اتنی اہمیت نہیں دی تھی کہ اس کے دکھوں کے بارے میں سوچوں بلکہ میں نے تو ہمیشہ اسے اس خود سے کمتر جان کر اسے اس بات کے طعنے دیئے تھے کہ وہ ہمارے گھر میں رہتی ہے۔ اس کا اپنا کوئی گھر نہیں ہے۔ آج مجھے اس فرحت سے ہمدردی محسوس ہو رہی تھی اور دل بے حد دکھی تھا۔ میں نے بلکتی ہوئی فرحت کو دیکھ کر یہ عہد کرلیا کہ میں اب اسے کبھی تکلیف نہیں پہنچاؤں گا۔ اسے کبھی طعنہ نہیں دوں گا اور گڑیا کا جوڑا اور وہ چین بھی اسے دے دوں گا۔ چین کا خیال آتے ہی میں چونک اٹھا۔ رات میں نے چین وہاں سے نکال لی تھی اور اپنی جیب میں ڈال کر سو گیا تھا۔ بے اختیار میں نے ہاتھ جیب میں ڈالا۔ وہ موجود تھی۔ میری جان میں جان آگئی۔ ایک خیال دماغ میں سما کر رہ گیا کہ سب سے پہلے اسے کہیں محفوظ کر دینا چاہیے۔ میں سب کچھ بھول گیا۔ ابا کا کمرا باہر سے بند تھا۔ کنڈی لگی ہوئی تھی۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ ان کے کمرے ہی میں چھپاؤں کیونکہ وہاں کوئی نہیں جاتا تھا۔ مگر یہ سوچ کر گھبرایا کہ اگر کبھی دادا نے اس چین کی تلاش میں کمرے کی چھان پھٹک شروع کر دی تو یہ ان کے ہاتھ آ جائے گی۔

اچانک مجھے فرحت کے کمرے کا خیال آیا۔ وہ سب سے محفوظ کمرا تھا بلکہ تحسین خالہ کی الماری سب سے محفوظ جگہ تھی۔ فرحت ابھی تک زہرہ آپا کے سینے سے لگی رو رہی تھی۔ میں چپکے سے اٹھ گیا۔ اب میرا ہاتھ اپنی جیب پر تھا۔ میں لوگوں کی نگاہ بچا کر تحسین خالہ کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ ان کی الماری سامنے ہی تھی مگر وہ بند تھی۔ میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ چین کو فوری طور پر کہیں چھپانا ضروری تھا۔ میں نے ان کی مسہری کے نیچے کسی بکس کی تلاش میں جھانکا۔ وہاں لوہے کی ایک چھوٹی سی صندوقچی نے

میری توجہ کھینچ لی۔ وہ ایک زنگ آلود صندوقچی تھی اور اس کا ڈھکنا باریک جالی کا تھا۔ وہ اتنی چھوٹی تھی کہ اس میں چھوٹی چھوٹی چیزیں ہی سما سکتی تھیں۔ میں نے بغیر کچھ سوچے اسے اٹھا لیا۔ اسے کھولا تو اس میں سوائے دھول کے اور کچھ نہ تھا۔ میں نے اسے میلے کپڑے سے جھاڑا پھر اس میں چین کو رکھ کر اسے چھپانے کو جگہ تلاش کرنے لگا۔ جلد ہی مجھے کامیابی ہو گئی۔ دیوار پر بنی الماری کے اوپر کا حصہ کسی چھجے کی طرح آگے کو نکلا ہوا تھا۔ میں نے مسہری کے سرہانے کی پٹی پر کھڑے ہو کر اسے وہاں رکھ دیا اور کود کر نیچے اتر گیا۔ مجھے یہاں سے نکل جانے کی بھی جلدی تھی۔ ڈر رہا تھا کہ کسی نے یہاں دیکھ لیا تو وہ ضرور سوچے گا کہ میں یہاں کیا کر رہا ہوں۔

میں وہاں سے باہر آ گیا۔ کسی کو خبر نہ تھی کہ میں کیا کر رہا تھا۔ سب ویسے ہی بین کر رہے تھے۔ اب محلے کے اور خاندان کے بہت سے لوگ آ چکے تھے۔ تحسین خالہ کی میت بھی نہیں تھی۔ لوگوں کی باتوں سے پتا چلا کہ وہ غسل کے لئے دوسری طرف بڑے غسل خانے میں چلی گئی ہے۔ ایک بات میں بتانا بھول گیا کہ ہمارے گھر کے رہائشی حصے میں کچھ فاصلے پر یہ بڑا غسل خانہ تھا۔ اس میں کفن دفن سے متعلق ہر چیز ہمیشہ رکھی رہتی تھی۔ غسل خانہ اور اس کی افادیت ہمارے پردادا پر عیاں رہتی تھی۔ انہوں نے سب سے کہہ دیا تھا کہ ہر آدمی کو اپنی کفن دفن کی چیزوں کو لا کر یہاں رکھ دینا چاہئے اور نہیں بھولنا چاہئے کہ موت کسی بھی وقت آ سکتی ہے۔ جس طرح آدمی اپنے سونے، کھانے اور اگلے روز پہننے کا انتظام کرتا ہے، یہ انتظام بھی اسے وقت سے پہلے کر لینا چاہئے۔ میرے نقطہ نظر سے تو ہر گھر میں یہ غسل خانہ ہونا چاہئے مگر........ آدمی ایسا دھوکے باز اور کوئی نہیں ہوگا جو سب سے بڑا دھوکا اپنے آپ کو دیتا ہے۔ دوسروں کی موت میں ایسے شریک ہوتا ہے جیسے کسی دور لگے میلے میں شریک ہو رہا ہے اور یہ میلہ اس کے گھر، اسی کے سبب کبھی نہیں لگے گا۔

بہرحال تحسین خالہ کی میت وہاں جا چکی تھی۔ میں پھر کسی نہ کسی طرح اس حصے میں پہنچ گیا۔ اندر جا نہیں سکتا تھا۔ غسل خانے میں بڑی بوا تھیں جو ہمارے محلے میں ہی رہتی تھیں اور ان کا کام ہی میت کو غسل دینا تھا۔ اماں، چچیاں اور تائی باہر تھیں۔ اس حصے میں کسی بچے کو یا لڑکی کو آنے کی اجازت نہیں تھی مگر میں تو سب سے چھپ کر آ گیا تھا۔ اماں کی نگاہ جوں ہی مجھ پر پڑی، وہ میری طرف لپکیں مگر اس سے قبل کہ مجھ تک

پہنچتیں، بڑی بوا کی کرب ناک چیخوں سے سارا گھر گونج اٹھا۔ عجیب سی بھگدڑ مچ گئی۔ اماں غسل خانے کی طرف لپکیں۔ چچیاں بھی ان کے پیچھے تھیں۔ مرد بھی سارے آداب لحاظ بھول کر اس حصے میں آ گئے۔ مہمانوں میں ہلچل مچ گئی۔ ہجوم نے مجھے رگید کر رکھ دیا۔ آنے والے بھاگے چلے آ رہے تھے اور اسی دوران میں، میں نے اماں اور چچیوں کو غسل خانے سے نکل کر بھاگتے اور چیختے دیکھا۔ وہ سب رہائشی حصے کی طرف بھاگ رہی تھیں۔

"کیا ہوا........؟"

"کیا ہے؟"

"ارے! بتاؤ تو........ کیا ہو گیا؟"

ایسی ہی بہت سی آوازیں تھیں جن سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ میں دیوار سے لگا کانپ رہا تھا تبھی میں نے اماں کو اندر کی طرف بھاگتے دیکھا۔ ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ابھی میں نکلنے کی کوشش کر رہا تھا کہ بڑی بوا کی خوفناک چیخ نے مجھے متجمد کر دیا۔ میری نگاہ غسل خانے کے دروازے پر پڑی جہاں سے آواز آئی تھی۔ سبھی اس طرف متوجہ ہو گئے۔ بڑا بوا کو دیکھ کر سب بدحواس ہو گئے۔ وہ دروازے کی چوکھٹ تھامے کھڑی تھیں بلکہ کھڑے رہنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ان کے جسم سے ہزاروں مکڑیاں چپٹی ہوئی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں گھسی ہوئی تھیں۔ خون باریک دھاروں کی شکل میں ان کے چہرے اور بدن سے بہہ رہا تھا۔ ان کا انگ انگ زخمی تھا اور آپ کو ایک حیرت انگیز بات بتاؤں؟ وہ سب مکڑیاں سنہرے رنگ کی تھیں۔ سنہری بیر بہوٹیوں ایسی۔ ان کے جسم کے بارک باریک بال سورج کی روشنی میں سونے کے تاروں کی طرح چمک رہے تھے۔ مجھے وہ کیڑے یاد آ گئے جو میں نے گھروندے سے چین نکالنے کے بعد کچھ فاصلے پر زمین میں کلبلاتے دیکھے تھے۔ اس سے زیادہ دیکھنے کی نہ مجھ میں تاب تھی اور لوگوں کے اس ہجوم نے جو بوکھلا کر اب واپس بھاگ رہا تھا، مجھے اور کچھ دیکھنے کی مہلت ہی نہیں دی۔ میں نے دادا اور چاچو وغیرہ کو اس طرف لپکتے دکھا تھا اور بس۔

☆==========☆==========☆

اس روز ہمارے گھر میں ہی نہیں، اس پورے محلے میں ہنگامہ ہو گیا۔ پولیس آئی۔ تحسین خالہ کو کیسے غسل دیا گیا، بڑی بوا کا کیا حال ہوا؟ وہ مکڑیاں کیسی تھیں اور کہاں چلی

گئیں‘ مجھے کچھ بھی معلوم نہیں ہو سکا۔

زہرہ آپا تو کئی بار بے ہوش ہوئیں۔ سب کی حالت یہ تھی کہ اگر کوئی کسی سے چھو جاتا‘ کوئی کپڑا ہوا سے لہرا کر کسی سے مس ہو جاتا تو کرب ناک چیخوں کا ایک طوفان لے آتا۔ خاندان کا ہر فرد ایک ہی کمرے میں تھا۔ دادا اور چاچو باہر تھے اور جانے کیا کر رہے تھے؟ اچانک انہوں نے آکر اماں سے کہا۔

"چلنے کی تیاری کرو۔ سب اپنی اپنی ضروری چیزیں لے لیں اور ہاں......... ہر چیز کو اچھی طرح جھاڑ کر رکھا جائے۔"

سب کے سفید چہرے خوف سے مزید سفید ہو گئے۔ میں اور فرحت حیران تھے۔ زین آنکھیں پھاڑے ساکت بیٹھا تھا۔ مجھے تو لگ رہا تھا کہ اس کے جسم کا لرزا اسے یقیناً ختم کر دے گا۔ مجھے تو اب اس کی آنکھیں بھی بھیگی لگ رہی تھیں۔ خوف نے جس قدر اس کا چہرہ مسخ کیا تھا‘ کسی اور کا نہیں۔ دادا کے اس حکم کے بعد کمرے میں ہلچل مچ گئی۔ زہرہ آپا کو ہم بچوں کے پاس چھوڑ کر سب عورتیں اٹھ گئیں۔

"آپا.........! ہم کہاں جا رہے ہیں؟" میں نے زہرہ آپا کو خلا میں گھورتے دیکھ کر پوچھا۔

"ہم......... دلی جا رہے ہیں۔ یہاں رہنا اب خطرے سے خالی نہیں رہا ہے۔" وہ کسی روبوٹ کی طرح بولیں۔

"کیوں.........؟ یہاں کیا ہو گیا؟" فرحت نے اپنے آنسو پونچھے تو مجھے احساس ہوا کہ وہ ابھی تک رو رہی ہے۔

"یہاں.........! یہاں تو اب........."

ابھی انہوں نے جملہ پورا نہیں کیا تھا کہ رضا بھائی نے انہیں ٹوک دیا۔ "آپا! بچوں کو کیوں ڈرا رہی ہیں۔"

"میں نہیں ڈرتا۔" میں نے کاندھے چوڑے کر کے کہا مگر انہوں نے مجھے گھور دیا۔ وہ شاید فرحت کے سامنے بات نہیں کرنا چاہتے تھے۔ میں چپ ہو گیا مگر میں نہیں جانتا تھا کہ آخر یہ بھونچال کیوں آیا ہے؟ ہم جو اچھے بھلے رہ رہے تھے‘ دلی کیوں جا رہے ہیں؟ میں چپکے سے اٹھ کر کمرے سے باہر چلا آیا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ تحسین خالہ اور بڑی بوا کا کیا ہوا؟ میں لوگوں کی نگاہیں بچا کر اس حصے میں پہنچ گیا جہاں غسل خانہ تھا۔ وہاں عجیب

سی ویرانی پھیلی ہوئی تھی۔ پتا نہیں‘ دادا اور چاچو وغیرہ کہاں تھے؟ میں چپکے چپکے آگے بڑھا۔ اس غسل خانے میں روشن دانوں سے آنے والی دھوپ اور روشنی میں مجھے ہر چیز واضح نظر آ رہی تھی۔ تحسین خالہ کا چہرہ گلابی تھا حالانکہ اب سے پہلے میں نے ان کے چہرے کو بالکل نیلا دیکھا تھا۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ سوائے تحسین خالہ کے ساکت جسم کے۔ تبھی مجھے لگا جیسے اس طرف کوئی آ رہا ہو۔ اب باہر نکلنے کا خطرہ مول لینا ٹھیک نہیں تھا اگر آنے والے دادا یا چاچو ہوتے تو یقیناً میری کھال ادھیڑ دیتے۔ میں لپک کر اس لکڑی کے تختے کے پیچھے ہو گیا جو وہاں دیوار کے ساتھ کھڑا تھا۔ یہ تختہ بھی بالکل ویسا ہی تھا جیسا تختہ اس وقت تحسین آپا کو لٹانے کے لئے استعمال کیا گیا تھا۔ میرے چھپتے ہی دادا وغیرہ غسل خانے کے قریب پہنچ گئے۔ وہ لوگ اندر نہیں آئے۔ ان لوگوں کے باتیں کرنے کی آواز مجھے صاف سنائی دے رہی تھی۔ دادا کہہ رہے تھے۔ "وہاب! دیکھو! ایمبولینس آتی ہوگی۔ تم بڑی بوا کو لے جانا۔ گھر کی کسی عورت کا ساتھ جانا مشکل لگتا ہے۔ وہ سب خوفزدہ ہیں۔ تحسین کے غسل کے لئے بی اماں کو بلوایا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ ٹھیک ہوئیں اور آ گئیں تو شاید میت کو اسپتال بھیجنے کی ضرورت بھی محسوس نہ ہو۔"

پھر وہاں بہت سے لوگوں کے باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ کوئی کسی سے پوچھ رہا تھا۔ "آخر یہ مکڑیاں تھیں کیسی؟ اب سے پہلے علاقے میں ایسی مکڑیاں نہیں دیکھی گئیں۔ ہمارا گھر تو بالکل کنارے پر ہے۔ آگے خودرو جھاڑیوں اور سرکنڈوں کا پورا کا پورا جنگل ہے۔ دنیا بھر کے کیڑے وہاں ہوتے ہیں مگر........."

"بڑی زہریلی ہیں۔ بڑی بوا کو جو خون کی الٹیاں ہوئی ہیں‘ وہ تک نیلی تھیں۔ الاماں.........! کتنا خوفناک واقعہ ہے۔ ایک زندہ عورت کو مکڑیوں نے کھا لیا۔ ارے! کہہ رہی تھیں کہ مجھے تو پتا ہی نہیں چلا۔ جانے کب اور کہاں سے آ گئیں؟"

"نہیں میاں! مجھے تو بتایا ہے انہوں نے راستے میں کہ تحسین کے غسل کے دوران اس کے پیٹ سے ایک مکڑی چمٹی ہوئی تھی۔ انہوں نے پہلے ہاتھ سے اسے جھٹکنا چاہا‘ جب وہ ہلی بھی نہیں تو پانی بہا کر ہٹانے کی کوشش کی تب احساس ہوا کہ اس کی باریک باریک ٹانگیں تحسین کے جسم میں پیوست ہیں۔ انہوں نے وہاں پڑی ایک لکڑی سے اسے وہیں مسل دیا اور پھر اسے غسل دینے لگیں مگر اچانک انہیں لگا جیسے ان کی پشت پر آگ کے شعلے لپک رہے ہیں۔ وہ بلبلا کر کھڑی ہو گئیں۔ ہاتھ پاؤں چلائے تو کچھ مکڑیاں

ان کے ہاتھوں سے چپک گئیں پھر دیکھتے ہی دیکھتے پورے بدن پر ہزاروں مکڑیاں چمٹ گئیں اور ان کا گوشت بھنبھوڑ ڈالا۔ بہت مشکل ہے کہ وہ بچیں۔"

بولنے والے دادا تھے اسی لئے یقین نہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں یہ سارا قصہ سن کر کانپ کر رہ گیا۔ لگا جیسے میری پشت پر بھی مکڑی رینگ رہی ہے۔ بے اختیار بلک کر وہاں سے نکل پڑا۔ میرا نکلنا تھا کہ سب بھونچکا رہ گئے۔ دادا نے لپک کر میرا بازو پکڑ لیا۔ "کہاں تھا تو...... کیا کر رہا تھا؟"

وہ دھاڑے۔ باقی لوگ دم بخود کھڑے مجھے دیکھ رہے تھے۔ اچانک دادا کو محسوس ہوا کہ میں بار بار کمر کی طرف ہاتھ لے جا کر کچھ جھاڑنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ انہوں نے لمحہ بھر کی دیر کیے بغیر میرا کرتا اتار کر دور پھینکا پھر مجھے گھسیٹتے ہوئے اندرونی حصے کی طرف لے چلے۔ اس سے قبل انہوں نے اطمینان کر لیا تھا کہ میرے جسم پر یا کپڑوں پر کوئی مکڑی تو نہیں ہے۔ انہوں نے میرا بازو بغل کے پاس سے اتنی زور سے جکڑ رکھا تھا کہ تکلیف سے میری سسکیاں نکل گئیں۔ ہم دونوں کے اندر داخل ہوتے ہی سب کی نگاہیں ہماری طرف اٹھ گئیں۔ اماں لپک کر آگے بڑھ آئیں۔

"کیا ہوا ابو جان!"

"سنبھال کر رکھو اپنی اس چھچھوندر کو۔ ہر جگہ گھستا پھرتا ہے۔" انہوں نے جھٹکے سے مجھے چھوڑ دیا۔ اماں سامنے نہ ہوتیں تو شاید میں بڑی زور سے زمین پر گرتا۔

"کہاں تھے تم؟" اماں نے مجھے جھنجوڑ دیا۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ معصوموں کی سی شکل بنا کر اماں کو اور باقی سب کو ٹکر ٹکر دیکھنے لگا۔

"اے! معصوم بچہ ہے۔ اسے کیا خبر؟ لو بی بی! بڑے میاں تو خیر تھے ہی غصے میں۔ تمہیں کیا ہوا؟" محلے کی ایک بڑی بی نے فوراً مجھے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ میں نے بھی جلدی سے ان کی بغل میں منہ چھپا لیا۔ ویسے اس وقت میں بے انتہا خوفزدہ تھا۔ بڑی بوا کے بارے میں سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو چکے تھے۔ ابھی میں انہی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ مہمانوں میں ہونے والی چہ میگوئیوں نے میری توجہ اپنی جانب مبذول کر لی۔ کوئی عورت سرگوشی کر رہی تھی۔

"تحسین آپا کو اسی زہریلی مکڑی نے کاٹا تھا۔ کیا پتا رات بھر یہ مکڑیاں ان کے جسم

سے بھی چپکی رہی ہوں۔"

"نہیں، ایسا تو نہیں لگتا۔ تم نے بڑی بوا کی حالت نہیں دیکھی؟ اگر رات بھر چپکی رہتیں تو یوں گوشت سلامت رہتا؟ بڑی بوا کو تو چھید کے رکھ دیا۔ ہاں، ممکن ہے کاٹا ہو۔"

"مجھے تو فرحت پر ترس آ رہا ہے۔ بے چاری معصوم! اب تو ماں بھی نہیں رہی۔ میرے خیال میں تو اب بی جان اسے یہاں نہیں رہنے دیں گی۔ پہلے بھی ان دونوں کو یہاں نہیں چھوڑنا چاہئے تھا۔ بھلا ان لوگوں سے کیا رشتہ تھا ان دونوں کا۔ بہن کے گھر کوئی یوں آ کر رہتا ہے۔"

فرحت کے ذکر پر میں ایک دم سب کچھ بھول گیا۔ ان بڑی بی کی گود سے نکل کر اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ اماں کو اچانک احساس ہوا کہ میں "ننگا" ہوں۔ رو رو کر ان کی حالت بری تھی۔ ابھی کچھ دن پہلے تو بیوہ ہوئی تھیں۔ اتنے سے دنوں میں بہن کی موت بھی دیکھ لی۔ مجھے سب کے درمیان میں "ننگا" کھڑا دیکھ کر وہ سب بھول کے کھڑی ہو گئیں۔ مجھے بلا کر کمرے میں پٹخا۔ عصمت آپا سے کہا کہ مجھے کرتا پہنائیں اور خود واپس چلی گئیں۔ فرحت وہیں کونے میں دبکی لیٹی تھی اور چھت کی کڑیوں کو دیکھ رہی تھی۔ زہرہ آپا بھی وہیں بیٹھی تھیں پھر وہ عصمت آپا سے وہیں رہنے کا کہہ کر چلی گئیں۔ عصمت آپا کے لئے ایک جگہ ٹکنا بہت مشکل تھا۔ وہ کسی سے ڈرتی ورتی بھی نہیں تھیں اس لئے مجھے کرتا پہنا کر چلی گئیں اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ گئیں کہ اگر اب انہوں نے مجھے باہر دیکھ لیا تو کچا چبا جائیں گی۔

پتا نہیں کیوں مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ واقعی ایسا کر سکتی ہیں۔ جانے کس بات کا غصہ تھا جو انہیں ہر وقت رہتا تھا۔ میں نے انہیں ہنستے مسکراتے یا نرم انداز میں بات کرتے کم ہی دیکھا تھا۔ یا چپ چپ رہتی تھیں یا کاٹ کھانے کو دوڑتی تھیں۔ خیر میں بتا رہا تھا کہ وہ مجھے کرتا پہنا کر باہر چلی گئیں۔ فرحت کو دیکھتے ہی مجھے وہ سونے کی زنجیر یاد آ گئی۔ میں یہ بھی سن چکا تھا کہ دادا نے دہلی جانے کا حکم دے دیا ہے۔ میرا خیال تھا کہ گھر کی عورتوں نے ایک طرح سے روانگی کی تیاری بھی مکمل کر لی تھی۔ کیونکہ میں نے کچھ ہی دیر پہلے سب کو بڑے برآمدے اور صحن میں آئے ہوئے لوگوں کے ساتھ بیٹھے دیکھا تھا۔ بی جان بھی آ چکی تھیں اور کاکا جان بھی۔ ان کے آنے پر ایک بار پھر واویلا مچا تھا۔ اب میں

دادو سے سن کر آیا تھا کہ اماں بی آ رہی ہیں۔ یہ اماں بی بڑی نیک خاتون تھیں۔ محلے کے بچوں کو قرآن پڑھاتی تھیں۔ ان کے گھر میں ہر جمعرات کو واعظ ہوتا تھا۔ جھاڑ پھونک بھی کیا کرتی تھیں بلکہ کچھ لوگوں نے تو یہ بھی اڑا رکھی تھی کہ ان کے قبضے میں جن ہیں کیونکہ وہ اکیلی رہتی تھیں۔ شوہر فوت ہو چکے تھے۔ اولاد کوئی نہیں تھی۔ اتنا بڑا گھر تھا جس میں اکیلی رہتی تھیں۔ دن بھر محلے کے ہر گھر جا کر قرآن کا درس دیتی رہتی تھیں پھر بھی ان کے آنگن میں بنی کیاری کا ہر پودا تازہ تھا جبکہ ان کے گھر میں پانی کی لائن بھی نہیں تھی اور محلے کے چند بچے کنستر بھر کر انہیں پانی پہنچایا کرتے تھے جو بقول لوگوں کے' ان کے ضروری کاموں کے لئے ہی مشکل سے پورا ہوتا ہوگا پھر جانے یہ لمبی لمبی کیاریاں کیسے پھل پھول رہی تھیں......... بہرحال......... بی اماں ضرورت پڑنے پر مُردوں کو غسل بھی دیا کرتی تھیں۔ بڑی بوا تو خیر کام ہی یہ کرتی تھیں مگر بی اماں صرف مجبوری میں فی سبیل اللہ ایسا کرتی تھیں۔

اب گھر کے لوگ ان کے منتظر تھے۔ بڑی بوا کو اسپتال پہنچا دیا گیا تھا اور دادا نے بی اماں کو بلا بھیجا تھا۔ تھوڑی دیر میں بی اماں آ گئیں۔ یہ میں نے سنا مگر دیکھنے باہر نہیں نکلا اس لئے کہ عصمت آپا واقعی مجھے کچا چبا ڈالتیں۔ مجھے فرحت سے ضروری بات کرنی تھی۔ مجھے اکیلے میں موقع مل گیا تھا۔ اس سونے کی زنجیر سے فرحت کو بھی یقیناً اتنا ہی لگاؤ تھا' جتنا مجھے تھا یہ اور بات ہے کہ اب اسے اپنے پاس رکھنا میری مجبوری بن چکا تھا۔ میں نے فرحت کو قریب بلا کر پوچھا۔ "فرحت! ہم دہلی جا رہے ہیں۔ کیا تم بھی ہمارے ساتھ جاؤ گی؟"

"پتا نہیں۔" اس نے اپنی بھیگی پلکیں جھپکا کر جواب دیا۔

"دیکھو فرحت! اگر تم نہیں گئیں تو پھر گڑیا کی شادی کا کیا ہوگا؟" میں نے اسے بہکانا چاہا مگر اتنا احساس تھا کہ بی جان اسے یہاں نہیں چھوڑیں گی۔ وہ تو ابا نے جانے کیا کہہ سن رکھا تھا کہ ان دونوں ہی کو روکے رکھا تھا پھر دادا نرم دل کے تھے۔ ان کی محرومی کو محسوس کرتے تھے مگر دادی کو فرحت یا تحسین خالہ ایک آنکھ نہیں بھاتی تھیں اور اس وجہ سے مجھے ڈر تھا کہ فرحت کو بی جان لے جائیں گی۔ گڑیا کی شادی کا سن کر فرحت اٹھ بیٹھی۔ لمحہ بھر کو اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔

"ہاں......... وہ تو میں بھول ہی گئی تھی۔"

"اچھا سنو!" میں اس کے اور قریب سرک آیا۔ دروازے کی طرف دیکھا جو بھڑا ہوا تھا۔ باہر سے باتیں کرنے اور سیپارے پڑھنے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ "میں سونے کی وہ خوبصورت چین اور سرخ جوڑا تمہاری گڑیا کو ہی دینا چاہتا ہوں مگر مصیبت یہ ہے کہ اگر گھر والوں نے میرے پاس وہ چین دیکھ لی تو وہ لے لیں گے اور پھر زین اور زینت بھی اس کے چکر میں ہیں۔"

یہ سن کر فرحت کے چہرے پر زردی پھیل گئی۔

"نہیں' تم گھبراؤ نہیں۔ وہ میں کسی کو نہیں دوں گا۔" میں نے اسے تسلی دی۔ اس بار وہ مجھ سے قریب ہو گئی۔ "میں نے وہ چین تمہارے کمرے میں صندوقچی میں چھپا کر رکھ دی ہے۔ اگر تم جاؤ تو اسے اپنے ساتھ لے جانا اور سنو! گڑیا کا وہ جوڑا اسی گھروندے میں دبا ہوا ہے۔ وہ بھی لے لینا۔ ان سب چیزوں کو بہت سنبھال کر رکھنا۔ میں جب بھی آیا' ہم گڑیا کی شادی کر دیں گے۔" میں نے جلدی جلدی اسے ساری بات سمجھا دی۔ وہ سن کر خوش ہو گئی تھی کہ میں شادی سے پہلے ہی سب کچھ اسے دے رہا ہوں۔ میرے دیئے ہوئے اعتماد نے اس میں عجیب سی بات پیدا کر دی۔ وہ شاید اپنی ماں کو بھی بھول گئی۔ ایسا چند لمحوں کے لئے ہوا مگر ہوا ضرور۔ اب مجھے اطمینان تھا کہ میں وہ وہاں سے چین نہ لے پایا تو فرحت اس کی حفاظت جی جان سے کرے گی۔ میں نے اسے سختی سے یہ بات سمجھا دی تھی کہ اس چین پر کسی کی نگاہ پڑ گئی تو وہ تمہارے ہاتھ سے نکل جائے گی اس لئے اسے ہمیشہ اس طرح چھپا کر رکھنا کہ اسے کوئی نہ دیکھ سکے۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اس کی حفاظت کرے گی اور مجھے یقین تھا کہ وہ ایسا ضرور کرے گی۔

جیسا کہ میرا خیال تھا کہ میں وہ چین ساتھ نہیں لے جا سکوں گا' وہی ہوا بھی' بی اماں تو آ گئی تھیں۔ تحسین خالہ کے جنازے کے اٹھتے ہی قیامت برپا ہو گئی۔ اماں' بی جان اور کانا جان کا حال برا تھا۔ فرحت بلک بلک کر پچھاڑیں کھا رہی تھی۔ وہ سب کچھ بھول چکی تھی۔ ایک ایسا ہنگامہ تھا جسے تھمتے تھمتے رات ہو گئی۔ رات کو ایک اور ہولناک اطلاع آ گئی کہ بڑی بوا بھی زخموں سے جانبر نہ ہو سکیں۔

پورا کا پورا گھر بڑی بوا کے دالان میں جا اترا۔ ان کی وہ بہویں بھی پچھاڑیں کھانے لگیں جو ان سے سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتی تھیں۔ وہ بیٹے جنھوں نے کبھی ان کی خیر خبر تک نہ پوچھی تھی' بھوں بھوں کی آواز کے ساتھ رو رہے تھے۔ ہم اس روز تمام

رات جاگتے رہے۔ دادا وغیرہ ہم سب کو بڑی بوا کے گھر سے جلدی لے آئے تھے۔ اماں وغیرہ بھی تھوڑی دیر کے بعد چلی آئیں۔ سنا تھا کہ بڑی بوا کو اسپتال ہی میں غسل دے کر کفنایا گیا تھا۔ ان کی حالت ایسی نہیں تھی کہ ان کی اولاد کو بھی ان کی صورت دکھائی جاتی۔ میت گھر میں آئی ضرور تھی مگر صرف تھوڑی دیر کو۔ مردوں نے فوراً ہی اٹھائی اور نماز کے لئے لے گئے۔ وہیں سے دفنا کر لوٹے۔ پے در پے ہونے والے ان واقعات نے ہمارے گھر کی شہرت میں بے پناہ اضافہ کر دیا۔ طرح طرح کے لوگ آ رہے تھے۔ پولیس بھی آئی۔ حفظ ماتقدم کے طور پر کچھ لوگوں کو بلوا کر گھر بھر کی تلاشی بھی لے ڈالی کہ کہیں ان مکڑیوں کا ٹھکانہ مل جائے۔ دواؤں کا اسپرے بھی کروایا۔ کچی زمین کی پہلی تہ ادھیڑی گئی مگر مکڑی کا بچہ تک نہیں ملا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مکڑیاں کہاں سے آئی تھیں۔ جو کچھ سنا اس سے اتنا پتا چلا کہ بڑی بوا جب چیختی دھاڑتی کمرے سے باہر آئی تھیں تو ان سے چمٹی مکڑیاں اچانک پھسل کر ان کے بدن سے اتر گئی تھیں پھر ان کی حالت دیکھ کر یوں بھی کسی کی آگے بڑھنے ہمت نہ ہوئی تھی۔ اسپتال سے ایمبولینس آنے تک وہ آنگن میں تڑپتی رہی تھیں اور جب انہیں ایمبولینس میں ڈالا گیا تو جسموں پر سوائے زخموں کے کچھ اور نہ تھا۔ اسپتال میں اس ایمبولینس کی خاص طور پر صفائی کروائی گئی تھی۔ ڈاکٹر دیکھنا چاہتے تھے کہ وہ کیسی مکڑیاں تھیں مگر ایک بھی نظر نہ آئی۔

جو کچھ گھر میں ہوا اس نے مجھ پر خوف طاری کر دیا تھا مگر سب سے زیادہ خوف مجھے اس وقت محسوس ہوا جب گھر کی تلاشی اور کھدائی کے چکر میں میرے بنائے ہوئے گھروندے سے گڑیا کا سرخ جوڑا نکلا۔ میں یہ سوچ کر ہی جی جان سے لرز گیا تھا کہ اگر میں نے بروقت وہ چیلن وہاں سے نہ نکالی ہوتی تو اس وقت میں دادا کے سامنے مجرموں کی طرح شاید الٹا لٹکا رہا ہوتا۔ وہ جوڑا مجھے زین نے لا کر دیا تھا۔ وہ ہکلا ہکلا کر مجھ سے چیلن کے بارے میں پوچھنا چاہ رہا تھا مگر میں نے اسے گھور دیا۔ پتا نہیں وہ کچھ سمجھا یا نہیں مگر ہونقوں کی طرح کھلا ہوا منہ بند کر کے چاروں طرف دیکھنے لگا تھا۔ میرا جی چاہا کہ میں اس کا سر دیوار سے دے ماروں اور وہ تربوز کی طرح تڑخ جائے۔ عصمت آپا میرے قریب ہی الماری سے ضروری چیزیں نکال کر بکسوں میں رکھ رہی تھیں۔ انہیں اگر بھنک بھی پڑ جاتی تو جانے کیا ہوتا۔

☆ ----------- ☆ ----------- ☆

ہم اس روز دہلی کے لئے روانہ نہ ہو سکے لیکن اس رات پورے گھر پر خوف طاری رہا۔ کہیں چیونٹی بھی رینگتی نظر آتی تو ہلچل مچ جاتی۔ کسی کے ہاتھ پر مکھی بیٹھ جاتی تو وہ اچھلنے لگتا۔ ایسا خوف میں نے پہلی بار دیکھا اور محسوس کیا تھا۔ دادا ہر جگہ اپنی موجودگی میں تلاشی لے رہے تھے۔ عورتوں کو سختی سے ہدایت کی تھی کہ ہر کپڑا جھاڑ کر رکھا جائے۔ وہاں سے پہلے الماریاں اور بکس کھول کر اسپرے کر دیا گیا تھا۔ سارے کپڑوں اور گھر کی ہر چیز میں اس دوا کی بدبو بیٹھ گئی تھی۔ مگر یہ بو شاید اس ہولناک موت کے مقابلے میں بہت بہتر تھی کہ لوگ اس سے الجھے نہیں۔ سارا گھر جاگ رہا تھا۔ بچوں کو سونے کے لئے لٹاتے ہوئے بے حد احتیاط لی گئی تھی۔ بستر کو کئی کئی بار جھاڑا گیا۔ پلنگوں کے پائے کچی مٹی کے کونڈوں میں پانی بھر کے اس کے اندر رکھے گئے تھے کہ کوئی مکڑی پائے کے ذریعے اوپر نہ چڑھ سکے۔ اتنے بڑے گھر کے ہر سوراخ اور ہر گڑھے میں دادا نے چونا بھروا دیا تھا۔ فرش پر چونا بکھیر دیا گیا تھا۔ عجیب افراتفری مچی ہوئی تھی۔ میں فرحت سے اکیلے میں بات کرنے کے چکر میں لگا ہوا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ اس کے کمرے کی تلاشی میں کہیں صندوقچی سے وہ چیلن نہ نکل آئے۔ میں اسے کہنا چاہتا تھا کہ وہ اسے کچھ دیر کے لئے نکال لائے۔ بعد میں اسے چھپا دیں مگر پتا نہیں فرحت کہاں تھی۔ میں اسے ڈھونڈتا ہوا تحسین خالہ کے کمرے میں پہنچ گیا جہاں وہ بی جان کی گود میں ان کے سینے سے سر ٹکائے آنکھیں موندے لیٹی تھی۔ کاکا جان کی ناک سرخ ہو رہی تھی۔ وہ بار بار رومال سے ناک رگڑ رہی تھیں۔ بی جان کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں مگر وہ خود پر قابو پائے ہوئے تھیں۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے فرحت کو پیار کر کے قریب بٹھا دیا اور بولیں۔

”لو! ضیا آ گیا! تم اس سے باتیں کرو۔ میں سامان سمیٹ لوں۔“

فرحت نے مجھے دیکھا پھر میری اور فرحت کی نگاہیں بی جان کا تعاقب کرنے لگیں۔ انہوں نے اور کاکا جان نے ہر کپڑا جھاڑ کر بکس میں رکھا۔ فرحت کی ضرورت کی چیزیں رکھیں پھر شاید کاکا جان کی نگاہ اسے چھجے پر پڑی جہاں سے وہ چھوٹی زنگ آلود صندوقچی نظر آ رہی تھی۔ وہ مسہری پر کھڑی ہو گئیں۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ میں نے فرحت کو کہنی ماری۔ وہ جلدی سے کھڑی ہو گئی اور بولی۔

”کاکا جان! وہ میری ہے۔ میری گڑیا کی۔“ فرحت نے دونوں ہاتھ پھیلا دیے۔

”اس نے دی تھی مجھے۔“

"ہائے میری بچی! ہائے میری چاند!" کاکا جان کی محبت تو بالکل اندھی تھی شاید۔ انہوں نے صندوقچی کھول کر مکڑی تلاش کرنے کی کوشش بھی نہیں کی اور صندوقچی فرحت کی طرف بڑھا دی۔ میری جان میں جان آگئی۔ فرحت نے تکیے کے نیچے رکھی ہوئی گڑیا نکال کر اس صندوقچی میں رکھ دی۔ میں نے جھانک کر اس چین کے متعلق اطمینان کرلیا تھا۔ میرے ہاتھ میں گڑیا کا سرخ جوڑا بھی تھا۔ وہ بھی فرحت نے مجھ سے لے کر اس صندوقچی میں رکھ دیا اور اس کے چہرے پر ایسا اطمینان پھیل گیا جیسے ان حالات کے بدلے سودا مہنگا نہ ہو۔ میرے اندر آیا ہوا بھونچال ایک دم سکون میں تبدیل ہوگیا۔ میں نے اشاروں ہی اشاروں میں سمجھا دیا کہ اسے وہ اپنی جان سے زیادہ سنبھال کر رکھے۔ ویسے میرا خیال ہے کہ یہ بات اسے سمجھانے کی ضرورت نہیں تھی۔

بی بی جان نے زیادہ سامان نہیں لیا تھا۔ تحسین خالہ کی کچھ چیزیں یادگار کے طور پر لے لی تھیں البتہ فرحت کا سارا ہی سامان سمیٹ لیا تھا۔ "بی جان! آپ بھی ہمارے ساتھ رہیں گی ناں دہلی میں؟"

"نہیں بیٹا! ہم اپنے گھر جائیں گے۔" کاکا جان نے افسردگی سے کہا۔

"بی جان! آپ بھی وہیں چلیں ناں! وہاں ماموں جان کے پاس رہ لیجئے گا۔"

"نہیں میرے چاند! اور تم کون سا ہمیشہ کے لئے جا رہے ہو! تم آ جانا میرے پاس۔" بی جان نے مجھے سینے سے لگا لیا۔ یہ بات میں نے اس وقت نوٹ کرلی تھی کہ ابا کے مرنے کے بعد سبھی مجھے بہت پیار کرنے لگے تھے۔ پتا نہیں' شاید اس کی وجہ میرا یتیم ہو جانا تھا۔ گویا اس لحاظ سے میں پہلے کی نسبت زیادہ بہتر پوزیشن میں آگیا تھا۔ خاص طور پر رضا بھائی اور شجاع بھائی کی ہر وقت کی ڈانٹ پھٹکار سے اب میری جان چھوٹ گئی تھی۔

ایک عصمت آپا تھیں جن کے انداز میں رتی برابر فرق نہیں پڑا تھا۔ خیر! یہ مجھے پتا چل گیا کہ بی جان ہمارے ساتھ دہلی نہیں جا رہیں اور فرحت کو بھی اپنے ساتھ اپنے گھر لے جا رہی ہیں۔ اس بات سے بڑا اطمینان مجھے یوں ہوا کہ اب چین کے یہاں سے برآمد ہونے کا خوف ختم ہو جائے گا۔ وہ میرے پاس ہوگی ہی نہیں تو برآمد کہاں سے ہوگی۔ دوسرا اطمینان مجھے یہ بھی تھا کہ فرحت اس کی حفاظت جی جان سے کرے گی۔ میں بے حد مطمئن ہوگیا تھا مگر اس کے باوجود پتا نہیں کیوں میرا دل گھبرا رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کچھ غلط ہو رہا ہے۔ کوئی ایسی بات جو جو سامنے نہیں آ رہی تھی' وہ مجھے بے چین کئے دے

رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ہی عصمت آپا مجھے تلاش کرتی ہوئی وہاں پہنچ گئیں اور حسب عادت میرا بازو پکڑ کر کھینچتے ہوئے مجھے اماں کے پاس لے جا کر پٹخ دیا۔

☆------------☆------------☆

گھر کی عورتیں سفر کی تیاری میں مصروف تھیں تو مرد عجیب پُراسرار سرگرمیوں میں۔ یوں لگتا تھا جیسے اس گھر میں ہزاروں برس پرانے کھنڈرات کھوجے جا رہے ہیں۔ میں دادا وغیرہ کی سرگرمیاں دیکھنا چاہتا تھا مگر خوفزدہ تھا کہ اگر اس بار بھی میں ان کے سامنے پڑ گیا تو وہ میرا بھرتہ بنا دیں گے۔ اب تک انہوں نے مجھے معصوم بچہ سمجھ کر چھوڑ دیا تھا۔ میرے خبیث ذہن تک تو ان کی پہنچ بھی نہیں تھی۔

ویسے اس چین کو ٹھکانے لگا کر میں خود کو کافی ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ میں اماں کے پاس لیٹا سب باتیں سن رہا تھا۔ یہ سب پریشان بھی تھے اور یہاں سے جانا بھی نہیں چاہتے تھے مگر خوف انہیں ٹکنے بھی نہیں دے رہا تھا۔ ہمیں ان سب کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ گھر کے لوگ ہی نہیں' محلے بلکہ علاقے والے بھی ان عجیب و غریب مکڑیوں کی کھوج میں تھے۔ دادا نے تو سرکاری سطح پر چھان بین پر بھی زور دیا تھا اور یہ واقعی سرکار کے لئے ایک چیلنج تھا۔ کسی علاقے میں اچانک ایسی زہریلی اور آدم خور مکڑیوں کا سینکڑوں کی تعداد میں نظر آنا اور پھر غائب ہو جانا' کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ ان کی وجہ سے ہونے والی پے در پے ان دو اموات نے سب پر لرزہ طاری کر دیا تھا پھر میں نے سنا کہ دادا ہمارے ساتھ نہیں جائیں گے بلکہ وہ یہاں سرکاری کارروائی میں مدد کریں گے۔ اس رات ریڈیو پر بھی یہ خبر سنائی گئی اور بالخصوص اس علاقے کو خبردار کیا گیا تا کہ مزید کوئی جانکاہ حادثہ پیش نہ آئے۔

گویا یہ واقعہ صرف ہمارے گھر کی ہی نہیں' پورے علاقے کی الٹ پلٹ ہو جانے کا سبب ٹھہرا۔ جس رات ہم دہلی کے لئے روانہ ہوئے' اس رات اسٹیشن پر بے پناہ رش تھا۔ لوگوں کے چہروں پر خوف منجمد تھا۔ وہ اپنے چاروں طرف ٹٹولتی ہوئی نگاہیں دوڑاتے یوں چل رہے تھے جیسے انگاروں پر چل رہے ہوں۔ عورتیں اچھے خاصے بڑے بچوں کو بھی گودوں میں اٹھائے ہوئے تھیں۔

مجھے بھی کئی بار اماں نے گود میں اٹھانا چاہا مگر میں ان بچوں کی طرح بے وقوف نظر

نظر نہیں آتا چاہتا تھا جن کی ٹانگیں ماؤں کی پنڈلیوں تک لٹکی ہوئی تھیں اس لئے پھسل کر ان کی گرفت سے نکل جاتا تھا۔ زین اپنی اماں کے گھٹنوں پر بیٹھا تھا۔ گو اس کے پاؤں زمین تک پہنچ رہے تھے اگر اس کے قریب کوئی مکڑی ہوتی تو اسے اوپر چڑھنے میں قطعی دشواری نہ ہوتی مگر وہ اور اس کی اماں دونوں مطمئن تھیں۔ میں نے کئی بار زین کو اپنے پاس بلانا چاہا مگر وہ نہیں آیا۔ وہ مجھ سے بھی اتنا ہی خوفزدہ لگ رہا تھا' جتنا کسی مکڑی سے۔

میں فرحت کے نہ آنے پر کافی اداس تھا۔ مجھے اپنی شخصیت میں کسی چیز کی کمی کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ جو ایک خاص قسم کا احساس تفاخر مجھ میں پیدا ہو گیا تھا' وہ بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مجھے فرحت کی آنکھیں بہت یاد آ رہی تھیں۔ پتا نہیں کیوں........؟"

شاید اس لئے کہ جب ہم گھر سے رخصت ہو رہے تھے' عین اس وقت دادا نے تانگہ منگا دیا تھا تاکہ بی جان وغیرہ بھی گھر چلی جائیں۔ فرحت ان کے ساتھ جا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں وہی صندوقچی تھی جس میں گڑیا' اس کے کپڑے اور وہ چھلن تھی۔ صندوقچی کو فرحت نے یوں سینے سے لگایا ہوا تھا جیسے اس میں اس کی زندگی کی سب سے بڑی اور قیمتی شے ہو۔ تانگے میں بیٹھتے ہوئے فرحت نے مجھ سے کہا تھا۔

"ضیا! تم جلدی سے آ جانا۔ گڑیا کی شادی بہت ضروری ہے اور میرا دل بھی نہیں لگے گا۔"

"سنو! خبردار! جو اس چھلن کے بارے میں کسی کو بتایا۔" میں نے اس کی التجا پر ذرا بھی دھیان دیے بغیر کہا۔ "اور یہ بھی یاد رکھنا کہ گڑیا میرے گڈے کی ہے۔ اگر تم نے اس کی شادی کہیں اور کر دی تو........ میں کپڑے اور چھلن واپس لے لوں گا۔ تمہاری گڑیا بھی توڑ دوں گا۔"

وہ سہم گئی۔ اس نے صندوقچی کو زیادہ مضبوطی سے پکڑ لیا اور گھبرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "نہیں ضیا! میں تمہارا انتظار کروں گی۔ کسی سے شادی نہیں کروں گی۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے گردن اکڑا کر جواب دیا۔

"پھر تم دیکھنا' ایسی ایسی بہت سی قیمتی اور اچھی چیزیں لاؤں گا میں دلی سے۔"

اس کا سارا خوف ایک دم ختم ہو گیا۔ وہ ہنسنے لگی بلکہ اس کا انداز مجھے ہنسانے والا تھا مگر میں قطعی نہیں ہنسا اور جب ہم اس تانگے میں سوار ہو گئے تو اس نے جانے کس انداز میں مجھے دیکھا کہ........ کہ میں اس کی آنکھیں بھول ہی نہیں سکا۔ اس کی آنکھوں میں بھرے آنسو بھی مجھے صاف نظر آ رہے تھے۔ انہی آنسوؤں کی وجہ سے ان میں چمک بھری ہوئی تھی۔ وہی آنکھیں مجھے دیر تک یاد آتی رہیں۔

☆-----------------☆-----------------☆

دادا جان سب کے ٹکٹ لے آئے تھے۔ ہم سب ٹرین میں سوار ہو گئے۔ ٹرین میں سوار ہونے کے بعد سب کا خوف کچھ کم ہو گیا۔ سب کے بچے گودوں سے اتر کر کھڑکیوں سے چمٹ گئے۔ میں نے اوپر والی برتھ پر قبضہ کر لیا۔ زین اور زینت اپنی اماں کے قریب ہی بیٹھے رہے۔ یہاں گرمی اور حبس تھا۔ شور تھا۔ طرح طرح کے لوگ تھے۔ ہزاروں آوازیں تھیں۔ ہزاروں بولیاں تھیں۔ کچھ لوگ ہمارے علاقے کے بھی تھے۔ شاید وہ ان مکڑیوں سے خوفزدہ ہو کر بھاگ رہے تھے۔

ٹرین چلی تو کچھ سکون ہوا۔ شجاع بھائی اور رضا بھائی نے مجھے زبردستی کھینچ کھانچ کر نیچے اتار دیا اور خود برتھ پر قبضہ کر لیا۔ میں کچھ دیر روتا رہا پھر کھڑکی کی جگہ مل جانے پر خاموش ہو کر باہر کے مناظر سے لطف اندوز ہونے لگا۔ اماں اور دادی مسلسل کچھ نہ کچھ پڑھ پڑھ کر سب پر دم کر رہی تھیں۔ عصمت آپا اور زہرہ آپا لائے ہوئے سامان کو ٹھیک سے رکھ رہی تھیں۔ ایک بات بتانا شاید میں بھول گیا کہ ہم دلی اس لئے جا رہے تھے کہ وہاں دادا کے چھوٹے بھائی یعنی منے دادا رہا کرتے تھے۔ قرول باغ میں ان کا تین منزلہ مکان تھا۔ دو بیٹے تھے۔ دونوں قالینوں کا کام کرتے تھے۔ ایک بیٹا شادی شدہ تھا۔ دوسرا شادی سے متنفر تھا۔ سنا تھا کہ کئی جگہ بات چیت چلائی گئی مگر اس نے بار بار انکار کر دیا۔ اس تین منزلہ گھر میں صرف چار افراد تھے اور یہ چاروں یعنی منے دادا' منی دادی اور یہ دونوں بیٹے یعنی طاہر اور ناصر' عمارت کے نچلے حصے میں رہتے تھے۔ اوپر کی دونوں منزلیں خالی تھیں۔ دادا نے ان لوگوں سے رابطہ کر کے سب کچھ بتا دیا تھا۔ منے دادا کی ہی تجویز پر ہم سب وہیں جا رہے تھے۔ دادی بھنائی ہوئی تھیں۔ ان کی منی دادی سے ذرا نہیں بنتی تھی۔

میری دادی میں بے پناہ غرور اور طرم خانی تھی۔ ان کی کم ہی کسی سے بنتی تھی۔ اماں تو خیر اللہ میاں کی گائے تھیں مگر میری دونوں چچیاں بولنا اور منوانا جانتی تھیں۔ اس زمانے میں آج جیسی تو تکرار تو نہیں ہوا کرتی تھی۔ بات کہنے اور منوانے کا اپنا ایک الگ

طریقہ ہوا کرتا تھا۔ وہ دونوں ایک حد تک ان کا احترام بھی کرتی تھیں مگر ان دونوں نے اپنے شوہروں کو اپنی حیثیت کا بھی احساس دلائے رکھا تھا۔ دادی اگر کبھی کسی بہو کی شکایت کسی بیٹے سے کیا کرتی تھیں تو وہ دونوں ابا کی طرح چھن کا ڈھے ان کے سروں پر نہیں پہنچ جایا کرتے تھے بلکہ دادی کو کسی طور ٹھنڈا کرنے کے بعد سہولت اور نرمی سے بیویوں کو سمجھا دیتے تھے۔ جس کی وجہ سے فساد نہیں ہوتا تھا۔ اماں اپنی بے وقوفی کی بنا پر ہی دادی کی منظور نظر بن چکی تھیں اس لئے ان دونوں میں کبھی کھینچا تانی نہیں ہوئی اور کھینچا تانی ہوتی بھی کس پر' بیٹا تو نہ بیوی کا تھا نہ اماں کا۔

ہاں' تو میں بتا رہا تھا کہ ہم سب ٹرین کی روانگی کے بعد اپنی اپنی جگہوں پر جم چکے تھے۔ عصمت آپا اور زہرہ آپا نے سامان ٹھیک سے رکھ دیا تھا۔ اماں کھانا نکالنے کی تیاری کر رہی تھیں۔ مجھے ٹرین میں کھانا کھانے کا بڑا مزہ آتا ہے۔ میں منتظر تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی ہم سب کھانے کھا رہے تھے۔ کھانے سے فارغ ہو کر میں سب سے پہلے کھڑکی میں جا بیٹھا۔ شام دھیرے دھیرے پھیل رہی تھی۔ دھوپ کی تمازت مٹی میں جذب ہو رہی تھی۔ پیڑوں کے سائے لمبے اور ٹھنڈے ہوتے جا رہے تھے۔ ٹرین بہت آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ باہر کا منظر مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ میں بھاگتے منظروں پر نظر ٹکانے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔

سفر بہت لمبا تھا۔ ابھی ہمیں رات بھر سفر کرنا تھا اماں کھانے نکالنے کے بعد سب کے لیٹنے کا بندوبست کرنے لگیں۔ یہ بھی بتاتا چلوں کہ یہ پوری بوگی یا ڈبا کہہ لیں' ہماری تھی یعنی وہاب چاچو نے پوری بوگی بک کرائی تھی۔ اماں نے مجھے لیٹنے کے لئے کہا تو میں نے صاف انکار کر دیا۔ دونوں چچیاں پارٹیشن کے دوسری طرف چلی گئیں۔ وہ اس جگہ کم ہی رہتی تھیں' جہاں دادی ہوں۔ عصمت آپا دوسری طرف کھڑکی کے پاس جا بیٹھیں۔ زہرہ آپا' اماں کے گھٹنے سے ٹک کر نیچے ہی لیٹ گئیں۔ دادی بھی وہیں لیٹی ہوئی تھیں۔

دادی اور اماں میں جانے کب کھسر پھسر شروع ہو گئی۔ زین اور زینت بھی دوسری طرف چچی کے پاس جا چکے تھے۔ زینت تو خیر چھوٹی تھی مگر مجھے زین پر حیرت ہو رہی تھی۔ وہ نہ معلوم کیوں مجھ سے اکھڑا ہوا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے تحسین خالہ اور بڑی بوا کو میں نے مارا ہو۔ میں نے کئی بار اسے اپنے پاس بلایا مگر وہ نہیں آیا۔

اس کا یہ رویہ مجھے تنہائی کا بے پناہ احساس دلا رہا تھا۔ فرحت اتنی ہی شدت سے

یاد آ رہی تھی۔ مجھے یہ افسوس بھی تھا کہ تحسین خالہ کے بعد وہ بالکل اکیلی رہ گئی ہے۔ میں فرحت کو یاد کرنے لگا۔ اس کا چہرہ مجھے کھڑکی کے باہر فضاؤں میں تیرتا محسوس ہو رہا تھا۔ میں جانے کب تک اسی کیفیت میں رہا۔ چاروں طرف گہرا اندھیرا چھا گیا۔ اس روز...... اس لمحے مجھ پر ایک حیرت انگیز انکشاف ہوا۔ وہ یہ کہ میں گھپ اندھیرے میں بھی [illegible] تک ہر چیز کو بہت واضح دیکھ سکتا ہوں۔ شروع میں تو مجھے اپنی صلاحیت کا قطعی احساس نہیں ہوا بلکہ یہ خیال ہی نہیں آیا کہ میں جو مناظر دیکھ رہا ہوں' وہ اندھیرے میں ڈوبے ہوئے ہیں یا جو چیز مجھے نظر آئی ہے' وہ مجھ سے بہت دور ہے لیکن اتنا تھا کہ میں بے دھیانی میں سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

ٹرین کسی وجہ سے بہت آہستہ ہو گئی تھی پھر وہ رک گئی۔ یہ ایک سنسان علاقہ تھا۔ شاید آگے کوئی اسٹیشن تھا۔ ٹرین کے رکتے ہی شدید گرمی کا احساس ہوا۔ وہاب چاچو' جو نماں سے پان لینے اس طرف آئے تھے' آگے بڑھ کر کھڑکی تک آ گئے۔ انہوں نے سر کھڑکی سے باہر نکال کر جھانکا اور بڑبڑائے۔

"یہ کون سی جگہ ہے؟" پھر انہوں نے دائیں طرف' جدھر ٹرین جا رہی تھی' نگاہ کی اور بولے۔ "ہاں اسٹیشن آ رہا ہے۔"

یہ سنتے ہی میں نے ان کی بغل میں سے سر جھکا کر باہر کی طرف نکال لیا اور اسی سمت دیکھنے لگا۔ وہ اسٹیشن ہی تھا۔ دور سے بلب روشن نظر آ رہے تھے۔ آبادی کے آثار تھے۔ میری نگاہ اسٹیشن شروع ہونے سے قبل زمین میں نصب ایک بورڈ پر پڑی۔ "ہاں چاچو......! وہ دیکھیں......! وہ لکھا ہے اناؤ۔" میں نے ہاتھ نکال کر انگلی سے اشارہ کیا۔ چاچو میرے اوپر سے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے چونک کر مجھے دیکھا۔

"تمہیں لکھا ہوا دکھائی دے رہا ہے؟" ان کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ہاں......! وہ دیکھیں ناں......! اس سفید بورڈ پہ' اس پر نیلے رنگ سے لکھا ہے۔ دیکھیں تو......" مجھے اس وقت احساس نہیں تھا کہ اسٹیشن بہت دور ہے اور یہاں سے اس بورڈ کو دیکھنا ہی بہت دشوار ہے جبکہ میں اس پر لکھا ہوا بھی صاف صاف پڑھ رہا تھا۔ وہاب چاچو نے چند لمحے میری طرف حیرت سے دیکھا پھر شاید سوچا ہوگا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ کسی سے پوچھ چکا ہوں کہ یہ کونسا اسٹیشن ہے یا پتا نہیں انہوں نے کیا سوچا۔ وہ مجھے عجیب سی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے چلے گئے۔

میں سر نکال کر اسٹیشن کی طرف دیکھتا رہا۔ وہاں بڑی گہما گہمی تھی۔ دور ٹھیلے پر رکھی کچوریاں صاف دکھائی دے رہی تھی بلکہ آلو کے ساگ سے بھاپ اٹھتی ہوئی بھی دکھائی دے رہی تھی۔ میں جلدی سے اماں کے پاس آیا۔ ان سے ضد کی کہ اسٹیشن آتے ہی وہ مجھے کچوریاں لے کر دیں۔ اماں نے اچھا کہہ کر مجھے بہلا دیا۔ میں پھر کھڑکی میں جا بیٹھا اور اسٹیشن کی رونق کو دیکھتا رہا۔

میں نہیں جانتا تھا کہ مجھ میں یہ صلاحیت کیسے اور کب پیدا ہو گئی؟ اس کا علم جب مجھے ہوا' وہ واقعہ بھی کم حیرت انگیز نہیں مگر وہ واقعہ بھی میں اپنے وقت پر سناؤں گا۔ ہاں!........ تو میں پھر اسٹیشن کی طرف دیکھنے لگا۔ میں اس رونق سے بالکل اس طرح لطف اندوز ہو رہا تھا جیسے اسٹیشن پر کھڑی ٹرین میں بیٹھے لوگ ہوتے ہیں۔ کچھ دیر میں ٹرین نے پھر رینگنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد ہم اناؤ اسٹیشن کی حدود میں داخل ہو گئے۔ ٹرین کے رکنے کے بعد وہاب چاچو نیچے اتر گئے۔ انہوں نے عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھا اور آگے بڑھ گئے۔

اماں نے سب کو کچوریاں لے کر دیں۔ مجھے بڑا مزہ آیا۔ ٹرین یہاں آدھے گھنٹے تک کھڑی رہی۔ ٹرین چلتے ہی مجھے نیند آنے لگی۔ میں بیٹھے بیٹھے تھک گیا تھا مگر جگہ چھوڑنے کو تیار نہ تھا۔ جانے کب نیند سے اونگھنے لگا۔ اماں نے مجھے وہیں لٹا دیا اور میں بے خبر سو گیا۔

اس روز میں نے بڑا بھیانک خواب دیکھا اور پھر وہی خواب میری تمام زندگی پر چھا گیا۔ بڑے راز منکشف ہوئے جنہیں آنے والے وقت نے دھندلایا نہیں بلکہ حقیقت کی شکل میں سامنے لا کر کھڑا کر دیا۔ میں نے دیکھا کہ میں ایک اندھیرے اور سنسان راستے پر اکیلا چلا جا رہا ہوں۔ مجھے ایک خاص سمت میں آگے بڑھنا ہے' اس کا مجھے شدت سے احساس ہے اور مجھے کسی خاص جگہ پہنچنے کی بھی بہت جلدی ہے۔ میں اس گھور اندھیرے میں بھی بڑے اطمینان اور اعتماد کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ اندھیرا مجھے نظر آ رہا تھا مگر میرے راستے میں حارج نہیں تھا۔ میں سب کچھ بالکل صاف دیکھ رہا تھا۔

میں جس راستے پر چل رہا تھا' وہ کسی گھنے جنگل میں بن جانے والے راستے جیسا تھا۔ ٹیڑھا میڑھا۔ چاروں طرف خودرو جھاڑیاں' اونچے اونچے' موٹی موٹی شاخوں اور بھدے بھدے تنوں والے درخت تھے۔ ان میں پرندوں کے پھڑپھڑانے اور کبھی کبھی ان

کے بولنے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں لیکن میں قطعی خوفزدہ نہیں تھا۔ میری رفتار حیرت انگیز حد تک تیز تھی۔ اچانک مجھے کہیں دور جلتی ہوئی روشنیوں کا احساس ہوا اور اچانک وہ جنگل ختم ہو گیا۔ اب میں ایک نسبتاً چوڑے راستے پر نکل آیا تھا اور پھر میں نے کچھ فاصلے پر ایک قبرستان دیکھا۔

یہ عیسائیوں کا قبرستان تھا۔ بے حد صاف ستھرا' چوڑی چوڑی روشوں اور پکی قبروں والا۔ اس کا احاطہ سرخ اینٹوں کا تھا۔ اس دیوار کے باہر بڑی ترتیب سے درخت لگے تھے۔ سفید رنگ کا بڑا سا اونچا گیٹ تھا۔ میں اسی رفتار سے اس قبرستان کی طرف بڑھ گیا۔ گیٹ کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی میں نے کسی گاڑی کے انجن کی آواز سنی۔ میں جس طرف تھا' وہاں ایک ٹوٹی ہوئی دیوار تھی۔ یہ دیوار میرے قریب تھی۔ میں آواز سن کر اس دیوار کے پیچھے دبک گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں انجن کی آواز اور قریب آتی محسوس ہوئی اور ساتھ ہی پورا راستہ روشنی میں نہا گیا۔

میں نے دیکھا' وہ ایک بڑی اور لمبی اسٹیشن ویگن تھی۔ اس کا رنگ سیاہ تھا۔ وہ رینگتی ہوئی اس گیٹ کے اندر داخل ہو گئی۔ مجھے ایسا لگا جیسے کوئی جلدی سے اندر جانے کو کہہ رہا ہے۔ میں تیزی سے نکلا اور گیٹ کے اندر داخل ہو گیا۔ اندر داخل ہوتے ہی میں روش کے دونوں اطراف لگے درختوں میں ایک طرف ہو گیا اور انہی درختوں کی آڑ لیے آگے بڑھنے لگا۔ ایک جگہ جا کر میں رک گیا۔ وہ گاڑی بھی رک چکی تھی پھر اس گاڑی کا پچھلا دروازہ کھلا۔ یہ حصہ عین میرے سامنے تھا۔ جونہی دروازہ کھلا' اس میں سے اترتے شخص کو دیکھ کر میں بری طرح چونک اٹھا۔ وہ وہی انگریز تھا جو ابا کی موت پر شجاع بھائی سے باتیں کر رہا تھا اور اصرار کر رہا تھا کہ اسے وہ سونے کی زنجیر چاہیئے۔

اسے دیکھ کر میں چوکنا ہو کر بیٹھ گیا مگر اس وقت پھر اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ جب میں نے اس شخص کے پیچھے ہی ابا کو گاڑی سے نکلتے دیکھا۔ اگر مجھے سب کچھ واضح نظر نہ آ رہا ہوتا تو میں کبھی ابا کو ان کے حلیے سے نہ پہچانتا۔ وہ کالے رنگ کی چست پتلون اور ٹی شرٹ میں ملبوس تھے۔ ہمارے یہاں اس طرح کا لباس نہیں پہنا جاتا تھا اسی لئے میں انہیں اس حلیے میں دیکھ کر حیران تھا مگر ابھی حیران ہونے والی بہت سی باتیں باقی تھیں۔ میں جو کھڑا ہو گیا تھا پھر دبک گیا۔ اب وہ لوگ اس گاڑی سے ایک تابوت کو باہر لا رہے تھے۔ میں دم سادھے یہ ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔

تابوت سیاہ لکڑی کا تھا جس کے کنارے سنہرے رنگ کے تھے۔ یہ ب
خوبصورت اور قیمتی تابوت تھا۔ تابوت کو باہر لا کر وہ لوگ چاروں طرف دیکھتے ہوئے ا
طرف بڑھ گئے۔ میں اگر درختوں سے نکلتا تو انہیں صاف نظر آ جاتا جبکہ وہ مجھ سے
فاصلے پر پہنچ جانے کے باوجود صاف نظر آ رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اس طرف
گئے جہاں میرے اور ان کے درمیان گاڑی آ گئی۔ میں لپک کر باہر نکلا اور گاڑی کی آڑ
کھڑا ہو گیا۔ اب وہ سب پھر میری نگاہ میں تھے۔ گہرے سناٹے میں ان کے بوٹوں کی
سی دھمک بڑی خوفناک لگ رہی تھی۔ وہ چاروں سایوں کی شکل میں آگے بڑھ رہے
پھر ایک کھدی ہوئی قبر کے نزدیک وہ لوگ رک گئے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے انہوں
تابوت کو قبر میں اتار دیا۔ زمین برابر کر دی۔ ایک شخص گاڑی تک آیا۔

میں رینگ کر گاڑی کے نیچے چلا گیا۔ اس کی ٹانگیں مجھے نظر آ رہی تھیں پھ
ٹانگیں مجھ سے دور ہو گئیں تو میں دوبارہ نیچے سے نکل آیا۔ میں نے دیکھا وہ شخص پھول
کا گلدستہ لئے قبر کی طرف بڑھ رہا تھا جبکہ باقی لوگ وہیں کھڑے تھے۔ سب کی نگاہیں
کے ہاتھ پر جمی ہوئی تھیں اور......... اور جب مجھے ابا کی ہتھیلی نظر آئی تو میں بھونچکا
گیا۔ ان کی ہتھیلی پر وہی سونے کی زنجیر دھری تھی جو میں فرحت کو دے آیا تھا۔ ان
انگلیوں کی پوروں پر کہیں کہیں مجھے سرخ دھبے بھی نظر آ رہے تھے۔ لمحہ بھر کو میں بو
گیا پھر مجھے خیال آیا کہ میں تو خواب دیکھ رہا ہوں۔

ابا وہ زنجیر سب کو دکھا رہے تھے اور سب کی نگاہوں میں اشتیاق تھا یقین کر
سیماجی! کہ میں اس وقت اتنی دور سے' اتنی رات میں بھی ان کے چہروں کے تاثرات ا
آنکھوں کے تاثرات صاف دیکھ رہا تھا۔ بالکل اس طرح محسوس کر رہا تھا جیسے میں آج
اور محسوس کر سکتا ہوں۔ میں نے ان لوگوں کے چہروں پر بیک وقت' خوف' اشتیاق
مندی اور جوش دیکھا تھا پھر اس شخص نے تازہ پھولوں کا گلدستہ اس تازی قبر پر رکھ دیا
ان چاروں میں صرف ابا مسلمان تھے۔ دوسرا وہ انگریز تھا جس کا نام غالباً رابرٹ تھا۔ ا
سکھ تھا اور چوتھا ہندو۔

ان چاروں نے اپنے اپنے انداز میں دعائیہ کلمات ادا کئے۔ ابا نے یقیناً سورۃ فا
پڑھی ہوگی پھر چاروں پلٹ کر گاڑی کی طرف آنے لگے۔ میں دوڑ کر درختوں کی آڑ
ہو گیا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ سب گاڑی میں بیٹھے۔ وہ چاروں خوش تھے۔ ہنس ر

تھے اور کسی ایلن کا ذکر کر رہے تھے۔ انہیں ڈر تھا کہ ایلن ان سے کچھ پوچھے گی اور وہ
وگ آپس میں طے کر رہے تھے کہ اسے کیا کہنا ہے' میں نے سب کچھ سنا تھا مگر دھیان
نہیں دیا۔ گاڑی ریورس ہوئی پھر گیٹ سے نکلتی چلی گئی۔ آخری بار بھی مجھے ان سب کے
ہنسنے کی آواز آئی۔

گاڑی کے جاتے ہی وہاں سناٹا گہرا ہو گیا۔ میں ساکت کھڑا تھا۔ میرا ذہن بالکل خالی
تھا۔ مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ اب مجھے کہاں جانا ہے؟ کیا کرنا ہے تبھی مجھے کسی نے پکارا۔
آواز بہت مدھم اور کرب میں ڈوبی ہوئی تھی۔ میں جلدی سے اس درخت کی آڑ میں سے
نکل آیا۔ آواز دوبارہ آئی۔ کہیں سے خشک جھاڑیوں کے چرمرانے کی آوازیں یوں ابھری
جیسے کوئی ان جھاڑیوں پر گھسٹ رہا ہو۔ میں چوکنا ضرور ہو گیا مگر خوفزدہ نہیں ہوا۔

اب میں نے چاروں طرف دیکھنا شروع کیا۔ گہرے اندھیرے کے باوجود ہر چیز واضح
نظر آ رہی تھی مگر میں اس وجود کو نہیں پا سکا جس کی آہٹ مجھے محسوس ہوئی تھی۔ وہ
یہیں کہیں تھا۔ اس کا مجھے یقین تھا۔ گھسٹنے کی آوازیں اب بھی آ رہی تھیں۔ میں چند قدم
آگے بڑھ آیا۔ پتا نہیں' وہاں کوئی گورکن تھا یا نہیں مگر مجھے اس کی قطعی فکر نہیں تھی۔
میں اب قبروں کی طرف بڑھنے لگا اس لئے کہ اس طرف سے تو کہیں بھی جھاڑیاں نظر
نہیں آ رہی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ شاید قبروں کے دوسری طرف یا دور نظر آنے والی
دیوار کے قریب کہیں ہوں۔ میں روش کو عبور کر کے اسی قبر کے نزدیک پہنچ گیا جہاں ابھی
ابا نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر تابوت دفنایا تھا۔ میں چند لمحے کھڑا اس پر رکھے
گلدستے کو دیکھتا رہا پھر آگے بڑھنے لگا مگر ٹھٹک کر رک گیا۔ مجھے پھر کسی نے پکارا تھا۔
باقاعدہ میرا نام لے کر مجھے آواز دی۔ وہ آواز سو فیصد کسی عورت کی آواز تھی اور وہ
عورت یقیناً سخت تکلیف میں تھی۔ یہ آواز مجھے اپنی پشت پر سے آتی محسوس ہوئی تھی
اس لئے میں پھر پلٹ گیا۔

"ضیاء......... ! ضیاء......... ! ضیاء......... !" اس بار میرا نام ایک تسلسل سے پکارا گیا
شاید یہ بازگشت تھی مگر کھلے قبرستان میں کسی آواز کی گونج کا کوئی سبب نہ تھا۔ میں نے
ان آواز کی سمت کی طرف نگاہ دیئے۔ کچھ سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ آواز کہاں سے آ رہی
ہے؟ میں پاگلوں کی طرح چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ ساتھ ساتھ میں ایک دائرے کی شکل
سا گھوم بھی رہا تھا۔ مجھے چکر آ گئے۔ کھڑا رہنا دوبھر ہو گیا۔ میں بے ساختہ وہیں بیٹھ گیا۔

میں نے اس قبر کے سرہانے سے ٹیک لگائی۔ عین اسی وقت میری نگاہ سامنے کی طرف اٹھی۔ دور ایک روشن کمرا دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ یہ کمرا مجھے اب تک نظر نہیں آیا تھا۔ شاید اب سے پہلے اس میں اندھیرا تھا اس لئے میرا دھیان اس طرف نہیں گیا تھا۔

نہ معلوم کیوں میں اسی طرف چل دیا۔ ایک خیال یہ بھی آیا کہ شاید مجھے تو یہاں سے دی گئی ہو۔ میں کمرے کے نزدیک پہنچا۔ کوئی آہٹ' کوئی آواز نہ تھی۔ اندر بلب جل رہا تھا جس کی روشنی کھڑکیوں اور روشن دان سے باہر آ رہی تھی۔ چار اونچی سیڑھیوں کے بعد چھوٹا سا حصہ تھا پھر آگے دروازہ تھا جو بند تھا۔ کھڑکیوں پر پردے نہیں تھے مگر ان پر لگے شیشے پتا نہیں کیسے تھے کہ میں نے ان شیشوں سے منہ لگا کر اندر دیکھنا چاہا مگر کچھ دکھائی نہ دیا۔ دروازہ ہلکے ہلکے بجایا مگر کسی نے دروازہ نہ کھولا۔

میں تھک کر واپس چل پڑا۔ اب جھاڑیوں کے جھرمٹ کی آواز بھی آنا بند ہو گئی تھی۔ مجھے بھی کسی نے نہیں پکارا تھا پھر بھی میں نے قبر کے قریب جا کر ہلکے سے کہا۔

"کون ہے......؟ کون ہے؟ میں......... میں ضیاء ہوں....... کون ہے؟"

مگر جواباً خاموشی اور گہری ہوتی محسوس ہوئی۔ میں اسی قبر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اچانک میری نگاہ اس گلدستے پر پڑی جسے ابا وغیرہ نے وہاں رکھا تھا۔ میری آنکھیں پھٹی پھٹی رہ گئیں۔ ہزاروں سنہری اور نرم چمکتے ہوئے بالوں والی مکڑیاں اس پر چمٹی ہوئی تھیں۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے ان مکڑیوں نے گلدستے سے الگ ہونا شروع کر دیا۔ میں اچھل کر دور جا کھڑا ہوا۔ وہ مکڑیاں دھیرے دھیرے اس قبر کے چاروں طرف پھیل گئیں۔ میں ساکت کھڑا دیکھ رہا تھا۔ اس وقت مجھے خوف بھی محسوس ہوا' مجھے بڑی بوا یاد آگئیں اور یہ بھی خیال آگیا کہ یہ مکڑیاں آدم خور ہیں۔ میں پھر اچھل کر ایک طرف ہو گیا۔ اس وقت مجھے اپنی پشت پر کوئی چیز رینگتی ہوئی محسوس ہوئی۔ بے ساختہ میرا ہاتھ اپنی پشت پر چلا گیا اور ساتھ ہی میرے حلق سے چیخ نکل گئی۔

☆=============☆=============☆

"کیا ہوا......... کیا ہے؟" یہ اماں تھیں جو میری ہی سیٹ پر دوسری طرف سر رکھے لیٹی ہوئی تھیں۔ میری آنکھ کھل گئی تھی مگر پشت پر کسی کیڑے کے رینگنے کا احساس اب بھی تھا۔ میں کھڑا ہو کر ناچ گیا۔ میری چیخ سے سب اٹھ کر آگئے۔ اماں بوکھلا کر میری قمیض کے نیچے ہاتھ ڈال کر جھاڑنے لگیں۔ اس دوران میں وہاب چاچو نے میری قمیض

اتار دی۔ سب خوفزدہ ہو گئے۔ سب کی نگاہیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ سب کے چہروں پر خوف تھا۔

میں اتنی دیر میں ہوش میں آچکا تھا۔ مجھے سب کچھ یاد آگیا تھا۔ اماں وغیرہ نے سب کپڑے جھاڑ کر چیک کر لئے تھے۔ لوگ مضطرب ہو چکے تھے۔ مجھے قرار آگیا تھا مگر خواب پوری جزئیات کے ساتھ یاد آ رہا تھا۔ اماں مجھے لپٹانے کی کوشش کر رہی تھیں مگر میں کھڑکی کی طرف سرک کر باہر دیکھ رہا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میرے سامنے اسی قبرستان کا منظر پھیلا ہوا ہو۔ جو لوگ جاگ گئے تھے' وہ چائے مانگ رہے تھے۔ عصمت آپا بڑبڑاتی ہوئی سب کو چائے دینے لگیں۔

"اچھا بھلا سویا ہوا تھا۔ سب کو پریشان کر دیا۔" انہوں نے مجھے کھا جانے والی نگاہوں سے گھور کر کہا۔ "ہاتھی گھس گیا تھا تیری قمیض میں!"

"نہیں! مکڑی گھس گئی تھی۔ وہی جو بڑی بوا کو کھا گئی۔" میں نے جل کر کہا۔

اماں' جو مجھے بہت ہی بچہ سمجھتی تھیں' فق ہو کر مجھے دیکھنے لگیں۔ "مکڑی کیوں کھانے گی انہیں۔ اجل آئی تھی' لے گئی۔" وہ بوکھلا کر بولیں۔ وہ لوگ شاید اس موضوع ہی کو بھول جانا چاہتی تھیں۔

ایک اماں ہی کا کیا' سب کے چہرے فق ہو گئے تھے۔ عصمت آپا نے کچکچا کر مجھے دیکھا۔ اماں نے جھاڑ دیا۔ شجاع بھائی اور رضا بھائی' جو اوپر والی برتھ سے نیچے جھانک رہے تھے' ایک ساتھ بول اٹھے "خواب دیکھا ہو گا اس نے۔"

"اچھا چپ رہو۔" اماں نے ڈانٹ دیا۔

میرا دل چاہ رہا تھا کہ یہ سب خاموش ہو جائیں۔ سناٹا چھا جائے اور میں پھر وہ خواب دیکھوں مگر اب ایسا ممکن نہ تھا۔ زین اب اٹھ کر میرے پاس آگیا تھا۔ میرا جی چاہا کہ میں اسے بھگا دوں مگر وہ جو ایک خوف تھا کہ یہ کسی سے اس زنجیر کا ذکر نہ کر دے' مجھے روکے رہا۔ میں نے زین جیسا بے وقوف لڑکا اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔ اسے اب نہ گھر میں ہونے والے اس حادثے کا قلق تھا' نہ تحسین خالہ اور بڑی بوا کی موت کا بلکہ اسے تو یہ احساس بھی نہیں تھا کہ ہماری......... ہم سب کی زندگیوں میں بڑی تبدیلی آچکی ہے۔ وہ مجھ سے صرف ڈیڑھ برس ہی چھوٹا تھا مگر شاید اس کا دماغ مجھ سے بہت چھوٹا تھا۔ وہ مجھ سے کہہ رہا تھا۔

"ٹرین میں......... کتنا مزہ آتا ہے ناں!! میں تو پہلی دفعہ جا رہا ہوں......... اور ضیاء......... اب ہم اسکول......... بھی نہیں جائیں گے۔"

میں نے خشمگیں نگاہوں سے اسے دیکھا۔ "تو تم صرف اس لئے خوش ہو کہ تم اسکول نہیں جاؤ گے!"

"ہاں.........! اور کیا!!" اس نے اپنا تربوز جتنا سر زور زور سے ہلا کر جواب دیا۔

"ٹھیک ہے پھر تم بڑے ہو کر کیا کرو گے؟؟"

"میں.........!! میں شادی کر لوں گا۔" اس نے چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد یوں جواب دیا جیسے اپنے روشن بلکہ بہت زیادہ روشن مستقبل کی نشان دہی کر رہا ہو۔

"کس سے کرو گے شادی؟"

"فرحت سے۔"

اور مجھے یوں لگا جیسے کسی نے مجھے بہت بلندی سے نیچے پھینک دیا ہو۔ میں نہیں جانتا کہ مجھے کس بات پر اتنا غصہ آیا تھا۔ بس مجھے کچھ ہوش ہی نہیں رہا اور میں نے ایک زوردار مکا اس کے منہ پر دے مارا۔ اس کی چیخ گونجی۔ سبھی اچھل پڑے۔ صورت حال کو سمجھنے میں انہیں یوں دیر نہ لگی کہ اس کی نکسیر پھوٹ گئی تھی اور اب وہ ہونقوں کی طرح منہ پھاڑے مجھے دیکھ رہا تھا۔ تکلیف تو اسے یقیناً ہوئی ہو گی مگر شاک اس سے زیادہ پہنچا تھا شاید۔ خون جب قمیض پر ٹپکا تب اس نے بھوں بھوں کر کے رونا شروع کیا۔ اتنی دیر میں باقی سب نے اسے گھیر لیا۔ وہ میری طرف ہاتھ اٹھائے رو رہا تھا مگر الفاظ منہ سے نہیں نکل رہے تھے۔

"کھڑکی سے منہ ٹکرا گیا۔" میں نے برجستہ جواب دیا پھر زین کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے حیرت سے دیکھ رہا تھا پھر اس نے اس بات کی تردید نہیں کی۔ یا تو وہ مجھ سے ڈر گیا! پھر واقعہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا ہوا تھا اس لئے بھی کہ میں نے اس سے پہلے کبھی اسے یا کسی کو بھی نہیں مارا تھا۔ بہرحال چچی اور چاچو اسے میرے پاس سے لے گئے۔ اسے لٹایا گیا۔ پانی ڈالا گیا اور سارا خاندان اس سے چمٹ کر رہ گیا۔ میں نے کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کر دیا مگر کان زین کی آواز پر لگے تھے کہ کب وہ میری شکایت کرتا ہے۔ مگر تھوڑی ہی دیر بعد مجھے پتا چلا کہ وہ روتے روتے سو گیا ہے۔ میں مطمئن ہو گیا۔ جانتا تھا کہ صبح تک اسے کچھ یاد نہیں رہے گا۔

تمام سفر عجیب افراتفری میں گزرا۔ سارا خاندان جاگتا رہا۔ میں جانے کب سو گیا تھا۔ وہ خواب پھر دکھائی نہیں دیا۔ صبح آنکھ کھلی تو سب لوگ دہلی اسٹیشن پر اترنے کی تیاری میں مصروف تھے۔ عصمت آپا نے مجھے کپڑے بدلوا دیئے۔ صبح دس گیارہ بجے تک ہم دہلی پہنچ گئے۔ منے دادا کو ہمارے آنے کی اطلاع تھی۔ وہ چار تانگوں سمیت ہمارے منتظر تھے۔ ہم سب ان تانگوں میں سوار ہو کر گھر کی جانب چل پڑے۔ وہاب چاچو اور چچا صاحب' (جو ابا سے بڑے تھے مگر انہیں سب "چچا صاحب" ہی کہہ کر پکارتے تھے)' منے دادا کو گھر میں ہونے والے ہنگامے کے بارے میں بتا رہے تھے۔ منے دادا نے تعزیت کے طور پر اماں کے سر پر ہاتھ رکھ کر انہیں صبر کی تلقین کی تھی۔ حالانکہ وہ صبر کر چکی تھیں مگر اس ہمدردی پر ان کے صبر کا پیمانہ پھر چھلک اٹھا تھا۔

منے دادا کا گھر بڑا خوبصورت تھا۔ کم از کم ہماری اس پرانی حویلی اور ادھڑی ہوئی دیواروں سے اچھا تھا۔ منی دادی نے ہم سب کو گلے سے لگایا۔ فوراً فوراً سب سے ہمدردی کی۔ طاہر چچا اور ناصر چچا بھی گھر پر ہی تھے۔ سب منہ دھو کر نکلے تو کھانا لگایا جا چکا تھا۔ کھانے کے دوران میں سب سے ساری داستان سنی' حیرت اور خوف کا اظہار کیا گیا۔ منی دادی نے پہنچے ہوئے بزرگوں کے نام اور پتے بتائے۔ یقین کے ساتھ یہ اطلاع دی کہ حویلی پر جنوں کا سایہ ہے بلکہ کئی ایک ایسے واقعے بھی سنا دیئے جو بقول ان کے ان کے ساتھ پیش آئے تھے اور اب سے پہلے انہوں نے محض اس وجہ سے تذکرہ نہیں کیا تھا کہ سب ڈر جائیں گے۔

جنوں کا ذکر آتے ہی جیسے ایک لمبی داستان چھڑ گئی۔ سب کو کچھ نہ کچھ محسوس ہونے لگا۔ چھوٹی چچی نے فوراً تائید کی اور بتایا کہ ان کے کمرے سے عجیب سی خوشبو آتی تھی اور یہ خوشبو اس وقت زیادہ تیز محسوس ہوتی تھی جب وہ نہا کر گیلے بالوں کو سلجھا رہی ہوتی تھیں۔ بڑی چچی صاحبہ نے سہم کر بتایا کہ انہوں نے اکثر چھت پر کسی کے تیز تیز چلنے کی آوازیں سنی ہیں۔ زہرہ آپا نے اپنے کئی دوپٹے کھو جانے کا اور عصمت آپا نے اکثر اپنے کمرے میں بڑے بڑے بالوں کے گچھے ملنے کا انکشاف بھی کیا۔ اماں اور دادی یہ سب سن سن کر ہولتی رہیں۔ انہیں یقین ہوتا چلا گیا کہ ضرور اس حویلی میں جنات ہیں۔ ابا کی موت کا ذکر بھی چھڑا۔ اس پر بھی قیاس آرائیاں کی گئیں۔ غرض سارا خاندان ایک بات پر متفق ہو گیا کہ وہ حویلی آسیب زدہ ہے مگر میرا خیال ہے کہ ساری کہانیاں تھیں۔

میں نہیں کہوں گا کہ یہ سب جھوٹ بول رہے تھے مگر اتنا یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ بات کو بڑھا چڑھا کر خاص رنگ میں پیش کیا جا رہا تھا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو زین اور زینت کی طرح خوفزدہ ہو جاتا مگر میں خوفزدہ نہیں تھا حالانکہ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کیسی مکڑیاں تھیں' کہاں سے آئی تھیں اور کہاں چلی گئیں؟ بہرحال منے دادا نے دادا کو وہاں سے بلوانے کا ارادہ کرلیا۔ وہاب چاچو سے سویرے ہی خط لکھ کر بلانے کا کہہ دیا۔

میں ناصر چچا کے بیٹے طیب سے متاثر تھا۔ طیب ان کا بڑا بیٹا تھا۔ گورا رنگ' بھرا بھرا بدن' بڑی خوب صورت اور چمکتی ہوئی آنکھیں جن میں ایک اضطراب سا کروٹیں لیتا محسوس ہوتا تھا۔ سب کچھ جان لینے کی خواہش اسے پارہ بنائے ہوئے تھی۔ وہ بیک وقت سب کی باتیں سن لینا چاہتا تھا۔ اپنی رائے دینے میں بھی اسے قطعی اجھک محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اس کی آواز خوبصورت اور لہجہ متاثر کن تھا۔ بہت جلد ہم دونوں کی دوستی ہوگئی۔ میں نے سب سے پہلے اسے فرحت کے بارے میں اطلاع بہم پہنچائی اور اس کا غائبانہ تعارف اپنی بہترین دوست کی حیثیت سے کروایا۔ وہ ہمارے خاندان کے ساتھ ہونے والے واقعے کے بارے میں کافی پُرجوش تھا بلکہ اسے حسرت تھی کہ وہ اس وقت وہاں کیوں نہ ہوا۔ وہ مجھ سے کرید کرید کے سارا احوال پوچھتا رہا۔ میں چلن والا یہ حصہ کہ میرے پاس ہے' بالکل گول کر گیا البتہ ابا کے مرنے کے جو اسباب باقی لوگوں نے بتائے تھے' وہ اسے بتا دیئے۔ اس نے چھوٹتے ہی کہا تھا۔

"طوائف والی بات صحیح لگتی ہے۔"

ایک بات بتا دوں کہ میں اس وقت نہ "طوائف" کا مطلب سمجھا تھا' نہ کچھ اور بس اتنا اندازہ تھا کہ یہ کسی عورت کو کہتے ہیں اور وہ عورت بری ہوتی ہے اور بری عورت کا بھی صحیح Concept میرے پاس نہیں تھا۔ بہرحال میں نے اس کے خیال کی تردید نہیں کی۔ باقی درمیان کی تفصیل ایسی نہیں کہ میں اسے ساری جزئیات سمیت بتا دوں۔ صرف اتنا جان لو کہ منے دادا نے دادا کو بلوا لیا تھا مگر دادا کچھ عرصہ رہنے کے بعد واپس چلے گئے تھے پھر تھوڑے ہی عرصے بعد انہوں نے ہم سب کو بھی بلوایا۔

منی دادی اور منے دادا ان کی اس "حرکت" پر ناراض تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انہیں دادی نے اکسایا ہے۔ چچا صاحب اور چچی صاحب زین اور زینت کے ساتھ دہلی ہی میں رہ گئے تھے۔ انہیں طاہر چچا نے قالین کے کاروبار میں شرکت کی دعوت دی تھی اور

انہیں یہ مشورہ بروقت اور درست لگا تھا۔ وہاب چاچو کیونکہ ملازمت کرتے تھے اس لئے ان کے لئے اتنا بڑا فیصلہ کرنا مشکل تھا پھر وہ چھوٹے تھے۔ (ابا کے بعد) اس لئے دادا کو چھوڑنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ سب سے بڑے چچا تو ملنگ آدمی تھے۔ انہیں نہ گھربار سے دلچسپی تھی' نہ گھر کے بزرگوں سے۔ ان کی دلچسپیاں ادبی حلقوں' شاعروں اور ادبی نشستوں تک محدود تھیں۔ تھوڑا بہت لحاظ رکھا کرتے تھے اسی لئے ابا کے مقابلے میں ان کی حیثیت کچھ بہتر تھی مگر گھر کے سارے کام' ساری ذمے داریاں وہاب چاچو پر تھیں اس لئے وہ ہمارے ساتھ واپس آ گئے۔

میں نے پہلے ہی دن بی جان کے گھر جانے کی ضد کی۔ اماں خود بھی تڑپ رہی تھیں۔ بی جان اور کاکا جان کو واپسی کی اطلاع کروا دی۔ شام تک وہ یہیں آ گئیں۔ فرحت ہمارے واپس آ جانے پر بہت خوش تھی۔ میں نے سب سے پہلے اس سے اس چلن کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا کہ وہ بالکل محفوظ ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اب تک اس نے اسے کھول کر بھی نہیں دیکھا۔ یہ سن کر مجھے زیادہ اطمینان ہوا۔ رات کو جب وہ لوگ جانے لگے تو میں بھی اماں سے ضد کر کے ان کے ساتھ ہی چلا گیا۔ سب سے پہلے میں نے ہی اس صندوقچی کا جائزہ لیا۔ فرحت میرے کہنے پر پانی لینے چلی گئی تھی۔

پتا نہیں' وہ کیسا خدشہ تھا جس کی وجہ سے میں نے صندوقچی کو اسی کے سامنے کھولنے سے گریز کیا۔ میں نے جونہی صندوقچی کھولی' میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ سنہری' خوب صورت سی مگر دہشت طاری کر دینے والی ایک مکڑی اس میں موجود تھی۔ پہلے میں نے چاہا کہ چیخ کر بی جان وغیرہ کو بلا کر دکھاؤں مگر جانے کیا ہوا! نہ میں چیخا' نہ ڈرا...... نہ میں نے کسی کو بتایا بلکہ صندوقچی کو اسی طرح بند کر دیا۔ گڑیا کا سرخ جوڑا اور وہ چلن بھی اس میں موجود تھی۔ یہ مکڑی ان مکڑیوں سے جسامت میں کافی بڑی تھی جیسی میں نے بڑی بوا کے جسم سے چمٹی ہوئی دیکھی تھیں۔

میں صندوقچی بند کر کے اپنی بے قابو ہو جانے والی سانس پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا فرحت پانی کا گلاس لئے اندر آ گئی۔ اس نے گڑیا لینے اور کھیلنے کی کوشش کی' بڑی منت سماجت کی مگر میں نے اسے ڈرا دیا۔ اب تو وہ صندوقچی بہت اہم ہو گئی تھی۔ میں کسی بھی حالت میں اسے یہاں نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ میں یہ بھی جان گیا تھا کہ اس میں مکڑی ہے یہ وہی مکڑی ہے جسے لوگ "آدم خور" کہہ رہے ہیں۔

میں سخت پریشان ہو گیا تھا۔ فرحت سے جان چھڑانے کو میں نے جنوں کا من گھڑت قصہ سنا ڈالا کہ جس نے مجھے چین دی تھی' وہ واپس لینے آیا تھا۔ یہ سن کر فرحت کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں مگر میں نے اسے خوب تسلی دی کہ میں بہت جلد اسے گڑیا کا پورا اور قیمتی زیور دے دوں گا۔ بڑی مشکل سے وہ مانی مگر گڑیا تو اسے دینا تھا۔ میں سوچتا رہا کہ کیسے ہاتھ ڈال کر گڑیا اور اس کا جوڑا نکالوں؟ مجھے ڈر لگ رہا تھا۔ وہ مکڑی میرے ہاتھ پہ چمٹ سکتی تھی۔ میں تمام وقت الجھا رہا۔ بی جان نے حسب معمول ہم دونوں کو پریوں کی کہانی سنائی تا کہ ہم سو جائیں۔ میں محض اس لئے سوتا بن گیا کہ میری ان دونوں سے جان چھوٹے۔ فرحت' بی جان کے پاس سوتی تھی مگر میرا پلنگ علیحدہ تھا۔ میں جب بھی بی جان کے پاس آتا تھا' اس پلنگ پر سویا کرتا تھا اس لئے میں نے وہ صندوقچی اسی پلنگ کے نیچے چھپا دی تھی۔

بی جان اور فرحت کے سوتے ہی میں چپکے سے اٹھ گیا۔ بی جان کمرے کا بلب بجھا دیتی تھیں مگر باہر برآمدے میں لگا بلب جلتا رہتا تھا۔ میں چپکے سے برآمدے میں چلا آیا۔ صندوقچی کھولی' مکڑی' گڑیا کے سینے پر جمی بیٹھی تھی۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں بے پناہ بینائی کا مالک تھا۔ اس وقت میں اس مکڑی کو بہت اچھی طرح دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس کی چمکتی ہوئی سیاہ آنکھیں' اس کے بدن پر باریک' نرم و ملائم سنہرے بال' اس کی ٹانگیں' اس کا دہانہ سب صاف نظر آ رہا تھا اور یقین کریں' میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مکڑی خوب صورت اور اتنی پرکشش بھی ہو سکتی ہے اور یہ بھی حیرت انگیز بات تھی کہ اچانک مجھے احساس ہوا کہ وہ مکڑی میری دوست ہے' جیسے اس کے چہرے کے تاثرات دوستانہ ہوں۔ بس.........!

ایسا مجھے محسوس ہوا تھا اور میں نے بے اختیار اپنے ہاتھ کی انگلی دھیرے سے اس کی نرم پشت پر پھیر دی۔ وہ دھیرے سے ہلی پھر گڑیا کے سینے سے اتر کر صندوقچی کے ایک کونے میں جا بیٹھی جیسے میری خواہش جان گئی ہو۔ میں نے گڑیا اور اس کے کپڑوں کا جوڑا نکال لیا۔ چین سب سے نیچے تھی اور وہ مکڑی گڑیا کے اٹھاتے ہی اس چین کے اوپر جا بیٹھی۔ میں نے دھیرے سے کہا۔ "شکریہ" تب نہ معلوم کیوں مجھے لگا جیسے وہ میری بات سن کر دھیرے سے مسکرائی ہو۔ میں نے صندوقچی بند کر دی اور دبے پاؤں کمرے میں لوٹ آیا۔ صندوقچی کو پلنگ کے نیچے چھپا کر میں نے اس پر جوتے وغیرہ ڈال دیئے تا کہ وہ

ایک نگاہ میں نظر نہ آ سکے پھر گڑیا کو سرخ جوڑا پہنا دیا۔ اسے اپنے پہلو میں لٹایا اور اس مکڑی کے بارے میں سوچتے سوچتے سو گیا۔

☆==============☆==============☆

اس رات پھر میں نے عجیب سا خواب دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ میں اسی قبر کے سرہانے کھڑا ہوں جس میں ابا نے تابوت اتارا تھا۔ وہ قبر کھلی ہوئی ہے۔ اندر روشنی کا بڑا شدید احساس ہے پھر میں سب کچھ صاف دیکھ رہا ہوں۔ میں نے جونہی اندر جھانکا' بھونچکا رہ گیا۔ اندر ایک بڑی خوبصورت لڑکی آنکھیں بند کئے لیٹی ہے۔ اس نے سرخ جوڑا پہن رکھا ہے۔ اس کے کانوں میں چمکدار موتیوں کے آویزے ہیں۔ گلے میں خوب صورت مالا اور بالوں میں سرخ پھول سجے ہوئے ہیں۔ پہلی نظر میں وہ مجھے دلہن لگی۔ میں کچھ اور جھکا پھر گھبرا کر سیدھا ہو گیا۔ اس کے سینے پر بالکل ویسی ہی سنہری مکڑی بیٹھی تھی جیسی میں نے صندوقچی میں گڑیا کے سینے پر بیٹھی دیکھی تھی۔ ویسی ہی آنکھیں' ویسے ہی نرم و ملائم چمکتے ہوئے سنہرے بال اور وہی دوستانہ تاثرات لئے۔ میں ایک دم پیچھے ہٹنے لگا تھا کہ اچانک مجھے ہلکی سی پکار سنائی دی۔

"ضیاء.........! ضیاء.........! ضیاء.........!" اس بار بھی آواز میں عجیب سی' بدن میں اتر کر کھروچنے ڈالنے والی بازگشت تھی۔ میں ٹھٹک گیا۔ ڈرتے ڈرتے میں نے پھر کھلی ہوئی قبر میں جھانکا۔ اب مجھے اس لڑکی کا ہاتھ بھی نظر آ رہا تھا۔ اس کی کلائی میں وہی سونے کی زنجیر تھی جو میں نے چھپا رکھی تھی۔ اس کی کلائی زخمی بھی تھی اور اس کی گوری گداز کلائی پر جگہ جگہ ناخنوں کے نشان تھے جن پر خون کی تازہ بوندیں چمک رہی تھیں۔

مجھے لگا تھا جیسے اسی دلہن نے مجھے آواز دی ہو۔ میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اس کے خوبصورت چہرے پر بند آنکھوں کے پپوٹوں اور پلکوں میں ہلکی سی لرزش تھی۔ ہونٹ نم تھے۔ میں پھر اس آواز کو وہم سمجھ کر ہٹنے ہی والا تھا کہ میں نے سسکی کی ہلکی سی آواز سنی۔ میرے قدم جیسے کسی نے تھام لئے تھے مگر خوف اچانک ہی بہت بڑھ گیا۔ میرے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی جیسے مجھے اچانک اپنے اکیلے اور اس پر ہیبت قبرستان میں ہونے کا احساس ہو گیا ہو۔ گہری تاریکی اور سناٹے نے مجھے سن کر دیا۔ میں بالکل بچوں ہی کی طرح رو پڑا۔ مجھے بڑی بوا سے چنی ہوئی مکڑیاں یاد آ گئیں۔ میں نے گھبرا کر پاؤں اٹھا لیا پھر دوسرا بھی اٹھانے کی شدید خواہش ہوئی مگر یہ ممکن نہ تھا سو نیچے دیکھا

ہوا کبھی ایک پاؤں اٹھاتا اور کبھی دوسرا۔ پھندے سے لٹکے ہوئے ابا اور ساکت لیٹی ہوئی تحسین خالہ کا نیلا چہرہ نگاہوں کے سامنے جم کر رہ گیا۔ میں پلٹ کر ایک طرف کو بھاگ اٹھا۔

پھر شاید میں کسی چیز سے ٹکرا گیا تھا۔ میرے جسم کو جھٹکا سا لگا اور میں اٹھ بیٹھا۔ ماما جان اور بی جان بے خبر سو رہی تھیں۔ فرحت ان دونوں کے درمیان سکڑی ہوئی تھی۔ کمرے میں باہر آتی ہوئی ہلکی روشنی تھی۔ باہر جھینگر بول رہے تھے۔ کبھی کبھی کسی بھیڑیے کی آواز بھی سناٹے کو چیر دیتی تھی۔ مجھے اپنے قریب کی دیوار سے یخ لہریں سی نکلتی ہوئی محسوس ہوئیں حالانکہ سردی کا موسم نہیں تھا۔ خوف اب بھی مجھے اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھا۔ کافی دیر بعد میری سمجھ میں آیا کہ میں سو رہا تھا۔ میں نے خواب دیکھا تھا اور اب میں خواب سے جاگ اٹھا ہوں۔ خواب یاد آتے ہی میں نے اپنے پہلو میں نگاہ کی جہاں میں نے گڑیا کو لٹایا تھا۔ گڑیا ویسے ہی لیٹی تھی پھر میں چپکے سے اٹھا۔ میں نے پلنگ کے نیچے جھانکا۔ صندوقچی ویسے ہی رکھی تھی۔

میں نیچے اترا۔ صندوقچی کو اٹھایا۔ میرے دل میں آیا کہ میں اس مکڑی کو ماردوں۔ اس مکڑی نے تحسین خالہ کو مارا ہے اور اس کے بچوں نے بڑی بوا کو' یہ اب مجھے' فرحت کو یا کاکا جان' بی جان کو بھی مار سکتی ہے۔ یہ خیال آتے ہی میں نے اپنا چپل بھی اٹھا لیا۔ دھیرے سے صندوقچی کھولی۔ یہ سب میں اس جگہ کر رہا تھا' جہاں باہر سے آنے والی روشنی براہ راست پڑ رہی تھی۔ میں نے صندوقچی کھول کر اندر جھانکا۔ وہ ویسے ہی بیٹھی تھی۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی وہ مجھے اتنی پیاری' بے ضرر اور معصوم سی لگی کہ میں نے ہاتھ سے چپل پھینک دیا۔

اس کے جسم کے بال' جہاں روشنی پڑ رہی تھی' وہاں وہاں اس قدر چمک رہے تھے کہ وہ مجھے بے حد خوبصورت بھی لگی۔ میرے دل سے خوف دور ہو گیا۔ اس کی جگہ دوستانہ جذبات نے لے لی۔ میں نے صندوقچی کو بند کیا۔ اسے اسی جگہ رکھا اور واپس بستر پر لیٹ گیا۔

صبح کسی نے جھنجوڑ کر اٹھایا۔ "اٹھو! ضیاء!........ اٹھو تو........!" آواز فرحت کی تھی۔

"کیا ہے؟" میں نے کسمسا کر کروٹ لے لی۔ میں رات کافی دیر جاگا تھا پھر خواب

دیکھنے کے بعد بھی میری نیند اچاٹ ہو گئی تھی۔ پتا نہیں' کب دوبارہ سویا تھا۔ ابھی اٹھنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔

"ارے! یہ تو دیکھو!" اس نے پھر کاندھے سے پکڑ کر ہلایا۔

اس کی آواز میں اس قدر حیرت تھی کہ میں بے اختیار اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "کیا ہے؟"

"یہ گڑیا........" اس نے گڑیا کی جانب اشارہ کیا جو سرخ جوڑا پہنے لیٹی تھی' بالکل اسی دلہن کی طرح جیسی میں نے خواب میں دیکھی تھی۔

"کیا ہوا اسے؟" میں جھنجلا گیا۔

"یہ یہاں کیسے آ گئی؟ اسے یہ کپڑے کس نے پہنائے؟" وہ حیران تھی۔

"اوفوہ فرحت........! اسے میں نے کپڑے پہنائے تھے اور یہاں بھی میں نے ہی لٹایا تھا۔" میں یہ کہہ کر پھر اوندھا لیٹ گیا۔ میں ابھی اور سونا چاہتا تھا "اٹھا لو اسے۔" میں نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا اور فرحت نے یوں جھپٹا مار کر اسے اٹھا لیا جیسے اسی انتظار میں ہو۔

اس وقت کاکا جان نے ہم دونوں کو آواز دے لی۔ فرحت تو چلی گئی مگر میں نے کہہ دیا کہ میں ابھی نہیں اٹھوں گا۔ اس کے جانے کے بعد میں پھر سو گیا لیکن میں زیادہ دیر تک نہیں سو سکا۔ عجیب سا شور اٹھا جیسے بہت سے لوگ ایک ساتھ چیخ اٹھے ہوں یا سب کے سب رو رہے ہوں۔ پہلے تو مجھے لگا تھا جیسے میں پھر خواب دیکھ رہا ہوں مگر جلد ہی احساس ہو گیا کہ آوازیں واقعی آ رہی ہیں۔ میں نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں۔ چھت کو تکتے ہوئے میں نے کان آوازوں پر لگا دیے۔ کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا۔ دور محسوس ہونے والا شور قریب آتا محسوس ہوا پھر کچھ ہی دیر بعد کمرے کا بھڑا ہوا دروازہ ایک دھماکے کے ساتھ کھلا اور میں........! میں اچھل کر اٹھ بیٹھا۔

کاکا جان' بی جان اور فرحت' تینوں روتی ہوئی اندر داخل ہوئی تھیں۔ ان کے پیچھے ہی رضا بھائی تھے جن کی آنکھیں سرخ تھیں۔ ناک سرخ تھی مگر وہ رو نہیں رہے تھے' مجھے گھور رہے تھے۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ ایک ہی خوف تھا کہ انہیں اس چھین کا پتا چل گیا ہو مگر دوسرے ہی لمحے بی جان آ کر مجھ سے لپٹ گئیں۔

"ارے! یہ کیا عذاب آ گیا ہے۔ کیا ہو رہا ہے یہ؟" کاکا جان' رضا بھائی سے لپٹی پوچھ رہی تھیں اور رضا بھائی عجیب سے انداز سے دونوں ہاتھ چھوڑے کھڑے تھے۔ نہ

ان میں کوئی والہانہ پن تھا' نہ دکھ کی شدت کا کوئی اظہار۔ ان کی آنکھیں خالی تھیں۔ وہ ڈھیلے ڈھالے انداز میں کھڑے تھے اور کاکا جان ان کے سینے سے چمٹی ہوئی تھیں۔ میں بی جان کے کاندھے کے اوپر سے رضا بھائی کو دیکھ رہا تھا۔ عجیب عجیب سے خیال آ رہے تھے۔ پیٹ میں اٹھتے گولے سے تھے جو بار بار حلق میں آ کر اٹک جاتے تھے اور میں بول بھی نہیں پاتا تھا۔

"چلیے بی جان!" رضا بھائی کسی روبوٹ کی طرح بولے تھے۔

بی جان نے مجھ سے الگ ہو کر میری پیشانی چومی۔ دو منٹ تک میرے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں تھامے رہیں۔ میرے آنسو بلاوجہ بہنے لگے۔ خودبخود۔ مجھے پتا بھی نہیں چلا اور نہ میں جانتا تھا کہ میں کیوں رو رہا ہوں۔

"چل میرے بچے! خدا تجھ پر رحم کرے! چل.......... چل میرے لعل!" انہوں نے مجھے پھر سینے سے لگا لیا۔

اب میرا دم گھٹنے لگا تھا۔ سینہ پھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ میں جلدی سے اترا اور میں نے مسہری کے نیچے پڑے چپل پہن لئے۔ کاکا جان اتنی دیر میں سر پر برقعہ ڈال چکی تھیں۔ فرحت دیوار سے لگی رو رہی تھی۔ میں نے چاہا کہ میں اس سے کچھ پوچھوں مگر نہ جانے کیوں لب کھولے بغیر جان گیا کہ میں بول نہیں سکوں گا۔ میں نے کپڑے بدلنے کے ارادے سے کھونٹی پر لٹکے کپڑے اٹھائے تبھی رضا بھائی بول اٹھے۔

"ضیاء! وقت نہیں ہے۔ گھر جا کر پہن لینا۔ ساتھ لے لو۔"

"وقت نہیں ہے' وقت نہیں ہے۔" یہ جملے میرے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح برسنے لگے۔ "کسے وقت نہیں؟ کس بات کا وقت نہیں ہے..........؟ کیا ہم پھر کہیں جا رہے ہیں؟ کیا پھر ٹرین چھوٹنے والی ہے؟ کیوں وقت نہیں ہے؟ کس کے پاس وقت نہیں ہے؟" یہ ساری باتیں میرے اندر ہی گونج رہی تھیں۔ میں کچھ بھی کہہ نہیں سکا تھا۔ مجھے پہلا خیال یہی آیا کہ صندوقچی کا کیا کروں؟ ساتھ لینا تو خطرناک تھا۔ وہ یہیں زیادہ محفوظ تھی۔ سو میں نے اس کا خیال ذہن سے نکال دیا۔ کاکا جان' بی جان اور فرحت بھی جیسے حلئے میں تھیں اسی میں چلنے کو تیار تھیں۔ بی جان کے برقعہ اوڑھتے ہی رضا بھائی پلٹ گئے۔ بی جان نے مجھے گود میں چڑھانا چاہا مگر میں نے کسمسا کر منع کر دیا۔

تانگا دروازے پر کھڑا تھا۔ ہم سب تانگے میں جا بیٹھے۔ رضا بھائی' کوچوان کے

ساتھ بیٹھے تھے۔ رضا بھائی میں ایسی تبدیلی میں نے پہلی بار دیکھی تھی۔ وہ اب بھی بت کی طرح بیٹھے تھے۔ بی جان اور کاکا جان کے ناک سڑکنے کی مسلسل آواز سے میں جان رہا تھا کہ وہ رو رہی ہیں۔ فرحت البتہ اب بہل گئی تھی بلکہ اس کے چہرے سے پتا بھی نہیں چلتا تھا کہ کچھ دیر پہلے وہ روئی ہے۔ وہ چاروں طرف دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔ ہمارے یہاں لڑکیوں کو گھر سے باہر جانے نہیں دیا جاتا تھا۔ وہ کبھی کبھار ہی نکلا کرتی تھیں۔ وہ بھی کسی بڑے کے ساتھ' کہیں جانے کے لئے۔ گھر میں وہ شاید سب کو روتا دیکھ کر روئی تھیں۔

"مگر ہوا کیا ہے؟" یہ سوال اچانک پھن کاڑھے میرے سامنے آ گیا تھا۔ "رضا بھائی کیوں آئے ہیں' ہم کہاں جا رہے ہیں' ہم یقیناً اپنے گھر جا رہے ہیں۔" آخری سوال کا تو میرے پاس یقیناً جواب تھا مگر جس انداز میں ہمیں لے جایا جا رہا تھا' وہ ناقابل فہم تھا۔ میں نے الجھن سے بچنے کے لئے ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا مگر دوسرے ہی لمحے چونک کر سیدھا ہو گیا۔ چونکنے کی وجہ ذہن میں اچانک کلبلا اٹھنے والا سوال تھا۔ "کیا پھر کوئی مر گیا؟" میں ایک دم ہی بی جان کی طرف پلٹ گیا۔

"کیا پھر کوئی مر گیا؟" اس بار یہ سوال میرے ہونٹوں سے آواز بن کر نکلا تھا۔ رضا بھائی نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ بی جان اور کاکا جان کی سسکی نکل گئی۔ بی جان نے مجھے پھر خود سے چمٹا لیا۔

"آ آ..........! ہا!" کوچوان نے سرد آہ بھری۔ "موت بھی بڑی عجیب چیز ہوتی ہے نی! ہر وقت سر پر لٹکتی تلوار کی طرح۔ اب گری کہ تب گری مگر بندہ..........!! اونہہ! مجال ہے جو سر اٹھا کر اوپر دیکھ لے۔ نیچے ہی نیچے دوڑا جاتا ہے۔ ہر کام کل پر ٹال دیتا ہے۔ سوچتا بھی نہیں کہ کل آئے گا کہ نہیں۔ میں تو کہتا ہوں' بابو جی کہ بس آج زندگی ہے۔ بس آج ہی زندہ ہیں.......... کل زندہ ہوئے تو دیکھی جائے گی۔ بندہ ایک دفعہ میں ایک ہی کام پورا کر دے تو بڑی بات۔ چھوٹے چھوٹے کام کرے۔ شام ہی کو گھر چلا جائے۔ بچوں کو سمجھائے' بیوی کو سمجھائے' نصیحت کرے' معافی مانگے اور سو جائے۔ بس یہ ہے زندگی! اب بھلا بتاؤ تو.......... ساری مصلحتیں دھری کی دھری رہ گئیں ناں!! کیسا لمبا چوڑا انتظام کیا تھا محفل سماع کا اور یہ بھی چھوڑ' پندرہ تاریخ کو مشاعرے کی تیاری بھی ابھی سے شروع کر دی تھی۔ لو بھلا!! جو باتیں آج کرنا تھیں' وہ تو کیں نہیں۔ بارہ روز آگے

کے دھندے طے پا گئے۔ سمجھ میں نہیں آتا' اتی تیز دھار کی تلوار بھی کوئی بھول سکتا ہے؟ اللہ معافی..........! اللہ معافی۔"

وہ گھوڑے کی باگیں چھوڑ' اپنے کان چھو رہا تھا اور میں حیرت سے اسے اور کبھی رضا بھائی کو دیکھ رہا تھا جو مسلسل پہلو بدل رہے تھے۔ صاف لگ رہا تھا کہ انہیں اس کی باتیں اچھی نہیں لگ رہی ہیں مگر وہ کب انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ تو جیسے ہواؤں سے باتیں کر رہا تھا یا اپنے گھوڑے سے۔ یا شاید خود سے۔ مگر میں سوچ رہا تھا۔ ضرور کوئی مر گیا۔ ایسی آہ کھینچ کر آدمی مرے ہوؤں کی باتیں کرتا ہے۔ میں نے ہمیشہ دادی کو ہر مرے ہوئے کے بارے میں باتیں کرنے سے پہلے بالکل اسی طرح سرد آہ کھینچتے' خلاؤں میں گھورتے اور زور زور سے ہلتے دیکھا تھا۔ شاید یہ بھی اسی طرح ہلا ہو مگر تانگے کے جھکولے بھی کو ہلا رہے تھے اس لئے میں یہ بات وثوق سے نہیں کہہ سکتا لیکن رضا بھائی کو میں دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کی باتوں سے ناراض تھے۔ جھنجلا رہے تھے اور مسلسل اس کی مخالف سمت دیکھ رہے تھے۔

"کون مر گیا بی جان؟" میں یہ سسپنس برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔

"میرے بچے!"

بی جان کو پتا نہیں کیا ہو گیا تھا؟ وہ مجھے جواب دینے کی بجائے رو پڑتی تھیں۔ میں الجھ گیا۔ میں نے اندازے لگانا شروع کر دیے۔ "ضرور دادی مری ہوں گی۔ ان کی اب اتنی ضرورت بھی نہیں تھی۔ دادا کو ہو تو ہو مگر شاید انہیں بھی نہیں تھی۔ وہ تو کبھی کبھی دنوں بعد گھر کے اندر آتے تھے اور اکثر ان سے ناراض بھی رہا کرتے تھے۔ ابا کے مرنے کے بعد تو ان دونوں کے درمیان ہونے والے زبانی کلامی جھگڑے بھی ختم ہو گئے تھے۔ پہلے تو کچھ تیز قسم کے جملوں کا تبادلہ ہوا بھی کرتا تھا۔ جس میں دادا ابا کی بے اعتنائی آوارگی اور گھر سے لاتعلقی کو انہی کے لاڈ پیار کا نتیجہ بتاتے تھے۔ اب تو ابا ہی نہیں رہے تھے۔ دادا نے دادی سے بات کرنا چھوڑ دی تھی مگر دادی تو کبھی بیمار بھی نہیں ہوتی تھیں۔ انہیں تو کبھی چھینک بھی نہیں آتی تھی۔ وہ بھی وہ زبردستی مارا کرتی تھیں۔ کبھی رومال کی بتی بنا کر نتھنے میں ڈال لیتیں اور کبھی کوئی چیز سونگھ کر چھینکیں مارا کرتی تھیں۔ میں اگر کبھی ان سے اس بارے میں پوچھتا تو کہتیں۔ "چھینک آنا صحت مندی کی نشانی ہے۔"

اور وہ زبردستی صحت مند تھیں "پھر..........!! پھر کون مرا ہو گا؟ کسے مرنا چاہیے؟"

میں سوچتا رہا۔ اماں' زہرہ آپا اور عصمت آپا کے علاوہ اپنے دونوں بھائیوں کا تو مجھے خیال ہی نہ آیا۔ فرحت میرے ساتھ تھی۔ منجھلے چچا دہلی میں رہ گئے تھے۔ بڑے چچا اگر مجھے پسند نہیں تھے تو ان سے مجھے کوئی شکایت بھی نہیں تھی اس لئے میں نے ان کے بارے میں بھی نہیں سوچا۔ وہاب چاچو تو خیر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' وہ تو بہت اچھے تھے۔ اچانک مجھے دادا کا خیال آیا۔ "ہاں......... ضرور دادا مرے ہوں گے۔ وہ بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ ابا کی موت پر تو وہ سخت بیمار بھی ہوئے تھے۔ ہاں۔"

مجھے یقین ہو گیا اور یک گونہ اطمینان بھی کہ چچن کے بارے میں' وہی اماں سے الٹے سیدھے سوالات کرتے رہتے تھے۔ میں ایک دم ہلکا پھلکا ہو گیا۔ یہ ٹھیک ہے' ان کے مرنے سے کوئی ایسا خلل بھی پڑنے والا نہیں تھا۔ مردان خانے کی رونق ضرور ختم ہو جاتی مگر بڑے چچا صاحب اکثر کہتے پائے گئے تھے کہ انہیں محفلیں سجانے کے لئے کھلے چبوترے پر انتظام کرنا پڑتا ہے۔ موسم اچھا ہو تو ٹھیک ہے مگر ہوا میں خنکی ہو' بارش کا خطرہ ہو یا سخت سردی تو بڑی پریشانی ہوتی ہے۔ انہوں نے کئی بار دادی سے کہا بھی کہ ابا سے کہیں مردان خانے کو کچھ روز کے لئے دے دیں۔ اتنے روز گھر میں آرام کر لیں مگر دادی نے ہمیشہ کانوں کو ہاتھ لگا کر انکار کر دیا تھا۔

"میاں! ساری جوانی اور بچپنا تم بچوں کی تکلیفیں اکیلے سہتی رہی مگر ان صاحب کو کبھی توفیق نہ ہوئی کہ اندر آ کر جھانک لیں۔ یہ موٹے موٹے آنسو بہہ جاتے تھے میرے اور ان کے کانوں پر جوں نہ رینگتی تھی۔ اس مردان خانے میں نال ان کی گڑی ہے۔ اب اس عمر میں ان کے ہاتھوں ذلیل نہیں ہوتا مجھے۔" یہ کہہ کر وہ تسبیح کے دانے بغیر کچھ پڑھے ہی جلدی جلدی گرانے لگتیں اور وہ پیر پٹختے ہوئے اپنے کمرے میں چلے جاتے تو پھر پتا نہیں' مشاعرہ کہاں ہوتا اور محفلیں کہاں سجتیں؟

اسی اثنا میں گھر آ گیا۔ پوری گلی میں قناتیں کھڑی تھیں۔ لوگ آ رہے تھے۔ سب کے سروں پر ٹوپیاں تھیں۔ لوبان کی مخصوص خوشبو میں خواب کی وجہ سے خوب پہچان گیا تھا۔ یہ خوشبو قبرستان والے ہر خواب میں' ہر لمحہ میرے ساتھ ہوتی تھی۔ میں اتر کر سیدھا گھر کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ کچھ روز پہلے والا سین تھا۔ عورتیں جمع تھیں۔ اگربتیاں سلگ رہی تھیں۔ میری نگاہ سب سے پہلے اماں پر پڑی۔ وہ کسی موٹی سی عورت کو کچھ بتا رہی تھیں پھر میں نے زہرہ آپا اور عصمت آپا کو بھی دیکھ لیا دادی پر نگاہ پڑی تو

میں بھونچکا رہ گیا۔ وہ ایک دم زرد ہو رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں کے پپوٹے رو رو کر سوج گئے تھے۔ بڑی چچی انہی کے سہارے بیٹھی تھیں اور خود بھی بلک بلک کر رو رہی تھیں۔ گویا دادی بھی زندہ تھیں۔

"پھر دادا ہی مرے ہیں۔" میں نے خود کو مزید یقین دلایا۔

"وہاب کو کہو............ بلد جائے۔" اچانک میری پشت پر سے دادا کی گرج دار آواز گونجی۔ میں اچھل پڑا۔ پلٹ کر دیکھا' دادا نڈھال ضرور تھے مگر اپنی چوڑی ہڈی کی وجہ سے اب بھی مضبوط لگ رہے تھے۔ وہاب چاچو کے نام کی آوازیں پڑنے لگیں' بھگدڑ سی مچ گئی۔ رضا بھائی باہر کو لپک گئے۔

"دادا بھی زندہ ہیں............" میں نے حیرت سے سوچا۔ اسی وقت مجھے باہر سے کسی کے چیخنے کی آوازیں آئیں۔ ادھر دیکھا تو بڑی چچی کی اماں' خالائیں اور بہنیں تھیں۔ ان کے پیچھے پیچھے منجھلے چچا' چچی اور ان کے پیچھے زین اور زینت۔

اور پھر کسی کے بتائے بنا ہی مجھے پتا چل گیا کہ بڑے چچا صاحب مر گئے بلکہ مارے گئے۔ ان کا رنگ بھی نیلا ہو گیا تھا۔ انہیں بھی سانپ نے ڈس لیا تھا۔ میں نے اس عمر میں مکڑی کا نام بھی سنا مگر یہ بھی کہ نہیں............ مکڑی سے ایسا کب ہوتا ہے۔ میں پھر اپنی "خفیہ سرگرمیوں" میں مصروف ہو گیا۔ لوگوں کے درمیان جھکے جھکے اس غسل خانے تک پہنچ گیا۔ کپڑا ہٹا کر چچا کا منہ بھی دیکھ لیا۔ واقعی اتنا گہرا نیلا تھا کہ وہ "بھوت" لگ رہے تھے۔ پورا منہ سوج کر کپا ہو گیا تھا۔ نیلے منہ پر سفید سفید جھاگ دیکھ کر ابکائیاں سی آنے لگیں۔ دادا کے ڈر سے جلدی میں وہاں سے نکل لیا۔ اس بار پھر پولیس آئی۔ ایمبولینس میں لاش رکھ کر اپنے ساتھ لے گئی۔ چچی کو غش پر غش آ رہے تھے۔ دادی ادھ موئی ہو رہی تھیں۔ دادا کی مضبوط آواز کبھی کبھی اچانک ہی بھرا کر دھیمی ہو جاتی تھی۔ چلتے چلتے کبھی کبھی بے اختیار لڑکھڑا جاتے تھے۔ دوسرا جوان بیٹا ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔ خوف نے ان کے سرخ و سفید رنگ کو سرخی مائل نیلا نیلا سا کر دیا تھا۔ جیسے اندر کہیں نیلاہٹیں کھلنے لگی ہوں۔

کلیجے کے دو ٹکڑے الگ ہوئے تھے۔ جتنا بھی زہر پھیلتا کم تھا۔ منجھلے چچا صاحب نے شاید سارا سفر روتے اور غش کھاتے طے کیا تھا۔ ان کی حالت خراب تھی۔ ڈاکٹر تک بلا لیا گیا تھا۔ وہ معائنہ کر رہا تھا۔ ایک وہاب چاچو تھے کہ چہرہ ستا گیا تھا۔ کندھے ڈھلک

گئے تھے پھر بھی چہروں میں جیسے فٹ کر لئے تھے کہ ان کے بغیر نہ جانے کب کیا ہو جائے۔ جب دادا اٹھ کر کہیں جانے لگتے' کچھ کہنے سننے لگتے' وہ انہیں بٹھا دیتے۔ آتے جاتے سہمی ہوئی نگاہوں سے دادا کو دیکھتے' دادی کی دھاڑیں سن کر بھی انہیں اتنی تشویش نہ تھی۔ جتنی دادا کی خاموشی اور خشک آنکھوں کے بارے میں تھی۔ شاید وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ کب دادا چ... سے گریں اور چٹ سے مر جائیں مگر میں ان کی حالت دیکھ کر جان گیا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ بے ہوش ہو جائیں گے یا ابا کی موت والے دن کی طرح چند گھنٹوں کو اسپتال چلے جائیں گے مگر ابھی مردان خانہ ویران نہ ہو گا۔

چچا صاحب کیسے مرے' انہیں سانپ نے ڈسا یا مکڑی کاٹ گئی' میڈیکل رپورٹ کیا آئی' یہ بہت لمبی کہانی ہے۔ بس یہ طے ہو گیا کہ انہیں کسی زہریلے کیڑے نے کاٹا ہے۔ ایک عجیب سے جکڑ دینے والے خوف کا سایہ سا پھیل گیا تھا۔ دادا' منجھلے چچا اور وہاب چاچو جو ہر وقت بوکھلائے سے پھرتے۔ حویلی بھر میں پھر نیا چونا ڈلوایا گیا۔ دواؤں کا پھر سے اسپرے کیا گیا۔ اس بار تو تنی چپائی (White Wash) بھی کروائی گئی۔ چھت کی بلیوں تک پر چونا کروا دیا گیا۔ نئے نئے لوگ آتے جاتے رہے۔ مردان خانہ ہر وقت دور پار سے آنے والے سرکاری مہمانوں کا گڑھ بن گیا۔ بچوں کے کھیل کود پر پابندی لگا دی گئی۔ مجھے تو یوں لگتا تھا جیسے ہمارے کمروں کے باہر انگریز نے فوج لگا دی ہے کہ کرفیو نافذ ہو گیا۔ عورتوں کے کام ہی جیسے ختم ہو گئے۔ وہ چہل پہل' وہ پکوان' سب دھرے رہ گئے۔ بس پیٹ پوجا کا سامان جیسے تیسے کر لیا جاتا پھر سارا وقت کمروں میں مسہریوں پر گزرتا۔

میں نچلا بیٹھنے والا کب تھا اس لئے زہرہ آپا اور عصمت آپا کے علاوہ اماں بھی ہر وقت میری ہی طرف نگراں رہتی تھیں۔ اسی دوران میں سنے دادا بھی اپنے اہل و عیال سمیت آ چکے تھے۔ میں ناصر چچا کے بیٹے طیب کو دیکھتے ہی خوش ہو گیا تھا۔ اب میرا اور اس کا یارانہ تھا۔ وہ عجیب سے خیالات سے گندھا لڑکا تھا۔ اسے خوشی تھی کہ چچا صاحب کی موت کی وجہ سے اسے بھی ان حالات میں یہاں آنے کا موقع مل گیا۔

"میں زبردستی آیا ہوں۔"

اس نے اپنی چمکدار آنکھیں پوری طرح کھول کر کہا۔ مجھے لگا جیسے اس کی آنکھوں سے کرنیں پھوٹی ہوں۔

"زبردستی............ کیا مطلب؟" میں ابھی تک اس کے انداز کے متعلق سوچ رہا

تھا۔

”منے دادا تو مجھے اور امی جی کو وہیں چھوڑ کر آ رہے تھے۔ امی جی بھی کسی کی موت میں جاتے گھبراتی ہیں۔ دراصل انہیں ہنسی بہت آتی ہے اور کسی کو روتا دیکھ کر تو وہ اپنی ہنسی ضبط کر ہی نہیں سکتی تھیں مگر میں نے اکیلے کمرے میں جب انہیں دھمکی دی کہ میں ہر حال میں جاؤں گا تو وہ صرف یہ سوچ کر چلی آئیں کہ میری حفاظت کون کرے گا۔ ان کا خیال ہے کہ یہاں کہیں کوئی بہت زہریلا سانپ ہے جو غیر آباد علاقے میں جانے کی بجائے اس حویلی کو ویران کرکے یہاں پر اپنا مسکن بنانے والا ہے اور انہیں یہ بھی یقین ہے کہ یہاں ضرور خزانہ دفن ہے جس کی حفاظت پر وہ سانپ مامور کیا گیا ہے اور وہ کہیں جانے والا نہیں بلکہ وہ سب کو یہ جگہ چھوڑنے پر مجبور کر دے گا۔“

میں اس کی باتیں ان سنی کر رہا تھا کیونکہ میرے اپنے ذہن میں بہت سی باتیں تھیں جو میں اس سے کرنا چاہتا تھا۔ خزانے والی بات سن کر اچھل پڑا اور سچی بات یہ ہے کہ میرے ذہن میں یہی خیال آیا کہ عورتیں بقول دادا کے، کتنی ہی بے وقوف کیوں نہ ہوں، کبھی کبھی سرسری انداز میں بڑے پتے کی بات کر جاتی ہیں۔ بڑا ہونے کے بعد میں اس کا قائل بھی ہو گیا ہوں کیونکہ میرے تجربات نے اسے ثابت کر دیا ہے اسی لئے میں عورتوں کی ساری ”بے وقوفیاں“ بڑی توجہ سے سنتا اور دیکھتا ہوں۔ ہاں، تو میں کیا بتا رہا تھا؟ ہاں! میں خزانے والی بات پر اچھلا تھا مگر وہی بات کہ عمر اتنی نہیں تھی کہ اسے سنجیدگی سے لیتا۔ سو اگلی چند باتوں کے بعد اس بات کو بالکل بھول گیا۔ میں تو طیب کو اتنا بتانا چاہتا تھا کہ وہ سانپ نہیں، مکڑی ہے اور مکڑی کو کسی خزانے کے محافظ کی حیثیت سے میں نے کسی کہانی میں نہیں پڑھا بلکہ مکڑی کی ریپوٹیشن میرے خیال میں اتنی بری بھی نہیں رہی کہ اس سے پُراسراریت یا جیبت ناکی منسوب ہو۔

میں پیٹ کا ہلکا تھا اور اسی لئے میں اسے مکڑی کے معاملے میں اپنا رازدار بنانا چاہتا تھا۔ فرحت میرے جذبوں کی تسکین کرنے میں ناکام تھی۔ اس میں وہ جوش بھی نہیں تھا جو میرے اندر نئے حوصلے جگاتا اور نہ ہی ایسا ٹھہراؤ تھا کہ میرے اضطراب کو کم کر پاتا۔ وہ بالکل بیویوں والی طبیعت رکھتی تھی۔ ایسی بیویوں والی جو اپنے میاں کے منہ سے نکلی ہوئی ہر بات بلا سوچے سمجھے سراہا کر اس کا ساتھ دیتی ہیں۔ نہ تنقید کرتی ہیں، نہ کچھ سوچ کر مشورہ دیتی ہیں، نہ اختلاف رائے کرتی ہیں اور نہ ہی تجزیہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں!

ممکن ہے، ان میں سب کچھ کرنے کی صلاحیت ہو مگر وہ محض کاہلی کی وجہ سے ہر بات کی تائید کرتی ہوں کہ اب کون سوچے اور کون سمجھے۔ جو کچھ ہو گا، خود ہی ان کے سامنے آ جائے گا۔ تو فرحت میری رازدار ہو جانے کے باوجود میرے لئے وہ اہمیت اختیار نہ کر سکی تھی جو میں چاہتا تھا۔

میں طیب کو پسند کرتا تھا۔ اس کی سیماب صفتی نے متاثر کیا تھا۔ جان لینے اور سمجھ لینے کی عادت اسے ذہین ثابت کر رہی تھی۔ اس کی چمکدار آنکھوں میں ایسی مقناطیسی قوت تھی جو آدمی کے اندر کا حال اگلوانا جانتی تھی۔ یہ سب میں نے بعد میں محسوس کیا مگر عمر کے لحاظ سے میں اس وقت بھی اس سے اتنا ہی متاثر تھا اور جب میں نے اسے بتایا کہ وہ زہر اندیلنے والا کوئی سانپ نہیں، ایک خوبصورت مکڑی ہے تو وہ بہت دیر تک ہنستا رہا۔ اس کی ہنسی میں طنز تھا۔ یوں جیسے کوئی کسی بہت ہی بے وقوف آدمی کی بات پر بے ساختہ ہنس پڑتا ہے۔ یہی بات مجھے بری لگ گئی۔ میں نے اسے کچھ بھی نہ بتانے کا فیصلہ کر لیا پھر وہ مجھے بڑے بوڑھوں کی طرح سمجھاتا رہا مگر میں اسے یوں دیکھتا رہا، جیسے وہ انتہائی بے وقوفی کی باتیں کر رہا ہو اور وہ واقعی بے وقوف تھا۔ سچ ہے، وہ جو کچھ نہ جانے اور جانے کہ کچھ نہیں جانتا، بہتر ہوتا ہے اس سے، جو کچھ نہ جانتے ہوئے سمجھے کہ وہ سب کچھ جانتا ہے۔ طیب مجھے وہی دوہرا آدمی لگا۔ میں سب کچھ پی گیا اور یہ میرے حق میں بہتر ہی ہوا۔ کیسے، یہ میں آگے چل کر بتاؤں گا۔

خیر! چچا صاحب کی موت نے تو ہمارے خاندان کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ منے دادا سب سے زیادہ ناراض تھے کہ انہوں نے سب کو یہاں آنے سے منع کیا تھا۔ دادا کی طرم خانی بھلک چکی تھی۔ جس وقت منے دادا چیخ چلا رہے تھے، اس وقت دادا ان سے چار برس بڑے ہونے کے باوجود دس برس چھوٹے دکھائی دے رہے تھے۔ چچی صاحبہ کی حالت خراب تھی۔ ان کی اماں اور نانی انہیں یہاں چھوڑنے کو تیار نہ تھیں نہ آل اولاد تھی کہ دلوا اور دادی اپنا حق جتاتے۔ ایک مروت تھی چچی صاحبہ میں جو کہتی تھیں۔ ”اسی گھر پڑی رہوں گی۔“ سوئم کے روز عدت کو بٹھائی جاتیں مگر یہاں تو حویلی میں نکلنا ہی عذاب لگ رہا تھا۔ چچی صاحبہ کے گھر والے میرٹھ کے تھے۔ کہتے تھے۔ ”وہیں عدت پوری کر لے گی۔ کون سا آپ لوگ یہاں رہنے والے ہیں۔“

چچا صاحب کی موت کی تفصیلات تو مجھے یقین ہے کہ چھپائی گئی تھیں۔ اتنا پتا چلا

سکا کہ چچا صاحب محفل سماع کے لئے بڑے احاطے میں چبوترا صاف کروا رہے تھے۔ کھڑے کھڑے کمر چٹخنے لگی تو وہیں پڑی دریوں کے ڈھیر پر ذرا کمر سیدھی کرنے کو لیٹے تھے۔ مزدور اور لاڈلے میاں' جو بابا کی پھوپی کے اکلوتے تھے اور پھوپی کے مرنے کے بعد یہاں وہاں رہ کر دن گزار رہے تھے' وہ بھی وہیں مصروف تھے کہ اچانک چچا صاحب کی دل ہلا دینے والی چیخ نے متوجہ کرلیا۔

وہ بری طرح تڑپ رہے تھے۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا ہوا؟ حکیم بلائے گئے۔ گھر میں کہرام مچ گیا مگر چچا صاحب ذرا کی ذرا میں ابدی نیند سو چکے تھے۔ اگلے دن ہی ہمیں بلوایا گیا تھا۔ ان کی موت کے بعد پہلی رات تو بہت خوفناک گزری ہوگی۔ اس کا اندازہ مجھے گھر کے افراد کے چہرے دیکھ کر ہو رہا تھا۔ آج دوسرا دن تھا۔ لبوں پر خوف کی مہریں کچھ دھندلی ہو کر خاموشی کو مٹا رہی تھیں۔ کچھ لوگ بولنے پر آمادہ ہوگئے۔ سماعتیں کچھ متحرک ہوگئیں تو منے دادا نے سب کے لتے لے ڈالے اور اب سب چپ چاپ سر جھکائے سن رہے تھے۔

"صغریٰ کو میرٹھ بھیج دو۔ فرسودہ اور بیہودہ باتوں میں انسانی جذبوں کو مسخ نہ کرو۔ اس کا یہاں کچھ نہیں رہا۔ ماں باپ سے زیادہ ڈھارس دینے اور حوصلہ پیدا کرنے والا کوئی نہیں ہوتا اور اگر کوئی کہتا ہے کہ ہم ہیں تو سالا جھوٹ بولتا ہے۔" انھوں نے نتھنے پھلا کر کہا تھا۔

میں خوب جانتا تھا کہ ان کا اشارہ دادی کی طرف ہے۔ مزے کی بات یہ تھی کہ یہ بات دادا کے علاوہ خود دادی بھی جانتی تھیں۔ دادی تو جھٹکے سے دوسری طرف دیکھنے لگی تھیں مگر دادا نے کن انکھیوں سے دادی کی طرف دیکھ کر پھر سر جھکا دیا تھا۔ میں جان گیا کہ اب پورے خاندان کی باگ ڈور منے دادا کی لمبی لمبی خوبصورت انگلیوں میں جا چکی ہے۔ سب یہ جان کر خوش تھے مگر وہاب چاچو بہت مضطرب تھے۔ پتا نہیں کیوں وہ ملازمت سے چمٹے رہنا چاہتے تھے؟ شاید وہاں کوئی ایسی چیز تھی جو ان کے اندر کہیں اپنا کھونٹا مضبوط کرچکی تھی۔ منے دادا کو ان کے اضطراب سے کچھ لینا نہ تھا۔ رات کے گیارہ بجے ہی تو فیصلے طے پا گئے۔ چچی صاحبہ اپنے والدین کے ساتھ جا رہی تھیں۔ منجھلے چچا میاں تو پہلے از دہلی میں سیٹل ہوچکے تھے۔ رضا بھائی اور شجاع بھائی کی تعلیم کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ دہلی یہاں سے بہتر تعلیمی ادارے تھے۔ ابا تھے نہیں۔ دادا کے چہرے پر اگر دکھ تھا تو جوان بیٹے

کی موت کے بعد صرف مردان خانے کی ویرانی کا تھا۔

دادی جیسی عورتوں کے لئے دنیا کے کسی کونے میں اکیلی دیٹی کی نہ تھی۔ وہ ان عورتوں میں سے تھیں جو چند ہی دنوں میں لوگوں سے گھل مل کر ان کے راز لے لیا کرتی ہیں اور پھر زندگی کا بڑا حصہ انہی رازوں کو یہاں وہاں کرنے' بڑھانے' گھٹانے پھر مٹانے میں گزار دیتی ہیں۔ انہیں ایسے گر بھی آتے تھے کہ عورتیں یہ جان کر بھی کہ راز فاش کرنے والی دادی ہیں' اپنے اگلے راز بھی انہی سے آکر کہتیں اور امانت کا وعدہ لیتی تھیں۔ ایک ناگواری ضرور ان کے چہرے پر تھی جو منے دادا اور منی دادی کے وجود کی بنا پر تھی۔ اماں تو یہاں سے بدکی ہوئی تھیں۔ انہیں اپنے بچوں کی فکر تھی۔ سو مخالفت کرنے والا کوئی تھا ہی نہیں۔ ایک وہاب چاچو ضرور کسمسائے تھے مگر منے دادا جب دادا کو ڈانٹ سکتے تھے' تو ان کی تو حیثیت ہی کیا تھی۔

میں بہت پریشان تھا۔ شاید وہاں موجود تمام لوگوں سے زیادہ پریشان اور فکرمند!! فرحت' کاکا جان اور بی جان کے ساتھ واپس جا رہی تھی۔ مجھے جانے کی قطعی اجازت نہ ملی کہ رضا بھائی میری تعلیم کی وجہ سے سخت پریشان تھے۔ ایک دن کی چھٹی پر بھی ہنگامہ کھڑا کر دیا کرتے تھے۔ میں نے کہا بھی کہ اب ایسے حالات میں اسکول جانے کا کیا فائدہ؟ وہ گرج اٹھے۔

"کیسے حالات.........؟ ہیں.........؟ بولو! کیسے حالات؟ ایسے کون سے حالات ہیں جنہیں سدھارنے کے لئے تمہارا گھر میں اور وہ بھی بی جان کے گھر میں رہنا ضروری ہے۔ تمہارے اسکول نہ جانے سے کیا موت کا فرشتہ ٹل جائے گا کہ بھیا ادھر کو مت جاؤ۔ ادھر ضیاء بیٹھا ہے۔"

سب ہماری طرف متوجہ ہوئے۔ اماں جو اس ساری گفتگو کو دبائے رکھنے کے لئے کوشاں تھیں' ہراساں ہوگئیں۔ منے دادا اور دادا کے اس طرف متوجہ ہونے سے پہلے ہی میں دوسری طرف سرک گیا اور شجاع بھائی نے رضا بھائی کا ہاتھ دبا کر انہیں خاموش کرا دیا۔

"کیا ہے.........؟" منے دادا نے سر اٹھا کر ہماری طرف دیکھا۔

"کچھ نہیں۔" اماں نے فوراً جواب دیا اور ان کی طرف رخ کرکے پیچھے سے مجھے نوچا۔

دادا بھی ہماری طرف متوجہ ہوگئے۔ ان کی آنکھوں سے غصہ چھلک رہا تھا۔ مجھے خیال آیا' یہ وقت دادا کے مرنے کا ہونا چاہیے تھا مگر میں اس سے زیادہ نہ سوچ سکا۔ عصمت آپا نے آکر میرا اور فرحت کا بازو پکڑا اور اٹھالیا۔ "چلو! سو جاؤ تم لوگ۔"

شاید وہ طیب سے اس انداز میں بات نہیں کر سکتی تھیں یا نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ وہ یوں بھی اپنی ای جی کے ساتھ سوتا تھا مگر میں نے اسے بھی دعوت دی۔ وہ بغیر کسی سے پوچھے اٹھ گیا۔ ہم دوسرے کمرے میں آگئے۔ یہاں عصمت آپا نے دو مسہریوں کو ملا کر ایک چوڑا سا بستر بنا دیا تھا۔ ہم تینوں کو اس پر آڑا لٹا دیا گیا۔ یہ مسہری دیوار سے ہٹا کر رکھی گئی تھی۔ ان سب کے پائے چونے کے بھرے ہوئے پیالوں میں جمے ہوئے تھے۔ دیواروں پر آویزاں تصاویر اتار دی گئی تھیں۔ نئی چونا کی ہوئی دیواریں صاف شفاف آئینوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ اگر کوئی کبھی بھی کہیں بیٹھتی تو یقیناً بدنما داغ کی طرح فوراً دکھائی دے جاتی۔

ہم ادھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے مگر میں محسوس کر رہا تھا کہ طیب بہت مضطرب ہے۔ وہ کچھ اور کہنا اور کچھ اور سننا چاہتا ہے۔ میں جان بوجھ کر ادھر ادھر کی باتیں کر رہا تھا۔ اصلی بات یہ بھی تھی کہ میں اب اسے اپنے ساتھ لانے پر پچھتا رہا تھا۔ فرحت اکیلی ہوتی تو میں اسے کچھ نصیحتیں ہی کر دیتا۔ اس صندوقچی کے بارے میں کچھ ہدایات ہی دے دیتا مگر اب میں سخت بے چین تھا۔ میں نے طیب سے پوچھا۔

"تم یہاں سوؤ گے؟"

"پتا نہیں۔ میں تو سونا چاہتا ہوں مگر امی جی میرے بغیر سوتی نہیں ہیں۔ ہو سکتا ہے' مجھے سوتے سے اٹھا کر لے جائیں۔"

"تم سو جاؤ۔" میں نے بے اختیار کہا۔ وہ ذہین تھا' سمجھ گیا کہ میں اس میں دلچسپی نہیں لے رہا۔ یہ میری ایک بری عادت تھی کہ ایک بار دل جس کو رد کر دیتا تھا' اس سے منافقت برتے بغیر ہی اپنا رویہ تبدیل کر لیتا تھا۔ آگے چل کر میری اس بری عادت نے مجھے بہت سے نقصانات سے محفوظ رکھا تھا۔ میں نے طیب کو سوچنا چھوڑ کر کروٹ لے لی۔ چند ہی لمحوں بعد میں نے مسہری کو ہلتا ہوا محسوس کیا۔ مجھے لگا' جیسے طیب اٹھا ہے پھر میچی میچی آنکھوں سے میں نے اسے باہر جاتے بھی دیکھ لیا۔ فرحت اونگھ رہی تھی مگر میں نے اسے طیب کے جاتے ہی اٹھا دیا۔

ہم بہت دیر تک اس صندوقچی اور چین کے بارے میں سوچتے رہے۔ میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ اس صندوقچی میں مکڑی بھی ہے۔ صرف چین کا ذکر کیا۔ یہ بھی کہہ دیا کہ جس جن نے مجھے وہ چین دی تھی' اس نے سختی سے منع کیا تھا کہ اسے میرے سوا کوئی نہ کھول کر دیکھے اس لئے میں نے اسے ہدایت کی کہ وہ موقع ملتے ہی صندوقچی کو کہیں جگہ چھپا دے جہاں کسی اور کی نگاہ نہ جا سکے۔ میں جب بھی آیا وہ صندوقچی لے لوں گا۔ ہو سکتا ہے کہ جن اپنی چین واپس لے لے اس لئے بھی وہ اسے قطعی نہ کھولے۔ وہ سہم گئی تھی بلکہ وہ تو اب صندوقچی کو ہاتھ بھی نہیں لگانا چاہتی تھی مگر میں نے اسے ڈرا دیا کہ اگر اسے کسی نے بھی کھولا تو جن اس سے ناراض ہو جائے گا۔ اس نے مجھے بتایا کہ بی جان کے گھر میں ایک کمرا ایسا ہے جہاں برسوں پرانا سامان پڑا ہے۔ اسے کوئی نہیں کھولتا مگر فرحت جانتی تھی کہ اس کمرے کی چابیاں طاق پر رکھی رہتی ہیں۔ وہ اسے وہاں کہیں چھپا دے گی۔

میں مطمئن ہو گیا اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ مجھے پتا تھا کہ کل سویرے ہی وہ سب چلے جائیں گے۔ ہمیں بھی شاید کل ہی دہلی جانا پڑے۔ ہم باتیں کرتے کرتے جانے کب سو گئے۔ صبح عصمت آپا نے اٹھایا تو بی جان اور کاکا جان جانے کو تیار تھیں۔ دادا نے سوئم تک رکنے کا کہہ دیا۔ اماں سے پتا چلا کہ چچا صاحب کے سوئم کے بعد ہی ہماری بھی روانگی ہے۔ رضا بھائی اور شجاع بھائی اسکول سے ٹرانسفر لیٹر لینے گئے ہیں۔ وہاب چاچو بھی کوشش کرنے گئے ہیں۔ دادا نے کسی سرکاری افسر کے نام خط بھی لکھ دیا تھا جو ان کا دوست تھا۔ انہیں یقین تھا کہ وہاب چاچو کا بھی تبادلہ ہو جائے گا۔

ہماری حویلی میں زہریلی اموات کا چرچا دور دور تک ہو رہا تھا۔ امید یہی تھی کہ معقول جواز کو رد نہیں کیا جائے گا۔ یہ ساری تیاریاں دیکھ کر میں حیران پریشان تھا۔ میری ایسی کوئی جذباتی وابستگی نہ تھی کہ مجھے یہاں سے جانے کا قلق ہوتا بلکہ میں تو اس عمر میں تھا' جہاں تبدیلی بہت بھاتی ہے۔ میں تو صرف اس صندوقچی کی وجہ سے پریشان تھا۔ یہ مجھے بعد میں پتا چلا کہ وہ وابستگی بھی وقتی تھی۔ پتا نہیں' کیوں میں بے وجہ پریشان تھا۔ اس لئے کہ "ملکیت" کا یہ پہلا پہلا احساس تھا۔ وہ واحد چیز دنیا میں ایسی تھی جسے میں' صرف اور صرف "اپنی" کہہ سکتا تھا۔ اس کے بارے میں فیصلے کر سکتا تھا۔ اسے اپنی مرضی سے یہاں وہاں رکھ سکتا تھا اور ملکیت کا یہ احساس اس قدر خوبصورت اور طاقتور ہوتا ہے کہ جس

نے آزاد' خوش اور خود مختار انسانوں کے اندر تفریق پیدا کر کے اسے جہنم کا مکین بنا دیا تھا۔ اسی احساس نے قدریں تبدیل کیں۔ اسی نے تیرا میرا کر کے رشتوں کو جنم دیا۔ اسی نے معاشرے کو توڑ موڑ کر ایک عجیب و غریب شکل میں ڈھال دیا تھا۔

بہرحال دوسری رات خیریت سے گزر گئی۔ تیسری صبح خاصی ہنگامہ خیز تھی۔ سوئم کا اہتمام بھی تھا اور سفر کی تیاری بھی۔ سفر بھی ایسا جس میں تمام زاد راہ بشمول وہاں زندگی شروع کرنے کے تمام لوازم بھی اشد ضروری تھے۔ صبح ہی سے لوگوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ ان میں زیادہ تر وہ لوگ تھے جو ان عجیب و غریب واقعات کی تفصیل سننا چاہتے تھے۔ کچھ ریسرچر تھے اور پتا نہیں' کس بات اور کس چیز پر ریسرچ کرنے کی وقیق باتیں کر رہے تھے۔

جو میری سمجھ میں تو کیا' رضا بھائی اور شجاع بھائی کی سمجھ میں بھی نہیں آ رہی تھیں۔ دادا نے ان سب لوگوں کو ڈانٹ کر بھگا دینے کا حکم دیا تھا۔ رضا بھائی اور شجاع بھائی ایسے ہی لوگوں کے استقبال کے لئے کھڑے تھے۔ وہاب چاچو سوئم میں شریک ہونے والوں کی رہنمائی کر رہے تھے اور دادا اور منے دادا ان سرکاری لوگوں کی آؤ بھگت میں لگے تھے جن کے آنے کے بعد وہ لوگ کافی دیر کے لئے مردان خانے میں بند ہو جاتے تھے۔ بڑی خفیہ میٹنگیں ہو رہی تھیں۔ میں بہت کسمسایا ہوا تھا۔ کچھ پتا ہی نہیں چل رہا تھا مگر میں رفتہ رفتہ بھولتا چلا گیا۔ وہ چیز یہاں تھی ہی نہیں جو میرے ہیجان کو برقرار رکھتی۔

اماں نے جانے والے سامان کو اپنے کمرے میں رکھ کر کمرا بند کر دیا تھا تاکہ بچے وہاں گھس کر چیزیں ادھر ادھر نہ کر دیں۔ کیونکہ ابھی تو سارا سامان ٹھیک سے پیک بھی نہ کیا گیا تھا۔ گھر مہمانوں سے بھرا تھا۔ کام بہت تھا اس پہ بھی اماں کا حکم تھا کہ کوئی بھی کی چیز نظر آئے تو اسے سنبھال لیا جائے۔ غالباً آج کی تمام رات سفر کی تیاری میں گزر تھی۔ میں طیب کو لئے یہاں وہاں پھرتا رہا۔ وہ بھی اضطراب کا شکار تھا مگر بے بس ہو کر گیا تھا۔ ہمیں سیپارہ پڑھنے کو تو کسی نہیں دیا' الحمد شریف کے دانے پڑھ کر پھر کھیل میں لگ گئے۔

میں اور طیب باہر لگے شامیانے کے ایک کونے میں بیٹھے تھے کہ اچانک ایک کالے رنگ کی لمبی سی گاڑی سامنے آ کر رک گئی۔ سبھی اس طرف متوجہ ہو گئے۔ میں اس گاڑی میں سے اسی انگریز کو نکلتا دیکھ کر اچھل کے کھڑا ہو گیا۔ شجاع بھائی بھی اسے دیکھ چکے

تھے۔ وہ جو پہلے ہی سرخ تھا' مزید تمتماتا ہوا لگ رہا تھا۔ پریشانی اور گھبراہٹ اس کے چہرے اور پورے وجود سے ٹپک رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں دہلا دینے والی بے چینی تھی۔ میں لپک کر اس کے قریب چلا گیا۔ طیب اس بات سے متاثر ہو کر قریب آیا تھا کہ ہمارے یہاں انگریز بھی آتے ہیں۔

شجاع بھائی سب کچھ بھول کر اس کی طرف لپکے تھے۔ میں جانتا تھا کہ شجاع بھائی اس سے چڑے ہوئے ہیں۔ اس کی آمد نے ان میں کوئی خوشگواریت پیدا نہیں کی ہو گی۔ شجاع بھائی یوں اچانک اس کے سامنے آ گئے جیسے وہ اندر آنے سے روکنے کی کوشش کر رہے ہوں۔

"دیکھا.......... دیکھا تم!! ہم بولا تھا نا! یہ بہت ڈینجرس ہے۔ اگر وہ چین نہیں ملا تو........... او مائی گاڈ........... تم لوگ سمجھتا نہیں ہے۔ اسے ڈھونڈو.......... تلاش کرو۔ تم سب........... تم سب ختم جائیں گے........... پلیز........... وہ اولڈ مین کدھر ہے؟ وہ تمہارا گرینڈ فادر..........." وہ اندر جانے کو بے چین تھا۔

"آپ یہاں بیٹھیں.......... میں دادا کو بلاتا ہوں۔" شجاع بھائی نے اسے ایک قدم بھی آگے نہ بڑھانے دیا۔

میں قریب ہی کھڑا تھا۔ آڑھی پڑی کرسی کو میں نے جلدی سے سیدھا کیا اور ہاتھ سے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس نے لمحہ بھر کو میری طرف دیکھا تھا.......... اف.......... میں بتا نہیں سکتا کہ اس کی آنکھوں میں کیا تھا؟ کیا تم یقین کرو گی کہ میں نے اس کی چھوٹی چھوٹی نیلی آنکھوں میں بڑی بڑی کھوپڑیوں والے بہت سے ڈھانچوں کو ناچتے دیکھا تھا اور پھر اپنے اندر.......... اور اپنے اردگرد ایسی خوفناک اور ہڈیوں کو چیر دینے والی ٹھنڈک محسوس کی تھی جو کپکپاہٹ نہیں دوڑاتی بلکہ آناً فاناً منجمد کر دیتی ہے۔ میں بھی ساکت رہ گیا۔ طیب کا مجھے نہیں پتا کیا ہوا۔ پھر مجھے ایک کھڑکھڑاتی ہوئی آواز آئی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"تھینک یو.......... تھینک یو ویری مچ.........."

اور ہواؤں میں خوف ہلکورے لے گیا۔ میں جو اس سے باتیں کرنے کی غرض ہی سے آیا تھا۔ الٹے قدموں لوٹ گیا۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ میں اس پوری دنیا میں بالکل اکیلا رہ گیا ہوں۔ ایک نظر نہ آنے والی دھول سی اڑتی محسوس ہوئی تھی جیسے بے آب و گیاہ صحرا میں اچانک تیز ہوائیں چل پڑی ہوں۔ پاؤں گرم گرم ریت میں دھنستے

محسوس ہوتے تھے۔ لگا جیسے میں گرنے والا ہوں۔ میں نے پلٹ کر دیکھے بغیر کسی چیز کا سہارا لینے کی کوشش کی۔ کوئی نرم سی چیز میں ہاتھ میں آگئی اور جیسے.......... جیسے میں زندہ ہوگیا یا باقی سب زندہ ہوگئے۔ بالکل اسی طرح جس طرح کسی فلم کا سین اچانک بدل جاتا ہے۔ میرے چاروں طرف گہما گہمی تھی۔ بچے اس بات سے بے خبر کہ یہ دیکھے کی تقریب نہیں' سوئم ہے۔ کرسیوں کے درمیان بھاگتے پھر رہے تھے۔ دائیں جانب اور پیچھے بنا چبوترے پر سفید چاندنیوں پر لوگ بیٹھے ہل ہل کر سیپارے پڑھ رہے تھے۔ تب میں نے دیکھا کہ میرا ہاتھ طیب کے ہاتھ میں ہے۔ وہ کچھ کہہ رہا تھا۔

"میں نے بھی کہہ دیا کہ نہیں۔"

پتا نہیں اس نے جملہ کہاں سے شروع کیا تھا۔ میں تو بس اتنا ہی سن پایا۔ وہ اور میں وہیں قریب کی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ میری کیفیت ایسی تھی جیسے گہری اور بے خبر نیند سے اچانک بیدار کر دیا گیا ہوں۔ سب کچھ سمجھ لینے میں چند سیکنڈ لگے تھے۔ میں نے ہوش میں آتے ہی پلٹ کر اس آدمی کی طرف دیکھا جو کرسی پر یوں ٹکا بیٹھا تھا جیسے کرسی پر نہ ہو۔ اک ذرا سا اچکا ہوا بیٹھا ہوا اور اشارہ ہوتے ہی اچھل کر کھڑا ہو جائے گا۔ اس کی لمبی گردن سارس کی طرح اکڑی ہوئی تھی' ہاتھ اضطرابی انداز میں مسلسل ہل رہے تھے ہاتھ میں ایک سفید رنگ کا لمبا سا لفافہ تھا جسے وہ کبھی ایک ہاتھ میں تھامتا اور کبھی دوسرے ہاتھ میں۔ کبھی اسے گود میں رکھ کر انگلیوں کی پوروں سے تھپتھپاتا۔ کبھی انگلیوں کے درمیان نچانے لگتا۔ اس کی نگاہیں حویلی کے اندرونی دروازے پر تھیں جہاں سے شجاع بھائی اندر جا چکے تھے۔

"تم سے کچھ کہا تھا انہوں نے؟" طیب میری طرف جھکا ہوا پوچھ رہا تھا۔

"کیا..........؟" میں چونک اٹھا۔

"تم سے کیا کہا؟" اس نے بوٹ کی نوک سے زمین پر ضرب لگا کر وہاں پھنسا ایک پتھر نکالتے ہوئے پھر کہا۔

"کس نے؟" میں الجھ گیا۔

"دادا نے!" وہ سر اٹھا کر مجھے دیکھنے لگا۔

"کچھ نہیں کہا۔ پتا نہیں تم کیا کہہ رہے ہو۔" میں نے بڑبڑانے کے سے انداز میں کہا۔ اب مجھے اس کا ساتھ کھل رہا تھا۔ مجھے یہ احساس ہو رہا تھا جیسے کوئی دائیں بائیں

مجھے کھینچ رہا ہو۔ دونوں طرف برابر کا زور تھا اور میں جیسے چرا جا رہا تھا۔ اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ میرے چہرے پر یقیناً اسی قدر ناگواری تھی کہ اس کا منہ بن گیا۔ وہ تیزی سے اٹھا اور بھد بھداتا ہوا اندر چلا گیا۔ میں نے کچھ سکون محسوس کیا۔ پھر اسی آدمی کی طرف متوجہ ہوگیا۔ جس کی بے چینی بتدریج بڑھتے بڑھتے خوفناک صورت اختیار کر چکی تھی۔ اب وہ اٹھ اٹھ کر بیٹھ رہا تھا۔ کھڑا ہو کر دروازے کی طرف دیکھتا۔ بیٹھتا' چاروں طرف گردن گھماتا پھر کھڑے ہو کر سامنے دیکھنے لگتا تھا۔

میں نے دیکھا' شجاع بھائی کے ساتھ دادا باہر آ رہے تھے۔ اس شخص کو جیسے قرار آگیا' مگر پھر وہ لپکا اور اس سے پہلے کہ دادا اس کے قریب آتے' وہ ان تک پہنچ گیا۔ میں نے شدت سے چاہا کہ میں ان دونوں کے قریب ہو جاؤں مگر یوں لگتا تھا جیسے مجھ پر فالج گر پڑا ہے۔ ٹانگیں سیدھی ہی نہ ہوئیں۔ نہ بدن میں کوئی حرکت ہوئی۔ وہ دادا کے قریب پہنچ کر' ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں زبردستی اپنی گاڑی کے قریب لے گیا۔ شجاع بھائی وہیں کھڑے رہ گئے۔ غالباً وہ بھی ساتھ ہی جانا چاہتے تھے مگر اس نے ان سے کچھ کہا تھا اور شجاع بھائی ٹھٹک کر رک گئے تھے۔ اس پل میری خواہش ہوئی کہ کاش بصارت کی طرح میری سماعت بھی اتنی ہی طاقتور ہوتی۔ میں اتنی دور سے سب کچھ صاف دیکھ رہا تھا تو سن بھی سکتا۔

وہ دادا سے رازدارانہ انداز میں کچھ کہہ رہا تھا۔ اس کے جبڑے یوں ہل رہے تھے جیسے چہرے سے الگ ہوگئے ہوں۔ کھال آہستہ آہستہ چہرے کی ہڈی چھوڑتی اور لرزتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ کچھ کہہ رہا تھا اور اس دوران میں' میں نے دادا کو دوبار چونک کر اس کی طرف دیکھتے دیکھا۔ پھر اس نے لفافہ کھولا۔ اس میں سے کچھ نکالا اور کچھ آڑھا ہو کر وہ دادا کو دکھانے لگا۔ پل بھر وہ اس چیز کے اور میرے درمیان حائل ہوا تھا مگر دادا ایک قدم پیچھے ہٹے تو میرے کانوں میں سیٹیاں سی بجنے لگیں۔ وہ ایک تصویر تھی۔ بہت واضح اور صاف گہری نیلی مخملیں چادر پر چین ایسے بچی تھی جیسے سنار کے ڈبے میں بچی ہوتی ہے۔ میرے تلووں میں چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ سر میں دھماکے سے ہونے لگے۔ یہ شاید اس لئے ہوا تھا کہ میں اپنی تمام حسوں اور تمام قوتوں کو قوت سماعت میں تبدیل کرنے کی شدید کوشش کر رہا تھا۔

دادا نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے تصویر اسے واپس کر دی۔ اب میں نے اپنی نگاہ

دادا کے چہرے پر مرکوز کر دی۔ ان کے چہرے پر ناراضگی اور ناگواری تھی۔ ان کے چہرے سے لگتا تھا کہ وہ کچھ سننے کو تیار نہیں ہیں۔ اس کی کوئی بات ماننے پر آمادہ نہیں ہیں اور وہ انہیں قائل کرنے' اپنی بات منوانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اچانک اس پر گہری مایوسی' بے بسی اور بے چارگی چھا گئی۔ اس نے تصویر لفافے میں رکھی' پھر دونوں ہاتھ پھیلا کر دادا کو عجیب سی رحم طلب نگاہوں سے دیکھا۔ دادا فرعون لگ رہے تھے۔ انہوں نے اس کے چہرے پر نگاہ ہی نہیں ڈالی اور پلٹ کر یوں دروازے کی طرف دیکھنے لگے جیسے اسے احساس دلا رہے ہوں کہ اندر انہیں بہت کام ہے اس لئے اب اسے چلے جانا چاہئے۔

وہ شخص اسی طرح ہاتھ پھیلائے پھیلائے الٹے قدموں چلنے لگا۔ یقین کرو سیما! مجھے یوں لگا جیسے دادا نے اس کی موت کے پروانے پر دستخط کر دیئے ہوں' اس نے اپنی زندگی کی بھیک مانگی ہو' آخری کوشش کی ہو مگر دادا نے انکار کر دیا ہو اور.......... اور اب وہ خود چل کر تختہ دار کی طرف جا رہا ہو۔ یخ لہروں کا احساس پھر شدید ہوا۔ میں نے بے اختیار اپنے دونوں ہاتھ اپنے رخساروں پر رکھ لئے اس لئے کہ مجھے ڈر لگا تھا۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ میرے دونوں ہاتھ جیسے برف کی سلوں سے ٹکرائے تھے۔ میں نے بے ساختہ ہاتھ کھینچ لئے۔

وہ کار میں بیٹھ رہا تھا۔ دادا پلٹ کر دروازے کی طرف جا رہے تھے۔ اب وہ رو رہا تھا۔ باقاعدہ رو رہا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں کے کٹوروں میں گہرا نیلا پانی بھرا صاف دیکھ لیا تھا۔ اس کے چہرے کی کھال تھرا رہی تھی۔ وہ نیچے کو لٹک آئی تھی اور پھر وہ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ سفید وردی والے ڈرائیور نے گاڑی چلا دی۔ گاڑی میری طرف بڑھ رہی تھی۔ فضاؤں میں بسی ٹھنڈک میں اب سوئیاں سی بھر گئی تھیں۔ میرے بدن پر چھید ہو رہے تھے۔ ساری آوازیں' ساری حرکتیں معدوم ہو گئی تھیں بس ایک اس کی سیاہ رنگ کی چمکیلی گاڑی تھی جو کسی عفریت کی طرح میری طرف بڑھ رہی تھی اور جب وہ میرے پاس سے گزری تو میں نے اس کے چہرے پر ایسی خوفناکی' ایسا کرب دیکھا کہ پورے بدن کی جان ہی نکلتی محسوس ہونے لگی۔ چکر سا آ گیا۔

"ضیاء......... ضیاء.........."

میں اچھل پڑا۔ آواز ایسی ہی تھی جیسے اسی قبر سے آ رہی ہو۔ وہی خواب والی قبر

میں نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ فرحت میرے کندھے کو جھنجھوڑ رہی تھیں۔

"ضیاء تم بیٹھے بیٹھے سو رہے ہو۔ اندر چلو۔ خالہ جان بلا رہی ہیں۔" وہ اماں کو خالہ جان کہتی تھیں۔ میں نے کچھ نہ سمجھنے کے سے انداز میں اسے دیکھا' واقعی میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ میں خالی الذہنی کی حالت میں بدن ڈھیلا چھوڑے بیٹھا تھا۔

"چلو نا!" اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا۔

میں جیسے خواب کی سی اس کیفیت سے نکل آیا۔ کھڑا ہوا اور اس سے ہاتھ چھڑا کر اندر بھاگا۔ مجھے خوف محسوس ہو رہا تھا مگر میں یہ نہیں جان سکا کہ یہ خوف کیسا ہے۔ اندر داخل ہوتے ہی میری نگاہ دور کھڑے دادا پر پڑی۔ وہ وہاب چاچو سے کچھ کہہ رہے تھے۔ شجاع بھائی بھی ان کے قریب کھڑے تھے۔ دادا کے چہرے پر غصہ تھا۔ وہاب چاچو کے چہرے پر حیرت اور شجاع بھائی کے چہرے پر ناگواری چھائی ہوئی تھی۔

میں جان گیا کہ بات اسی انگریز کی ہو رہی ہے۔ پاس جاتا تو دادا ڈانٹتے۔ اماں دیوار سے لگی سیپارہ پڑھ رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے سر کے اشارے سے مجھے اپنے قریب بلایا۔ برابر میں سرک کر میرے لئے جگہ بنائی اور میں جلدی سے ان کے قریب پہنچ کر دبک گیا۔ ان کے وجود کی قربت نے مجھے کافی حرارت پہنچائی جبکہ وہ میرے سرد بدن کو محسوس کر کے حیران ہوئیں۔ خود سے چمٹا لیا پھر جلدی جلدی سیپارہ ختم کر کے عصمت آپا سے چادر منگوا کر مجھ اوڑھا دی۔ میں کافی دیر تک وہیں دبکا رہا۔ بدن میں بالکل جان نہیں تھی حالانکہ فرحت نے مجھے کئی بار بلایا۔ زین اور زینت بھی بار بار آ کر مجھے بلا رہے تھے مگر میں جیسے ہلنے جلنے کے قابل ہی نہ تھا۔

شاید گھنٹا بھر بعد ہی قرآن پاک مکمل ہو گیا۔ سیپارے سمیٹ لئے گئے۔ دسترخوان لگ گئے۔ اماں نے مجھے وہیں کونے میں پڑے تخت پر لٹا دیا۔ کھانا لگا فاتحہ کا کھانا مسجد بھجوایا گیا۔ لوگ آتے رہے' جاتے رہے' میں وہیں لیٹا سب کے چہروں کے تاثرات کو نوٹ کرتا رہا۔ آنے والی ہر خاتون بوکھلائی ہوئی سی داخل ہوتی اور لپک کر سفید چاندنی پر آ جاتی' بیٹھنے سے پہلے تشویش بھری نگاہوں سے چاروں طرف دیکھتی' دیواروں کے کونوں کے نیچے سے اوپر تک نگاہ ڈالتی۔ چھت کی طرف دیکھتی' پھر بڑے سنبھل کر سمٹ کر بیٹھ جاتی۔ مجھے یہ سب دیکھتے ہوئے لطف آنے لگا۔

معاً مجھے خیال آیا کہ وہ مکڑی تو بی جان کے گھر میں صندوقچی میں بند ہے پھر چچا

صاحب کو کاٹنے والی مکڑی کہاں ہے؟ کیا یہاں اور بھی مکڑیاں ہیں؟ اس سوال نے مجھے بے چین کر دیا۔ میرا جی چاہا کہ میں اٹھ کر ڈھونڈوں لیکن مجھے فوراً ہی یاد آ گیا کہ بڑی کو کھانے والی مکڑی ایک نہیں، سینکڑوں تھیں اور پھر وہ سب دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو گئی تھیں۔ میرے پاس تو صرف ایک تھی۔ وہ سب یقیناً یہیں ہوں گی۔ اس کا مطلب ہے ابھی یہاں اور لوگوں کو بھی مرنا ہے۔ پھر تو دادا کا فیصلہ ٹھیک تھا کہ وہ سب کو چھوڑ رہے تھے۔ مجھے بھی اس صندوقچی کو کہیں دور پھینک دینا چاہیے تھا۔ چین نکال کر اس صندوقچی میں بند کر کے کہیں پھینک دینا ہی میرے حق میں بہتر تھا۔ میں نے سوچ لیا خود تو وہاں نہیں جا سکوں گا لیکن فرحت کو بتا دوں گا کہ اس میں مکڑی ہے، مگر وہ کچھ نہ کہے گی۔ فرحت اس میں سے چین نکال لے اور صندوقچی کہیں اور پھنکوا دے۔

☆ ☆ ☆

یہی باتیں سوچتے سوچتے مجھے اونگھ آ گئی۔ سونے سے پہلے میں نے اپنے اندر ایک آنچ سی محسوس کی تھی۔ جیسے کہیں اندر بھٹی سلگنا شروع ہو گئی ہو۔ اس کے ساتھ میرے پپوٹے بھاری ہو گئے تھے۔ پتا نہیں میں کتنی دیر سویا ہوں۔ بڑی میٹھی اور گہری تھی۔ شاید میں ابھی اور سوتا مگر حویلی میں آنے والے خوفناک زلزلے سے میری آنکھ کھل گئی تھی۔ میں بہت دیر اپنے تخت کو تھامے رہا۔ کچھ دیر بعد اندازہ ہوا کہ یہ زلزلہ نہیں تھا، چیخوں کی آوازیں ہیں، ساتھ ہی بھاگتے ہوئے قدموں کی دھمک نے زلزلے کی سی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ میں بوکھلا کر ناچ گیا۔ آوازیں چاروں طرف سے آتی محسوس ہو رہی تھیں پھر اندازہ ہوا کہ چیخوں کی آوازیں اماں کے کمرے کے سامنے والے برآمدے سے آ رہی ہیں، میں اس طرف تھا جس طرف تحسین خالہ کا کمرا تھا۔ یہاں سے وہاں کا منظر نظر آتا تھا۔ البتہ میں نے باہر کے ملازمین کو بھی اندر آتے اور اس طرف بھاگتے ہوئے دیکھا۔ ادھر کا حصہ سنسان تھا۔

میرے دیکھتے ہی دیکھتے محلے کے کچھ لوگ بھی پاگلوں کی طرح بھاگتے ہوئے آ گئے۔ اب میں بدکے ہوئے گھوڑے کی طرح اس طرف بھاگ اٹھا۔ پورا برآمدہ لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ اماں، عصمت آپا اور زہرہ آپا کی چیخیں رک ہی نہیں رہی تھیں۔ ہڑبونگ میں، میں رستہ بناتا ہوا گھستا چلا گیا۔ شجاع بھائی اور رضا بھائی کے علاوہ مجیب صاحب، وہاب چاچو اور دادا بھی وہیں تھے۔ دادا چیخ چیخ کر کچھ کہہ رہے تھے۔ شجاع

اور رضا بھائی عصمت آپا اور زہرہ آپا کو قابو میں کر رہے تھے۔ اماں کو دادی اور منجھلی چچی سنبھالے تھیں۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ ہوا کیا ہے۔ اتنے میں منے دادا چیخے۔

”روکو......... ان سب کو روکو......... جائیں آپ لوگ یہاں سے چلے جائیں، شرم نہیں آتی آپ لوگوں کو۔ زنانے میں گھسے چلے آتے ہیں۔“

وہ اماں کے کمرے کے دروازے پر یوں کھڑے تھے جیسے لوگوں کو اندر جانے سے روکنا چاہتے ہوں۔ کچھ لوگ تو کھسیانے ہو کر لوٹ گئے تھے۔ کچھ کے چہروں پر سخت ناگواری پھیل گئی تھی۔ کچھ پر کوئی اثر نہ تھا وہ سب آپس میں ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ کیا ہوا ہے۔ کچھ معاملے کو پُراسرار بنانے کے لئے بڑی خوفناک باتیں کر رہے تھے۔

میں اتنی دیر میں کسی نہ کسی طرح اس دروازے تک پہنچ گیا۔ شجاع بھائی اور رضا بھائی، اماں اور دونوں بہنوں کو دوسرے کمرے میں لے گئے تھے۔ دادی وغیرہ سب انہی کے ساتھ چلی گئی تھیں۔ یہاں صرف دادا، منے دادا، منجھلے چچا اور ناصر چچا وغیرہ رہ گئے تھے۔ وہاب چاچو پتا نہیں کہاں چلے گئے تھے۔ منے دادا کے قریب پہنچ کر میں نے جونہی اندر جھانکا۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ جھرجھری سی چھوٹ گئی۔ وہاں دروازے سے لے کر اندر تک مکڑی کے جالے تنے ہوئے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ کمرا ہزاروں برس سے بند ہو۔ وہ جالے اتنے بڑے بڑے اور ایسے خوفناک تھے کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ اسی دوران میں منے دادا کی نگاہ مجھ پر پڑی، انہوں نے میری کمر پر دھپ جمایا اور دھاڑے۔ ”چلو بھاگو.........“

میں پلٹ کر بھاگ اٹھا۔ وہ نہ بھی کہتے تو میں بھاگ جاتا۔ وہاں کھڑا رہنا میرے لئے ممکن تھا ہی نہیں۔ اس خوف سے ہی میرا دم نکل گیا تھا کہ اگر اندر مکڑیاں ہیں تو ابھی ہم سب کو چمٹ جائیں گی اور ہمیں کھا لیں گی......... اور میں یہ کہتا ہوا بھاگا کہ مکڑیاں......... آدم خور مکڑیاں۔

میرے منہ سے مکڑیوں کا ذکر سنتے ہی وہ لوگ جو اب بھی ادھر ادھر کھڑے تھے اور معاملے کی گہرائی میں جانا چاہتے تھے، سرپٹ باہر کی طرف بھاگے۔ خود گھر کے افراد کو بھی شاید میرے کہنے کے بعد ہی احساس ہوا تھا کہ مکڑیاں اندر ہیں تو باہر بھی آ سکتی ہیں۔ میرے پیچھے ہی سب نے برآمدہ خالی کر دیا۔ ہر طرف افراتفری مچی ہوتی تھی۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے گھر کے لوگ جس حالت میں تھے اسی حالت میں گھر سے باہر نکل آئے۔ چادروں میں لپٹی اماں' زہرہ آپا' عصمت آپا' دادی وغیرہ بھی گھر سے باہر آ گئی تھیں۔ شجاع بھائی وغیرہ تانگے لے آئے۔ سب کو ان میں بھر کر بی جان کی طرف روانہ کر دیا۔ مجھے اب پتا چلا کہ چچی صاحب اپنے والدین کے ساتھ میکے جا چکی ہیں اور بی جان' کاکا جان اور فرحت کو بھی گئے بہت دیر ہو چکی ہے۔

☆------------☆------------☆

ہم حویلی سے باہر نکلے تو یوں لگا جیسے ساری دنیا کو اس واقعے کی خبر ہو چکی ہے۔ دور تک سر ہی سر نظر آ رہے تھے۔ تین تانگے بھر کر ہم لوگ بی جان کے گھر پہنچے تو وہاں ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ ایک ہی پل میں محلے والوں کو خبر ہو گئی۔ اماں وغیرہ کی حالت بہت بری تھی۔ خوف نے سب کے چہروں پر ہلدی کھنڈ دی تھی۔ اب میں بے پناہ خوف محسوس کر رہا تھا۔ مجھے اپنے اندر تھرتھراہٹ سی محسوس ہو رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی میرے دل کو مٹھی میں لے کر بھینچ رہا ہے۔ فرحت سو چکی تھی مگر اس ہنگامے کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک بھی محسوس ہوتی تھی مگر اس کی تمام سیماب صفتی ہوا ہو چکی تھی۔

"ارے ہوا کیا ہے بنو! مجھے بتاؤ تو۔" بی جان اماں کو بنو کہا کرتی تھیں' وہ ان کے سفید چہرے کو دونوں ہاتھوں میں تھامے پوچھ رہی تھیں۔ اماں کے ہونٹوں پر جیسے مہر لگی تھی۔ زہرہ آپا اور عصمت آپا کی تو ہچکیاں بندھ ہوئی تھیں۔ دادی نڈھال سی پڑی تھیں۔ منجھلی چچی دادی کی ٹانگیں دبا دبا کر رو رہی تھیں۔ اماں نے لحہ بھر کو بی جان کی طرف دیکھا۔ میں پوری طرح ان کی طرف متوجہ تھا۔ میں خود بھی جاننا چاہتا تھا کہ کیا ہوا ہے؟

"بی جان...... وہ ہم سب کو مار دیں گی۔ ہم سب کو......"

"اے اللہ نہ کرے۔ کیوں بدفال منہ سے نکالتی ہو!" بی جان اماں کو تسلی دیتے دیتے خود بھی رو پڑیں۔ پھر دوسرے ہی لمحے دوپٹے سے ناک پونچھتے ہوئے دوبارہ بولیں۔ "کیا پھر کسی کو؟"

"نہیں۔" اماں ایک دم بول اٹھیں۔ "سب کے چلے جانے کے بعد میں عصمت اور زہرہ کو لے کر اپنے کمرے کی طرف بڑھی۔ سامان بکھرا ہوا تھا۔ سب سمیٹنا تھا۔ میں نے کہا تینوں مل کر سمیٹ لیں گے تو جلدی کام نمٹ جائے گا۔ میں نے جونہی اپنے کمرے

کا دروازہ کھولا بی صفان...... مانو میں کسی ہزاروں برس پرانے کھنڈر میں آ گئی۔ یہاں سے وہاں تک جالے تنے تھے۔ ہر چیز پر جالے۔ اتنے بڑے بڑے۔ دروازہ کھلتے ہی ہوا سے جھومنے لگے۔ میرے پیچھے ہی عصمت اور زہرہ تھیں۔ ہماری تو گھگھی بندھ گئی بی جان...... اے اللہ ہم سے ایسی کیا خطا ہو گئی۔ جانے کس جنم کا برا کیا آگے آ رہا ہے۔ ہائے بی جان! میرے بچوں کی جانیں ہتھیلی پر آ گئیں۔ ہائے جانے کتنی آدم خور مکڑیاں ہوں گی وہاں کہ منٹوں میں کچھ کا کچھ کر ڈالا۔" اماں اب باقاعدہ بین کر رہی تھیں۔ اچانک وہ چونکیں۔ چاروں طرف دیکھنے لگیں۔ مجھ پر نگاہ ڈالی پھر عصمت آپا اور زہرہ آپا کو دیکھا اور اٹھ کر باہر کی طرف بھاگیں۔ "اے شجاع...... رضا...... ہائے دونوں کہاں ہیں؟"

بی جان نے لپک کر تھام لیا۔ "دونوں یہیں ہیں بنو۔ وہ دونوں یہیں ہیں۔"

اماں نڈھال ہو کر وہیں ڈھے گئیں۔

اب میں اس مکڑی سے خوفزدہ ہو چکا تھا۔ میں چپکے سے اماں کے پاس سے اٹھ گیا۔ فرحت کاکا جان سے لپٹی بیٹھی تھی۔ میں نے اشارے سے اسے بلایا۔ صندوقچی کے متعلق پوچھا تو اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ میں نے جا کر مسہری کے نیچے جھانکا۔ صندوقچی وہاں نہیں تھی۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ پھر تو پھرکی کی طرح پورے گھر میں پھر گیا پھر مجھے صندوقچی کہیں دکھائی نہ دی۔ مسہری کے نیچے کا حصہ صاف ستھرا تھا۔ لگتا تھا جیسے کسی نے صفائی کی ہے۔ میں نے فرحت کو بتایا' پہلے تو وہ حیران ہوئی پھر بولی۔

"ارے ہاں۔ اکابوا کو پتا ہو گی۔"

"کون اکابوا؟" میں نے پوچھا۔

"ارے وہی...... موٹی سی بھدو۔ بھئی ستارہ کی اماں۔"

ستارہ بی جان کے منشی کی بیٹی تھی۔ یہ منشی بی جان کے مکان کے پچھواڑے چھوٹے مکان میں رہتا تھا۔ یہ مکان بی جان نے ہی بنوا کر دیا تھا۔ وہ اپنی موٹی سی بیوی اور دونوں بیٹیوں کے ساتھ وہیں رہتا تھا...... اکابوا' بی جان کے پاس کبھی کبھی آتی تھیں مگر ان کی دونوں بیٹیاں ستارہ اور شبانہ بی جان کے گھر کے سارے کام کیا کرتی تھیں۔

"انہیں کیسے پتا ہو گا؟" میں بے چین ہو گیا تھا۔

"بی جان گھر کی چابیاں انہیں دے جاتی ہیں ناں! وہی صفائی وغیرہ کراتی ہیں۔ ضرور یہ ستارہ کی بچی نے لی ہو گی۔ وہی ہے ندیدی' ہر چیز پر اس کی نظر لگی رہتی ہے۔"

فرحت معاملے کی سنگینی کو سمجھے بغیر بول رہی تھی اور میرے اندر ابال سے اٹھ رہے تھے۔ اگر ایسا ہوچکا تھا تو یہ تو بہت خطرناک تھا مگر اس وقت میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ رات ہوچکی تھی۔ گھر میں ویسے ہی خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔ اکابوا تو چیخ پکار کی آوازیں سن کر آگئی تھیں مگر ستارہ شبانہ نہیں آئی تھیں اگر ستارہ یا اکابوا وہ صندوقچی لے بھی گئی تھیں تو ان کے گھر میں ہوگی۔ اگر میں وانہیں بتا دیتا کہ اس میں کیا ہے تو ایک اور قیامت آجاتی۔ بہت سوچ بچار کے بعد میں نے سوچا کہ چپ رہوں۔ وہ چھین میرے لئے مصیبت بن چکی تھی۔ اپنے ساتھ لے جانا یوں بھی خطرناک تھا اور مکڑی کے بارے میں تو پہلے ہی سوچ چکا تھا کہ اسے کہیں ،بز ر پھنکوا دوں گا۔

☆==========☆==========☆

وہ رات بڑی قیامت کی تھی۔ اس رات شاید کوئی بھی نہیں سویا۔ میں بہت دیر جاگ پھر جانے کب سوگیا۔ صبح اٹھایا گیا تو سب جانے کو تیار تھے۔ بی جان نے تو بہت کہا کہ یہاں رہو مگر دادی اور دادا نہیں مانے۔ منے دادا بھی کسی کو یہاں چھوڑنے کو تیار نہ تھے۔ وہاب چاچو سب کے ٹکٹ لے آئے تھے۔ بی جان نے کچھ سامان ساتھ کر دیا ورنہ ہم لوگ تو بس تن کے کپڑوں میں تھے۔ دادا نے کہہ دیا کہ کسی چیز کا قلق نہ کیا جائے۔ جان ہے تو جہان ہے۔ صرف مجھے ہی کیا' شاید گھر کے سارے افراد کو گھر کے مردوں کی فکر تھی' سب کو صحیح سلامت دیکھ کر لوگوں کے چہروں کا خوف کچھ کم ہوچکا تھا۔

ہم پھر اسٹیشن پہنچ گئے۔ میں نے فرحت سے کہہ دیا تھا کہ اب وہ صندوقچی کو بھول جائے۔ وہ شاید جن لے گیا ہے۔ جن کے نام پر وہ پھر خوفزدہ ہوگئی اور مجھے یقین ہوگیا کہ اب صندوقچی یا چھین کا نام بھی زبان پر کبھی نہ لائے گی۔ اس بار بھی سارا سفر خوف کے عالم میں گزرا۔ آج گھر کے کسی فرد کو حویلی چھوڑنے کا دکھ نہیں تھا بلکہ جان بچنے کی خوشی تھی۔ کھانے پینے کا بہت سا سامان بی جان نے ساتھ کیا تھا مگر ہم بچوں کے علاوہ کسی نے بھی کھانے کو ہاتھ نہ لگایا۔ دادا کی حالت بہت خراب تھی۔ دادا کو حویلی چھوڑنے کا بھی دکھ تھا اور اپنے دو جوان بیٹوں کی موت نے انہیں بیمار اور نڈھال کر دیا تھا۔

ہم دہلی پہنچے۔ منے دادا' طاہر چچا اور ناصر چچا نے ہم سب کا بے حد خیال رکھا۔ میں آپ کو پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ ان کا مکان دو منزلہ تھا۔ اوپر کے حصے میں ناصر چچا' چچی اور طیب تھے۔ طاہر چچا اور دادا دادی نچلے حصے میں رہتے تھے۔ اس زمانے میں گھر اتنے چھوٹے نہیں ہوا کرتے تھے جتنے آج ہوتے ہیں۔ یہاں بھی نچلے حصے کا تقریباً آدھے سے زیادہ حصہ بیکار اور ویران پڑا تھا۔ دو ہی دنوں میں وہ حصہ صاف ستھرا کرکے ٹھیک ٹھاک کر دیا گیا۔ ہم سب وہاں سیٹ ہوگئے۔ دادا اپنے ساتھ کافی پیسہ لے کر آئے تھے' انہوں

نے ناصر چچا کے کاروبار میں مزید پیسہ لگا دیا۔ ان کا کاروبار ترقی کرتا رہا۔ اسی کاروبار میں منجھلے چچا بھی شراکت دار تھے۔ انہوں نے دن رات محنت کی اور خوب کاروبار پھیلایا۔ اب وہ قالینوں کی خرید و فروخت کے سلسلے میں ایران اور افغانستان بھی جانے لگے۔ شہباز بھائی اور رضا بھائی نے دلی ہی میں داخلہ لے لیا۔ وہاب چاچو بھی کچھ روز دل برداشتہ رہے پھر ناصر چچا کے کاروبار میں لگ گئے۔ میرا داخلہ بھی وہاں کے قریبی اسکول میں کرا دیا گیا۔

دادا کبھی کبھی میرٹھ جاتے مگر جب واپس آتے' پریشان دکھائی دیتے تھے۔ پھر رفتہ رفتہ اس معاملے کو بھولتا چلا گیا۔ دادا بھی کبھی کوئی ذکر نہیں کیا کرتے تھے۔ وہ سب لوگ ہی محتاط ہو گئے تھے۔ وہاں کی کوئی بات ہم بچوں کے سامنے نہیں کرتے تھے۔

رفتہ رفتہ میں سب کچھ بھول گیا۔ میری مصروفیات بدل گئیں۔ یہاں کے اسکول میں مجھے بہت مزہ آتا۔ زینت' زین اور طیب بھی میرے ہی اسکول میں پڑھتے تھے۔ کچھ عرصہ ساتھ رہنے کے بعد دادا نے اسی محلے میں ایک بڑا مکان خرید لیا۔ یہ دو منزلہ مکان تھا۔ اوپر کا حصہ منجھلے چچا نے لے لیا۔ نچلے حصے میں ہم لوگ رہے۔ دادا نے یہاں بھی مردان خانہ آباد کر لیا مگر وہ بجھے بجھے رہتے تھے۔ اپنی آبائی حویلی چھوڑنا آسان بات نہ تھی۔ منے دادا البتہ بہت خوش تھے۔ دادا اور منی دادی میں اب بھی نہیں بنتی تھی یا وجہ تھی کہ جب منے دادا نے طاہر چچا کے لئے زہرہ آپا کا رشتہ مانگا تو گھر میں فساد کھڑا ہو گیا۔ دادی نے اس پر واویلا کیا کہ منے کو طاہر کی عمر اور زہرہ کی عمر میں فرق نظر نہیں آتا۔ دادا نے سمجھایا۔

"تمہاری اور میری عمر میں پندرہ برس کا فرق ہے۔ بات عمر کی نہیں عقل کی ہوتی ہے۔ لڑکے کو اتنا بڑا ہونا چاہیے کہ وہ زندگی کے معاملات کو پوری سنجیدگی سے سمجھ سکے۔"

"ارے رہنے دو۔ تم نے بڑے معاملات سنجیدگی سے نمٹائے تھے ناں!"

"کون سا لونڈھیار پنا کیا تھا میں نے؟" دادا جل گئے۔ "کون سا معاملہ ہے جس میں تمہاری رائے کی کوئی اہمیت رہی ہو۔ عطا کی شادی البتہ تمہارے مشورے پر ہوئی تھی اور تمہارا خیال تھا کہ شادی کے بعد فوراً سدھر جائے گا۔ ذرا انگلیوں پر گن کے بتاؤ' شادی کے بعد وہ کبھی مہینا بھر بھی ٹک کر رہا تھا یہاں۔ میں ہمیشہ دلہن سے شرمندہ رہا۔ وہ بے چاری تو لگتا تھا صرف بچے پالنے کے لئے منگوائی گئی ہے۔"

"تو اور .... عورتوں کا کیا کام ہوتا ہے؟ دوسری بات یہ کہ مرے ہوئے بچے پر طعن تشنے کرتے برا نہیں لگتا تمہیں!"

"یہ طعن تشنے نہیں۔ وہ حقیقت ہے جو کسی کے مرنے کے بعد بھی جھٹلائی نہیں جاتی۔ بہرحال' میں پہلے دلہن سے بات کروں گا۔"

دادا نے بات ختم کر دی۔ وہ اٹھ گئے۔ دادی بڑبڑاتی رہیں۔ منے دادا جو مردان خانے میں بیٹھے دادی کی باتیں سن کر وہیں بیٹھے رہ گئے تھے' جانے کو اٹھے ہی تھے کہ دادا پہنچ گئے۔ انہوں نے کہہ دیا۔ "میاں تم ان کی باتوں پر دھیان نہ دینا۔ دلہن درست فیصلے کا حق رکھتی ہیں۔ بچی کے بارے میں بھی ان کی رائے کو مقدم سمجھتا ہوں۔"

دادی بڑبڑاتی رہ گئیں۔ دادا نے اماں سے بات کی۔ اماں نے عصمت آپا سے ذکر کیا کہ وہ ان کا عندیہ لے لے۔ زہرہ آپا بہت سیدھی تھیں۔ اسی وقت سے دوائی کا دکھ پال لیا۔ آنکھیں ہر وقت بھیگی رہنے لگیں۔ طاہر چچا سے پردہ ہو گیا۔ منجھلے چچا' چچی اور پھر پھوپیاں بھی سب اس بیاہ کے حق میں تھیں۔ میں نے طاہر چچا کو بھی خوش دیکھا۔ وہ ایک دم سے مجھ سے بے تکلف ہو گئے تھے۔ طیب اکثر آتا اور زہرہ آپا سے کھسر پھسر کیا کرتا۔ انہیں چھیڑتا۔ زہرہ آپا سرخ ہو جاتیں۔ اسے بھگانے کو دوڑتیں۔

اس تمام عرصے میں بی جان اور کاکا جان دوبارہ فرحت کے ساتھ دہلی آئی تھیں' ایک مرتبہ چھوٹے نانا کے انتقال پر اور دوسری بار زہرہ آپا کی شادی پر۔ نانا کے انتقال پر میں دہلی میں نہیں تھا مگر زہرہ آپا کی شادی پر میں نے فرحت کو دیکھا تو یوں لگا تھا جیسے اسے خدا نے چاندنی سے گوندھ ڈالا ہو۔ میں تو تصور تک نہیں کر سکتا کہ یہ فرحت ہو گی۔ یہ بھی بتاتا چلوں کہ میں اسے کچھ ہی عرصے بعد بھول گیا تھا۔ کبھی ذکر آتا تو یاد آ جاتا تھا کہ فرحت بھی ہے اور میں کبھی اس سے قربت محسوس کیا کرتا تھا اور یہ بھی کہ کبھی میں نے اسے اپنا رازدار بھی بنایا تھا۔

مگر وہ یادیں اور وہ معصوم سے مٹے مٹے جذبے اب بالکل ہی دھندلا گئے تھے۔ زہرہ آپا کی شادی پر اسے دیکھ کر میں بڑی دیر تک ساکت رہ گیا تھا۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں' ان میں بلکورے لیتی مقناطیسی کشش۔ چہرے پر روشنی سی پھیلی ہوئی۔ لمبی سیاہ اور اوپر کو مڑی ہوئی پلکیں' کومل کامنی سی فرحت کو دیکھ کر مجھے گزرے وقت کا پل پل یاد

آ گیا تھا۔ اور وہ پل پل جسے بھلانے میں مجھے ذرا بھی دقت نہیں ہوئی تھی اسے یاد کرنے میں' میں نے دن رات ایک کر دیے تھے۔ اسی دوران میں مجھے وہ صندوقچی بھی یاد آ گئی تھی جو میں نے اس کے حوالے کی تھی۔

اس روز گھر میں گہما گہمی تھی۔ عصمت آپا اور فرحت آنگن میں بیٹھی مہندی گھول رہی تھیں۔ میں اوپر اپنے کمرے کے باہر چھجے پر کھڑا اسے بڑے انہماک سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے بال اتنے بڑے اور ایسے چمکیلے تھے کہ سورج کی شعاعیں ان میں سے منعکس ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔ ستارے سے چمک رہے تھے جیسے افشاں بھری ہو۔ عین اسی لمحے مجھے وہ صندوقچی یاد آ گئی۔ اس سے قبل میں نے اس سے بات کرنے کی کوشش کی تھی مگر وہ رسمی سی باتیں کرنے کے بعد گھبرائی گھبرائی سی پلٹ گئی تھی۔ پتا نہیں یہ جھجک اس میں کہاں سے آ گئی تھی۔ صندوقچی کا خیال آتے ہی میں نیچے گیا۔ بڑا مناسب موقع تھا۔ صندوقچی سے جو راز وابستہ تھا وہ سب کے سامنے کہنے کا نہ تھا اور یوں اس بہانے میں اسے بلا کر بات بھی کر سکتا تھا۔ میں سیدھا انہی کی جانب گیا۔ مجھے دیکھ کر وہ جو بڑی زور سے کسی بات پر ہنس رہی تھی' ایک دم بوکھلا گئی۔

"عصمت آپا!" میں نے عصمت آپا کو مخاطب کیا تھا مگر نگاہیں اس کے چہرے پر ٹکی تھیں۔

"ہاں بولو؟" عصمت آپا نے ہتھیلی کی پشت سے بالوں کو چہرے سے ہٹاتے ہوئے میری طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

"ایک کام کریں گی؟" میں نے بڑی لجاجت سے کہا۔

"بولو تو۔" وہ الجھ گئیں۔

"ایک کپ چائے دے دیں۔ میرے سر میں شدید درد ہے۔"

"چائے تو تم زینت سے بھی لے سکتے ہو۔ میں کام کر رہی ہوں۔"

"زینت کی چائے مجھے اچھی نہیں لگتی۔"

"فرحت جاؤ تم اسے چائے دے آؤ ورنہ یہ ہمیں کام نہیں کرنے دے گا۔"

بات وہی ہوئی جو میں چاہ رہا تھا۔ یا تو عصمت آپا جاتیں یا فرحت' مجھے ہر دو صورتوں میں بات کرنے کا موقع مل جاتا۔ میں فرحت کے پیچھے پیچھے باورچی خانے کی طرف بڑھا۔

"آپ ٹھہریں' میں لے کر آتی ہوں۔" اس نے دھیمے سے کہا۔

"کیوں......... میں یہاں دھوپ میں کھڑا رہوں اور یہ تم نے آپ جناب کب سے شروع کر دیا۔" میں نے خفگی کا اظہار کیا۔ "بچپن میں تو تو تڑاخ سے بات کرتی تھیں۔"

"وہ بچپن تھا۔" اس کے چہرے پر سرخی پھیل گئی۔

"اور بات یہ ہے میں تم سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے رازداری سے کہا۔

وہ ایک دم بوکھلا گئی۔ "کیا......... کیسی بات؟"

اب ہم باورچی خانے کے قریب پہنچ گئے تھے۔ مجھے دور ہی سے زین اور زینت نظر آ گئے جو باورچی خانے میں تھے اور زینت حسب معمول اسے الاہا نضا رہی تھی۔

"سنو فرحت! تمہیں وہ مکڑیوں والا چکر یاد ہے؟"

اس کا چہرہ ایک دم پیلا ہو گیا۔ وہ بھلا اپنی ماں کی موت کو کیسے بھول سکتی تھی۔ ایک دم اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ مجھے دکھ ہوا کہ بلاوجہ میں نے یہ ذکر کیوں چھیڑ دیا مگر یہ حقیقت تھی کہ میں اس بارے میں معلوم کرنا چاہتا تھا گو بات کرنے کا بہانہ بھی تھا مگر مجھے کچھ بے چینی بھی محسوس ہو رہی تھی۔

"ہاں......... اف........."

"فرحت وہ صندوقچی........."

ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اس نے خوفزدہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ "خدا کے واسطے" وہ ایک دم بول اٹھی۔ اس کا ہاتھ بھی اٹھا تھا یوں جیسے وہ میرے منہ پر ہاتھ رکھ کر مجھے روکنا چاہتی ہو۔

"اس کا نام بھی نہ لیں۔ آپ کی بچپن کی اس حرکت نے اتنی بہت سی جانیں لے لیں اور......... وہ........."

"کیا مطلب؟" میں سن رہ گیا۔ یہ تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ فرحت ان تمام باتوں کو میرے کھاتے میں بھی ڈال سکتی ہے۔

"وہ ستارہ اور شاہانہ......... دونوں کو ادھیڑ دیا تھا اسی مکڑی نے۔ اس نے بتایا تھا وہ صندوقچی اٹھا کر لے گئی تھی۔ اس روز ان کے گھر پر کوئی بھی نہیں تھا۔ میں اکابوا کو لے گئی تھی مگر اکابوا نہیں تھیں۔ میں شاہانہ کے پاس تھی۔ اس وقت ہمیں ستارہ کے

چیخنے کی آواز آئی۔ وہ ایسے چلا رہی تھی جیسے کوئی اسے ذبح کر رہا ہو۔ میں اور شاہانہ بھاگ کر کمرے میں گئے تو اس کے بدن پر ہزاروں مکڑیاں چپٹی ہوئی تھیں۔ صندوقچی پاس ہی کھلی پڑی تھی اور اس میں ایسی ایسی ہزاروں مکڑیاں کلبلا رہی تھیں۔ میں تو اندھا دھند بھاگی تھی پھر جب بی جان' کاکا جان اور دوسرے لوگ اندر گئے تو وہ شاہانہ کو بھی چٹ کر چکی تھیں۔ صندوقچی غائب تھی۔ مکڑیاں بھی نہیں تھیں۔ وہاں تو ایک ہنگامہ مچ گیا۔ مگر...... میں تو جیسے سکتے میں رہ گئی تھی اور یہ اچھا ہی ہوا۔ ورنہ اگر میں کہہ دیتی وہ صندوقچی آپ کی تھی تو...... تو جانے کیا ہوتا؟ کیا دادا نے آپ کو کچھ نہیں بتایا تھا؟"

"نہیں۔" میں خواب کے سے عالم میں بولا۔ مجھے واقعی اس واقعے کا علم نہیں تھا۔ مجھے افسوس ہوا کہ میں نے ستارہ سے لڑجھگڑ کر وہ صندوقچی کیوں نہ لی۔ محض اس مصیبت سے اپنی جان بچانے کے لئے ان دونوں کو موت کے گھاٹ اتر جانے دیا۔ والد کو میں نے لکھنؤ جاتے اور پریشان لوٹتے دیکھا تھا مگر شاید وہ ان باتوں کا ذکر کر کے گھر والوں کو پریشان نہیں کرنا چاہتے تھے۔

"اب...... اب وہ صندوقچی......"

"پتا نہیں کہاں ہے۔ وہ وہاں سے غائب ہو گئی تھی۔ اچھا ہوا ناں' ورنہ بی جان یا کاکا جان ہی اسے دیکھ کر پہچان لیتیں اور اگر اسے واپس لے لیتیں تو...... تو شاید آج یہاں نہ کھڑی ہوتی۔"

"خدا نہ کرے۔" بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ میری نگاہوں میں جانے کیا تھا کہ فرحت جھجک کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

"میری مانیں تو اب سب کچھ بھول جائیے۔ اس واقعے کے بعد سے اس علاقے میں ایسی کوئی موت نہیں ہوئی۔ شاید وہ...... صندوقچی آپ کا وہی دوست جن لے گیا۔"

پتا نہیں فرحت نے طنز کیا تھا یا وہ سنجیدہ تھی۔ وہ اتنا کہہ کر پلٹ گئی۔

"اور وہ گڑیا...... میں آج بھی اپنے گڈے کی شادی تمہاری گڑیا ہی سے کروں گا۔ پتا ہے' ابھی تک کنوارا ہے۔ پڑھائی میں لگا ہوا ہے بس فارغ ہوتے ہی۔" وہ چھپاک سے باورچی خانے میں گھس گئی۔

اس ماحول نے پچھلا سارا خوف دلوں سے دھو دیا تھا۔ دادا اب بھی میرٹھ جاتے

تھے۔ ویسے ہی پریشان واپس آتے۔ حویلی بک نہیں رہی تھی۔ اس علاقے میں لوگ اس حویلی کے پاس سے ہو کے گزرتے گھبرانے لگے تھے۔ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ اب مجھے بھی ایسے خواب نہیں آتے تھے جیسے ان دنوں دکھائی دے رہے تھے۔ میرا خیال تھا کہ ابا کی حادثاتی موت نے میرے لاشعور میں کچھ ایسی گرہیں ڈال دی تھیں جو خواب کی صورت اختیار کر گئی تھیں۔ کیونکہ جگنی میں نے چرائی تھی پھر اس انگریز نے جو غالباً پاگل تھا' مجھ سے ایسی باتیں کی تھیں کہ میرے لاشعور نے ایک فلم سی بنائی تھی۔ میں نے خود ابا کو کہتے سنا تھا کہ اس جگنی کی خاطر انہوں نے قتل کیا ہے۔ اماں شاید یہ بات بھول گئی ہوں مگر میں جو ان باتوں کو ظاہر نہیں کر سکتا تھا' کسی سے کہہ نہیں سکتا تھا' اس لئے خواب میں اس لڑکی کو دیکھتا اور ابا کو اسے دفناتے تک دیکھ چکا تھا۔

☆==========☆==========☆

بڑھتی عمر میں آنے والے شعور کا ہر لمحہ خود بخود الجھی گتھی کو سلجھا رہا تھا مگر یہ مکڑیوں والا چکر کسی کے لاشعور کی کرامت نہیں تھا۔ نہ سنی سنائی بات تھی' سال بھر کے قلیل عرصے میں گھر سے چار جنازے نکلنا اور وہ بھی چاروں کے چاروں المناک اور حیرت انگیز واقعے کے تحت' کوئی معمولی بات نہ تھی۔ میں نہیں جانتا کہ وہاں کی پولیس کی مطابق یہ واقعات کون سے زمرے میں آتے تھے۔ ڈاکٹرز کیا کہتے تھے۔ وہ جو کئی سنگلاخ سے جبڑوں والے ریسرچر آئے تھے' ان کا نظریہ کیا تھا۔ اتنا جانتا تھا کہ ان میں سے کوئی بھی اس مکڑی کو نہیں دیکھ سکا تھا۔

وقت گزرا تو گزرتا ہی چلا گیا۔ پتا نہیں کہ دادا کیا سوچ رہے تھے؟ باقی لوگوں کا کیا خیال تھا' صرف میں بہت کچھ بھول چکا تھا۔ اسکول کی زندگی نے میری طبیعت کو یکسر بدل دیا تھا۔ میں جو پڑھائی کے معاملے میں انتہائی دبو قسم کا تھا' بہت سنجیدہ ہو گیا تھا۔ مجھے تاریخ سے دلچسپی تھی۔ میں نے یہی شعبہ اپنایا۔ شجاع بھائی اور رضا بھائی دونوں نے ایم بی بی ایس کیا تھا۔ دادا نے شجاع بھائی کو انگلینڈ بھیج دیا۔ وہ ایف آر سی ایس کرنے کے متمنی تھے۔ رضا بھائی یہاں ایک ہاسپٹل میں جاب کر رہے تھے۔ اپنا ہاسپٹل بنانے کا خواب تو انہوں نے تعلیم مکمل ہونے سے پہلے ہی دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ زہرہ آپا دادی کی مخالفت کے باوجود ظاہر چچا سے بیاہ گئی تھیں۔ عصمت آپا شادی پر تیار نہ تھیں۔ بقول اماں ان کے دماغ میں کیا بھس بھرا تھا۔ طیب سول انجینئر بن کر بمبئی چلا گیا۔ وہاں اسے بڑی اچھی جاب

مل گئی تھی۔ زینت پڑھ رہی تھی۔ زین چار مرتبہ میٹرک میں فیل ہونے کے بعد اب منجھلے چچا کے کاروبار کو سنبھالنے بلکہ ابھی تک سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ اب بھی بگ... تھا۔ اب بھی ہونقوں کی طرح منہ کھولے پھرتا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ لوگ اتنے پاگل کیوں ہیں کہ لاکھوں روپے کا ایک قالین کھڑے کھڑے خرید لیتے ہیں۔

میں وہاں رکا نہیں۔ اپنے کمرے میں چلا آیا۔ مجھے یقین تھا کہ فرحت چائے لے کر مجھے ڈھونڈھتی ہوئی اوپر ضرور آئے گی۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ آئے گی تو کیا کہوں گا... اچانک ہی میرا ذہن بھٹک کر کہیں سے کہیں پہنچ گیا۔ مجھے وہ مکڑی یاد آگئی جو صندوقچی میں بند تھی۔ میں نے اسے کئی بار چھوا تھا۔ مجھے وہ اچھی لگتی تھی۔ اس نے کبھی مجھے نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ان باقی اموات میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ پہلے میرا بھی یہی خیال تھا مگر فرحت نے جو کچھ بتایا تھا اس نے ثابت کر دیا کہ ان اموات میں اسی مکڑی اور اس کے خاندان کی دوسری مکڑیوں کا ہاتھ تھا۔

میرے بدن میں چیونٹیاں سی رینگنے لگی تھیں۔ ہتھیلیاں پسینے سے پسیج گئیں... سوچ کر ہی گھبرا رہا تھا کہ اب جانے وہ کہاں ہوگی اور کہاں کہاں گل کھلا چکی ہوگی۔ مکڑی کا چین سے کیا تعلق تھا؟ اس چین سے ابا کا کیا تعلق تھا۔ وہ انگریز جو کچھ کہتا تھا اس کا مقصد کیا تھا؟ آج یہ سارے سوال میرے دماغ میں مکڑی کے جالوں ہی کی طرح تنے تھے۔ اتنے عرصے بعد میں آج پھر اپنے ماضی میں جانا چاہتا تھا۔ مجھے وہ شخص یاد آگیا جو... صاحب کے انتقال کے وقت لمبی سیاہ گاڑی میں گھر آیا تھا۔ جو دادا سے گڑگڑا گڑگڑا کر کچھ کہہ رہا تھا مگر نہ اس کی بات دادا نے سنی تھی اور نہ ہی شجاع بھائی نے۔

اور آج.......... آج میرے اندر بے پناہ شور تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ یہ راز ایک ہی لمحے میں کھول کر رکھ دوں۔ اسی انگریز کو تلاش کروں۔ اس صندوقچی کو ڈھونڈ نکالوں۔ اس مکڑی کو پاؤں کی ایڑی سے کچل کر پھینک دوں۔ پتا کروں کہ ابا کا چین سے کیا تعلق تھا' انہوں نے اسے کیوں اور کس طرح حاصل کیا تھا۔ میں فرحت کی جھکی جھکی پلکوں کو' اس کے بدن کی چاندنی کو اور اس کے لمبے سیاہ چمکدار بالوں کو بھول گیا۔ مجھے یہ بھی پتا نہیں چلا کہ میرے لئے چائے کون لایا۔ بس میں ذرا ہوش میں آیا تو میرے سامنے کپ یوں رکھا تھا جیسے اسے برسوں پہلے کسی نے یہاں' اسی حالت میں رکھا ہو۔ میں نے گھونٹ لیا تو اسے نگلنا مشکل ہو گیا۔ وہ چائے بالکل ٹھنڈی ہو چکی تھی۔

بے چینی میرے اندر رچ بس گئی۔ ایک عجیب سا اضطراب تھا۔ یہ خوف بھی تھا کہ اگر دادا کو کچھ ہو گیا تو بہت سے راز ان کے ساتھ ہی دفن ہو جائیں گے۔ میں اب سب کچھ جان لینا چاہتا تھا۔ زہرہ آپا کی شادی کیسے گزری مجھے کچھ ہوش نہیں۔ زیادہ وقت میں نے اپنے کمرے میں یا دادا کو غور سے دیکھتے ہوئے گزارا۔ کئی بار محسوس کیا کہ فرحت مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے مگر پتا نہیں کیسا خوف تھا کہ میں نے اسے بات کرنے کا موقع نہیں دیا۔ شاید میں نہیں چاہتا تھا کہ اس موضوع پر وہ دوبارہ بات کرے۔ جو کچھ وہ بھول چکی تھی اس دکھ کو دوبارہ زندہ کرنے سے میں ڈرتا تھا۔

زہرہ آپا رخصت ہو گئیں' چوتھی چالا بھی ہو چکا تو میں ایک روز دادا کے پاس جا پہنچا۔ میں دادا کو زیادہ وقت نہیں دیتا تھا۔ یوں کہ میں انہیں پسند نہیں کرتا تھا یا یہ کہ بزرگ ہونے کی وجہ سے ان سے فاصلے کو ضروری خیال کرتا تھا۔ بہرحال میں نے ذرا سی دیر کو ان کی خیریت معلوم کرنے' اچکے اچکے وہاں بیٹھنے اور بغلیں جھانکنے کے سوا کبھی اتنا وقت ان کے ساتھ نہیں گزارا تھا کہ ان سے دو باتیں خیر خیریت کے علاوہ بھی کرتا مگر اس روز میں وہاں بہت دیر بیٹھنے کے ارادے سے گیا تھا۔ یہاں ایک بات اور واضح کر دوں کہ میں نے آرکیالوجی کے شعبے کو اپنا لیا تھا۔ اب میں آثار قدیمہ میں بے انتہا دلچسپی رکھتا تھا۔

ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ اسی روز میں دادا کے پاس پہنچا۔ انہوں نے سرسری سا مجھے دیکھا' سوچا ہوگا کہ میں کسی کام سے مردان خانے میں گیا ہوں مگر جب میں ان کی مسہری کے قریب کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا تو وہ چونکے۔

"خیریت تو ہے صاحب زادے؟ یہ سورج مشرق ہی سے نکل رہا ہے یا........ بھئی مجھے تو بہت دن ہو گئے یاد یکھے ہوئے کہ سورج آج کل کس طرف سے نکل رہا ہے۔"

میں جھینپ گیا۔ میں اپنے اور ان کے درمیان کے فاصلے کم کرنا چاہتا تھا۔

"دادا!" میں نے بڑی محبت سے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ اور بھی حیران ہوئے۔ اس بار انہوں نے پوری گردن گھما کر میری طرف دیکھا۔ وہ بہت کمزور ہو گئے تھے۔ اگر ان کی ہڈی چوڑی نہ ہوتی تو شاید وہ خوفناک حد تک کمزور دکھائی دیتے۔ ان کی آنکھوں کے نیچے کی کھال لٹک آئی تھی۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں۔........ ہاتھوں میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی۔ "دادا........! صبح کا بھولا شام کو لوٹ آئے تو اسے بھولا نہیں کہتے ناں!" میں نے محبت سے ان کا ہاتھ دبایا۔

جانے ان کی آنکھیں کیوں بھیگ گئیں۔ وہ والہانہ انداز میں مجھے دیکھتے رہے پھر انہوں نے میرے ہاتھ کی پشت کو ہونٹوں سے لگالیا۔ میں بھی بے اختیار ان کی پیشانی پر جھک گیا۔ میں' جس نے نہ کبھی ابا سے لگاؤ محسوس کیا تھا نہ دادا سے محبت۔ اس وقت بھرپور ان کی محبت میں ڈوب گیا۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ انہیں تو میری سخت ضرورت تھی۔ وہاب چاچو تو کب کے بمبئی جا چکے تھے۔ طیب بھی وہیں تھا۔ رضا بھائی کو اپنے خوابوں اور ان کی تعبیروں سے فرصت نہ تھی۔ منجھلے چچا قالین کے کاروبار میں بالکل بنیا بن گئے تھے۔ انہیں احساس ہوگیا تھا کہ ان کے دو منٹ کی قیمت کم سے کم بیس ہزار روپے ہے۔

دادی کو اب سنائی بھی کم دیتا تھا اور دکھائی بھی۔ بس وہی ایک اسٹیچو کی طرح ان کے سامنے بیٹھی رہتیں یا مسہری پر کسی سلوٹ کی طرح پڑی رہتی تھیں۔ دادا اب مردان خانے میں گم ہی جاتے تھے۔ منے دادا ہی ایک تھے جو اکثر شطرنج لے کر ان کے سامنے بیٹھ جاتے تھے تو گزرتا وقت دبے پاؤں کہیں سے کہیں نکل جاتا۔ عصمت آپا نے سلام کرنے کے سوا کبھی ان سے بات نہ کی تھی۔ منجھلی چچی اپنے بچوں میں مگن تھیں اور چچی صاحب کبھی کبھی ہی آیا کرتی تھیں۔ اماں البتہ ان دونوں بوڑھوں کی خدمت میں لگی رہتیں مگر ان سے باتیں کرنے کی فرصت انہیں بھی نہیں تھی۔ وہ ہر وقت شجاع بھائی کے غم میں روتی اور آہیں بھرتی رہتیں جو مسلسل تین سال سے یہی لکھ رہے تھے کہ بس اگلے ماہ ضرور آجائیں گے۔

"بیٹا!!"

دادا کی بھرائی ہوئی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ ان کا نرم کپکپاتا ہوا ہاتھ اب بھی میرے ہاتھ میں تھا۔

"بیٹا! تو نے کبھی آئینہ دیکھا ہے......... غور سے؟"

"جی دادا.........! مطلب؟"

"مطلب یہ کہ......... تو......... تو بنا بنایا عطا ہے۔ ہو بہو وہی۔" اور تب.........

ان کے احساس دلانے پر مجھے احساس ہوا کہ وہ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں واقعی ابا کی کاربن کاپی ہی تھا۔ قد کاٹھ بھی وہی تھا۔

"تجھے کیا پتا کہ عطا میرا سب کچھ لے گیا۔ سب کچھ......... اس کے بعد میں کیسے

جیا ہوں' کیسے جی رہا ہوں' بس پتا ہی نہیں چلتا۔ جی رہا ہوں۔ جیئے چلا جا رہا ہوں۔"

وہ عجیب بہکے بہکے انداز میں باتیں کر رہے تھے اور میں شرمندہ ہو رہا تھا۔ میں نے انہیں اکیلا چھوڑ دیا تھا۔ اس کا شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ وہ بھی یوں دل کھول رہے تھے جیسے یہ چند لمحے ابھی ان کے ہاتھوں سے پھسل جائیں گے اور پھر کوئی بھی ان کا دکھ سننے والا نہ رہے گا۔

"دادا.........! میں شرمندہ ہوں۔ سخت نادم ہوں کہ میں نے آپ کی خبر گیری نہیں کی۔ لاتعلق رہا۔ میں تو آپ کے لئے آپ کا عطا ہوں۔ مجھے آپ کے بیٹے کی طرح آپ سے لاتعلقی نہیں برتنا چاہیے تھی۔"

"نہیں بیٹا!" وہ جیسے تڑپ اٹھے۔ "وہ تو میرا بہت خیال رکھتا تھا۔ میں تو اس سے بہت سی باتیں کرتا تھا۔ گھنٹوں میرے پاس بیٹھتا تھا اور پتا ہے........." انہوں نے چپ ہو کر چاروں طرف دیکھا پھر رازداری سے بولے۔ "وہ اب بھی آتا ہے۔ گھنٹوں باتیں کرتا ہے۔"

جیسے کسی نے میرا دل مٹھی میں لے کر بھینچ دیا۔ مجھے لگا' دادا کا ذہنی توازن بگڑ گیا ہے۔ ان کے قریب آکر احساس ہوا تھا کہ وہ کیسے ہولناک زنداں میں قید ہیں جہاں کی دیواروں پر ان کے خیالی پیکر ناچا کرتے ہیں۔

"اور سنو! اسی نے مجھے بتایا تھا کہ تم......... تم آؤ گے ضرور آؤ گے۔ میں تمہارا منتظر تھا۔"

"میں آگیا ہوں دادا!" میں نے ان کے نرم و ملائم ہاتھوں کو اپنے دونوں ہاتھوں میں چھپا کر دھیرے سے دبایا۔ شاید میں اپنے لوٹ آنے کا یقین ان میں سرایت کرنا چاہتا تھا۔ ان کی بوڑھی آنکھوں میں آنسو بھر آئے جو ایک ہی لمحے بعد ان آنکھوں کے کونوں میں سمٹ کر تکیے پر ڈھلک گئے۔

"دادا جی! میں نے کبھی ابا کی کمی کو محسوس نہیں کیا تھا مگر......... آج سوچتا ہوں' کاش! وہ ہمارے درمیان ہوتے اور پھر ان کی حادثاتی موت........." میری آواز بھر آئی۔

"وہ بہت بے چین ہے بیٹا! اس کی بے وقوفی کی وجہ سے پانچ زندگیاں عذاب میں پھنسی ہیں۔ اب انہیں بچانا اس کے اختیار میں نہیں۔ یہ شجاع تو کچھ سمجھتا ہی نہیں۔ میں نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی اور......... رضا......... اس نے تو دنیا ہی الگ بنا

والی ہے۔ پتا نہیں' کیا سوچتا اور کیسے دن گزارتا ہے۔ اس لئے عطا نے کہا تھا کہ تم آ جاؤ گے۔ اب تو میں ڈرنے لگا تھا کہ اگر تم نے دیر کر دی تو..........! میری تو چند ہی سانسیں ہیں بیٹا۔ وہ بھی شاید تمہارے آنے کی آس میں اس قدر دھیمی چل رہی تھیں۔ چندا..........! وہ چمن ڈھونڈ کے لے آؤ۔"

دادا کے آخری جملے نے مجھے اچھل جانے پر مجبور کر دیا۔ "دادا..........! چمن! کونسی چمن؟"

دادا مجھے دیکھ کر یوں مسکرائے جیسے کسی بے وقوف بچے کی بات پر کوئی بڑا مسکرا سکتا ہے۔

"مجھے تو اب پتا چلا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس دوران میں کچھ ایسا نہیں ہوا مگر کیا تمہیں احساس ہے کہ تمہاری ایک بے حقیقت سی خواہش نے کتنوں کی جان لے لی؟ پہلی بے وقوفی عطا نے کی تھی اور دوسری تم سے سرزد ہوئی۔ وہ سمجھدار تھا مگر تم ناسمجھ تھے۔ شاید اسی وجہ سے تم اب تک محفوظ ہو یا شاید اس لئے کہ اب تم ہی کچھ کر سکتے ہو۔"

میں حیرت سے منہ کھولے سن رہا تھا۔ وہ اسی انگریز کی بات کر رہے تھے جو کبھی ان سے گڑگڑا گڑگڑا کر کچھ کہہ رہا تھا اور وہ ماننے کو تیار نہ تھے۔ اس سے زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ اس ایلن کا ذکر کر رہے تھے اور ایلن وہی عورت تھی جس کا ذکر اپنے خواب میں سنا تھا۔ اس خواب میں جس میں ابا اپنے دوستوں کے ساتھ تابوت دفن کر رہے تھے۔ ایک آدمی ان سے پوچھ رہا تھا کہ ایلن کو کیا جواب دیا جائے گا؟

"ایلن..........؟ کون ایلن' دادا!.........." میں بے اختیار پوچھ بیٹھا۔

"یہ تمہیں رابرٹ سے پتہ چل جائے گا۔" انہوں نے تھکے ہوئے انداز میں آنکھیں موند لیں۔

میرے کانوں میں سیٹیاں سی بج رہی تھیں۔ "کیا وہ زندہ ہے؟"

"کون..........؟ رابرٹ؟ ہاں.......... مگر ایسے کہ اس کے دائیں طرف موت ہے اور بائیں طرف زندگی۔ کبھی موت اس کی جانب قدم بڑھاتی ہے تو کبھی زندگی۔ ضیاء!" وہ اچانک اٹھ کر بیٹھ گئے۔ "تم جاؤ گے ناں اس کے پاس؟"

"جی..........! جی دادا..........! ضرور جاؤں گا۔ میں خود بھی اس اسرار کو کھوجنا چاہتا ہوں۔ میں تو محض اس لئے پریشان ہوں کہ میرے ساتھ یہ سب کچھ کیوں ہوا۔ اس نے کبھی مجھے نقصان کیوں نہیں پہنچایا۔ میرا اس کا کون سا بندھن تھا۔ یہ سب کیا تھا.......... کیا ہے.......... آج کتنے عرصے بعد میں یہ سب کچھ سوچ رہا ہوں۔ مجھے کتنی دیر میں خیال آیا ہے دادا.......... میں.......... میں خود حیران ہوں.......... وہ چمن.......... وہ کڑی.......... وہ حیرت انگیز اور ہولناک موتیں.......... دادا مجھے تو ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے میں [illegible] تھا۔ بہت گہری نیند مگر آج میں بیدار ہو گیا ہوں۔ جاگ اٹھا ہوں دادا۔"

میں واقعی خواب کی سی کیفیت میں بول رہا تھا۔ مجھے واقعی ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے یہ سارے بیتے واقعات زیادہ دور کے نہ ہوں۔ جیسے کل ہی مجھ پر سب کچھ گزرا ہو۔

دادا کے چہرے پر ایک مطمئن سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ وہ پھر بستر پر یوں گر گئے جیسے انہیں قرار آگیا ہو۔ "تم نے دیر نہیں کی ضیاء!.......... تم جلدی بیدار ہو گئے ہو۔ ورنہ.......... شاید تمہیں اندازہ نہیں کہ کیا ہونے والا تھا۔"

"مجھے کیا کرنا ہوگا دادا؟" میں پُرعزم لہجے میں بول اٹھا۔

"سب سے پہلے تمہیں رابرٹ سے مل کر اسے حقیقت سے آگاہ کرنا ہے۔ وہی تمہیں بتائے گا کہ تم کیا کرو گے۔"

پھر انہوں نے اپنے سرہانے رکھے ایک اٹیچی کیس کو کھول کر اس میں سے ایک لفافہ نکالا جس میں چھوٹے بڑے' پرانے' بہت سے کاغذات تھے۔ وہ کچھ تلاش کر رہے تھے پھر انہوں نے ایک نیلے رنگ کا کاغذ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ "اس پر اس کا پتا لکھا ہے۔ وہ بمبئی میں ہے۔ ضیاء میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ اس سے ملنے سے پہلے تم اپنی حفاظت کا بندوبست کر لینا۔ میں ان باتوں کا قائل نہ تھا۔ مگر بیٹا! یہ دنیا ہے۔ یہاں ایسے ہزار اسرار پوشیدہ ہیں۔ بعض واقعات ایسے ہو جاتے ہیں کہ عقل انسانی دنگ رہ جاتی ہے جن کا جواز نہ ہو' سبب نہ ہو اور جو باتیں انسانی عقل میں نہ سمائیں۔ انسان ان سے متاثر ہو کر غلط اندازے لگا لیتا ہے اور کبھی کبھی ان واقعات کو جھوٹ اور جادو سے منسوب کر کے علیحدہ ہو جاتا ہے۔ ضیاء! میں تم سے استدعا کروں گا کہ اعتدال پسندی اختیار کئے رہنا۔ یہ سوچ کر اس معاملے میں الجھنا کہ کہیں کچھ نہ کچھ ایسا ضرور ہے جسے عقل انسانی اپنے احاطے میں نہیں لا پاتی۔ یہ ضعیف اعتقادی نہیں' خدا نے عقل دی ہے اور وہ بار بار کہتا ہے کہ یہاں اسرار بھرے پڑے ہیں۔ غور کرو۔ فکر کرو۔ تو بیٹا! جیسے کسی بھی جگہ سامان کی بے ترتیبی ذہن پر اثرانداز ہوتی ہے ایسے ہی واقعات جنم لیتے ہیں۔

ذرا سی بے ترتیبی سے سب کچھ الٹا سلٹا ہو جاتا ہے۔ تم سمجھ رہے ہو ناں!!"

"میں سب سمجھ رہا ہوں دادا! میں خیال رکھوں گا۔ اب آپ آرام کریں۔ جب بھی میری ضرورت محسوس ہو' مجھے بلوا لیں۔ میں اپنی بے احتیاطی کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں دادا!" میں نے پھر ان کا ہاتھ دبایا۔ جھک کر ان کی پیشانی کو بوسا دیا۔ ان کے بدن کو کمبل سے ڈھکا۔ تکیہ درست کیا۔ جگ پانی سے بھر کر ان کے سرہانے رکھا۔ گلاس دھو کر رکھ دیا پھر ان سے اجازت لے کر اپنے کمرے میں آ گیا۔

وہی دن میری بے چینی کا پہلا دن تھا۔ فرحت بی جان اور کاکا جان کب واپس چلی گئیں۔ کب زہرہ آپا کی رخصتی ہوئی۔ کون کون سی رسمیں ہوئیں' مجھے نہیں پتا۔ میں تو اپنے کمرے میں گھسا اپنی یادداشت تازہ کر کے بچپن میں بیتی ہوئی ہر بات لکھتا رہا' میں چاہتا تھا کہ میں اس عرصے میں وہ سب کچھ لکھ ڈالوں جو آٹھ برس کی عمر سے لے کر آج تک مجھ پر بیتا تھا پھر مجھے اس کی اسٹڈی کرنا تھی۔ جاننا چاہتا تھا کہ یہ سب کیوں' کب اور کیسے ہوا۔ میں نے سب کچھ لکھ لیا اور جب اسے پڑھا تو یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ مجھ میں کئی حیرت انگیز صلاحیتیں ہیں۔ ایک دیکھنے کی یعنی حیرت انگیز بصارت مگر تب جب میں کچھ دیکھنا چاہوں۔

عام طور پر میری بینائی بھی اتنی ہی محدود تھی جتنی کسی اور صحت مند آدمی کی ہو سکتی ہے۔ دوسری یہ کہ اگر میں ذرا سی کوشش کروں تو بیتی ہوئی اور دنیا کے کسی کونے میں ہونے والی بات واقعے یا حادثے کو پوری جزئیات کے ساتھ دیکھ سکتا ہوں۔ تیسری یہ کہ صندوقچی میں رہنے والی مکڑی مجھے اپنے دوست کی حیثیت سے پہچانتی تھی اور میں نے اس کے لئے اپنے دل میں کبھی خوف یا نفرت محسوس نہیں کی۔ اسے ابھی بھی' اپنی ہی مسہری کے نیچے رکھا۔ صندوقچی میں اس وقت تالا بھی نہیں تھا مگر اس نے کبھی مجھے نقصان نہیں پہنچایا۔ اس نے فرحت بی جان اور کاکا جان کو بھی کچھ نہیں کہا اور اس نے میری اماں اور بہن بھائیوں کو نقصان نہیں پہنچایا تھا۔

باقی تمام اموات کی ذمے دار وہی مکڑی تھی' اس کا پتا نہیں کیوں مجھے یقین تھا۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں نے پہلی بار جب گھروندے سے چین نکالی تھی تو وہاں قریب ہی ایک مکڑی کچلی پڑی تھی اور اس میں ہزاروں چھوٹے چھوٹے کیڑے کلبلا رہے تھے۔ یہ یقیناً وہ بچے تھے جو مکڑی کے بدن سے پھوٹ رہے تھے حالانکہ مکڑی انڈے دیتی ہے؟

اب مجھے یقین ہو گیا کہ اس چین اور مکڑی کا آپس میں کوئی تعلق ضرور ہے پھر وہ چین بھی پوری طرح میرے ذہن میں تھی۔ اس پر ہر تین کڑیوں اور تین زنجیروں کے بعد ایک مکڑی سی بنی تھی۔ سونے کی مکڑی اور یہ مکڑی بھی سونے کی طرح چمکتی تھی۔ خواب میں دکھائی دینے والی لڑکی کی لاش جو تابوت میں رکھی دیکھی تھی' اس کے ہاتھ میں وہی چین تھی۔ اس کے سینے پر مکڑی تھی۔

بات کچھ کچھ میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ کڑیاں ایک دوسرے سے مل رہی تھیں مگر.......وہ لاش کس کی تھی؟ دلہن کون تھی' ابا کے وہ ساتھی........ جن میں رابرٹ بھی تھا مگر باقی کون تھے۔ وہ چین کیوں' کب اور کیسے بلکہ کس سے حاصل کی گئی تھی۔ اسے حاصل کرنے کا مقصد کیا تھا' یہ سب کچھ ابھی اندھیرے میں تھا۔

میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں آثار قدیمہ میں دلچسپی رکھتا تھا۔ شاید اسی لئے یہ معاملہ میرے لئے اہمیت اختیار کر گیا تھا یا پتا نہیں کیا تھا۔ بس میں دیوانوں کی طرح سارا سارا دن کمرے میں بند اس کہانی کو توڑنے موڑنے اور جوڑنے میں لگا رہا پھر مجھے یاد آ گیا کہ ابا کی موت کے بعد تحسین خالہ اور بڑی بوا کی موت نے جب گھر میں تباہی اور وحشت پھیلائی تھی تو کسی نے کہا تھا کہ ہمیں کسی بزرگ سے مل لینا چاہئے۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ ابا چین کے کھو جانے کے بعد اماں سے کہہ رہے تھے کہ وہ شیوا جی سے ملیں گے۔ میں نے شیوا جی کا نام سنا تھا۔ ان کے بارے میں کچھ عجیب و غریب باتیں مشہور تھیں۔ ایک بار میں نے انہیں دیکھا بھی تھا۔ وہ جوگیا رنگ کا کپڑا اپنے بدن پر لپیٹے ہوئے تھے۔ گلے میں ہزاروں مالائیں۔ انگلیوں میں موٹی موٹی انگوٹھیاں۔ بڑھی ہوئی' الجھی اور میلی داڑھی' سر کے بال گھنگریالے اور کمر تک پہنچے ہوئے جنہیں برسوں سے سلجھایا ہی نہیں گیا تھا۔

ہندوؤں کے علاوہ کچھ مسلمان گھرانے بھی ان کے عقیدت مند تھے۔ سنا تھا کہ انہوں نے ان گھرانوں کو بڑے خوفناک آسیب سے بچایا تھا۔ ایک گھر میں بیاہ کر آنے والی ہر عورت کے گھر بچہ پیدا نہیں ہوتا تھا بلکہ معمول کے مطابق نو ماہ پورے کر کے پیدائش سے صرف چند روز پہلے مر جاتا تھا۔ زچہ کی جان کے لالے پڑ جاتے تھے مگر وہ پھر اگلا عذاب اٹھانے کو لوٹ پوٹ کے ٹھیک ہو جاتی تھی۔ ان لوگوں نے شیوا جی سے رابطہ کیا تھا اور شیوا جی سے رابطے اور علاج کے بعد اس آنگن میں اب بچے کھیل رہے تھے۔

یہ سب باتیں وقتاً فوقتاً سنتا رہا تھا۔ شیوا جی مجھے یوں یاد رہ گئے کہ ابا نے ان کا ذکر

کیا تھا۔ میں نے اپنے سامنے کسی ڈائری کے اس ورق پر جہاں میری نجی باتوں کا اختتام ہوا تھا۔ شیوا جی کا نام لکھ کر سرخ پین سے اس کے گرد دائرہ کھینچ دیا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ اب میرا ان سے ملنا ضروری ہے۔ رابرٹ کا پتا بھی میں نے اس ڈائری میں نوٹ کر لیا۔

اماں عصمت آپا کی شادی کے سلسلے میں پریشان تھیں۔ عصمت آپا عجیب روکھی طبیعت کی مالک تھیں۔ میں نے ان میں لڑکیوں والی بات کبھی محسوس ہی نہیں کی۔ انہیں گھر گرہستی کا شوق تھا' نہ گڑیوں ہی سے بچپن میں لگاؤ رہا۔ گھر کے کام کاج زہرہ کر لیتی تھیں۔ نہ سہیلیاں بنانے اور ان کے ساتھ وقت گزارنے کی حسرت تھی۔ زہرہ کے بیاہ کے بعد مجبوراً گھر کا کام سنبھال لیا تھا۔ اماں کی ہڈیاں کڑکڑا چکی تھیں۔ وہ صرف وہی کام کر پاتیں جو پلنگ یا پیڑھی پر بیٹھ کر کئے جا سکتے ہیں سو اس صورت میں عصمت آپا اماں کا ہاتھ بٹا رہی تھیں۔ انہی دنوں چچی صاحب آ گئیں۔ وہ بہت عرصے کے بعد آئی تھیں۔ پتا چلا کہ ان کی اماں کا انتقال ہو چکا ہے۔ اپنی بھابی کو وہ وبال لگنے لگی تھیں۔ ان کے بھیا بٹیربازی میں لگے رہتے تھے۔ بھاوج نے طعنے دے کر ان کا کلیجہ چھلنی اور کام کروا کروا کر ان کے ہاتھ زخمی کر ڈالے تھے۔

انہیں دیکھا تو گھر کے سبھی افراد کو محسوس ہوا۔ دادا تو ان کے سر پہ ہاتھ رکھ کر بہت روئے۔

"ابو جانی! میں آپ کی خدمت میں رہنا چاہتی ہوں۔ میری غلطی تھی کہ سر کے سائبان کو اہمیت نہ دی۔ آج آسمان بھی سر پہ آتا محسوس ہوتا ہے۔" وہ رو رو کر کہہ رہی تھیں۔

"بیٹا! مت رو۔ تم تو میرے بچے کی نشانی ہو۔ میرے کلیجے کا ٹکڑا۔ بھول جاؤ سب کچھ۔ بھول جاؤ بیٹا! یہ تمہارا گھر ہے۔ تمہارا اپنا.........."

اور پھر دادا نے تیسری منزل کے لئے سیمنٹ اور اینٹیں منگوا لیں۔ مہینا بھر میں اوپر کمرا' برآمدہ اور باورچی خانہ بن گیا۔ بھلا کون اعتراض کرتا۔ چچی صاحب نے طبیعت بھی بڑی نرم پائی تھی پھر جو حالات گزار آئی تھیں۔ انہوں نے مسکینی اور غلامی کی عادت بھی ڈال دی تھی۔ اسی کو جنت محسوس کیا اور دادا دادی کی پیڑھی پکڑ لی۔ دادی مطمئن ہو گئیں۔ اماں کے فکرمند چہرے پر بھی اطمینان پھیل گیا ورنہ وہ پریشان ہوتیں کہ کہیں عصمت آپا نے عقل تھام لی تو ان کا بیاہ ہو جائے گا پھر ان بوڑھوں کی رکھوالی کون کرے۔

خود ان کی ہڈیوں میں تو اب سنسناہٹ ہونے لگی تھیں۔ چچی صاحب اماں سے عمر میں بڑی تھیں مگر کھایا پیا انہی کو لگا تھا۔ نہ بچے پیدا کئے تھے' نہ فکریں بڑھی تھیں۔ جو چہرے پر کچھ روکھا پن آیا تھا کندھے کچھ جھک آئے تھے۔ اس کا سبب چچا صاحب کی ناگہانی موت اور بھاوجوں کے طعنے تھے۔ یہاں رہیں اور فکروں سے آزاد ہوئیں تو صحت اور چستی آ گئی۔

☆-----------☆-----------☆

ذرا گھر میں ہلچل ختم ہوئی تو میں پھر وہ ڈائری لے کر بیٹھ گیا۔ اب ڈائری میں' میں نے ستارہ اور شاہانہ والے واقعے کا اضافہ کیا۔ خود کو مجرم محسوس کرتا رہا پھر یہ سوچ کر اور کوفت میں مبتلا ہو گیا کہ دادا میرے اس جرم سے واقف ہیں جو میں نے نادانستگی میں کیا مگر اس کے نتائج بہت ہولناک نکلے۔ میں اس رات پھر دادا کے پاس پہنچ گیا۔ ان سے ستارہ اور شاہانہ والے واقعے کے بارے میں پوچھا۔ وہ کچھ دیر تک چھت کو تکتے رہے۔ مجھے ان کی آنکھوں میں ویرانی بڑھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ پتلیاں دھندلا گئی تھیں۔

"ہاں.......... مگر بیٹا' بتا میں کیا کرتا؟ میں گیا تھا شیوا جی کے پاس۔ انہوں نے بڑی دیر کوشش کی۔ پسینے میں شرابور ہو گئے پھر کہہ دیا کہ بہت اندھیرا ہے۔ وہاں بہت اندھیرا ہے۔ ابھی ممکن نہیں کہ پتا کر سکوں۔ تم بعد میں آنا۔ میں جبھی تو پریشان تھا۔ ٹانگوں میں سکت ہے نہ کمر میں دم۔ کیسے جاتا؟ کہاں تلاش کرتا۔ منے سے کہنا چاہا تو اس نے خرافات کہہ کر بات سنی ہی نہیں۔ مجھے ایسے دیکھنے لگا جیسے میرا دماغ چل گیا ہے۔ جو بات سننے کو تیار نہ ہو' وہ کام کرنے پر کیسے آمادہ ہو سکتا ہے تبھی تو عطا نے کہا کہ تم آؤ گے۔ ضرور آؤ گے' تب سے تمہارا منتظر تھا۔"

میں نے ان سے وعدہ کیا کہ میں وہاں ضرور جاؤں گا۔ میں نے شیوا جی کا پتا بھی لکھ لیا۔ دہلی میں کچھ میرے کام ادھورے رہتے تھے۔ انہیں نمٹائے بغیر سفر کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا مگر دل و دماغ بھٹک رہے تھے۔ جو توجہ ان کاموں پر دینا چاہیے تھی' مفقود تھی۔ جیسے تیسے کام نمٹا لئے۔ اماں سے ذکر کیا کہ شاید اس بار سفر طویل ہو۔ اماں سفر کے نام ہی سے گھبراتی تھیں۔ شاید ابا کے طول طویل سفر یاد آ جاتے ہوں اسی لئے بھول کر بھی کبھی میری شادی کا ذکر نہ کیا۔ میں اس سے قبل بھی اپنے کام کے سلسلے میں کئی بار سفر کر چکا تھا۔ رضا بھائی کے لئے ہر وقت آہیں بھرتی تھیں اور جب خط آتا' جواب میں یہی لکھتیں کہ چھٹی لے کر آ جاؤ تاکہ بیاہ کر دیا جائے۔ ان کی نظر زینت پر تھی۔ اچھی لڑکی تھی۔

نکھرا اور نرم لہجے والی مگر رضا بھائی کو ابھی تک اپنے خوابوں کی تعبیر نہیں ملی تھی۔ وہ پھر چند ماہ یا سال مانگ لیتے تھے۔ شجاع بھائی نے تو کبھی شادی کے مسئلے پر کئے گئے سوالوں کا جواب ہی نہیں دیا تھا۔ ادھر ادھر کی اتنی دلچسپ باتیں لکھ دیا کرتے تھے کہ پڑھتے ہوئے یہ خیال ہی نہ آتا کہ جواب گول کر گئے ہیں۔

میں نے سب سے پہلے شیوا جی سے ملاقات کی ٹھانی۔ وہ لکھنؤ ہی میں تھے۔ وہاں میرے لئے مشکل نہ تھی۔ بی جان یوں بھی شکایت کر چکی تھیں کہ اب تو اکیلے سفر کرنے لگے ہو' کبھی نانی کی خیر خیریت کو بھی آجایا کرو۔ وہاں جانے کا سوچا تو فرحت کا خیال چاندنی کی طرح بدن میں ٹھنڈک بن کر اتر گیا۔ میں اس کے لئے اپنے دل میں بڑی گنجائش محسوس کرتا تھا۔ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ اس وقت مجھے اس سے محبت تھی۔ ہاں' یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اس کی پرکشش شخصیت نے مجھے پہلی مرتبہ اٹریکٹ کیا تھا جبکہ خاندان کی اور دور پرے کی بہت سی لڑکیاں مجھے متوجہ کرنے کی خواہش مند رہیں۔ میں جوانی میں بہت حسین ہوا کرتا تھا۔ اب تو خیر..........!!" پھر انہوں نے کچھ کھسیانے سے انداز میں مجھے دیکھا۔

اور میں سوچ رہی تھی کہ "حسین" سے زیادہ حسین لفظ کونسا ہوگا؟ جس شخص میں اب بھی بلا کی کشش اور مقناطیسیت تھی' وہ واقعی اپنی جوانی میں کیا رہا ہوگا! اس وقت اگر روز ایک لڑکی خودکشی کرتی تو بھی مجھے تعجب نہ ہوتا۔

"ہاں' تو میں نے لکھنؤ کی تیاری کر لی۔" وہ یوں ایک دم بول اٹھے جیسے مجھے مزید کچھ سوچنے سے بھٹکانا چاہتے ہوں۔ میں پھر ان کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"اماں لکھنؤ جانے پر بے حد خوش تھیں۔ انہوں نے بی جان اور کاکا جان کے لئے کئی چیزیں دیں۔ عصمت آپا کے لئے کسی لڑکے کو نظر میں رکھنے کی نصیحت بھی کی۔ شام کو جلدی گھر آجانے سے لے کر وقت پر کھانے اور سونے تک کی ہدایات ڈالیں۔ دادا مجھے کچھ عجیب سی مگر مسرور نگاہوں سے دیکھتے رہے۔ جب میں ان سے رخصت چاہنے گیا تو انہوں نے مجھے سینے سے لگا لیا۔ دادا کی قربت میں' میں نے پہلی مرتبہ پدری شفقت محسوس کیا تھا۔ بے اختیار میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ ابا کی تو بات ہی دور کی تھی' مجھے کبھی بھائیوں یا چچاؤں نے بھی سینے سے نہیں لگایا تھا۔ دادا ابا کے قریب میں کبھی پھٹکا نہ تھا۔ ان سے شکایت بیکار تھی۔ میں بہت دیر تک ان کے سینے کی حرارت کو اپنے اند

اتارتا رہا۔

"بیٹا! لکھنؤ میں شیوا جی سے ملنے سے پہلے بی جان کے ساتھ شانی بابا کے پاس ہو لینا۔"

"شانی بابا!!" مجھے یہ نام سن کر حیرت ہوئی۔ پہلی بار یہ نام سن رہا تھا۔

"ہاں.........بی جان تمہیں بتا دیں گی۔"

"ان سے کیا کہنا ہے؟"

"کچھ نہیں.......... بس بتا دینا کہ تم عطا کے چھوٹے بیٹے ہو اور تمہیں میں نے بھیجا ہے۔ ان کی نصیحتوں پر عمل کرنا۔"

"اور کچھ دادا!؟"

وہ کچھ دیر میرے کندھے کو تھامے مجھے غور سے دیکھتے رہے پھر مجھے اپنے سینے سے لگا لیا اور بہت دیر تک گم صم سے کھڑے رہے۔ جب میں نے دھیرے سے انہیں الگ کیا تو ان کے چہرے کی سبھی جھریوں کو بھیگے پایا۔ "جاؤ بیٹا! اللہ تمہارا نگہبان ہو۔ اپنے دادا کے لئے دعا کرتے رہنا۔ اللہ اتنی مہلت دے دے کہ تمہیں دوبارہ دیکھ سکوں۔"

"کیسی باتیں کرتے ہیں دادا!" میں نے بے اختیار کہا مگر یوں لگا جیسے میں دنیا کا سب سے بڑا جھوٹ بول رہا ہوں۔ اچانک یہ احساس بڑھ کر میرے پورے وجود میں پھیل گیا کہ دادا مجھے آخری بار دکھائی دے رہے ہیں۔ "نہیں دادا..........! آپ کو میرا انتظار کرنا ہوگا۔" اس بار میں نے انہیں بازوؤں میں بھر لیا۔

"میرا کیا بس چلتا ہے بیٹا! اب تھکن بھی بہت ہے۔"

وہ مسہری پر بیٹھ کر ہانپنے لگے۔ میں ان کے سامنے کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

"میری الماری کی چابیاں تمہیں میری مسہری کے گدے کے نیچے سے مل جائیں گی۔ شاید تمہیں کسی چیز کی ضرورت پڑے۔ عطا کی بہت سی چیزیں میں نے اسی الماری میں سنبھال کر رکھ دی تھیں۔ کبھی دیکھتا ہوں تو لگتا ہے جیسے وہ میرے سامنے بیٹھا ہے۔ اس کی ڈائری بھی ہے۔ کچھ اور کاغذات اور پرچے ہیں اور پتا نہیں کیا الا بلا ہے.......... تم دیکھ لینا۔"

میں انہیں روکنا چاہتا تھا کہ ایسی باتیں نہ کریں مگر یہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ یہ بہت ضروری باتیں ہیں۔ پوری توجہ سے انہیں سنتا رہا۔ اتنی دیر میں آہٹ ہوئی۔ پلٹ کر

دیکھا تو دادی دیوار تھامے کھڑی تھیں۔

"آؤ کنیز فاطمہ! اچھا ہوا تم آگئیں۔ تمہاری منطقیں ہمیشہ اختلافی ہوتی ہیں مگر میں جو کہہ رہا ہوں' اسے غور سے سنو۔"

میں نے انہیں سہارا دینے کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا۔ دادی نے کچھ تعجب سے انہیں اور پھر مجھے دیکھا۔ شاید میری یہاں موجودگی نے انہیں بھی حیران کر دیا تھا۔ "یہ پوتے کو آج کیسے دادا کا خیال آگیا؟" انہوں نے طنزیہ انداز میں کہا اور میرے بڑھے ہوئے ہاتھ کو تھام کر مسہری کی پائنتی پر آبیٹھیں۔

"سنو! صرف سنو!" دادا نے انہیں ٹوک دیا۔ "میری الماری کی چابیاں جب بھی یہ مانگے' اسے دے دینا۔"

"اے......... کیوں؟ آپ کہیں جا رہے ہیں؟ اب ایسی حالت میں آپ کا کہیں جانا ٹھیک نہیں ہے۔" انہوں نے پاس رکھی تپائی سے پاندان اٹھاتے ہوئے کہا۔

ان کی بات سن کر دادا نے جس انداز سے انہیں دیکھا' میرا تو کلیجہ ہی کٹ گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ جب آدمی موت کی آہٹ سن لیتا ہے تو اس کی نگاہوں میں کیسی بے بسی چھا جاتی ہے اور وہ جو کچھ محسوس کرتا ہے' اسے کہہ بھی نہیں پاتا' کچھ بات میں بے دلی محسوس کرتا ہے مگر چہرے پر یقین پھیلا چلا جاتا ہے اور یہ' وہ یقین ہوتا ہے جس کی تہ تک کوئی پہنچ ہی نہیں پاتا۔ بالخصوص وہ جو سرسری دیکھتا ہے۔ دادی نے بھی ان کی طرف نہ دیکھا۔ وہ پان کی گلوری بناتی رہیں۔

"تم......... بس یہ مانگے تو چابیاں دے دینا۔ میری الماری میں تمہاری دلچسپی کی کوئی چیز نہیں ہے۔ اگر ہے تو یاد کرلو۔ جائیداد کے کاغذات میں تمہیں پہلے ہی دے چکا ہوں۔ زیور کوئی تمہارا ہے نہیں اس میں۔ میری مانو تو زیور بہوؤں کو دے ڈالو۔ تمہاری زندگی میں بھی خوش ہو لیں گی ذرا۔"

ان کے انداز میں شوخی آگئی۔ میں کرب میں ڈوبی ہنسی ہنس دیا۔

"کس چیز کی کمی کی ہے میں نے؟" انہوں نے پان دادا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ چہرے پر ناگواری پھیل گئی تھی۔ "اور میں کونسا پہنتی ہوں کچھ۔ یہ کنگن بھی سہاگ کے یقین کو ڈالے ہوئے ہیں۔ آپ تو کبھی مہینوں میں بات کرتے ہو تب یاد آتا ہے کہ ارے ہاں......... میاں ہیں تو سہی۔"

"ساری کہانیاں قصے تو سنا چکا ہوں تمہیں۔ اب بات کرنے کو رہ ہی کب ہے؟ اور معقول باتیں سننے کی تم عادی نہیں ہو۔"

"اگر ان تمام معقول باتوں کا تعلق شطرنج سے ہے تو بھیا میں باز آئی ان معقول باتوں سے۔ یہ شاطرانہ چالیں نہ کبھی چلیں' نہ پسند کیں۔ اے! سیدھی سادی زندگی' سیدھی سادی گزارے آدمی۔" انہوں نے باچھیں پونچھتے ہوئے کہا۔

"خیر! شطرنج تو تم ہم سے زیادہ کھیلی ہو۔ ہم تو گتے کی بساط پر کھیلتے ہیں' زندگی میں کبھی چالیں نہ چلیں' نہ مہرے پیٹے' نہ وزیر........."

دادا ہنس پڑے۔ کچھ دیر پہلے کی بے بسی اور بے چارگی ان کی مسکراہٹ کی دھند میں کہیں چھپ گئی۔ مجھے خوشی ہوئی۔ میں پہلی بار دادا' دادی کی نوک جھونک سن رہا تھا۔ دادی کے چہرے پر ناگواری ضرور تھی مگر صاف دکھاوے کی ورنہ آنکھوں کے کونے چمک رہے تھے اور جیسے اس چمک کی اوٹ سے ہنسی بھی جھانک رہی ہو۔

میں اٹھ گیا۔ "دادا! مجھے اجازت دیں۔ کل سویرے ہی چلا جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے بیٹا! کل مجھ سے مل لینا۔ ملے بغیر نہ جانا۔" ان کی بے قراری لپک آئی۔

"جی ضرور۔" میں کمرے سے نکلا تو دادی کو کہتے سنا۔

"کہاں جا رہا ہے ضیاء۔"

☆--------------☆--------------☆

رات کافی بیت گئی تھی۔ میں ضروری چیزیں اٹیچی کیس میں رکھ چکا تھا۔ بستر پر لیٹا تو نیند منہ پھلائے دور کھڑی تھی۔ میرے سونے کا وقت جو میں نے مقرر کر رکھا تھا' گزر چکا تھا اور اگر یہ وقت نکل جائے تو میں گھنٹوں کروٹیں بدلتا رہتا ہوں تب کہیں جا کر نیند آتی ہے۔ لیٹا اور سونے کا خیال آیا تو وہ پرانے خواب یاد آگئے۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ خواب اب کیوں دکھائی نہیں دے رہے۔ میں چاہتا تھا کہ پھر وہی خواب دکھائی دیں۔ میں محسوس کرسکوں' دیکھ سکوں کہ وہ سب کیا تھا۔ پرانے خواب البتہ مجھے تمام تر جزئیات کے ساتھ اچھی طرح یاد تھے اور انہیں میں اپنی ڈائری میں نوٹ بھی کرچکا تھا۔ میں بہت دیر تک سوچتا رہا' کروٹیں بدلتا رہا۔ نیند سے منتیں کرتا رہا تب جانے کب سو گیا۔

فجر کی اذان پر آنکھ کھل گئی۔ تیار ہوا' اماں اٹھ کر میرے لئے ناشتا اور ساتھ لے

جانے کو کھانا تیار کر رہی تھیں۔ انہیں پتا تھا کہ سفر میں مجھے بے پناہ بھوک لگتی ہے۔ عصمت آپا نماز پڑھ کر چائے بنانے لگیں۔ میں نماز سے فارغ ہو کر دادا کے کمرے میں گیا تو وہ سجدے میں تھے۔ میں وہیں کھڑا رہا۔ ان کی پشت میری طرف تھی۔ میں نے ان کے جسم کو بے حد لاغر اور کپکپاتا محسوس کیا۔ چند لمحوں بعد وہ نماز سے فارغ ہو گئے۔ مجھے دیکھ کر ان کے چہرے پر تازگی پھیل گئی۔

"آؤ بیٹا! جا رہے ہو؟"

"جی دادا! پلیز دادا جی! اپنا خیال رکھئے گا۔ بہت زیادہ۔ مجھے آپ کی ضرورت ہے۔ اس کا احساس یقیناً مجھے دیر سے ہوا ہے مگر میری اس غلطی کی سزا اتنی بڑی نہیں ہونی چاہیے کہ میں برداشت نہ کر سکوں۔"

"بیٹا! وہ قادر مطلق ہے۔ اس کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے۔ ہم تم دعا ہی تو کر سکتے ہیں۔ خیر تم بھی اپنا خیال رکھنا۔ اگر شاہی بابا سے ملتے ہی مجھے خط لکھ سکو تو لکھ دینا۔ کچھ اطمینان ہو جائے گا۔"

"میں ضرور لکھوں گا دادا۔ ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کروں گا۔"

میں نے انہیں دل میں اتار لینے والی نگاہوں سے دیکھا۔ کل کی نسبت آج ان کے چہرے پر صحت مندی تھی پھر میں نے رخصت چاہی۔ اماں ٹفن تیار کر چکی تھیں۔ ایک چھوٹا سا اٹیچی کیس میرے ساتھ تھا۔ میں سب سے رخصت لے کر باہر نکل آیا۔ اس زمانے میں سائیکل رکشا تھے یا تانگے، سائیکل رکشا کو لوگ چلایا کرتے تھے۔ آج کے رکشوں جیسے نہیں تھے بلکہ آدمی آگے آگے سائیکل چلاتا تھا۔ تانگے بھی ملتے تھے مگر تانگے کے لیے مجھے اگلے چوک تک جانا پڑتا۔ میری ہی گلی کے موڑ پر رام داس رہا کرتا تھا۔ وہ سائیکل رکشا چلاتا تھا۔

میں نے رات ہی کو اس سے بات کر لی تھی کہ اسٹیشن جانا ہے۔ وہ تیار تھا۔ سیٹ پر کپڑا مار کر انہیں چمکا رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اچک کر اس نے سائیکل سنبھال لی اور زور زور سے پیڈل مارنے لگا۔ اس کی موٹی موٹی پنڈلیاں پھڑکنے لگیں اور زبان بھی چلنا شروع ہو گئی۔ اسے آثار قدیمہ سے دلچسپی تھی۔ خاص طور پر اسے آگرے کا تاج محل پسند تھا۔ اکثر وہ اپنی ماتا جی کی پھٹکار صرف اس لیے سنا کرتا تھا کہ وہ گھنٹوں اسی انتظار میں بیکار کھڑا رہتا کہ کوئی لال قلعے یا قطب مینار کو جانے والا مسافر مل جائے۔ اس بہانے اسے

دوبارہ عمارتیں دیکھنے کا موقع مل جاتا۔

اسی نسبت سے وہ مجھ سے کافی بے تکلف تھے۔ جب موقع ملتا تو کرید کرید کر معلوم کرتا کہ میں اب کیا کھود رہا ہوں۔ کونسی نئی عمارتیں، کونسی کہانیوں کو عیاں کر چکی ہیں۔ میں اسے بہلا دیتا تھا۔ کبھی کوئی بات بتانے والی ہوتی تو ضرور بتا دیتا تھا۔ آج بھی وہ پوچھ رہا تھا کہ میں کہاں اور کیوں جا رہا ہوں۔ یہ سن کر کہ میں محض اپنی نانی سے ملنے جا رہا ہوں، وہ مجھے مشکوک نگاہوں سے بار بار پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ رستہ کٹتے دیر نہ لگی۔ گاڑی پلیٹ فارم پر تیار کھڑی تھی۔ میں نے ٹکٹ لیا۔ بوگی ڈھونڈی اور اس میں سوار ہو گیا۔ ڈبے میں زیادہ لوگ نہیں تھے اور میری طرف والے حصے میں تو کوئی تھا ہی نہیں۔ میں نے اٹیچی کیس برتھ پر رکھا۔ سیٹ کو صاف کیا اور کھڑکی کے قریب بیٹھ گیا۔ میں بروقت پہنچا تھا۔ میرے بیٹھتے ہی گاڑی نے وسل دی۔ ذرا سی دیر میں گاڑی رینگنا شروع ہو گئی۔ میں نے اسٹیشن پر نگاہ ڈالی۔ زیادہ رش نہیں تھا۔ کچھ لوگ تھکے تھکے بیٹھے تھے، یہ وہ لوگ تھے جو یہاں خوانچے لگاتے تھے۔ تمام رات آوازیں لگا لگا کر ان کی آواز بیٹھ جاتی تھی کیونکہ رات میں کئی ٹرینیں یہیں سے گزرتی تھیں اور کافی کافی دیر رکتی بھی تھیں۔

اچانک مجھے اپنے قریب آہٹ محسوس ہوئی۔ لگا جیسے کوئی میرے قریب آیا ہے۔ چاروں طرف مہک پھیل گئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ دماغ میں ہلچل سی مچی اور پھر کن پٹیوں میں دھماکے ہونے لگے۔

نتھنوں میں گھس جانے والی کافور کی مہک نے دماغ میں چنگاریاں سی بھر دی تھیں مگر آنے والی کو دیکھ کر وہی چنگاریاں جیسے بھڑک کر شعلوں میں تبدیل ہو گئیں۔ مجھے اپنی یادداشت پر اس قدر اعتماد نہیں تھا مگر میں اسے سامنے پا کر ہونّقوں بھونچکا رہ گیا۔ وہ جو بھی تھی، ہو بہو وہی تھی۔ وہ لڑکی جس کی لاش کو میں نے تابوت میں دیکھا تھا۔ وہ بھی خواب میں۔ مگر میں خود پر یقین کرنے کو تیار نہ تھا۔ یہ حیرت انگیز مشابہت کا کمال بھی ہو سکتا تھا۔ میں نے سر سے لے کر پاؤں تک اسے غور سے دیکھا۔ چھوٹا سا چمکدار پرس اس کے ہاتھ میں تھا، کالی جالی دار کپڑے کی لمبی سی فراک میں ملبوس یہ لڑکی پرس میں کچھ ٹٹول رہی تھی۔ اس کے بال لمبے اور سنہرے تھے۔ آنکھیں ہلکے فیروزی رنگ کی جھلک لیے ہوئے تھیں۔ ناک نقشہ کھڑا تھا۔ کالے ہی جالی دار لمبے موزوں سے اس کی گوری پنڈلیاں جھلک رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر اضطراب تھا۔ وہ ابھی تک پرس کو ٹٹول رہی تھی۔ ایک چھوٹا سا

اٹیچی کیس جو اس کے ہاتھ میں تھا' اس نے میرے سامنے والی سیٹ پر رکھ دیا۔
میں سخت ہراساں تھا۔ اسے خواب میں دیکھتے ہوئے آج بارہ برس ہو چکے تھے۔ پھر بھی میرا ذہن اس میں تمام جزئیات تک کو پا چکا تھا۔ ان بارہ برسوں کی دھول تک نہ تھی اس کے چہرے پر۔ وہی ترو تازہ چہرہ تھا۔

"بے وقوف.........." میرے دماغ میں ارتعاش سا پیدا ہوا۔

میں جھینپ گیا۔ اپنی بے وقوفی پر......... ممکن ہے اس کی شکل یونہی میرے دماغ نے تشکیل دی ہو۔ وہ حیرت انگیز طور پر اس سے مماثل ہو۔

اب وہ ہاتھ میں پکڑے کاغذ پر غالباً سیٹ نمبر چیک کر رہی تھی پھر اس نے وہاں پڑے نمبر کو دیکھ کر مطمئن انداز میں گردن ہلائی۔ کاغذ کو پرس میں رکھا۔ میری طرف تعارفی نگاہ ڈالی۔ ہلکے سے مسکرائی۔ پھر اس کی آنکھوں میں لمحہ بھر کو حیرت ابھری۔ میں بھی جواباً مسکرایا پھر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ وہ غالباً اپنا اٹیچی کیس اوپر رکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نظر آنے والی حیرت نے مجھے اچنبھے میں ڈال دیا تھا۔ شاید اسی وجہ سے میں نے یہ غیر اخلاقی حرکت کی تھی ورنہ ہوتا تو یہ چاہیے تھا کہ میں اٹیچی کیس رکھنے میں اس کی مدد کرتا۔

اس دوران میں' میں کافور کی مہک کو قطعی بھول چکا تھا۔ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے اچانک مجھے یاد آ گیا۔ اب وہ پہلے سے زیادہ نزدیک تھی۔ میں نے گہرا سانس لے کر اس مہک کا یقین کرنا چاہا مگر ناکام رہا۔ ایک ہلکی ہلکی' میٹھی میٹھی سی خوشبو تھی جو اس کی قربت کا احساس دلا رہی تھی۔

"پھر......... وہ کافور کی مہک......... وہ کیا تھا؟" میں الجھ گیا۔

"ایکسکیوزمی!"

اس سے پہلے کہ میں خود سے کیے گئے سوال کا جواب تلاش کرتا' اس کی خو[...] آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں چہرے پر مسکراہٹ سجائے اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔ "ہیلو!!" وہ مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ بہت خوبصورت تھی۔ "یہ ٹرین میر[...] جائے گی؟" اس نے انگریزی میں پوچھا۔

"جی ہاں۔"

"تھینک یو۔"

پھر وہ پرس کی طرف متوجہ ہو گئی۔ وہ پھر اس میں کچھ تلاش کر رہی تھی۔ مجھے پھر اس کا جائزہ لینے کا موقع مل گیا۔ عجیب سی سحر انگیزی تھی اس میں۔ میں جوں جوں اسے دیکھتا گیا' میرے ذہن میں وہ تابوت والی لڑکی واضح ہوتی چلی گئی۔ کچھ ہی دیر بعد یہ بات میرے دماغ میں پنجے گاڑ چکی تھی کہ یہ سو فیصد وہی ہے۔ سر مو فرق نہ تھا اس میں۔ میں نے چاہا کہ اس سے اس کے بارے میں معلومات حاصل کروں مگر جیسے کوئی مجھے اندر سے کھینچے ہوئے تھا۔ دبوچے بیٹھا تھا۔ اس سے مخاطب ہونے سے روک رہا تھا۔ میں نے پھر کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ ہوا سرد ہو گئی ہے۔ کمرے میں ٹھنڈک سی بھر گئی ہے۔ مجھے اس بات پر حیرت ہوئی کیونکہ شیشے بند تھے۔ موسم بھی گرم تھا' اسی لئے میں نے آتے ہی پنکھا چلا دیا تھا مگر اب اس پنکھے سے نکلنے والی ہوا بے پناہ سرد ہو چکی تھی۔ میں نے چاہا کہ پنکھا بند کر دوں مگر اب میں تنہا نہیں تھا' ایسا کرنے کے لئے مجھے اس سے یقیناً اجازت لینا پڑتی۔

اس نے پھر مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی بلکہ اسی اضطراب میں مبتلا اب بھی پرس میں کچھ تلاش کر رہی تھی۔ میں نے بے وجہ بے تکلف ہونے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ فضا میں عجیب سا تناؤ پیدا ہو گیا تھا۔ ممکن ہے یہ تناؤ میرے ذہن کا پیدا کردہ ہو۔ میں جس کیفیت سے دوچار تھا اسے بیان کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہا ہوں۔ بار بار خواب میں نظر آنے والا سین میری نگاہوں میں گھوم جاتا تھا۔ ہر بار میں خود کو تیقنی حالت میں پاتا۔ اگر اس لاش اور اس لڑکی میں فرق تھا تو آنکھوں کے فیروزی رنگ کا کہ لاش کی آنکھیں بند تھیں۔ پھر اچانک ہی میں چونک اٹھا۔ میں ایک بہت اہم چیز نظر انداز کر گیا تھا اور وہ تھی لاش کی کلائی میں پڑا وہی بریسلیٹ جو ابا لائے تھے اور جسے میں نے چرا لیا تھا اور جو ہمارے خاندان کی تباہی کا سبب بنا تھا۔

یہ خیال آتے ہی میں جھینپ گیا۔ بے وجہ مسکرایا پھر پلٹتے پلٹتے بھی میں نے نگاہ اس کی دونوں کلائیوں پر ڈالی اور مایوسی سے کھڑکی کی جانب پلٹ گیا۔ وہ پوری آستینوں کی فراک پہنے ہوئے تھی۔ آستین کلائی کے پاس آ کر تنگ ہو گئی تھی۔ اگر اس کے ہاتھ میں وہ کنگن تھی بھی تو مجھے دکھائی نہیں دے سکتی تھی۔

میں تھوڑی ہی دیر میں اپنے اندر ہونے والی اس کشمکش سے تھک گیا۔ یوں لگ

رہا تھا جیسے میرے اعصاب مسلسل اکڑے رہنے کے بعد اچانک چٹخ کر ٹوٹ جائیں گے۔ میں نے ذہن سے اس لڑکی کو کھرچ کر پھینک دینا چاہا' میرے لئے ممکن نہ تھا مگر اتنا ہوا کہ میں نے خود پر قابو پالیا۔ بدن کو ڈھیلا چھوڑ کر' سامنے والی سیٹ پر پاؤں ٹکا کر میں نے آنکھیں موند لیں۔ ہلکی ہلکی سی آوازیں' اور مدہم مدہم سی میٹھی خوشبو اس کی موجودگی کا احساس دلا رہی تھی۔ اسے ذہن سے مکمل طور پر نکالنے کی غرض سے میں فرحت کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس خیال سے ہی مجھے ایک عجیب سی سنسنی خیز خوشی محسوس ہو رہی تھی کہ وہ مجھے اچانک اپنے سامنے پا کر کتنی حیران ہوگی۔ بی جان اور کاکا جان بھی اچھل پڑیں گی۔ پھر میں دادا کے بارے میں سوچنے لگا۔ ان کا خیال آتے ہی میرا دل بیٹھنے لگا۔ وہ واقعی بہت جھکے ہوئے لگ رہے تھے۔ یوں جیسے جیتے جیتے تھک گئے ہوں۔

ان کے جملے کسی بازگشت کی طرح میرے دماغ میں گونجنے لگے۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ واقعی اب کبھی نہیں ملیں گے۔ میرا جی چاہا کہ یہیں سے پلٹ جاؤں مگر ایسا صرف میں سوچ ہی سکا۔

ٹرین اپنی پوری رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور رفتہ رفتہ گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ کسی بھی وقت بارش ہو سکتی تھی۔ بادلوں کی سیاہی گہری ہوتی جا رہی تھی۔ دن ڈھلنے سے پہلے ہی شام سی ہو چلی تھی۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے موٹی موٹی بوندیں پڑنے لگیں۔ اچانک مجھے کافی کی خوشبو آئی۔ ساتھ ہی ایک حسین آواز نے مجھے متوجہ کر لیا۔

"پلیز.............کافی............!"

"نو تھینکس............" میں نے طلب محسوس کرتے ہوئے بھی انکار کر دیا۔

"تکلف نہیں کیجئے۔ میں سفر میں کافی ضرور پیتی ہوں اور ہمیشہ زیادہ لاتی ہوں۔" اس کا انداز دوستانہ تھا۔ اس بار میں نے انکار نہیں کیا بلکہ شکریہ ادا کر کے کافی لے لی۔

"سردی بڑھ گئی ہے۔" میں نے بات آگے بڑھانے کو کہا۔

"سردی!!" اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ "مجھے یہاں بہت حبس محسوس ہو رہا ہے۔ ہوا گرم ہے اور میں الجھن کے ساتھ کوفت بھی محسوس کر رہی ہوں۔"

مجھے حیرت ہوئی اور میری نگاہ اس کی پیشانی اور ہونٹوں کے اوپر چمکتے پسینے کے

قطروں پر پڑی۔ "آپ یہاں آجائیے۔ میں کھڑکی کھول دیتا ہوں۔" میں اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے کھڑکی کو کچھ اوپر کر دیا۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ باہر کی ہوا گرم تھی جبکہ ڈبے میں سرد لہریں سی ہلکورے لیتی محسوس ہو رہی تھیں۔ میں اس لڑکی کی جگہ پر جا بیٹھا مگر دوسرے ہی لمحے مجھے اچھل جانا پڑا۔ میں جس جگہ بیٹھا تھا' یوں لگا جیسے وہاں سے ابھی ابھی برف کی سل سرکائی گئی ہو۔ وہ لڑکی میری طرف متوجہ نہیں تھی اس لئے شاید اس نے میرے اچھل جانے کو نوٹ نہیں کیا تھا۔ میں جلدی سے سرک کر بیٹھ گیا۔ کافی کا کپ میرے ہاتھ میں تھا۔

میں نے تعجب سے اس لڑکی کی طرف دیکھا پھر کپ کو ہونٹوں کے قریب لایا ہی تھا کہ ایک شدید بدبو کا بھبکا میرے دماغ میں چڑھ گیا۔ بدبو کافی کے کپ سے اٹھ رہی تھی۔ کافی ٹھنڈی یخ تھی جس کا اندازہ مجھے برف کی طرح سرد پڑتے کپ سے ہو گیا۔ میں نے حیرت سے کپ کی طرف دیکھا' وہ کپ جس میں ابھی کچھ دیر پہلے گرم بھاپ اٹھ رہی تھی' اب اسی کافی میں بلبلے سے بن کر پھوٹ رہے تھے۔ جیسے ہزاروں کیڑے کلبلا رہے ہوں۔ بدبو سے دماغ پھٹنے لگا تھا۔ میں تیزی سے اٹھ کر دوسری طرف چلا گیا۔ مجھے ابکائیاں سی آ رہی تھیں۔ میں نے سب سے پہلے کافی باہر انڈیلی۔ کپ کو باتھ روم میں لے جا کر دھویا۔ اب بھی اس میں سے بدبو اٹھ رہی تھی مگر اب قدرے کم ہو گئی تھی۔ میں دھلا ہوا مگ لے کر واپس اپنی جگہ لوٹ آیا۔ وہ مزے سے کافی پی رہی تھی۔ اس کی کافی سے اب بھی بھاپ اور خوشبو اٹھ رہی تھی۔

اب میرے سینے میں بل سے اٹھنے لگے تھے۔ میری حالت عجیب سی ہو گئی تھی۔ اب تو خوف بھی محسوس ہونے لگا تھا۔ مجھے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ وہ اس لڑکی کا بھوت ہے۔ پھر میں خود ہی اپنی بات کو رد کر دیتا' ہنس دیتا' اس سے بات کرنا چاہتا تو بات نہ ہوتی۔ اسے بھول کر آنکھیں بند کرتا تو تابوت میں لیٹی لڑکی کا سراپا گول گول گھومتا ہوا میرے اوپر چکرانے لگتا۔ ٹرین اسی رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ کتنی ہی دیر سے کوئی اسٹیشن نہیں آیا تھا۔ میں حیران تھا۔ اس راستے پر تو کئی چھوٹے چھوٹے اسٹیشن آتے تھے۔ یہ واحد ٹرین تھی جو ہر اسٹیشن سے مسافروں کو لیتی اور انہیں منزل پر پہنچایا کرتی تھی۔ میں نے اپنی ریسٹ واچ پر نگاہ ڈالی۔ حالانکہ مجھے ٹرین میں سوار ہوئے دو گھنٹے گزر چکے تھے مجھے لگ رہا تھا جیسے پندرہ بیس منٹ ہی گزرے ہوں۔ اچانک نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگا

جیسے میں اور وہ......... دنیا میں صرف ہم دو ہی رہ گئے ہیں۔

میں کسی اسٹیشن پر اترنا چاہتا تھا۔ دوسرے لوگوں کو دیکھنا چاہتا تھا مگر ٹرین بھاگی جا رہی تھی۔ سنسان اور دھیرے دھیرے اندھیروں کی طرف بڑھتے راستوں پر کسی زہریلی ناگن کی طرح بل کھاتی ہچکولے لیتی' اپنی مخصوص آواز کے زیروبم پر لہراتی چلی جا رہی تھی۔

میں اپنے اندر بلا کی تھکن محسوس کر رہا تھا۔ وہ لڑکی اب تک کافی کا مگ دونوں ہتھیلیوں میں تھامے کھڑکی کی چوکھٹ سے سر ٹکائے باہر دیکھ رہی تھی۔ تیز ہوا سے اس کے سنہرے بال اڑ رہے تھے۔ میں بے حس و حرکت بیٹھا تھا پھر شاید تھکن سے مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ میں نے سر جھٹک کر اس کیفیت سے نکلنا چاہا تو سر یوں بھاری ہو گیا جیسے اس پر کسی نے پہاڑ رکھ دیا ہو۔ میری گردن چٹخنے لگی۔ پپوٹے بھاری ہو کر میرے نہ چاہتے ہوئے بھی بند ہو گئے۔ جیسے تھک گئے ہوں پھر اندھیرا میری آنکھوں میں لہرانے لگا مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ میرا ذہن چوکنا ہو گیا تھا۔ میں ہر آہٹ' ہر آواز کو بڑے واضح طور پر سن رہا تھا۔ محسوس کر رہا تھا اور نہ جانے مجھے کیوں ایسا لگ رہا تھا کہ میں کسی اندھیری سرنگ میں گھٹنوں کے بل چل رہا ہوں۔ یوں جیسے وہ سرنگ چھوٹی ہو' تنگ ہو' جہاں میں کھڑا نہیں ہو سکتا۔ بس گھٹنوں کے بل رینگ سکتا ہوں۔ میرے گھٹنے چھل رہے تھے۔ سر جھکا ہوا تھا۔ گردن کے پیچھے مہروں کی ہڈیاں کڑکڑا رہی تھیں۔

پتا نہیں میں جاگ رہا تھا یا سو رہا تھا۔ رفتہ رفتہ ٹرین کی مخصوص آواز دھیمی ہوتی چلی گئی۔ اس کی جگہ تیز جھکڑ چلنے کی آواز نے مجھے احساس دلایا جیسے میں بگولوں کی زد میں ہوں۔ ٹھنڈی اور یخ ہوا کے تھپیڑے میرے چہرے اور بدن سے ٹکرانے لگے۔ مجھے آگے بڑھنے کے لئے بہت محنت کرنا پڑ رہی تھی۔ میں جیسے جیسے آگے بڑھنا چاہ رہا تھا ویسے ویسے ہوا میرے راستے کی دیوار بنتی جا رہی تھی۔

بالکل اچانک مجھے لگا جیسے سرنگ ایک دم ختم ہو گئی ہے۔ میں کہیں نیچے گرنے والا ہوں۔ ایک زبردست جھٹکا لگا۔ میں نے پوری قوت سے اپنے آپ کو سنبھالا اور پھر اچانک کوئی بھاری پتھر سا مجھ پر آ گرا' میرے حلق سے چیخ نکل گئی۔ میں جھٹکے سے اٹھ بیٹھا تھا۔ میں اپنی سیٹ پر ہی تھا' میری ٹانگوں پر میرا اٹیچی کیس گرا ہوا تھا۔ میں یقیناً سو گیا تھا۔ کھڑکی کا شیشہ کھلا ہوا تھا جس میں سے سرد ہوا کے جھونکے اندر داخل ہو رہے تھے۔ میں نے

چاروں طرف نگاہ ڈالی پھر مجھے اچانک خیال آیا کہ وہ عورت نہیں ہے۔ وہ واقعی کہیں نہیں تھی۔ نہ اس کا اٹیچی کیس تھا۔ نہ وہ فلاسک' جس میں اس نے مجھے کافی دی تھی' کپ تھے' گویا وہاں کوئی آیا ہی نہ ہو۔ میں بڑی دیر تک اپنی کیفیت اور گزرے ہوئے واقعات کے بارے میں سوچتا رہا۔ میں کسی بھی حال میں اس تمام واقعے کو خواب ماننے کو نہ اس وقت تیار تھا نہ اب تیار ہوں' وہ آئی تھی۔ مجھے اس نے کافی دی تھی۔ مجھ پر غنودگی طاری ہوئی تھی۔ وہ سب کچھ میرے ساتھ ہوا تھا جو میں نے محسوس کیا تھا مگر وہ سب کیا تھا؟ کیا میری غنودگی کے دوران میں ٹرین کہیں رکی تھی؟ کیا وہ عورت کہیں اتر گئی تھی؟ وہ کون تھی۔ اس کا البتہ واضح جواب میرے پاس موجود تھا۔ یہ کہ وہ' وہی تھی جسے میں نے بچپن کے خواب میں تابوت کے اندر لیٹا دیکھا تھا۔ اس کا مجھے سو فیصد یقین تھا' اور ہے۔

میں سوائے سوچنے' تاویلیں گھڑنے' اندازے لگانے کے کچھ بھی نہیں کر سکا۔ یہ ٹرین ایسی بھی نہ تھی کہ اس میں زیادہ رش ہوتا' کوئی اگر میری بوگی میں ہوتا تو میں اس سے اس واقعے کی تصدیق کروا سکتا تھا مگر میں جس بوگی میں تھا وہ بالکل خالی تھی۔ پتا نہیں یہ بھی اتفاق تھا یا کسی پُراسراریت کا حصہ۔ میں تھک گیا۔ بہت تھک گیا۔ میری گردن میں پشت کی طرف درد تھا۔ دونوں کندھوں کے بیچوں بیچ درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ میں سیٹ پر بالکل سیدھا لیٹ گیا۔ اٹیچی کیس میں نے اٹھا کر واپس اوپر رکھ دیا تھا جو غالباً ٹرین کے جھٹکے سے میری ٹانگوں پر گرا تھا۔

میں نے سونے کی کوشش کی۔ گھڑی میں وقت دیکھا' ابھی میرٹھ پہنچنے میں بہت دیر تھی۔ ٹرین کی رفتار وہ نہیں تھی جو میں نے اب سے پہلے محسوس کی تھی۔ وہ رینگتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے کھڑکی کا شیشہ بند کرنے سے پہلے باہر جھانکا۔ صبح کا سرمئی پن دور تک پھیلا ہوا تھا۔ آسمانوں کے کنارے شفق رنگ ہو چکے تھے۔ پرندے رزق کی تلاش میں محوِ سفر تھے۔ دور کھیتوں میں کسان ہل چلا رہے تھے۔ کہیں کہیں کچی پگڈنڈی پر کبھی کوئی بیل گاڑی' کبھی سائیکل اور کبھی گھوڑا گاڑی نظر آ جاتی تھی۔ کہیں سڑک کو کراس کرتی ٹرین کے دونوں جانب ایک آدھ گاڑی' سائیکل سوار یا تانگا ٹرین کے گزرنے کے انتظار میں کھڑے لمحہ بھر کو نظر آتے اور تیزی سے گزرتے ہوئے سین میں غائب ہو جاتے۔ ہوا میں خنکی اب بھی تھی۔ میں نے شیشہ بند کر کے اس کا شٹر بھی گرا دیا۔ عین سر

پر جلنے والا بلب بجھایا اور سیٹ پر دوبارہ لیٹ گیا۔

ٹرین کے ہچکولے مجھے دھیرے دھیرے نیند کی وادی میں لے گئے۔ پھر میری آنکھ بہت سی آوازوں سے کھلی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے ڈبے میں کچھ لوگ چڑھے ہیں۔ ٹرین کسی اسٹیشن پر رکی ہوئی تھی۔ میں نے پھر کھڑکی کھولی۔ یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ اس کا اگلا اسٹیشن میرٹھ کا تھا۔ اس دوران میں بہت سے لوگ اندر آ گئے۔ آتے ہی ان لوگوں نے سیٹیں سنبھال لیں۔ شور سا مچ گیا۔ مجھے زندگی محسوس ہوئی۔ میں اس شور اور ہڑبونگ سے ذرا بھی نہ الجھا۔ بڑے سناٹے میں گزرا وقت بوجھل لمحوں کی طرح مجھے ڈپریس کر گیا تھا۔ شاید اس لئے میں خود کو خوش محسوس کر رہا تھا۔ میں نے اپنا اٹیچی کیس اٹھا کر نیچے اپنی سیٹ کے پاس رکھ لیا۔ جو فیملی میرے بالکل سامنے والی سیٹ پر قبضہ جما رہی تھی ان کے ساتھ دو بچے تھے۔ بچے سیدھے کھڑکی کی طرف آئے تھے اور اب دونوں آپس میں لڑ رہے تھے۔ دونوں کو کھڑکی سے لگ کر بیٹھنا تھا۔ لمحوں ہی میں ان دونوں کے درمیان ہاتھاپائی شروع ہو گئی۔

"ابے حرام زادو .... منحوسو.......... تم دونوں کو یہاں بھی چین نہیں آتا۔"

ایک بوڑھی خاتون نے دونوں ہی کو ریٹ کے رکھ دیا۔ وہ دونوں شاید پہلے ہی اس سے اس ردعمل کے عادی تھے۔ ایک دم منہ پھاڑ کر رونے لگے۔ وہ اب بھی ایک دوسرے کو کھسوٹ رہے تھے۔ اب ان کے ساتھ آنے والا مرد ان دونوں کی طرف مڑا۔ انہیں گھورا۔ "ابے نجلو! بات سمجھ میں نہیں آتی؟"

وہ بھی مارنے کے لئے ہاتھ اٹھا کر آگے بڑھا۔ میں نے دیکھا' دونوں بچوں کے رنگ سفید ہو گئے۔ دونوں ایک دوسرے کے پیچھے چھپنے لگے۔ وہ کسی عقاب کی طرح جھپٹا اور دونوں کو گریبانوں سے پکڑ کر اٹھا لیا۔ دوسری طرف پٹخ کر اس نے کھڑکی کے قریب کی جگہ خود سنبھال لی۔ اب اس کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ وہ بڑے بھونڈے انداز میں مسکرایا پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

"ابا...... ابا........" دونوں بچوں نے سہمے ہوئے انداز میں اس آدمی کو پکارا۔

"ارے چپ ہو جاؤ حرامزادو۔ تمہاری ہڈیوں میں دکھن نہیں ہوئی۔ سارے راستے پٹے ہو باپ اور دادی سے۔" اب برقعے میں لپٹی عورت نے ان دونوں کو کھسوٹا۔ اس نے اپنا نقاب پلٹ دیا تھا۔ میری آنکھوں میں بجلی سی کوندگئی۔ اس کی خوبصورت

آنکھوں میں غصے کے ساتھ کرب بھی بھرا ہوا تھا۔ اس نے ان دونوں کو مرغی کی طرح اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ اپنی آنکھوں کے نم کونوں کو برقعے سے صاف کیا اور شاکی نگاہوں سے کھڑکی کے قریب بیٹھے آدمی اور اس بوڑھی عورت کو دیکھنے لگی۔

مجھے اماں یاد آ گئیں۔ وہ راتیں یاد آ گئیں جب وہ ابا کے گھر میں گھستے ہی بوکھلا جاتی تھیں۔ بار بار ہمیں چپ کراتی تھیں۔ ذرا سی آہٹ پر بھی "ششش........" پکار اٹھتی تھیں۔ اس وقت ان کی آنکھوں میں خوف ہوا کرتا تھا مگر جب........ رات کے کسی پہر وہ ابا کے کمرے سے باہر آتی تھیں اور میں چپکے سی بھنچی بھنچی آنکھوں سے انہیں غور سے دیکھتا تھا تب ان کی آنکھوں کے کونوں میں بھی پانی بھرا ہوتا تھا۔ غصہ اور کرب دونوں ہی مل کر عجیب سی کیفیت بنا دیتے ہیں اور وہ جانے کیوں' بے اختیار مجھے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیتی تھیں۔

وہ پورا خاندان ایک دوسرے سے بیزار لگ رہا تھا۔ مجھے اس وقت شدت سے اپنے گھر کے افراد یاد آئے۔ یہ احساس بھی ہوا کہ ہم سب بھی ایک دوسرے سے اتنے ہی بیزار ہیں۔ الگ تھلگ' کوئی کسی کے لئے نہ فکرمند ہے' نہ پریشان' حال احوال تک پوچھنے سے مستثنیٰ سمجھنے لگے ہیں خود کو۔ رضا بھائی' شجاع بھائی' طیب' زین' اور زینت اور میں........ خود میں بھی گھر سے باہر کتنا اہم اور گھر کے اندر کس قدر غیر اہم بن کر رہ گیا تھا۔

وہ رفاقتیں' وہ محبتیں' وہ میل ملاپ......... وہ چہل پہل سب کچھ ختم ہو کر رہ گیا تھا۔ ہم سب یوں ایک گھر میں رہ رہے تھے جیسے کسی سرائے میں رہ رہے ہوں اور صرف وہی لوگ جن کے پاس رات کو سونے کا ٹھکانا نہ تھا۔ شاید ہم میں سے کسی کے پاس ٹھکانا ہوتا تو ہم بھی وہ چوکھٹ چھوڑ کر کہیں اور جا چکے ہوتے حالانکہ ابا کی موت سے پہلے کسی کا گھر سے الگ ہونا' یا کسی فرد سے کسی دوسرے فرد کا بے رخی برتنا ممکن ہی نہ تھا' دلوں میں ایک دوسرے کے لئے کشش تھی' محبت تھی' وہ سب ختم ہو چکی تھی......... میں نے سوچتے سوچتے سر سیٹ کی پشت سے ٹیک دیا۔

جونہی میرا سر لکڑی کے اس پٹے پر لگا۔ میں چند لمحے ساکت رہ گیا۔ پھر اچھل پڑا۔ مجھے یوں لگا جیسے اس لکڑی میں سے کوئی سرگوشیاں کر رہا ہو۔ پھر آواز واضح ہو گئی تھی۔

"ضیاء...... ضیاء...... ضیاء......"

کوئی مجھے پکار رہا تھا۔ وہی مخصوص آواز تھی۔ وہی خواب والی۔ قبرستان والی.......... میرے اچھل جانے سے میرا سر لکڑی کے اس پٹے پر سے دور ہو گیا اور آواز ختم ہو گئی۔ میں نے حیرت سے اس لکڑی کو دیکھا جس پر سر ٹیکا تھا۔ پھر میں نے اس سے کان لگا دیا۔ مگر اب کوئی آواز سنائی نہ دی۔ میں نے سیدھا ہو کر سر ٹکا دیا مگر آواز اب بھی نہ آئی۔ میں نے پھر اس لکڑی کو ٹٹولا۔ لیٹا تو جھینپ گیا۔ وہ پوری فیملی میری حرکتوں کو حیرت سے منہ پھاڑے دیکھ رہی تھی۔ وہ لوگ مجھے ایسے دیکھ رہے تھے جیسے میں پاگل ہو گیا ہوں۔ مجھے اپنے اوپر غصہ آنے لگا۔ میں واقعی پاگلوں کی سی حرکتیں کر رہا تھا۔ وہ آواز میرے اعصاب پر طاری ہو گئی تھی۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ میرٹھ ہی میں کسی نفسیات کے ماہر ڈاکٹر سے ملوں گا۔ اب میں کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ مجھے شرم محسوس ہو رہی تھی۔ وہ دونوں بچے بھی ماں کی بغل سے مجھے جھانک رہے تھے۔ ان کے منہ کھلے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں حیرت تھی۔ عین اسی وقت میرٹھ کا اسٹیشن آگیا۔ میں نے تیزی سے کھڑے ہو کر اپنا اٹیچی کیس اٹھایا اور دروازے پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے ان دونوں بچوں کو اپنی کھڑکی کی طرف لپکتے دیکھ لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

اسٹیشن پر رش تھا۔ تانگے والے میرے پیچھے لپکے۔ میں نے ایک تانگے والے سے بات کی اور تانگے میں بیٹھ گیا۔ سفر اتنا نہیں تھا جتنی مجھے تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ ہم بیس منٹ بعد ہی بی جان کے دروازے پر پہنچ گئے۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ شام کے چار بجنے والے تھے۔ میرے حساب سے تو ٹرین سے اتنی دیر کا سفر نہیں تھا مگر شاید یہ ٹرین زیادہ ہی دھیمی رفتار سے چلی تھی حالانکہ ایسا کہیں محسوس نہیں ہوا سوائے ایک مرتبہ کے۔ بہر حال مجھے یہاں پہنچنے کی ایسی کوئی جلدی بھی نہیں تھی لیکن میں اتنا ضرور چاہتا تھا کہ شیوا جی سے میری ملاقات آج ہی ہو جائے بلکہ ہو سکے تو میں شالی بابا اور شیوا جی دونوں ہی سے آج ہی مل لوں تا کہ کم از کم دادا کو کل ہی تفصیل لکھ دوں۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے دادا کو بہت جلدی ہے۔ انہوں نے تاکید کی تھی کہ فوراً پہلی فرصت میں انہیں ضرور لکھ دوں کہ ملاقات ہوئی یا نہیں اور اگر ہوئی تو کیا ہوا۔

"ہاں بابو صاحب! کیا ہم غلط جگہ آگئے ہیں؟" تانگے والے نے مجھے چونکا دیا۔

"اوہ.......... نہیں.......... ہم ٹھیک جگہ آئے ہیں۔" میں نے بی جان کے مکان کی

طرف دیکھتے ہوئے کہا جو اتنے برسوں میں ذرا بھی نہ بدلا تھا۔ باہر سے ویسا ہی کھنڈر لگ رہا تھا جیسے اب سے برسوں پہلے لگا کرتا تھا۔ میں نے تانگے والے کو کرایہ دیا۔ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ یہ سب مجھے اچانک یہاں پا کر کس قدر حیران ہوں گے۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ میں نے کنڈا بجایا جواباً کچھ دیر تک اندر خاموشی چھائی رہی۔ میں نے پھر کنڈا بجانے کے لئے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ دروازہ دھیرے سے کھل گیا۔ سامنے فرحت کھڑی' بھونچکی ہوئی مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کا دوپٹا اس کے کندھے سے ڈھلکا ہوا تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ سیاہ چمکدار بالوں کی ایک لٹ اس کے چہرے پر پڑی تھی۔ ملگجے سے کپڑے' ہاتھ آٹے میں سنے ہوئے' تمتماتا ہوا چہرہ۔ میں اسے دیکھے ہی رہ گیا۔

"او....... اوہ....... آ...... آپ.........؟"

شاید اسے یقین نہیں آیا تھا شاید وہ اسے خواب سمجھ رہی تھی۔ اس نے پلکیں جھپکائیں۔ میں پھر بھی غائب نہیں ہوا تو وہ چونک پر پلٹی۔

"بی...... بی جان...... بی جان........" پھر وہ میری طرف پلٹی۔ "آیئے نا۔ اور کون آیا ہے.........؟ خالہ جان.......... عصمت آپا۔"

"کوئی نہیں آیا۔ میں اکیلا کافی ہوں۔" میں نے شرارت سے کہا۔ میں اندر داخل ہو گیا۔ وہ پلٹ کر اپنا دوپٹا درست کرنے لگی' دوپٹے پر آٹا لگ گیا۔ وہ بوکھلا گئی۔ میں اس کی اس بوکھلاہٹ سے محظوظ ہو رہا تھا۔ مجھے ایسے آنا بہت اچھا لگا۔ پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ آدمی بکھرا بکھرا' بے ترتیب بھی کبھی کبھی اچھا لگتا ہے۔

"کیا ہوا فری........ کون ہے بیٹا؟"

بی جان کی آواز آئی۔ ساتھ ہی ان کے چپلوں کو گھسیٹنے کی آواز اور مخصوص انداز میں چلنے کی آواز آئی۔ وہ سامنے آگئیں۔ مجھے دیکھ کر لمحہ بھر کو تو وہ بھی حیران ہو گئیں۔ میں نے پل بھر کو تو ان کی آنکھوں میں اچانک کروٹ لے کر جاگ اٹھنے والے خوف کو بھی محسوس کر لیا۔ "السلام علیکم بی جان۔" میں ان کی طرف بڑھا۔ میں نے خاص طور پر مسکرا کر کہا۔ شاید ان کی آنکھوں میں جاگ اٹھنے والے خوف کی وجہ سے۔

"خیریت ہے بیٹا؟" ان کی آواز میں انجانے خوف کی لرزش تھی۔ "وعلیکم السلام!"

"جی بی جان۔ الحمداللہ۔ بہت خیریت ہے۔ بس میں نے سوچا آج آپ کی شکایت دور کر دوں۔ آپ ہی کہتی تھیں ناں کہ میں آتا نہیں۔" میں نے اپنا بازو ان کے کندھوں پر رکھ کر کہا۔ ان کے بدن میں ہلکا سا لرزا مجھے صاف محسوس ہو رہا تھا اور جب انہوں نے ملتجی انداز سے مجھے یوں دیکھا جیسے کہنا چاہتی ہوں' تو بھی بے بتا دو۔

"بی جان! سب نے آپ کو سلام کہا ہے۔ اماں اور عصمت آپا بھی آنے کو کہہ رہی تھیں مگر دادا کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ دادی میں اتنا دم نہیں کہ اکیلی ان کی دیکھ بھال کر سکیں۔ آپ کو تو پتا ہے' رضا بھائی اور شجاع بھائی تو اپنے میں مگن ہیں۔ چچی صاحب آ تو گئی ہیں مگر......" میں نے جلدی جلدی سب کے بارے میں بات کر لی۔ انہوں نے ایک بار پھر مجھے غور سے دیکھا۔ ہم بڑے کمرے میں پہنچ گئے۔ جہاں کاکا جان نماز پڑھ رہی تھیں۔ میں نے بی جان کو مسہری پر بٹھا دیا۔ اب ان کے چہرے پر کچھ اطمینان تھا۔

"اللہ سب پر کرم کرے۔ میں تو یوں تجھے دیکھ کر ہولا ہی گئی تھی۔"

"کیوں بھلا۔ میں ہولا دینے والی شکل رکھتا ہوں کیا؟" میں نے پلٹ کر فرحت کو دیکھنا چاہا مگر وہ وہاں نہیں تھی۔

"ارے میرے لعل........ اتنی پیاری شکل ہے تیری........ پتا ہے' تیرے دودھیال میں اتنا خوبصورت کوئی بھی نہیں ہے۔" وہ اترا کر بولیں۔

"دادا تو کہتے ہیں میں ابا کی شکل کا ہوں اور ابا تو........ میرے دودھیال کے ہی ہوئے ناں!" میں نے مسکرا کر ان کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ارے ہاں' بڑے آئے' کہاں سے ابا کی شکل کا ہے؟ بنا بنایا نانا ہے تو........ تو........ نے دیکھا نہیں کیا نانا کو؟"

"دیکھا تو تھا پر یاد نہیں۔" میں نے نانا کی صورت یاد کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ میں اس وقت چھوٹا تھا۔ کچھ بھی یاد نہیں تھا۔

"ابھی تصویر دکھاؤں گی تجھے۔ فرحت........ او فری........" بی جان نے آواز دی اور فرحت اندر آئی۔ اب وہ سنبھلی ہوئی لگ رہی تھی۔ غالباً آٹا گوندھ چکی تھی۔ ہاتھ منہ دھو کر اس نے بکھرے ہوئے بالوں کو بھی سمیٹ لیا تھا۔ دوپٹا سلیقے سے سر پر اوڑھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ خوشگوار حیرت سے دوچار ہے۔ اس میں تحسین خالہ کی شباہت بڑی واضح تھی۔ ویسا ہی نرم نرم سا شفیق چہرہ' وہی دھیمی سی

مسکراہٹ۔

"فری بوا! ضیاء کے لئے نہانے کو پانی گرم کر دو اور ہاں جلدی سے کھانا بھی نکال لو۔ بھوکا آیا ہوگا۔" آخری جملہ انہوں نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا تھا۔

"کچھ کھایا تو نہیں ہے بی جان۔ حالانکہ اماں نے ٹفن میں کھانا دیا تھا مگر........" اور اسی وقت مجھے یاد آیا کہ ٹفن تو میں ٹرین ہی میں بھول آیا۔ بلکہ وہ تو مجھے کہیں نظر ہی نہیں آیا۔

"کیا ہوا؟" بی جان نے مجھے اچانک چپ ہوتے دیکھ کر پوچھا۔

"کچھ نہیں بی جان' ٹفن میں ٹرین میں بھول آیا۔"

"ارے تو کیا ہوا۔ جاؤ فری بوا تم کھانے کا انتظام کرو اور چندا تم جا کر نہا لو۔" انہوں نے آخری جملہ مجھ سے کہا تھا۔

اسی وقت کاکا جان نے سلام پھیرا پھر لپک کر مجھے سینے سے لگا لیا۔ سب کی خیریت پوچھی۔ بی جان نے ٹوک دیا ضیاء نہا کر آ جائے پھر پوچھتی رہنا۔ میں نہانے چلا گیا۔ میں نے فرحت کو گرم پانی کرنے کو منع کر دیا تھا۔ میں ٹھنڈے پانی سے نہا کر نکلا تو فرحت کھانا لگا رہی تھی۔

کھانے کے دوران میں بی جان زیادہ تر گھر والوں کے بارے میں باتیں کرتی رہیں۔ زہرہ آپا کی خیریت' چچی صاحب کے حالات' رضا بھائی کی شادی کے معاملات' شجاع بھائی کی واپسی کا پروگرام یا عصمت آپا کی شادی کا قصہ۔ یوں تو میں ان کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا یا فرحت کے چہرے پر پھیلی دھنک کے معنی تلاش کر رہا تھا مگر میرے دماغ میں کہیں سرگوشیاں سی ہو رہی تھیں۔ میں جلد از جلد شالی بابا کے متعلق اور شیوا جی کے بارے میں معلومات چاہتا تھا۔ یوں بھی شام گہری ہوتی جا رہی تھی۔ میں رات سے پہلے ہی شالی بابا سے مل لینا چاہتا تھا۔ اسی طویل گفتگو کے دوران کھانا ختم ہو گیا۔ کاکا جان اور بی جان مغرب کی نماز کے لئے اٹھیں تو میں بھی قریبی مسجد میں چلا گیا۔ میرا ارادہ اپنی حویلی جانے کا بھی تھا۔ میں اپنے محلے والوں سے بھی ملنا چاہتا تھا۔ گھر کو ایک نگاہ دیکھ لینے کی خواہش نے میرٹھ پہنچتے ہی جنم لیا تھا۔

☆-------------☆-----------☆

مسجد میں ہر شخص اجنبی تھا۔ ظاہر ہے یہ وہ علاقہ نہیں تھا جہاں میں نے اپنی ابتدائی عمر گزاری تھی۔ گو یہ بھی میرٹھ ہی تھا اور میرٹھ اتنا بڑا بھی نہیں تھا کہ ایک علاقے کے آدمی کو ضرور دوسرے علاقے کا آدمی نہ جان سکے۔ یوں بھی ہمارے گھر تو میرٹھ کے کئی علاقوں میں رہنے والے آیا جایا کرتے تھے۔ کچھ دادا سے عقیدت کی بنا پر اور زیادہ نرنجا صاحب کے مشاعروں اور ادبی نشستوں کی وجہ سے مگر میرا خیال ہے کہ مجھے کسی نے بھی کبھی اتنے غور سے نہیں دیکھا ہوگا کہ یوں برس گزر جانے پر بھی آسانی سے پہچان لے۔ میں نے اپنے طور پر کسی جان پہچان کے آدمی کو ڈھونڈنے کی کوشش ضرور کی تھی مگر پھر ایک صف میں نماز پڑھ کر مسجد سے باہر آگیا۔

ابھی میں سیڑھیوں کو عبور بھی نہیں کر پایا تھا کہ میری نگاہ ایک ہجوم پر پڑی۔ ہجوم مضطرب تھا۔ لوگ ایک دوسرے سے آگے بڑھ کر کچھ دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بہت جلد مجھے احساس ہوگیا کہ اس ہجوم کے درمیان کوئی بیٹھا ہے یا کچھ ہے جسے دیکھنے کے لئے سب بے چین ہیں۔ پہلے میں نے بھی جھانکنے کی کوشش کی مگر ہجوم کے اضطراب سے گھبرا کر پیچھے ہوگیا۔ پتا نہیں کیوں مجھے خیال نہ آیا کہ میں کسی سے استفسار کرتا۔ بس چپ چاپ کھڑا رہا۔ اتنی دیر میں ایک تانگا وہاں آکر رکا۔ ہجوم نے جگہ بنا دی۔ تانگا اس ہجوم کے درمیان سے ہوتا ہوا آگے بڑھا پھر میں نے ایک باریش بزرگ کو تانگے میں سوار ہوتے دیکھا۔ اب وہ مجھے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ لوگوں کو اس بزرگ سے عقیدت اضطراب میں مبتلا کئے ہوئے تھے۔

میں مسجد ہی کی دیوار سے ٹک کر کھڑا ہوگیا۔ میرے کھڑے رہنے کی وجہ صرف اتنی تھی کہ میں ہجوم میں اپنے محلے کے کسی شخص کو تلاش کر رہا تھا۔ جس مسجد میں میں نے نماز ادا کی تھی' یہ میرٹھ کی سب سے بڑی مسجد تھی۔ یہاں نماز ادا کرنے کے لئے دور دور سے لوگ آیا کرتے تھے۔ میری نگاہ اب پھر ہجوم کی طرف تھی۔ میں ہر چہرے میں

شناسائی تلاش کر رہا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے ان بزرگ کا تانگا آگے بڑھ گیا۔ تانگے میں ایک لوہے کا بکس رکھا دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ بزرگ شاید شہر سے باہر جا رہے تھے۔ میں نے تانگے کے گزرنے کا انتظار کیا' مجھے خود بھی اسی سمت میں جانا تھا۔ یہ ایک چوڑی سڑک تھی جسے عبور کرنے کے بعد ہی بی جان والی گلی پڑتی تھی۔

اچانک میری نگاہ مبشر پر پڑی۔ میں اسے پہچان گیا۔ وہ ذرا بھی نہیں بدلا تھا ہاں قد ضرور لمبا ہوگیا تھا مگر اس کا ناک نقشہ' رنگ' دبلا پتلا جسم' بھورے بال اور بھوری آنکھیں اب بھی وہی تھیں۔ وہ ہمارے گھر کے پیچھے والے گھر میں رہتا تھا۔ ان لوگوں کا ہمارے گھر آنا جانا تھا اور میں محلے کے تمام دوسرے لڑکوں کی نسبت مبشر کو زیادہ پسند کرتا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ بھی ہمیشہ سے مجھ سے مرعوب رہا تھا۔ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ مجھے ہمیشہ وہی لوگ اچھے لگتے تھے جو مجھ سے مرعوب رہیں۔

مبشر کو دیکھتے ہی میں آگے بڑھا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ مبشر مجھے پہچانتا ہے یا نہیں۔ میں نے اس کے قریب پہنچ کر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا' لمحہ بھر کو اس کی آنکھوں میں اجنبیت بھی لہرائی مگر دوسرے ہی لمحے وہ منہ پھاڑ کر مجھ سے لپٹ گیا۔

"ضیاء...... یہ...... یہ تم ہو......؟" اس نے مجھے خود سے الگ کیا' سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لیا پھر مجھے لپٹا لیا۔ مجھے اس سے اس گرم جوشی کی امید نہیں تھی۔ اس کی یہ محبت اور یہ والہانہ پن مجھے اچھا لگا۔

"تم مجھے پہچان گئے؟" میں نے مسکرا کر پوچھا۔

"ارے...... تمہیں کیسے نہ پہچانتا!"

"اور میں نے تو دور سے دیکھ کر ہی پہچان لیا تھا۔ کیسے ہو تم؟ ابا اماں وغیرہ کیسے ہیں؟"

"سب ٹھیک ہیں۔ ایک منٹ ٹھہرو پھر گھر چلتے ہیں۔ اماں تو سب کو بہت یاد کرتی ہیں۔ ایک منٹ...... ہاں؟"

وہ اتنا کہہ کر تانگے کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلانے لگا حالانکہ وہ تانگہ اب ہم سے بہت دور جا چکا تھا۔ پھر اچانک وہ میری طرف پلٹا۔

"آؤ...... چائے پیتے ہیں۔"

اتنا کہہ کر وہ مجھے لئے ہوئے قریب ایک ہوٹل میں پہنچ گیا۔ یہ چھوٹا سا ایک ریستوران تھا شاید نیا بنا تھا ورنہ مجھے یاد تھا' اس طرف دور تک ایک میدان تھا جہاں اکثر ہم کھیلنے اور گرگٹ پکڑنے آیا کرتے تھے۔ میدان میں تیزی سے بھاگتے اور کبھی ہم گردن اٹھا کر دیکھتے ہوئے مٹیالے رنگ کے گرگٹ ہمیشہ مجھے سنسنی خیز کیفیت سے دوچار کر دیا کرتے تھے۔ انہیں پکڑنے میں 'میں' جس قدر چالاکی اور محنت کا مظاہرہ کیا کرتا تھا وہ میرے دوستوں کے لئے حیرت انگیز تھی۔

"اب بتاؤ........" بشر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "تم کب آئے؟"

"میں آج ہی شام کو پہنچا ہوں۔"

"شام کو؟ مگر ہمیں تو نہیں لگا کہ کوئی اس گھر میں آیا ہے۔ میں تو گھر پر ہی تھا۔"

"میں اپنے گھر ابھی نہیں گیا۔ بی جان کے گھر ہوں۔"

"اوہ........ ہاں........" وہ یوں میری آنکھوں میں جھانک کر بولا جیسے اسے [illegible] یاد آ گیا ہو۔ "اس گھر کی ویرانی نے پورا محلہ ہی ویران کر دیا ہے ضیاء۔"

"ہاں یار۔" میں بھی افسردہ ہو گیا۔

"کیسی رونق تھی اس گھر میں۔" وہ آہ بھر کر بولا۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ وہ ضرور شالی بابا کے بارے میں جانتا ہو گا۔ "سنو۔" میں بول اٹھا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ "یار یہاں کوئی شالی بابا رہتے ہیں۔ تم جانتے........"

"ارے........" اس نے میری بات کاٹ دی۔ "وہ شالی بابا ہی تو تھے۔"

"کون؟"

"وہی جو ابھی تانگے میں گئے ہیں۔ وہ آج عمرے کے لئے روانہ ہوئے ہیں۔"

"کیا........؟" میں دھک سے رہ گیا۔ "وہ........ چلے گئے؟"

"ہاں' اب تک تو وہ اسٹیشن پہنچ گئے ہوں گے۔ یہاں سے دہلی جائیں [illegible] سے......"

"آؤ میرے ساتھ۔" میں نے اس کی بات پوری ہوئے بغیر ہی کھڑے ہو کر اسے گھسیٹا۔

"ارے کہاں........ سنو تو........" وہ بوکھلا گیا۔ عین اسی وقت ہوٹل کا لڑکا چائے کی ٹرے تھامے ہمارے پاس پہنچ گیا۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ ایک روپیہ ا

ٹرے میں ڈالا اور بشر کی بات کا جواب دیئے بغیر اسے گھسیٹتا ہوا باہر کی طرف لپکا۔

"کیا ہو گیا بابا........! بتاؤ تو۔" وہ حیران تھا۔

"مجھے شالی بابا تک پہنچنا ہے۔" میں نے باہر کھڑے تانگے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "جلدی کرو۔ میں راستے میں وجہ بتاتا ہوں۔"

وہ تانگے میں بیٹھ گیا مگر اصرار کرتا رہا کہ اسٹیشن یہاں سے دور نہیں ہے اور ٹرین کی روانگی کا وقت بھی گزرے بیس منٹ ہو گئے ہیں۔ اس لئے وہاں جانا بیکار ہے۔ میرا خیال تھا کہ ابھی ٹرین روانہ نہیں ہوئی ہو گی۔ اگر مجھے دو منٹ بھی مل گئے تو غنیمت ہو گا۔ میں تانگے والے کے پیچھے پڑا رہا کہ وہ تیز دوڑائے۔ اس بیچارے نے گھوڑے کو چابک مارنا شروع کر دیئے۔ ہم اسٹیشن پر پہنچے تو میں تانگے میں سے اچھل کر بھاگا۔ ٹرین ابھی پلیٹ فارم پر ہی کھڑی تھی مگر بس چلنے ہی والی تھی کیونکہ گارڈ ہری جھنڈی ہلا رہا تھا۔ مجھے شالی بابا کا ڈبا دور ہی سے نظر آیا محض اس وجہ سے کہ اس ڈبے کے باہر بے پناہ رش تھا۔ میں بھاگتا چلا گیا۔ ہجوم کو چیرتا ہوا جب میں قریب پہنچا تو ٹرین وسل دے رہی تھی۔ ابھی میرے سامنے دو چار آدمی تھے کہ شالی بابا کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ میں نے چیخ کر ہاتھ ہلایا اور کہا۔

"شالی بابا...... میں عطا الرب رضوی کا بیٹا ہوں ضیاء...... دادا نے مجھے آپ کے......"

اب ٹرین رینگنے کی تیاری کر رہی تھی۔ ہلکے ہلکے جھٹکے لگ رہے تھے۔ میری آواز ان تک پہنچ گئی تھی۔ انہوں نے لوگوں سے راستہ بنانے کو کہا۔ میں تیر کی طرح ان کی کھڑکی کے قریب پہنچ گیا۔ "بابا........ میرا ملنا بہت ضروری تھا۔ میں آج ہی پہنچا ہوں۔"

"تمہیں پہنچتے ہوئے تو دیر ہو گئی لڑکے! تم نے تاخیر کیوں کی۔" اتنا کہہ کر انہوں نے ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ میں نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ ان کی مٹھی سے کوئی چیز میری مٹھی میں منتقل ہو گئی ہے۔ ٹرین نے رینگنا شروع کر دیا۔ اب میں ان کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ وہ میرا ہاتھ ویسے ہی تھامے ہوئے تھے اس لئے میں نہیں جان سکا کہ میرے ہاتھ میں کیا ہے۔

"عطا آیا تھا میرے پاس۔"

"جی!" میں نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ "لیکن وہ تو......" میں سمجھا کہ شاید وہ

ان کی موت سے ناواقف ہیں' یہ کہہ کر مجھے بے وقوف بنا رہے ہیں یا بے وقوف بن
رہے ہیں۔ اچانک ان کی آنکھوں میں غصہ بھر گیا۔
"آیا تھا وہ میرے پاس۔ سنا تم نے؟" ان کا لہجہ بھی تلخ تھا۔
"جی....... جی بابا۔" میں بوکھلا گیا۔
"تم نے دیر کر دی۔ بہت دیر....... مگر دیکھو....... میں ملوں گا تم سے۔" ان کی
آواز اور میرے قدم تیز ہوتے جا رہے تھے۔ ٹرین رفتار پکڑ رہی تھی۔
"بابا......" میری آواز میں بے بسی تھی۔
"اسے سنبھال کر رکھنا۔" انہوں نے اب ہاتھ کھینچ لیا۔ ٹرین کی رفتار تیز ہو گئی۔
میں پھر بھی بھاگ رہا تھا۔
"اسے تین دن سورج دکھانا۔ نصف النہار کا سورج۔ پھر موم جامہ کر کے
کپڑے میں سی لینا۔ ہر وقت اپنے پاس رکھنا۔ ورنہ مشکل میں پڑ سکتے ہو۔"
آخری جملہ انہوں نے چیخ کر کہا اور پھر میرے قدم ٹرین کی رفتار کا ساتھ نہ دے
سکے۔ میری پنڈلیوں کی اینٹھن بڑھ گئی۔ میں رک گیا۔ جو چیز شالی بابا نے مجھے دی تھی
میری مٹھی میں تھی۔ میں نے مٹھی کھولی تو حیران رہ گیا۔ وہ سیاہ رنگ کا ایک چپٹا سا
تھا۔ اوجھے جتنا پتھر۔ چمکدار سا۔ میں چند منٹ تک اسے دیکھتا رہا اور پھر میرا دل اچھل
حلق میں آ گیا۔ سیما! میں تمہیں بتا چکا ہوں نا کہ میں اگر کسی چیز کو غور سے دیکھنا چاہوں
میری بصارت حیرت انگیز حد تک تیز ہو جاتی ہے۔ اس وقت بھی میں نے محسوس کیا
دیکھا کہ اس سیاہ پتھر میں باریک باریک سی گلابی رنگ کی رگیں ابھری ہوئی تھیں پھر
ہی میں نے محسوس کیا کہ میری ہتھیلی پر کوئی زندہ چیز رکھی ہے۔ جو سانس لے رہی
دل کی طرح دھڑک رہی ہے۔
میں نے سر کو جھٹکا۔ مٹھی کو بھینچ کر دوبارہ کھولا پھر غور سے دیکھا۔ وہ چمک دار
پتھر واقعی سانس لے رہا تھا۔ اس کی ایک ایک نس دھڑک رہی تھی۔ میرے بدن
چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ میں ابھی تک وہیں کھڑا تھا اور ریل کی خالی پڑی اسٹیشن
بلب کی روشنی میں چمک رہی تھی۔ اسٹیشن کی گہما گہمی پیچھے کہیں رہ گئی تھی۔ میں
پلٹ کر دیکھا۔ وہاں مبشر مجھے تلاش کر رہا تھا۔ میں نے پھر مٹھی کھول کر اسے
دیکھا۔ اب مجھے لگا جیسے وہ قطعی بے جان پتھر ہے۔ میں نے اسے دبا کر دیکھا۔ وہ

بالکل کسی پتھر ہی کی طرح جبکہ چند ثانئے پہلے میں نے اس میں بالکل وہی نرمی محسوس کی
تھی جو کسی جاندار کیڑے یا گوشت کے کسی زندہ لوتھڑے میں ہو سکتی ہے۔ میں نے گہرا
سانس لیا۔ خیال ہوا کہ شاید یہ میرا وہم تھا۔ یہ سوچ کر میں نے پتھر کو احتیاط سے اپنے
ویسٹ کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھا اور پلٹ پڑا۔
مبشر مجھے دیکھتے ہی پلٹ پڑا۔ "تم کیا ٹرین کے ساتھ ہی چلے گئے تھے۔"
میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا بلکہ اس کا ہاتھ پکڑ کر پلیٹ فارم سے باہر
آ گیا۔ وہ الجھن میں تھا۔ بار بار مجھے دیکھ رہا تھا۔
"مسئلہ کیا ہے ضیاء۔ تم کچھ پریشان لگ رہے ہو۔"
"بس میں شالی بابا سے ملنا چاہتا تھا۔ میں زیادہ عرصے تک یہاں نہیں رک سکتا پھر
وہ جانے کب لوٹیں گے اور میں دوبارہ آ بھی پاؤں گا کہ نہیں۔"
"تو پاگل' تم دن میں مل لیتے۔"
"یہ تو گمان بھی نہیں تھا کہ بابا کہیں جا رہے ہیں۔"
ہم دونوں تانگے کی طرف بڑھ گئے۔ مبشر جانتا تھا کہ ٹرین چلنے والی ہے اس لئے
اس نے تانگے کو رخصت نہیں کیا تھا۔ تانگے والا آرام سے ٹانگیں پھیلائے بیٹھا تھا' ہمیں
دیکھتے ہی وہ سیدھا ہو گیا۔ میں بہت الجھ چکا تھا۔ بابا نے وہ پتھر جو دیا تھا میں اس کی طرف
سے بھی ششدر تھا۔ انہوں نے یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ وہ ہے کیا؟ اس کو میں اپنے پاس
کیوں رکھوں۔ میں بھی یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ اس مکڑیوں والے چکر سے واقف بھی ہیں یا
نہیں۔ میں جوں جوں سوچ رہا تھا' میری پریشانی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ مبشر میری پریشانی کو
محسوس کر رہا تھا۔ اس نے تانگا اسی ریستوران کے سامنے رکوایا مگر میں نے معذرت
کر لی۔ میں بہت دیر سے باہر تھا جبکہ بی جان جانتی تھیں کہ میں صرف نماز پڑھنے آیا ہوں۔
اب تک وہ پریشان ہو چکی ہوں گی۔ اسی بناء پر میں مبشر سے دوسرے روز ملنے کا وعدہ
کر کے گھر آ گیا۔

☆==========☆==========☆

بی جان واقعی بے حد ہراساں تھیں۔ فرحت اور کاکا جان بھی پریشان بیٹھی تھیں۔
وہ شاید دروازے کے قریب ہی تھیں کہ میرے کھٹکھٹاتے ہی دروازے پر آ گئیں۔
"اے میاں! کہاں رہ گئے تھے؟ تمہیں پتا ہے۔ کتنا ہول رہی تھی میں!" بی جان کا

رنگ فق ہو رہا تھا۔

کاکا جان! ابھی غالباً کچھ پڑھ رہی تھیں جسے وہ پورا کرنے میں مصروف تھیں۔ اس دوران میں غالباً وہ فارغ ہو گئیں اور بول اٹھیں۔ "یہ ہے عطا والی عادت۔ اب جماز تو سہی' نماز کو نکلے اور اتنی دیر کر دی۔ آدمی ہولائے گا نہیں کیا!"

"سوری......! میں واقعی شرمندہ ہوں بی جان! میں شام کو بتاؤں گا آپ کو۔" میں بے خیالی میں شالی بابا کا نام لینے والا تھا مگر فرحت اور کاکا جان کی موجودگی کی وجہ سے میں گڑبڑا گیا۔ "دراصل مبشر بھی مل گیا تھا ناں وہاں۔" میں نے بات بنائی۔

"اے! یہ موا' انگریز حرام خور اچھے الفاظ لے کر آیا ہے۔ سب کچھ کیا کرایا اور منہ ٹیڑھا کر کے "سوری!" کہہ دیا۔ کاکا جان نے ایسے انداز میں کہا کہ میرے علاوہ فرحت کی بھی ہنسی چھوٹ گئی۔

"بتائے دے رہی ہوں۔ اب اگر تم بتائے بنا کہیں غائب ہوئے تو...... تو......"

"تو کیا ہو گا کاکا جان......! بتائیے ناں!" مجھے یاد آ گیا تھا کہ وہ ہمیشہ ابا سے شکایت کرنے کی دھمکی دیا کرتی تھیں۔

"چل یہاں سے!" وہ بھی جھینپ گئیں۔

بی جان بڑی محبت سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ "اچھا چلو!" وہ مجھے لئے ہوئے صحن میں بچھے پلنگوں تک چلی آئیں۔ "آج میں نے ہرے مونگ اور گوشت پکایا ہے۔ یاد ہے تمہیں کتنے شوق سے کھاتے تھے تم!!"

"میں کپڑے بدل کر آتا ہوں۔" میں اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا میرے لئے بی جان نے وہ کمرہ خالی کرا دیا تھا جسے کبھی نانا بیٹھک یا دیوان خانے کے طور پر استعمال کرتے ہوں گے۔ اب تو اس میں زیادہ تر تالا ہی پڑا رہتا تھا۔ اس کمرے کی صفائی کا ذکر وہ میرے مسجد جانے سے پہلے ہی فرحت سے کر چکی تھیں۔ اس وقت کپڑے بدلنے کا سن کر فرحت نے میری رہنمائی کرتے ہوئے بتایا کہ اس نے میرا اٹیچی کیس میرے کمرے میں ہی رکھ دیا ہے۔

کپڑے بدلتے ہوئے میں نے جیب سے وہ پتھر نکال کر اسے غور سے دیکھا۔ سو فیصد پتھر تھا۔ میں نے اسے اپنے تکیے کے نیچے رکھ دیا اور خود کپڑے تبدیل کر کے آ گیا۔ فرحت چائے بنا لائی تھی۔ وہ تینوں میرے آنے سے بہت خوش دکھائی دے

تھیں اور میں سوچ رہا تھا کہ اس گھر میں کوئی بھی مرد نہیں کیا ان تینوں کو کبھی کسی قسم کا خوف محسوس نہیں ہوتا ہو گا مگر میں نے یہ بات پوچھ کر ان میں کوئی احساس جگانے کی کوشش نہیں کی۔

فرحت مجھے ان شریر بندروں کے قصے سنانے لگی جو اکثر الگنی پر ٹنگے ہوئے اس کے کپڑے درخت کے اوپر لے جا کر ٹانگ دیا کرتے اور جن کو اتارنے کے لئے اسے محلے کے بچوں کو بلانا پڑتا تھا۔ بی جان نے بتایا کہ فرحت اب بھی چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ ہنڈکلپ کھیلتی ہے۔ گڑیوں کا بیاہ رچاتی ہے۔ میں نے اس لمحے اس کی آنکھوں میں اٹھنے اور پھر لو دینے والے چراغوں کی سی روشنی محسوس کی۔ ہم سب بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ میں بی جان سے اکیلے میں بات کرنے کا متمنی تھا۔ فرحت اور کاکا جان کو اٹھا دینا غیر اخلاقی حرکت تھی۔ اسی وجہ سے کچھ نہیں بولا مگر اب میں سبے حد بے چین ہو چکا تھا۔ میرے پہلو بدلنے اور ذہنی طور پر غیر حاضر ہونے کو بی جان نے محسوس کیا۔

"تمہیں نیند تو نہیں آ رہی؟" انہوں نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"نیند تو نہیں ہے بی جان! بس تھکن ہے۔ کچھ لیٹنا چاہتا ہوں۔" مجھے موقع مل گیا۔

"ٹھیک ہے۔ تم آرام کرو۔" وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔ فرحت اور کاکا جان بھی اٹھ گئیں۔

میں اپنے کمرے میں جاتے جاتے رکا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں بی جان سے کیسے کہوں کہ مجھے ان سے بات کرنا ہے لیکن خدا نے یہ موقع بھی دے دیا۔ بی جان نے فرحت سے کہا کہ وہ میرے کمرے میں ضرورت کی چیزوں کو دیکھ کر آتی ہیں۔ مجھے بھی یاد آ گیا کہ اماں نے ان لوگوں کے لئے چیزیں دی تھیں جو میں دینا بھول گیا تھا۔

"ارے ہاں بی جان! میں تو بھول گیا۔ اماں نے آپ لوگوں کے لئے کچھ چیزیں بھیجی تھیں۔ آیئے! میں آپ کو دے دیتا ہوں۔" میں نے جان بوجھ کر فرحت یا کاکا جان کو دعوت نہیں دی۔ کاکا جان اور فرحت اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ تینوں ایک ہی کمرے میں سوتی تھیں۔ بالکل پہلے کی طرح۔ میں اور بی جان کمرے میں پہنچے۔ اندر پہنچتے ہی میں نے دروازے کی چٹخنی چڑھا دی۔ بی جان کی آنکھوں میں حیرت در آئی۔

"مجھے آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں بی جان! میں پریشان تھا کہ آپ کب

اکیلی ہوں گی۔"

"ضیاء!...... خیریت تو ہے ناں بیٹا! میں...... میرے اعصاب اس قابل نہیں کہ......" ان کی آواز رندھ گئی اور وہ لڑکھڑا سی گئیں۔ نہ معلوم وہ کیا سمجھی تھیں۔

"بی جان! اگر آپ یوں پریشان ہوتی رہیں تو کیسے سمجھ پائیں گی کہ بات کیا ہے۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ کوئی بھی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ ہم احتیاطاً شالی بابا سے ملنے پہنچے تھے۔ بھئی! پہلے تو آپ ٹھیک ہو جائیں پھر میں آپ کو کچھ بتاؤں گا۔" میں نے انہیں مسہری پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ میرے قسم کھانے کی بات سن کر شاید انہیں قرار آگیا تھا۔

"بی جان! دیکھئے! مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ جو کچھ ہمارے خاندان کے ساتھ ہوا ہے' وہ آپ کے علم میں ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہم اس پُراسراریت سے ہمیشہ کے لئے نجات پالیں۔"

بی جان میرا منہ تک رہی تھیں پھر میں نے سب کچھ انہیں بتا دیا۔ یہ بھی کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں اور یہ بھی کہ دادا اس بارے میں بہت پریشان ہیں۔ میں نے انہیں یہ بھی بتا دیا کہ وہ زنجیر میں نے اپنی گڑیا کے جہیز میں دینے کو کس طرح چرائی تھی۔ کس طرح میں اسے یہاں چھپا گیا تھا۔ میں اس میں مکڑی کی موجودگی کو ضرور چھپا گیا تھا کہ وہ ستارہ اور شبانہ کی موت سے واقف تھیں۔ اگر میں انہیں یہ بھی بتا دیتا کہ اس میں مکڑی کی موجودگی بھی میرے علم میں تھی' تب شاید وہ بھی فرحت کی طرح مجھے ان تمام اموات کا ذمے دار ٹھہراتیں۔ وہ حیران' پریشان میری باتیں سن رہی تھیں۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ فرحت کا کہنا ہے کہ وہ صندوقچی ستارہ شبانہ لے گئیں تھیں شاید اسی لئے ماری گئیں تو ان کا رنگ بالکل زرد ہو گیا۔

"وہ...... وہ صندوقچی تو......"

وہ تھوک نگلنے لگیں پھر ان سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ وہ تیزی سے اٹھ کر چپل پہن کر کمرے سے باہر نکل گئیں۔ میں حیران بیٹھا انہیں دیکھتا رہ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیوں چلی گئیں؟ وہ صندوقچی کہاں ہے؟ انہوں نے پوری بات کیوں نہ سنی؟ میں سوچ ہی رہا تھا کہ انہیں پھر لے آؤں۔ ان کے اعصاب واقعی اس قابل نہ تھے کہ تنہا یا کسی پریشانی کو برداشت کر پاتے۔ عمر بھی ایسی تھی جب ہمتیں ٹوٹ چکی ہوتی ہیں اور پھر انہوں نے تو اتنی اموات دیکھی تھیں' اتنے دکھ اٹھائے تھے کہ وہ کسی بھی لمحے ڈھے سکتی

تھیں۔ میں اٹھنے ہی والا تھا کہ اچانک دروازہ کھلا۔ وہ سامنے کھڑی تھیں۔ میں اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ میرا دل حلق میں دھڑک اٹھا اور میرے جسم کو یوں جھٹکا لگا جیسے بجلی کا ننگا تار مجھے چھو گیا ہو۔ ان کے ہاتھ میں وہی صندوقچی تھی۔

"بی جان!" میں چیخ اٹھا۔ لپک کر ان کے ہاتھ سے صندوقچی چھین لی۔

"یہ...... یہ تو کوٹھری میں پڑی تھی۔ پرسوں ہی میں نے ٹوٹی ہوئی کرسیاں نکلوانے کے لئے کوٹھری کھولی تھی تب دیکھا۔"

میں حیران' پریشان اس صندوقچی کو دیکھ رہا تھا جس پہ دھول اٹی ہوئی تھی۔ اس میں چھوٹا سا تالا بھی پڑا تھا جبکہ مجھے خوب یاد تھا کہ میں نے آخری بار اس کا تالا کھولا تھا تو اسے بند کرنا بھول گیا تھا۔

"چین اسی میں ہو گی ناں!" بی جان کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"جی......! جی ہاں بی جان!...... ہونی تو چاہیے مگر...... تالا میں نہیں ڈالا تھا۔ خیر......! میں دیکھتا ہوں۔ اچانک میری خواہش ہوئی کہ بی جان چلی جائیں جبکہ بی جان وہیں کھڑی میرے ہاتھ میں تھامی اس صندوقچی کو دیکھ رہی تھیں۔ جب میں نے محسوس کیا کہ وہ صندوقچی کے کھولے جانے کی منتظر ہیں تو میں نے اسے لا کر اپنی مسہری کے دائیں طرف رکھی تپائی پر رکھ دیا۔

"آپ یہ بتائیے کہ شیوا جی سے ملاقات ہو سکتی ہے؟" میں نے کہنے کو تو کہہ دیا مگر مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اب مجھے اس کی ضرورت نہیں رہی۔ زنجیر اسی صندوقچی میں ہو گی اور میں صبح ہی اسے دادا کے پاس لے جانے کی پوزیشن میں تھا۔ انہوں نے تو مجھ سے صرف اتنا کہا تھا کہ وہ زنجیر ڈھونڈ کر لے آؤ۔

"شیوا جی سے تو اب کل شام ہی کو ملاقات ہو سکے گی۔ کل نوچندی کا میلہ لگتا ہے۔ وہاں نوچندی مائی کے مندر میں وہ ضرور پہنچیں گے۔ وہ پورا مہینہ وہیں رہتے ہیں پھر کہیں اور نکل جاتے ہیں اور شالی بابا تو......؟"

"وہ عمرے پر جا چکے ہیں۔ میری ان سے ملاقات ہو چکی ہے۔" میں نے ان کی بات کاٹ دی پھر انہیں بتایا کہ کل مسجد سے واپسی پر مجھے کس طرح دیر ہوئی تھی۔ میں نے انہیں یہ نہیں بتایا کہ انہوں نے مجھے کچھ دیا ہے۔ بس اتنا کہا وہ دہلی میں دادا سے خود ملاقات کر لیں گے۔

"ویسے بوا! مجھے یقین نہیں آتا کہ سب کچھ ٹھیک ہے۔" اچانک وہ پھر خوف زدہ ہو کر بولیں۔

"اب میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں۔ میں اپنے سر کی قسم کھاتا ہوں کہ اب تک سب خیریت ہے۔"

اس قسم پر وہ ہول اٹھیں۔ انہوں نے اٹھ کر میرا سر اپنے سینے سے لگا لیا اور بولیں۔ "بوا.........! ایسی بڑی قسم نہیں کھاتے۔ میں تجھ پر واری جاؤں۔ میری عمر بھی تجھے لگ جائے۔ آئندہ ایسا کبھی نہ کرنا۔"

پھر آپ مانتی کیوں نہیں بی جان!" مجھے ان پر ترس آگیا۔ میں نے ان کے ٹھنڈے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ "جائیے! اب آرام کیجئے۔ میں کل شام نوچندی کے میلے میں جاؤں گا۔ میں نہیں جانتا کہ دادا نے مجھے ان سے ملنے کی ہدایت کیوں کی ہے؟ شاید دادا انہیں کچھ بتا چکے ہیں یا شاید مجھے ہی سب کچھ بتانا پڑے لیکن بی جان! آپ سے ایک درخواست ہے۔ میں کیوں آیا ہوں اور کیا کر رہا ہوں' اس کی خبر فرحت اور کاکا جان کو نہیں ہونا چاہئے' دوسری درخواست یہ ہے کہ آپ ہمت کریں گی تو میرا ساتھ دیں گی ناں! اس لئے آپ اپنے آپ کو مضبوط کر لیجئے۔"

وہ غور سے میری بات سن کر سر ہلا رہی تھیں۔ میرا آخری جملہ سن کر انہوں نے کسی فرمانبردار بچے کی طرح اپنے آنسو پونچھ لئے۔

"کل اگر مجھے آنے میں دیر ہو جائے تو پریشان نہ ہوئیے گا ورنہ وہ دونوں بھی آج کی طرح پریشان ہوتی رہیں گی۔ بس آپ میرے لئے دعا کیجئے گا۔ ٹھیک ہے ناں! آج سے میری آپ کی دوستی......... وہی رازدار والی......... ٹھیک ہے ناں!"

انہوں نے پھر سر ہلایا۔

"اگر آپ ہمت سے میری مدد نہیں کریں گی بی جان تو میں خود کسی خوف کا شکار ہو کر کمزور ہو جاؤں گا۔"

"نہیں بیٹا.........! اب میں سمجھ گئی ہوں۔ مجھ میں حوصلے تو بہت تھے مگر تمہیں کی جوانی میں بیوگی اور پھر اس کی موت نے مجھے توڑ کر رکھ دیا۔ تمہیں کیا پتا کہ اب غم فرحت میرے سینے پر دھری برف کی ایسی سل میں تبدیل ہو گئی ہے جو آہستہ آہستہ زندگی کی حرارت کھینچے چلے جاتی ہے مگر کتنا اذیت ناک ہے یہ وقت کہ میں یوں مر بھی نہیں

سکتی۔ وہ ایک ایسا کھونٹا ہے بیٹا! جس میں میری زندگی اٹک کر رہ گئی ہے۔ موت کھینچے جاتی ہے۔ جانتی ہوں کہ اس کا کوئی بھی جھٹکا مجھے اس کھونٹے سے علیحدہ کر دے گا مگر یہ جاننے میں بھی کتنی اذیت ہے۔ تم سب سے ایک شکایت بھی ہے کہ تم لوگوں نے میری فرحت کو بالکل بھلا دیا ہے۔ اسے ایک ایسے چھپر میں چھوڑ دیا ہے جو بہت تیز ہواؤں کی زد میں ہے۔"

وہ پھر رونے لگیں۔ میرا دل موم ہو گیا۔ مجھے اپنے گھر والوں کی ہی نہیں' اپنی بے حسی پر بھی شرمندگی ہوئی۔ میں نے انہیں پاس بٹھا لیا۔ "بی جان! آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ ہم فرحت کو بھول گئے ہیں۔ ہم بھلا آپ لوگوں کو کیسے بھول سکتے ہیں؟ آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ میں ہوں ناں.........! آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ سب.........اور فرحت بھی' میری ذمے داری ہے۔ سمجھ رہی ہیں آپ؟" میں نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وہ بھی بڑی گہرائی سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ یقیناً کچھ کھوج رہی تھیں اور شاید انہوں نے وہ چیز بھی پا لی تھی جس کی انہیں کھوج تھی۔ اچانک ان کے افسردہ چہرے پر خوشی پھیل گئی۔ آنکھیں چھلکیں پھر انہوں نے ساری کے پلو سے رگڑ کر صاف کر لیں۔ طمانیت سی پھیل گئی تھی ان کے چہرے پر۔ میں اچانک اپنے اندر اتر گیا میں جاننا چاہتا تھا کہ جو کچھ میں نے ان سے کہا ہے' وہ سطحی یا وقتی جذبے کا حامل تو نہیں.........! مگر میرے اندر اس لمحے سناٹا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ اور کہتا' وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"اب تم آرام کرو۔ بس کہیں جاؤ تو مجھے ضرور بتا دیا کرو۔ آدمی بوڑھا ہو جائے تو خوف یوں بھی شکلیں بدل بدل کر اسے ڈراتا ہی رہتا ہے اور تم جانو' بڑھاپے میں جب کرنے کو اور کچھ نہ ہو تو آدمی اپنے اندر کے جذبوں اور سوچوں کے سمندر میں تنکا بن کر ہی ڈولتا رہتا ہے۔"

میں ان کی منطق سن کر مسکرایا۔ میں نے یہ بھی سوچا اور یقین کر لیا کہ صرف تعلیم ہی علم نہیں دیتی' تجربہ واقعی بڑا استاد ہوتا ہے۔ میں نے خدا حافظ کہا۔ وہ دعائیں دیتی چلی گئیں۔ یوں تو ان کے جانے کے بعد سوچنے کو میرے پاس بہت سی باتیں تھیں مگر ان کے جاتے ہی جب میں مسہری کی جانب پلٹا تو اس کے برابر رکھی تپائی پر نگاہ پڑی۔ وجود میں ایک ابال سا اٹھتا محسوس ہوا۔ دماغ بھک سے اڑ گیا ہو جیسے۔ میں نے پلٹ کر دروازے کی چٹخنی لگائی اور تیزی سے تپائی کی طرف لپکا۔ اب مسئلہ اسے کھولنے کا تھا۔ وہ

تالا وہ نہیں تھا جو کبھی میں نے اس میں ڈالا تھا مگر تھا تقریباً ویسا ہی چھوٹا سا۔ میرے پاس ایسی کوئی چابی نہ تھی کہ میں اسے کھول لیتا۔ میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ میں اسکرو ڈرائیور (Screw Driver) یا ایسی کوئی سلاخ ڈھونڈنا چاہتا تھا جس کو تالے یا کنڈی میں پھنسا کر اسے توڑ سکوں۔

جلد ہی میں اپنی اس تلاش میں کامیاب ہو گیا۔ اسی کمرے کے ایک کونے میں چوکور میز رکھی تھی جس پر سفید میز پوش بچھا ہوا تھا۔ اس پر سلائی مشین رکھی تھی جو ایک نگاہ میں مجھے نظر نہیں آئی تھی کیونکہ اس پر بھی ایک سفید کڑھا ہوا میز پوش ڈالا گیا تھا۔ جب میرا ہاتھ لگا تو میں نے جھانک کر دیکھا۔ مجھے ایک مشین کی دراز سے پیچ کس مل گیا۔ میں نے بڑی آسانی سے اس تالے کو توڑ دیا۔ کنڈی کھولنے سے پہلے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری گدی پر کچھ رینگ رہا ہو۔ میں کسمسا کر رہ گیا۔ حلق خشک ہو گیا تھا۔ مجھے اپنی اس کیفیت سے الجھن سی ہو رہی تھی۔ میں اصل میں اپنی اس کیفیت کو خوف کا نام دینے سے جھجک رہا تھا حالانکہ میرے خوفزدہ ہونے کی بات نہیں تھی۔ اگر اس میں مکڑی تھی بھی تو مجھے اس سے ڈر نہیں تھا اس لئے کہ جب وہ مجھے نقصان پہنچا سکتی تھی' تب بھی اس کا رویہ دوستانہ تھا اور آج تو میں صحیح طور پر محسوس کر سکتا تھا کہ وہ رویہ واقعی دوستانہ تھا یا ایسا سمجھنا صرف میرا بچپن تھا۔

فرحت نے مجھے بتایا تھا کہ ستارہ اور شاہانہ والے واقعے کے بعد مکڑی اس میں نہیں تھی بلکہ وہ صندوقچی ہی نہیں تھی۔ وہ کہاں سے ملی' یہ بی جان جانتی تھیں مگر وہ وہاں کیسے پہنچی' یہ وہ نہیں جانتی تھیں۔ اگر فرحت نے اسے وہاں رکھا ہوتا تو وہ یقیناً مجھے بتا دیتی۔ میں کچھ عجیب سی کیفیت کا شکار تھا۔ شاید اس لئے کہ وہ بچپن تھا اور آج میں برسوں کے بعد اسے دیکھ رہا تھا۔ میں نے دھیرے سے اس کی کنڈی اٹھائی پھر بے اختیار آیۃ الکرسی پڑھی۔ عین اس لمحے مجھے شمالی بابا کا جملہ یاد آ گیا اور وہ عجیب و غریب پتھر بھی جو انہوں نے یہ کہہ کر مجھے دیا تھا کہ اسے اپنے پاس رکھنا ورنہ مشکل میں پڑ سکتے ہو۔ میں نے جھپٹ کر اپنے تکیے کے نیچے سے اس پتھر کو نکال لیا۔ اسے دبا کر دیکھا۔ وہ پتھر تھا۔ سخت اور ٹھنڈا۔ میں نے اسے اپنے ہاتھ میں بھینچ لیا اور دوسرے ہاتھ سے صندوقچی کا ڈھکنا اٹھا دیا۔

وہ سونے کی زنجیر اس میں موجود تھی........ اور بس........ مکڑی نہیں تھی۔ میں نے

وہ چین اٹھائی۔ اسے غور سے دیکھتا رہا پھر اسے اپنے کرتے کی جیب میں رکھ لیا۔ ساتھ ہی وہ پتھر بھی جیب میں ڈال لیا۔ صندوقچی کو واپس تپائی پر رکھ دیا۔ اب میرے اندر سکون تھا۔ بانا خر گونج اٹھنے والا سناٹا جس کی ہیبت ناک آواز آدمی کو بے چین کر دیتی ہے۔ میں بے چین ہوا بھی مگر پھر بھی جو کیفیت اب سے پہلے تھے' اس سے نجات کی کیفیت بہت آرام دہ تھی۔ میں بستر پر لیٹ گیا۔ سب سے زیادہ پریشانی مجھے اس زنجیر کی تھی جبکہ مکڑی کے بارے میں مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اس کا تعلق یقیناً ان حادثات سے تھا۔ فرحت اور دادا کے بقول ستارہ اور شاہانہ کی موت کے بعد کوئی ایسا حادثہ نہیں آیا تھا۔

دادا نے التجا کے انداز میں کہا تھا کہ میں زنجیر ڈھونڈ لاؤں۔ سو وہ مجھے مل گئی تھی۔ اب مجھے صرف شیوا جی سے ملنا تھا۔ میں کل کا پروگرام ترتیب دینے لگا۔ یہ بھی سوچ لیا کہ میں اکیلا جانے کی بجائے مبشر کو لے جاؤں گا۔ یوں تو میرٹھ میرے لئے نیا نہیں تھا مگر برسوں میں یہاں کچھ تبدیلی ضرور آئی تھی پھر وہ سراہٹ مجھے حوصلہ مند بنائے رکھتی تھی۔

"حوصلے سے میری مراد تم سمجھ رہی ہو ناں!" انہوں نے بات کرتے کرتے میری طرف دیکھا۔

میں طلسم میں جکڑی ہوئی تھی۔ قارئین! مجھے پانچواں دن تھا۔ میں مسلسل پانچ روز سے یہاں آ رہی تھی۔ شاہ بابا ہمیشہ مجھے منتظر ملے تھے۔ شروع میں تو انہوں نے مجھے پیار سے' خوفزدہ کر کے' مذاق اڑا کے' ہر طرح اپنے ارادوں میں ناکام بنانے کی کوشش کی تھی مگر جب دیکھا کہ میں ان کی کسی بات میں نہیں آ رہی تو وہ پوری توجہ سے میری خواہش پوری کر رہے تھے۔ ان کا سحرزدہ سراپا دھیرے دھیرے میرے اندر اتر رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں نڈر ہوتی جا رہی ہوں۔ جو باتیں عموماً مجھے خوفزدہ کئے دیتی تھیں' اب ان باتوں پر مجھے ہنسی آنے لگی تھی اور مجھ میں کیا تبدیلی آئی' اسے تو میں نہیں جان سکی مگر جب کل میری بھتیجی جویریہ گھر آئی تو پہلے سرسری انداز میں مجھے دیکھ کر سلام کرتی ہوئی وہ میرے بیٹے کی جانب بڑھی تھی اور پھر چونک کر اس نے مجھے دیکھا تھا۔

پتا نہیں اس کے انداز میں کیا تھا۔ میں اس سے پوچھ نہیں سکی تھی مگر میں نے اتنا ضرور محسوس کیا کہ وہ بات کرتے ہوئے مجھے بار بار غور سے دیکھ رہی تھی اور جب میں آفس کے لئے گھر سے نکلی تھی تو اوپر فلیٹ میں رہنے والی خاتون' جن کا مجھے نام تو یاد نہیں مگر میں انہیں باجی کہتی ہوں' میرے سلام کا جواب دینے کے بعد سیڑھیوں کی طرف

بڑھتے بڑھتے ٹھٹک کر رک گئی تھیں۔ میں نے ان کی نگاہوں میں بھی وہی بات محسوس کی جو رات جویریہ کی نگاہوں میں محسوس ہوئی تھی۔ میں نے رک کر باجی کو دیکھا۔

"سیما! سب ٹھیک ہے ناں؟" انہوں نے سپاٹ سے انداز میں پوچھا تھا مگر ان کی نگاہوں میں تشویش تھی۔

"جی باجی! الحمدللہ!" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ خیال ہوا کہ شاید تھکن اور رات کو دیر تک لکھنے کی وجہ سے چہرہ پژمردہ لگا ہو گا۔

انہوں نے کچھ کہنے کو منہ کھولا تھا پھر اچانک پلٹ گئی تھیں۔ میں چلی آئی مگر آج میں سوچ چکی ہوں کہ باجی سے بھی اور جویریہ سے بھی پوچھوں گی ضرور کہ وہ کیا محسوس کر رہی ہیں۔ میں نے تو اپنے اندر صرف اور صرف حوصلہ بڑھتا ہوا محسوس کیا ہے اور ہاں' آج میں آئینہ بھی ضرور دیکھوں گی۔

"سیما! کہاں کھو گئیں؟" شاہ بابا کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"جی بابا.........! بس یونہی.........!" میں جھینپ گئی۔

"فضول باتیں سوچ کر اپنی انرجی کیوں ضائع کرتی ہو؟ تمہیں کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔ جب کچھ ہو گا تو ضرور بتاؤں گا۔" انہوں نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ مجھے لگا' وہ ہنس رہے ہیں یا شرارت کر رہے ہیں۔ وہ ابھی میری ہی طرف دیکھ رہے تھے کہ اچانک مجھے لگا جیسے میں کسی پتلے سے اندھیرے خول میں چکراتی ہوئی اترتی چلی جا رہی ہوں۔ آنتیں حلق میں آتی محسوس ہوئیں۔ لگا جیسے میں اس خول میں سر کے بل گرتی جا رہی ہوں۔ مجھے لگا جیسے میں چیخ پڑوں گی۔ میں چیخنے ہی والی تھی کہ شاہ بابا کی آواز نے جھٹکے سے مجھے جیسے تھام لیا۔

"حوصلے سے میری مراد صرف یہ تھی کہ مستقل مرعوب رہنے والا شخص میری اہم ضرورت تھا۔ یہ بری عادت تھی مگر یہ میرے لئے بہت ضروری ہو گیا تھا۔ بس میری شخصیت کی یہ خامی میرے کنٹرول میں نہیں تھی اسی لئے میں مبشر کو ساتھ لے جانے کا پروگرام بنا کر سو گیا۔" شاہ بابا نے بات وہیں سے شروع کر دی۔

"اس رات اتنے برسوں بعد میں نے ایک خوفناک خواب دیکھا۔ مجھے خواب میں بھی پوری طرح احساس تھا کہ یہ خواب ہے اور میں برسوں بعد کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ میں نے اپنے آپ کو گھنے اونچے اور بہت پرانے درختوں کے درمیان پایا۔ خوف کسی

خونخوار چیتے کی طرح مجھے دبوچے' میرے اوپر سوار تھا۔ میں سب کچھ دکھائی دینے کے باوجود بھی آنکھیں پھاڑے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے شدت سے احساس تھا کہ میں کسی بہت ہی خوفناک جگہ پر بالکل تنہا ہوں۔ اس دوران مجھے کہیں سے ریل گاڑی کے چلنے کی آواز آتی محسوس ہوئی۔ میں بے اختیار اس سمت بھاگ اٹھا جہاں سے آواز آ رہی تھی۔ دور سے مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں بہت جلد اس گھنے اور پُرہیبت جنگل سے نکل جاؤں گا مگر میں جوں جوں آگے بڑھ رہا تھا جنگل گھنا اور تاریک ہوتا جا رہا تھا۔

اب میں خوف کے مارے گھگیانے لگا تھا۔ میرے حلق سے عجیب و غریب قسم کی خوف زدہ آوازیں نکل رہی تھیں جو خود مجھے ہی ڈرا رہی تھیں۔ میں اپنی ہی آواز سن کر چیخ پڑا تھا۔ یوں جیسے میرے اندر کوئی اور خوفزدہ ہوا ہو۔ کوئی اور چیخ رہا ہو۔ پھر میری چیخیں مجھے سہا کر چپ کرا دیتیں مگر دوسرے ہی لمحے میں پھر گھگیانے لگتا۔ اب میری رفتار بھی خوفناک حد تک تیز ہو چکی تھی میں گرتا پڑتا بھاگ رہا تھا۔ یوں بھاگتے بھاگتے میرا حلق کانٹوں سے اٹ چکا تھا۔ پیاس نے سینے کے اندر دراڑیں سی ڈال دی تھیں۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے کسی نے میرے گلے میں پھندا ڈال دیا ہو اور مجھے پیچھے سے اوپر اپنی جانب کھینچ رہا ہو۔

اچانک میرے پیروں نے زمین چھوڑ دی۔ میں گرنے لگا۔ کہیں اندر گہری کالی سرنگ میں۔ جہاں کبھی کبھی میری آنکھوں کے آگے ستارے سے جل جل کر بجھ رہے تھے۔ اچانک مجھے جیسے کسی نے درمیان ہی میں تھام لیا۔ میرا سر کچھ دیر کو چکراتا رہا پھر کچھ حواس بحال ہوئے۔ میں نے دیکھا کہ میں اونچے سے درخت کی شاخ پر بیٹھا ہوں۔ اس وقت یہ احساس بالکل ختم ہو گیا کہ میں کیسے اوپر سے یہاں آ گرا ہوں۔ یوں لگا جیسے میں خود اوپر چڑھ کر شاخ پر جا بیٹھا ہوں۔ میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ یہاں درخت' پھل' پودے اور کنج تو تھے مگر سب کے سب انسانی ہاتھوں کے مرہونِ منت تھے۔ درمیان میں سرخ بجری کی روشیں بنی ہوئی تھیں۔ ایک بڑے سے زمین کے ٹکڑے کے چاروں طرف ڈم ڈم کی قسم کی باڑھ سی لگا کر علیحدہ کیا گیا تھا۔ جس کے دوسری طرف سڑک تھی۔ اس سڑک کے کنارے لگے ہوئے پول کی تمام روشنی باڑھ کے اندرونی حصے کو روشن کئے ہوئے تھی۔ اندر بھی کافی کافی فاصلے سے چھوٹے چھوٹے پول لگے تھے جن پر شیشے کے لیمپوں میں بلب روشن تھے ان کی روشنی دودھیا تھی مگر اکثر جگہ۔ پیڑوں کے گھنے سائے

اس روشنی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھے۔

میں دھیرے دھیرے نیچے اتر آیا۔ اب میں سڑک کی طرف جانے والے راستے پر آگے بڑھ رہا تھا۔ میرے اندر سے خوف زائل ہو چکا تھا۔ مجھے باہر نکل جانے اور یہاں سے بھاگ جانے کی جلدی تھی۔ یہ باغ سا تھا مگر یہاں کا سناٹا اور سناٹے میں بولتے جھینگر اپنی آوازوں سے سناٹے کو علیحدہ کر رہے تھے یوں جیسے سناٹے اور اپنی آوازوں کے درمیان لکیر سی کھینچ رہے ہوں۔ میرے اندر کہیں کسی کی موجودگی کا احساس ضرور ہلکورے لے رہا تھا۔ میں اس انجانے شخص کی نگاہوں سے بچنے کے لئے جتن بھی کر رہا تھا۔ درختوں کی آڑ لے کر آگے بڑھتا' رکتا' چاروں طرف دیکھ کر اطمینان کرتا کہ کسی نے مجھے دیکھ تو نہیں لیا' پھر بھاگ کر دوسرے درخت کی آڑ میں چلا جاتا۔ سرخ بجری کی روش مجھے سفید رنگ کے چمکتے ہوئے گیٹ تک جاتی نظر آ رہی تھی۔ اس گیٹ پر قریب قریب لوہے کی چمک دار سلاخیں تھیں مگر وہ اتنا اونچا نہیں تھا کہ میں اسے عبور نہیں کر پاتا۔ ابھی میں نے وہ بجری کی روش عبور بھی نہ کی تھی کہ سوکھے پتوں کے چرمرانے کی خوفناک آواز ابھری جیسے کہیں قریب ہی پوری فوج ان سوکھے پتوں پر سے گزرتی ہوئی میری طرف بڑھنے لگی ہو۔

یہ آواز سن کر میں اچھل پڑا۔ لپک کر قریب کے درخت کے پیچھے چھپ گیا۔ بھاری قدموں کی آواز دھیرے دھیرے تسلسل سے سنائی دینے لگی۔ پھر ایسی چرچراہٹ کی آواز آئی جیسے کسی نے سوکھے پتوں کو آگ لگا دی ہو۔ لکڑیاں چٹخنے لگی ہوں۔ کچھ ہی دیر بعد مجھے لگا جیسے میری سانس کے ساتھ کچھ دھواں بھی میرے سینے میں بھر گیا ہو۔ میں نے چاروں طرف غور سے دیکھا' کہیں دھوئیں کا نام و نشان تک نہ تھا۔

دفعتاً قدموں کی آوازیں ماند پڑ گئیں۔ گہرا سناٹا چھا گیا اور پھر اس سناٹے میں سسکیوں کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے اندازہ لگایا' آواز میرے بائیں جانب سے آ رہی تھی۔ میں دبے پاؤں اس طرف بڑھا۔ جونہی میں سسکیوں کی آواز کے قریب پہنچا' بھونچکا رہ گیا۔ یہ وہی قبرستان تھا۔ وہی جسے میں بچپن میں دیکھا کرتا تھا۔ پہچانتے ہی میں دیوانہ وار وہ قبر تلاش کرنے لگا جس میں' میں نے وہ لاش دیکھی تھی۔ پھر ایک اور حیرت انگیز بات ہوئی کہ مجھے لگا میں جس قبر کے قریب پہنچتا ہوں' سسکیوں کی آواز دوسری قبر میں منتقل ہو جاتی ہے۔ میں نے وہاں کی ساری قبریں دیکھ لیں۔ کوئی بھی کھلی ہوئی نہیں

تھی۔ نہ مجھے کسی قبر کے قریب ایسی کوئی چیز نظر آئی جس سے اس خاص قبر کو پہچان سکتا۔ جس آخری قبر سے مجھے سسکیوں کے اخراج کا گمان تھا' جب میں اس کے قریب پہنچا تو آواز معدوم ہو کر سناٹے میں مدغم ہو چکی تھی۔ جھینگروں کی آواز البتہ تیز ہو گئی تھی ممکن ہے جسے میں سسکیوں کی آواز سمجھتا تھا وہ اصل میں جھینگروں کی آواز ہو۔

بہرحال میں اس قبر کو نہیں پہچان سکا مگر قبرستان کو پہچان گیا تھا۔ یہ سوفیصد وہی قبرستان تھا۔ میں اپنی ہر کوشش کرنے کے بعد پھر گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ ابھی میں نے گیٹ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اسے پھلانگ جانے کے لئے اپنا بدن تولا ہی تھا کہ مجھے زبردست جھٹکا لگا۔ میری آنکھ کھل گئی۔ میرے سر میں دھماکے ہو رہے تھے۔ میں بڑی دیر تک اپنی دونوں کن پٹیوں کو دبائے بیٹھا رہا پھر میں نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ باہر صبح کا اجالا پھیلنے والا تھا۔ دور سے اذان کی آواز آ رہی تھی۔ یہ آواز سن کر میرے اندر ٹھنڈک سی اتر گئی۔ گو میرا حلق اب بھی خشک ہو رہا تھا۔ دل اب بھی حلق میں دھڑکتا محسوس ہو رہا تھا مگر میں نے خود کو ایک دم پرسکون ہوتے ہوئے بھی محسوس کیا۔ میں کلمہ پڑھتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ باہر نکلا تو بی جان' کاکا جان اور فرحت بھی جاگ اٹھی تھیں۔ فرحت پانی گرم کر رہی تھی۔ میں نے ٹھنڈے پانی سے وضو کیا اور مسجد جانے کی بجائے گھر ہی میں نماز ادا کی۔ نماز پڑھنے کے بعد میں تھوڑی سی چہل قدمی کے لئے گھر سے نکل آیا۔ میں نے بی جان سے کہہ دیا کہ وہ ناشتا تیار کریں گی ہی کہ میں لوٹ آؤں گا۔

چہل قدمی کرنا میں نے گزشتہ چار برس پہلے اپنا معمول بنا لیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ سویرے سویرے تازہ ہوا میں چہل قدمی آدمی کی صحت کے لئے بہت ضروری ہے۔ میں نے باہر نکل کر ہوا کی ٹھنڈک کو گہری سانسوں کے ساتھ اپنے اندر اتار لیا۔ تقریباً بیس منٹ بعد میں گھر لوٹ آیا۔ اس دوران میں' میں اپنا آئندہ پروگرام ترتیب دیتا رہا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ شیوا جی سے ملاقات کے بعد ہی میں رات کو یا علی الصبح دہلی روانہ ہو جاؤں گا۔ خط لکھنے کا فائدہ نہیں۔ اس زمانے میں ٹی سی ایس یا کوئی ایئر میل وغیرہ کا تو چکر تھا نہیں' خط سے پہلے ہی میں پہنچ جاتا۔ اس لئے خط لکھنے کا ارادہ ملتوی کر چکا تھا۔ ناشتے کے بعد مبشر کو لینا تھا تا کہ اسے پہلے بتا سکوں کہ اسے رات کو میرے ساتھ چلنا ہے۔ میں واپس لوٹا تو سب ہی انتظار کر رہے تھے۔ ہم نے ناشتا کیا۔ ناشتے کے دوران میں' میں نے بی جان کو بہت خوش پایا۔ انہیں خوش دیکھ کر مجھے یاد آ گیا کہ میں نے رات ان کے سینے پر

دھری گویا برف کی سل پگھلادی تھی۔ کم از کم الفاظ میں اتنی گرمی تھی کہ وہ اس بوجھ سے آزاد ہوگئی تھیں۔ اس خیال سے میں نے فرحت کو دیکھا۔

اس کے چہرے پر بکھرے دھنک کے رنگ، آنکھوں میں جل اٹھنے، ستارے اور حیا کے بوجھ سے جھک جھک جانے والی پلکیں، مجھے اپنا رات کا وعدہ نہ صرف یاد دلا گئیں بلکہ اس کی تجدید کو بھی دل چاہا۔ میں فیصلہ کرتا ہوں تو تمام عمر اس پر قائم رہتا ہوں۔ میں نے اپنے عہد کی دل ہی دل میں تجدید کی اور سوچ لیا کہ جاتے ہی اماں اور عصمت آپا سے عندیہ بیان کروں گا۔

ابھی سورج نہیں نکلا تھا بس نکلنے ہی والا تھا۔ اچانک دروازے پر کھٹکا ہوا۔ یہ دستک اتنی وحشیانہ تھی کہ میرے ہاتھ میں چائے کا کپ چھلک گیا۔ فرحت تو اچھل ہی پڑی۔ بی جان اور کاکا جان بیک وقت بول اٹھیں۔

"الٰہی خیر۔"

میں جلدی سے چائے کا کپ رکھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ میں نے جونہی دروازہ کھولا میری ریڑھ کی ہڈی میں جیسے ہزاروں مکڑیاں رینگ گئیں۔

دروازے پر مبشر تھا مگر ایسی حالت میں کہ میں حواس باختہ ہو کر چیخ اٹھا تھا اور پھر میری اس چیخ کے ساتھ ہی بی جان، کاکا جان اور فرحت کی متواتر چیخوں نے پورے علاقے میں ایک طوفان برپا کر دیا۔ مبشر کا جسم ادھڑا ہوا تھا۔ اس کے منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا۔ اس کے سر کے بال اس طرح ہل رہے تھے جیسے ان کی جڑوں میں ہزاروں مکڑیاں موجود ہوں۔ میں اور کچھ نہیں کر سکا مگر میں نے لات مار کر مبشر کو دھکا دیا تاکہ وہ دروازے سے دور ہو کر زمین پر گرے۔ میں ایسا نہ کرتا تو وہ وہیں دروازے کے بالکل قریب ڈھیر ہو جاتا اور پھر......... پھر جانے کیا ہوتا۔

ان خوفناک چیخوں نے پورے محلے کو نہیں، جیسے سارے میرٹھ کو جگا دیا تھا۔ تیز اور متواتر آوازوں کے ساتھ کھڑکیاں اور دروازے کھلے۔ لوگ کیڑے مکوڑوں کی طرح گھروں سے باہر آ گئے پھر چیخوں کا ایک سلسلہ دراز شروع ہو گیا۔ مبشر مجھ سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ اس کی سوجی ہوئی آنکھیں بار بار میری جانب اٹھتیں اور بھاری پپوٹے ان پر جھک کر انہیں بند کر دیتے۔ وہ بولنے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ اس کی حالت بہت خراب تھی۔ بی جان اور کاکا جان فرحت کو لے کر اندر جا چکی تھیں۔ بی جان مجھے آوازیں دے

رہی تھیں مگر میں دروازے پر جما کھڑا تھا۔

خدا کی قسم! میں مبشر کو بچانا چاہتا تھا۔ میں اس کی بات سننا چاہتا تھا مگر اس کی حالت دیکھ کر میری ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ میں اس کے قریب جاؤں، پھر بھی میں نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ مجھے اب تک اس کے بدن پر کوئی مکڑی نظر نہیں آئی تھی۔ بلکہ اس کے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے جیسے کسی خونخوار جانور نے پھاڑ دیئے ہوں، ان پھٹے ہوئے حصوں سے اس کا ادھڑا ہوا سرخ خون سے بھرا جسم نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر جگہ جگہ سے گوشت نچا ہوا تھا اور بال......... میں نے ذرا غور سے دیکھا تو اس کے بالوں کی جڑوں میں ہزاروں سنہری مکڑیاں رینگ رہی تھیں۔ وہ مکڑیاں اتنی بہت سی تھیں کہ اس کے ایک دم سیاہ بال بھی کچھ کچھ سنہری محسوس ہو رہے تھے۔ لگتا تھا، اس کے بالوں کی جڑوں میں، پوری کھال پر وہ مکڑیاں بچھی ہوئی ہیں۔

"غیا......... غوم......... غا......... رے......... غیوض......... ض......... با........." وہ یقیناً کچھ کہنا چاہ رہا تھا۔ اس کی ادھ کھلی آنکھوں میں التجا تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا رکھا تھا۔ میں پھر اس کے چاروں طرف مکڑی نہ پا کر آگے بڑھا۔ کچھ جھکا۔

"مبشر.........! میرے دوست.........؟"

اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ میں نے اس کے ہاتھ کی طرف دیکھا اور بھونچکا رہ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ویسی ہی سونے کی چین تھی جو اس وقت بھی میرے کرتے کی جیب میں موجود ہونا چاہئے تھی۔ میں نے بے اختیار جیب کو چھوا۔ وہ موجود تھی پھر بھی بے ساختہ میرا ہاتھ بڑھا اور میں نے اس کی مٹھی میں سے لٹک آنے والی زنجیر کو اس سے لے کر تیزی سے جیب میں ڈال لیا اور پھر سر اٹھا کر چاروں طرف دیکھا۔ کافی فاصلہ پر لوگ موجود تھے۔ ہزاروں لوگ......... جن کے چہرے خوف سے زرد ہو رہے تھے، جن کی آنکھیں خوف سے ابلی پڑ رہی تھیں۔ لوگوں نے مجھے اس کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے دیکھ لیا تھا پھر بھی مجھے اتنا اندازہ ضرور تھا کہ وہ یہ نہ دیکھ پائے ہوں گے کہ اس مٹھی سے کیا چیز میری مٹھی میں منتقل ہوئی ہے۔ وہ کافی دور تھے لیکن یہ خدشہ موجود ہی تھا کہ کسی نے دیکھ لیا ہو۔ میں پھر مبشر کی طرف متوجہ ہوا اور اس بار اچھل کر پیچھے ہو گیا۔ اس کی کھال بھاسا بھاسا سلامت تھی وہاں پانی کی سطح کی طرح لہریں سی لے رہی تھی اور اندر سنہری رنگ

پھیلتا ہوا صاف نظر آ رہا تھا۔ گویا وہ ننھی ننھی مکڑیاں اس کے جسم کے اندر بھی تھیں......... اچانک مبشر کا چہرہ نیلا ہو گیا۔ سفید سفید جھاگ سے اس کا چہرہ بھر گیا اور پھر اس کی آنکھوں کی پتلیاں ساکت ہو گئیں۔

اس دوران میں کوئی پولیس کو اطلاع کر چکا تھا۔ پولیس آگئی مگر کوئی بھی اس کے قریب نہ آیا۔ اس کی لاش سے پچاس فٹ کے فاصلے پر وہ لوگوں سے واقعات کی تفصیلات معلوم کرتے رہے پھر شاید کسی نے انہیں میرے بارے میں کچھ کہہ کر میری طرف بھیج دیا۔ اسی دوران بی جان بے خوف ہو کر دروازے تک چلی آئی تھیں اور ہذیانی انداز میں مجھے پکار رہی تھیں۔ اس سے پہلے کہ میں ان تک پہنچتا' پولیس کے باوردی آفیسر میرے قریب آ چکے تھے۔ واضح کرتا چلوں کہ اس وقت کی پولیس آج کی طرح بے مہار نہیں تھی۔ وہ لوگ انسانوں کو جانور نہیں سمجھتے تھے۔ لہجوں میں شائستگی اور انکساری بھی قائم تھی اور ان آفیسرز کے چہروں پر تو شدید حیرت اور بے طرح خوف کے آثار بھی نمایاں تھے۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے بی جان کو اندر جانے کا اشارہ کر دیا تھا مگر بی جان چوکھٹ تھامے خوفزدہ کھڑی رو رہی تھیں۔

"آپ انہیں جانتے ہیں؟" پولیس آفیسر نے سڑک پر ساکت پڑے مبشر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

میں نے نظر بھر کر مبشر کو بغور دیکھا اور پھر یہ دیکھ کر حیرت زدہ ہو گیا کہ اب اس کے بالوں میں اور کھال کے نیچے کوئی مکڑی نہیں تھی۔ لمحہ بھر میں میں نے فیصلہ کر لیا کہ مجھے کیا کہنا اور کیا کرنا ہے۔

"جی ہاں آفیسر' یہ میرا دوست تھا۔" میرے منہ سے لفظ "تھا" سن کر وہ چونکا اور غیر اختیاری طور پر مبشر کی طرف پلٹا۔ لمحہ بھر اس نے مجھے دیکھا اور پھر پلٹ کر خوفزدہ انداز میں نپے تلے قدم رکھتا ہوا مبشر کی طرف بڑھا۔ اتنی دیر میں سرکاری اسپتال کا عملہ بھی گاڑی لے کر آ پہنچا تھا۔ وہ قانونی کارروائی میں مصروف ہو گیا۔ میں نے دروازے پر آ کر بی جان کو تسلی دی۔ ان کے آنسو صاف کیے اور انہیں کسی نہ کسی طرح اندر بھیج دیا۔ مجھے یقین تھا کہ آفیسر مجھ سے ضرور پوچھ گچھ کرے گا۔ میں بی جان کو بھیج کر وہاں کھڑا ہو گیا' اب محلے کے لوگ سرک سرک کر میرے قریب آ پہنچے تھے۔ اب ان میں کچھ ہمت بڑھ گئی تھی۔ وہ دیکھ چکے تھے کہ اسپتال کے عملے کے علاوہ پولیس والے بھی مبشر کی لاش کے قریب جا چکے ہیں۔

"میاں یہ......... ناصر انصاری کا بیٹا نہیں ہے؟" ایک بڑے میاں مجھ سے بولے۔

"جی چچا.........! یہ ناصر انصاری کا بیٹا مبشر ہے۔" میں نے جواب دیا

"آئے ہائے بے چارہ.........!"

"مگر اسے ہوا کیا؟" ایک اور آواز آئی۔

"کسی جانور کے پیچھے لگ گیا۔" جانے کس نے کہا تھا۔

اس کی آواز نے مجھے ایک نئی راہ سجھا دی۔

پھر چاروں طرف جوں جوں لوگوں کا ہجوم بڑھتا گیا' ان کے سوالات' جملے اور باتیں بڑھتی چلی گئیں۔ کافی لوگوں نے اسے پہچان لیا تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ دور کے محلے میں رہتے ہوئے بھی ہر دلعزیز تھا۔ اس کی انکساری اور خاکساری سے تو میں بھی متاثر ہوا تھا۔ میرا ذہن مسلسل کام کر رہا تھا۔ میں سوچ چکا تھا کہ پولیس کے استفسار پر مجھے کیا جواب دینا ہے۔ اب تو میں اس پریشانی میں گرفتار تھا کہ وہ زنجیر کیسی ہے جو مبشر نے مجھے دی تھی۔ میں اس کی ایک جھلک ہی دیکھ پایا تھا مگر اتنا جان گیا تھا کہ وہ ہو بہو ویسی ہی ہے جیسی رات میں صندوقچی سے نکال کر اپنے قبضے میں لے چکا تھا۔

دوسرا پریشان کن بلکہ تباہ کن احساس یہ تھا کہ یہ مبشر کے ہاتھ کہاں لگی؟ وہ مکڑیاں اس پر کب' کیسے اور کہاں حملہ آور ہوئیں؟ کیا وہی زنجیر اصلی تھی؟ کیا وہ اب بھی اس جیسی کسی دوسری صندوقچی میں اس مکڑی کے ساتھ محفوظ تھی۔ اگر ایسا تھا تو وہ صندوقچی مبشر کے ہاتھ کہاں سے لگی اور وہ صندوقچی کیسی تھی جو بی جان نے مجھے رات لا کر دی تھی۔ یہ سربستہ راز بڑے خوفناک تھے۔ میں مبشر سے کچھ بھی معلوم نہیں کر پایا' وہ کچھ بتانا چاہتا تھا مگر موت نے اسے مہلت نہیں دی۔ ایسی کون سی اہم بات تھی کہ اس حالت میں مبشر اپنے محلے سے یہاں تک چلا آیا۔

وہ یقیناً بڑی ہی خوفناک بات ہو گی ورنہ ایسی حالت میں اس کا یوں آنا۔ میری کن پٹیوں میں دھمک شروع ہو گئی۔ اب مبشر کی لاش اٹھوا لی گئی تھی۔ میں نے معلوم کیا' لاش کو اسپتال لے جایا جا رہا تھا۔ پولیس آفیسر نے مجھے تھانے آنے کی دعوت بڑے مجمل انداز میں دی پھر خود ہی رد کر دی اور بولا۔ "میں شام میں آپ سے کسی وقت مل لوں گا۔"

"سوری آفیسر! میں شام کو یہاں نہیں ہوں گا اور کل سویرے مجھے واپس دلی جانا

ہے۔ آفس ڈیوٹی کی وجہ سے' آپ اگر چاہیں تو میں دوپہر میں' نماز کے بعد آپ کا انتظار
کروں گا۔"

"تھینک یو سر!" وہ قدرے جھکا پھر مبشر کا ایڈریس مجھ سے پوچھ کر نوٹ کیا۔ میں
نے بتایا کہ میں خود وہاں جا کر یہ خبر دینا چاہتا ہوں۔ ان لوگوں کا وہاں جانا بہتر نہ ہو گا۔ میں
جانتا تھا کہ مبشر کی اماں نے مبشر کو ہمیشہ ہتھیلی کا چھالا بنائے رکھا ہے۔ بقول اس کے
بھائیوں کے' وہ کھرچن تھا اس لئے اماں سر پر بٹھائے رہتی تھیں۔ آفیسر نے میری بات
سے اتفاق کیا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ وہ فی الوقت سیدھا اسپتال ہی جائے گا اور میڈیکل
رپورٹ کا انتظار کرے گا۔

☆------------☆------------☆

ان سب کی روانگی کے بعد ہی نہیں' پہلے بھی لوگ مجھ سے بہت کچھ پوچھنے کے
لئے بے چین تھے۔ میں نے آفیسر کے جاتے ہی گھر کی طرف قدم بڑھائے' لوگوں نے مجھے
روکنے کی کوشش کی مگر میں نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ میں صدمے میں ہوں اور ابھی
اتنی جانکاہ خبر مجھے مبشر کے گھر بھی پہنچانا ہے۔ میں اندر داخل ہوا تو باہر بے چین آوازیں
مکھیوں کی بھنبھناہٹ سی بن کر پھیل گئیں۔ بی جان دروازے سے کچھ فاصلے پر اب بھی
میری منتظر تھیں۔ قریب ہی کمرے کے دروازے پر فرحت زرد چہرہ لئے اور کاکا جان اسے
تھامے آنکھوں میں آنسو بھرے' خوفزدہ انداز میں کھڑی تھیں۔

"اتنے دن تو کچھ بھی نہ ہوا تھا۔" مجھے دیکھتے ہی کاکا جان نے کہا۔ ان کے لہجے میں
عجیب سا شک' عجیب سا شکوہ تھا۔ یوں جیسے وہ تینوں اس واقعے کا ذمے دار مجھے سمجھ رہی
ہوں۔ میں نے کن انکھیوں سے فرحت کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی وہی شک
اور وہی خوف میں ڈوبا شکوہ ہلکورے لے رہا تھا۔ میں نظر چرا گیا۔ میں نڈھال سا ہو گیا۔
سچ ہے کہ میں شدید صدمے کے اثر میں تھا۔ میں نے کب چاہا تھا کہ ایسا کچھ ہو اور وہ بھی
یہاں۔ بی جان کے دروازے پر......... اور بھلا مبشر کا اس تمام واقعے سے کیا تعلق تھا؟

مجھے دیکھتے ہی بی جان میری طرف لپکیں اور بے ساختہ مجھ سے لپٹ کر رو دیں۔
میں بہت دیر تک انہیں تھپکیاں دیتا رہا اور سوچتا رہا۔ اب پوزیشن ایسی نہیں تھی میں ان
لوگوں کو یہاں چھوڑ دیتا' میں نے اس لمحے اپنے آپ کو مفلوج پایا' ذہن کچھ سوچنے
کی صلاحیت سے عاری محسوس ہو رہا تھا۔

"یہ......... یہ سب کیا ہوا ہے ضیاء......... مبشر کو کیا......... ہو گیا تھا؟"

جو جھوٹ میں کسی اور سے بول سکتا تھا' وہ یہاں کارگر نہ تھا۔ میں ان سے یہ نہیں
کہہ سکتا تھا کہ اسے شیر نے زخمی کر دیا ہو گا' یا راستے میں بھیڑیوں کے غول نے اس پر
حملہ کر دیا ہو گا......... میں ایسا اس لئے نہیں کر سکتا تھا کہ وہ لوگ بڑی بوا کی اسی انداز
میں ادھڑی ہوئی لاش دیکھ چکے تھے اور جب میں دروازے پر آیا تو یہ تینوں بھی میرے
پیچھے تھیں۔ مجھے دکھائی دے جانے والی مکڑیاں انہیں نظر آئی ہوں گی......... لیکن مجھے
کچھ کہنا ہی تھا' سو میں نے تھکے ہوئے انداز میں بی جان کے کندھے تھام لئے۔

"بی جان.........! جو بھی ہوا' آپ کے سامنے ہے......... بس اتنی گزارش کروں
گا کہ خود پر قابو پائیں......... جو کچھ آپ لوگوں نے دیکھا اور محسوس کیا ہے' اسے بھول
جائیں۔ ابھی حالات واضح نہیں ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ لوگ اس حادثے کو کیا رنگ دیتے
ہیں' میڈیکل رپورٹ کیا کہتی ہے لیکن بی جان......... آپ لوگوں کے منہ سے کوئی بات
نہ نکلے......... کوئی پوچھے تو کہہ دیجئے گا کہ ہمیں ضیاء نے باہر نکلنے نہیں دیا اور مبشر دور
تھا......... بس آپ لوگوں نے بھی وہی کچھ دیکھا ہے جو دور کھڑے ہوئے لوگوں نے دیکھا
ہے۔"

میں ان تینوں سے مخاطب تھا۔ میں جانتا تھا کہ میرے یہ الفاظ ان کے شک و شبہے
کو مزید تقویت دیں گے مگر اس کے سوا کچھ چارہ ہی نہ تھا۔ ان تینوں کے چہروں پر پھیلی
زردی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ میں نے سب سے نگاہیں چرا لیں۔ بے چینی نے مجھے گھیر
رکھا تھا۔ میں ان کے درمیان مزید ٹھہرنے کی بجائے اپنے کمرے میں آ گیا۔ وہاں پہنچ کر
میں نے پہلا کام یہی کیا کہ اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر وہ دونوں زنجیریں اور شالی بابا کا دیا ہوا
پتھر نکال لیا۔ وہ دونوں زنجیریں جیسے ایک ہی تھیں' سرمو فرق نہ تھا۔ میں نے بڑی باریک
بینی سے جائزہ لیا۔ حسب سابق میری بصارت حیرت انگیز ہو گئی مگر میں پھر بھی ان دونوں
میں کوئی فرق نہ پا سکا۔ میں بتا نہیں سکتا کہ اب میری کیا حالت تھی! سمجھ میں نہیں آ رہا تھا
کہ ان دونوں میں سے اصلی کون سی ہے۔ کچھ بھی ہو' ان میں اصلی صرف ایک ہی
تھی۔ وہ زنجیر جو میں نے ابا کے کمرے میں سے چرائی تھی اور جو یہاں فرحت کے گھر میں
صندوقچی میں تھی مگر اس وقت وہ دونوں آپس میں گڈمڈ ہو چکی تھیں۔ الجھن نے میرے
ذہن کو شل کر دیا۔ اب دونوں ہی کی حفاظت ضروری ہو گئی تھی۔

☆-------------☆-------------☆

وقت بیت رہا تھا۔ مجھے احساس تھا کہ مجھے پہلی فرصت میں مبشر کے گھر والوں
اس حادثے کی اطلاع کرنا چاہئے۔ میں چند لمحوں کے بعد کمرے سے باہر نکل آیا۔ بی جان
کاکا جان اور فرحت ہارے ہوئے جواریوں کی سی حالت میں بیٹھی تھیں۔ بی جان کے
بابا' ان کی بیوی اور محلے کی کچھ عورتیں بھی وہاں موجود تھیں۔ سب کے چہرے پر
تھا۔ پہلے میں نے چاہا کہ ان سب کو ڈانٹ کر بھگا دوں مگر پھر ضبط کر گیا۔ میں بی جان کو
کر مبشر کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ بی جان نے مجھ سے کہا کہ وہ بھی تھوڑی دیر
وہیں آجائیں گی۔

اب سورج تھوڑا سا ابھر آیا تھا۔ ہوا کی خنکی میں کچھ کمی آگئی تھی۔ گھر سے
اب بھی رش لگا ہوا تھا۔ لوگ آپس میں تبادلہ خیال کر رہے تھے۔ کچھ لوگ میرے
تھے' جب میں ان سے کترا کر نکلنے لگا تو انہی بڑے میاں نے مجھے روک لیا جنہوں نے
کو ناصر انصاری کے بیٹے کی حیثیت سے پہچان کر مجھ سے تصدیق کی تھی۔

"میاں ہم تمہارے منتظر تھے کہ ساتھ ہی ناصر انصاری کے گھر جائیں گے۔"

"ہائے! میرا تو دل ہول رہا ہے یہ سوچ کر سویرے سویرے ایسی خبر وہ لوگ سنیں
گے تو کیا ہو گا؟"

"یہ سب اللہ کی مرضی ہے صاحب! بندہ حقیر کیا کر سکتا ہے۔ ویسے لگتا ہے کوئی
جنگلی جانور اٹھا کر لے گیا تھا۔"

"نہ بھیا! اگر ایسا ہوتا تو بھلا اپنے پیروں پر چل کر یہاں تک کیسے آتا؟ بات
سمجھ میں نہیں آئی۔"

ایک اور صاحب نے کہا۔ دوسرے صاحب نے کسی کو پکار کر تانگے کے لئے
دیا تھا۔ میں اکیلا ہوتا تو پیدل چلا جاتا مگر ساتھ بزرگ لوگ تھے اسی لئے وہیں کھڑا تانگے
انتظار کرتا رہا۔ یہ اندازہ لگانا بھی مقصود تھا کہ لوگ کیا کہتے ہیں اور کس حد تک جا
ہیں۔ اچانک ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"اس حادثے نے پرانے زخم تازہ کر دیے۔"

میں نے چونک کر کہنے والے کو دیکھا۔ وہ چالیس پینتالیس برس کا آدمی تھا۔
رنگ' سیاہ بڑی بڑی آنکھیں' گھنے سیاہ بال' پرکشش چہرہ' اونچا قد اور کسرتی جسم نے

کی شخصیت کو سحر انگیز بنا دیا تھا۔ میں غیر محسوس انداز میں ان کے قریب سرک گیا۔

"کون سے زخم؟" کسی نے ان کی بات سن کر پوچھا تھا۔

"ایسے حادثات عطاء الرب رضوی کی موت کے پیچھے بعد دیگرے ان کی حویلی میں
ہوئے تھے۔"

"کون عطاء الرب.........! وہی تو نہیں جنہوں نے خودکشی کر لی تھی؟" کسی نے
پوچھا۔

ہاں! ہاں.........!"

اور پھر وہ صاحب تفصیلات بتانے لگے۔ رفتہ رفتہ دوسرے لوگ بھی ان کی طرف
متوجہ ہو گئے۔ میں خود پورے حواسوں سے ان کی جانب متوجہ تھا۔ مجھے حیرت ہو رہی
تھی کہ وہ بڑی تفصیل سے واقف تھے۔ ابھی بات درمیان ہی میں تھی کہ تانگا آگیا۔ ہم
لوگ جن میں میرے علاوہ چار دوسرے افراد شامل تھے' تانگے میں بیٹھ گئے۔ میں نے نقشی
بابا کو تاکید کر دی تھی کہ بی جان وغیرہ اگر وہاں آنا چاہیں تو وہ ان کے ساتھ رہیں۔

☆-------------☆-------------☆

میرٹھ جاگ اٹھا تھا۔ بازاروں میں رونق تھی۔ ہلکی ہلکی دھوپ' نرم نرم توانائی بکھیر
رہی تھی مگر یہ صبح ایک اداس صبح تھی۔ بڑے عرصے کے بعد ایک ایسا حادثہ رونما ہوا تھا
جس نے واقعی پرانے زخم تازہ کر دیے تھے مگر وہ شخص کون تھا جس نے ان زخموں کا ذکر
کیا' میں اب بھی نہیں پہچانا تھا۔ اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص سے جب میں نے ان
صاحب کے بارے میں استفسار کیا تو ان کا جواب سن کر اچھل پڑا۔

"میاں! عطاء الرب کے گھر ان کی ساس کی موت ایسے ہی پراسرار انداز میں ہوئی
تھی۔ اس موقع پر بڑی بوا میت کے غسل کے لئے گئی تھیں۔"

"جی جی! آپ بڑی بوا کی بات کر رہے ہیں! پھر؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"یہ صاحب زادے ان کے چھوٹے داماد ہیں۔ شریف الدین نام ہے۔ اس حادثے
کے وقت ان کی شادی تو نہیں ہوئی تھی مگر بات طے ہو چکی تھی۔ موت کے بعد ہی شادی
ہو گئی تھی مگر یہ ان کے خاندان ہی کے تھے' اسپتال میں اور گھر میں سارا انتظام انہوں نے
اور ان کی اماں ہی نے سنبھالے رکھا تھا۔"

بات میری سمجھ میں آگئی تھی پھر بھی مبشر کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ ایک

صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ وہ آپ سے کیا کہہ رہا تھا؟ میں نے ان کی تسلی کے لئے بتا دیا۔ "وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا مگر کہہ نہیں پایا تھا پھر اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا تھا تاکہ میں اسے سہارا دے کر اٹھا لوں مگر میں اس کی حالت دیکھ کر خوفزدہ بھی تھا اور بدحواس بھی۔ میں نے پھر بھی اسے اٹھانے کی کوشش کی مگر اس کا ہاتھ بھی زخمی تھا۔ میری گرفت میں نہیں آسکا۔" اتنا بتا کر میں نے سب کے چہروں پر اپنی بات کا ردعمل تلاش کرنا چاہا۔ میں صرف اتنا جاننا چاہتا تھا کہ ان میں سے کسی نے مبشر کو وہ چین دیتے تو نہیں دیکھا' مجھے جلدی ہی اطمینان ہو گیا۔ جب ایک صاحب نے کہا۔

"ہاں.........! وہ اٹھنا تو چاہ رہا تھا مگر......... آپ کو کیسے پتا چلا کہ باہر وہ سڑک پر پڑا ہے؟"

"جس وقت میں نے لات مار کر مبشر کو دروازے سے دور کرنے کے لئے گرایا تھا اس وقت محلے کے سب دروازے بند تھے جنہوں نے بھی دیکھا' اسے سڑک پر گرتے ہوئے دیکھا تھا۔ "میں چہل قدمی کے لئے اسی وقت گھر سے باہر نکلا تھا۔ اسے وہاں دیکھ کر بھونچکا رہ گیا میرے منہ سے چیخ نکل گئی اور گھر کی خواتین نے بھی اس حالت میں دیکھ کر چیخنا شروع کر دیا۔" میں نے جلدی سے جواب دیا۔

بات واضح ہو گئی تھی۔ لوگ مطمئن ہو گئے تھے اور کسی قدر مجھے بھی اطمینان ہو گیا تھا۔ اس وقت تانگا ہمارے پرانے محلے میں داخل ہو رہا تھا۔ اتنے عرصے بعد اپنی گلی اپنے محلے اور اپنے گھر کو دیکھ کر بے اختیار میری آنکھیں بھر آئیں۔ باہر ہی سے کوٹھی کی ویرانی کا احساس ہو رہا تھا۔ مبشر کے گھر کو جانے والی پتلی گلی' ہماری کوٹھی کی دیوار کے ساتھ ہی اندر کی طرف جاتی تھی۔ یہ پتلی گلی چند گز سے زیادہ لمبی نہ تھی اور کچھ اس انداز سے بنی ہوئی تھی کہ دور سے دیکھنے پر یوں لگتا تھا جیسے آگے جا کر بند ہو گئی ہے حالانکہ آخری گھر کے دائیں جانب سے ایک بغلی راستہ سا تھا جو پچھلے حصے کی طرف مڑ کر چوڑی سڑک پر ختم ہوتا تھا۔ اس گلی میں آخری کونے پر مبشر کا گھر تھا۔ جس کی ایک دیوار ہماری کوٹھی اور اس کے آنگن کو علیحدہ کرتی تھی۔ یہ دیوار کافی اونچی تھی مگر کیونکہ اس جانب ہمارے کمروں کے سامنے والا برآمدہ تھا اس لئے اماں نے اس دیوار میں کافی اونچائی پر گول روشن دان کھلوا لیا تھا۔ جس پر باریک جالی لگی تھی' یہاں سے آنے والی ہوا اور دھوپ برآمدے کو قدرے روشن اور ہوادار بنا دیتی تھی۔ غالباً اسی لئے گھر کی رونق' ادھر مبشر کے گھر میں بھی ہوتا تھا اور جب سے ہم لوگ چھوڑ کر گئے تھے یہاں ویرانی برس رہی تھی۔ شاید اسی لئے مبشر یہ سن کر حیران ہوا تھا کہ میں کل دن کا آیا ہوا ہوں مگر انہیں نہیں لگا کہ گھر میں کوئی آیا ہے۔ میں گھر میں جاتا تو اسے پتہ چلتا۔ تانگا ہم نے پتلی گلی کے باہر ہی رکوا لیا۔ ہم سب پیدل مبشر کے گھر کے دروازے پر پہنچ گئے۔

"میاں! تم ہی ہمت کرو......... ہم میں تو ہمت نہیں......... یہ انتہائی ناپسندیدہ فرض ہے۔"

وہی بزرگ گویا ہوئے جو راستے بھر مجھ سے باتیں کرتے ہوئے آئے تھے' واقعی یہ ایک انتہائی ناپسندہ فرض تھا جسے بہرحال انجام دینا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اب کہرام مچنے والا ہے اور چاہتا تھا کہ ایسا نہ ہو مگر بے بس تھا' مجھے سویرے سویرے یہ ہولناک خبر ان لوگوں کو سنانا تھی۔ پھر تسلیاں بھی دینا تھیں۔ مبشر کی تدفین تک مجھے یہیں رہنا تھا۔ اسپتالوں کے چکر' پولیس کی پوچھ گچھ' رونا چیخنا اور لوگوں کے ہزاروں سوالات .... مجھے ان سب کا سامنا کرنا تھا۔ میں نے ہمت کی۔ آگے بڑھ کر دروازہ بجاتے ہوئے میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ دل حلق میں دھڑک رہا تھا۔

"کون ہے میاں؟"

یہ مبشر کے دادا کی آواز تھی۔ یہ آواز میں بھول نہیں سکتا تھا' ان کی اس باٹ دار اور گونجدار آواز نے بچپن ہی سے محلے کے تمام لڑکوں پر ہیبت طاری کی ہوئی تھی۔ ہم محلے میں اور کسی سے اتنا نہیں بدکتے تھے جتنا مبشر کے ابا سے۔ انہوں نے زندگی میں کبھی کسی لڑکے کو شریف نہیں جانا تھا' ان کی نظر میں تمام کم عمر لڑکے نرے نالائق' آوارہ اور بدمزاج ہوتے تھے۔ وہ مبشر سے بھی ہمیشہ نالاں رہے تھے۔ دادا سے ان کی اچھی دوستی تھی حالانکہ دادا اور ان کی عمر میں اتنا فرق تھا جتنا ابا اور دادا کی عمر میں تھا۔

اسی دوران میں مجھے چپل گھسیٹنے کی آواز آئی۔ میں ایک قدم پیچھے ہو گیا۔ میرے حلق میں کانٹے سے اگ آئے تھے۔ انہوں نے دروازہ کھولا۔ چندھائی ہوئی آنکھوں سے پہلے مجھے پھر میرے پیچھے کھڑے ان چاروں افراد پر نگاہ ڈالی۔ میں نے اور ان تمام لوگوں نے انہیں سلام کیا۔ ان سے مصافحہ کیا۔ مجھے لگا جیسے پیاس نے میری زبان کو بہت موٹا کر دیا ہے۔ میں کچھ بول ہی نہ پاؤں گا۔ وہ سب سے ہاتھ ملاتے ہوئے کچھ حیران سے تھے۔ بالآخر بول اٹھے۔

"خیریت تو ہے' میں آپ لوگوں کو پہچانا نہیں۔"

"جی.......... چچا.......... خیریت ہے.......... وہ.......... ہمیں آپ سے کچھ بات کرنا ہے۔" میں بول تو پایا مگر گڑبڑا گیا۔

انہوں نے ایک بار پھر بغور ہم سب کو دیکھا۔ غالباً وہ اب بھی ہمیں پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ پہچان نہیں پائے پھر پلٹ کر اندر دیکھا۔ خواتین سے پردہ کرنے کو کہا۔ چند لمحے کے بعد ہماری طرف پلٹے اور بولے۔ "آیئے! تشریف لے آیئے۔"

ہم ان کی رہنمائی میں ایک کمرے تک پہنچ گئے۔ یہ کمرا غالباً ان کا کمرا تھا۔ یہاں ایک بڑی سی اونچے پایوں والی منقش چارپائی تھی جس کے سرہانے آئینہ لگا ہوا تھا۔ ایک لکڑی کی بھاری اور چوڑی الماری' گول میز' دو آرام دہ کرسیاں' گلدان' پاندان اور سلفچی اس کمرے کا کل اثاثہ تھی۔

"تشریف رکھئے۔"

انہوں نے سب کو بٹھایا پھر خود بھی چارپائی پر بیٹھ گئے۔ سر اٹھا کر انہوں نے سب کے چہروں کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں شدید الجھن تھی۔ میں نے دیکھا' سب کے چہروں پر تذبذب کے علاوہ گہرا دکھ تھا۔

"دیکھئے صاحب! اگر آپ لوگ مبشر کی شکایت کرنے آئے ہیں تو میں پہلے ہی سے ایک بات واضح کر دوں کہ وہ میری نگاہ میں انتہائی ناخلف اولاد ہے۔ میں تو اسے کئی بار گھر سے نکال چکا ہوں مگر یہ عورتیں.......... یہ ناقص العقل مخلوق' آدمی کو بے دست و پا کر دینے کی صلاحیت سے مالا مال ہیں۔ اچھے خاصے آدمی کو چغد بنا دیتی ہیں۔ وہ اگر اس گھر میں گھسنے کی ہمت رکھتا ہے تو محض اسی مخلوق کی پشت پناہی پر۔ میں آپ لوگوں سے انتہائی معذرت خواہ ہوں' اسے پیدا نہ کرنا میرے بس میں ہوتا تو میں ایسی فاش غلطی کبھی نہ کرتا۔"

ان کی آواز ہماری سماعتوں میں یوں گونج رہی تھی جیسے کسی صحرا میں نقارے کی آواز گونج سکتی ہے۔ جیسے سناٹے میں گدھ کی آواز سماعت میں خراشیں ڈال دیتی ہے۔ مجھے تو یوں لگ رہا تھا جیسے ان کی آواز میرے سینے کے اندر کھرونچے ڈال رہی ہو۔ جیسے زخموں سے خون رسنے لگا ہو۔ باقی لوگوں کے چہرے بھی فق ہو گئے تھے۔ سبھی ایک دوسرے سے نظریں چرا رہے تھے۔ میں نے شدت سے چاہا کہ کوئی اور یہ خبر انہیں نہ

دے مگر میں یہ چاہ کر بھی گھبرا گیا۔ اب مجھے یہ خوف دامن گیر تھا کہ ان کے ان احساسات میں مبشر کی موت کی خبر کسی بم دھماکے سے کم نہ ہوگی۔ جب آدمی مدافعت کے لئے تیار ہوتا ہے تو وہ سنبھل جاتا ہے لیکن اگر وہ قطعی متضاد کیفیات کا حامل ہو تو کوئی بھی خبر اس کے لئے موت کا سبب بن سکتی ہے۔ خود آدمی کے خیالات ہی اسے چرکے لگاتے رہتے ہیں۔ یہاں مبشر سے نفرت کے اس اظہار نے ان کے اندر مبشر کے لئے ایک ایسی صورت حال پیدا کر دی تھی جو سکتے کا سبب تو بن ہی سکتی تھی۔

میں گم صم تھا۔ وہ سر اٹھائے ہم سب کو دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہرے کی جھریوں میں الجھن تیر رہی تھی۔ آنکھوں میں حیرت تھی۔ وہ غالباً ہماری خاموشی پر حیران تھے یا ہمارے چہروں کے تاثرات پر۔ ایک صاحب ہلکے سے کھنکارے۔ غالباً انہوں نے ہمت کر لی تھی مگر ایک دم ہی بیچ میں بول اٹھا۔

"مبشر کے.......... بھائی.......... بڑے بھائی' منور بھائی کہاں ہیں؟" منور بھائی مجھے اچانک ہی یاد آ گئے تھے۔

"وہ تو بمبئی چلا گیا تھا۔ بڑا محنتی بچہ ہے۔ اگر وہ نہ ہوتا تو.......... شاید ہم سفید پوشی کا بھرم رکھتے.......... ویسے آپ لوگ بات تو بتایئے' منور سے کچھ کام تھا کیا؟"

"نہیں.......... ہاں.......... ! دراصل ہم..........۔" میں پھر گڑبڑا کر چپ ہو گیا۔ ہر گزرتا لمحہ میرے دل کا بوجھ بڑھا رہا تھا۔ "آپ کے علاوہ کیا گھر میں کوئی اور مرد نہیں ہے؟" بالآخر میں نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔ حالانکہ میں جانتا تھا کہ اس سوال پر وہ فوراً بھڑک جائیں گے اور وہی ہوا۔ ان کے نتھنے پھڑکے' بھنویں کھنچ کر کمان ہو گئیں اور چہرے پر ناگواری پھیل گئی۔

"مطلب کیا ہے آپ کا؟ میاں پہلی بات تو یہ ہے کہ میں آپ لوگوں کو پہچانتا ہی نہیں ہوں۔ اس محلے کے بھی نہیں لگتے۔ دوسری یہ میری شرافت تھی کہ آپ نے خود اندر آنے پر اصرار کیا اور میں اندر لے آیا۔ اگر مبشر سے آپ کو شکایت ہے تو میں اس کا باپ ہوں' میرے علاوہ کسی دوسرے سے اس کی شکایت کا بھلا کیا جواز ہے اور اگر بات مبشر کی نہیں تو آپ سب تشریف لے جا سکتے ہیں۔"

اب معاملہ جیسے ہاتھوں سے نکل گیا تھا۔ وہ کھڑے ہو چکے تھے۔ وہ ہم سب کو اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے ہمارے اٹھ کر چلے جانے کے منتظر ہوں۔ میں بلا سوچے سمجھے اٹھا

اور بے اختیار ان کے گلے سے لپٹ کر رو دیا۔ وہ لمحہ بھر کو ساکت رہ گئے۔ میرے سینے سے ان کا دل دھڑک رہا تھا یوں جیسے کوئی سینے پر ہتھوڑے برسانے لگا ہو۔ ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ میرے رونے نے میرے ساتھ آنے والوں کی آنکھیں بھی بھگو دیں۔

"کیا...... کک...... کیا ہے بھئی......؟"

یہ انہی کی آواز تھی مگر جیسے گرتی ہوئی بھربھری ریت کی آواز ہو' دھیمی دھیمی...... ٹوٹی ہوئی سی' بکھر جانے والی۔ پھر اچانک میں نے ان کے اندر جھرجھری سی محسوس کی' انہوں نے جھٹکے سے مجھے خود سے الگ کیا' میرے دونوں شانے تھامے تو ان کی انگلیاں میرے شانوں میں گڑ کر رہ گئیں۔ ان کے اعصاب تن چکے تھے۔

"کیا بات ہے' تم کون ہو اور...... کیا......؟" انہوں نے جبڑے بھینچ کر پوچھا تھا۔

میں سمجھ گیا کہ اب وہ ہر خبر سننے کو تیار ہیں۔ یہ بالکل مناسب وقت تھا۔

"مبشر...... مر گیا۔" یہ تین حروف میں نے کس مشکل سے ادا کئے' اس چھوٹے سے جملے میں کتنی ہیبت ناکی تھی' شاید کوئی اس کا اندازہ نہ کر سکے۔ مگر میں نے ان کے چہرے پر کیسا طوفان آتے دیکھا' کتنے ہی جذبوں کو ان کی آنکھوں میں طلوع ہوتے اور غروب ہوتے دیکھا' کیسی کیفیات کو دم بدم بدلتے دیکھا' میں بیان نہیں کر سکتا۔ ایک ایسا باپ جو اولاد سے نفرت کر سکتا ہے' اس کی محبت میں کس قدر شدت ہوتی ہے' اس کا اندازہ مجھے اس ایک لمحے میں ہوا تھا۔ آج مجھے پتا چلا تھا کہ کھال ادھیڑ دینے والا باپ جب اپنے اس ناخلف بیٹے کو کسی اور سے معمولی تھپڑ کھاتے یا تکلیف جھیلتے دیکھتا ہے تو کون سا جذبہ اس میں جوار بھاٹا اٹھا دیتا ہے۔ وہ ایک دم تنکے کی طرح ڈولے' ایک بہت بڑے طوفان تھے مگر پھر کیسے بپھر گئے تھے! کیسی عجیب سی صورت ہو گئی تھی ان کی جیسے بہت سارے خوبصورت رنگوں کو کسی نے ایک ساتھ ملا دیا ہو' تیز' ہلکے' چمکدار' بھدے' سبھی رنگ ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو کر بدصورت ترین شکل اختیار کر گئے تھے اور وہ پھٹی پھٹی آنکھیں' بھینچے ہوئے جبڑے' لرزتے ہوئے ہونٹ' اکڑا ہوا سینہ' اچکے ہوئے کندھے باہر کو لپک گئے تھے پھر غراتے ہوئے اندر پلٹے۔ ان کی تیز چلنے والی سانس کی آواز [illegible] کی کھنڈی جیسی آواز میں تبدیل ہو کر آہستہ آہستہ دھیمی ہو رہی تھی۔ ان کے چہرے پر کھنچی ہوئی ساری لکیریں دھیرے دھیرے سپاٹ ہونے لگیں۔ انہوں نے یقین اور

بے یقینی کے درمیان خود پر قابو پایا تھا۔

"تم کیا کہہ رہے تھے؟" لہجے میں کوئی رنگ نہ تھا' یوں جیسے گہرے خیالوں میں کھویا ہوا شخص اچانک چونک کر سپاٹ انداز میں پوچھ لیتا ہے۔ اب کی بار مجھ سے بولا نہیں گیا۔ ہاں' میں اور پھوٹ کر رو دیا۔ وہ یوں دوسری طرف مڑے جیسے میں رویا نہ ہوں' میں نے جواب دینے سے انکار کر دیا ہو۔ شاید وہ یقین کرنے کو تیار نہ تھے' یا یقین کرنا ہی نہیں چاہتے تھے۔

"یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ آپ بیٹھ جائیں۔" میرے ساتھ آنے والے تمام بزرگ جو کھڑے تھے' ان میں سے ایک نے قریب آ کر انہیں شانے سے چھوا تھا۔

مبشر کے ابا اس تیزی سے کاندھا جھٹک کر ان سے دور ہوئے جیسے ان کے شانے پر بچھو ڈنک مارنے والا ہو۔ "ارے واہ میاں' ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" انہوں نے ان بزرگ کے انداز کی نقل اتاری۔ "ان کے باوا کا راج ہے کہ جو چاہیں گے آ کر کہہ دیں گے۔ تشریف لے جائیں آپ لوگ' اور ہاں...... ایک بات بتا دوں' وہ جیسا بھی ہے' ہے میری اولاد' الٹی سیدھی باتیں کرنے والے کا منہ توڑ دیتا ہے۔" مگر اتنا کہتے کہتے ان کی آواز بھرا گئی تھی۔ ان کی آنکھوں میں جانے کہاں سے پانی امنڈ آیا تھا۔ ناک کی پھننگ دیکھتے ہی دیکھتے سرخ ہو گئی تھی۔ انہوں نے اپنا دایاں ہاتھ اس طرح اپنے گلے پر پھیرا تھا جیسے ان کا حلق خشک ہو گیا ہو۔

"اچھا......! اچھا......! وہ واقعی مر گیا۔"

یہ جملہ پورا کرتے ہی میرا دماغ جھنجھنا اٹھا تھا۔ میرے دائیں رخسار پر پڑنے والا تھپڑ پوری طاقت سے آ کر لگا تھا۔ میں ہی نہیں وہ خود بھی چند لمحوں کے لئے ساکت رہ گئے تھے اور پھر وہ مبشر کا نام لے کر اتنی زور سے دھاڑے تھے کہ گھر کی تمام خواتین پردے اور حیا کو بالائے طاق رکھ کر دوڑتی ہوئی اس کمرے میں داخل ہو گئی تھیں اور پھر...... میں اس طوفان کا مقابلہ نہیں کر سکا۔ جانے کیسے وہاں سے نکل کر باہر آ گیا۔ باہر آ کر مجھے لگا جیسے میری اب تک کی رکی ہوئی سانس بحال ہو گئی ہو۔ جیسے اندر اتنا وقت میں نے کسی گہری گھٹن میں گزارا ہو۔

ذرا ہی سی دیر میں یہاں بھی محلہ اکٹھا ہو گیا۔ بی جان اور ان کے محلے کے کچھ لوگ بھی پہنچ گئے۔ ایسا آہ و بکا کا طوفان تھا کہ لگتا تھا' میرٹھ آج ختم ہو جائے گا اور جب پولیس

دروازے پر آئی' باقاعدہ موت کی تصدیق ہوئی اور مبشر کی حالت کا پتا چلا تو پورے جسم غضنفر کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ اس محلے کے سارے زخم تازہ ہو گئے۔ میں جس دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا' وہ میری ہی کوٹھی کی دیوار تھی اور میرا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ میں اندر قدم رکھوں' مجھے لگ رہا تھا کہ اگر میں اندر داخل ہوا تو بیچ آنگن میں رکھی ہوئی تحسین خالہ کی میت میرا استقبال کرے گی' پھر میت کے غسل خانے سے بڑی بوا لڑکھڑاتی ہوئی' چیختی میری راہ میں آ جائیں گی اور ابا کے کمرے کے بیچوں بیچ ابا کی لاش پنکھے سے لٹک رہی ہو گی پھر باہر......... بڑے چبوترے پر چچا صاحب کا ادھڑا ہوا نیلا بدن میرا دامن تھام لے گا اور میں زندگی بھر اس حویلی سے باہر نہیں آ پاؤں گا۔

کیا کارروائی ہوئی' لاش کب گھر والوں کے حوالے کی' کب اور کیسے اسے غسل دیا گیا۔ ان سب باتوں کا مجھ کچھ پتا نہیں چلا' میں باہر بچھی دری پر بیٹھا رہا۔ پولیس آفیسر وہیں مجھ سے پوچھ گچھ کرتا رہا۔ میں نے اسے یہ قطعی نہیں بتایا کہ میں نے اس سے سونے کی زنجیر لی تھی۔ یہ بھی نہیں بتایا کہ میں نے اس کے بدن سے چمٹی ہوئی مکڑیاں بھی دیکھی تھیں اور یہ بھی چھپا گیا کہ مجھے آج شام اسے لے کر نوچندی کے میلے میں شیوا جی کے پاس جانا تھا۔ میں نے چہل قدمی کے لئے نکلنے والی فرضی کہانی سنائی تھی' اسے تڑپتا ہوا بتایا تھا۔ یہ بھی بتایا تھا کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کہہ نہیں پایا اور بس۔

میڈیکل رپورٹ حیرت انگیز طور پر تحسین خالہ' چچا صاحب اور بڑی بوا کی رپورٹ سے مماثل تھی۔ یہ بھی خیال تھا کہ اب اس کیس کے چکر میں پچھلی دبی ہوئی فائلیں بھی نکال لی جائیں گی مگر ان کا بھی وہی حشر ہونا تھا جو پچھلی فائلوں کا ہو چکا تھا۔ اس لئے اس طرف سے مجھے کوئی تشویش نہیں تھی۔ مجھے افسوس تھا' میں صدمے سے نڈھال تھا' میں مبشر کے کھو جانے سے بھی دل برداشتہ تھا۔ میں کچھ باتوں کے راز میں رہ جانے پر بے چین بھی تھا۔ میں دوسری زنجیر پا کر خوفزدہ بھی تھا' اس مکڑی یا مکڑیوں کی تازہ کارروائی نے میرے ذہن میں بہت سے خدشوں کو جنم دیا تھا اور پریشانی لحہ بہ لحہ بڑھ رہی تھی۔ میں دادا کی وجہ سے بھی پریشان تھا۔ یہ فیصلہ کرنا میرے لئے مشکل ہو گیا تھا کہ مجھے شیوا جی سے ملنا چاہئے یا میں واپس دہلی پہنچ کر دادا کو اس نئی صورت حال سے آگاہ کروں۔ پھر شالی بابا نے مجھے چلتے چلتے کہا کہ میں تمہیں ملوں گا۔ مگر کہاں......... کب' کیسے' یہ سب جواب میرے پاس نہیں تھے۔ اب دوپہر ہو چکی تھی اور شام بھی یہیں ہونے والی تھی۔

میلہ نوچندی کب اور کیسے جانا؟ یہ الجھن تھی کہ اچانک مجھے ایک بچے نے متوجہ کر لیا۔

"سنئے! آپ کو بی جان بلا رہی ہیں۔"

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے گھر کی طرف اشارہ کیا۔ میں اسی طرف بڑھ گیا۔ بی جان دروازے کی اوٹ میں تھیں۔

"ضیاء.........! میرا خیال ہے چلنا چاہئے۔ میں رات کا کھانا بھجوانا چاہتی ہوں۔"

میں نے غنیمت جانا اور تانگے کے انتظام کے لئے چل دیا۔ وہاں کافی تانگے کھڑے تھے۔ محلے کے کئی لوگ مجھے پہچان چکے تھے۔ میں نے ان سب سے وعدہ تو کر لیا تھا کہ ضرورت آؤں گا مگر مجھے لگ رہا تھا کہ میں ایک بھی وعدہ ایفا نہ کر پاؤں گا۔ میں کچھ ہی دیر بعد بی جان' کاکا جان اور فرحت وغیرہ کو لئے بی جان کے گھر لوٹ آیا۔ منشی کی بیوی' نزہت اور کاکا جان کھانا بنانے کے کام میں مصروف ہو گئیں۔ میں بی جان کو لے کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ ان کا چہرہ بھی فق تھا۔

"اب کیا ہو گا ضیا؟" انہوں نے خوفزدہ انداز میں پوچھا۔

"میں خود پریشان ہوں بی جان' پتا نہیں دادا نے شیوا جی سے ملنے کی تاکید کیوں کی تھی۔ اب سوچتا ہوں دادا کو جا کر سب بات بتاؤں یا شیوا جی سے ملوں۔"

میرے خیال میں شیوا جی سے تمہاری آج ملاقات یقینی نہیں ہے۔ وہاں بہت رش ہوتا ہے۔ ضروری نہیں کہ ان سے مل ہی لو۔ اس کے لئے تمہیں ایک دو دن مزید لگ سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں دادا کے پاس جانا چاہئے' تم نے کہا تھا ناں کہ شالی بابا ان سے وہاں ملیں گے۔ تم انہی سے بات کرنا یا پھر دو چار دن کو آؤ تو شیوا جی سے ملو۔"

"بی جان! کیا آپ لوگ میرے ساتھ دہلی چلیں گی؟" میں نے پوچھا۔

ان کی آنکھوں میں بے بسی نظر آئی۔ وہ کسی بچے کی طرح خوفزدہ تھیں اور ملتجی بھی مگر کہہ نہیں پا رہی تھیں۔ اسی لئے میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ آپ لوگ ابھی یہاں نہ رہیں۔ میرے ساتھ ہی چلیں۔ پھر حالات دیکھ کر کوئی فیصلہ کریں گے۔ میں آج ہی ٹکٹ لے لیتا ہوں۔ مجھے دادا کی فکر ہے۔"

"ٹھیک ہے' سچی بات تو یہ ہے ضیاء کہ......... ان حالات میں......... میں خود........."

"میں جانتا ہوں........." میں نے ان کا ہاتھ تھپتھپایا۔

☆------------☆------------☆

میں نے اگلے روز ہی دہلی جانے کا پروگرام بنا لیا تھا۔ میں یوں بھی ہراساں تھا کہ اس واقعے سے جو پرانی باتیں تازہ ہوئیں تھیں تو یہاں میرے لئے مشکلات کھڑی ہو گئی تھیں۔ میں اب اتنا فارغ بھی نہیں تھا کہ یہاں ملنے ملانے اور باتیں کرنے میں وقت ضائع کرتا پھر دادا کی فکر نے مجھے زیادہ ہراساں کیا تھا۔ رات کو بھی مجھ سے کچھ لوگ ملنے آئے۔ وہی باتیں 'پُراسرار گھڑیوں کے قصے' 'دہی ابا کی موت پر قیاس آرائیاں' غمگین خالہ اور بڑی بوا کا ذکر' چچا صاحب کی موت پر تاسف' میں الجھ گیا۔ رات گئے کسی طرح میری جان بخشی گئی۔ میں نے بی جان وغیرہ کو تیاری کا کہہ دیا۔ بی جان گھر منشی اور ان کی بیوی کے حوالے کر کے جائیں۔ میں شام ہی کو جا کر ٹکٹ لے آیا تھا' پھر رات کو مبشر کے گھر کھانا پہنچا کر وہاں کچھ دیر رک کر لوٹ آیا تھا۔

☆------------☆------------☆

اگلی صبح ہم دہلی کے لئے روانہ ہو گئے۔ اس بار سفر خیریت سے گزرا۔ ٹرین میں بیٹھنے کے بعد ہی سے میں چوکنا تھا۔ بی جی جان' کاکا جان اور فرحت کی وجہ سے پریشان بھی تھا۔ چند گھنٹوں کے سفر کے بعد ہم دہلی پہنچ گئے۔ گھر پہنچتے ہی میں نے سب سے پہلے دادا کی خیریت دریافت کی۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ ٹھیک تھے۔ میں سیدھا ان کے پاس پہنچا۔ ایک بات یاد دلا دوں کہ وہ دونوں زنجیریں اور شالی بابا کا دیا ہوا پتھر میں نے بڑی احتیاط سے جیب میں رکھا تھا اور اس طرف سے پوری طرح محتاط بھی تھا کہ کہیں ضائع نہ ہو جائے۔ دادا پہلے سے کمزور لگے۔ دو دن میں ہی ان کے چہرے کی زردی بڑھ گئی تھی۔ آنکھوں کے گرد پڑے حلقے اور گہرے اور سیاہ ہو گئے تھے۔ مگر ان کی آنکھوں میں وہ بے رونقی نہ تھی جو میں جانے سے پہلے دیکھ چکا تھا۔

کاکا جان' بی جان اور فرحت کو دیکھ کر اماں اور عصمت آپا خوش ہو گئی تھیں۔ میں نے بی جان سے کہہ دیا تھا کہ فوری طور پر مبشر والے واقعے کا ذکر نہ کریں ورنہ اماں بہت پریشان ہو جائیں گی۔ فرحت کو بھی سمجھا دیا تھا مگر ان تینوں کے چہرے پر کھنڈا خوف اماں کو نظر آ گیا تھا۔ میں آپ کو بتا رہا تھا کہ میں سیدھا دادا کے پاس پہنچا' وہ میری آمد پر کھل اٹھے۔

"ضیاء..........! میرے بچے! شکر ہے کہ تم خیریت سے آ گئے۔ میں بہت پریشان تھا۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ "شالی بابا اور شیوا جی سے ملاقات ہوئی؟" انہوں نے بے چینی سے پوچھا۔

میں نے انہیں پوری تفصیل سے آگاہ کیا۔ میں اب زنجیروں کے بارے میں بھی ان سے کچھ چھپانا نہیں چاہتا تھا اس لئے میں نے مبشر والے واقعے کا ذکر بھی تفصیل سے کیا۔ اس دوران میں دادا سکتے کی سی کیفیت میں بیٹھے' سب کچھ سنتے رہے' ان کا چہرہ سپاٹ تھا۔ میں اندازہ نہیں لگا سکا کہ اس واقعے سے متعلق وہ کیا سوچ رہے ہیں۔ جب میں سب کچھ بتا چکا تو میں نے وہ دونوں زنجیریں اور پتھر نکال کر ان کے سامنے رکھ دیا۔ وہ حیرت سے دونوں زنجیروں کو دیکھتے رہے۔

"یہ تو.......... دونوں ایک سی ہیں۔" ان کی ڈوبی ڈوبی سی آواز آئی۔

"جی دادا..........! میرا خیال ہے کہ اب یہ معاملہ زیادہ گمبھیر ہو گیا ہے۔ میں خود حیران ہوں کہ یہ دوسری زنجیر کہاں سے آ گئی اور مبشر کو کہاں سے ملی' وہ مجھ سے کیا کہنا چاہتا تھا۔"

"جو تمہارے پاس تھی' وہ کون سی ہے؟" دادا نے ان دونوں زنجیروں کو ہتھیلی پر رکھ کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"یہی تو غلطی ہوئی دادا..........! اس وقت مبشر دروازے پر آیا تھا' زنجیر اور پتھر میری دائیں جیب میں تھا اور جب مبشر نے مجھے وہ زنجیر دی تو میں اسے دیکھ کر حیران ہوا مگر وہ وقت بہت خطرناک تھا۔ میرے چاروں طرف کچھ فاصلے پر لوگ چیخوں کی آواز سن کر دروازوں اور کھڑکیوں میں موجود تھے بلکہ کچھ لوگ تو باہر بھی آ گئے تھے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ان کی نگاہ میں وہ زنجیر آئے۔ مجھے یقین تھا کہ مبشر اب چند لمحوں کا مہمان ہے۔ اگر وہ لوگ دیکھ لیتے کہ میں نے اس سے یہ زنجیر لی ہے تو میں پولیس کے چکر میں پڑ سکتا تھا اس لئے اس کے زخمی ہاتھ پر اس زنجیر کو دیکھ کر میں قطعی یہ نہ جان سکا کہ یہ دوسری زنجیر ہے۔ میں نے جھپٹ کر وہ اس کے ہاتھ سے لے لی اور بے خیالی میں اپنی جیب میں ڈال لی جس میں پتھر اور وہ پہلی زنجیر تھی۔ بعد میں دیکھا تو ان میں امتیاز کرنا ممکن نہ تھا۔"

"اوہ..........! خدا جانے یہ کیا چکر ہے؟ کاش! مبشر تمہیں کچھ بتا پاتا۔" دادا پر خاموشی طاری ہو گئی۔

وہ شالی بابا سے تفصیلی ملاقات نہ ہونے پر بھی پریشان تھے مگر اس پتھر کے بارے میں انہوں نے مجھے بہت احتیاط برتنے کی ہدایت کی تھی بلکہ انہوں نے کہا تھا۔ ''اسے کپڑے کی کترن میں لپیٹ کر بازو پر باندھ لو تاکہ اس کے کھو جانے یا ضائع ہو جانے کا اندیشہ نہ رہے۔''

''دادا! آپ نے شیوا جی سے ملاقات کا کیوں کہا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ ایسے بہت سے چکروں سے واقف ہے' میرا خیال ہے کہ ہمارے گھر پر کسی نے سفلی عمل کروایا ہے' ممکن ہے یہ زنجیر ہی اس عمل کا حصہ ہو۔ وہ سفلی عمل کا توڑ جانتا ہے۔''

''اور شالی بابا؟''

''ان سے بھی میں مدد چاہتا تھا۔ میں پچھلی بار ان سے مل کر آیا تھا۔ جب ستارہ اور شاہانہ ایسے حادثے کا شکار ہوئی تھیں۔ تبھی انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ عطا کسی سے ایک زنجیر لایا تھا' جو تم نے اپنے بچپنے کی وجہ سے چھپا دی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ پہلے وہ زنجیر تلاش کرو۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ تم بہت خطرے میں ہو۔ عطا تو اس عجیب و غریب چکر میں پھنس کر موت کا شکار ہو گیا مگر تم......... تم پر اس سے بھی زیادہ خطرات چھائے ہیں۔ انہوں نے ہی کہا تھا اگر ضیاء مجھ سے مل لے تو شاید میں اس کی مدد کر سکوں۔''

''اور وہ انگریز؟'' میں سخت متجسس تھا۔

''ہاں' وہ اس زنجیر کا مطالبہ کر رہا ہے' وہ کہتا ہے اگر یہ زنجیر اسے نہ ملی' اسے اس کے ٹھکانے پر نہیں پہنچایا تو جس عذاب سے وہ اور اس کے بقول دوسرے ساتھی دوچار ہیں' انہی سے ہم بھی دوچار ہو سکتے ہیں اور بیٹا ضیاء......... اس کی بہت بری حالت ہے۔ جس جسمانی' قلبی اور روحانی تکلیف سے وہ دوچار ہے تم اس کا تصور تک نہیں کر سکتے۔''

''اس زنجیر کا اصل ٹھکانہ کیا ہے؟''

''پتا نہیں۔ یہ اس نے نہیں بتایا مگر میرا خیال ہے وہ اسے ملک سے باہر لے جانا چاہتا ہے۔ وہ کہتا ہے سب سے زیادہ اذیت ایلن کو ہے۔''

ایلن کا ذکر سن کر میں سناٹے میں رہ گیا۔ اب مجھے ٹرین میں اس انگریز لڑکی سے ملاقات یاد آ گئی مگر میں نے نہ اس کا ذکر دادا سے کیا اور نہ اپنے خواب کا' وجہ صرف یہ

تھی کہ وہ پھر میری طرف سے اور زیادہ پریشان ہو جاتے۔ ابھی تو اس بات سے تھوڑی بہت ڈھارس بندھی ہوئی تھی کہ اس خوفناک سلسلے سے ہماری اور ہمارے خاندان کی جان چھوٹی ہوئی ہے مگر میں تو یہ نہیں جانتا تھا کہ اس لڑکی کا نام کیا تھا جو ٹرین میں ملی تھی۔ اگر میں اسے دیکھ کر حواس باختہ نہ ہوتا تو شاید میں اس کا نام پوچھ لیتا مگر میری تو حالت ہی غیر ہو گئی تھی۔

''اب کیا آپ یہ زنجیر رابرٹ کو دینا چاہتے ہیں؟''

''سمجھ میں نہیں آ رہا۔ وہ ایک زنجیر کا طالب ہے اور......... یہ دو بن چکی ہیں۔ تمہارے خیال میں اسے دونوں دے دینا چاہئیں؟ اگر ہم اسے ایک دیتے ہیں تو پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم یہ کیسے جان پائیں گے وہ کون سی ہے جسے تم نے چرایا تھا اور دوسری بات یہ کہ کیا دوسری کی ہمارے پاس موجودگی پھر کسی نئے خوفناک سلسلے کا آغاز تو نہیں بن جائے گی۔''

''کیا زنجیر رابرٹ کو دینے کے بعد ہمارے مسائل ختم ہو جائیں گے؟'' میں نے ان کے سوال کا جواب دیئے بغیر پوچھا۔

''اس کا کہنا تو یہی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کی واپسی سے اس کے چار ساتھیوں کے علاوہ ہم سب کی جانوں کے عذاب بھی ختم ہو سکتے ہیں۔''

''پھر یہ اسے دے دیں۔''

''تم خود جا کر اس سے ملو۔ وہ بمبئی میں ہے۔''

''میں دو چار دن بعد وہاں جا پاؤں گا لیکن اب آپ فکر نہ کریں۔ میرا خیال ہے کہ میں اس معاملے کو جلد نمٹا دوں گا۔'' میں نے انہیں تسلی دی۔

''شالی بابا سے تمہاری ملاقات کیسے ہو گی؟'' دادا نے لیٹتے ہوئے پوچھا۔

''پتا نہیں دادا انہوں نے یہ سب تو مجھے نہیں بتایا تھا' صرف اتنا کہا کہ وہ مجھ سے پھر ملیں گے۔''

پھر ہم مبشر کی موت کے سلسلے میں باتیں کرتے رہے۔ میں نے دادا کو بتایا کہ میں چاہنے کے باوجود اپنے گھر نہیں جا سکا۔ دادا خود بھی نہیں چاہتے تھے کہ میں ایسا کوئی قدم اٹھاؤں۔ ابھی ہم گفتگو کر رہے تھے کہ کاکا جان' بی جان اور فرحت چلی آئیں۔ دادا ان لوگوں سے بہت محبت سے ملے۔ فرحت کو انہوں نے اپنے قریب بٹھا کر پیار کیا' پھر ان لوگوں

کے جانے کے بعد مجھ سے بولے۔

"ضیاء! پتا نہیں کیوں' میں خود کو فرحت کا مجرم محسوس کرتا ہوں۔ نہ عطا نے یہ حرکت کی ہوتی' نہ تم وہ زنجیر نکالتے اور نہ ہی تحسین اسے تنہا چھوڑ کر جاتی۔"

میں نے ان سے نگاہیں چرا لیں۔ مجھے لگا جیسے وہ خود کو مجرم محسوس کرنے کی بات مجھ میں احساس جرم پیدا کرنے کو کر رہے ہوں۔ میں نے اس جرم کے اعتراف میں قطعی حجاب محسوس نہیں کیا اور کہا۔ "دادا! حالانکہ یہ احساس جرم مجھ میں ہونا چاہئے تھا۔ اصل مجرم تو میں ہوں۔"

"فرحت اکیلی ہے' بی جان یا کاکا جان کی پناہ تو بھربھری دیوار ہے بیٹا' میں نے چاہا تھا کہ رضا اور شجاع تیار ہوں تو میں اسے یہاں لے آؤں گا مگر......... وہ دونوں انتہائی ناخلف ہیں۔ تم نے عطا کی صورت پائی ہے تو ان دونوں نے اس کی طبیعت۔"

"دادا! میں آپ کی خواہش پوری کرنے کو تیار ہوں۔" میں نے بلا جھجک کہہ دیا۔

"فرحت اچھی لڑکی ہے۔ بی جان اور کاکا جان بھی اس کے لئے پریشان ہیں مگر میں نہیں جانتا کہ اماں اور عصمت آپا کے علاوہ داری........."

"ان سب کو چھوڑو اگر کسی کو کسی کی مشکل کا احساس نہ ہو تو اس مشکل کے حل سے کترایا نہیں جا سکتا۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ تم حساس بھی ہو اور ذمے دار بھی۔ میں نے کبھی تمہیں ایسا نہیں سمجھا تھا۔ میرا خیال تھا کہ تم بھی لاڈ میں بگڑ چکے ہو گے۔ میں آج ہی تمہاری اماں اور دادی سے بات کرتا ہوں۔" وہ میری بات سن کر بہت خوش ہو گئے تھے۔

میں ان سے اجازت لے کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ دادا نے دونوں زنجیریں مجھے دے دی تھیں اور چلتے ہوئے پھر تاکید کی تھی کہ شالی بابا کا دیا ہوا پتھر میں فی الفور موم جامہ کر کے باندھ لوں۔ میں انہیں اچھا تو کہہ آیا تھا مگر اسے بازو پر باندھنے یا گلے میں پہن لینے والی تجویز سے متفق نہیں تھا۔ ہاں' جیب میں رکھنا یا سوٹ کیس کی جیب میں ڈالے رہنا میرے لئے ممکن تھا۔ میں نے یہ کیا کہ اپنے والٹ میں اندر کی جیب میں رکھ دیا۔ اس والٹ میں میرے ضروری کاغذات ہوا کرتے تھے اس لئے یہ ہمیشہ میرے ساتھ ہی ہوتا تھا۔

مجھے ایک اسائنمنٹ تیار کرنا تھا جسے میں ادھورا چھوڑ کر میرٹھ چلا گیا تھا۔ آج

رات میں اس کو تیار کرنا چاہتا تھا۔ شام کا کافی وقت میں نے اماں' بی جان اور فرحت وغیرہ کے ساتھ گزارا۔ بی جان نے اماں سے مبشر کی موت کا واقعہ چھپا لیا تھا۔ فرحت یہاں آ کر اتنی خوفزدہ تو نہیں تھی جتنی میرٹھ میں تھی مگر خوف ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ میں نے کئی بار محسوس کیا وہ کن انکھیوں سے مجھے دیکھ رہی ہے۔ اس کی نگاہوں کا تاسف اور ان میں منڈلاتے اندیشے مجھے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ میں جانتا تھا کہ وہ کیا محسوس کر رہی ہے۔ مبشر والا واقعہ نہ ہوا ہوتا تو اچھا تھا۔ سارے زخم اس حادثے نے ہرے کئے تھے۔

میرے پاس ایک ہینڈ بیگ تھا جس میں' میں اکثر اپنے ضروری کاغذات رکھا کرتا تھا۔ خاص طور پر اپنے آفس سے متعلق کاغذات' جس جگہ اور جس چیز پر ریسرچ کرتے تھے' اپنی مکمل تیاری تک ہمیں بڑی احتیاط سے رکھنا پڑتا تھا اور یہ تیاری کبھی کبھی سالوں پر محیط ہو جایا کرتی تھی۔ اس ہینڈ بیگ میں دو خفیہ خانے بھی تھے۔

یہ بیگ مجھے آفس کی جانب سے ملا تھا۔ بظاہر دیکھنے میں ایک درمیانے سائز کا بیگ تھا مگر اس کے اندر کافی گنجائش تھی۔ یہ بیگ بھی اکثر و بیشتر میرے ساتھ ہوا کرتا تھا۔ میں نے اپنے کمرے میں جاتے ہی وہ دونوں زنجیریں اس بیگ کے خفیہ خانے میں رکھ دیں اور ڈائری نکال کر اپنے کام کی تفصیلات کا جائزہ لینے لگا۔ ڈائری کے اوراق پلٹے تو رابرٹ کا ایڈریس سامنے آ گیا۔ اسے میں نے اس دوسری ڈائری میں نوٹ کیا جس میں' میں بچپن سے لے کر آج تک اور اپنے خوابوں کی تفصیل لکھ چکا تھا مگر میرٹھ جاتے ہوئے ٹرین میں ہونے والا واقعہ اور مبشر کی ہیبت ناک موت کی تفصیل میں ابھی تک نہیں اتار پایا تھا' بے اختیار سب کام چھوڑ کر میں نے تفصیلات نوٹ کرنا شروع کر دیں۔ شالی بابا سے ملاقات اور پتھر دینے کا ذکر کرنے کے ساتھ ہی میں نے اس پتھر میں محسوس ہونے والی وہ انوکھی بات بھی تحریر کر دی۔

بہت رات بیت گئی تھی۔ میں نے اس کام سے فارغ ہو کر کچھ دیر تک آفس کا کام کیا۔ مجھے صبح آفس جانا تھا۔ تھکن اور نیند نے بہت جلد مجھے کام سمیٹنے پر اکسانا شروع کر دیا۔ میں کاغذات سمیٹ کر بیگ میں رکھنے کے بعد سونے کے لئے لیٹ گیا۔ جلد ہی مجھے نیند بھی آ گئی۔ شاید آدھی رات کا وقت تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں کسی آواز کو سن کر جاگا ہوں۔ میں چند لمحے اپنے بستر پر پڑا رہا پھر اچانک مجھے اماں اور دادی وغیرہ کے چیخنے کی آواز سنائی دی۔ وہ زور زور سے باتیں کر رہی تھیں۔ رات کے سناٹے میں مجھے ان کی آوازیں

صاف سنائی دے رہی تھیں۔ ابھی میں نیند کے غلبے سے پوری طرح چھٹکارا نہیں پا سکا تھا اور ان آوازوں کا مطلب جاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ اچانک دروازے کے قریب عصمت آپا کے چیخنے کی آواز آئی اور دھڑ سے میرے کمرے کا دروازہ کھل گیا۔

"ضیاء جی! وہ... وہ دادا........"

عصمت آپا کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ بری طرح بوکھلائی ہوئی اندر داخل ہوئی تھیں۔ پھر اس سے پہلے کہ میں بستر سے اترتا وہ اسی تیزی سے باہر کی طرف بھاگیں۔ میں بستر سے چھلانگ لگا کر ننگے پیر ہی دادا کے کمرے کی طرف بھاگا تھا۔ کمرے کے باہر دیوار سے ٹیک لگائے فرحت رو رہی تھی۔ کاکا جان اور بی جان ایک دوسرے کو تھامے چیخ رہی تھیں۔ اماں دروازے کو دھڑ دھڑا رہی تھیں۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ دادا کا کمرا اندر سے بند تھا' دادی بھی دروازے کو پیٹ پیٹ کر چیخ رہی تھیں۔

"کیا ہوا........؟ کیا ہو گیا اماں؟" میں نے دروازے کو دھکا دیتے ہوئے پوچھا۔

"بابا صاحب چیخے تھے۔" اماں نے روتے ہوئے کہا۔ "یہ دروازہ کیسے بند ہو گیا؟ ابھی تو کھلا ہوا تھا۔"

میں نے دو قدم دور جا کر اپنے کندھے سے دروازے پر زوردار دھکا دیا۔ وہ چرچرا گیا مگر کھلا نہیں۔ میں نے دادا کو پکارا۔ اندر سے کوئی آواز نہ آئی۔ میرا دل حلق میں دھڑک رہا تھا۔ میں نے اماں اور دادی کو وہاں سے ہٹا دیا۔ اب بی جان اور کاکا جان بھی اپنی چیخوں پر قابو پا چکی تھیں مگر رو اب بھی رہی تھیں۔ عصمت آپا بھی دروازے پر زور لگا رہی تھیں۔ میں حیران تھا۔ اس لئے کہ یہ دروازے اتنے مضبوط نہیں تھے پھر بھی میری پوری قوت صرف کرنے کے باوجود دروازہ نہیں کھل رہا تھا۔ میں مسلسل زور لگا رہا تھا۔ بہت جلد مجھے احساس ہو گیا کہ اب دروازہ ٹوٹنے لگا ہے۔ یہ محسوس کرتے ہی میں نے پھر اپنی پوری قوت صرف کی۔ اب وہاب چاچو بھی آ چکے تھے۔ وہ غالباً اوپر کی منزل پر تھے یا پتا نہیں اب تک کہاں تھے؟ یہ وقت کچھ پوچھنے کا نہیں تھا' میرے اور ان کے بیک وقت دھکا دینے سے دروازہ زوردار آواز کے ساتھ اندر کی جانب گر پڑا۔

دادا اپنے بستر پر ساکت پڑے تھے۔ ان کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ ان آنکھوں میں بلا کی وحشت تھی' جیسے انہوں نے کوئی خوفناک چیز دیکھ لی ہو۔ میں اور میرے ساتھ وہاب چاچو ان پر جھک گئے۔ ان کی سانس بہت مدھم تھی۔ پہلی نظر میں تو یوں لگا تھا جیسے

وہ گزر چکے ہوں۔ میں نے پلٹ کر سب کو باہر جانے کے لئے کہا مگر دادی نے میری بات نہیں سنی تھی۔ وہ دادا کے قریب آ کر ان سے لپٹ گئیں۔ اس لمحے مجھے یوں لگا جیسے دادا کے بدن کو زوردار جھٹکا لگا ہو۔ میں نے دادی کو ہٹاتے ہوئے چیخ کر وہاب چاچو سے کہا کہ وہ پچھلی گلی سے ڈاکٹر سکندر کو بلا لائیں۔ وہ الٹے قدموں باہر بھاگ کھڑے ہوئے۔ اب دادا نے آنکھیں دھیرے دھیرے موند لی تھیں۔ میں نے دادی کو کھینچ کر ان سے علیحدہ کیا اور اماں سے کہا کہ وہ دادی کو لے جائیں۔ اماں انہیں زبردستی گھسیٹتی ہوئی باہر لے گئیں۔ میں دادا پر جھک گیا۔

"دادا........! دادا جی........! آپ ٹھیک ہیں ناں! دادا جی........!"

انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن شاید ان کا تنفس بحال ہو رہا تھا۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے گہرے سانس لینے شروع کر دیے۔ اماں پانی کا گلاس اور چمچہ لے آئی تھیں۔ میں نے چمچے سے ان کے حلق میں پانی ٹپکایا۔ ان کے ہونٹوں پر پپڑیاں سی جمی ہوئی تھیں۔ اتنی دیر میں چاچو ڈاکٹر کو لے آئے۔ ڈاکٹر سکندر نے فوراً ہی ان کا معائنہ کیا' فوری طور پر ایک انجکشن لگایا۔ پانی سے بھیگا ہوا تولیہ منگوایا اور اس تولیے سے ان کا چہرہ اور گردن پونچھتے رہے۔ بار بار پانی ہونٹوں پر ٹپکاتے رہے۔ وہ بڑے غور سے دادا کے چہرے کو دیکھ رہے تھے۔ ایک ہاتھ ان کی نبض پر تھا۔ میں کبھی دادا کو اور کبھی ڈاکٹر سکندر کو دیکھ رہا تھا۔ ان کے چہرے پر تشویش تھی۔ دادا کا چہرہ دھیرے دھیرے سفید پڑتا جا رہا تھا اور اسی رفتار سے ڈاکٹر سکندر کے چہرے پر پھیلی مایوسی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ میں بے چین ہو رہا تھا۔ مجھے ڈر لگ رہا تھا۔ میں دادا سے پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ کیا محسوس کر رہے ہیں۔ انہوں نے کیا دیکھا تھا؟ وہ کیوں چیخے تھے مگر میں بالکل بے بس تھا۔

اچانک ڈاکٹر سکندر بے چین ہو کر کھڑے ہو گئے پھر انہوں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے دادا کے سینے کو جھٹکے دینے شروع کر دیے۔ اس کا مطلب تھا کہ دادا کا دل بند ہو رہا تھا۔ اماں' دادی اور باقی تمام لوگ ابھی تک دروازے پر کھڑے اندر جھانک رہے تھے۔ دادی کی حالت بہت خراب تھی' میں نے جلکر انہیں اپنی بانہوں میں بھینچ لیا۔

"دادی! خدا سے دعا کریں۔ دعا کریں اماں........! دعا کریں۔" میں چیخ رہا تھا۔ میری طبیعت کی تمام بے چینی میری آواز میں گھل گئی تھی۔ اماں نے روتے ہوئے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا دیے۔ دادی برآمدے میں رکھے چھوٹے تخت پر سجدہ ریز ہو گئیں۔ میں

پلٹ کر واپس کمرے میں آیا تو ڈاکٹر سکندر کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ دیکھ کر چونک اٹھا۔ دادا' جن کا تنفس ڈوب رہا تھا' اب پھر گہرے گہرے سانس لے رہے تھے۔

"پلیز! انہیں فوری طور پر ہسپتال لے جائیں۔ میں گاڑی لاتا ہوں۔ آپ تیار کریں۔" ڈاکٹر سکندر یہ کہہ کر تیزی سے باہر چلے گئے۔ میں نے اماں وغیرہ کو خوشخبری سنائی۔ منے دادا کا گھر یہاں سے دور نہیں تھا مگر انہیں اس وقت کون اطلاع دیتا۔ میں دادا کو چھوڑ کر کہیں نہیں جانا چاہتا تھا اور وہاب چاچو بھی انہیں چھوڑنے کو تیار نہ تھے۔

"وہاب بیٹا! منے کو بلاؤ۔" دادی جو اب رو رہی تھیں۔ پکار اٹھیں۔

میں نے اور اماں نے دادا کی ضروری چیزیں سمیٹیں جن میں روزمرہ کی دوائیں' چپل ایک جوڑی کپڑے اور کچھ دوسری چیزیں تھیں۔ میرا خیال تھا کہ شاید دادا کو ہسپتال میں داخل کر لیا جائے۔ گھر والوں کے چہروں پر اب قدرے اطمینان تھا ورنہ اس سے قبل ان کے چہرے انہی واقعات کی وجہ سے خوف سے مسخ ہو رہے تھے۔ دادا کی آنکھیں میں نے دیکھی تھیں۔ میں حیران تھا کہ دروازہ کس نے بند کیا تھا کیونکہ وہ کبھی دروازہ بند کر کے نہیں سوتے تھے' باقی لوگ شاید ان باتوں کی طرف دھیان نہیں دے پائے تھے۔ میں پریشان تھا' مجھے احساس ہو رہا تھا کہ شاید اب دادا کو زیادہ مہلت نہ ملے اور میں عجلت میں تھا۔ میں ان سے پوچھنا چاہتا تھا۔ مجھے خوف تھا کہ کہیں وہ بھی مبشر کی طرح کچھ بتائے بغیر ہی آنکھیں بند نہ کر لیں۔ مجھے یقین تھا کہ کوئی نہ کوئی بات ہوئی ہے' میں نے انہیں سونے سے قبل جس حالت میں چھوڑا تھا وہ قدرے اطمینان بخش تھی۔

چند لمحوں بعد وہاب چاچو کے ساتھ طاہر بھائی (جو منے دادا کی حیثیت سے تو میرے چچا تھے مگر زہرہ آپا سے شادی کے بعد میرے بہنوئی بن گئے تھے) اور منے دادا کے ساتھ منی دادی بھی روتی ہوئی آ پہنچیں۔ ڈاکٹر سکندر بھی عین اسی وقت آ گئے۔ ہم چند ہی لمحوں بعد دادا کو لے کر قریبی سرکاری ہسپتال پہنچ گئے۔ ڈاکٹروں نے مکمل معائنے کے بعد ان کی ذہنی حالت کو مفلوج قرار دے دیا۔ مکمل طور پر آرام اور علاج کی غرض سے انہیں داخل کر لیا گیا۔ ڈاکٹرز کا کہنا تھا کہ کسی صدمے یا خوف کی وجہ سے ذہنی توازن بگڑ گیا ہے۔ وہ جلد ہی نارمل ہو جائیں گے مگر اس کے لئے ضروری ہے کہ مکمل ذہنی آرام اور پرسکون نیند ملتی رہے۔ گھر والے یہ سن کر بہت پریشان ہو گئے تھے۔ پھر ان کا بلڈ پریشر بھی بہت لو ہو گیا تھا۔ جس نے ان کی صحت پر اثر ڈالا تھا۔ وہ یوں بھی بے حد کمزور اور

بوڑھے تھے' میں جانتا تھا کہ آج کل وہ کسی ذہنی انتشار کا شکار تھے۔ پھر ڈاکٹرز کی رائے سن کر مجھے یقین ہو گیا کہ میرا شک' محض شک نہیں تھا' یقیناً کوئی بات ہوئی تھی۔

جو کچھ بھی تھا' منے دادا ان کے پاس رکنے کو تیار تھے مگر میں نے انہیں منع کر دیا۔ میں ان کے قریب رہنا چاہتا تھا' میرا ان کے قریب رہنا نہایت ضروری تھا۔ میرے اصرار پر گھر کے دوسرے افراد ایک گھنٹے بعد یہ سن کر کہ اب دادا کی طبیعت بہتر ہے اور ڈاکٹر انہیں سکون آور انجکشن دے کر سلا چکے ہیں' گھر چلے گئے۔ ڈاکٹر سکندر نے اس بارے میں ہماری بہت مدد کی۔ انہی کی وجہ سے ہسپتال کے بہترین ڈاکٹرز نے دادا کا معائنہ کیا تھا۔ میں گھر والوں کے جانے کے بعد دادا کے قریب ہی بیٹھا رہا۔ دادا کا چہرہ سفید ہو رہا تھا' بہت دھیمی دھیمی سانس کے سوا ان میں زندگی کے آثار کی قطعی رمق نہ تھی۔ ساکت' کمزور جسم' چہرے پر ویرانی' ٹھنڈے ہاتھ پاؤں اور ناک اور ٹھوڑی کی زردی انہیں زندگی سے بہت دور ظاہر کر رہی تھی مگر وہ زندہ تھے۔ ڈاکٹر اپنا اطمینان کرنے کے بعد جا چکے تھے۔ میں بہت بے چین اور بہت بے بس تھا۔

میں نیند پوری نہیں کر سکا تھا۔ تھکن بھی نہیں اتری تھی۔ مگر اب نہ تھکن تھی' نہ نیند۔ دادا کے پرائیویٹ روم میں ایک بیڈ اور تھا مگر پریشانی میں اس روز میں نے پہلی بار سگریٹ پیا' میں کھڑکی میں آ کر کھڑا ہوا' باہر ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ دور تک لان پھیلا ہوا تھا' جس میں کھلے خوبصورت پھول چاندنی میں چمکتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ جہاں لان ختم ہوتا تھا وہاں گیٹ تھا اور گیٹ کے بالکل برابر میں ہسپتال کا میڈیکل سٹور تھا جس کا ایک دروازہ اندر کی طرف اور دوسرا دروازہ باہر کی طرف تھا۔ میں نے پلٹ کر دادا کی طرف دیکھا۔ وہ بے خبر تھے۔ میں دھیرے سے کمرے سے باہر آ گیا۔ بے وجہ ہی گیٹ کی طرف بڑھا۔ میڈیکل اسٹور کے پاس جا کر کھڑا ہوا تو وہاں کچھ فاصلے پر ایک پان کا کیبن کھلا ہوا تھا۔ وہاں جا کر سگریٹ خریدا اور واپس کمرے میں آ گیا۔ اگر مجھے دادا کو دیے گئے خواب آور انجکشن کا علم نہ ہوتا تو شاید میں اس کمرے میں کبھی سگریٹ نہ پیتا' مگر اس وقت میں نے بے دھڑک سگریٹ سلگا لیا اور کھڑکی میں کھڑا ہو کر پورا سگریٹ پھونک ڈالا۔ اس دوران میرا ذہن مختلف باتیں سوچتا رہا اور میں بار بار دادا کو بھی چیک کرتا رہا۔

مجھے ڈر تھا کہ دادا کو کچھ ہو نہ جائے۔ میں نے آسمانوں کو پہلے سرمئی' سرخ اور پھر نیلیں ہوتے دیکھا مگر دادا کی نیند گہری تھی۔ خاموش اور پرسکوت ہسپتال کے چکنے فرش پر

پہلے جمعداروں کے ننگے پیروں کی مدھم آہٹ' پھر ڈاکٹرز کے بوٹوں کی چرچراہٹ اور پھر آنے والوں کے قدموں کی شور مچاتی چاپ ابھری' چہل پہل شروع ہو گئی۔ مریضوں کے اٹھنے اور برتنوں کے کھڑکنے کی آوازوں نے سارے سناٹے کو نگل لیا مگر دادا سوتے رہے۔ ڈاکٹرز راؤنڈ پر نکلے ہوئے تھے۔ میں کئی بار ڈیوٹی روم کے چکر لگا آیا۔ اسٹاف نرس نے مجھے ہر بار تسلی دے کر لوٹا دیا کہ میں اپنے کمرے ہی میں ڈاکٹرز کا انتظار کروں۔ میری بے چینی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ میں' جس نے کبھی سگریٹ نہیں پیا تھا' سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہا تھا۔ جانے کتنا وقت گزر گیا تھا' یا ممکن ہے وقت ٹھہر گیا ہو کیونکہ مجھے اچانک وہ قدموں کی چاپ' وہ چہل پہل' وہ باتیں کرنے کی آوازیں سب معدوم ہوتی محسوس ہوئیں جیسے سب کچھ ختم ہو گیا ہو۔ میں نے حیرت سے کھڑکی سے باہر جھانکا' باہر کاری ڈور ویران تھا' لان سنسان تھا' یہاں تک کہ یہاں سے نظر آنے والے بیرونی گیٹ تک جانے والا راستہ' جہاں لوگ کچھ دیر پہلے آ جا رہے تھے' بالکل تنہا تھا اور کھلے ہوئے گیٹ کے باہر بھی بلا کی ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ بے پناہ مصروف سڑک بالکل ویران تھی۔ ہوا تھم چکی تھی۔ اونچے اونچے درخت ساکت تھے۔ میں گھبرا کر پلٹا' دادا کے قریب آیا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ان کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔

"دادا!" میں ان پر جھک گیا۔ ان کے چہرے پر نرم شفیق سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"دادا! آپ کیسے ہیں؟" میں نے سینے پر رکھا ان کا ہاتھ محبت سے اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔

"بہت سکون ہے ضیاء!"

وہ بولے تو ان کے انداز یا لہجے میں قطعی نقاہت نہیں تھی۔ وہ بالکل صحت مند لگ رہے تھے۔ میں پاس پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میری نگاہیں ان کی آنکھوں کے اندر لہریں لیتے سکون کو صاف دیکھ رہی تھیں۔ میں نے ایسا سکون' ایسی طمانیت اور اس قدر امن اس سے پہلے کسی آنکھ میں نہیں دیکھا تھا۔

"دادا..........! کیا ہو گیا تھا؟" میں نے وقت ضائع کئے بغیر سوال کر لیا۔

"کیا؟"

وہ چونکے۔ میں نے ان کی آنکھوں کی پُرسکون کیفیت میں ایسی ہلچل محسوس کی جیسے کسی نے ٹھہرے پانی کی جھیل میں کوئی کنکر اچھال دیا ہو۔ بے چینی کی لہریں سی اٹھیں اور دور دور تک پھیل گئیں۔ پھر یوں لگا جیسے انہیں کچھ یاد آ گیا ہو۔ وہ ایک دم دہشت زدہ ہو

گئے۔ میں ان پر مزید جھک گیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اب مجھ پر کوئی خوفناک انکشاف ہونے والا ہے۔ دادا کچھ بتانے والے ہیں مگر آواز نہ آئی۔ ہاں' ان کی آنکھوں کے اندر مجھے بکھراں صحرا سا لہراتا ضرور دکھائی دیا اور پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس صحرا میں لاکھوں سنہری کنکریاں رینگنے لگیں۔ میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ مجھے یوں لگا جیسے جو کچھ دادا نے دیکھا تھا' مجھے بالکل وہی نظر آ رہا ہے۔

اس صحرا میں جھومتا وہ شخص جانے کس کونے سے نکل کر میرے عین سامنے آ گیا تھا۔ اس کے لمبے لمبے بال لٹوں کی شکل میں ہوا میں اڑ رہے تھے۔ چاروں طرف اڑتی اس دھول میں وہ گول گول گھوم رہا تھا۔ میں اپنی بصارت کا پورا زور لگا کر اس کی صورت دیکھنے کی کوشش کرنا چاہتا تھا مگر ناکام تھا۔ روشنی اس کے چہرے پر سے یوں گزر رہی تھی جیسے کسی قید خانے میں نصب سرچ لائٹ پل بھر کو چمک کر اندھیرے کو مزید گہرے سیاہ خوفناک دھبوں میں تبدیل کرتی ہوئی گزر جاتی ہے۔ وہی ویرانی' وہی ہیبت' وہی تاریکی اور پھر اچانک اس شخص نے زمین پر گھٹنوں کے بل گر کر سر اوپر اٹھایا' حلق کے بل یوں چیخا جیسے کسی نے اسے ذبح کر دیا ہو اور ساتھ ہی میرے حلق سے چیخ نکل گئی۔ اس لئے کہ..........کہ وہ شخص جو اپنے ننگے بدن کو ایک سیاہ چادر سے ڈھانپے ہوئے تھا' جس کے بالوں کی لمبی لمبی لٹیں اس کے چہرے کو چھپائے ہوئے تھیں۔ جس کے حلق سے کربناک چیخ نکلی تھی وہ..........وہ ابا تھے۔ سر اوپر اٹھاتے ہی بالوں کی لٹوں نے ان کے چہرے کو آزاد کر دیا تھا' روشنی سے وہ چہرہ چمک اٹھا تھا اور تبھی میں نے ان کے چہرے کو ادھڑے' اور نچے ہوئے گوشت کے لوتھڑوں کی صورت میں دیکھا۔ اس کے باوجود میں پہچان گیا تھا کہ وہ ابا ہیں۔ ان کے چہرے کے کرب اور اذیت نے مجھے دہلا کر رکھ دیا تھا اور تبھی میں چیخ پڑا تھا۔

"مسٹر ضیاء..........! مسٹر ضیاء!" کوئی میرے کاندھے کو پکڑ کر زور زور سے ہلا رہا تھا۔ میں اچھل پڑا۔ وہ اسٹاف نرس تھی۔ جونہی میں نے سر گھما کر اسے دیکھا' وہ دہشت سے دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اس کے چہرے پر خوف پھیل گیا۔ خوف کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھوں میں بلا کی حیرت اور دہشت تھی۔ وہ پیچھے ہوتے ہوئے الٹے قدموں دروازے تک پہنچ گئی پھر اس تیزی سے پلٹ کر بھاگی جیسے اس نے بھوت دیکھ لیا ہو۔ میرے سر میں دھماکے ہو رہے تھے۔ میں خود بھی اس دہشت ناک منظر کے حصار میں تھا جس میں نے

ابھی ابھی دادا کی کھلی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھام لیا پھر چونک کر دادا کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھیں بند تھیں۔

"دادا......... دادا......... میں......... میں جان گیا ہوں دادا......... آپ......... آپ فکر نہ کریں۔ میں......... میں کچھ کروں گا دادا.........۔" میں نے اب پھر ان کے ہاتھ تھام کر سرگوشی کی۔

"مسٹر ضیاء؟"

اچانک مجھے پھر اپنی پشت سے ایک مردانہ آواز سنائی دی۔ میں نے دھیرے سے پلٹ کر دیکھا۔ وہ ڈاکٹر عرفان تھے۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی ان کے چہرے کے عضلات تن گئے۔ ان کی آنکھوں میں حیرت اور دہشت موجیں مارنے لگی۔

"آر یو آل رائٹ؟" انہوں نے لرزتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ مگر بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹ گئے۔

"اوہ یس! تھینک یو! آئی ایم آل رائٹ۔" میں نے تھکے تھکے انداز میں جواب دیا مگر میں حیران تھا کہ نرس کیوں بھاگی تھی اور ڈاکٹر کے چہرے پر خوف کیسا تھا۔ اس کی نگاہیں اب بھی میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ میرے چہرے پر کیا ہے؟ میں تیزی سے باتھ روم کی طرف بڑھا۔ آئینے پر نگاہ پڑتے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میری آنکھیں بالکل سرخ تھیں' جیسے ان میں خون بھرا ہوا ہو اور چہرے پر جگہ جگہ سنہرے دھبے ابھر آئے تھے۔ میں نے گھبرا کر چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ نل کھول کر منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ تولیے سے چہرے کو رگڑ ڈالا اور جان گیا کہ نرس کیوں بھاگی تھی اور ڈاکٹر دہشت زدہ کیوں تھا۔

میں تقریباً پندرہ منٹ تک چہرے کو دھوتا رہا۔ بار بار چہرے کو غور سے دیکھتا۔ مجھے خوف تھا کہ جس جگہ سنہرے دھبے ہیں وہاں سے بس اب گوشت ادھڑنے والا ہے مگر خدا کا شکر ہے پندرہ بیس منٹ کے بعد ہی میری حالت بہتر ہو گئی۔ آنکھوں کی سرخی کم ہو گئی۔ دھبے معدوم ہو گئے۔ اس دوران میں ڈاکٹر عرفان نے دوبارہ دروازہ کھٹکھٹا کر میری خیریت دریافت کی تھی۔ میں نے دروازہ کھولے بغیر ہی انہیں تسلی دے دی تھی۔

میں باتھ روم سے باہر آیا تو وہاں ڈاکٹر عرفان کے علاوہ تین ڈاکٹرز اور بھی تھے۔ آہٹ پر سب نے چونک کر مجھے دیکھا پھر ڈاکٹر عرفان کو دیکھا۔ ڈاکٹر عرفان کے چہرے پر

حیرت پھیل گئی۔ وہ میری جانب بڑھ آئے۔

"مسٹر ضیاء! آپ ٹھیک ہیں ناں! آئی ایم سوری مسٹر ضیاء آپ کے دادا۔"

"جی ڈاکٹرز میں ٹھیک ہوں۔" میں نے قصداً مسکرا کر جواب دیا۔ دوسرے ڈاکٹرز کے چہرے پر پھیلی بے یقینی نے ڈاکٹر عرفان کی بوکھلاہٹ میں اضافہ کر دیا۔ وہ ان سب کے چہروں پر بے یقینی دیکھنے کے بعد پھر میری طرف پلٹے۔

"مسٹر ضیاء ابھی ابھی......... آپ ٹھیک نہیں تھے۔ آپ کی آنکھیں......... آپ کا چہرہ......... کہیں آپ کوئی نشہ تو نہیں کرتے.........؟"

وہ شاید اپنے ساتھی ڈاکٹروں کو یقین دلانا چاہتا تھا کہ اس نے جو کچھ بتایا ہے وہ سچ تھا۔ مجھے ان پر ترس آیا۔

"نہیں ڈاکٹر! میں نشہ نہیں کرتا لیکن......... میں خود بھی نہیں جانتا کہ مجھے کیا ہو گیا تھا۔" میں دادا کو دیکھ رہا تھا۔ بات کرتے کرتے میں چونک اٹھا۔ دادا کی طرف بڑھا۔ وہ ویسے ہی ساکت اور بے سدھ لیٹے تھے جیسے یہاں لانے اور انجکشن لگانے کے بعد سے۔ "دادا ابھی ابھی ہوش میں آ گئے تھے ڈاکٹر......... آپ انہیں چیک کریں۔"

"آئی ایم سوری مسٹر ضیاء......... ہم انہیں چیک کر چکے ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ یہ ہوش میں آئے بغیر تقریباً ڈھائی تین گھنٹے قبل ہی انتقال کر چکے ہیں۔"

"جی......... یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ.........؟ ابھی کچھ دیر پہلے وہ ہوش میں آئے تھے۔ ابھی چند منٹ پہلے......... میں نے ان سے بات کی ہے ڈاکٹر! انہوں نے جواب دیا ہے مجھے۔" میں لپک کر دادا کے پاس چلا گیا۔ میں نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ وہ برف جیسا ٹھنڈا تھا اور بدن میں بھی اکڑن پیدا ہو گئی تھی۔ مگر یہ سب غلط تھا۔ میں چند لمحے پہلے تک ان کا نرم اور گرم ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر ان سے بات کر چکا تھا پھر.........؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ اب سے ڈھائی تین گھنٹے پہلے مر چکے ہوں۔"

میں ڈاکٹروں پر برس اٹھا۔ جس قدر چیخ سکتا تھا' چیخا۔ کسی نے سکندر کو بھی بلوا لیا تھا۔ انہوں نے مجھے آ کر سنبھالا۔ مجھے یقین دلانے کی کوشش کرتے رہے کہ میں نے خواب دیکھا ہو گا۔ میں کیونکہ لاشعوری طور پر ان کی موت قبول نہیں کر رہا تھا اس لئے ایسا محسوس کر رہا ہوں۔ میں نے انہیں بتایا کہ رات کو انہیں کسی نے چیک نہیں کیا۔ اس پر مجھے دادا کی فائل چیک کروائی گئی کہ اب سے تین گھنٹے قبل اسٹاف نرس نے آ کر

انھیں چیک کیا ہے۔ ایک انجکشن دیا ہے۔ ان کا ٹمپریچر لیا ہے۔ سب کا اندراج ان کی کیس ہسٹری فائل پر تھا۔

میں مصر تھا کہ اس وقت پورا اسپتال سنسان تھا۔ دور دور تک وہاں کوئی نہیں تھا۔ کمرے میں کوئی نہیں آیا۔ میں مسلسل کمرے میں تھا۔ انتظار کر رہا تھا بلکہ سویرے ہی سے میں نے ڈیوٹی روم کے چکر لگا ڈالے کہ ڈاکٹرز دادا کو چیک کر لے مگر ہر بار نرس نے کہا کہ میں کمرے ہی میں ڈاکٹرز کا انتظار کروں۔ جب مجھے ڈیوٹی روم لے جایا گیا تو وہاں موجود نرس، وہ نہیں تھی جس نے ہر بار مجھے واپس بھیج دیا تھا۔ میں نے جس نرس کا حلیہ بتایا، پتا چلا کہ وہ نرس دو سال قبل اسپتال چھوڑ کر جا چکی ہے۔ مجھے اس نرس کی تصویر دکھائی گئی تھی جسے میں نے پہچان لیا تھا۔ میں چکرا کر رہ گیا۔ ڈاکٹرز بھی میری وجہ سے ذہنی پریشانی میں مبتلا ہو گئے تھے۔ وہ نرس جو میرے چہرے سے دہشت زدہ ہو کر بھاگی تھی، اب تک خوف سے بے حال تھی اور اس کا ٹمپریچر ایک سو چار تک پہنچ گیا تھا۔ ڈاکٹر اس کا علاج کر رہے تھے۔ اس واقعے کو حتی الامکان چھپانے کی کوشش کی جا رہی تھی کہ کہیں ہسپتال میں دہشت نہ پھیل جائے۔ بہرحال وہاں تو جو کچھ ہوا، وہ الگ ایک قصہ ہے مگر دادا مر چکے تھے۔ میں ضروری کارروائی کے بعد انھیں گھر لے جانے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ گھر سے وہاب چاچو، منے دادا اور طاہر بھائی چائے اور کھانا وغیرہ لے کر پہنچ گئے۔ اس خبر نے ان سب پر سکتہ طاری کر دیا۔ میری حالت الگ تباہ ہو رہی تھی۔ اب مجھے بخار بھی ہو چکا تھا۔ بدن میں ایسا درد تھا جیسے میں نے ساری زندگی کھڑے کھڑے گزاری ہو۔

میرے بدن میں بے پناہ درد تھا۔ پورا بدن شل ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ منے دادا، وہاب چاچو اور طاہر بھائی نہ ہوتے تو شاید میں میت لے جانے کے قابل بھی نہ ہوتا۔ وہ لوگ نہیں تھے تو میں خود پر کسی حد تک قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا مگر ان تینوں کی آمد نے مجھے بالکل نڈھال کر دیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میت کس طرح اور کب گھر لائی گئی، گھر والوں کا کیا حال ہوا، کب تدفین ہوئی۔ مجھے قطعی ہوش نہ تھا بلکہ بعد میں پتا چلا کہ گھر کے آدھے افراد میری تیمارداری میں لگے ہوئے تھے۔

مجھے خطرناک درجے کا بخار چڑھا تھا۔ میرے پورے بدن پر سرخ اور سفید دھبوں کا جال سا بن گیا تھا۔ میرے پلنگ کے نیچے اور دائیں بائیں برف کی سلیں رکھی گئی تھیں۔ مجھے ہسپتال بھی لے جایا گیا تھا مگر ڈاکٹرز نے ہسپتال میں داخل کرنے کی بجائے مجھے گھر پر

رکھنے کا مشورہ دیا تھا۔ ان ڈاکٹرز میں ڈاکٹر عرفان اور ڈاکٹر سکندر پیش پیش تھے۔ میں ... ہوں کہ انھوں نے ایسا کیوں کہا ہو گا۔

بہرحال وہ دونوں صبح شام گھر پر ڈیوٹی دے رہے تھے۔ منے دادا نے بمبئی اپنے ... دوست ڈاکٹر کو فون کر کے مشورہ کیا بلکہ درخواست کی تھی کہ وہ ان کے خرچے پر بمبئی سے دہلی آ جائیں مگر انھوں نے معذرت کر لی تھی اور کیونکہ وہ منے دادا کے دوست تھے اس لیے انھوں نے ڈاکٹر سکندر اور ڈاکٹر عرفان سے میری کیفیت پر تفصیل بات چیت کر کے انھیں ہدایات بھی دی تھیں۔ دہلی کے بڑے بڑے ڈاکٹرز بلوائے گئے تھے۔ لوگ دادا کی موت کے صدمے سے نکل کر میری پریشانی میں گرفتار ہو گئے تھے۔ اماں نے رضا بھائی کو بمبئی سے بلوا لیا تھا۔ شجاع بھائی کو ٹیلی گرام دے کر دادا کی موت اور میری بیماری کے بارے میں آگاہ کر دیا تھا۔ وہ ہر دو تین روز بعد فون کر رہے تھے۔

میں پندرہ روز تک صاحب فراش رہا۔ ان پندرہ روز کی کمزوری نے میرے جسم کا سارا خون نچوڑ لیا تھا۔ میں جب ذرا ہوش میں آتا، مجھے دادا کی آنکھوں میں پھیلا صحرا دکھائی دینے لگتا۔ ابا کی کرب ناک چیخیں میرے پورے وجود کو جھنجھوڑنے لگتیں اور خوف زہریلے بچھو کی طرح میرے دماغ میں اپنے پنجے گاڑ کر بیٹھ جاتا۔ میرا کم ہوتا درجہ حرارت بڑھنے لگتا اور میں پھر ہوش و حواس کھو دیتا تھا۔ یہ کیفیت مسلسل طاری تھی۔ مسلسل ہی ہو رہا تھا۔ ایک روز میں ذرا سا ہوش میں آیا تھا کہ عصمت آپا میرا والٹ لے کر میرے قریب آ گئیں اور بولیں۔ "ضیاء جی! اپنے آفس کا نمبر دے دو۔ مجھے بتاؤ کون سا ہے، رضا بھائی وہاں جا کر اطلاع کریں گے، اتنے روز سے تم آفس نہیں گئے ہو۔ ایڈریس بھی بتا دو۔"

میں نے والٹ اپنے ہاتھ میں لیا اور اسی لمحے اچانک مجھے یوں لگا جیسے میں کسی دلدل سے آہستہ آہستہ باہر آ رہا ہوں۔ جیسے میں جو اب تک کسی دھند میں لپٹا ہوا تھا، صاف اور روشن فضا میں نکل آیا ہوں۔ عین اسی لمحے مجھے شانی بابا کا دیا ہوا وہ پتھر یاد ... میں تھیں.......... گھر میں، اپنے والٹ میں ہی بھول گیا تھا۔ دادا کی اچانک بگڑ جانے والی حالت نے، دھیان نہیں آنے دیا کہ میں اسے ساتھ لیتا۔ شانی بابا کا جملہ سرگوشی بن کر میرے دماغ میں گونج اٹھا۔ "اسے ہمیشہ اپنے پاس رکھنا ورنہ تم مشکل میں پڑ سکتے ہو۔"

دادا ٹھیک کہتے تھے کہ اسے موم جامہ کر کے بازو پر باندھ لو یا گلے میں ڈال لو۔ میں نے والٹ کو مٹھی میں بھینچ لیا۔ پھر دو انگلیاں ڈال کر اس پتھر کی موجودگی کا اطمینان کیا۔

"ضیاء جی!"

عصمت آپا نے پھر پکارا۔ میں چونک اٹھا۔ عین اسی لمحے ڈاکٹر سکندر اندر داخل ہوئے۔ میرے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

"ارے ماشاء اللہ! آپ تو آج بہت بہتر دکھائی دے رہے ہیں۔"

"جی ڈاکٹر! میں واقعی بہتر ہوں۔" میں نے ان کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ عصمت آپا جلدی سے سر کو دوپٹے سے ڈھانپ کر باہر چلی گئیں۔

ڈاکٹر سکندر میرے ہاتھ پر دوسرا ہاتھ رکھ کر میرے قریب ہی بیٹھ گئے۔ "مسٹر ضیاء! میں بہت خوش ہوں ورنہ آپ کی حالت نے مجھے ہی نہیں کافی ڈاکٹرز کو حیران کر رکھا تھا۔ آج تو میں یہ سوچ کر آیا تھا کہ آپ کا ٹمپریچر نارمل نہ ہوا تو بمبئی لے جانے کا مشورہ دوں گا۔ دہلی کے ہم تمام ہی ڈاکٹرز سے آپ کا کیس ڈسکس کر چکے ہیں۔ خاص طور پر اسپتال میں آپ پر ہونے والے حملے نے ڈاکٹر عرفان اور.........."

"ڈاکٹر.......... پلیز!" میں نے ان کی بات کاٹ دی۔ "میں اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتا۔ وہ حالت.......... آپ کے لئے افسوس اور حیرت انگیز ہو سکتی ہے مگر میرے لئے نہیں۔"

"ہاں.......... کچھ باتیں مجھے آپ کے منے دادا سے پتا چلی ہیں۔ کافی عرصہ پہلے میں نے میرٹھ اور یہاں کے مقامی اخباروں میں آپ کے گھر ہونے والے حادثات کے بارے میں پڑھا بھی تھا۔ اب پتا چلا کہ وہ واقعات آپ لوگوں سے متعلق تھے تو میں نے چاہا کہ میں مکمل معلومات حاصل کروں۔"

"آپ اس چکر میں نہ پڑیں تو اچھا ہے۔ مجھے پیش آنے والے تجربات بہت تلخ رہے ہیں۔ میں کبھی نہیں چاہوں گا کہ کسی اور کو بھی کوئی نقصان پہنچے۔" میں نے دو ٹوک انداز میں جواب دیا۔ میں ان کے بے جا تجسس کو محسوس کر رہا تھا اور واقعی اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ ایسے غیر مستحکم حالات میں کسی اور کو تفصیلات سے آگاہ کروں۔ ابھی تو میں خود بھی تسلی بخش جواب حاصل کرنے سے معذور تھا۔ نہ ان واقعات کی کوئی توجیہ میرے سامنے تھی اور نہ سبب۔

میرے لہجے اور انداز نے ڈاکٹر سکندر کو کسی حد تک محتاط کر دیا۔

وہ چند لمحے میری طرف دیکھتے رہے پھر گہری سانس لے کر میرا معائنہ کرنے لگے۔ ٹمپریچر لینے کے بعد ان کے چہرے پر شدید حیرت کے آثار تھے۔ "حیرت انگیز!" انہوں نے بلا اظہار کیا۔ "مسٹر ضیاء اب آپ مکمل طور پر صحت مند ہیں۔"

"شکریہ!" میں نے سپاٹ انداز میں جواب دیا۔ ممکن ہے میری صحت مندی کو وہ اپنا کریڈٹ سمجھ رہے ہوں مگر میں جانتا تھا کہ میری صحت مندی کا راز اس وقت میرے دائیں ہاتھ میں موجود وہ لاکٹ ہے جس میں شالی بابا کا پتھر رکھا ہے۔

کچھ وقت وہ میرے لئے طاقت کے ٹانک لکھنے، مجھے آرام کی تاکید کرنے اور فوری صحت مندی کا اظہار کرنے میں ضائع کرنے کے بعد اٹھ گئے۔ "ڈاکٹر عرفان یہ سن کر بہت حیرت زدہ اور خوش ہوں گے۔"

انہوں نے کچھ معنی خیز انداز میں ڈاکٹر عرفان کا ذکر کیا تھا اور میں جان گیا تھا کہ غالباً ان کا مقصد ہسپتال والی میری کیفیت کے بارے میں جاننا ہے مگر میں نے اپنی آگاہی کا اظہار نہیں کیا بلکہ مسکرا کر کہا۔ "میری طرف سے ان کا شکریہ ضرور ادا کیجئے گا۔"

"ضرور!" انہوں نے اسٹیتھو اسکوپ اپنے بیگ میں رکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ "ویسے مسٹر ضیاء! اس نرس کی حالت اب تک خراب ہے۔"

"کون سی نرس؟" میں انجان بن گیا۔

"وہی.......... جس نے آپ کو اسپتال میں دیکھا تھا۔ وہ جب ہوش میں آتی ہے، بری طرح چیختی ہے۔ ہم اس کی طرف سے بھی بہت پریشان ہیں۔ خدا کرے وہ بھی اچانک آپ ہی کی طرح ٹھیک ہو جائے۔" وہ کھڑے ہو گئے۔ "اچھا مسٹر ضیاء اجازت دیں۔" انہوں نے ہاتھ ملانے کو بڑھایا۔

"ڈاکٹر.......... کیا آپ مجھے اس نرس کے پاس لے جا سکتے ہیں؟" مجھے اچانک اس نرس پر رحم آنے لگا تھا جو میری وجہ سے بے وجہ ہی مصیبت میں پڑ گئی تھی۔

"آں.......... ہاں.......... مگر.......... کیوں مسٹر ضیاء؟"

"میرا خیال ہے کہ اب وہ مجھے دیکھے گی تو اس کا خوف ختم ہو جائے گا۔" میں نے جنبش دی۔

"ہاں.......... ویسے نفسیاتی اثر تو بہت اچھا ہو گا۔ میرا خیال ہے یہی کہ خوف نے اسے جکڑ رکھا ہے' وہ آپ کو بھول نہیں پائی ہے۔ ویسے مسٹر ضیاء میں بھی اس بارے میں حیران ہوں۔ اگرچہ میں نے آپ کو نہیں دیکھا مگر ڈاکٹر عرفان نے جو کچھ مجھے بتایا اور جس کی تصدیق آپ باتوں سے کر چکے ہیں۔ اگر مجھے پتا چل جائے کہ وہ سب کیا تو.........."

"پلیز ڈاکٹر.........." میں نے ہاتھ اٹھا کر پھر ان کے شوق کی شدت کو کم کر دیا۔ "مجھے اس نرس سے ہمدردی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اسے کوئی نقصان پہنچے' اگر ایسا ہوا تو شاید میں ہمیشہ ایک انجانے سے دباؤ میں رہوں' اس لئے.........."

"نہیں' نہیں.......... وہ تو ٹھیک ہے میں آج ہی ڈاکٹر عرفان سے بات کرتا ہوں۔ مجھے بہرحال ہسپتال کی انتظامیہ سے اس کی اجازت لینا ہو گی اس لئے کہ وہ نرس اب ہسپتال میں ایڈمٹ ہے اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے مسٹر ضیاء کہ اس ملاقات سے وہ سب ہو جو ہم سوچ رہے ہیں' بلکہ اس کے برعکس کچھ اور خوفناک بات ہو جائے۔"
ٹھیک ہے۔ آپ دیکھ لیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ ٹھیک ہو جائے گی۔"

☆--------------☆--------------☆

پھر وہ مجھ سے اجازت لے کر چلے گئے۔ ڈاکٹر سکندر کے جاتے ہی اماں' بی جان' کاکا جان' منی دادی اور فرحت وغیرہ کمرے میں آ گئیں۔ غالباً انہیں عصمت آپا نے بتایا تھا کہ میں اب ٹھیک ہوں۔ دہاب چاچو' منے دادا اور طاہر بھائی جانے کہاں تھے البتہ بھائی کے لئے سنا کہ وہ سو رہے ہیں۔ وہ رات بھر میرے سرہانے جاگے تھے اس لئے انہیں کسی نے نہیں جگایا۔ وہ سب مجھے ٹھیک دیکھ کر خوش تھے۔ اماں تو خوشی میں بھی رو رہی تھیں۔ اچانک مجھے دادا کا خیال آ گیا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ میں ان کی موت کو بھولا ہوا تھا۔ ڈاکٹر سکندر نے بھی ایسی کوئی بات نہ کی تھی کہ مجھے یاد آتا مگر اب انہیں دیکھ کر مجھے یاد آ گیا۔ مجھے لگا جیسے میرا دل کسی نے مٹھی میں لے کر بھینچ دیا ہو۔ منی دادی میرے قریب آئیں اور مجھ سے لپٹ کر رو دیں۔ بے اختیار آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور پھر ہم سبھی کافی دیر تک خاموشی سے روتے رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد منے دادا' طاہر بھائی کے علاوہ زہرہ آپا اور دہاب چاچو بھی ہمارے شامل ہو گئے۔ اتنے بہت سے لوگوں کے ہوتے ہوئے اتنی گہری خاموشی گھبرائے دے رہی تھی۔ دھیمی دھیمی سسکیاں ماحول کو گھمبیر اور اداس کر رہی تھیں۔

"بیٹا! سب ہی کو جانا ہے۔ کسی کے روکے سے کون رک سکتا ہے؟" منے دادا کی بھاری اور بھرائی ہوئی آواز نے جمود توڑ دیا۔

"جا بیٹا پانی لا۔" انہوں نے عصمت آپا سے کہا۔ پھر میرے سر پہ ہاتھ پھیر کر بولے "خدا کا شکر ہے کہ تم اچھے ہو گئے۔ خدا کی امانت لوٹاتے ہوئے اتنا بھاری صدمہ اٹھا لینا اچھا نہیں ہوتا بیٹے!"

وہ غالباً میری حالت کو دادا کی موت کے صدمے سے تعبیر کر رہے تھے۔ انہیں کیا معلوم کہ میرے ساتھ کیا ہوا تھا۔ ویسے اس لمحے میں نے شکر بھیجا کہ دادا کی موت بظاہر نارمل ہوئی ہے۔ خدانخواستہ اگر وہ بھی مکڑیوں والی خوفناک موت ہوتی تو جانے کیا ہوتا۔ یہ سوچتے ہوئے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ سب کچھ چھوڑ کر میں سب سے پہلے اس چکر سے نجات حاصل کروں گا۔ معلوم کرنے کی کوشش کروں گا کہ یہ سب کیا ہے۔ اس کے لئے مجھے رابرٹ سے ملنا تھا۔ شالی بابا سے ملاقات اب بہت ضروری ہو گئی تھی۔ ان سے ملے بغیر میں جان نہیں سکتا تھا کہ وہ ایک زنجیر دو میں کیسے تبدیل ہو گئی۔ دوسری کہاں سے آئی' اصلی زنجیر کون سی ہے اور اس کا اب مجھے کیا کرنا ہے۔ ایک مبہم سا خیال تھا کہ شاید رابرٹ کے حوالے کر دینے سے ہماری جان چھوٹ جائے۔

☆--------------☆--------------☆

میں پندرہ دن سے بیمار تھا۔ اتنے روز تک آفس والوں کو اطلاع نہیں تھی کہ میرے ساتھ کیا ہوا۔ میں تو وہاں سے صرف دو روز کی چھٹی لے کر میرٹھ گیا تھا۔ سب سے پہلے مجھے آفس جا کر اطلاع کرنا تھی۔ میں نے جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو رضا بھائی نے مجھے سختی سے منع کر دیا اور کہا کہ وہ کل صبح خود وہاں جا کر مزید چھٹی لے لیں گے۔ مگر جو اسائنمنٹ میرے پاس تھے انہیں مکمل کر کے دینا میری آفس ذمے داری تھی۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں اب بالکل ٹھیک ہوں اس لئے خود جا کر بھی مزید چھٹی لے سکتا ہوں۔ میرے اصرار پر وہ خاموش ہو گئے مگر انہوں نے کہہ دیا کہ مجھے ضرور چھٹی لینی چاہئے اس لئے کہ میں بہت کمزور ہوں۔ یہ بات درست بھی تھی۔ گو میں اندر سے اپنے آپ کو بہتر اور قطعی صحت مند محسوس کر رہا تھا مگر بظاہر کمزوری بہت زیادہ تھی۔ چہرہ زرد تھا۔

آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی محسوس ہونے لگی تھیں اور رخساروں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔

☆-------------☆-------------☆

دادا کی کمی بہت شدت سے محسوس ہونے لگی تھی۔ بالخصوص جب میری نگاہ دادی پر پڑتی تو بہت افسوس ہوتا۔ چچی صاحب اب دن رات ان کی خدمت میں لگی رہتی تھیں۔ انہوں نے اپنوں کی خدمت کرنے کے بعد جو پھل پایا تھا اس نے دادی کی قدر سکھادی تھی۔ رضا بھائی اگلے روز ہی بمبئی چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد کچھ دنوں کو ناصر چچا اور طیب بھی آگئے۔ طیب بڑا خوبصورت جوان نکلا تھا۔ جنس مخالف کے لئے ان میں مقناطیسی کشش تھی جس کا اس نے بہت زیادہ بلکہ ناجائز حد تک فائدہ اٹھایا اور کبھی اپنی کارستانیوں کو سنانے میں ہچکچایا بھی نہیں۔ وہ اکثر مجھے سر سے پیر تک دیکھ کر ٹھنڈی آہ بھرتا اور کہتا۔ ”ضیاء! تمہیں خدا نے بڑی سحرانگیز شخصیت دی ہے۔ اگر میں تمہارے ایسا ہوتا تو اس دنیا میں طوفان اٹھا دیتا۔“

”تو اور تم کیا کر رہے ہو؟“ میں طنز کرتا۔

”نہیں یار۔“ وہ افسردہ ہو جاتا۔ ”میں ایک خاص قسم کی عورت کی بھرپور توجہ چاہتا ہوں۔ جادوگرنی ہوتی ہے وہ عورت مگر.......... پتا نہیں کیوں..........؟“ وہ الجھ کر خاموش ہو گیا۔

”میرا خیال ہے کہ ہر قسم کی عورت جادوگرنی ہوتی ہے۔“ میں نے اسے ٹالنے کے لئے کہا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ موضوع تبدیل کر دے۔ ”ویسے تمہیں خاص قسم کی عورت کی تلاش ہے اگر اس کی کچھ تفصیل مجھے بتا دو گے تو میں اس کی تلاش میں کسی کام ضرور آؤں گا۔ مجھے اکثر اوٹ پٹانگ عورتیں ٹکراتی رہتی ہیں۔“

”نہیں.......... تلاش کی ضرورت نہیں‘ ایسی کم از کم دو عورتیں میری نگاہ میں ہیں۔“ وہ ایک دم پہلو بدل کر پرجوش انداز میں بولا۔

”پھر کیا قباحت ہے.......... تم یہاں کیوں چلے آئے‘ وہیں کوشش کرتے۔“

”یہی تو رونا ہے کہ ایسی عورتیں جن کی قربت کی خواہش مجھے دیوانہ بنائے دیتی ہے میری طرف دیکھتی بھی نہیں ہیں۔“

”آخر ان کا بھی تو کوئی ذوق ہو گا۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

”لیکن ضیاء مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اگر میں ان عورتوں کا قرب نہیں پا سکا تو فنا ہو جاؤں گا۔“ وہ خلاؤں میں دیکھ رہا تھا۔ یوں جیسے وہاں اس عورت کا پیکر ہو۔

”تم قرب پا کر بھی فنا ہو جاؤ گے۔“

”تم مذاق کر رہے ہو اور میں..........“ وہ جھنجلا گیا۔

”میں حقیقت بیان کر رہا ہوں اور تم..........“ میں نے بالکل اسی انداز میں جواب دیا۔

”تم.......... بہت بدذوق ہو۔“ اس نے میرے متعلق فیصلہ دیا۔

”ہر پریکٹیکل آدمی بدذوق ہو سکتا ہے۔“

”ضیاء! تم میں یقیناً وہ خوبی ہے کہ ان جیسی عورتوں کو دیوانہ بنا دو۔“ وہ پھر میرے لہجے اور انداز کو فراموش کر بیٹھا۔

”میں تخریب پسند نہیں کرتا۔“

”اگر تم ایک بار.......... صرف ایک بار میرے ساتھ چلو.......... تو میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتا ہوں۔“ وہ ایک ہاتھ کی مٹھی دوسری ہاتھ کی ہتھیلی پر مار کر پریقین انداز میں بولا۔

”تم نے مجھے بے وقوف کیوں سمجھ لیا ہے؟“

”ضیاء پلیز!.......... میری خاطر۔“ وہ منت سماجت پر اتر آیا۔

”میں کسی کی خاطر بھی بے وقوف بننے کو تیار نہیں اور اب تم جاؤ۔ نہایت غیر دلچسپ باتیں کرتے ہو۔ تم بچپن میں بھی ایسے ہی تھے۔ چچا صاحب کی موت پر صرف اس لئے خوش تھے کہ تمہیں ان پُراسرار حالت میں ہمارے ہاں آنے کا موقع مل گیا تھا۔ میں اسی دن تمہیں جان پایا تھا۔“ میں نے دل میں کچھ رکھے بغیر کہہ دیا۔

”اوہ..........! اوہ..........! بچہ تھا میں لیکن پُراسراریت پر اب بھی جان دیتا ہوں۔ وہ عورتیں مجھے اسی لئے اچھی لگتی ہیں کہ ان میں ایک عجیب سی پُراسراریت ہوتی ہے۔“

”پُراسراریت واقعی جان لے لیتی ہے۔“ میں نے اسے تنبیہہ کی۔

”پروا نہیں! دیکھ لینا! میں ایسی ہی کسی پُراسراریت کا شکار ہوں گا اور اگر وہ پُراسراریت مجسم عورت ہو تو کیا کہنا۔“

”یہ پاگل ہے۔“ میں نے مکمل سنجیدگی سے مان لیا مگر اس سے کچھ نہیں کہا۔ اسے

دادا کی موت کی بھی پروا نہیں تھی۔ اس نے سب سے پہلے آتے ہی یہ پوچھا تھا کہ موت نارمل ہوئی تھی یا چچا صاحب وغیرہ کی طرح اور تکلیف دہ بات یہ تھی کہ یہ سوال اس نے دادی سے کیا تھا۔ بجائے وہ تعزیت کرنے کے' ہر ایک سے یہی کھوج رہا تھا کہ واقعہ پُراسرار تو نہیں تھا۔ اگر وہ جانتا کہ پُراسراریت کیا ہوتی ہے تو یقیناً اس کی گھگھی بندھ جاتی۔ میں نے سوچا کہ اس کی چوکڑی بھلا دوں مگر یہ سوچ کر ارادہ ملتوی کر دیا کہ وہ سارے زمانے میں چیختا پھرے گا۔

وہ بیٹھنا چاہتا تھا مگر میں اٹھ گیا۔ رات بھی کافی ہو گئی تھی۔ مجھے دادی سے کام تھا۔ میں ان سے اس الماری کی چابی لینا چاہتا تھا جو دادا کی تھی اور دادا' دادی سے کہہ چکے تھے کہ اس الماری کی چابی ضیاء جب مانگے' اسے دے دینا۔ میرا مقصد ابا کی تمام چیزوں کو چیک کرنا تھا۔ یہ بڑا وقت طلب کام تھا۔ میں پہلے آفس سے چھٹی لینا چاہتا تھا مگر چابی کو اپنے قبضے میں کرنے کے بعد۔

طیب ٹھنڈی آہیں بھرتا ہوا اٹھ گیا۔ میں سیدھا دادی کے پاس پہنچا۔ چابی انہوں نے بلا حیل و حجت دے دی۔ الماری کافی بڑی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اپنے کمرے میں اٹھوا لوں مگر اماں نے میری مشکل آسان کر دی۔ انہوں نے تجویز دی کہ میں دادا کے کمرے میں شفٹ ہو جاؤں تاکہ وہ ویران نہ ہو سکے اور اپنا کمرا مہمانوں کے لئے خالی کر دوں۔ ناصر بھائی کے جانے کے بعد ان کے بیوی بچوں کے آنے کا پروگرام تھا اور اب تو بڑی جان' کاکا جان اور فرحت کو بھی فی الحال یہیں رہنا تھا۔ مجھے یہ تجویز پسند آئی۔

☆--------------☆--------------☆

اگلے روز میں آفس گیا۔ آفس والے میری طرف سے پریشان تھے۔ میری حالت دیکھ کر دو مہینے کی چھٹی فوراً دے دی گئی۔ دو ماہ میرے لئے کافی تھے۔ کم از کم میرا یہی خیال تھا۔ اسی روز شام سے پہلے ہی میں دادا کے کمرے میں منتقل ہو گیا۔ اسی روز ناصر بھائی اور طیب واپس چلے گئے۔ مجھے فرصت ملی تو میں دادا کی الماری کھول کر بیٹھ گیا۔ اس الماری میں بہت سی چیزیں تھیں۔ ابا کے کپڑوں کے علاوہ ایک بریف کیس تھا۔ جس میں ان کا پاسپورٹ اور دوسرے ضروری کاغذات تھے۔ چاندی کی وہی ڈبیا تھی جس میں سے میں نے زنجیر چرائی تھی۔ اسے دیکھ کر جانے کیوں میرا دل دھڑک اٹھا تھا۔

میں نے دھیرے سے اسے کھولا۔ اس میں چھوٹی چھوٹی سی بہت چیزیں تھیں۔ میں نے اسے بستر پر الٹ دیا اور پھر جیسے مجھے سانپ سونگھ گیا۔ دل بند ہوتا ہوا محسوس ہوا' شالی بابا کا دیا ہوا سیاہ چپٹا پتھر میرے عین سامنے پڑا تھا۔ میں نے گھبرا کر اپنی جیب سے اپنا والٹ نکالا۔ میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اس کی اندرونی جیب میں دو انگلیاں ڈالیں تو بند ہوتا دل ایک دم جیسے دھڑکنا شروع ہو گیا۔ وہ پتھر میری انگلیوں کی پوروں سے مس ہوا تھا۔ میں نے اسے نکال لیا۔ وہ ہوبہو ویسا ہی تھا۔ اس بار میں نے وہ غلطی نہیں کی جو زنجیر کے معاملے میں کر چکا تھا۔ اسے میں نے اس پتھر کے قریب نہیں رکھا بلکہ اسے اپنی ہتھیلی پر ہی رکھے رہا اور دونوں کو غور سے دیکھتا رہا۔ وہ دونوں اس وقت بے جان اور ٹھنڈے تھے مگر ان دونوں میں قطعی کوئی فرق نہ تھا۔

اسی لمحے میرے ذہن میں دادا کے الفاظ گونج اٹھے کہ اسے موم جامہ کر کے پہن لو۔ میں جانتا تھا کہ اگر ابھی میں نے کچھ نہیں کیا تو پھر بھول جاؤں گا۔ اسی لئے میں نے بستر پر بکھری چیزوں کو سمیٹ کر پھر ڈبیا میں رکھا۔ اپنے پتھر کو یونہی ہتھیلی میں دبائے میں دادی کے پاس گیا۔ وہ اپنے پلنگ پر لیٹی تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ میں ایک تعویذ کو موم جامہ کروا کر پہننا چاہتا ہوں۔ انہوں نے تعویذ مجھ سے مانگا مگر میں نے کہہ دیا کہ میں خود موم جامہ کروں گا۔ وہ ضرور چیزیں دے دیں اور موم جامہ کرنے کا طریقہ بتا دیں۔ انہوں نے مجھے ہرے رنگ کا کپڑا' موم بتی اور لوبان دیا۔ طریقہ بتایا اور یہ بھی کہا کہ موم جامہ کرنے کے بعد اسے لوبان کا دھواں ضرور دے لوں۔ مجھے یہ سب کرنے میں بڑی دشواری ہوتی مگر بالآخر میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے بازو پر باندھنے کے لئے اسے ایک پٹی کی شکل میں سی لیا۔ اس دوران میں دادی بھی آ گئی تھیں۔ پتھر میں موم جامہ کر چکا تھا اس لئے وہ نہ دیکھ سکیں مگر پٹی بناتے ہوئے دیکھتی اور بتاتی رہیں۔ انہوں نے اسے میرے بازو پر باندھ دیا۔ کچھ دیر تک زیر لب کچھ پڑھتی رہیں پھر مجھ پر پھونک کر دعائیں دیتی ہوئی چلی گئیں۔

اب میں کسی حد تک مطمئن ہو چکا تھا پھر وہ ڈبیا نکال کر بیٹھ گیا۔ اس میں دوسری چیزیں تو میرے کام کی نہیں تھیں بس وہ پتھر ہی اہم تھا۔ میں حیران تھا کہ یہ پتھر ابا کے پاس کہاں سے آیا؟ کیا وہ بھی شالی بابا سے مل چکے ہیں؟ کیا شالی بابا سب کچھ جانتے ہیں؟ کیا ابا کو پتا تھا کہ یہ زنجیر پُراسرار ہے؟ ان کی زندگی میں تو کوئی بھی واقعہ ایسا نہ ہوا تھا پھر...... وہ کن چکروں میں تھے؟ کیا کر رہے تھے؟ وہ ہمیشہ مجھے ایک خاص قبرستان میں'

چند خاص دوستوں کے ساتھ کیوں نظر آتے ہیں؟ اس زنجیر یا مکڑی کا آپس میں کیا تعلق ہے اور ان دونوں کا اس قبرستان سے کیا تعلق ہے؟ یہ سب باتیں تو اب تک سمجھ میں نہ آئیں تھیں پھر اس وقت سوچنے اور الجھنے سے کیا ہو جاتا سو میں سب کچھ بھول کر اس بریف کیس کو کھول کر بیٹھ گیا۔

☆-------------☆-------------☆

وہ بریف کیس میرے لئے بہت اہم ہو گیا جب ان کی ڈائری میں مجھے ایلن کا ایڈریس اور فون نمبر مل گیا۔ اس نمبر کے بعد ہی پانچ مختلف نام' ان کے آگے ایڈریس اور فون نمبرز مل گئے۔ ان پانچ میں سے ایک رابرٹ بھی تھا۔ دوسروں میں' جینو پاپا' ریکو' جو اپنے نام ہی سے اٹالین لگ رہا تھا۔ ایک سکھ تھا جس کا نام سورن سنگھ تھا۔ تیسرا پرکاش باترے' چوتھا نام یقیناً یونانی تھا "پپاس زیگو" ان سب کے ناموں کے آگے مفصل پتا اور فون نمبرز تھے جو میرے لئے بہت اہم تھے۔ میرا خیال تھا کہ یہ وہی لوگ ہوں گے جنہیں میں ابا کے ساتھ قبرستان میں دیکھتا رہا ہوں۔ اگر وہ نہ بھی ہوئے تو بھی یہ امکان تو موجود تھا کہ ابا کے بارے میں تفصیل سے جانتے ہوں اور ممکن ہے' وہ ان سرگرمیوں سے بھی واقف ہوں جو ابا نے ان دنوں میں اختیار کی ہوئی تھیں' انہیں چیک کرنا ضروری تھا۔ ایک رابرٹ تو سو فیصد میرے کام کا آدمی تھا۔ اس ڈائری کے علاوہ بھی اس بریف کیس میں بہت سے کاغذات تھے۔ ایک نقشہ تھا جس میں جا بجا سرخ دائرے بنے ہوئے تھے۔ یہ نقشہ انڈیا کا نہیں تھا بلکہ یونان کا تھا۔ ایک اور نقشہ تھا جو ہانگ کانگ کا تھا پھر انہی کاغذات میں لپٹا ہوا مجھے ایک بوسیدہ کاغذ بھی ملا تھا جس پر ٹیڑھی میڑھی لکیروں سے کسی خاص سمت اور جگہ کی نشاندہی کی گئی تھی۔

بہرحال یہ ثابت ہو گیا تھا کہ جو کچھ بھی ہے' میرے لئے انتہائی اہم ہے۔ رات گئے تک میں ان کاغذات اور ان پر درج نمبروں میں الجھا رہا۔ آخر میرے کمرے میں روشنی دیکھ کر اماں نے آکر بتایا کہ رات کے دو بج چکے ہیں اور مجھے سو جانا چاہئے۔ وقت گزرنے کا مجھے بالکل احساس نہیں ہوا تھا۔ میں نے اماں سے معذرت کی اور چیزیں سمیٹ کر دوبارہ الماری میں رکھ دیں۔ اسی چاندی کی ڈبیا میں وہ پتھر رکھ دیا جو ہمیں مجھے دیئے جانے والے پتھر ایسا تھا۔ تمام چیزیں رکھنے کے بعد میں نے الماری بند کی اور چابی کو اپنے سرہانے کی طرف قالین کے نیچے چھپا دیا۔ بہت دیر تک میں بے ربط سی باتوں میں الجھا رہا پھر مجھے نیند آ گئی مگر سونے سے پہلے میں فیصلہ کر چکا تھا کہ مجھے ان دو ماہ کی چھٹیوں میں زیادہ سے زیادہ کام نمٹا لینے چاہئیں۔

☆-------------☆-------------☆

صبح اٹھ کر میں نے ناشتے کے دوران اماں سے کہا کہ میں بمبئی جانا چاہتا ہوں۔ میں نے زبانی آفس کے کام کا کہا تھا اور گھر میں نہیں بتایا تھا کہ مجھے چھٹی مل گئی ہے۔ اماں اس بات پر ناراض تھیں کہ میں بیماری سے اٹھتے ہی آفس کے چکر میں پڑ گیا۔ بڑی مشکل سے میں نے انہیں منایا اور بتایا کہ وہاں میرا کام کچھ ایسا محنت طلب نہیں ہے بلکہ مجھے آرام کرنے کا کافی وقت مل جائے گا۔ میں اب تک اماں سے فرحت کے بارے میں بات نہیں کر سکا تھا بلکہ سچی بات تو یہ تھی کہ وہ بات میرے ذہن سے نکل ہی گئی تھی۔ آتے ہی تو دادا والا حادثہ ہو گیا تھا۔ موقع بھی نہ تھا اور ابھی دادا کا چالیسواں بھی نہیں ہوا تھا۔ بمبئی جانے کا سن کر اماں نے یہ بھی کہا تھا کہ میں چالیسویں کے بعد ہی گھر سے نکلنے کا سوچوں مگر اس میں کافی دن تھے۔ اس ایک ہفتے میں' میں سب کچھ کر سکتا تھا اس لئے اس وعدے پر انہیں منا لیا کہ چالیسویں پر میں واپس آ جاؤں گا۔

اس دوران میں فرحت سے میری ملاقات بھی نہ ہو پا رہی تھی۔ پندرہ دن تو ہوش اور بے ہوشی کے درمیان ہی نکل گئے تھے۔ وہ ناشتے پر موجود تھی اور کچھ کٹی کٹی سی تھی' کھوئی کھوئی ہوئی۔ میں اپنی الجھنوں میں تھا اس لئے بھی میں نے اس کی طرف دھیان نہ دیا مگر آج اس کے غمگین چہرے کو دیکھ کر یہ فیصلہ ضرور کر لیا کہ بمبئی سے واپسی اور چالیسویں کے بعد اماں کے کان میں ضرور بات ڈال دوں گا۔

میں نے بمبئی کا پروگرام ترتیب دیا۔ مجھے رکنا تو ناصر چچا کے گھر تھا۔ ان کی بیوی' بچے بھی یہاں آنے والے تھے اس لئے مجھے وہاں رہنے میں دشواری بھی نہ ہوتی' بس حبیب سے جان چھڑانا مشکل ہو جاتا مگر وہ ایسا مسئلہ نہ تھا۔ میں اس معاملے میں بہت آزاد آدمی تھا۔ اس سے دو ٹوک بات کر سکتا تھا۔ میں اگلے ہی روز بمبئی کے لئے روانہ ہو گیا۔ اس بار میں نے ٹرین میں سفر کی بجائے ہوائی سفر کو ترجیح دی۔ میں نے اپنے ساتھ ابا کی ڈائری لے لی تھی۔ وہ بہت اہم تھی اور میں ان سب کے بارے میں رابرٹ سے تصدیق بھی کر سکتا تھا۔

میں بمبئی پہنچا تو پتا چلا کہ چند گھنٹے بعد والی ٹرین سے آمنہ چچی اور بچے دہلی جا رہے

ہیں۔ وہ سب مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ ناصر چچا نے بہت زیادہ خوشی کا اظہار کیا۔ طیب غالباً گھر میں نہیں تھا یا مجھے نظر نہیں آیا۔ ہم سب نے ساتھ کھانا کھایا۔ پھر چچی اور بچے ناصر چچا کے ساتھ اسٹیشن چلے گئے۔ میں کچھ آرام کرنا چاہتا تھا۔ گھر میں نوکر موجود تھا۔ اس نے مجھے چائے دی اور میں اخبار لے کر بیٹھ گیا پھر مجھے خیال آیا کہ مجھے رابرٹ کو فون کرنا چاہیے۔ میں فون لے کر اس کمرے میں آگیا جو میرے لئے کھولا گیا تھا۔ میں نے مطلوبہ نمبر ملایا۔ کافی دیر تک بیل جاتی رہی مگر کسی نے نہیں اٹھایا۔ غالباً رابرٹ گھر پر نہیں تھا۔

میں نے فون دوبارہ درمیانی لاؤنج میں رکھ دیا اور اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔ اس وقت شام کے پانچ بج رہے تھے۔ میں گھنٹا بھر بعد نکلنے کا ارادہ کر کے لیٹ گیا۔ ایک بات بتانا میں بھول گیا کہ میں وہ دونوں زنجیریں اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ میں ایک زنجیر رابرٹ کو دوں گا پھر اس کا رد عمل دیکھوں گا۔ اگر وہ اصلی زنجیر کو پہچانتا ہے تو ضرور بتا دے گا۔ یہ دیکھ ہی تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اصل والی اسے مل جاتی۔ بہر حال مجھے تو یوں بھی اس سے جان چھڑانا تھی۔

آدھے گھنٹے تک میں لیٹا اسی غیر متوقع ملاقات کے بارے میں سوچتا رہا جو رابرٹ سے ہونے والی تھی۔ یہ ملاقات رابرٹ کے لئے یقیناً غیر متوقع تھی۔ مجھے امید تھی کہ وہ میرے بارے میں جان کر خوش ہو گا۔ مجھے یاد آگیا کہ وہ دادا کے آگے کیسے گڑگڑا رہا تھا۔ مجھے رضا بھائی اور شجاع بھائی پر بھی غصہ آیا جو زنجیر اسے دینے کے حق میں نہ تھے۔ بھلا اس چھوٹی سی بیکار زنجیر کو دے دینے سے ان کا کون سا نقصان ہو جاتا بلکہ الٹا فائدہ ہی ہوتا اور ہمارے خاندان میں وہ کچھ نہ ہوتا جو اب تک ہو چکا تھا۔ انہیں تو ابا کی موت کے بعد ہی وہ زنجیر اسے واپس کر دینا چاہیے تھی۔ میں نے پہلے یہ بات سنجیدگی سے سوچی پھر مجھے یاد آگیا کہ وہ بھلا اسے کیسے واپس کرتے جسے میں چھپا چکا تھا یعنی سراسر غلطی میری ہی تھی اور میں ہی اسے بھگت بھی رہا تھا۔

میں نے اپنے خیالات کو جھٹک دیا اور تیار ہونے کے لئے اٹھ بیٹھا۔ نہا کر نکلا تو خیال آیا کہ چلتے چلتے فون ہی کر لوں۔ میں نے پھر رابرٹ کا نمبر ملایا۔ اس بار کئی دفعہ بیل بجنے کے بعد میں ریسیور رکھنے ہی والا تھا کہ اچانک دوسری طرف سے کسی نے ریسیور اٹھا لیا۔ "ہیلو!" آواز کسی عورت کی تھی اور بہت خوبصورت آواز تھی۔

"ہیلو! دیکھئے! میں مسٹر رابرٹ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے انتہائی شائستگی سے کہا۔

دوسری جانب موجود عورت ہذیانی انداز میں ہنس پڑی اور پھر کتنی ہی دیر تک ہنستی رہی۔ میں بھونچکا سا ریسیور تھامے کھڑا رہا اور سوچتا رہا کہ میرے جملے کے کسی لفظ میں اس قدر مزاح تھا کہ اس کی ہنسی رک ہی نہیں رہی اور عجیب بات یہ تھی کہ اس ہنسی میں کچھ عجیب سی اور ایسی سفاکی تھی کہ میری ریڑھ کی ہڈی سنسنانے لگی تھی۔

"مسٹر رابرٹ!" وہ اتنا کہہ کر پھر ہنس پڑی۔ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ اسے اپنی ہنسی روکنے میں بڑی دشواری ہو رہی ہے۔

"سوری مس!" میں نے دھیمے سے کہا۔ "کیا میں نے ایسی کوئی مضحکہ خیز بات کہہ دی ہے جو مجھے نہیں کہنا چاہیے تھی؟"

"اوہ!......... آئی ایم سوری!" وہ بولی۔

مجھ محسوس ہوا کہ وہ انڈین نہیں ہے۔ اس کا لہجہ امریکن سا تھا۔

"اٹس آل رائٹ!" میں نے جواباً کہا۔

"یہ بات کافی مضحکہ خیز ہے کہ رابرٹ کسی سے بات کر سکے گا۔ یو نو! آئی مین.........!" وہ ہنس پڑی۔

سفاکی کا ناپسندیدہ احساس مجھے پھر ہوا۔ "کیا وہ اس وقت گھر پر موجود ہیں؟" اب میرا دماغ پھرنے لگا تھا۔

"اوہ یس!......... آف کورس' ہی از ایٹ ہوم بٹ.........!" وہ ہنسی کے دوران کہہ رہی تھی۔

میں نے اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی ریسیور رکھ دیا۔ میں نے خود کو بہت اپ سیٹ محسوس کیا۔ اس عورت کی ہنسی یوں سماعت میں گونج رہی تھی جیسے میرے اندر تک جذب ہو گئی ہو۔ سفاکی ٹھنڈک بن کر میرے دماغ کو منجمد کرنے لگی۔ میرا جی چاہا کہ رابرٹ کے گھر پہنچنے پر یہی عورت دروازہ کھولے اور میں زور دار مکا مار کر اس کے سارے دانت توڑ دوں۔ میں نے بے دھیانی میں تپائی پر لات ماری۔ اس پر رکھی ہوئی پانی کی پیالی ایک چھناکے سے ٹوٹی اور میں حواسوں میں آیا۔ اسی وقت نوکر بھاگتا ہوا آیا۔ میں نے اسے دیکھ کر کندھے اچکائے۔ اس نے پہلے مجھے پھر فرش پر بکھرے پانی تے

ٹکڑوں کو دیکھا اور انہیں چننے لگا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں جا رہا ہوں اور غالباً دیر سے لوٹوں گا۔

"آپ جا رہے ہیں؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں.......... کیوں، ناصر چچا میرے کہیں جانے پر پابندی عائد کر گئے ہیں کیا۔" مجھے اس کا انداز اچھا نہیں لگا تھا۔

"نہیں.......... نہیں.......... وہ دراصل طیب بھیا کا فون آیا تھا۔ وہ آپ کے آنے کا سن کر خوش ہو گئے تھے۔ آپ اس وقت نہا رہے تھے۔ انہوں نے کہا تھا کہ میں آپ کو بتا دوں کہ وہ اپنے کسی خاص دوست کے ساتھ گھر آ رہے ہیں اور آپ کو ان دونوں کا استقبال کرنا ہے۔"

"اوہ تو.........." میں جھنجھلا گیا۔ میں خاص دوست کی اطلاع سن کر ہی سمجھ گیا تھا کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔ "اس سے کہہ دینا کہ مجھے اس سے بھی زیادہ خاص کام تھا۔" میں نے نوکر کو جواب دیا اور گھر سے نکل گیا۔

☆-----------------☆----------------☆

میں ٹھیک پچیس منٹ بعد ایک ویران سے حویلی نما مکان کے زنگ آلود گیٹ پر کھڑا تھا۔ گیٹ بند نہیں تھا۔ میں نے جھانک کر دیکھا۔ ویرانی اور سناٹے کا احساس گہرا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے یہاں کوئی بھی نہیں ہے، بلکہ شاید یہاں کبھی کوئی رہا ہی نہیں ہے۔ جگہ جگہ بکھری گندگی، سوکھے پتے، دیواروں سے لٹکے مکڑیوں کے جالے، دیواروں پر جمی گرد۔ یہاں کسی بھی مکین کے نہ ہونے کی گواہی دے رہی تھی۔ اگر فون پر اس عورت سے میری بات نہ ہوئی ہوتی تو شاید میں یہیں سے یہ سوچ کر لوٹ جاتا کہ وہ یہاں سے کہیں اور جا چکا ہے مگر میری کچھ ہی دیر پہلے اسی گھر کے فون پر بات ہوئی تھی۔ رابرٹ کے علاوہ وہ عورت بھی یہاں موجود تھی۔ میں نے ٹیلی فون کرنے کے بعد ٹیلی فون ڈائریکٹری میں اس ایڈریس کو کنفرم بھی کیا تھا۔

میں نے اندر قدم رکھا۔ ادھر ادھر دیکھتا ہوا آگے بڑھا۔ عمارت کی حالت بہت خستہ تھی۔ دیواروں پر بارش کی وجہ سے بڑے بڑے دھبے پڑے تھے۔ دیواروں کی جڑوں میں گندے پانی کا کافی ذخیرہ تھا جو دیواروں کے ساتھ ساتھ کافی دور تک چلا گیا تھا اور اس کی وجہ سے کائی بڑھ کر دیوار تک پھیلی ہوئی تھی۔ کناروں پر مچھروں کے غول اڑ رہے

تھے۔ گندی بدبو سے دماغ چکرانے لگا تھا۔ میں نے رومال ناک پر رکھ لیا اور اندرونی عمارت کی طرف بڑھتا رہا۔ مجھے یہاں پھر ایک چھوٹے سے لکڑی کے گیٹ کو عبور کرنا پڑا۔ اس گیٹ کے ساتھ ساتھ دائیں اور بائیں طرف کافی دور تک لکڑی کی باڑ بنی ہوئی تھی۔ گندگی کا یہاں بھی وہی عالم تھا۔ یہاں تو کتے بھی پھر رہے تھے جو مجھے حیرت سے دیکھ کر کونوں کھدروں میں ہو گئے تھے۔ پھر ایک کتے نے آگے بڑھنے کی ہمت کر کے بھونکنا بھی چاہا مگر جانے کیوں چپ ہو گیا۔ بلکہ مجھے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے وہ خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹا ہو۔

اب میں ایک بڑے سے دروازے کے قریب پہنچ گیا تھا۔ دروازے پر دستک دے کر میں ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اندر سے کوئی جواب نہیں ملا۔ میں نے پھر دستک دی۔ اس بار آواز تیز تھی۔ اس بار بھی جواب نہیں ملا اور میں انتظار کرتا رہا۔ میں نے تیسری بار بڑی زور زور سے دروازہ دھڑ دھڑایا۔ اسی وقت مجھے مدھم سی آواز آئی مگر یہ آواز ایسی تھی جیسے پکے فرش پر کوئی چیز گھسیٹی جا رہی ہو۔ آواز دروازے کے قریب ہی سے آئی تھی۔ میں نے بے اختیار اپنا کان دروازے کے قریب کر لیا۔ اچانک اسی وقت دروازہ کھل گیا۔ میں جو ایک ہاتھ سے دروازے کے پٹ کو تھامے کھڑا تھا گرتے گرتے بچا۔ پھر یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ دروازے میں کوئی نہیں تھا مگر عین اسی لمحے میری نگاہ نیچے جھکی۔ ایک وجود.......... ہاں وجود.......... ایک انسانی وجود گٹھڑی کی شکل میں لپٹا ہوا نیچے پڑا تھا وہ گٹھڑی گندگی اور بدبو کا ڈھیر تھی اور اس کا جسم یوں ٹیڑھا میڑھا تھا کہ بدن پر چیونٹیاں کی رینگتی محسوس ہوئیں۔ عین اسی لمحے اس وجود میں ہلچل سی ہوئی اور ایک گندے کپڑے کے نیچے سے ایک گول چہرہ جیسے رینگ کر باہر آ گیا ہو۔ جونہی میری نگاہ اس کے چہرے پر پڑی تو میں اچھل پڑا۔

ایک گٹھڑی نما وجود پر بالکل گول سا چہرہ، بیضوی چہرہ، انڈے کی مانند سامنے آ گیا تھا اس کے بال پیشانی سے اتنی دور پیچھے کی طرف سرک گئے تھے جیسے کسی نے پوری وگ کو مٹھی میں پکڑ کر پیچھے کر دیا ہو اور اس کی سفید سفید پتلیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ ہونٹ بھی بالکل سفید تھے۔ چہرے کی جلد کھردری اور موٹی تھی۔ اسے آپ میری ذہانت کہہ لیں کہ میں اسے رابرٹ کی حیثیت سے پہچان گیا اور پہچان کے اسی سنسنی خیز احساس نے مجھے اچھل جانے پر مجبور کیا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی یوں لگا جیسے اس کے مرتے ہوئے جسم میں زندگی

دوڑ گئی ہو۔ سفید پھیلی ہوئی پتلیوں میں حرکت ہوئی‘ جذبے سرسرائے اور اس کے سوکھے ہوئے سفید ہونٹ پھیل گئے۔ میں اس کی حالت دیکھ کر حیران تھا۔ میں نے تو اسے لمبا اونچا اور چوڑے کندھوں کے ساتھ دیکھا تھا۔ اس کے سنہرے بالوں کے لچھے اس کی فراخ پیشانی پر الجھے لگتے تھے۔ اس کی جلد کے نیچے خون بڑی روانی سے دوڑا کرتا تھا اور اس وقت وہ.........

"اوہ.........! ہو......... ہو آر یو؟" اس کی آواز مجھے سکتے سے نکالنے کا سبب بنی ضرور تھی مگر اس آواز نے مجھے دوسری مرتبہ پھر اسی کیفیت میں مبتلا کر کے منجمد کر دیا تھا۔ وہ آواز ایسی تھی جیسے دو کھوکھلے بانس بہت تیز جھکڑ میں ایک دوسرے سے ٹکرا گئے ہوں اور اس کی بازگشت فضا میں سر پھوڑتی پھر رہی ہو۔ اس کی سکڑتی پھیلتی پتلیوں نے مجھ میں کچھ حرارت دوڑائی۔

"آر یو مسٹر رابرٹ؟" میں بے اختیار جھک گیا۔

"لیں.........! تم کون ہے؟" یہ سوال کرنے کے باوجود میں اس کی آنکھوں میں ہلکے ہلکے سے پہچان کے رنگ پا گیا تھا مگر ان رنگوں میں ایک عجیب سی مسرت انگیز پکار تھی جیسے وہ گمان کر رہا ہو کہ یہ میں ہوں......... اور حسرت سے دعا گو ہو کہ اس کا اندازہ درست ثابت ہو۔

"میں عطاالرب رضوی کا چھوٹا بیٹا‘ ضیاء الرب رضوی ہوں مسٹر رابرٹ!"

وہ اپنے سکڑے سمٹے وجود کی بے چینی کو قابو میں نہیں رکھ سکا اور لڑھکتا ہوا‘ کچھ گھسٹتا ہوا میرے بالکل قریب چلا آیا۔ "اوہ! ضیاء......... مسٹر ضیاء.........! آئی کانٹ بلیو اٹ۔"

"بلیو اٹ! میں آپ کی تلاش میں تھا۔ بڑی مشکل سے آپ کا پتا چل سکا ہے۔"

وہ یوں پیچھے سرکا جیسے مجھے اندر آنے کا راستہ دے رہا ہو۔ "کم آن مسٹر ضیاء!" وہ پلٹ گیا۔ میں اس کے پیچھے تھا اور اسے اس حالت میں دیکھ کر ایک نامعلوم سی کراہیت آمیز حیرت میں غرق تھا۔ اب میں نے پھر اس کا جائزہ لیا۔ اس کا پیٹ اس کے ٹخنے کے اوپر جھکا ہوا تھا اور قدرے آگے کی طرف لٹکا ہوا تھا۔ سینہ اندر کی طرف دبا ہوا تھا جبکہ کندھے اور ان کے درمیان رکھا ہوا سر اسے ہیبت ناک بنا رہا تھا کیونکہ یہ حصہ بھی سینے کے اوپر سے کچھ آگے کو نکلا ہوا تھا۔

سر مسلسل اوپر دیکھنے کی وجہ سے یوں لگتا تھا جیسے کسی پلیٹ کی طرح اس کے دونوں کندھوں کے بیچ رکھا ہو۔ جب وہ مجھ سے آگے ہو کر گھسٹتا ہوا اندر جا رہا تھا تو میں حیرت سے سوچ رہا تھا کہ اس کا بدن اس قدر چھوٹا کیسے ہو گیا؟ اگر ٹانگیں معذور بھی ہوئی ہوں تو اس کے اوپر کا دھڑ تو اپنی قامت نہیں گھٹا سکتا تھا۔ اگر کمزور بھی ہو گیا ہو تا تب بھی اس دھڑ کی لمبائی کیسے کم ہو سکتی تھی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے کانٹوں سے بھری "سے" لڑھکتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے۔ بلاشبہ اس کی حالت نے مجھے بڑے کربسہ خوف میں مبتلا کر دیا تھا۔

وہ کچھ کہہ رہا تھا۔ عجیب سا ارتعاش تھا جو میری سماعت سے ٹکرا تو رہا تھا مگر میں اس آواز کو‘ اس غرغراہٹ کو الفاظ کی صورت سمجھنے سے قاصر تھا۔ وہ آواز بغیر وقفے کے مسلسل آ رہی تھی اور میں اس کے پیچھے چلتا ہوا عمارت کے اندر داخل ہو رہا تھا۔ پہلے میں بے چین سا ہو اٹھا کہ اسے بولنے سے منع کر دوں‘ کہہ دوں کہ میں کچھ نہیں سمجھ رہا جب ہم کسی جگہ بیٹھیں گے تو باتیں کریں گے مگر پھر پتا نہیں کیوں‘ میں چپ رہ گیا۔ میں نے اس اذیتناک اور ناگوار کیفیت سے چھٹکارا پانے کے لئے اطراف کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔

ہم جس دروازے سے اندر داخل ہوئے تھے‘ وہ گول اونچی چھت والا ایک بہت بڑا کمرا تھا جو بالکل خالی تھا۔ جہاں ہمارے قدموں کی چاپ یوں گونج رہی تھی جیسے ہم ہمارے سروں پر سے گزر رہے ہیں۔ یہاں لفظ "ہم" اور لفظ "قدموں" میں نے قطعی غلط استعمال کیا ہے۔ میں اکیلا ہی جیسے اپنے سر سے گزر رہا تھا اور وہ......... وہ بھی میرے ساتھ سر پر گھسٹ رہا تھا۔ اس کے سرکنے کی آواز میری کھوپڑی کی ہڈی پر بھی خراشیں ڈال رہی تھی۔ اس گونج دار کیفیت نے مجھے بہت زیادہ حواس باختہ کر دیا تھا۔ اس خالی کمرے کے بیچوں بیچ ایک لمبی لوہے کی پتلی سلاخ میں چھوٹے چھوٹے پروں والا بجلی کا پنکھا لٹک رہا تھا۔ بڑی بڑی کھڑکیوں کو کھردرے شیشوں سے بند کیا گیا تھا۔ فرش پر چار خانوں والے ٹائلز لگے تھے۔ دیواروں پر چڑھا ہوا پیلا رنگ تھا جو وحشت پھیلاتا محسوس ہو رہا تھا۔ چھت اونچائی میں اوپر کو دھنستی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ کمرے میں سرمئی شام کا احساس ہونے کے باوجود تپش کی شدت تھی۔

میں جیسے بہت دیر سے چل رہا تھا اور وہ......... بڑی دیر سے گھسٹ رہا تھا۔ پتا

نہیں' وہ تھکا یا نہیں مگر میں تھک گیا جیسے گھنٹوں سے بے آب و گیاہ صحرا میں محو سفر ہوں جہاں نہ سایہ ہے نہ بیٹھنے کی جگہ۔ میری ریڑھ کی ہڈی چٹخنے لگی۔ میرا جی چاہا کہ میں ذرا دیر کو بیٹھ جاؤں۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ کمرا بہت زیادہ طویل یا بڑا نہیں تھا۔ سامنے والا دروازہ جس کی طرف ہم بڑھ رہے تھے' وہ ہم سے چند قدم کے فاصلے پر نظر آ رہا تھا۔ اس کا احساس ہوتے ہی مجھے پھر حیرت ہوئی۔ وہ عجیب سی کھڑکھڑاتی ہوئی آواز اب بھی مسلسل اس کے لڑھکتے ہوئے وجود سے اٹھ کر دور دور تک گونج رہی تھی۔ مجھے اپنے سر میں دھماکے سے محسوس ہونے لگے تھے۔ اتنی ناگوار آواز میں زندگی میں پہلی بار سن رہا تھا۔

پھر میری تھکاوٹ اچانک ختم ہو گئی۔ ہم دروازے تک پہنچ گئے۔ اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا بلکہ سر کو پیچھے کی طرف اونچا کر کے میری طرف دیکھا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے اس کی گردن کسی اسپرنگ میں تبدیل ہو چکی ہے۔ وہ اپنے سر کو جس طرف چاہے گھما سکتا ہے۔ اس کے لئے اسے اپنے بدن کو جنبش دینے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی یعنی وہ اپنے پیچھے بھی اسی طرف صرف گردن گھما کر دیکھ سکتا تھا جیسے دائیں اور بائیں۔

"مسٹر ضیا! میں بہت خوش ہوا ہوں۔ یہ خوشی مجھے پورے چودہ برس بعد نصیب ہوئی ہے اور ایسے میں جب آدمی موت کے سامنے ہار چکا ہو' جب زندگی کے لئے کی جانے والی ہر جدوجہد ناکام ہو چکی ہو' تب اگر زندگی کی طرف کوئی روزن کھل جائے تو انسان کیسا محسوس کرتا ہے! کیا تمہیں اندازہ ہے؟" اس نے انگریزی میں پوچھا۔

"ہاں........ مسٹر رابرٹ! مجھے اندازہ ہے اور مجھے دکھ ہے اس بات کا کہ میں نے اس معاملے کو اتنی سنجیدگی سے کبھی نہیں لیا تھا ورنہ میں اب سے بہت پہلے بھی آ سکتا تھا! میرا آنا قطعی دشوار نہیں تھا۔" میں نے بھی انگریزی میں جواب دیا۔

ہم جس کمرے میں داخل ہوئے تھے' وہ ڈرائنگ روم جیسا تھا مگر ایک طرف پڑے سنگل بیڈ نے اسے بیڈ روم بنا دیا تھا۔ وہاں رکھے صوفے میلے اور بڑی خراب حالت میں تھے۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر پڑے پردوں کی اصل صورت بگڑ کر [illegible] تبدیل ہو چکی تھی اور کناروں سے جھانکتا ہوا ہلکا پیلا رنگ ثابت کر رہا تھا کہ وہ پہلے خاکی رنگ کے نہیں تھے بلکہ پردوں کا کچھ حصہ تو سیاہی مائل خاکی ہو چکا تھا۔ بستر کی چادر اور تکیہ میلا تھا اور اس کمرے میں عجیب سی' بہت ناگوار بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ سنگل بیڈ عام اونچائی کا حامل تھا۔ پوری طرح نظر آ رہا تھا کہ وہ رابرٹ کا بستر ہے مگر [illegible]

اس لئے تھا کہ وہ بیڈ کے اوپر کیسے چڑھتا اور کیسے اس پر سے اترتا ہو گا۔

"بیٹھو مسٹر ضیا!" اس نے اپنی آنکھوں سے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

میں بیٹھ گیا۔ اچانک اس کا گٹھڑی نما وجود بے ڈھب انداز سے دائیں سے بائیں ہوا اور اس کے لمبے لمبے ہاتھ باہر نکل آئے۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ان بازوؤں کی لمبائی کم نہیں ہوئی تھی لیکن موٹائی اور چوڑائی کم ہو چکی تھی۔ ایسا لگا تھا جیسے اس نے دونوں ہاتھ اپنے نیچے سے نکالے ہوں۔ جیسے انہی ہاتھوں کی مدد سے آگے بڑھ رہا تھا پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ سرکتا ہوا صوفے کی طرف پشت کر کے اس کے نزدیک ہو گیا۔ دونوں ہتھیلیوں کو اس نے زمین پر ٹکایا اور اپنا پورا وجود ان بازوؤں کے زور پر اٹھا کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ میری حالت اس وقت بالکل اس بچے کی سی تھی جو کسی جادوگر یا شعبدے باز کے کرتب دیکھ رہا ہو۔ اسے سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو مگر حیرت اسے کچھ سوچنے سمجھنے نہیں دے رہی ہو۔ وہ صوفے پر بیٹھا تو مجھے اس کی ٹانگیں بھی نظر آ گئیں مگر ان دو پتلی پتلی لکڑیوں کو ٹانگیں کہنا بہت دشوار تھا۔ اس کے پاؤں بھی سکڑ کر گولائی اختیار کر چکے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیسے اس کا پورا حلیہ آپ کو سمجھاؤں! میرا خیال ہے کہ اگر میں مزید ایک گھنٹے تک بولتا رہوں تب بھی آپ اسے امیج نہیں کر سکیں۔ میں اس کی ہر حرکت کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ خود اپنی حالت کا عادی ہو چکا ہے۔ صوفے پر اطمینان سے بیٹھنے کے بعد اس نے میری طرف دیکھا اور لگا جیسے میرے چہرے پر پھیلی حیرت کا سبب جان گیا ہو۔ ایک دم اداسی سی پھیل گئی اس کے چہرے پر' آنکھوں میں جیسے ماضی لوٹ اٹھا۔

"مسٹر ضیاء! یہ........" اس نے اپنے وجود پر نگاہ کی۔ "یہ حالت دیکھ رہے ہو تم! یہ سب اسی سبب سے ہے۔ میں نے چاہا تھا کہ تمہارا گرینڈ فادر میری مدد کرے۔ تم لوگ مجھ سے تعاون کرو۔ میں جانتا تھا کہ وہ چیز نہ ملی تو کیا ہو گا۔ میں نے اسے بتانے کی کوشش کی مگر اس نے........ اس نے میری بات سننے کی زحمت بھی نہیں کی۔ کاش! وہ میری بات سن لیتا تو آج میری یہ حالت نہ ہوتی۔" وہ غمزدہ تھا پھر چونک اٹھا جیسے اسے کچھ یاد آ گیا ہو۔ "تم سب........ تم سب تو ٹھیک ہو ناں!" یہ کہہ کر اس نے بڑی گہری نظروں سے میرے سراپا پہ نگاہ ڈالی اور حیرت سے اس کا منہ کھل گیا۔ "تم تو........ تم تو بالکل ٹھیک ہو........ مگر........ کیسے........؟ یہ سب میرے لئے حیرت انگیز ہے۔"

میرے خیال میں تو تمہیں مجھ سے بھی زیادہ اذیت میں ہونا چاہیے تھا۔"
اور خوف سے میرے بدن میں پھریری سی چھوٹ گئی۔ "مجھے آپ کو اس طرح دیکھ کر سخت اذیت ہوئی ہے۔ میں خود کو ہر واقعے کا مجرم سمجھتا ہوں لیکن میں نے جو کچھ کیا تھا' وہ بچپنے میں کیا تھا۔" پھر میں نے اسے اس زنجیر کے چرانے سے لے کر آج تک کے واقعات بلاکم و کاست بتا دیے۔ وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے میری طویل داستان سنتا رہا۔ کبھی کبھی اس کے چہرے پر خوشی کھل اٹھتی تھی اور کبھی وہ حیرت سے چونک اٹھتا تھا۔ خواب کی تفصیلات بتاتے ہوئے میں نے اس کے چہرے پر اذیت اور دکھ کے تاثرات بھی دیکھے لیکن جب میں نے اسے شالی بابا اور ان کے دیے ہوئے پتھر کا ذکر کیا تو وہ اچھل پڑا۔

"کیا وہ تمہارے پاس ہے؟" وہ دائیں طرف' میری جانب سرک آیا۔

"جی! میں نے کہا اور جیب سے پرس نکال کر اس میں رکھا وہ پتھر اسے دکھایا جو مجھے ابا کی صندوقچی سے ملا تھا جبکہ مجھے دیا ہوا پتھر اس وقت بھی میرے بازو پر بندھا ہوا تھا۔

اس نے پتھر ہاتھ میں لیا۔ اسے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ چہرے پر بے یقینی سی پھیل گئی۔ "یہ......... کیا ہے یہ؟"

"میں نہیں جانتا......... مگر شالی بابا نے بالکل اسی قسم کا ایک پتھر مجھے بھی دیا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ اسے ہر وقت اپنے ساتھ رکھنا ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔" پھر میں نے اسے دادا کے ساتھ اسپتال جانے اور وہاں خوفناک کیفیت سے دوچار ہونے والا واقعہ بھی سنایا۔ وہ سنتا رہا اور ہاتھ میں پکڑے پتھر کو بھی دیکھتا رہا۔ میرے خاموش ہونے پر بولا۔

"ویل......... لیکن عطا نے ذکر نہیں کیا کہ وہ کسی شالی بابا کو جانتا ہے یا اس نے اسے ایسی کوئی چیز دی ہے۔ کیا وہ ہم سے کچھ چھپا رہا تھا.........؟ یا......... اس کے دل میں کچھ اور تھا اور وہ......... وہ شاید ہمیں دھوکا دینا چاہتا تھا۔"

مجھے اس کی یہ بات اچھی نہیں لگی مگر میں اپنے باپ کو صرف اس لئے نہیں سمجھ سکتا تھا کہ وہ میرا باپ ہے۔ وہ انسان تھا' کچھ بھی سوچ سکتا تھا اور کچھ بھی کر سکتا تھا۔ ناگواری کے احساس نے جلد ہی مجھے خالی کر دیا۔ "میں نہیں جانتا......... میں یہ ضرور جاننا چاہتا ہوں کہ یہ چکر کیا تھا؟ میں وہ زنجیر لے کر آیا ہوں۔ دادا نے بھی کہا تھا کہ میں تمہارے حوالے کر دوں مگر مسٹر رابرٹ! میں اس سارے گورکھ دھندے کا مقصد جاننے کے بعد ہی اسے تمہارے حوالے کروں گا۔ وہ کیسی زنجیر ہے؟ کہاں سے حاصل کی گئی؟ اسے حاصل کرنے کے بعد تم لوگ کیا کرنا چاہتے تھے اور ایسی ہی دوسری باتیں۔ تم مجھے یہ بھی بتاؤ کہ جو خواب میں مسلسل دیکھ رہا ہوں' اس کا کیا راز ہے؟ کیا یہ خواب درست ہے؟ ہاں تو کیا ان لوگوں میں تم بھی شامل تھے؟ وہ قبر جو میں دیکھتا ہوں' وہ کس کی ہے؟ وہ عورت کون ہے؟ میں یہ سب جاننا چاہتا ہوں..."

میں چپ ہوا تو سناٹا بڑھنے لگا۔ وہ بڑے غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں الجھن کے ساتھ ساتھ ایک اطمینان بھی تھا۔ کچھ دیر کسی گہری سوچ میں ڈوبا مجھے دیکھتا رہا پھر اپنی کریہہ آواز میں بولا۔ "مسٹر ضیاء! تم شاید اس پورے معاملے کو بہت ایزی لے رہے ہو۔ غالباً تمہارے ذہن میں یہ خیال ہے کہ آج ہی میں تمہیں ساری کہانی سنا دوں گا' تم وہ زنجیر مجھے دے دو گے۔ میں اس کے ہاتھ میں آتے ہی جادو کے اثر سے پہلے جیسا لمبا چوڑا جسم اختیار کر لوں گا۔ وہ مکڑیاں دنیا سے ناپید ہو جائیں گی۔ نہ تمہیں وہ خواب پریشان کرے گا اور نہ کوئی اور خوفناک واقعہ تمہارے خاندان میں رونما ہو گا۔ زندگی اتنی ہی آسان ہو جائے گی' جتنی پہلے تھی۔ نو......... نیور مسٹر ضیاء! ہم جو غلطیاں کرتے جاتے ہیں' وہ ہمارے آگے بڑھتے ہی آکٹوپس کی طرح اپنے ہاتھ لمبے کر کے چاروں طرف کے معاملات کو جکڑ لیتی ہیں۔ ہمیں احساس نہیں ہوتا کہ ہم کیا کر آئے ہیں اس لئے بے خبر آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ ہم پلٹ کر دیکھنے کا اوراک کرتے ہیں اور ہمیں نظر آ جاتا ہے کہ کیا ہو چکا ہے اور آگے بڑھنے کے لئے ہم کونسا محفوظ راستہ اختیار کر سکتے ہیں۔ ایسا ہو جائے تو ہم یقیناً نکل آتے ہیں مگر اکثر ایسا نہیں ہوتا۔ بہت دیر ہو جاتی ہے' ہمارے آگے بڑھنے کے راستے مسدود ہو جاتے ہیں۔ ہماری اپنی ہی غلطی آگے کہیں ہمارا راستہ روکے کھڑی ہوتی ہے اور......... تم جانتے ہو کہ بہت دور نکل جانے کے بعد پیچھے لوٹنا اور اس غلطی کے اثرات کو زائل کرنا کتنا دشوار طلب ہوتا ہے۔ خاص طور پر اس وقت' جب وہ خطرناک حد تک تیزی سے دور دور تک پھیل چکے ہوں۔"

"کیا آپ مجھے مایوس کرنا چاہتے ہیں؟" مجھے الجھن محسوس ہوئی۔

"نہیں......... تم بہت طاقتور ہو۔ تم مایوس نہیں ہو سکتے اس لئے میں حقائق بیان کر رہا ہوں۔ یہ محسوس کرنے کے بعد کہ تم حقائق سے گھبرانے والے نہیں ہو' اب یوں

بھی میں اس قابل نہیں رہا کہ لوگوں کو مس گائیڈ کر کے اپنا کوئی کام نکال سکوں اس لئے تمہیں مجھ پر شک نہیں کرنا چاہیے۔ میں موت کی دہلیز پر کھڑا ہوں۔ ایک چوکھٹ ہے اور اندر میں موت کو جنبش کرتے' اپنے استقبال کی تیاریاں کرتے بھی صاف دیکھ سکتا ہوں اس لئے تم مجھے کسی بھی قسم کے الزام سے مبرا رکھو۔ میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ نادانستگی ہی میں سہی' جو غلطیاں ہم سے' بالخصوص عطا سے سرزد ہوئی ہیں' وہ خوفناک حد تک تباہ کن تھیں۔ مجھے اپنی موت کا کوئی افسوس نہیں ہوگا مگر میں عطا کی موت پر بہت پریشان رہا۔ میں پیاس ٹریگو کی اذیت سے بے چین ہوں۔ میں جینو پاپا کے جوان اور مضبوط توانا جسم کی رفتہ رفتہ سکڑنے سے خوف زدہ ہوں۔ میں سورن سنگھ کے لئے بھی فکر مند ہوں اور پرکاش کے لئے بھی۔"

"یہ سب کہاں ہیں؟" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"جلدی نہ کرو مسٹر ضیاء!" اس نے ہاتھ اٹھا کر جواب دیا۔ "ان تک پہنچنے کے لئے تمہیں میری مدد کرنا ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ ان تک پہنچنا تمہارے لئے اتنا آسان نہ ہوگا۔"

مجھے لگا جیسے وہ مجھے بلیک میل کر رہا ہے۔ غصہ میری کن پٹیوں میں جمع ہونے لگا پھر اچانک اس کی آواز نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

"میں نے ان سب کو فون کئے تھے مگر ان میں سے کسی سے بھی بات نہیں ہو سکی۔" اس نے گہرا سانس لے کر کہا۔ "شاید کبھی بھی میں ان سے بات نہیں کر پاؤں گا۔" اس نے سرگوشی کی۔ "وہ لوگ خود فون نہیں اٹھاتے اور...... جو اٹھاتا ہے وہ........."

عین اس لمحے مجھے اس عورت کا خیال آ گیا جس نے خود رابرٹ کا فون اٹھا کر اور ہذیانی ہنسی ہنس کر مجھے بتایا تھا کہ وہ بات کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ "مسٹر رابرٹ!" میں ایک دم بول اٹھا۔ وہ چونک گیا۔ "کیا وہاں........ کوئی عورت فون اٹھاتی ہے؟" لہجہ خود میرے لئے اجنبی سا لگا۔

اس نے حیرت سے مجھے دیکھا پھر سر کو زور زور سے ہلایا۔ "ہاں........ لیکن........ تم کیسے جانتے ہو؟ کیا تم نے انہیں فون کرنے کی کوشش کی تھی؟"

میں چند لمحے سوچتا رہا۔ میں سوچ رہا تھا کہ جانے ان سب کی کیا حالت ہوگی۔ "آپ

آپ کیسے جانتے ہیں کہ جینو پاپا ریکو کا مضبوط بدن سکڑ رہا ہے؟" میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کر دیا۔

"مجھے یقین ہے' صرف اس کے ساتھ نہیں' باقی لوگوں کے ساتھ بھی وہی کچھ ہوا ہوگا جو میرے ساتھ ہو رہا ہے پھر......... آخری بار جب جینو مجھ سے ملا تھا تو اس کے بدن میں بھی اسی طرح کی جلن تھی جو اس کے چلے جانے کے دو ماہ بعد میں نے اپنے آپ میں محسوس کی تھی۔ وہ آیا تو اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس کی کانوں کی لوئیں تو عنابی ہو چکی تھیں۔ میں نے پوچھا تھا تو اس نے کہا کہ وہ شاید بیمار ہے۔ اس کے بدن میں ایک عجیب سی جلن ہے۔ اسے یوں لگتا ہے' جیسے گرم سیسہ سا اس کی رگوں میں بہہ رہا ہے۔ میں نے اسے چیک اپ کا مشورہ دیا تھا۔ وہ بے پناہ بے کل تھا۔ وہ چلا گیا تو میں نے اس کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا مگر ٹھیک دو ماہ بعد مجھے اپنے اندر تپش کا احساس ہونے لگا تھا۔ پہلے تو میں نے دھیان نہیں دیا مگر پھر بہت جلد مجھے احساس ہو گیا کہ میرے بدن میں لہو کی جگہ سیسہ بہہ رہا ہے۔ میں نے ڈاکٹرز کو دکھایا۔ ہر طرح کے ٹیسٹ بھی لئے۔ ماہرین کو بتایا مگر کیا تم یقین کرو گے سب کی رپورٹس ایک جیسی تھیں کہ میں قطعی صحت مند ہوں۔ نہ مجھے کچھ ہوا ہے' نہ کچھ ہو رہا ہے۔ بعض نے میری بے چینی دیکھ کر مجھے ماہر نفسیات سے ملنے کا مشورہ بھی دیا۔ میں ملا بھی مگر کیا میں اسے بتا سکتا تھا کہ ہم نے پُراسراریت کے چکر میں آ کر رات کے خوفناک اندھیروں اور جھینگروں کی نفرت انگیز آوازوں کے درمیان قبریں کھود کر کیا کچھ کیا ہے؟ نہیں مسٹر ضیاء! ہم میں سے کسی کی اتنی ہمت نہیں کہ ہم یہ بتا سکتے۔ بہرحال رفتہ رفتہ میری کیفیت شدت اختیار کرنے لگی تو میں نے ایک روز اسے فون کیا۔ اس روز میری اس سے آخری بار گفتگو ہوئی تھی اور گفتگو بھی کیا ہوئی تھی' وہ میری آواز سنتے ہی رونے لگا تھا۔ زور زور سے' اور کیا تم یقین کرو گے کہ اس کی آواز سن کر مجھے یوں لگتا تھا جیسی جینو اکیلا نہیں رو رہا ہے بلکہ اس کے اندر بھی کوئی ہے جو اس کے ساتھ مل کر رو رہا ہے۔ وہ دو آوازیں تھیں۔ ایک لڑکھڑاتے بانسوں جیسی اور......... دوسری......... جینو کی اپنی معصوم اور نرم سی۔ وہ ہم میں سب سے کم عمر تھا اور ہم سب سے زیادہ معصوم اور بھولا بھالا بھی۔ اس میں قطعی تیزی یا چالاکی نہیں تھی۔ وہ ایک خوبصورت اور سیدھا سادا مگر پُرجوش نوجوان تھا اور اسی وجہ سے میں اس کی طرف سے زیادہ فکر مند تھا۔ میں نے اسے یہ بتانے کے لئے فون

کیا تھا کہ میں بھی اس کی طرح اسی جلن کا شکار ہو چکا ہوں۔ میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ کیا وہ اب ٹھیک ہے مگر وہ روتا رہا اور میں اسے کچھ بھی نہیں بتا سکا بلکہ اسے تسلیاں دیتا اور خیریت دریافت کرتا رہا پھر یوں لگا جیسے کسی نے ریسیور اس کے ہاتھ سے چھین لیا ہو۔ اس کی آواز ریسیور سے دور ہو گئی تھی۔ میں چیخا۔ "جینو.........! جینو! مجھ سے بات کرو۔" مگر کسی نے دھیرے سے مجھے ڈانٹ دیا "شٹ اپ!"

میں بھونچکا رہ گیا۔ وہ کوئی عورت تھی جس نے ڈانٹ کر ریسیور کریڈل پر ڈال دیا تھا۔ رابطہ منقطع ہو گیا تھا۔ اس روز کے بعد میں آج تک اس سے بات کرنے سے قاصر ہوں۔ میں نے کئی بار فون کیا۔ کسی نے اٹھایا بھی مگر بغیر کچھ کہے ریسیور رکھ دیا گیا۔"

"کیا تم اس سے ملنے نہیں جا سکتے تھے؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"اس دوران میں' میں چلنے پھرنے سے معذور ہو چکا تھا۔ میرے گھٹنوں اور ٹخنوں کی ہڈیاں جیسے جیلی کی شکل اختیار کر چکی تھیں۔ میں کھڑا نہیں رہ سکتا تھا ورنہ......... ضرور جاتا۔"

پتا نہیں' مجھے کیوں ایسا لگا جیسے وہ اپنے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتا' نہ اس عورت کی موجودگی سے آگاہ ہے جس نے فون پر مجھے رابرٹ سے بات نہیں کرنے دی اور نہ ہی اپنی آواز کے بارے میں اسے آگہی ہے کہ وہ بھی جینو پاپا ایسی ہو چکی ہے۔ وہ اس کی آواز کے بارے میں جب بتا رہا تھا تو مجھے یوں لگا تھا جیسے اسے جھرجھری آئی ہو۔ بالکل اسی طرح جیسے میں نے اس کی آواز سن کر بدن میں جھرجھری محسوس کی تھی۔

اس روز مجھے اپنے بارے میں بھی معلوم ہوا کہ میں سفاک ہوں۔ جب میں نے اس کی بات ختم ہوتے ہی کہا۔ "خود تمہاری آواز کب تبدیل ہوئی؟" میرے لہجے کا سپاٹ پن سفاکانہ تھا۔ وہ جیسے اچھل پڑا۔

"نہیں......... نن......... نہیں تو......... تم......... کیا کہنا چاہتے ہو؟ کیا تم مجھے خوفزدہ کرنے کی کوشش کر رہے ہو؟"

"نہیں......... بالکل اسی طرح تمہیں حقائق سے آگاہ کر رہا ہوں جس طرح تم مجھے آگاہ کر رہے تھے۔ تمہاری آواز بہت خوفناک ہے اور تمہارا وجود........."

"ہاں! میرا وجود یقیناً خوفناک ہے مگر آواز......... تم سے پہلے کسی نے ایسا نہیں کہا۔"

"کسی نے؟ کیا تم نے جینو کے بعد کسی سے بات کی ہے؟"

وہ ایک دم چونک کر مجھے دیکھنے لگا پھر یوں لگا جیسے وہ کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو پھر شاید اسے سب کچھ یاد آ گیا۔ اسے یاد آ گیا کہ تب ہی سے اس کی کسی سے بات نہیں ہوئی' یہ سب میں اس کے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگ سے جان گیا اور وہ بالآخر بول اٹھا۔

"ہاں.........!" اس نے تھوک نگلا۔ "تب سے کسی سے بات بھی تو نہیں ہوئی۔ کسی نے فون بھی نہیں کیا۔"

"ممکن ہے کہ فون آئے ہوں مسٹر رابرٹ! جینو نے' پپاس ٹریگو نے' پرکاش اور سورن سنگھ نے' سب نے تمہیں فون کیے ہوں گے مگر اس عورت نے بات نہیں کرنے دی ہوگی اور فس کر یا ڈانٹ کر کریڈل پر ریسیور پٹخ دیا ہوگا۔" میرے اندر کی تمام سفاکی' الفاظ کا روپ دھار چکی تھی۔ میں نے آنکھیں اس کے چہرے پر گاڑ دی تھیں۔ میں اس کا ردعمل دیکھنا چاہتا تھا۔

وہ سفید ہو گیا۔ اس نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ "یہاں کوئی نہیں ہے۔ میں اکیلا ہوں۔" اس نے پھر سہمے ہوئے انداز میں چاروں طرف دیکھا پھر اپنے بیڈ کے سرہانے میز پر رکھے ٹیلی فون سیٹ کو گھورتے ہوئے بولا۔ "فون یہاں ہے۔ میرے سرہانے۔ اگر اس کی بیل بجتی تو......... تو میں خود فون اٹھاتا۔" خوف اس کے ہونٹوں پر پھیل گیا تھا اور اس کے منہ سے نکلے ہوئے ہر لفظ سے چپکا ہوا تھا۔

"مگر بیل نہیں بجی! یہی کہنا چاہتے ہو نا تم! کیا جینو اور دوسرے ساتھیوں نے تم سے رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی ہوگی اور کیا تم نے بھی ایسی کوئی کوشش نہیں کی؟"

اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ "کی تھی......... مگر......... کسی کے ہاں سے کوئی جواب نہیں ملا مگر سنو! کیا تم یقین سے کہہ رہے ہو کہ یہاں بھی ایسا ہی ہوا ہوگا؟"

"یہاں بھی ایسا ہی ہوا ہے مسٹر رابرٹ!" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اب میں اسے اس حالت میں دیکھنے کا عادی ہو چکا تھا۔ اب مجھے اس سے کراہیت بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ "میں نے آج......... یہاں آنے سے ٹھیک بیس منٹ پہلے تمہیں فون کیا تھا۔ کسی عورت نے اٹھا کر اور یہ سن کر قہقہہ لگایا تھا کہ میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے کہا تھا کہ تم بات کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔ میں

سمجھا تھا کہ تم شاید گونگے ہو چکے ہو یا ایسا کوئی حادثہ رونما ہو چکا ہے کہ تم بول نہیں سکتے مگر میں نے یہاں آنے کا ارادہ ترک نہیں کیا۔ میں نے اس سے پوچھا تھا کہ وہ ہنس کیوں رہی ہے مگر اس نے جواب نہیں دیا تھا۔ دیکھو مسٹر رابرٹ! میرا اپنا یہ خیال ہے کہ وہ عورت انگریز تھی۔ اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ انگریز ہے۔ کیا وہ ایلن ہے؟"

ایلن کا نام سن کر رابرٹ کی حالت بہت خراب ہو گئی۔ مجھے ڈر لگا کہ وہ مرنے والا ہے۔ وحشت سے اس کا دل بند ہونے والا ہے مگر اس نے بہت جلدی خود کو سنبھال لیا۔ اس کے لئے اسے آنکھیں بند کر کے خود کو قابو میں کرنے کے لئے اتنی کوشش کرنا پڑی کہ اس کے چہرے کی سفیدی' گلابی رنگ میں تبدیل ہو گئی لیکن جب بہت گہرے سانس لے کر اس نے آنکھیں کھولیں تو چہرے کی سفیدی دھیرے دھیرے لوٹ آئی۔

"ایلن.......... اف.......... میں اس نام سے منسوب خوف کی شدت کو کبھی کوئی نام نہیں دے پایا۔ اگر ایلن نہ ہوتی' ہم سے نہ ملتی تو شاید ہم سب بڑی پُرسکون زندگی گزار رہے ہوتے۔ میں روز کے ساتھ میامی کی ٹھنڈی مگر حرارت بخش ریت پر آنکھیں بند کئے لیٹا ہوتا اور روز اپنے مخصوص لہجے میں' پُرجوش انداز میں مجھے بتا رہی ہوتی کہ اس نے کیسے گھر کا خواب دیکھا ہے اور کتنی ہی چیزیں بنانا سیکھ لی ہیں جن سے وہ اپنے گھر کو سجانے والی ہے۔ وہ بار بار مجھے جذباتی ہو کر بے قابو ہو جانے کا طعنہ بھی دیتی رہتی۔ مجھے چرچ جا کر مراقبہ کرنے کی نصیحت وہ ہزار بار کر چکی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اگر میں وہاں اکیلے میں بیٹھ کر آنکھیں بند کر کے یسوع مسیح کے روبرو خود کو محسوس کرنے کے بعد یہ دعا کروں کہ میرے جذبات کی طغیانی کم ہو جائے تو میں ایک حیرت انگیز اور پاکیزہ زندگی گزارنے کے لئے تیار ہو سکتا ہوں۔"

وہ فضول باتیں کر رہا تھا۔ مجھے اس کی روز اور اس کے نظریہ زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں ایلن کے بارے میں جاننا چاہتا تھا اور اس کے انداز سے لگ رہا تھا جیسے وہ اس وقت میامی بیچ پر سرخ رنگ کا سلکی انڈرویئر پہنے' سرخ رنگ کی چھتری کے نیچے آنکھیں بند کئے لیٹا ہے۔

"مسٹر رابرٹ! آپ ایلن کے بارے میں بتا رہے تھے۔" میں نے بڑی بے دردی سے اسے حال کی طرف گھسیٹ لیا۔

وہ آنکھیں کھول کر مجھے گھورنے لگا۔ کچھ دیر پلک جھپکے بغیر مجھے دیکھتا رہا پھر حقیقت

کی دنیا میں لوٹ آیا۔ "تم اسے کیسے جانتے ہو؟"

"کیا یہ بتانا ضروری ہے؟"

"ہاں! کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ تم زیادہ تفصیلات میں جاؤ۔ میرا خیال ہے کہ تم اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے۔"

"صرف اتنا جانتا ہوں کہ خواب میں' میں جس عورت کو قبر کے اندر دیکھتا ہوں۔ اسے دیکھ کر مجھے احساس ہوتا ہے کہ وہ ایلن ہے اور پھر ابا کی ڈائری میں مجھے اس کا نمبر بھی ملا ہے۔ آج تو میں صرف تم سے ملنا چاہتا تھا اس لئے ان لوگوں کو فون نہیں کیا مگر اب میں ان سے بھی رابطہ کروں گا۔"

"تم ایلن سے رابطہ نہیں کر سکو گے۔" اس نے سپاٹ انداز میں جواب دیا۔

"کیوں؟" یہ سوال کرتے ہوئے میرے دل نے دھڑک کر مجھے پہلے ہی جواب سے آگاہ کر دیا کہ وہ اب دنیا میں نہیں ہے۔

"وہ اب دنیا میں نہیں ہے۔" رابرٹ نے میرے دل میں گونجنے والے جملے کو زبان دے دی۔

میرا دل اور زور سے دھڑک اٹھا۔ "کیا تم اس کا حلیہ بتا سکتے ہو؟"

"پھر کیا ہو گا؟" اس نے برا سا منہ بنا کر جواب دیا۔

"مسٹر رابرٹ! آپ کیا سمجھ رہے ہیں' میں جو اس معاملے کی چھان بین کے لئے نکلا ہوں تو کیا میں بے وقوف ہوں' میرے یا خاندان والوں کے ساتھ جو کچھ ہوا' میں نے بلاکم و کاست آپ کو بتا دیا۔ میں آپ سے بھی اس رویے کا اظہار چاہتا ہوں۔ یہ مصیبت ہماری مشترکہ ہے۔ اسے ہم ایک دوسرے کو بتائے بغیر اور کسی بھی عمل سے پہلے مشورہ کئے بغیر کسی بہتر صورتِ حال کی توقع نہیں کر سکتے۔ کیا آپ میری بات کی گہرائی کو سمجھ رہے ہیں؟"

اب اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ وہ ایک سمجھدار آدمی تھا۔ اس کا ثبوت اس کی آنکھیں تھیں جو اب بہت خوفناک ہو جانے کے باوجود ذہانت کی عکاس تھیں۔ وہ بہت غور سے مجھے دیکھ رہا تھا پھر اس نے پہلو بدلا۔ اپنے لمبے لمبے ہاتھوں کو زمین پر ٹکا اور پورے بدن کو ہوا میں معلق کر کے ہتھیلیوں کے زور پر فرش پہ لے آیا اور اسی لڑھکنے کے سے انداز سے سرکتا ہوا اپنے بیڈ کے سرہانے بنی لکڑی کی ایک چھوٹی سی الماری کے قریب چلا گیا۔

اس الماری پر پہلے میری نگاہ نہیں پڑی تھی۔ اس نے اسے کھول کر نیلے ویلوٹ کا کور چڑھی البم نکالی اور میرے قریب آ کر اسی انداز میں صوفے پر بیٹھ گیا بیٹھنے سے پہلے ہی البم اس نے میرے حوالے کر دیا تھا۔

"اس میں سب کی تصویریں ہیں۔"

اس کی بات سن کر میں نے البم کھولا۔ کچھ تصاویر خود رابرٹ کی تھیں جس میں وہ ایک خوبصورت لڑکی کے گلے میں بانہیں ڈالے ہوئے تھا۔ اس لڑکی کے ساتھ رابرٹ کی بہت سی تصاویر تھیں۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔

"یہ روز ہے۔ میری گرل فرینڈ۔"

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ میں نے وہ صفحہ پلٹ دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ پھر ماضی کی حسین یادوں میں کھو کر ہیبت ناک اور خوفناک مستقبل کو بھول جائے۔ "وہ ایلن کہاں ہے؟"

"آگے۔" اس نے کہا اور ہاتھ بڑھا کر کچھ تصاویر اکٹھی پلٹ دیں۔ "یہ ہے۔"

اور آگے جو تصویر تھی وہ میں دیکھ کر اچھل پڑا۔ یہ وہی لڑکی تھی جسے میں نے میرٹھ جاتے ہوئے راستے میں دیکھا تھا جس نے مجھے گرم گرم کافی دی تھی۔ "یہ! یہ ایلن ہے؟ آر یو شور؟"

اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ اس حیرت میں ناگواری بھی شامل تھی۔ "کیا تم میرے حافظے پر شک کر رہے ہو؟ مسٹر ضیا! ایک بتا دوں، میرا حافظہ خطرناک حد تک تیز ہے۔ میں آج بھی بتا سکتا ہوں کہ اس روز تم نیلے رنگ کی نیکر اور کالی چپلی اور سفید رنگ کی دھاریوں والی شرٹ پہنے ہوئے تھے جب میں تمہارے تایا کی پُراسرار موت پر تمہارے دادا سے ملنے گیا تھا۔"

مجھے واقعی حیرت ہوئی کیونکہ واقعی اس کے یاد دلانے پر مجھے یاد آیا تھا کہ میں یہی کپڑے پہنے تھا۔

"یہ ایلن ہے؟" یہ کہہ کر اس نے آگے کی تصویر کی طرف اشارہ کیا جو اس صفحے کے بالکل سامنے والے صفحے پر تھی۔ یہ ایک گروپ فوٹو تھا۔ میں اس میں درمیان میں کھڑے ابا کو صاف پہچان گیا اور انہیں کالے سوٹ، کالے ہیٹ اور سفید شرٹ میں دیکھ کر بھی حیران ہوا کیونکہ میں نے کبھی انہیں اس لباس میں نہیں دیکھا تھا۔ ہمارے یہاں

کرتا پاجامہ یا شیروانی پاجامہ ہی پہنا جاتا تھا۔

"یہ پاپا ریکو۔ پپاس نزیکو اور میں ہوں۔ آگے پرکاش اور سورن سنگھ ہیں۔" وہ انگلی رکھے بتا رہا تھا۔

میں نے سب کے چہروں کو غور سے دیکھا۔ میں ان چہروں کو یادداشت میں محفوظ کرنا چاہتا تھا۔ انہیں دیکھنے کے بعد میں نے پھر ایلن کا جائزہ لیا۔ وہ سو فیصد وہی رہی تھی۔ میں نے چاہا کہ اسے بتا دوں کہ وہ ملی تھی مگر یہ سوچ کر چپ ہو گیا کہ ضروری نہیں کہ وہ میری بات کا یقین کر لے۔ وہ یہ بھی سوچ سکتا تھا کہ میں اسے خوف زدہ کرنے کے لئے ایسا کر رہا ہوں۔

"مسٹر ضیاء! تم بات کو کہیں سے کہیں لے گئے۔ تم بات کر رہے تھے یہاں فون کرنے کی۔ دیکھو! اگر تم یہ سب کچھ مجھے خوفزدہ کرنے کے لئے کہہ رہے تھے تو......!"

"مسٹر رابرٹ!" میں نے ہاتھ اٹھا کر اس کی بات کاٹ دی۔ "پہلی بات تو یہ کہ میں نہیں جانتا کہ ایلن مر چکی ہے۔ دوسری بات یہ کہ میں تمہیں خوفزدہ کر کے کیا حاصل کر سکتا ہوں یا تم بھی مجھ پر شک کر رہے ہو؟ یہ سو فیصد حقیقت ہے کہ یہاں فون کرنے پر ایک عورت نے فون اٹھایا تھا اور کہا تھا کہ تم بات نہیں کر سکتے۔"

"مسٹر ضیاء! میں...... آج میں واقعی خوفزدہ ہو گیا ہوں۔ اگر وہ یہاں ہے تو کون ہے؟ اس بلڈنگ میں اس فون کا کوئی ایکسٹینشن نہیں ہے اور......"

"میں یہ سب نہیں جانتا۔ مجھے تو یہ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس نے مجھے تم سے بات کیوں نہیں کرنے دی۔ اگر اس کا کوئی مقصد تھا تو اسے یہاں آنے سے روکنا بھی چاہیے تھا مگر میں کسی بھی رکاوٹ کے بغیر تم تک پہنچ گیا ہوں۔ اب میں صرف اتنا جاننا چاہتا ہوں کہ اگر میں زنجیر تمہارے حوالے کر دوں تو کیا ہو گا؟"

"تم نے بہت دیر کر دی مسٹر ضیاء! اب کام بہت بڑھ گیا ہے۔ بہرحال وہ زنجیر اس لحاظ سے ہمارے لئے اہم ہے کہ ہم سب ایلن کی قبر تک پہنچیں۔ اسے کھودیں اور زنجیر کو اسی طرح اس کی کلائی میں ڈال دیں جیسے اس کی کلائی سے نکالی تھی۔ اس کے علاوہ ہمیں دنیا جیسے بڑے ملک میں وتسلا کمیکر نامی عورت کو تلاش کرنے پڑے گا۔"

"یہ کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ پوری داستان سات برس پر محیط ہے مسٹر ضیاء! یہ وہ سات برس ہیں جو ہم

نے بڑی بڑی غلطیوں میں گزارے اور باقی برس ہم ان کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔ تم سمجھتے ہو کہ ہم سات برس کی داستان صرف ایک گھنٹے میں سن اور سنا سکتے ہیں؟"

"میں اہم باتیں سننا اور اس تمام داستان کا مقصد جاننا چاہتا ہوں۔ تفصیلات میرے لئے اہم نہیں۔ مجھے صرف وہ کچھ سننا ہے' جس کا تدارک ضروری ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"دیکھو مسٹر ضیاء! میں اب چند گھنٹوں بعد جس اذیت ناک کیفیت میں داخل ہونے والا ہوں' اس کے بارے میں تم نہیں جانتے۔ میں آج کم از کم تمہیں کچھ نہیں بتا سکوں گا۔ ہاں' اگر تم کل صبح سویرے میرے پاس چلے آؤ تو میں کوشش کروں گا جس قدر بھی اہم باتیں ہیں' تمہیں بتا دوں لیکن کیا تم وہ زنجیر مجھے دینا پسند کرو گے؟ اور یہ پتھر بھی۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ یہ کیا ہے اور عطا اسے کیوں اپنے پاس رکھتا تھا۔ تم نے بتایا ہے کہ یہ پتھر کسی شالی بابا نے دیا ہے اور حیرت انگیز طور پر تمہارے کام بھی آیا ہے۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ یہ میرے بھی کام آ سکتا ہے یا نہیں۔" وہ ملتجیانہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

"ہاں مسٹر رابرٹ! یہ پتھر آپ رکھیں البتہ زنجیر........." یہ کہہ کر میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور احتیاط سے صرف ایک زنجیر نکال کر اس کی طرف بڑھا دی۔ "یہ لیجئے۔" میں جاننا چاہتا تھا کہ وہ زنجیر اصل ہے یا نہیں پھر رابرٹ اسے پہچانتا ہے یا نہیں۔

زنجیر دیکھتے ہی اس کے چہرے پر خوشی ناچ اٹھی۔ طمانیت کے گہرے احساس نے اس کے چہرے کی خوفناکی کو کسی حد تک کم کر دیا۔ اس کی چمکتی آنکھیں دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ یہی زنجیر اصلی ہے پھر جانے مجھے کیا خیال آیا۔ میں نے اس سے باتوں باتوں میں وہ چین واپس لے لی۔ پہلے تو میں اسے بہ غور دیکھتا رہا پھر میں نے پوچھا۔ "کیا چین ایلن کی ہے؟"

"ہاں! وہ اسے یونان سے لائی تھی۔ کیا تم یقین کرو گے کہ ایلن انتہائی غریب عورت تھی جسے اکثر ایک وقت کی روٹی کے لئے اپنے کسی دوست کو زحمت دینا پڑتا تھا! وقت بے وقت اسے ایسے کام کی تلاش ہوتی تھی جس کا معاوضہ ایک ڈالر ہی کیوں نہ ہو۔ جب وہ یونان گئی تھی تو اس کے سامنے صرف ایک مقصد تھا' اس کی نانی کی ایک بہن تھی جس نے ایک یونانی سے شادی کی تھی۔ بے اولاد تھی پھر بڑھاپے میں شوہر مر گیا تھا جو سرکاری اعلیٰ عہدے پر فائز تھا اور مکان کے علاوہ گاڑی بھی اس کی ذاتی تھی اور اس نے

اپنی بیوی کو ایک چھوٹا سا ریستوران بھی بنوا کر دیا تھا جو وہ خود چلایا کرتی تھی۔ یہ کام وہ صرف وقت گزاری کے لئے کرتی تھی۔ شوہر کے مرنے کے بعد بہ قول ایلن کے وہ بڑے مزے میں تھی۔ اسے اپنی بہن یعنی ایلن کی نانی سے بہت محبت تھی اور اسی لئے وہ ایلن کی ماں سے بھی محبت کیا کرتی تھی۔ نانی کے مرنے پر وہ ایک بار پھر ایلن کی ماں سے ملنے بھی آئی تھی اور ایلن کو وہ کسی شہزادی سے کم نہیں لگی تھی پھر ایلن کی ماں بھی مر گئی۔ باپ پہلے ہی کہیں غائب ہو چکا تھا۔ وہ پانی کے جہاز پر ملازم تھا۔ ایک دن گیا تو واپس لوٹ کر نہیں آیا تھا۔ ایلن کو یقین تھا کہ جب وہ اپنی نانی کی بہن کے پاس جائے گی تو وہ کم از کم بھوکی نہیں رہے گی۔

میرا خیال تھا کہ وہ اپنی نانی کی بہن کی جائیداد پر قبضہ کرنے کی نیت سے جا رہی ہے مگر یونان جا کر اس کی قسمت بدل گئی۔ وہاں اسے یہ زنجیر ملی جو اسے ایک یونانی عورت نے دی تھی۔ یہ بات ایلن نے ہمیں بتائی تھی ورنہ ہمارا خیال تھا کہ وہ یہ زنجیر اپنی نانی کی بہن کے گھر سے چرا کر لائی ہے۔ اس کے علاوہ بھی اس نے بہت دولت ہتھیائی ہے کیونکہ پھر وہ حیرت انگیز طور پر امیر ہوتی چلی گئی۔ وہ جس چیز کو ہاتھ لگاتی تھی' وہ سونا بن جاتی تھی۔ جس کاروبار کو اس نے اختیار کیا' اس نے کروڑوں کی مالیت کا اضافہ کیا اور تم یقین نہیں کرو گے ایسا صرف ایک برس میں ہو گیا۔ میں اور پرکاش باتر لے ہم دونوں اس کے بہت قریب تھے۔ اس کی ایک خرابی نے ہمیں لالچ میں مبتلا کر دیا۔ وہ پیٹ کی ہلکی تھی۔ جس طرح وہ اپنے دکھ کھل کر بیان کئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی' اسی طرح اس سے اپنی خوشی بھی نہیں چھپائی جاتی تھی۔ یہ راز وہ چھپا نہیں سکی اور اس نے ہم پر عیاں کر دیا۔ ہم اس روز سے اس کے پیچھے لگ گئے پھر عطاء الرب کے علاوہ سورن' چیپاس اور جینو بھی ہماری پارٹی میں شامل ہو گئے۔ ہم پہلے ہی سے دوست تھے۔ ایلن بہت محتاط ہو چکی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ہم دونوں زنجیر کے راز سے واقف ہیں اس لئے ہم نے ان دونوں کو اجنبی بن کر اس سے ٹکرا جانے کا ڈراما رچایا اور پھر........."

وہ چونکا۔ اس نے کھڑکی سے باہر نگاہ ڈالی۔ شام گہری ہو چکی تھی اور میں اس دوران میں اپنا کام کر چکا تھا یعنی اس کی دی ہوئی زنجیر کو دائیں جیب میں منتقل کر کے بائیں جیب والی زنجیر کو ہتھیلی پر پھیلائے بیٹھا تھا۔

"مسٹر ضیاء! اب تم جاؤ۔"

میں نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے پر وحشت پھیلنے لگی ہے۔

"مسٹر رابرٹ! آپ ٹھیک تو ہیں ناں!" میں نے اسے غور سے دیکھا پھر زنجیر اس کی طرف بڑھا دی۔ اس نے جھپٹ کر زنجیر کو تھام لیا۔ "اسے غور سے دیکھ لیں' ایسا تو نہیں کہ یہ وہ زنجیر نہ ہو جو ایلن کے پاس تھی۔" میں نے قصداً اس کی توجہ زنجیر کی طرف مبذول کر دی۔ اس نے غور سے دیکھا۔ اطمینان کے اظہار کے لئے سر ہلایا۔

"ہاں! یہی وہ زنجیر ہے مسٹر ضیاء! کتنی حیرت انگیز بات ہے کہ جس زنجیر نے اسے آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دیا تھا' اس نے ہم سب کو زندہ درگور کر دیا ہے بلکہ عفا کو زمین کے اندر اتار دیا ہے۔ بہرحال اب تم جاؤ۔ میں اب کچھ بھی نہیں بتا سکتا۔ کل سویرے میں انتظار کروں گا۔ ابھی میں اس قابل بھی نہیں ہوں کہ سوچ سکوں کہ اصل کہانی کہاں سے شروع ہوئی تھی۔

میں کھڑا ہو گیا۔ میں خود بھی رات سے پہلے اس کوٹھی سے باہر نکل جانا چاہتا تھا۔ مجھے رابرٹ کی بات پر یقین نہیں تھا کہ اس حویلی میں کوئی عورت نہیں ہے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہاں واقعی ایلن ہو۔ وہ مری نہ ہو۔ یہ وہ عورت نہیں ہو جسے میں ایلن سمجھ رہا ہوں۔ تصویر کے نیچے کسی کا نام نہ تھا۔ اسے ایلن کی صورت میں متعارف کرانے والا خود رابرٹ تھا اور کوئی وجہ نہیں تھی کہ میں بے وجہ ہی اسے قابل اعتماد سمجھ لیتا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ایلن اور رابرٹ اس زنجیر کو حاصل کرنے کا ڈرامہ رچا رہے ہوں۔ اس کی اس حالت تک پہنچنے کی وجہ کوئی اور ہو۔ بہرحال ہر بات الجھی ہوئی تھی۔ میں اٹھ کھڑا ہوا تو زنجیر کو دیکھتا ہوا رابرٹ چونک کر بولا۔

"مسٹر ضیاء! کیا تم اپنے گھر پہنچنے کے بعد مجھے فون کرو گے؟"

"کیوں؟"

"میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم فون کرتے ہو تو میں اٹھاتا ہوں یا.........؟"

"ٹھیک ہے۔" میں نے ریسٹ واچ پر نگاہ ڈالی اور ٹھیک آدھے گھنٹے بعد عین ساڑھے آٹھ بجے کا وقت دیا کہ وہ منتظر رہے۔ میں فون کروں گا۔ پھر میں نے اسے اٹھنے یا دروازے تک چھوڑنے سے روک دیا۔ پتھر کو سنبھال کر رکھنے کی ہدایت کی اور اسی راستے سے باہر کی طرف بڑھ گیا جس راستے سے اندر داخل ہوا تھا۔ اس بار میں نے اپنی رفتار کم رکھی۔ جائزہ لیتا ہوا آگے بڑھتا رہا اور ہر نظر آنے والی نظر کو بہت غور سے دیکھتے

وہاں میں اپنی بصارت کی طاقت سے کچھ جاننا اور دیکھنا چاہتا تھا مگر وہاں کوئی خاص بات نظر نہ آئی۔

ہاں' البتہ جب میں لکڑی کا احاطہ کراس کر کے مین گیٹ کی طرف بڑھ رہا تھا تو میں نے بیرونی دیوار کے اوپر بیٹھی تین بلیاں دیکھیں۔ وہ تینوں بالکل ایک ہی کا عکس لگ رہی تھیں۔ تینوں میں ذرہ برابر فرق نہ تھا۔ تینوں یوں بیٹھی تھیں جیسے خوفزدہ بھی ہوں مگر موقع ملتے ہی جھپٹ کر حملہ کر دینے کے لئے بھی تیار ہوں۔ میں لمحہ بھر کو ٹھٹکا ضرور تھا مگر پھر بھی میں نے اپنی چال میں فرق نہ آنے دیا۔ ان کے قریب سے ہوتا ہوا گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ گیٹ پر پہنچ کر میں پلٹا۔ وہ تینوں اب قدرے مطمئن انداز میں بیٹھی تھیں جیسے خطرہ ٹل گیا ہو مگر ان کی گردن اب میری ہی طرف مڑی ہوئی تھی اور نگاہیں بھی مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔

میں رکا' پلٹا اور میں نے دیکھا کہ میری اس حرکت کو دیکھتے ہی وہ تینوں پھر دیوار پر کمر کو اٹھائے ہوئے کھڑی ہو گئیں۔ ان کے کان اکڑ گئے اور آنکھوں میں سفاکی در آئی۔ میں مسکرایا اور گیٹ کھول کر باہر نکل گیا۔

☆=============☆=============☆

اس گلی سے نکلتے ہی پُر رونق بازار شروع ہوتا تھا۔ مجھے بڑی آسانی سے ٹیکسی مل گئی۔ ٹیکسی میں بیٹھتے ہی میں نے پھر رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی۔ آٹھ بجنے میں دس منٹ تھے۔ یہ گرمیوں کے دن تھے اس لئے بھی زیادہ رات کا گمان نہیں ہو رہا تھا۔ بمبئی یوں بھی دوسرے علاقوں کی نسبت گرم اور زیادہ پُر رونق شہر ہے۔ یہاں رات گئے بھی زندگی جاگتی رہتی ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور کو پتا بتا کر میں نے پشت سے کمر ٹکا دی۔ رابرٹ سے ملاقات میرے لئے انتہائی خوفناک تجربہ تھا۔ بے حد پُراسرار اور حیرت انگیز!! میرے خیال میں اگر اسے دادا بھی دیکھتے تو کبھی نہ پہنچاتے پھر مجھے خیال آیا کہ میں نے ساڑھے آٹھ بجے اسے فون کرنے کا کہا ہے پھر یاد آیا کہ وہ کہہ رہا تھا کہ اب سے چند گھنٹوں بعد وہ کسی اذیت ناک کیفیت میں گرفتار ہونے والا ہے۔ اس طرح میں اس کی باتوں کو ذہن میں دہراتا رہا تو احساس ہوا کہ ان باتوں میں ربط نہیں ہے۔ وہ ایلن کے بارے میں بتاتے بتاتے روز کو یاد کرنے لگا تھا پھر اس نے زنجیر کی کہانی سنائی تو ایلن کی نانی کی بہن کی تفصیلات ضرورت سے زیادہ بتا گیا۔ اس نے پرکاش' سورن سنگھ اور جگنو کے علاوہ پچاس

کے بارے میں بھی کچھ نہیں بتایا۔ کبھی وہ اس عورت کا ذکر کرتا تھا جس نے جیتو سے اسے بات نہیں کرنے دی۔ اس نے کسی انڈین عورت وتسلا کمٹیکر کا بھی ذکر کیا مگر یہ نہیں بتایا کہ وہ کون ہے اور اس کا معاملے سے کیا تعلق ہے؟

میں جانے کب تک سوچتا رہا۔ گھر آگیا' ٹیکسی جھٹکے سے رکی تو میں حواسوں میں آیا۔ ٹیکسی والے کو کرایہ ادا کرکے میں نے گھر کی طرف نگاہ اٹھائی تو شدت سے یہ احساس ہوا کہ گھر میں کچھ زیادہ ہی بلب لگے ہیں۔ اندر باہر تیز روشنی کا احساس ہوا' رونق بھی محسوس ہوئی حالانکہ ناصر بھائی کے بیوی بچے دہلی جا چکے تھے اور میری معلومات کے مطابق گھر میں ناصر بھائی' طیب اور ایک ملازم کے علاوہ کسی کی موجودگی کا امکان نہیں تھا۔ میں پرس کو جیب میں رکھتا ہوا گھر کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

بیل بجانے پر ملازم نے دروازہ کھولا۔ وہ منہ میں پان بھرے ہوئے تھا۔ میں نے پوچھا کہ طیب آچکا ہے تو اس نے اثبات سے سر ہلایا اور مزید کچھ کہنے کی کوشش کی تو اس کا منہ دیکھ کر مجھے عجیب کراہیت کا احساس ہوا۔ اس کا نچلا ہونٹ باہر کو نکلا ہوا تھا جیسے پیالا اس نے پان کی پیک کو سنبھالنے کے لئے نکال لیا تھا۔ سر کو اونچا کرکے وہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا کہ آواز ایسی آ رہی تھی جیسے پانی کے بلبلے سے بن بن کر پھوٹ رہے ہوں۔

"چپ ہو جاؤ!" میں نے غصے سے کہا۔ وہ جلدی سے منہ بند کرکے پلٹ گیا۔ میں راہداری سے ہوتا ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ پورا گھر روشن ہے۔ طیب بھی آچکا تھا مگر میں فی الحال کچھ وقت کے لئے آرام کرنا چاہتا تھا۔ راہداری سے گزرتے ہوئے میں نے وہاں رکھا فون کا سیٹ اٹھا لیا اور اپنے کمرے میں چلا آیا۔ مسہری پر لیٹ کر میں نے اپنی جیب سے دوسری زنجیر نکالی۔ اسے غور سے دیکھتا رہا اور پھر اسے دوبارہ جیب میں ڈال لیا۔ تکیوں کو کچھ اونچا کرکے میں ایزی ہو کر لیٹ گیا۔ جوتے اتار دیئے تاکہ تھکاوٹ کا احساس کم ہو سکے۔ اس وقت مجھے دروازے کے قریب کسی کے بولنے کی آواز آئی اور دوسرے ہی لمحے دروازہ پورے زور سے کھل گیا۔ طیب سامنے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر خوشی کے ساتھ ناراضگی بھی تھی۔

"ضیاء.........!"

"کیسے ہو؟" میں مسکرایا۔ وہ قریب چلا آیا۔

"تمہیں پتا ہے کہ میں کب سے تمہارا منتظر ہوں؟" وہ ناراض لہجے میں بولا اور میرے قریب ہی مسہری پر بیٹھ گیا۔

"ہاں!" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

"اور تمہیں قاعدے سے' پہلے مجھ سے ملنا چاہیے تھا۔"

"میں قاعدے سے جیتا ہی نہیں تو دوسرے کام کیسے کر سکتا ہوں۔"

اس نے عادت کے مطابق میرے جملے پر دھیان دیئے بغیر کھڑے ہو کر میرے لباس کا تنقیدی انداز میں جائزہ لیا پھر پرجوش انداز میں بولا۔ "ضیا! تم لباس کے بارے میں بہت بے پروا ہو۔ کیا تم اچھے کپڑے نہیں پہن سکتے؟"

"اب میں لباس تبدیل کروں گا۔"

"ہاں! جلدی کرو۔" وہ دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے سے رگڑ کر بولا۔ اس کے چہرے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ یا تو بہت جلدی میں ہے یا کوئی بے چینی ہے اسے۔ میں بستر سے اٹھ کر اٹیچی کیس کی طرف بڑھا جو وہیں قریب ایک میز کے اوپر رکھا تھا۔ وہ میرے پیچھے لپکا۔ میں نے دھیان نہیں دیا۔ اٹیچی کیس کھول کر اپنا تولیہ اور سلیپنگ سوٹ نکال کر کندھے پر ڈالا تو وہ اچھل پڑا۔

"یہ......... یہ پہنو گے تم؟" وہ میرے سامنے آگیا۔

"ہاں! میں سونے سے پہلے یہی پہنتا ہوں۔" میں نے اطمینان سے جواب دیا۔

"بکواس مت کرو! یہ میرٹھ نہیں' بمبئی ہے۔ یہاں رات کو 2 بجے سے پہلے کوئی نہیں سوتا اور دوسری بات یہ کہ میں کیا چغد ہوں جو شام سے تمہارے انتظار میں سوکھ رہا ہوں۔"

"تو کیا تم سلیپنگ سوٹ میں ملبوس کسی شخص سے بات کرنا پسند نہیں کرتے؟" میں باتھ روم کی طرف بڑھا تو اس نے کندھے سے میرا سوٹ کھینچ لیا۔

"یار ضیاء! کیوں زچ کرتے ہو یار! وہ اب تک تمہارے انتظار میں بیٹھی ہے۔ اسے باتوں میں لگائے لگائے میرا حلق سوکھ گیا۔ الف لیلیٰ کے قصے کے علاوہ اسے قصہ باغ و بہار بھی سنا چکا ہوں۔ نہ جانے کتنی فلموں کی اسٹوریاں سنا گیا۔ کتنے واقعات خاندان کے بھی سنا ڈالے۔ اب تو اسے جمائیاں بھی آنے لگی تھیں۔" وہ روہانسا ہو گیا۔

"کمال ہے! حالانکہ جمائیاں تمہیں آنا چاہئیں تھیں۔ ویسے میں نہیں جانتا کہ تم کس

کی بات کر رہے ہو؟" میں انجان بن گیا حالانکہ مجھے اندازہ تھا کہ وہ کس کی بات کر رہا ہوگا۔ میرے یہاں سے جانے سے پہلے ہی وہ ملازم کو فون کرکے بتا چکا تھا کہ وہ اپنے خاص مہمان کو لے کر آ رہا ہے اور یہ کہ مجھے اس کا استقبال کرنا چاہیئے۔

"میں مونیکا کی بات کر رہا ہوں۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"کون مونیکا؟ میں اسے نہیں جانتا اور وہ میرے انتظار میں اپنا وقت کیوں ضائع کر رہی ہے۔ میں نے اسے ٹائم نہیں دیا۔" میں نے اس کے ہاتھ سے ملبنگ سوٹ لینا چاہا تو اس نے اسے اٹیچی کیس پر پٹخ دیا۔

"ٹھیک ہے۔ تم دو منٹ کے لئے انہی کپڑوں میں چلے چلو۔ یار! سمجھنے کی کوشش کرو۔ میری بڑی بے عزتی ہو جائے گی۔" اس نے مجھے کاندھوں سے پکڑ لیا۔

"نہیں! تمہاری بے عزتی تو میں نہیں ہونے دوں گا۔ ہاں' محض اس کے لئے مجھے لباس تبدیل کرکے تیار ہونے کا کوئی شوق نہیں ہے۔" میں نے تولیہ' کرسی کی پشت پر ڈالتے ہوئے کہا۔ وہ ایک دم خوش ہو گیا۔

"ہاں! دیکھو نا! میں نے اسے تمہارے بارے میں اتنا کچھ بتایا ہے کہ وہ گھنٹوں سے انتظار کر رہی ہے۔"

"ابھی تم بتا رہے تھے کہ اسے جمائیاں آ رہی ہیں اور تم نے اسے قصہ باغ و بہار سنا کر روک رکھا ہے۔" میں نے باہر کی طرف قدم بڑھائے۔

"وہ تو اسے میرے بولنے کی وجہ سے اور اتنے طویل انتظار کی وجہ سے آ رہی ہوں گی۔"

ہم راہداری میں نکل آئے۔ "وہ ہے کون؟" میں نے مڑ کر پوچھا۔

"اس کا نام مونیکا ہے۔" وہ فوراً میرے سامنے کھڑا ہو گیا جسے آگے بڑھنے سے پہلے مجھے خاص ہدایات دینا چاہتا ہو۔ "یہ وہی پراسرار شخصیت کی مالک لڑکی ہے جسے حاصل کرنا میری زندگی کا اہم ترین مقصد بن گیا ہے ضیاء! تم اسے دیکھو گے تو حیران ہو جاؤ گے۔ تم نے اپنی زندگی میں ایسی سحرانگیز شخصیت اب سے پہلے نہیں دیکھی' مگر ضیاء! اس کے انداز سے لگتا ہے کہ وہ مجھ سے متاثر نہیں ہے۔ ہم ایک دوسرے کے اچھے دوست ہیں مگر میں نے تمہارا ذکر کرکے اسے یہاں تک آنے پر راضی کیا۔ اب ایک بات اور بتا دوں کہ میری مدد کرو گے۔ اپنا الو سیدھا کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ وعدہ تم وہاں جانے سے پہلے

کرو گے۔" آخری جملے کہتے ہوئے اس کے نتھنے پھولنے پچکنے لگے تھے۔

مجھے ہنسی آ گئی۔ "اگر وہ پہلی ہی نظر میں مجھ سے متاثر ہو کر میری طرف بڑھی تو.........؟"

"میں کچھ نہیں جانتا۔ تمہیں وعدہ کرنا ہوگا کہ تم میرے لئے قربانی دو گے۔"

"ہاں! یہ ٹھیک ہے۔ میں نے اکثر فلموں میں دیکھا ہے کہ محبوب یا محبوبہ ایک دوسرے کو اپنی وفا کا واسطہ دے کر کسی اور کے حوالے کر دیتے ہیں اور خود تمام زندگی عیش کرتے ہیں۔ میں وہی کام کروں گا۔"

"ہاں! ایسا ہی کرنا۔" وہ خوش ہو کر پلٹا پھر ٹھٹک کر رک گیا۔ پلٹ کر مجھے گھورا اور میرے ہونٹوں پر گہری مسکراہٹ دیکھ کر جھلا گیا۔ "دیکھ یار ضیا! تجھے اور بہت سی مل جائیں گی۔ یہ مجھے زندگی میں سب سے زیادہ عزیز ہے۔ میں اس پر اپنی جان تک قربان کر سکتا ہوں۔ پلیز! میں تیرے ہاتھ جوڑتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے چلو۔" میں نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اپنی ہار ماننے کے انداز میں جواب دیا۔

وہ خوشی سے اچھل پڑا۔ اب پھر وہ اس کی سحرانگیز شخصیت کا رونا رو رہا تھا۔ وہ ڈرائنگ روم میں تھی۔ ڈرائنگ روم یہاں سے گھوم کر جاتی ہوئی راہداری کے آخری سرے پر تھا۔ میں اور وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تو بے پناہ روشن ڈرائنگ روم میں وہ ایک کھڑکی کے پاس ہماری جانب پشت کئے کھڑی تھی۔ یہ کھڑکی باہر لان میں کھلتی تھی۔ مست ہوا سے کھڑکی کے جالے دار سفید پردے اڑ رہے تھے۔ وہ خود بھی کسی سنگ تراش کے مجسمے کی طرح ترشی ہوئی سی کھڑی تھی۔ اس نے سفید رنگ کی شیفون کی ساڑھی باندھ رکھی تھی۔ اس کا پلو بھی اڑ رہا تھا۔ سیاہ لمبے گھنیرے بال اس کی پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔ ساڑھی میں اس کا متناسب بدن تراشیدہ مجسمے ایسا لگ رہا تھا۔ گندمی رنگ اس کی کلائیوں سے سونے کی چمک بن کر پھوٹ رہا تھا۔ اس میں واقعی کوئی ایسی بات تھی کہ میں اس کا چہرہ اور نین نقش دیکھے بغیر ہی اس کے سحر میں ڈوب رہا تھا۔ ہمارے پیروں تلے دبیز قالین تھا اس لئے ہمارے قدموں کی آہٹ اسے سنائی نہیں دی۔ اس کے دائیں بائیں اڑتے بالوں کی لٹیں اوپر لٹکے فانوس کی روشنی میں چمک رہی تھیں۔ ان روشنیوں میں وہ خود بھی ایک روشن ہیولے کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ جہاں جہاں

اس کا بدن نظر آ رہا تھا' وہاں جیسے دیے جل رہے تھے۔

"مونیکا!" طیب نے اسے چونکا دیا۔ میں خود بھی چونک کر سحرزدہ کیفیت سے نکل آیا۔

"آں...... ہاں!" وہ پلٹی' اس کی نگاہ مجھ پر اور میری نگاہ اس پر پڑی۔ وقت تھم گیا۔ ہمارے اردگرد کے تمام مناظر جیسے لطیف دھوئیں میں تبدیل ہو کر فضاؤں میں تحلیل ہو گئے۔ ایک میں رہ گیا اور دوسری وہ۔ باقی کچھ بھی نہ رہا۔ اس کی سیاہ گہری آنکھوں میں بھنور پڑ رہے تھے اور میں ان میں جکڑا اندر ہی اندر کہیں اترتا جا رہا تھا۔ میرے روئیں روئیں میں سرور بہہ رہا تھا۔ میرے اندر روشنی بڑھتی جا رہی تھی مگر ذہن ڈوبتا محسوس ہو رہا تھا۔ پُرکیف سے اندھیروں میں کہیں مدھر تانیں مجھے لوری دیتی محسوس ہو رہی تھیں۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں سو جاؤں مگر میرا انگ انگ' روم روم جاگ رہا تھا۔ بیدار ہو رہا تھا۔ زمین میرے پیروں تلے دھیرے دھیرے گردش کرتی محسوس ہو رہی تھی۔ میں جیسے ہچکولے لے رہا تھا یا موجوں کے نرم ہاتھوں میں ڈول رہا تھا۔ سرور انگیز لہروں کا لمس اس کے اڑتے بالوں کے لمس سے ذرا بھی مختلف نہ تھا۔ وہ پلکیں جھپکتی تو لگتا اس کی پلکیں میرے ہونٹوں سے ٹکرا رہی ہیں۔

"یہ ضیاء ہے مونیکا! میں نے بتایا تھا ناں! دراصل اسے بہت ضروری کام تھا۔ آثار قدیمہ کے محکمے کے اعلیٰ عہدے پر فائز ہے ناں! اس لئے بڑی ذمے داریاں ہیں اس پر۔ آتے ہی کسی مسئلے میں الجھ گیا تھا۔ ویسے بہت شرمندہ ہے دیر سے آنے پر۔"

اتنا کہہ کر طیب نے غالباً مجھے کہنی ماری تھی اس لئے میں لڑکھڑا گیا تھا۔ یوں جیسے میں زمین پر نہ کھڑا ہوں بلکہ ہوا میں معلق ہوں۔

"کوئی بات نہیں۔"

وہ بولی تھی اور میں اس کے سمندر کی خوفناک موجوں سے لڑتا ہوا کنارے آ گیا تھا۔ میرا سانس پھول رہا تھا۔ بدن میٹھے میٹھے درد سے چیخ رہا تھا۔ پلکیں بوجھل تھیں۔ پپوٹے اٹھنے کا نام نہ لے رہے تھے مگر میں نے انہیں زبردستی اٹھا دیا۔

"طیب! تمہارے کزن کو نیند آ رہی ہے۔ دیکھو تو آنکھیں کتنی بوجھل ہو رہی ہیں۔ انہیں سونا چاہیے۔ تم زبردستی لے آئے۔ ہم پھر ملیں گے۔" وہ ایک قدم آگے بڑھ آئی۔ اس کی نگاہیں میری نگاہوں میں پیوست ہو گئیں۔ میں ڈوب گیا۔ بہت گہرے

بھنور میں جہاں چکراتے ہوئے نیچے اترنا پُرکیف لگ رہا تھا۔

"نن......... نہیں......... مس مونیکا! میں سخت شرمندہ ہوں کہ تمہیں اتنی دیر تک انتظار کرنا پڑا اور پھر اس کا بھروسا بھی نہیں ہے۔ کیا پتا' کل صبح اسے یاد آئے کہ اسے اگلی فلائٹ سے دہلی واپس جانا ہے۔"

اتنا کہہ کر طیب نے مجھے پھر کہنی ماری۔ ان دونوں کی آوازیں مجھے گھسیٹ گھساٹ کے ساحل پر لے آئی تھیں۔ اب موجیں مجھے نظر آ رہی تھیں مگر چھو نہیں پا رہی تھیں۔ میں نڈھال سا صوفے پر بیٹھ گیا۔ "بیٹھیے۔" میں نے اتنا ہی کہا اور یوں لگا جیسے الفاظ میرے اندر کے پاتال میں اس بری طرح گونجتے ہوئے باہر آئے ہیں کہ سوائے میرے اپنے شور کے اندر کچھ بھی نہیں۔

وہ مسکرائی۔ میں نے طیب سے کہا۔ "پانی پلاؤ۔"

طیب نے مجھے گھور کر دیکھا مگر شاید میری حالت دیکھ کر اسے ترس آ گیا۔ اس نے قریب ہی رکھی میز سے جگ اٹھا کر مجھے پانی دیا۔ "ضیاء! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں!" میں نے ایک گھونٹ میں گلاس خالی کر کے سر ہلایا۔ وہ آگے بڑھ آئی۔ بہت قریب' میرا دم خوشبو' سرور' روشنی اور کیف سے گھٹنے لگا۔

"آپ لیٹ جائیے۔" اس نے میرے کندھے کو چھوا۔ کہکشاں سی بکھر گئی' تاروں نے اس بدن کو چھو رہی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ سرگوشی کر رہی ہو' مسکرا رہی ہو۔ خود کو سمیٹ کر میرے پہلو میں آ رہی ہو۔ میری آنکھیں بند ہو گئیں۔ میں موم بن کر ڈھے گیا۔

"ضیاء! ضیاء! تم ٹھیک نہیں ہو۔ میں ڈاکٹر کو فون کرتا ہوں۔" مجھے طیب کی گھبرائی ہوئی آواز آئی۔ "مونیکا! ضیاء کو سنبھالو۔ میں ابھی آیا۔"

اور اس نے مجھے سنبھال لیا۔ دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ اس کے بالوں کی لٹیں بکھر کر میرے بازو سے لپٹ گئیں۔ مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔ پتا نہیں' کتنی دیر تک میں بے خبر رہا۔ ہوش آیا تو ڈاکٹر میرا معائنہ کر رہا تھا۔ طیب اور مونیکا پاس ہی کھڑے تھے۔ اب مجھے سب کچھ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ بدن سرور کی سحرانگیز کیفیت سے نکل کر تھکاوٹ تھی' بدن میں میٹھا میٹھا درد بھی تھا مگر یہ کیفیت تکلیف دہ نہیں تھی۔ میں ٹھیک تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "کیا بات ہے؟" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

مجھے جواب دینے کی بجائے طیب نے اطمینان بھرا گہرا سانس لیا۔ مسکرایا پھر مونیکا

کی طرف دیکھنے لگا۔

"کچھ بھی نہیں۔ یہ خوامخواہ مجھے بلا لائے۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو تھکاوٹ بہت ہے۔ آپ آرام کر لیں۔" ڈاکٹر نے جواب دیا اور کھڑا ہو گیا۔ طیب اس کے ساتھ باہر چلا گیا۔ میں نے مونیکا کو دیکھا۔ وہ کچھ پریشان سی بیٹھی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے اب سے پہلے میں کوئی خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ حسین تو تھی' بلاشبہ سحرانگیز شخصیت کی مالک بھی تھی۔ مقناطیسی کشش کی حامل بھی تھی مگر اس میں میرے یوں ڈھے جانے یا باؤلا ہو جانے والی کون سی بات تھی؟ میں نے خفت محسوس کی۔

"آپ پریشان ہیں!" میں نے بات کرنے کو پوچھ لیا۔

"نن.......... نہیں.......... بس۔ آپ کی طبیعت دیکھ کر.........."

اسی وقت طیب بھی آ گیا۔ "کیا ہو گیا تھا یار!" وہ حیران سا مجھے دیکھ رہا تھا۔

"سچی بات تھی طیب کہ میں بہت تھکا ہوا تھا۔" میں اس کے سوا اسے کیا جاتا۔

"ہاں..........! میں نے کہا تھا ناں! مگر آپ کسی کی بات بھی تو نہیں مانتے۔" وہ ہلکے سے ناراض انداز میں بولی۔

"خیر' اب تو تم ٹھیک ہو ناں!" وہ پھر پرجوش ہونے لگا۔ "تمہیں پتا ہے' میں مس مونیکا کو کتنی مشکل سے یہاں لایا تھا! صرف تم سے ملانے کے لئے۔" اس نے مونیکا کی آنکھ بچا کر مجھے آنکھ ماری۔

"ہاں! میں ان سے معذرت خواہ ہوں۔ مس مونیکا..........! امید ہے کہ آپ سے پھر ملاقات ہوتی رہے گی۔"

"یقیناً!" اس نے خوش ہو کر جواب دیا۔

عین اسی لمحے گھڑی کا گھنٹا گونج اٹھا۔ یہ ایک ہی گھنٹا تھا۔ میں چونک گیا۔ "کیا ٹائم ہے؟"

طیب نے پہلے مجھے گھور کر دیکھا پھر رسٹ واچ پر نگاہ ڈال کر بولا۔ "ساڑھے آٹھ۔"

"ارے..........!" میں ایک دم کھڑا ہو گیا۔

"کیا ہوا؟" طیب کے انداز میں گھبراہٹ تھی۔

"میں ابھی آیا۔" پھر میں نے مونیکا کو دیکھا۔ "مس مونیکا! پلیز' آپ مائنڈ نہ کیجئے گا۔"

"میرا خیال ہے کہ میں چلتی ہوں۔ پھر آؤں گی۔"

"نہیں! نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" طیب کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح چیخ اٹھا۔ "وہ.......... میں نے کھانا منگوایا ہے۔"

"اوہ..........! میں بہت لیٹ ہو رہی ہوں۔" وہ کچھ پریشان ہو گئی۔ "پھر جانا دشوار ہو جائے گا۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ میں آپ کو چھوڑ کر آؤں گا۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔"

وہ ایک دم بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر اطمینان پھیل گیا تھا۔ میں وہاں رکا نہیں۔ بدعا اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ پورے ساڑھے آٹھ بجے تھے بلکہ دو منٹ اوپر بھی ہو چکے تھے۔ ٹیلی فون سیٹ وہیں رکھا تھا۔ میں نے جیب سے ڈائری نکال کر رابرٹ کا نمبر نکالا اور ریسیور کان سے لگا کر نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف بیل بج اٹھی۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے اندر عجیب سا سناٹا چھا گیا تھا۔ میری تمام حسیں' قوت سماعت پہ سمٹ آئی تھیں۔ دوسری بیل پہ کسی نے ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو!"

میرا رکا ہوا سانس بحال ہو گیا۔ دوسری جانب رابرٹ تھا۔ "ہیلو رابرٹ!"

"ہیلو..........! کیا تم مسٹر ضیاء ہو!" وہ پوچھ رہا تھا مگر مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ رو رہا ہے۔

"ہاں مسٹر رابرٹ! کیا تم ٹھیک ہو؟"

"آں.......... ہاں.......... مسٹر ضیاء مگر.......... میں.......... تم۔"

مجھے لگا جیسے کوئی اس کا گلا گھونٹ رہا ہے۔ ان الفاظ کے بعد اس کے حلق سے خرخراہٹ سی نکلی تھی۔ "مسٹر رابرٹ! کیا بات ہے؟ کیا ہوا ہے تمہیں؟" میں بے ساختہ چیخ اٹھا تھا لیکن دوسرے لمحے سن ہو گیا۔ ٹیلی فون پر کوئی عورت ہنس رہی تھی۔ یوں جیسے وہ درمیان میں کسی اور سے مل گئی ہو۔

"مسٹر رابرٹ! مسٹر رابرٹ!!" میں نے پکارا۔

"یس..........! یس مسٹر ضیاء..........! دوسری طرف رابرٹ کی آواز آئی مگر اس

سے زیادہ صاف اس نقرئی ہنسی کی آواز تھی۔ تمسخر اڑاتی ہوئی ہنسی' جو بار بار قریب آ کر دور جاتی محسوس ہو رہی تھی۔

"کون ہیں آپ؟ پلیز فون رکھ دیں۔" میں نے زور سے کہا۔ "خاتون! میں آپ سے کہہ رہا ہوں' ہماری بات ہو رہی ہے۔"

"فون آپ نے کیا ہے' آپ رکھ دیں۔" دوسری طرف سے اس عورت کی آواز آئی جس سے شام کو میری بحث ہو چکی تھی۔ ہاں.........! یہ سو فیصد وہی عورت تھی جس نے میرے فون کرنے پر ریسیور اٹھا کر کہا تھا کہ رابرٹ گھر پر ہے مگر بات کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔

"دیکھیں! میں رابرٹ سے بات کر رہا ہوں۔" مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اس گھر میں کوئی نہ کوئی ایکس ٹینشن ہے ضرور۔ ممکن ہے' رابرٹ اس سے لاعلم ہو۔

"مگر رابرٹ آپ سے بات کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔" وہ پھر ہنسی۔ وہ انگریزی میں بول رہی تھی۔

"آپ کون ہیں؟" میں نے جھلا کر پوچھا۔

"جی.........! میں.........؟ آپ کی دوست۔"

"پلیز فون رکھ دیں۔ رابرٹ کو دیکھیں......... شاید وہ کسی اذیت میں ہے۔" میں نے کہیں دور سے رابرٹ کی خرخراہٹ پھر سنی تو جلدی سے کہا۔

"میں ہمیشہ اس کا خیال رکھتی ہوں۔ وہ ٹھیک ہے۔" بڑے سفاک لہجے میں جواب ملا تھا۔ "یہ اذیت بہت معمولی ہے۔"

"دیکھیں.........! پلیز.........! مجھے اس سے بات کرنے دیں۔" میں نے ملتجی انداز میں کہا اور دوسری طرف وہ اونچی آواز میں ہنس پڑی۔ ہنستی رہی۔ اس کی ہنسی میری سماعت میں مل سے ڈالتی گئی۔ میرے دماغ کی رگیں' نسیں' جھنجھنا اٹھیں۔ اس کی ہنسی کی آواز میں ایک اور آواز پوشیدہ تھی جو دھیرے دھیرے میرے اعصاب کو بنجر رہی تھی۔

"چپ ہو جاؤ......... چپ ہو جاؤ۔ شٹ اپ.........! آئی سے شٹ اپ.........!" میں بری طرح چیخ اٹھا۔ ریسیور میرے ہاتھ سے گر پڑا۔ سر چکرانے لگا۔ میں نے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ اب میرے کانوں میں سیٹی کی سی آواز کے ساتھ اس کی ہنسی بھی گونج رہی تھی جیسے اس کی ہنسی کی آواز میری سماعت

سے کنوئیں میں اندر تک جانے کے بعد چکر کھاتی ہوئی واپس آ رہی ہو۔

مجھے نہیں پتا کہ میں کتنی دیر وہاں بیٹھا رہا۔ کب تک خود پر قابو پا سکا مگر اتنا احساس ہے کہ وقت کافی گزر چکا ہے۔ اب میں پُرسکون تھا۔ گہری خاموشی میں مجھے اپنے سینے میں بڑی دھڑکن صاف سنائی دے رہی تھی۔ میں اٹھ کر باتھ روم گیا۔ چہرے پر پانی کے چھینٹے مارنے کے بعد قدرے حالت بہتر ہو گئی۔ میں نے بالوں پر گیلے ہاتھ پھیرے' کنگھا کیا۔ کچھ دیر تک خود کو آئینے میں دیکھتا اور سوچتا رہا کہ وہ کون ہے' کیا رابرٹ نے اس کی آواز سنی ہے؟ کیا اب اسے یقین آ گیا ہے کہ وہ پُراسرار عورت اس کے اور دوسروں کے درمیان اسی طرح حائل ہے جیسی جینو اور اس کے درمیان کوئی عورت حائل تھی۔

پھر رابرٹ کسی اذیت میں تھا۔ کسی تکلیف دہ کیفیت سے دوچار تھا۔ کچھ ہوا ہے اس کے ساتھ جو وہ بتا بھی نہیں پایا تھا کہ یہ عورت درمیان میں آ گئی۔ میں نے اس بڑھے میڑھے وجود کے ساتھ بھی اسے صحت مند ہی محسوس کیا تھا۔ اس کی آواز کیسی ہی بیزار تھی مگر ایسی نہ تھی جیسی میں نے فون پر سنی تھی' میں اس کے لئے فکرمند ہو گیا مگر اس فکرمندی سے کچھ ہونے والا نہیں تھا اس لئے خود پر آخری نگاہ ڈال کر میں کمرے سے باہر آ گیا۔ اب میں ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اچانک' بالکل اچانک اچھل پڑا۔ اس عورت کی سفاک نقرئی ہنسی مجھے اپنے بہت قریب سنائی دی تھی۔

"کون ہے؟" میں نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ ہنسی کی آواز تھم گئی۔ چند ہی لمحوں بعد ڈرائنگ روم کے دروازے پر طیب اور مونیکا کھڑے حیرت سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

"کیا ہوا ضیاء؟" طیب قریب چلا آیا۔

"یہاں کوئی ہے۔" میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں جواب دیا اور گہری نگاہوں سے دور دور تک کا جائزہ لینے لگا۔ "کوئی عورت ہے یہاں۔"

"یہاں مونیکا ہے ضیاء! تم شاید بھول گئے۔"

میں نے چونک کر مونیکا کو دیکھا۔ وہ مجھے ہی دیکھ رہی تھی۔ "پتا نہیں! شاید یہ میرا خیال تھا" میں دھیرے سے بولا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے یہ کہتے ہی مونیکا کی آنکھوں میں عجیب سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"ہاں.........! یہاں میں ہوں۔"

اس نے "ہوں" پر زور دے کر کہا۔ مجھے اس کا انداز' اس کے دیکھنے کا اسٹائل' اس کے چہرے کے تاثرات' سب عجیب سے لگے۔

"ضیاء! پلیز! تم پتا نہیں کس چکر میں پڑے ہو۔ ہمیں بھوک لگ رہی ہے۔ مس مونیکا اپنا بہت سا وقت ضائع کر چکی ہیں تمہارے لئے مگر......... تم.........."

طیب اب چڑنے سے اکھڑ رہا تھا۔ مجھے خود بھی شرمندگی کا احساس ہوا۔ وہ واقعی میرے چکر میں کافی برداشت کر چکی تھی اور اب تو نو بجنے والے تھے۔

"سوری!" میں نے طیب سے کہا پھر میں مونیکا کی طرف پلٹا۔ "آئی ایم ویری سوری مس مونیکا! آج میرے ساتھ تو سب کچھ عجیب سا ہو رہا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ میں ایک بیماری سے اٹھ کر یہاں چلا آیا ہوں۔ مجھے واقعی کچھ روز آرام کرنا چاہیے تھا۔ "سوری........! ہاں!"

"کوئی بات نہیں۔ ایسا' ویسے حالات میں اکثر ہو جاتا ہے۔" اس بار بھی مجھے اس کا انداز معنی خیز لگا۔

"چلیں پلیز! کھانا کھا لیں۔" طیب کافی بور ہو چکا تھا۔ اس کے چہرے پر غصہ تھا۔ اسے وقت کے ضائع ہونے کا قلق یقیناً بہت زیادہ ہو رہا ہوگا۔ وہ تو دوپہر ہی سے پروگرام بنائے بیٹھا تھا۔

☆==========☆==========☆

ہم ڈائننگ روم کی طرف بڑھ گئے۔ لمبی چوڑی میز پر مختلف اقسام کے کھانے لگے ہوئے تھے یوں لگتا تھا جیسے بہت سے لوگوں کے کھانے کا بندوبست کیا گیا ہے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ ہم تینوں کے سوا وہاں چوتھا کوئی نہیں تھا۔ اس کی نسبت اہتمام بہت زیادہ تھا۔ مونیکا میز سجی دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی اور یوں لگتا تھا جیسے اس کی تمام کوفت ختم ہو گئی ہو۔ طیب بڑے تفاخر سے مجھے اور اسے دیکھ رہا تھا۔ انواع و اقسام کے کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبو نے تو مجھے بھی احساس دلا دیا تھا کہ میں شدید بھوک محسوس کرنے سے قاصر تھا حالانکہ بھوک تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر کرسی سرکائی۔ مونیکا میرا شکریہ ادا کر کے بیٹھ گئی بلکہ طیب جو دوسری کرسی سرکائے اس کے بیٹھنے کا منتظر تھا' نتھنے پھلا کر مجھے دیکھنے لگا۔ میں اس کی سرکائی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ یہ کرسی مونیکا کے دائیں جانب والی تھی۔ طیب گھوم کر سامنے آ گیا اور عین اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کی حالت غصے سے خراب ہو رہی تھی۔ میں نے اس موقع پر اس کی طرف دھیان نہیں دیا اور کھانے میں مشغول ہو گیا۔

کمرے میں سناٹا تھا' صرف پلیٹوں' کانٹوں اور چمچوں کی مدھم آوازیں کسی وقت ساکت فضاؤں میں ارتعاش پیدا کر دیا کرتی تھیں۔ میں بہت ہلکی رفتار سے کھاتا ہوں اور اب دل جمعی سے کھانا کھاتا رہا۔ طیب نے جلدی کھا لیا اور آئس کریم لینے چلا گیا جو اس کے بقول' وہ بھول آیا تھا۔ کھانے میں بہت سی ایسی چیزیں تھیں جو گھر کی پکی ہوئی نہیں لگ رہی تھیں۔ یہ بھی یقیناً طیب بازار سے لایا ہوگا۔ طیب کو گئے کافی دیر ہو گئی تھی جبکہ میں سر جھکائے کھانے میں مصروف تھا۔ مونیکا بھی حیرت انگیز طور پر چپ تھی۔ اچانک مجھے اس خاموشی کا احساس ہوا تو میں نے سر اٹھا کر دیکھا اور میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

میں نے کوئی خوفناک بات نہیں دیکھی تھی۔ نہ اس کا چہرہ بدل کر بھیڑیے کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ وہ اب بھی اتنی ہی سندر' کومل اور سحر انگیز تھی' نہیں بلکہ حیرت سے

میرے رونگٹے کھڑے ہوئے تھے۔ رنگ برنگی کھانوں سے بھری میز' ہڈیوں' روٹی کے کناروں' کالی مرچوں اور لونگوں سے بھری ہوئی تھی۔ تمام قابیں خالی تھیں۔ روٹی کا برتن خالی تھا۔ حتیٰ کہ سوئٹ ڈش بھی صاف رکھی تھی۔ مونیکا مرغی کی ران کو دونوں ہاتھوں میں تھامے بھنبھوڑ رہی تھی۔ سلاد کی پلیٹ میں صرف ٹماٹر اور کھیرے کا ٹپکا ہوا رس تیر رہا تھا۔

میں نے حیرت سے مونیکا کو دیکھا۔ دبلی پتلی' بے حد اسمارٹ عورت اتنا کچھ کیسے کھا سکتی ہے! میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ میں اس حیرت کا اظہار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ بڑی بداخلاقی ہوتی۔ میں نے اپنا کھلا ہوا منہ بند کر لیا۔ ہاتھ میں پکڑا روٹی کا ٹکڑا جسے میں تھوڑا تھوڑا کاٹ کاٹ کر کھا رہا تھا کہ مجھے مرچیں بہت لگ رہی تھیں' وہ میں نے واپس پلیٹ میں رکھ دیا۔ اب میری نگاہیں گاہے بہ گاہے مونیکا کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس کے سامنے رکھی خالی اور ہڈیوں سے بھری پلیٹ اور خالی قابوں نے اس کا تمام سحر زائل کر دیا تھا اور ایک عجیب طرح کی کراہیت مجھے اس سے دور کر رہی تھی۔

"ہیلو!!"

اچانک طیب اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں آئس کریم کا پیکٹ تھا۔ میں نے دیکھا' مونیکا اب پلیٹ سامنے سے سرکا چکی تھی۔ اس کے چہرے پر وہی ملکوتی مسکراہٹ تھی۔ طیب کے ہاتھ میں آئس کریم کا پیکٹ دیکھ کر وہ کھل اٹھی۔

"اوہ.........! مجھے آئس کریم بہت پسند ہے۔"

وہ پھر میز کے قریب ہو گئی۔ میں اب اسے مزید کھاتا دیکھ لیتا تو شاید میرا دماغ چکرانے لگتا اس لئے میں ہاتھ دھونے کے بہانے اٹھ گیا۔ اٹھتے اٹھتے میں نے طیب کے چہرے پر حیرت کے آثار دیکھے۔ اس کی نگاہ بھی غالباً مونیکا کے سامنے رکھی خالی قابوں اور پلیٹ پر تھی۔ میں ہاتھ دھو کر واپس آیا تو وہ آئس کریم بھی کھا چکی تھی۔

"طیب! مجھے بے پناہ خوشی ہوئی۔ ایک تو مسٹر ضیاء سے ملنے کی' دوسرے تمہارے اس بہترین ڈنر کی۔ سوری! میں نے کبھی تمہیں اہمیت نہیں دی حالانکہ تم ایک اچھے میزبان ہو۔"

طیب کھل اٹھا۔ سب کچھ بھول گیا۔ "حالانکہ میں دنیا میں تمہارے سوا کسی کو اہمیت نہیں دے سکا۔" اس نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر فوراً ڈائیلاگ بولا۔

"اوہ! ایسا کیا؟" وہ کھلکھلا اٹھی۔ "ویسے مسٹر ضیاء! میں حیرت انگیز طور پر آپ سے متاثر ہوئی ہوں۔" وہ میری طرف پلٹی۔ طیب کا منہ بن گیا۔ میں بری طرح تھک چکا تھا۔ رابرٹ کی طرف سے بھی پریشان تھا' چاہتا تھا کہ ایک بار پھر اسے فون کر کے دیکھوں۔ مونیکا اب جانے کو تیار تھی۔ میں نے چاہا کہ ان لوگوں سے اجازت لے کر کرے میں چلا جاؤں کہ اچانک مونیکا بولی۔

"مسٹر ضیاء! بہت دیر ہو گئی ہے۔ میرا خیال ہے' اب ہمیں چلنا چاہئے۔"

"میں بھی اجازت چاہتا ہوں۔ بہت تھک گیا ہوں۔"

"کیا مطلب؟ آپ مجھے چھوڑنے نہیں جائیں گے؟"

"طیب آپ کو ڈراپ کر دے گا۔"

"نہیں.........! آپ چلیں۔" اس نے ضد کی۔

میں نے طیب کی طرف دیکھا۔ طیب میرے جانے کا سن کر پھر اپ سیٹ ہو گیا تھا مگر غالباً مونیکا کی خاطر وہ ہر قربانی دینے کو تیار تھا۔ "چلو طیب! میں ڈرائیو نہیں کر سکوں گا۔" میں نے اس پر رحم کھا کر کہا۔ وہ کھل اٹھا۔ ہم دونوں اسے لیے ہوئے گھر سے باہر نکل آئے۔ راستے بھر طیب اسے شیشے میں اتارنے کی کوشش کرتا رہا اور راستے بھر مونیکا چونک چونک کر مجھ سے مخاطب ہوتی رہی۔ وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ میں یہاں کب تک ہوں اور کب اس سے دوبارہ ملاقات کر رہا ہوں۔ میں نے کوئی واضح جواب دینے سے احتراز کیا۔ میں اونگھ رہا تھا۔ میرا ذہن بوجھل تھا۔ شاید مجھے نیند آ رہی تھی۔ میرے مختصر' سپاٹ لہجے میں دیئے گئے جوابوں نے غالباً اس کے حوصلے پست کر دیئے تھے۔ وہ اب خاموش ہو گئی تھی۔ میں نے غنیمت جان کر آنکھیں موند لیں۔ طیب کے شوخ جملے' اس کا والہانہ انداز اور ڈائیلاگ مجھے سنائی دے رہے تھے مگر میں ان باتوں میں شریک نہیں ہوا۔

اچانک مونیکا نے کہا۔ "بس یہاں' ایک طرف روک دیں۔ ممی نے دیکھ لیا کہ میں غیر لوگوں کے ساتھ آئی ہوں تو قیامت آ جائے گی۔"

گاڑی رک گئی۔ میں یونہی آنکھیں بند کئے بیٹھا رہا کہ وہ سمجھے میں سو گیا ہوں۔ میں الوداعی لمحوں کو طول نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس نے ایک بار مجھے پکارا مگر طیب نے ہنس کر جواب دیا کہ میں اس وقت کسی حسین خواب کی وادی میں گھوم رہا ہوں۔

"یہ بہت روکھا آدمی ہے مونیکا! اس کے چکر میں جو بھی پڑتا ہے' وہ آخر دیواروں سے سر پھوڑتا ہے۔" طیب غالباً اب برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

"یہ ہے ایسا کہ اس کی خاطر دیواروں سے سر پھوڑ لیا جائے۔" بڑے رومانک انداز میں جواب دیا گیا۔

"واٹ؟" طیب چیخا۔ "میں پاگل ہوں کیا؟"

وہ ہنسی۔ "اوکے! سی یو۔"

گاڑی جھٹکے سے اسٹارٹ ہو گئی۔ عین اس لمحے میں نے ایک آنکھ کھول کر دیکھا۔ طیب گاڑی گھما رہا تھا۔ میری نگاہ دائیں جانب اٹھی۔ میں چونک کر سیدھا ہو گیا۔ "روکو!" بے ساختہ میں بول اٹھا۔

"کیوں؟ اب کیوں روکوں؟" اس نے گاڑی روک کر غصے میں پوچھا مگر میں اس کی طرف متوجہ نہیں تھا بلکہ دائیں جانب کی عمارت کو دیکھ رہا تھا۔ یہ وہی عمارت تھی جہاں میں آج شام کو آیا تھا۔ جی ہاں' وہ رابرٹ کا گھر تھا۔ میں نے جلدی سے پلٹ کر دوسری طرف دیکھا۔ مونیکا نظر نہیں آئی۔

"کہاں گئی؟" میں نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اپنے گھر۔" طیب نے جل کر جواب دیا۔

"کس طرف گئی ہے؟"

"مجھے کیا پتا یار! چلی گئی بس۔" وہ جھلا گیا تھا۔

"طیب! پلیز! مجھے بتاؤ۔ کیا وہ اس عمارت میں گئی ہے؟" میں نے رابرٹ والی عمارت کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔ میرے لہجے اور انداز میں کوئی ایسی بات تھی کہ وہ مجھے غور سے دیکھنے لگا اور قطعی سنجیدہ ہو گیا۔

"پتا نہیں ضیاء! میں نے دیکھا نہیں۔ کیوں؟ بات کیا ہے؟!"

"گاڑی بیک کرو۔" میں نے کہا۔ اس نے بغیر کوئی بات کئے گاڑی بیک کی۔ جہاں تک میری نگاہ جا سکتی تھی' وہاں تک کسی ذی روح کا وجود نہ تھا۔ وہ گاڑی پھر اس رخ پر کر کے آہستہ آہستہ چاروں طرف دیکھتا ہوا آگے بڑھا۔ میری نگاہیں بھی تمام مکانوں' ان کے باہر کے جنگلوں اور دروازوں پر ٹکی ہوئی تھیں۔ پوری گلی سنسان تھی۔ مجھے یہ بھی حیرت ہوئی کہ یہاں پوری گلی میں ہی زندگی کے آثار نہیں تھے البتہ چند ایک گھروں کو

چھوڑ کر جن میں سے ایک رابرٹ کا بھی تھا' باقی گھروں کے اندر روشنی تھی۔ ہم نے کافی آگے جا کر گاڑی واپس گھمائی مگر یہ نہ جان سکے کہ مونیکا کس گھر میں داخل ہوئی۔

"اس نے کہا تھا کہ یہیں روک دو ورنہ اس کی ممی دیکھ کر ناراض ہوں گی۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ کسی قریبی گھر میں نہیں گئی ہو گی۔" طیب نے پر سوچ انداز میں جواب دیا۔

"مگر ہم تو بڑی دور تک دیکھ آئے ہیں۔" میں الجھا ہوا تھا۔ اب گاڑی پھر رابرٹ کے گھر کے آگے سے گزر رہی تھی۔ اچانک مجھے احساس ہوا جیسے اس عمارت کے اندر کا کوئی دروازہ کھلا ہو کیونکہ روشنی کی لمبی باریک لکیر سی لمحہ بھر کو نظر آ کر بجھ گئی تھی۔ مجھے نہ جانے کیوں یہ یقین ہو گیا کہ وہ اسی عمارت میں گئی ہے۔ یہ خیال آتے ہی میں پھر اچھل پڑا۔ مجھے یاد آ گیا کہ جب میں رابرٹ کو فون کرنے کے بعد اس عورت کی خوفناک ہنسی سے نڈھال ہو گیا تھا اور جب باہر آیا تھا تو مجھے قریب ہی پھر اسی عورت کی ہنسی سنائی دی تھی اور میں چونک اٹھا تھا۔

"طیب! جب میں کمرے میں گیا تھا اور واپس آیا تھا تو......... کیا وہ ہنسی تھی؟!"

"آں......... ہاں......... جب تم نے کہا تھا کہ کون ہے' تب؟"

"ہاں' ہاں.........!"

"ہاں! وہ ہنس رہی تھی کہ ہم تمہاری آواز سن کر چونک گئے تھے۔"

"او مائی گاڈ!" میں نے سر تھام لیا۔

"کیوں؟ کیا ہوا ہے یار! ایک تو تم مجھے کچھ بتاتے نہیں ہو۔" طیب اب خاصا پریشان لگ رہا تھا۔ گاڑی کی رفتار اب بھی دھیمی تھی۔

"چلو! گھر چلو!" میں نے سیٹ کی پشت سے سر ٹکا دیا۔

وہ بڑبڑایا پھر اس نے رفتار تیز کر دی۔ وہ خاموش تھا۔ میں بھی خاموش تھا۔ میں مونیکا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کے اندر کا سحر اور مقناطیسیت مجھے یاد آ رہی تھی اور عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ دنیا کا کوئی بھی حسین سے حسین وجود آدمی کو نڈھال نہیں کر سکتا۔ اسے مدہوش کر سکتا ہے مگر جو کیفیت مجھ پر طاری ہوئی تھی' وہ مدہوشی نہیں' بے ہوشی ایسی تھی۔ ہم تھوڑی ہی دیر بعد گھر پہنچ گئے۔

طیب شاید پھر سب کچھ بھول بھال کر اس کے حسن میں کھو چکا تھا کیونکہ میں نے

اسے زیر لب مسکراتے دیکھا۔ ہم گھر پہنچے تو ساڑھے دس بج رہے تھے۔ میں اپنے کمرے میں چلا گیا۔ طیب گاڑی پارک کر رہا تھا۔ میں نے اندر جانے سے پہلے ہی ملازم کو چائے کے لئے کہہ دیا تھا۔ جاتے ہی میں نے کپڑے بدلے اور بستر پر دراز ہو گیا۔ ملازم چائے لے آیا۔ وہ چائے رکھ کر نکلا ہی تھا کہ طیب سلیپنگ گاؤن کی ڈوریاں کستا ہوا چلا آیا۔

"کیسی تھی؟" اس نے یوں فخر سے پوچھا جیسے یہ اس کا اپنا شہکار ہو۔

"اچھی تھی مگر......... یہ تمہیں ملی کہاں سے؟"

"میں جس ریستوران میں جاتا ہوں' وہاں میں نے اسے ایک دو بار آتے دیکھا تھا۔ میں تو پہلی ہی بار میں دل ہار بیٹھا تھا مگر اس کے حسن کا رعب ایسا تھا کہ میں سکتے میں چلا گیا تھا۔ جتنی دیر بیٹھی رہی' سکتہ نہیں ٹوٹا اور جب چلی گئی تو کف افسوس ملتا رہا پھر پابندی سے صرف اس آس میں جانے لگا کہ شاید بھولی بھٹکی دوبارہ نظر آ جائے۔ پورے تین ماہ کی جاں گسل پابندی کے بعد ملی۔ اتنے عرصے میں' میں اپنی قوت برداشت کے کئی امتحان لے چکا تھا اس لئے دوسری ہی ملاقات میں اس سے تعارف حاصل کر لیا اور یقین کرو ضیاء! وہ بڑی اچھی طرح ملی۔ بالکل نہیں لگا کہ وہ اجنبی ہے مگر پھر بھی' میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ میری ذات میں دلچسپی نہیں لے رہی۔

"ظاہر ہے۔" میں نے پھر طنز کیا۔

"لیکن ضیاء! وہ کبھی میرے کہنے پر نہ میرے ساتھ کہیں گھومنے گئی' نہ گھر آئی بلکہ وہ جتنی دیر چاہتی تھی پاس بیٹھتی تھی اور جب چاہتی تھی اٹھ کر کچھ کہے بنا چلی جاتی تھی۔ بعض اوقات تو ایسا بھی ہوا کہ ہم نے وہاں کھانا کھایا۔ میں ہاتھ دھونے باتھ روم گیا اور جب لوٹا تو وہ جا چکی تھی۔ یہ محض اتفاق تھا کہ پچھلے دنوں جب ناصر بھائی دادا کے مرنے پر دہلی گئے تو میں نے ذکر کر دیا پھر بات کہیں سے کہیں پہنچی۔ پُراسرار باتوں پر بحث چل نکلی تو وہ جلدی جلدی ملنے لگی۔ میں نے اپنے خاندان کی اموات کا ذکر کیا تو وہ بہت پُرجوش ہو گئی۔ جب میں نے تمہارا ذکر کیا تو اس نے تم سے ملنے پر اصرار کیا۔ اب وہ کافی بے تکلف ہو چکی تھی مگر میں نے ایک بات خاص طور پر محسوس کی کہ اگر میں ان پُراسرار باتوں اور تمہارے ذکر کے سوا کچھ اور موضوع تلاش کرتا تو اسے کوئی اہم کام یاد آ جاتا۔ وہ کہیں' کسی سوچ میں ڈوب جاتی۔ اسے ماحول سے وحشت ہونے لگتی یا ممی کی ڈانٹ سے ڈر لگنے لگتا۔ میں نے جب پیار کا اظہار کرنے کی کوشش کی۔ وہ یوں مجھے دیکھ کر ہنس

دی جیسے خلا میں گھورتے گھورتے اسے کوئی لطیفہ یاد آ گیا ہو۔ میں اس کے لئے قطعی اہمیت نہیں رکھتا۔"

"صبر کرو! اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"

"کیا تم میری مدد نہیں کر سکتے؟" وہ میرے قریب سرک آیا۔

"کسی ایسے معاملے میں کسی کی مدد کرنے کا میرا سابقہ کوئی تجربہ نہیں ہے۔ یہ پہلا تجربہ ہو گا اگر میں نے ایسا کرنے کا سوچ لیا تو اور تمہیں پتا ہے کہ پہلا تجربہ ناکام ہونے کے چانس زیادہ ہوتے ہیں بلکہ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ سارے معاملے الٹے ہو جاتے ہیں۔"

"مجھے تمہاری ذہانت پر یقین ہے۔" وہ چاپلوسی پر اتر آیا۔

"لیکن میں اپنی ذہانت سے مطمئن نہیں ہوں۔"

"تم کوشش تو کرو۔"

"تم کیا چاہتے ہو؟"

"اس کی قربت۔"

"وہ کئی گھنٹے تمہارے قریب تھی۔" میں پھر الجھ گیا۔

"نہیں! میرا مطلب ہے کہ میں اس سے اظہار محبت کرنا چاہتا ہوں۔"

"تو یہ کام تو تمہیں خود ہی کرنا ہو گا۔ میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں یا تم چاہتے ہو کہ تمہاری طرف سے ڈائیلاگ بھی میں بولوں۔"

"ارے یار! بڑے بے وقوف ہو۔ اسے احساس دلاؤ کہ میں اس سے محبت کرنے لگا ہوں۔ راتوں کو جاگتا ہوں۔ لان میں ٹہلتا ہوں' سوتے میں اسے پکارتا ہوں۔ اور.........."

"بس! بس کافی ہے۔ عقل مند کے لئے تو اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔ ویسے تم اس سے کہہ کیوں نہیں دیتے بلکہ ایسا کرو' اگلی بار اس کا گھر دیکھ کر زہرہ آپا اور طاہرہ بھائی کو رشتے کے لئے بھیج دو۔"

"پاگل ہوئے ہو کیا؟ وہ کرسچن ہے۔"

"اچھا! تو پھر.........؟"

"پھر کیے......... میں اس سے شادی کیسے کر سکتا ہوں۔"

"کیوں؟ جیسے اس سے محبت کر رہے ہو' ویسے ہی شادی بھی کر سکتے ہو۔ بھئی!

شادی میں ایک یہی تو فرق ہو گا ناں کہ وہ چوبیس گھنٹے تمہارے ساتھ ہو گی۔"

"نہیں یار! یہ نہیں ہو سکتا۔" وہ سر ہلانے لگا۔

"پھر محبت کیسے ہو سکتی ہے؟ اگر کر یچن سے محبت ہو سکتی ہے تو شادی کیوں نہیں ہو سکتی اور پھر میں نے سنا اور پڑھا ہے کہ محبت کی کوئی ذات نہیں ہوتی' وہ ان تمام بندھنوں اور پابندیوں سے آزاد ہوتی ہے۔"

"ہاں! ٹھیک سنا ہے لیکن یہ بات محبت کے بارے میں ہے اور محبت تو میں اس کی ذات پات دیکھے بغیر ہی کر رہا ہوں۔"

"لیکن شادی.......... اور محبت.........." میں نے کہنا چاہا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر مجھے روک دیا۔ "شادی الگ چیز ہے اور شادی تو میں فرحت سے ہی کروں گا۔"

میں اچھل پڑا۔ "کیا.......... کس سے؟"

"فرحت سے۔ یار! وہی تمہاری تحسین خالہ کی بیٹی۔ ہاں یار! یاد آیا۔ تم میری مدد کرو۔ میری ہمت نہیں ہوتی کہ میں بابا یا امی سے کہتا۔ میرا خیال ہے کہ وہ میری بات مانیں گے بھی نہیں۔ امی کو بڑی خالہ کی لڑکی پسند ہے اور مجھے وہ ذرا بھی پسند نہیں۔ پتا نہیں' کتنے من تو گوشت ہے اس کے اندر اور دوسری اہم بات یہ کہ میں اسے بارہ سال سے دیکھ رہا ہوں مگر ہمیشہ اسے کچن میں بیٹھے' پلنگ پہ بیٹھے یا کرسی پر بیٹھے ہی دیکھا ہے۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ اس کا قد کتنا ہے اور میرے خیال میں خواتین کا آئیڈیل قد پانچ فٹ چھ انچ ہے۔ نہ اس سے ایک انچ کم' نہ زیادہ۔ میں نے کئی بہانے کئے کہ وہ کھڑی ہو جائے یا کبھی چوڑے ململ کے دوپٹے کے بغیر نظر آ جائے مگر ایسا نہیں کبھی ہوا۔ ہاں البتہ اس چکر میں میرا وقت بہت برباد ہوا ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس کی آواز باریک اور کان میں چبھتی ہوئی سی ہے جبکہ میں دھیمے دھیمے بولنے والی کو پسند کرتا ہوں۔ "ضیاء! پلیز! تم میرا یہ کام کر دو۔"

میں حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ جو چند منٹ پہلے مونیکا کے لئے قربان ہونے کو تیار تھا' میری مدد مانگ رہا تھا' اسے قطعی بھول چکا تھا۔ اب اسے فرحت کے لئے میری مدد درکار تھی۔ اس فرحت کے لئے جو میرے دل میں اپنا ایک خاص مقام بنا چکی تھی۔

"بولو نا! جواب دو۔ میری مدد کرو گے ناں!"

"فی الحال تو مجھے نیند آ رہی ہے۔ صبح ناشتے پر بات کریں گے پھر سوچیں گے کہ کیا کرنا ہے۔" میں نے اسے ٹالنا چاہا۔

"وعدہ!"

"وعدہ۔"

وہ چلا گیا۔ جاتے وقت میرے وعدے سے بہت خوش تھا۔ مجھے اس پر ہنسی بھی آئی۔ میں نے اتنا بے وقوف مرد آج تک نہیں دیکھا تھا۔ اس کے جاتے ہی میں کمبل لے کر لیٹ گیا۔ ذرا پر سکون ہوا تو رابرٹ پھر دھیان میں آ گیا۔ مونیکا بھی بار بار ذہن پر چھا جاتی تھی مگر اس سے زیادہ اہم رابرٹ کا معاملہ تھا۔ میں کہنیوں کے بل اٹھ بیٹھا۔ میں نے ٹیلی فون سیٹ اٹھا کر پاس رکھ لیا۔ سرہانے لٹکی قمیض میں سے ڈائری نکالی اور اس کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ اس بار بیل بجتی رہی مگر کسی نے فون نہیں اٹھایا۔ میں نے بڑی دیر انتظار کیا۔ گھڑی پر نگاہ ڈالی' گیارہ بج چکے تھے۔ کچھ دیر بعد میں نے ریسیور رکھ دیا پھر ڈائری پر جینو پاپا کے نمبر پر انگلی رکھ کر اسے ڈائل کیا۔ دوسری طرف بیل بجتے ہی فون اٹھا لیا گیا۔

"ہیلو!" میں نے کہا۔

"ہیلو!" آواز نسوانی تھی۔ بڑی خوبصورت اور سوئی سوئی سی۔ جیسے میں نے کسی کو سوتے میں جگا دیا ہو۔

"معاف کیجئے گا! شاید میں نے غلط وقت پر فون کیا ہے۔" میں نے معذرت خواہانہ انداز میں جواب دیا۔

دوسری طرف خاموشی چھائی رہی۔ میں خجل سا ہو گیا۔

"دراصل میں دہلی سے آیا ہوا ہوں۔ مجھے کل واپس جانا ہے اور میں کوشش کے باوجود مسٹر جینو پاپا سے نہیں مل سکا۔ سوچا کہ فون پر ہی بات کر لوں۔"

"آئی ایم سوری مسٹر! وہ بات کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔"

سرد لہر سی میری ریڑھ کی ہڈی میں تیر گئی۔ میں نے ریسیور کریڈل پر اتنے آہستہ سے رکھا جیسے میں رابطہ منقطع ہونے کا احساس نہیں ہونے دینا چاہتا۔ وہی جملہ' وہی آواز' وہی لہجہ اور وہی سفاکی۔ پھر میں نے زیادہ توقف نہیں کیا۔ اب پپاس ڑیگو کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف بیل بجنے لگی۔ دو یا تین بیلوں کے بعد ریسیور اٹھا لیا گیا۔ گہرے گہرے سانس لینے کی آواز آئی جیسے ریسیور اٹھانے والا کہیں سے بھاگتا ہوا آیا مگر بولا کوئی

نہیں۔ "ہیلو! ہیلو مسٹر پیاس! ہیلو!" میں پکار اٹھا۔

کوئی ہنسنے لگا۔ کوئی عورت ہنستی چلی گئی۔ میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ میں نے ریسیور پٹخ دیا۔ چہرے پر پسینے کی بوندوں کو صاف کیا۔ اب میرے ہاتھوں میں ہلکی سی کپکپی تھی۔ میں نے ڈائری پر نگاہ ڈالی۔ ابھی پرکاش اور سورن سنگھ کو فون کرنا باقی تھا۔ میں نے سرہانے رکھا پانی کا گلاس اٹھایا اور یہ سوچے بغیر کہ وہ جانے کب سے کھلا رکھا ہے ایک ہی گھونٹ میں اسے خالی کر دیا پھر میں نے ریسیور اٹھایا۔ اس بار میں نے سورن سنگھ کا نمبر ڈائل کیا۔ پہلی ہی بیل پر فون اٹھا لیا گیا۔ میرا دل دھڑک اٹھا مگر اس بار میں کچھ نہیں بولا۔ دوسرے ہی لمحے ایک مردانہ آواز نے حوصلہ دیا۔ آواز قطعی نارمل تھی۔

"ہیلو! ہیلو!"

"ہیلو مسٹر سورن سنگھ؟" میں نے ہمت کر کے پوچھا۔ "یس! آپ کون ہیں؟"

"اوہ! تھینکس گاڈ!" میں نے اطمینان کا گہرا سانس لے کر کہا۔

"کیا مطلب؟" دوسری طرف سے پوچھا گیا۔ "آپ کون ہیں؟ کس سے بات کرنا چاہتے ہیں؟"

"میرا نام ضیاء الرب رضوی ہے مسٹر سورن سنگھ اور میں آپ کے دوست عطاء الرب رضوی کا بیٹا ہوں۔ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔"

لمحہ بھر کو خاموشی چھا گئی۔

"ہیلو! مسٹر سورن سنگھ!!"

"ہوں! تم مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟"

"کچھ باتیں ہیں سر! جو میں فون پر نہیں کر سکتا۔ آپ اگر مجھے وقت دے دیں تو......"

"ٹھیک ہے۔ آپ کل رات نو بجے کے بعد کسی بھی وقت آ جائیں مگر میں دیئے گئے وقت سے پہلے نہیں مل سکوں گا۔"

"تھینک یو سر! میں نو بجے کے بعد ہی پہنچوں گا۔" میں خوش ہو گیا۔

"اوکے! سی یو!" دوسری طرف سے خوش دلی سے کہا گیا۔

میں نے ریسیور رکھ دیا۔ میری حالت سنبھل چکی تھی۔ نتیجہ حیرت انگیز طور پر میری سوچ کے برعکس نکلا تھا ورنہ میرا یہی خیال تھا کہ جینو اور پیاس اس کے گھر فون

کرنے کے بعد ان دونوں کے معاملے میں بھی یہی ہوگا۔ مجھے سورن سنگھ سے بات کر کے حیرت آمیز مسرت ہو رہی تھی۔ کچھ دیر تک میں اسی غیر متوقع صورت حال سے لطف اندوز ہوتا رہا پھر میں نے پرکاش کا نمبر ڈائل کیا۔ یہاں فون کی بیل بجتی رہی اور کسی نے فون نہیں اٹھایا۔ میں نے فون نہ اٹھانے پر شکر بھیجا ورنہ اگر یہاں کوئی گڑبڑ ہو جاتی تو جو سکون اور خوشی مجھے ملی تھی میں اس سے محروم ہو جاتا اور شاید رات بھر سو بھی نہ پاتا۔

اب میں نے ٹیلی فون سیٹ میز پر رکھ دیا۔ ایزی لیٹ کر جسم ڈھیلا چھوڑ دیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ صبح سویرے وعدے کے مطابق رابرٹ کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ وہ بھی یہ سن کر خوش ہوگا کہ سورن سنگھ نہ صرف یہ کہ بالکل ٹھیک ہے بلکہ وہ مجھ سے ملاقات بھی کر رہا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ ان سب کی حالت اس سے مختلف نہیں ہوگی۔

میں کچھ دیر تک آئندہ کے پروگرام بناتا رہا پھر تھکن نے غلبہ پا لیا اور آنکھیں بوجھل ہو گئیں۔ میں لیمپ بجھا کر سو گیا۔

پتا نہیں میں کتنی دیر تک سویا تھا کہ اچانک فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں اچھل پڑا۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ "ہیلو!" میں نے نیند سے بوجھل آواز میں کہا۔

"کیا تم واپس نہیں جا سکتے؟" وہ کوئی عورت تھی۔

"کیا مطلب؟ کون ہیں آپ؟" میری نیند اڑ گئی۔ میں کہنی کے بل اٹھ بیٹھا۔

"واپس چلے جاؤ...... یہی تمہارے حق میں بہتر ہے مسٹر ضیاء!" اس نے میرا نام لے کر چبا چبا کر کہا تو میں اچھل پڑا۔

"مونیکا؟" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

"نہیں...... زیوسا......" اتنا کہہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا۔

"ہیلو...... ہیلو...... ہیلو!" میں چیختا رہ گیا۔ لائن بے جان تھی۔ میں نے ریسیور کریڈل پر رکھا تو احساس ہوا کہ میرے سرہانے رکھا لیمپ روشن ہے۔ مجھے یاد تھا کہ میں نے سوتے ہوئے اسے بجھا دیا تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرے سامنے والی کھڑکی بھی کھلی ہوئی تھی اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اندر آ رہے تھے۔ میں بستر سے اتر آیا۔ کھڑکی کے قریب گیا۔ اسے بند کیا۔ واپس آ کر میں نے سگریٹ کا ڈبا اٹیچی کیس سے نکالا۔ سگریٹ سلگایا اور بستر پر لیٹ کر لمبے لمبے کش لینے لگا۔ میرا دماغ اسی آواز میں الجھا رہا تھا۔ وہ آواز

وہ نہیں تھی جو رابرٹ یا جینیو کے فون پر سنائی دی تھی۔ مجھے مونیکا کا دھیان آ رہا تھا مگر جب میں نے غور کیا تو وہ مونیکا کی آواز بھی نہیں تھی۔ شاید مجھے مونیکا کا خیال اس لئے آیا تھا کہ اس نے مجھے میرے نام سے مخاطب کیا تھا۔ میں بہت دیر تک الجھتا رہا' سوچتا رہا مگر کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ مسلسل سگریٹ پھونکتا رہا۔ میں نے گھڑی دیکھی' صبح کے تین بج رہے تھے۔

آخر میں نے تیسرا سگریٹ آدھا پی کر بجھا دیا۔ لیمپ بجھایا اور پھر سونے کی کوشش کرنے لگا مگر اس بار نیند نہیں آئی۔ بار بار کوئی مجھے اندر سے اکساتا رہا کہ مجھے واقعی واپس چلے جانا چاہئے۔ دوسری زنجیر کو بھی رابرٹ کے حوالے کر دینا چاہئے۔ اس سارے چکر سے اپنا دامن بچا کر نکل جانا چاہئے لیکن دماغ مصر تھا کہ اس پراسراریت کا پردہ چاک کئے بغیر چلے جانا بزدلی ہے۔ ہاں' اگر میرے خاندان میں اتنے لوگ اس پراسراریت کا شکار نہ ہوئے ہوتے تو یقیناً مجھے اس چکر میں نہیں پڑنا چاہئے تھا لیکن اب......... اب میں یہ تہیہ کر چکا تھا کہ ایسے نہیں جاؤں گا۔

"زیوسا!!" یہ نام اچانک ہی میرے دماغ میں گونج اٹھا۔ "یہ کیسا نام تھا؟ عجیب سا........" میں سوچتا رہا۔ مجھے لگا جیسے یہ روسی نام ہے یا شاید یونانی ہو۔ میں نے سوچا' رابرٹ سے پوچھوں گا۔ وہ یقیناً اسے جانتا ہو گا مگر یہ کون تھی۔ اسے یہ کیسے پتا چلا کہ میرا نام ضیاء ہے اور میں اس چکر میں آیا ہوں پھر اسے مجھ سے ایسی کیا ہمدردی ہے کہ وہ میری بہتری کے متعلق سوچ رہی ہے۔ مجھے لوٹ جانے کا مشورہ دے رہی ہے۔ ذہن الجھ رہا تھا اور میں سونا چاہتا تھا مگر نیند نہیں آ رہی تھی۔ گھڑی کی سوئیاں دھیرے دھیرے' ٹھنک ٹھنک کر چل رہی تھیں۔ میں ان سوئیوں پر نگاہ جمائے لیٹا تھا کہ اچانک یوں لگا جیسے میرے کمرے کے باہر........ دروازے کے بہت قریب کوئی رو رہا ہے۔

پہلے میں سمجھا کہ میرا وہم ہے مگر یہ آواز دھیرے دھیرے بلند ہو رہی تھی........ اور پھر میں ایک دم اچھل پڑا۔ "طیب.........!" میں چیخا اور باہر کی طرف بھاگا۔

وہ کسی کے رونے کی آواز تھی اور پتا نہیں' کیوں مجھے لگا تھا جیسے طیب رو رہا ہو۔ میں بستر سے اچھل کر دروازے کی طرف لپکا تو بائیں طرف کسی ٹیبل پر پڑا ہوا میز پوش کا کونا میرے انگوٹھے کے ناخن میں اڑ گیا اور اس پر رکھی ساری چیزیں میرے سامنے آ گریں۔ گلدان ٹوٹنے سے میرا پاؤں زخمی ہو گیا۔ ایک بھاری سا پیتل کا مجسمہ بھی تھا جو

پاؤں پر گرا تھا۔ میں کراہ کر رہ گیا مگر رکا نہیں' لنگڑاتا ہوا باہر بھاگا بلکہ تقریباً اپنے آپ کھینچتا ہوا لے گیا۔ لگا یوں تھا جیسے میرے ہی دروازے کے باہر کوئی رو رہا ہو مگر برآمدہ ویران تھا۔ اب کوئی آواز بھی نہیں تھی۔

میں یہ تصور تک کرنے کو تیار نہ تھا کہ یہ میرا وہم تھا اس لئے یہ خیال تو مجھے وہاں لیٹے لیٹے ہی آیا تھا اور میں نے اپنی تمام قوتیں مجتمع کرتے ہوئے اس امکان کو رد کر دیا کہ وہ آواز نہ صرف یہ کہ مسلسل آ رہی تھی بلکہ بتدریج بلند بھی ہوئی تھی۔ میرے پاؤں میں سخت تکلیف تھی مگر میرا دھیان طیب ہی کی طرف تھا۔ میں جانتا تھا کہ طیب کا بیڈ روم نیچے ہے۔ میں اسی طرح گھسٹتا ہوا وہاں تک پہنچا۔ دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ دروازہ اندر سے بند ہے۔ پہلے تو میں نے آواز سننے کی کوشش کی مگر جب کوئی آواز سنائی نہ دی تو میں سوچ میں پڑ گیا۔ ایسے سناٹے میں طیب کو اٹھانے کا مطلب تھا کہ میں اسے بھی اپنے پیچھے لگا لوں۔ وہ میری جان کو آ جاتا۔ مجھ سے اٹھانے کی وجہ پوچھتا' میں وجہ بتاتا اور وہ میری مذاق اڑاتا۔

یہی سوچ کر میں نے اسے اٹھانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس کے کمرے میں سناٹا تھا' دروازہ اندر سے بند تھا اس لئے مجھے اتنا اطمینان ہو گیا تھا کہ وہ بہرحال خیریت سے ہے اور بہتا سو رہا ہے۔ اب میں نے اپنے پیر کی طرف دھیان دیا جس کی تکلیف بڑھ گئی۔ یہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا کہ وہ کافی زخمی ہوا تھا۔ خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ میں واپس اپنے کمرے تک آیا تو قالین اور سیڑھیوں پر خون کے دھبے دیکھتا رہا جو میرے پیر سے نکلا تھا۔ مجھ میں ہمت نہ تھی کہ انہیں صاف کرتا کیونکہ یہاں اکثر جگہ قالین تھا اور قالین پر سے خون کے دھبے صاف کرنا محنت طلب کام تھا۔

پھر تکلیف بھی بہت تھی۔ میں کسی نہ کسی طرح اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ میں نے باتھ روم جا کر اپنا پیر دھویا۔ تلوا زخمی تھا اور زخم کافی گہرا تھا جبکہ اوپر کا حصہ نیلا ہو کر سوج گیا تھا۔ یہ غالباً اس پیتل کے مجسمے کی کارستانی تھی۔ ہڈی کے ساتھ کافی خون بہہ گیا۔ ذرا دیر کو زخم کی گہرائی کا اندازہ ہوا پھر وہ خون سے بھر گیا۔ میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی' یہاں نہ کاٹن تھی نہ ایسا صاف کپڑا جسے میں خون صاف کرنے کے لئے استعمال کرتا۔

آخر تنگ آ کر میں نے تکیے کا غلاف اتارا' اسے الٹا کیا اور اسے پھاڑ کر پٹیاں بنائیں پھر ایک ٹکڑے سے خون صاف کیا۔ تیکچر آیوڈین البتہ باتھ روم سے مل گیا تھا اور ان

حالات میں وہی غنیمت تھا اس لئے میں نے زخم پر اس پاؤڈر کو چھڑکا تا کہ خون بند ہو سکے
پھر کس کر پٹی باندھی حالانکہ پٹی باندھنے سے نیل کی جگہ کافی تکلیف محسوس ہوئی تھی۔
پاؤں میں اٹھنے والی ٹیسیں پنڈلی تک پہنچنے لگیں تو میں نے سوچا اب طیب کو اٹھا دینا
چاہیے۔ پتا نہیں' زخم کی کیا کیفیت تھی! خراب بھی ہو سکتا تھا۔ مجھے اس بات کا بھی خیال
تھا کہ اس باتھ روم میں ڈیٹول تک نہیں تھا مگر اب مسئلہ تھا میرے دوبارہ طیب کے
کمرے تک جانے کا۔ جس اذیت سے گزر کر میں وہاں تک گیا اور واپس آیا تھا' اس کا
دکھن تو اب تک بدن میں لہریں لے رہی تھی۔

اس روز مجھے پہلی بار اس گھر کی بناوٹ مضحکہ خیز لگی' دو کمرے نیچے' دو کمرے
اوپر' ایک کمرا چھت پر' شاید ہم انسانوں میں مکانوں کی اس طرز تعمیر نے ہی فاصلے پیدا کئے
ہیں۔ نظر آتی رہنے والی چیزیں اندر بھی جگہ بنا لیتی ہیں اور ایسے غیر محسوس طریقے سے کہ
آدمی ماننے کو تیار نہیں ہوتا۔ ایسا بھی تو نہیں تھا کہ میں آواز دیتا اور طیب سن لیتا' پھر
سرونٹ کوارٹر والا ڈراما بھی یہاں خوب شروع ہوا تھا۔ کہنے کو ہر وقت ملازم موجود ہیں مگر
انتہائی خراب اور ضروری حالت میں کسی کی ضرورت پڑ جائے تو بے بسی مذاق اڑائے۔
اب اگر آدمی اٹھ کر پانی پینے کے قابل نہ ہو تو وہ سرونٹ کو بلانے سرونٹ کوارٹر تک کیسے
جائے' اٹھ کر پانی خود ہی نہ پی لے۔

میں کڑھتا رہا اور اسی بہانے اپنی تکلیف کو بہلاتا رہا۔ مگر لگتا تھا شیشہ کہیں اندر ہی
رہ گیا ہے' ذرا سی حرکت پر اندر جیسے گوشت چرنے لگتا تھا۔ معاملہ پاؤں کا تھا جو مجھے مفلوج
اور معذور کر سکتا تھا۔ مزید تکلیف مسلسل برداشت کرنے کی بجائے میں نے تھوڑی دیر کی
زیادہ برداشت کرنے کا فیصلہ کر لیا اور پھر گھسٹتا ہوا باہر نکلا ہی تھا کہ جیسے گھر میں طوفان سا
آ گیا۔ طیب کی چیخ و پکار اچانک سنائی دی۔ پہلے دروازہ زور سے کھلنے کی آواز آئی تھی جس
سے میں اس حالت میں بھی اچھل پڑا تھا پھر طیب کی مسلسل چیخوں کی آوازوں نے مجھے
مزید حواس باختہ کر دیا۔ وہ مجھے دیوانوں کی طرح پکارتا ہوا شاید میری ہی جانب آ رہا تھا۔
میں اپنے آپ کو اور تیزی کے ساتھ گھسیٹنے لگا۔ یہ شور اس سناٹے کے بعد قیامت کا شور
محسوس ہو رہا تھا۔

"ضیاء......! ضیاء......!" یہ آواز میرے بالکل قریب سے آئی تھی مگر اس
وقت تک پیر کی تکلیف نے مجھے جکڑ کر اندھیروں میں دھکیل دیا تھا' غالباً سیڑھیوں کے

...ب نے اس پر ایک اور زخم کا اضافہ کر دیا تھا۔ مجھے اتنا ضرور ہوش رہا کہ میں سیڑھیوں
...را نہیں' کسی نے مجھے سنبھال لیا۔

☆------☆------☆

میں بالکل نہیں جانتا کہ مجھے کتنی دیر بعد ہوش آیا۔ حواس لوٹے تو کسی پرائیویٹ
...بیڈ پر تھا۔ طیب میرے قریب تھا' ایک ادھیڑ عمر کا ڈاکٹر بھی تھا۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ
...طیب کے چہرے پر خوشی جھلک اٹھی۔ وہ جھکا۔ "ضیاء! کیسے ہو تم؟"
"ٹھیک ہوں! طیب مگر تمہیں کیا ہو گیا تھا؟" میں نے اسے سر سے پیر تک غور سے
...لیا۔

"کیا ہو گیا تھا؟" اس کے چہرے پر حیرت ابھری۔ "یہ تو تم بتاؤ گے ضیاء! میرا خیال
...ہ کہ کوئی چور ووڑ آیا ہو گا یا پھر...... تم زخمی کیسے ہوئے اور تم کیوں رو رہے تھے؟"
اس نے بہت سے سوال کر ڈالے۔ مجھے لگا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ بات وہ نہیں جو میں
...رہا ہوں پھر وہ ڈاکٹر اپنے چشمے کے اوپر سے ہم دونوں کو دیکھ رہا تھا' اور مجھے لگا کہ
...کے سامنے بات کرنا بھی مناسب نہیں اس لئے میں نے طیب کو نظر انداز کر دیا۔ اپنے
...زخم کی تکلیف اب کم محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے دیکھا میرا پاؤں سفید پٹیوں میں لپٹا
...ہوا تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"تم ہمت والے نظر آتے ہو۔ ایسا کوئی خاص زخم نہیں ہے۔ البتہ کچھ ٹانکے لگانے
...پڑے ہیں۔ اینٹی بایوٹک دواؤں کا استعمال اور اس کی بہتر صفائی کے بعد مرہم پٹی تمہیں
...جلد صحت مند کر دے گی۔" اس ڈاکٹر نے بڑے شگفتہ انداز میں کہا۔ "لیکن تمہیں کچھ
...آرام تو کرنا پڑے گا۔ اگر تم چلنے پھرنے کی کوشش کرو گے تو دشواری پیدا ہو جائے گی۔
...ویسے تم جا سکتے ہو مگر اسٹریچر پر۔ میں چھوٹا ڈاکٹر ہوں' چھوٹا کلینک ہے اس لئے ایمبولینس
...کی توقع مت رکھنا۔" وہ مسکرا رہا تھا اور غالباً میرے لئے کچھ دوائیں بھی لکھتا جا رہا تھا۔
"نہیں......! میرا خیال ہے کہ میں باہر گاڑی تک تو جا ہی سکتا ہوں۔" میں
...نے ٹانگ سمیٹتے ہوئے تکلیف کا اندازہ لگایا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے پاؤں بالکل سن ہے۔ مجھے
...تکلیف ایسی محسوس نہیں ہوئی مگر اندر کہیں میٹھا میٹھا سا درد تھا۔
"نہیں...... جانے کو تو تم کسی پہاڑ کی چوٹی پر بھی جا سکتے ہو مگر اس طرح تم ایک
مستقل روگ پال لو گے۔ بہتر ہے کہ اپنے کزن کا سہارا لے لو۔ اس وقت میرے پاس

کوئی آدمی بھی نہیں ہے ورنہ گود میں اٹھا کر.........."

طیب نے ان کی بات کاٹ دی۔ "میں.......میں اٹھا کر لے جاؤں گا' آپ فکر نہ کریں۔"

"یہ دوائیں خرید لینا۔ اس وقت تو یہاں سے بہت دور ملیں گی۔ فی الحال صبح تک کی خوراک تو میں دے چکا ہوں مگر تم صبح یہ دوائیں لے کر پابندی ضرور کرنا۔ کورس پورا کرنا ضروری ہے۔"

میں خود کو کافی بہتر محسوس کر رہا تھا۔ طیب نے مجھے بڑی آسانی سے اٹھا لیا۔ ڈاکٹر کو وہ شاید اس وقت اس کے گھر سے لے کر کلینک آیا تھا اس لئے کہ وہ بھی ہمارے ساتھ ہی کلینک بند کر کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔ راستے میں طیب نے بولنا چاہا تو میں نے اسے اشارے سے خاموش کرا دیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ ایسے ایسے پیچیدہ سوالات کرے گا جس کا سوچے بغیر جواب دینا میرے لئے ممکن نہ ہو گا اور ابھی تک تو یہ ساری صورت حال میرے سامنے واضح نہیں تھی۔ پہلے مجھے اس سارے واقعے کے بارے میں سوچنا تھا طیب کی حالت نے یہ یقین تو مجھے دلا دیا تھا کہ میں نے جو اس کے رونے کی آواز سنی تھی تو وہ یقیناً میرا وہم تھا یا پھر وہی کوئی پُراسرار چکر.......... مگر کیا؟ اور کیوں؟ اس پر غور کرنا ضروری سمجھتا تھا۔ طیب اس قدر لاابالی اور غیر متوازن شخصیت کا مالک تھا کہ اس سے کسی سنجیدہ معاملے پر گفتگو ہی فضول لگتی تھی' نہ کہ کسی واقعے یا بات کا تجزیہ مگر ایک مجبوری یہ بھی آن پڑی تھی کہ ان حالات میں میرے پاس اس کے سوا کوئی تھا بھی نہیں۔ ناصر بھی اپنے محکمے کی جانب سے کلکتہ گئے ہوئے تھے۔ وہ تو غنیمت تھا کہ چچی اور دوسرے بچوں کے علاوہ طاہر بھائی اور زہرہ آپا بھی یہاں نہیں تھے ورنہ جانے کیا ہوتا۔

اتنا مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میری یہاں موجودگی ابھی اور بھی گل کھلائے گی' مگر مسئلہ یہ بھی تھا کہ میں اور کہاں جا کر رہوں۔ کسی ہوٹل میں رہنا گویا پوری دنیا میں تماشا بننے کے مترادف ہوتا۔ بہرحال میرے کہنے کے مطابق بلکہ میری خواہش کے عین مطابق طیب خاموش تھا مگر کلینک سے گھر تک کے راستے میں اس نے کم از کم ہزار بار پہلو ضرور بدلا تھا۔

گاڑی گھر کے قریب رکی تو میں اپنے خیالات سے باہر آ گیا۔ میں نے طیب سے پوچھا۔ "تائم کیا ہوا ہے؟"

"تائم!" وہ ایک دم خوش ہو کر میری طرف یوں پلٹا جیسے میرے بولنے سے اچانک اسے یہ خوشخبری ملی ہو کہ میری قوت گویائی لوٹ آئی ہے۔ پھر منہ بنا کر کلائی پر نگاہ ڈال کر بولا۔ "پتا نہیں۔ گھڑی تو میں باندھنے کی پوزیشن میں ہی نہیں تھا۔ ویسے ڈاکٹر قدیر کے گھر گیا تھا اور انہیں چلنے کو کہا تھا تو دو بج رہے تھے۔ میرا خیال ہے' اب چار تو بج ہی گئے ہوں گے۔"

اب مجھے خیال آیا کہ میں ہی نہیں' خود وہ بھی سلیپنگ سوٹ میں ہے۔ ظاہر ہے' گھڑی باندھنے کی پوزیشن میں کیسے ہو سکتا تھا۔ وہ گاڑی اندر لے آیا۔ گیٹ ویسے ہی کھلا تھا جیسے اس نے چھوڑا ہو گا۔ ملازم کو نہ ہمارے جانے کا پتا تھا نہ آنے کا ورنہ وہ ضرور منتظر ہوتا۔ طیب پھر مجھے گود میں لے کر گھر کے اندر گیا۔ اس بار وہ مجھے میرے کمرے میں نہیں لے گیا' میں خاصا وزنی تھا اور مجھے لے کر سیڑھیاں چڑھنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ اسی میں اس کے پسینے چھوٹ گئے تھے۔ وہ مجھے اپنے کمرے میں لے گیا۔ پھر اسی نے میرے لئے گرم گرم کافی بنائی۔ دیوار سے لگے ہوئے صوفے کو سرکا کر میرے قریب لے آیا۔ میں اس کے بیڈ پر لیٹا تھا' وہ صوفے پر بیٹھ گیا۔

"اب بتاؤ! کیا ہوا تھا؟"

میں جانتا تھا کہ وہ ساری تیاری کیوں کر رہا ہے' یہی سوال کرنے کے لئے' میں نے چند لمحے سوچا پھر شاید اس کے چہرے سنجیدگی دیکھ کر بول اٹھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں ابھی سویا بھی نہیں تھا کہ میں نے اس کے رونے کی آواز سنی تھی اور بھاگا تھا جس کے نتیجے میں زخمی ہو گیا تھا۔

وہ یہ سب سن رہا تھا تو اس کا چہرہ سفید ہو گیا۔ مجھے لگا جیسے کچھ غیر معمولی بات ہوئی ہے۔

"مگر.......رونے تو تم تھے۔" وہ ہونقوں کی طرح آنکھیں پھیلا کر بولا۔

"میں تمہاری طرح پاگل نہیں ہوں۔" میں نے منہ بنا کر جواب دیا۔ "بہرحال جب میں زخمی ہونے کے باوجود بھی تمہارے کمرے تک آیا تو کمرا اندر سے لاک تھا اور غالباً تم بے خبر سوئے ہوئے تھے اس لئے میں تمہیں اٹھائے بغیر چلا گیا مگر پھر تکلیف نے بے چین کر دیا۔ تم تک آنے کا سوچ کر خود کو گھسیٹ ہی رہا تھا کہ تم چیخنے چلانے لگے' یہ آوازیں سن کر جو میں بھاگا تو.......... سیڑھیوں پر پیر ریلنگ سے ٹکرا گیا اور پھر.......... میں بے ہوش

ہو گیا۔ اب تم شروع ہو جاؤ۔ تم نے کیا خواب میں بھوت دیکھ لئے تھے جو اس طرح بری طرح شور مچا رہے تھے؟"

وہ اب منہ کھولے میری بات سن رہا تھا۔ بات ختم ہونے کے باوجود اس کی پوزیشن میں تبدیلی نہ آئی تو میں نے اسے پکارا۔ وہ چونک اٹھا۔

"نہیں......! میں تو سو رہا تھا مگر پھر......... اچانک تمہارے چیخنے اور رونے کی آواز آنے لگیں اور میں دروازہ لاک بھی نہیں کرتا۔ جب میں باہر نکلا تو تم سیڑھیوں پر کھڑے چکرا رہے تھے پھر میں نے دیکھا کہ تم زخمی ہو مگر........"

"میں نہیں چیخا بلکہ تمہاری آواز سن کر........" اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں بے وقوفی کی باتیں کر رہا ہوں۔ بے سبب بحث۔ اتنا ہوا تھا کہ کسی کے رونے کی آواز آئی ضرور تھی' پہلے مجھے اور میں سمجھا طیب ہے اور بعد میں طیب کو۔ وہ سمجھا کہ میں ہوں مگر وہ آواز........ کیا تھی؟ اگر میرا وہم تھا تو سمجھ میں آتا تھا کہ میں ان چکروں اور حالات کے درمیان ہوں جہاں اپنی نفسیات کی کمزوری کے کرتب بھی بڑے یقین کے ساتھ دیکھ اور محسوس کر سکتا ہوں مگر طیب........ اسے تو خواب میں مونیکا کے ساتھ بادلوں میں اڑنے والے سین نظر آنے چاہییے تھے۔ وہ تو نہ ایسے حالات سے دوچار تھا نہ ایسی باتیں سوچنے کا روادار۔

طیب حیران تھا۔ وہ بات کو سمجھنے کی کوشش بھی کر رہا تھا' ممکن ہے میری ذہنی حالت پر بھی شبہ کر رہا ہو' مگر میرے پاؤں کا زخم اور کمرے کا حلیہ جو وہ دیکھ کر آیا تھا اسے معلق کیے ہوئے تھا۔ وہ کسی ایک طرف ہو نہیں پا رہا تھا' یہ کیفیت اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ موقع اچھا ہے' اسے پُراسراریت سے یوں بھی دلچسپی ہے جو فی الحال مونیکا کے طلسماتی حسن تک ہی محدود ہے مگر مونیکا کے سلسلے میں جو شکوک و شبہات میرے ذہن میں سر اٹھا چکے تھے بلکہ یقین کی حدود کو چھو رہے تھے۔ اگر اسے بتا دوں تو وہ چوکڑی بھول جائے گا' ایک شائبہ یہ بھی تھا کہ وہ زندگی کی اس سطحی ڈگر سے نکل کر زیادہ گہرائی میں جا سکے۔ مردانہ وار زندگی گزارنے کے لئے صرف مرد ہونا ہی ضروری نہیں ہوتا بلکہ اس میں وہ خصوصیات بھی ہونا ضروری ہوتی ہیں جو مردانگی کو ثابت کریں۔ یہاں آپ غلط مت سمجھ لیجئے گا۔

لوگ عموماً اس بات کو کہ خدا کہتا ہے۔ "میں نے مردوں کو عورتوں سے زیادہ بلند

درجات عطا کئے ہیں۔" یہ مطلب لیتے ہیں کہ غالباً وہ عورتوں کے مقابلے میں زیادہ معتبر اور اعلیٰ ہیں۔ خواہ ان میں کتنی ہی برائیاں اور خامیاں کیوں نہ ہوں۔ یہ ایک مذہبی معاملہ ہے مگر میرے نظریات اس بارے میں ذرا سے مختلف ہیں' میں ان درجات کا مطلب یہ لیتا ہوں کہ مردوں میں عورتوں سے زیادہ طاقت (جسمانی اور روحانی) برداشت' جذبات میں عورتوں سے زیادہ توازن' سوچنے سمجھنے اور اس پر عمل درآمد کرنے کے طریقہ کار پر مکمل دسترس' آزادی (ان معنوں میں کہ وہ سڑکوں پر گھوم پھر سکتے ہیں۔ اندھیرے جنگلوں میں سفر کر سکتے ہیں' اکیلے کئی برس تک کہیں رہ سکتے ہیں اور زیادہ محنت مشقت کر سکتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ) اس کے علاوہ ہمت بھی زیادہ عطا کی ہے جبکہ عورتوں کو ان میں سے اکثر چیزیں کم دی ہیں' مثلاً ان میں ہمت کم ہوتی ہے' جسمانی طاقت مرد کے مقابلے میں کم ہے' جذباتی ہوتی ہیں' جذباتی ہونے کی وجہ سے کسی بھی چیز یا واقعے سے بغیر سوچے سمجھے متاثر ہو جانے کی وجہ سے فیصلہ بھی غلط کر سکتی ہیں۔ اکیلی کہیں زیادہ عرصہ نہیں رہ سکتیں' تنہا جنگلوں میں سفر کرنے کا یارا نہیں ہوتا۔ رشتے اور تعلق کی بناء پر ترجیح دینا ان کے لئے زیادہ اہم ہو جاتا ہے' رحم دلی عقل و خرد پر اثرانداز ہو جاتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ کلیہ نہیں' اکثر بے ہمت مرد بھی ہوتے ہیں اور اکثر باہمت اور مدبر خواتین بھی' مگر عمومی انداز کی بات کر رہا ہوں۔ بہرحال یہ میرا نظریہ ہے ضروری نہیں کہ یہ بات آپ بھی مان لیں مگر میرا خیال ہے کہ اس پر آپ سوچیں گے ضرور اور ایسے لوگوں کو تو اس پر ضرور سوچنا چاہیے جو عورت پر ظلم بھی کرتے ہیں' معاشی' معاشرتی اور سماجی برائیوں کے علاوہ غیر اخلاقی اور غیر اسلامی حرکتیں کرنے کے باوجود خود کو اس جملے سے انڈر اسٹینڈنگ نہ ہونے کی بناء پر بے حد بلند درجات کا حامل اور قابل احترام و معتبر بھی سمجھتے ہیں۔

میں طیب کی بات کر رہا تھا کہ وہ جس انداز میں زندگی بسر کر رہا تھا وہ میرے نزدیک ذرا نسوانی قسم کی تھی۔ (محض جذباتی ہونے کی وجہ سے)

"نیاء! میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔" اس نے میرے تجیئات پر بند باندھ دیا۔

"جلد سمجھ میں آ جائے گا بچے۔" میں مسکرا دیا۔

"یعنی......!" وہ خوف زدہ ہو گیا حالانکہ میں نے جس لہجے میں کہا تھا اس میں دھمکی نام کی کوئی چیز نہ تھی۔

"مونیکا بہت سحرانگیز ہے نا؟" مجھے اسے چھیڑنے میں مزہ آنے لگا۔

"ہاں!"

وہ چونک اٹھا اور پھر یوں لگا جیسے وہ سب کچھ بھول گیا۔ جیسے یہ وہ طیب ہی نہ ہو جو لمحہ بھر پہلے میرے سامنے بیٹھا' دونوں ہتھیلیوں سے کافی کا گرم کپ سختی سے تھامے خوفزدہ بیٹھا' تھوڑی دیر پہلے ہونے والے واقعے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

"یار! تم سوچ نہیں سکتے کہ جب اس نے میرے ساتھ گھر آنے کا اقرار کیا تو میں.......... میں تو آپے سے باہر ہو گیا تھا بلکہ.......... یوں لگا' جیسے میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ یار! وہ لڑکی.......... اف.........!" اس نے ایک ہی گھونٹ میں کافی حلق میں انڈیل کر کپ تپائی پہ رکھتے ہوئے خلا میں نگاہیں جما دیں۔ جیسے.......... جیسے میں سمندر کی دھیرے دھیرے بہنے والی لہروں پر ڈول رہا ہوں.......... یا.......... یا جیسے ستاروں کے جھرمٹ میں سے گزرتے ہوئے میرے دماغ میں' دل میں.......... بلکہ پورے وجود میں کہکشاں پھیلنے لگی ہو یا.........."

"بس بھیا! بس..........! مجھے شاعری انتہائی فضول چیز اسی لئے لگتی ہے کہ اس کا پریکٹیکل لائف سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ پوری زندگی کو' اس کی تلخیوں اور خوشیوں دونوں کو صرف تشبیہات میں بدل کر اسی قدر سہل بنا دیتی ہیں کہ ہر شاعر تمہیں صرف ڈولتا اور خیالوں میں گم نظر آئے گا۔ زندگی کو برتنے سے ان کی جان جاتی ہے' ذرا سی تکلیف سے بلبلا جاتے ہیں مگر ان تکلیفوں کو جھیلنے کے اس قدر آسان اور خوبصورت طریقے مصرعوں میں باندھتے ہیں کہ پڑھنے والے کا جی چاہتا ہے یہ تکلیفیں اسے تحفے کے طور پر مل جائیں۔"

"ہیں..........! کیا؟" وہ یوں دیکھنے لگا جیسے اس نے میری بات سنی ہی نہ ہو۔

"مونیکا سے راہ و رسم کا یہ پہلا تحفہ ہے جسے تم بصد احترام' بصد خلوص بلکہ بصد عشق یہاں لے کر آئے تھے۔"

"کونسا تحفہ؟"

"یہ پُراسرار واقعہ۔ یہ زخم.......... اور.......... یہ رات' جو ہم جاگ کر گزار رہے ہیں۔"

"ارے نہیں یار!" اس نے منہ بنایا۔ "تم اسے سمجھے نہیں۔"

"طیب خان! میں تو سمجھ گیا ہوں مگر تمہیں بروقت اطلاع دے رہا ہوں کہ تم اس سے ہوشیار رہنا۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے خاندان کی پُراسراریت اپنا دائرہ وسیع کر رہی ہے۔"

اس کے بعد جب میں نے اسے بتایا کہ میں یہاں کیوں آیا اور رابرٹ سے مل کر کیا دیکھا اور دوسروں کو فون کر کے کیا سنا ہے تو اس کا رنگ بلا مبالغہ پیلا ہو گیا اور جب میں نے اسے بتایا کہ کسی عورت نے مجھے اس گھر میں' اس کے فون پر فون کر کے واپس لوٹ جانے کو کہا ہے تو اس کی آنکھیں بھی چڑھنے لگیں اور لگا جیسے اب وہ جھومتا ہوا صوفے پر گر جائے گا مگر اس نے خود کو سنبھال لیا۔ چند لمحے وہ میری طرف دیکھتا رہا پھر اس کے چہرے پر بے یقینی پھیل گئی۔ اس نے لمحوں میں میری ساری باتوں بلکہ یہاں ہونے والے اس واقعے کو بھی جھٹلا دیا جس کا ایک کردار وہ خود بھی تھا۔

"پھر یہ سب کیا تھا؟" میں بھنا گیا۔

"وہم.......... ڈیئر..........! میں نے کہیں پڑھا تھا کہ وہم اتنی بڑی اور طاقتور بیماری ہے کہ اچھا بھلا آدمی چغد بن کر رہ جاتا ہے۔ اس کا علاج تو اس کے پاس بھی نہیں تھا.......... اس کے یار..........! وہ.........." وہ اپنے ماتھے پر انگلی مارتے ہوئے یاد کرنے لگا۔

"وہ کون تھا؟ شاید وہ ایک بڑا سائنس دان تھا ناں! جس نے وہم کا علاج ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی مگر پھر اپنی شکست بھی تسلیم کر لی تھی۔ بڑا اچھا نام تھا یار اس کا۔"

"تم لقمان کی بات کر رہے ہو۔" میں ہنس دیا۔

"ہاں! ہاں! وہی۔ اب اتنا بڑا سائنس دان غلط بات تو نہیں کہہ سکتا ناں؟"

"وہ سائنس دان نہیں تھا بچے! حکیم تھا.......... حکیم لقمان۔"

"ایک ہی بات ہے۔"

"تو تمہارا خیال میں یہ سب وہم ہے میرا؟"

"ہاں!" اس نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے یا اپنے یقین کو پُرزور ظاہر کرنے کے لئے زور سے سر ہلایا۔

"اچھا۔" میں نے اچھا کو کھینچا۔ "آج مجھے سورن سنگھ سے ملنے اس کے گھر جانا ہے۔ کیا تم وہاں چلنا پسند کرو گے؟"

"ہاں! چلوں گا مگر جانا کس وقت ہے؟"

"رات نو بجے۔"

"اچھا خیر' دیکھو' اگر مونیکا سے رات ڈنر کا کوئی پروگرام نہیں بنا تو میں ضرور چلوں گا' ویسے یار! ایک اور بھی ہے۔ وہ تو اس سے بھی بڑھ کر قیامت ہے۔" وہ کچھ میرے قریب سرک آیا۔

"بس!" میں نے ہاتھ اٹھایا۔ "فی الحال مجھے اس ایک کے چکر سے نکلنے دو۔ پھر یہ......... زیو سا پتا نہیں کون ہے؟"

"یار ضیاء! وہ جو چین تھی ناں! تمہارے پاس۔ تم بتا رہے تھے کہ دو تھیں اور ایک تم نے رابرٹ کو دے دی تھی۔ یہی بتایا تھا ناں تم نے.........!"

"ہاں! مگر کیوں.........؟ اس کا کیا ذکر ہے۔"

"یار! وہ تم میرے ہاتھ بیچ دو۔"

"تم پاگل تو نہیں ہو۔" اب مجھے غصہ آگیا۔

"لو! اس میں پاگل ہونے والی کون سی بات ہے۔ میں اسے خرید سکتا ہوں۔ قیمت دوں گا اس کی۔ اصل میں' میں مونیکا کو کوئی ایسا تحفہ دینا چاہتا ہوں جو دنیا کی ہر چیز سے منفرد ہو۔ ایسا جسے دیکھ کر وہ حیران رہ جائے۔ ایک مختلف چیز۔ سونے کی یہ زنجیر دونوں کے درمیان فاصلے کے لئے محبت کی ایسی زنجیر ثابت ہوگی جو ہم دونوں کو ایک بندھن میں جکڑ دے گی۔" اس نے پھر خلاؤں میں دیکھ کر محل بنانا شروع کر دیا تھا۔

"میں اس سے زیادہ مضبوط زنجیر فراہم کر سکتا ہوں۔"

"کیسے؟" وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔

"شادی کی اس زنجیر......... ایسا بندھن جو جڑتا تو ایک کڑی سے ہے مگر پھر سال دو سال ہی میں نئی کڑیوں کے اضافے کی بات چل نکلتی ہے۔ پھر یہ زنجیر اتنی لمبی ہو جاتی ہے کہ آدمی نکلنا بھی چاہے تو ان کڑیوں سے نکل نہیں پاتا۔"

وہ چند لمحے میری بات سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ اچانک اس کے چہرے کے تاثرات تبدیل ہوگئے۔ "میرا خیال ہے مجھے نیند آ رہی ہے۔ تم خود بھی کچھ دیر سو لو۔"

اس کے ایسا کہنے پر مجھے یاد آیا کہ مجھے تو سویرے رابرٹ کے پاس جانا تھا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا۔ وہاں جانا بہت ضروری تھا' مجھے بہت کچھ علم ہونے کا یقین اور امید تھی۔ "طیب!" میں نے اسے اٹھتے دیکھ کر مخاطب کیا۔ "یار! اس گھر میں ایسی کوئی چیز ہوگی

جو میرے لئے سہارے کا کام دے سکے۔"

"اوہ! چھڑی! شاید ہاں! شاید رحمان بابا کے پاس ہوگی مگر وہ سفید چھڑی ہوگی۔ رحمان بابا میرے ملازم ایاز کے دادا ہیں اور اندھے ہیں لیکن سیر و تفریح کا اور جوگنگ کا بہت شوق ہے' اس عمر میں بھی صحت لاجواب ہے' ان کے پاس ہوگی' میں ایک روز کے لئے لے سکتا ہوں۔ کل میں آفس سے آتے ہوئے تمہارے لئے خرید لاؤں گا۔"

"ہاں! چلے گی۔" میں مطمئن ہوگیا۔

"لیکن کیوں؟" وہ جاتے جاتے رک گیا۔

"مجھے صبح جانا ہے۔"

"باؤلے ہوگئے ہو کیا؟ اس حالت میں تمہارا بھرنا خطرناک ہے۔"

"مگر میرا پڑے رہنا اس سے زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ تم ان باتوں کو نہیں سمجھو گے۔ صرف چھڑی کا بندوبست کر دو اور تم جا کہاں رہے ہو۔؟"

"تمہارے کمرے میں سوؤں گا۔" اس نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔ میں نے کھڑکی سے باہر نگاہ ڈالی صبح کاذب کے آثار تھے۔

طیب کو نیند پیاری تھی لیکن اس سے پہلے وہ مجھے لاٹھی دے گیا اور یہ بھی کہہ گیا کہ وہ رات کو سورن سنگھ کے پاس میرے ساتھ چلے گا۔ میرا خیال تھا کہ یہ بھی اس نے یونہی سرسری انداز میں کہا ہوگا۔ رات تک اس کے فیصلے میں کئی بار تبدیلی آچکی ہوگی۔ وہ چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد تھوڑی دیر بعد اس کا ملازم چائے لے آیا۔ میں نے ہلکا ناشتا کیا۔ چائے پی۔ مجھے رابرٹ نے سویرے آنے کو کہا تھا۔ پاؤں زخمی نہ ہوا ہوتا تو میں کچھ دیر چہل قدمی بھی کر لیتا مگر اب میں کسی قسم کا رسک نہیں لینا چاہتا تھا گو تکلیف بہت کم تھی۔

میں آرام کرتا رہا۔ دھوپ دبے پاؤں آگے بڑھتی رہی۔ سرمئی دھند چمک دار ہوگئی تو میں نے منہ ہاتھ دھویا۔ کپڑے بدلے۔ چل کر اور زخمی پاؤں پر زور دے کر اپنا اطمینان کیا پھر میں گھر سے باہر نکل آیا۔ میں جانتا تھا کہ گاڑی طیب کے لئے ضروری ہے۔ مجھے رابرٹ کے پاس جانے کے سوا کوئی کام نہیں تھا اس لئے میں ٹیکسی لے سکتا تھا۔ میں نے ملازم کو بھیج دیا کہ وہ اگلے چوراہے سے ٹیکسی لے آئے۔ مجھے بہ مشکل پانچ منٹ انتظار کرنا پڑا۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر میں نے اسے پتا بتایا اور سیٹ کی پشت سے سر ٹیک کے

آنکھیں موند لیں۔

☆=====☆=====☆=====☆

رابرٹ کا گھر یہاں سے بہت دور تھا۔ اس دوران میں مونیکا کے بارے میں سوچتا رہا۔ نہ معلوم کیوں مجھے یہ یقین ہوتا جا رہا تھا کہ وہ رات اسی عمارت میں داخل ہوئی تھی۔ میں نے اسی بنا پر یہ فیصلہ بھی کیا تھا کہ آج میں رابرٹ کو اعتماد میں لے کر اس عمارت کی تلاشی ضرور لوں گا۔

"سر!" ٹیکسی ڈرائیور نے مجھے مخاطب کیا۔ وہ میرے مطلوبہ پتے پر پہنچ چکا تھا۔

"اوہ ہاں.........! دائیں جانب لے لو۔" میں نے کہا اور سنبھل کر بیٹھ گیا۔ کچھ آگے جا کر میں نے عمارت کے عین سامنے ٹیکسی رکوا لی۔ اسے پیسے دیتے ہوئے میں نے سرسری نگاہ اس عمارت پر ڈالی۔ یہ ایک تین منزلہ عمارت تھی۔ اوپر کی منزل باہر ہی سے ویران نظر آ رہی تھی۔ نیچے کے حصے میں تو پھر بھی آبادی کا احساس ہوتا تھا یا شاید اب مجھے احساس ہونے لگا تھا۔

"لیجئے سر!" ٹیکسی والے نے باقی پیسے دینے کے لئے مجھے مخاطب کیا اور میں اس کی جانب پلٹنے لگا تو چونک اٹھا اس لئے کہ پلٹتے پلٹتے مجھے ایسا لگا جیسے ہلکے آسمانی رنگ کے کپڑوں میں کوئی اوپر کی کھڑکی کے سامنے سے گزرا ہے۔ میں چونک کر واپس اسی جانب پلٹ گیا مگر وہاں ابھی اس کھڑکی کے شیشے کے پیچھے اب کوئی نہیں تھا۔ کوئی سایہ سا لہرایا تھا جو دوسرے پل ہی غائب بھی ہو گیا تھا اور اب میں بے یقینی کے عالم میں تھا کہ ایسا ہوا بھی ہے کہ نہیں۔ ممکن ہے، یہ میرا وہم ہو مگر میں اتنا وہمی تھا نہیں اس لئے بہت جلد اس کیفیت سے باہر نکل آیا۔

ٹیکسی والا چلا گیا۔ میں چند لمحے کھڑا اس کھڑکی کی طرف دیکھتا رہا پھر جانے میرے دل میں کیا آیا کہ میں نے عمارت کے باہر سے دوسری طرف گھوم کر بھی اس کا جائزہ لیا۔ یہ بہت بڑی عمارت تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کس کی ملکیت ہے اور رابرٹ کا اس عمارت سے کیا تعلق ہے جبکہ وہ مجھے امریکا اور یہاں موجود اپنی گرل فرینڈ روز کے قصے سناتا رہا تھا جس سے لگتا تھا کہ وہ زیادہ وہیں رہا ہے۔ بہرحال یہ باتیں آج پتا چل جاتیں مگر یہ عمارت......... اس کے بارے میں میرے شکوک و شبہات میں اضافہ ہو رہا تھا۔ میں اس سے پوچھنا چاہتا کہ وہ یہاں کیوں اور کیسے اور کس حیثیت سے رہ رہا ہے۔

جب میں عمارت کا جائزہ لے کر دوبارہ سامنے گیٹ پر پہنچا تو مجھ پر ایک حیرت انگیز انکشاف ہوا۔ میں وہ چھڑی جسے اپنے سہارے کے لئے مستعار لے کر آیا تھا، ٹیکسی میں بھول چکا ہوں اور بغیر کسی سہارے کے چل رہا ہوں اور کمال یہ کہ ذرا بھی تکلیف کا احساس نہیں ہوا۔ یہ خیال آتے ہی بے ساختہ میں نے پیر کی طرف دیکھا جس کے زخمی ہونے کی وجہ سے میں کھلے سینڈل پہن کر آیا تھا جو طیب کے تھے۔ پیر پر پٹی تو ویسے ہی بندھی تھی۔ میں نے پیر پر زور دیا۔ بار بار اسے سڑک پر مارا، یہ احساس کم کرنے کی کوشش کی کہیں سن تو نہیں ہو رہا مگر ایسا لگا جیسے میرے پیر پر کبھی کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ میں اندر جانا بھول کر وہیں کوئی منڈیر تلاش کرنے لگا۔ سامنے کی عمارت کے باہر کے گیٹ کے سامنے چار سیڑھیاں تھیں۔ میں اس طرف بڑھ گیا۔ میں نے وہیں پیر پر سے پٹی کھولی اور حیرت زدہ رہ گیا۔ وہاں زخم کا نشان تک نہیں تھا۔ نہ اوپر کا وہ نیل تھا جہاں چپل کا تسمہ گڑا تھا۔

آپ سوچ سکتی ہیں کہ اس وقت میری کیا کیفیت ہوئی ہوگی۔ میں جو ہر بات کی کھوج ڈھونڈا کرتا تھا، سخت حیران تھا۔ میں نے پٹی وہیں پھینک دی اور رابرٹ کے گھر کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے پھر باہر والا احاطہ طے کیا، اندر کا احاطہ طے کیا، چاروں طرف دیکھتا رہا مگر وہی ویرانی اور سناٹا تھا جس نے رات میرا استقبال کیا تھا۔ میں اندرونی دروازے تک پہنچا تو دروازہ بند تھا۔ ایک جانب کال بیل لگی تھی۔ میں نے دائیں ہاتھ کی انگلی اس کال بیل پر رکھ دی۔ اندر کہیں گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی پھر وہی گھسٹنے کی سی آواز آئی جو میری جانی پہچانی تھی۔ دروازہ کھل گیا۔ رابرٹ میرے سامنے تھا۔ آج اس کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ اور آنکھوں میں اطمینان تھا۔ آج اسے دیکھ کر میری بھی وہ کیفیت نہ ہوئی جو اب سے پہلے، پہلی ملاقات پر ہوئی تھی۔

"ہیلو مسٹر ضیاء! میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔"

اس نے ایک طرف ہو کر مجھے راستہ دیا۔ میں نے دیکھا کہ دروازے کی کنڈی سے نیچے تک لوہے کی ایک سلاخ لٹکی ہوئی تھی جو غالباً اس نے دروازے کی کنڈی کھولنے کے لئے اپنی سہولت کو لٹکا دی تھی ورنہ اتنی اوپر لگی کنڈی اس کے بس کی بات نہ تھی۔

"سوری.........! کیا میں لیٹ ہو گیا ہوں؟"

"میرا خیال ہے کہ مجھے ایسا لگ رہا ہے کیوں کہ میں رات ہی سے تمہارا منتظر

تھا۔" اس نے حسب سابق آگے کی طرف لڑھک لڑھک کر کمرے کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔

"مگر رات تو تم نے خود روانہ کیا تھا حالانکہ میں ابھی اور بیٹھنا چاہتا تھا۔" میں نے اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

"ہاں.........! اور میں اسی وجہ سے خوش ہوں۔ تمہاری آمد یا تمہارا دبا ہوا پنجر میرے لئے حیرت انگیز طور پر مددگار ثابت ہوئے ہیں۔"

اس کی اس بات سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ کل جس آنے والی اذیت ناک کیفیت کا ذکر کر رہا تھا۔ اس سے محفوظ رہا تھا یا وہ اذیت کم ہو گئی ہے۔ پھر بھی میں نے پوچھ لیا۔ "وہ کیسے؟"

"آج میں بہت خوش ہوں۔" اس نے میرا سوال نظرانداز کر دیا۔

"میں تمہاری خوشی میں شریک ہونا چاہتا ہوں۔" میں نے دوبارہ سوال نہیں کیا۔ یہ بھی محسوس کیا کہ آج اس کی رفتار کل سے زیادہ تیز تھی۔ آج مجھے دروازے سے کمرے تک کا فاصلہ بھی طے کرنا دشوار نہیں لگا حالانکہ کل میں اس عجیب و غریب کیفیت سے باہوش و حواس گزرا تھا کہ جیسے سامنے نظر آنے والا دروازہ کوسوں دور ہو۔ کل میں چل چل کر نڈھال ہو گیا تھا مگر آج ایسا نہیں ہوا۔ ہم کمرے میں داخل ہوئے تو کمرا مجھے روشن لگا۔ کھڑکیوں کے پردے ہٹے ہوئے تھے۔ باہر کی دھوپ نے روشنی اور حرارت بکھیر دی تھی۔ کل والا سیلن زدہ احساس زائل ہو چکا تھا۔ میں اس صوفے پر بیٹھ گیا جہاں کل بیٹھا تھا۔ اس نے بھی اپنی وہی نشست اسی خاص طریقے سے سنبھال لی جسے میں کل دیکھ کر حیران ہوا تھا۔ ایسا کرتے ہوئے وہ مجھے کوئی مداری لگتا تھا جو ہاتھوں کے بل اپنے پورے سکڑے ہوئے بدن کو ہوا میں معلق کر لیتا ہے۔ دکھ مجھ آج بھی ہوا مگر وہ خوش تھا یا جیسے اب وہ بہت بہتر ہو۔

"تم نے ہی یہ کام آسان کر دیا ہے مسٹر ضیاء! میں تم سے بہت متاثر ہوا ہوں۔"

"تھینک یو! میں ایسا کرنے میں بہت لیٹ ہو گیا ہوں اور میرے لیٹ ہونے کی وجہ سے تم اور دوسرے لوگوں نے یقیناً بہت اذیت اٹھائی ہے۔ اس کے لئے میں اب شرمندگی محسوس کرتا ہوں۔"

"اوہ کم آن! اب مجھے یقین ہے کہ جب جنیو' بیاس' پرکاش اور سورن سنگھ کو

گا کہ ہمارے سامنے کھلا موت کا دروازہ دھیرے دھیرے بند ہو رہا ہے تو وہ بہت خوش ں گے۔"

"میری بات ہوئی تھی سورن سنگھ سے۔" میرا جملہ سنتے ہی وہ اچھل پڑا۔

"ہیں......... کب؟"

"کل رات!"

"پھر؟"

اس کی کیفیت دیکھنے والی تھی۔ وہ مجھے ایسی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا جنہیں میں ملتجی ہی کہہ سکتا ہوں۔ شاید وہ مجھ سے اچھی خبر کی توقع کر رہا تھا۔ التجا کر رہا تھا۔ وہ کل یقیناً جان چکا تھا کہ حقیقت کتنی ہی تلخ اور کریہہ کیوں نہ ہو' میں بلا جھجک اور کافی بے حسی سے اس کا ذکر کر دینے والا انسان ہوں۔

"پھر......... یہ کہ........." میں مسکرایا۔ میری مسکراہٹ نے جیسے اس کے سینے میں رکی ہوئی سانس کو آزاد کر دیا۔ "وہ مجھے پہچان گیا۔ وہ آج رات نو بجے کے بعد مجھ سے ملاقات کرنا چاہتا ہے۔ ملاقات کی خواہش کا اظہار میں نے کیا تھا مگر وقت کی پابندی اس نے لگائی تھی۔"

"اوہ.........!" وہ پُرسکون ہو گیا۔ پھر چند لمحے سکون کی کیفیت سے لطف اندوز ہونے کے بعد وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ "وہ ٹھیک تو ہے ناں؟"

میں آواز کے بارے میں کہتے کہتے اس لئے رک گیا کہ اسے پھر اپنی آواز کا احساس ہوتا اور وہ اپ سیٹ ہو جاتا۔ "ایسا لگتا نہیں تھا کہ وہ کسی تکلیف میں ہے' ذہنی طور پر وہ مجھے پُرسکون لگا کیوں کہ مجھے پہچاننے کے بعد اس نے مجھ سے ملنے میں کسی بے تابی کا اظہار نہیں کیا بلکہ جب میں نے کہا کہ یہ ملاقات پر ہی بتاؤں گا تب اس نے کچھ سوچ کر کہا کہ میں وقت کی پابندی کا خیال رکھوں اور اس کے دروازے پر نو بجے کے بعد پہنچوں۔"

"کیا تم مجھے ساتھ لے جانا پسند کرو گے؟" اس نے پھر ملتجی انداز میں پوچھا اور میرے جواب دینے سے قبل ہی بول اٹھا۔ "ایسا بہت ضروری ہے۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ اگر وہ کسی اذیت میں نہیں تو اس کی کیا وجہ ہے پھر ہم آئندہ کے معاملات بھی ڈسکس کر سکیں گے۔"

وہ اتنا کہہ کر چپ ہوا اور پھر بول اٹھا مگر اس بار لگتا تھا جیسے وہ خود سے مخاطب ہے۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"یہ نہیں ہو سکتا۔ وہ ہر طرح سے ہر معاملے میں شامل رہا ہے بلکہ مجھے یاد ہے کہ ایک بار وہ ایک بڑے خوفناک حادثے کا شکار ہوتے ہوتے بچا تھا۔ وہ واقعہ سخت حیرت انگیز تھا اور ہم سب میں پہلا شخص تھا جس کے ساتھ ہونے والے اس حادثے نے ہم سب کو پہلی بار احساس دلایا کہ ہم جو کچھ کر چکے ہیں' وہ کہیں ہم سب کی جان ہی نہ لے لے۔"

"مسٹر رابرٹ! تم رات کو میرے ساتھ چل سکتے ہو مگر اس وقت میں امید رکھوں گا کہ تم میرا اور اپنا وقت ضائع کرنے کی بجائے مجھے اصل معاملے سے آگاہ کرو اور بات کوشش کرنا کہ اختصار سے کام لو۔ میں کافی سمجھدار آدمی ہوں' کسی بھی واقعے کا سن کر اس کی ہیبت اور خوفناکی کا پورا اندازہ لگا سکتا ہوں اس لئے بار بار جذباتی ہونے کی کوشش نہ کرنا' دو اور دو چار سے کام لینا۔"

اس نے میری بات سن کر بہت برا سا منہ بنایا لیکن میں اس معاملے میں کل اندازہ لگا چکا تھا کہ وہ بار بار پٹڑی سے اتر جانے والا آدمی ہے۔ بالخصوص روزی کے معاملے میں کافی جذباتی ہے اور اس سے دوری پچھتاوا بن کر اسے کچوکے بھی لگاتی رہتی ہے۔ میں اصل معاملے کی تو تمام تر جزئیات جاننے کا خواہش مند تھا مگر اس کی گرل فرینڈ کے قصے سننا میری برداشت سے باہر ہو جاتا اس لئے میں نے اسے صاف صاف کہہ دیا تھا۔ وہ بہت برا مانے گا اس کا بھی مجھے اندازہ تھا۔ اس لئے میں کچھ نہ بولا۔ وہ چند لمحے خلا میں کچھ ٹٹولتا رہا۔ پھر بولا۔

☆--------------☆--------------☆

"عطا سے ہماری ملاقات لندن میں ہوئی تھی۔ تم اپنے باپ کے بارے میں جانتے ہو گے کہ وہ کافی عیاش آدمی تھے۔ دولت تھی' بے فکری تھی' جو ہمارے یہاں نایاب ہے۔ ہم ایک چیز خود محنت کر کے حاصل کرتے ہیں اور اس کی قدر بھی جانتے ہیں جبکہ ہندوستان کے شہزادوں کو دولت کی پروا بھی نہیں ہوتی کیونکہ انہیں کمانا نہیں پڑتا اس لئے خرچ کرتے ہوئے بھی انہیں قطعی دکھ نہیں ہو سکتا۔"

"ملاقات کے بعد کیا ہوا؟" میں نے تجسس انداز میں کہا۔ وہ چونک کر چپ ہو گیا۔

"سوری!" اس نے مجھے دیکھ کر کہا پھر بولا۔ "عطا پرکشش انسان تھا پھر اس کے اس بے فکر انداز نے مجھے اس کی طرف مائل کر دیا۔ میں نے دوستی میں پہل کی۔ ہم جس بار میں ملے تھے' وہاں وہ تنہا نہیں تھا بلکہ ایک عورت اس کے ساتھ تھی۔ وہ عورت بھی پرکشش اور شاہانہ لگ رہی تھی۔ پپاس ڑیگو اور پرکاش میرے دوست تھے جنہیں میں اس روز کی دعوت دے چکا تھا۔ یہ دعوت میں نے روزی کا پروگرام سننے کے بعد دی تھی ورنہ میں ویک اینڈ اس کے ساتھ گزارنا پسند کرتا تھا۔ اس دن روزی' اپنی بہن سے ملنا چاہتی تھی اور اس کے چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ وقت گزارنا چاہتی تھی۔ اس وقت سورن سنگھ سے میں واقف نہیں تھا اور جنیو کو تو ہم میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ سورن سنگھ' عطا کا دوست تھا اور کچھ دیر بعد وہیں اس سے ہماری ملاقات ہوئی تھی۔

وہ خوبصورت شام جو مجھے بڑی اچھی لگی تھی بلکہ ہم سب ایک دوسرے سے مل کر اس گھڑی کو خوب صورت گھڑی محسوس کر رہے تھے' اس وقت نہیں جانتے تھے کہ ہم اس پل جس خوفناک وقت کی گرفت میں جا رہے ہیں' وہ ہماری زندگیوں کے لئے تار عنکبوت ثابت ہو گا اور اس سے نکلنے کے لئے ہم صرف ہاتھ پاؤں مارا کریں گے مگر نکل نہیں پائیں گے۔ وہ خوشی کا آخری لمحہ تھا۔ جہاں سے دکھوں کی ڈھلوان شروع ہوئی تھی اور ہم اس پر پھسلتے ہوئے زندگی کی بلندیوں سے پستی کی طرف چلے آئے۔ ہاں..........! تم سوچو کہ دکھ تو زندگی کی بلندیوں پر بھی پہنچتے ہیں مگر میں اسے پستی کے دکھ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ یہاں سے ہمارے اس سفر کا آغاز تاریخ جیسے پرکشش گناہ سے ہوا تھا۔

عطا نے اپنے ساتھ ہونے والی اس حسین عورت کا تعارف کروایا تو پتا چلا کہ وہ ایلن ہے۔ مقناطیسی کشش کی حامل' ایک ایسی عورت جس کی آنکھوں میں اس کے مکمل مطمئن اور پرسکون ہونے کا غرور ناچا کرتا تھا۔ میں نے پپاس اور پرکاش کا عطا سے اور ایلن سے تعارف کروایا۔ ہم اس رات قہقہے لگاتے رہے' سرور و مستی میں ڈوب کر نفسانیت کی سطح سے اس وقت نیچے آگرے جب ایلن نے شراب کے نشے میں بدمست ہو کر اپنی داستان سنا ڈالی اور بتایا کہ اسے یونانی عورت نے ایک بریسلٹ دے کر دنیا کی امیر ترین عورت بنا دیا ہے جبکہ وہ ایک وقت کے لئے ایک برگر خریدنے پر قادر نہیں رہی تھی۔

ہمارے دلوں کے شیطان ہمارے دلوں میں چٹکیاں لینے لگے مگر ہم سب نشے میں

تھے۔ پتا بھی نہیں چلا کہ ان چٹکیوں نے وہ نیل ڈال دیئے ہیں جو ہماری روح، ہمارے کردار کا حصہ بننے والے ہیں۔ ہم اس رات جدا تو ہوگئے مگر اگلی صبح ہمیں یوں لگا جیسے اب ہم چاروں کا یکجا ہونا ضروری ہے۔ ہم نے آپس میں رابطہ کیا۔ عطا کے بارے میں ہمیں یہ علم نہیں تھا کہ وہ اس معاملے کو کس طرح لے رہا ہے مگر اگلے روز کی ملاقات میں ایلن نہیں تھی، ہم سب نشے میں ڈوب کر ایک دوسرے کے سامنے عریاں ہوگئے۔ ہماری روح اور کردار پر پڑے انسانیت اور اخلاق کے پردے تار تار ہوگئے اور ہم نے طے کرلیا کہ ایلن کو ٹریپ کرکے اس سے دولت حاصل کرلیں گے۔

اس کے پاس اس بریسلٹ کے علاوہ بڑے نوادرات تھے جو منفرد ہونے کے ساتھ بے انتہا پرانے اور قیمتی تھے۔ ہماری اس ملاقات نے ہم سب کو بالکل ایک جیسا ثابت کر دیا تو درمیان میں جھجک نہ رہی۔ ہم نے ایلن سے دوستی بڑھائی۔ اس کے گھر میں محفلیں جمائیں۔ اس سے بے تکلف ہوئے اور ایک روز اسے قتل کر دیا۔ اس قتل سے چند روز پہلے ہماری ملاقات جینو بابا ریکو سے ہوئی تھی۔ یہ اٹالین لڑکا بہت غریب اور سیدھا سادا تھا۔ معصوم تھا، وہ ہمارے بہت کام کا تھا اس لئے کہ وہ پُرجوش تھا۔

ہم سب نے طے کرلیا کہ اسے استعمال کریں گے۔ ایلن اس سے بہت متاثر ہوئی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ ہمارے ارادے کیا ہیں۔ وہ ہماری ہمدردی اور محبت سے متاثر ہوا پھر ایلن سے مرعوب ہوگیا۔ ایلن نے ہم سب کو اپنے خوبصورت گھر میں دعوت دی تھی۔ اس روز ہم نے اسے اتنی شراب پلائی اور اس قدر بھڑکایا کہ وہ بولتی چلی گئی۔ اس روز اس نے اپنے گھر کی دیوار میں بنے وہ خفیہ خانے بھی دکھا دیئے جہاں چھپائے ہوئے ہیرے جواہرات دیکھ کر ہماری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ہمارے حواس گم ہوگئے تب بھی ہمیں اتنا ہوش رہا کہ پرکاش بول اٹھا۔

"ایلن اگر کوئی تمہیں مار کر یہ سب لوٹ لے تو وہ بڑا خوش قسمت ہوگا۔" اس نے ہنس کر کہا تھا۔

ایلن نے اس سے بھی زیادہ زور سے قہقہہ لگا کر کہا۔ "نہیں مسٹر پرکاش! وہ بدقسمت ترین آدمی ہوگا۔ میں جس پُراسرار طریقے سے یہ سب کچھ حاصل کرپائی ہوں وہ تم لوگ نہیں جانتے۔ یہ......... صرف یہ سونے کی چین اس پوری پُراسرار دولت کا راز ہے۔" اس نے اپنی گوری اور کومل خوبصورت کلائی کو ہماری آنکھوں کے سامنے گھماتے

ہوئے کہا جہاں سونے کی خوبصورت زنجیر چمک رہی تھی۔ یہی زنجیر جو تم نے مجھے دی ہے۔"

ہم نے سوچا کہ وہ اپنی نانی کی بہن کی دولت چھپانے والی کہانی کو پُراسرار کہہ کر ٹال رہی ہے۔ ویسے وہ یقیناً پُراسرار طریقہ یہی ہوگا۔ ایک عورت یہ سب کچھ حاصل کرلے اور لوگ اسے بے گناہ اور معصوم ہی سمجھتے رہیں، یہ واقعی ایک پُراسرار بات ہے۔ ہم نے صرف یہی سوچا۔ اگر ہم نشے میں نہ بھی ہوتے تو دولت حاصل کرنے کا خمار بھی ہمیں کچھ اور نہ سوچنے دیتا مگر شاید ہم چاروں میں کوئی ایک ہوتا جو اس سے اس کی پُراسراریت کے بارے میں ضرور پوچھ لیتا۔ یقیناً وہ بتا دیتی اس لئے کہ وہ وہسکی اس قدر پی چکی تھی کہ اس کے قدم لڑکھڑانے لگے تھے۔

ہم نے جینو کو اشارہ کیا کہ وہ اس کو اس کے کمرے میں لے جائے۔ جینو نوجوان تھا۔ اس کا نشہ ایلن کی کشش نے دوآتشہ کر دیا تھا۔ وہ ہماری اس اجازت میں پُرخوش ہوگیا۔ اس نے بڑی خوش اخلاقی اور محبت سے اسے تھام لیا۔ وہ خوش ہوئی کہ اسے تھامنے والا ایک خوبصورت، پُرکشش اور پُرجوش نوجوان ہے۔ تب اس نے مزاحمت نہیں کی اور اسی کے کہنے پر گلاس ہوا میں اچھال دیا پھر اپنے بیڈروم میں اس کا سہارا لے چلی گئی۔

ہم موقعے کی تاک میں تھے۔ اس روز سورن سنگھ بھی ہمارے ساتھ تھا۔ وہ ہم سب میں سب سے زیادہ خطرناک تھا۔ وہ ایسی باتیں کرتا تھا جیسے جاسوسی کہانیاں سنا رہا ہو۔ اس کا ذہن کرمنل تھا۔ وہ 'بقول اس کے' یونیورسٹی میں ایک ایسے غنڈے کی طرح مشہور تھا جس سے سب دبتے تھے۔ اس نے کبھی کسی سے نظر جھکا کر بات نہیں کی تھی۔ یہ سب میں تمہیں مختصر بتا رہا ہوں۔" اس نے شاید میرے چہرے پر الجھن کے آثار دیکھ لئے تھے۔

"تھینک فل ہوں۔ میں قصے کہانیوں میں دلچسپی نہیں رکھتا۔" میں نے پیشانی کے بل دور کرتے ہوئے کہا۔

"اگر تفصیل میں جاؤں تو تمہیں صحیح طور پر پتا چل سکتا ہے کہ ہم پانچوں نے یہ اتنا بڑا فیصلہ بہت تھوڑے دنوں میں نہیں کیا تھا مگر تم سننے پر تیار نہیں ہو۔ بہرحال سورن سنگھ نے ہماری اس روز بہت مدد کی۔ جب ہمیں یقین ہوگیا کہ وہ دونوں اب نیند کی گہرائیوں

میں اتر چکے ہوں۔ جب ان کی سرگوشیاں اور قہقہے سناٹے میں بدل گئے۔ تب ہم چاروں اوپر پہنچے۔ ہم نے قتل کے بہت سے بہتر طریقوں پر بات چیت کی تھی۔ بہت سے طریقے مسترد کر دیے تھے۔ ہر طریقے کے اچھے برے پہلوؤں پر غور کیا تھا۔ ہم رات کے آدھے سے زیادہ گزر جانے کے بعد یہاں ایک ایک کر کے بغیر گاڑیوں کے آئے تھے تاکہ باہر ہماری موجودگی کا ثبوت نہ مل سکے۔ ہم نے سیڑھیوں کو دبے پاؤں عبور کیا تھا۔ کھڑکیوں کے پردے بڑی چالاکی سے کھینچ دیے تھے۔ یہ ہمیں معلوم تھا کہ یہ ایک ساؤنڈ پروف فلیٹ ہے' اس لئے اونچے قہقہے لگاتے رہے۔ اصل میں ہم اس روز اپنی آنے والی خوش قسمتی کا استقبال کرنے جمع ہوئے تھے لیکن......... خوش قسمتی اور بدقسمتی کے قدموں کی چاپ کا فرق پتا ہی نہیں تھا اس لئے......... اس لئے دھوکا کھا گئے۔"

"جب تم چاروں اوپر پہنچے تو کیا ہوا؟" میں پھر اسے پٹڑی پر لانے کو بولا۔

"ہاں.........!" وہ جھینپ گیا۔ "ہم اوپر پہنچے۔ ہم نے سرمستی کے عالم میں پڑے ان دونوں کو مدہوش دیکھا اور سورن سنگھ کی بتائی ہوئی ترکیب پر عمل کیا۔ عطا نے وہ نرم و ملائم کشن اٹھا کر مجھے دیا۔ سورن سنگھ جھک کر جینو اور ایلین کو دیکھ رہا تھا۔ پرکاش اس کے قریب کھڑا تھا۔ میں نے کشن پرکاش کی طرف بڑھایا۔ پرکاش سے سورن نے لے لیا اور ایلین کے چہرے پر رکھ کر اسے دبا دیا۔ ہم نے اس سے قبل جینو کو غیر محسوس انداز میں بے ہوشی کی دوا سنگھا دی تھی۔ ایلین اتنی کمزور نکلی نہیں جتنی نظر آتی تھی۔ وہ نازک اندام عورت ہم چاروں کے پسینے چھڑوانے کو کافی ہوئی۔ ہم چاروں کو زور لگانا پڑا۔ آخر وہ مر گئی۔ ہم چاروں کی سانسیں اکھڑ گئیں۔ ہم پسینے میں تر بتر ہو گئے۔

ہمیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایلین واقعی مر چکی ہے؟ یا ابھی قہقہہ لگا کر اٹھ بیٹھے گی۔ ہم اس قتل سے خوف زدہ بھی تھے۔ وہسکی نے ہمیں اور ہمارے اعصاب کو یوں بھی اتنا کمزور کر دیا تھا کہ ہمارے جسموں سے جان سی نکل گئی تھی لیکن جو کچھ ہم کر چکے تھے اور جو کچھ حاصل کرنے والے تھے' اس نے حوصلہ دیا۔ ہم صبح کی پہلی کرن کے مرانشنے سے پیشتر ہی اس قابل ہو سکے کہ وہاں سے نکل سکیں۔ ہم چاروں نیچے آ چکے تھے مگر جینو اب بھی بے خبر تھا۔ سورن سنگھ نے مجھے کہا تھا کہ اسے بھی مار دیا جائے تاکہ پولیس کو کہانی مل سکے گی مگر ہم سے کوئی بھی اس پر تیار نہیں ہوا۔ ہم نے سوچا سورن سنگھ سب سے زیادہ بے حس ہے۔ بہرحال میں نے پہلے سے طے شدہ پروگرام کے تحت عطاء'

ہاش' سورن اور پرکاش کے جانے کے بعد دوبارہ سیڑھیاں چڑھیں اور ایلین کے کمرے ں پہنچ گیا۔ ایلین بے سدھ پڑی تھی۔ مجھے اس کی کلائی سے وہ بریسلٹ اتارنا تھا ر اس وقت میری نگاہ اس کے سینے پر بیٹھی ایک خوفناک مکڑی پر پڑی۔ جانے وہ مکڑی نی یا کیا چیز تھی' چمکدار بالوں سے بھری ہوئی۔ سرخ آنکھوں والی۔ اگر وہ مکڑی ہی تھی تو ں زندگی میں پہلی بار اتنی بڑی' خوبصورت مگر ہیبت ناک مکڑی دیکھ رہا تھا۔

عین اس وقت جینو کسمسایا۔ وہ ہوش میں آ رہا تھا۔ میں نے اسے گھسیٹ لیا۔ وہ نیچے گرا' اٹھا اور پھر ایلین اور اس مکڑی کو دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا۔ میں نے اسے بڑی مشکل سے سنبھالا پھر چاہا کہ کسی چیز سے اس مکڑی کو ہٹا کر دور پھینک سکوں مگر میں ایسا کرنے ں کامیاب نہ ہو سکا پھر اسی وقت اس چین اور ایلین کے ساتھ ساتھ اپنی قسمت پر لعنت بھیج کر' اپنی جان بچا کر تیزی کے ساتھ اس گھر سے نکل گیا۔ اگر میں دیر کر دیتا تو اس کی زدمیں آ جاتی جس کے پاس گھر کی دوسری چابی موجود تھی اور وہی ایلین کی سب سے زیادہ بہتی تھی۔

ہم نکل کر جینو کے گھر پہنچے۔ نہ معلوم کیوں جینو کا خیال تھا کہ ایلین مر چکی ہے۔ اس کے چہرے پر مردنی تو تھی جسے شاید میں پوری طرح محسوس نہیں کر سکا تھا مگر جینو نے محسوس کر لیا تھا۔ وہ جذباتی لڑکا تھا۔ میں نے پروگرام کے مطابق اسے یہ باور کرا دیا کہ رات اس کی کسی حرکت سے وہ مر گئی ہو گی۔ ممکن ہے' خود اس نے اس کا گلا دبا دیا ہو یا کچھ بھی کیا اور ایسا کہ وہ مر گئی۔ جینو یہ سن کر رونے لگا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اسے اب سب سے پہلا کام یہی کرنا چاہیئے کہ پولیس اسٹیشن جا کر اپنے جرم کا اعتراف کر لے اور خود کو پولیس کے حوالے کر دے۔

میں کانپ کر رہ گیا۔ اگر میں سورن سنگھ کے پروگرام کے مطابق وہاں موجود نہ رہتا ور اس کی دی ہوئی ذمے داری کے مطابق جینو کو اٹھا کر نہ لے جاتا تو آج......... ہم سب پھانسی چڑھ چکے ہوتے مگر......... نہیں.........! ٹھہرو۔ میں شاید غلط کہہ گیا۔ مجھے یوں کہنا چاہیئے کہ آج ہم اس عذاب سے بچے ہوئے ہوتے تھے۔ ہم پرسکون ہوتے۔ ہم موت کی پرسکون وادی میں بے خبر سو رہے ہوتے لیکن خدا نے ہمیں جو سزا دی ہے' وہ بڑی بھیانک تھی۔ پھانسی کی سزا بہت آسان ہوتی۔ بہت مختصر سی اذیت جو میں بخوشی قبول کر لیتا اگر مجھے ذرا بھی شبہ ہوتا کہ آگے ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔"

"مجھے تمہارے اور باقی لوگوں کے انجام سے دلچسپی نہیں ہے مسٹر رابرٹ۔ مجھے بتاؤ کہ پھر کیا ہوا؟ یہ پُراسرار چکر کیا تھا۔ تم اب تک اصل بات کی طرف نہیں آئے۔" میں نے گھڑی دیکھی' ایک بج چکا تھا۔

وہ ناراض ہوگیا۔ چیخنے لگا۔ وہ چاہتا تھا کہ جب وہ بات کر رہا ہے اور اختصار سے بھی کام لے رہا ہے تو میں اتنی زیادہ سفاکی کا مظاہرہ نہ کروں جتنی سفاکی سے وہ سب کر چکے تھے۔

"اوکے.........!" میں نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اسے نارمل رہنے کا اشارہ کیا۔ "بی ایزی! اب شروع ہو جاؤ۔"

وہ کچھ دیر لمبی لمبی سانسیں لیتا رہا پھر اس نے پانی پیا۔ چند لمحے ذہن کو یکجا کرنے میں صرف کر دیئے پھر بولا۔

"میں نے اسے قابو کئے رکھا۔ اسے سمجھایا' پھانسی کا خوف دلایا' جب خوف اس پر طاری ہوگیا اور وہ اعتراف کرنے سے باز آگیا تب میں نے اسے دولت کا لالچ دیا۔ اسے بتایا کہ اب بہت جلد ہم دولت مند ہو جائیں گے۔ میں جانتا تھا کہ ہمارے ساتھی ایلن کے تمام جواہرات لے گئے ہیں جنہیں ہمیں آج ہی رات کو آپس میں بانٹنا تھا۔ وہ سونے کی چین جسے ایلن کی کلائی سے اتارنا میری ڈیوٹی تھی مگر میں اسے پورا نہیں کر سکا تھا۔ اس کے بارے میں طے ہوا تھا کہ اسے کچھ عرصہ میں رکھوں گا پھر جب میرا مقصد پورا ہو جائے گا تو باری باری وہ سب اس سے مستفیض ہوں گے لیکن اب میں پریشان تھا۔ اسے اتارنا ضروری تھا اور ادھر جینو کو قابو کرنا بھی اہم.........

میں نے اسے قدرے پُرسکون کرنے کے بعد عطا کو اس واقعے کی اطلاع دی اور جینو کے سامنے یہی پوز کیا کہ وہ جینو کی کسی حرکت کی بنا پر ماری گئی ہے اور اب ہم سب کو مل کر جینو کو بچانا ہے۔ وہ فوراً جینو کے گھر پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر اسے پتا چلا کہ وہ چین نہیں لے سکے۔ یہ میں نے جینو سے چھپ کر اسے بتایا تھا۔ وہ یہ سنتے ہی سیدھا ایلن کے گھر پہنچا۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ پکڑا جائے گا اس لئے میں نے اسے منع بھی کیا تھا مگر عطا بڑا ہمت تھا۔ وہ وہاں پہنچا اور اس ملازمہ کو بھی جل دے کر اس کی کلائی سے وہ چین اتار لی۔ اس وقت تک ملازمہ جان چکی تھی کہ ایلن مر چکی ہے۔ پولیس کو فون کر چکی تھی۔ ایلن کے کچھ دوسرے عزیزوں کو بھی اطلاع دے چکی تھی مگر حسن اتفاق تھا کہ ابھی تک

کوئی پہنچا نہیں تھا۔

عطا نے اپنی چرب زبانی سے اسے یقین دلایا کہ وہ ایلن کے پروگرام کے مطابق آیا ہے کیوں کہ آج ایلن اس کے ساتھ ساحل سمندر پر جانا چاہتی تھی اور رات ہی اس نے فون کر کے عطا سے پروگرام طے کیا تھا۔ وہ اس کی موت کا سن کر بلک بلک کر رو دیا بھی۔ ملازمہ کا دکھ اس نے بٹایا پھر ایلن کی پیشانی کو بوسہ دینے کی خواہش کا اظہار کر کے اس کے کمرے میں گیا۔ ملازمہ کو اس نے ہم دوستوں کا نمبر دے کر بزی کر دیا کہ وہ فوراً ہم سب کو اس اندوہناک حادثے کی اطلاع دے۔ وہ ایلن کے کمرے میں پہنچا' اس نے بقول اس کے' وہاں کوئی گڑبڑ نہیں دیکھی۔ اس نے کلائی سے بریسلٹ اتاری۔ وہ پھر نیچے آگیا اور ملازمہ کے ساتھ بیٹھ کر اسے تسلی دینے اور رونے لگا۔ پھر پولیس آئی اور عزیز بھی۔ ہم سب پہنچ گئے مگر میں نے جینو کو وہاں نہیں جانے دیا بلکہ اسے خواب آور گولیاں دے کر مکمل آرام کرنے کو کہہ دیا۔ ایسا بہت ضروری تھا ورنہ وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔

سب کچھ ہماری توقع کے مطابق ہوگیا۔ پولیس کا خیال تھا کہ یہاں کسی نے اسے لوٹ کر مار دیا ہے مگر کوئی نشان نہیں چھوڑا۔ میں شاید بتانا بھول گیا کہ ہم سب نے وہاں نچلے حصے میں پارٹی کے دوران جو کچھ بکھیرا تھا' صاف کر کے گھر کو ایسا کر دیا تھا کہ جیسے وہاں ایلن کے سوا کوئی بھی نہیں آیا ہو۔ پھر اس کی تدفین کے موقع پر جب ہم قبرستان پہنچے تو آخری دیدار کے وقت اس کی دوسری کلائی میں بھی ویسی ہی زنجیر دیکھ کر دم بخود رہ گئے۔ جو بقول اس کی ملازمہ اور وکیل کے' اس کی وصیت کے مطابق اس کے ساتھ دفن ہونا تھی۔

اسے دفن کر دیا گیا' اس زنجیر سمیت۔ ہم سب حیران تھے کہ ایلن نے ہم سے ایک زنجیر کا ذکر کیا تھا پھر یہ دوسری کہاں سے آگئی۔ عطا نے کہا کہ وہ چالاک عورت تھی اس لئے ہو سکتا ہے کہ اس نے نقلی زنجیر پہن رکھی تھی۔ وہی ہمیں دکھائی تھی جبکہ دوسری کلائی میں دوسری بھی پہنی ہوئی ہو گی یا کہیں رکھی ہوئی ہو گی جو وصیت کے مطابق اس کی کلائی میں ڈال دی گئی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کی ملازمہ جو چوبیس گھنٹے اس کے ساتھ رہتی تھی اس نے بھی کسی دوسری زنجیر کا ذکر نہیں کیا۔ اب ہمارا شک مزید پختہ ہوگیا۔ ہم اس کی تدفین میں اس کے اچھے دوستوں کی طرح نہ صرف شریک ہوئے بلکہ ہم بڑے دل گرفتہ بھی نظر آتے رہے۔ ہم نے اس کے عزیزوں سے بڑے مناسب اور

ہمدردانہ انداز میں تعزیت بھی کی لیکن ہم سب بے چین ہو چکے تھے۔

اس کی تدفین کے چھ سات روز کے بعد ہم نے اس کی قبرستان جا کر اس کی قبر کھود کر اس دوسری زنجیر کو حاصل کرنے کا پروگرام بنا لیا۔'' اس نے جملہ ختم کر کے گہرا سانس لیا جیسے بول بول کر تھک چکا ہو۔

میں چونک اٹھا۔ میں نے جو خواب بچپن میں دیکھے تھے' شاید وہ ان ہی میں سے ایک سنانے جا رہا تھا۔ میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اس نے پانی کی طرف دیکھا' میں نے لپک کر اسے گلاس دے دیا۔ جتنی دیر وہ پانی کے گھونٹ حلق سے اتارتا رہا۔ اتنی دیر میری نگاہیں اس کی بھدی اور بد ہیئت گردن پر جمی رہیں جسے آپ گردن کہہ ہی نہیں سکتے۔ گوشت کا ایک بچا سا تھا جیسے موٹی ہو جانے والی عورتوں کے پیٹ کے نچلے حصے پر لٹک آتا ہے۔

اس نے گلاس رکھا۔ نم ہونٹوں کو آستین سے صاف کیا اور بولا۔ ''پھر اس رات ہم سب کالے کپڑوں میں ملبوس ہو کر' آدھی رات کے وقت قبرستان پہنچے۔ ہم نے بڑی محنت اور خوف کے ساتھ اس کی قبر کھودی۔ اس کی کلائی سے زنجیر اتار لی تب یہ دیکھ کر خوف سے تھر تھر کانپنے لگے کہ اس کے سینے پر وہ سنہری مکڑی موجود تھی۔ زنجیر عطا ہی نے اتاری تھی اور وہ میرے سنہری مکڑی والے واقعے کو میرا وہم قرار دے چکا تھا اسی لئے سب سے زیادہ وہی خوفزدہ ہوا جبکہ میں نے کم خوف محسوس کیا۔ مجھے اس کی خوشی تھی کہ عطا نے مکڑی دیکھے بغیر پہلے زنجیر حاصل کر لی تھی ورنہ شاید ہم اس روز واپس آ جاتے۔ وہاں نظر آنے والی مکڑی کی وجہ سے باقی لوگوں نے میری بات پر یقین تو کر لیا تھا مگر سب اس دوسری چین کو بھی حاصل کرنے پر خوش تھے۔

ہم نے اس رات دوسرا جشن منایا۔ اس میں ایلن شامل نہیں تھی مگر دولت کی کنجیاں ہمارے قبضے میں تھیں اور ان زنجیروں نے ہمارے اندر بھی اسی سکون' غرور اور مکمل ہونے کے احساس کو پناہ دے دی تھی اس لئے ہم سب بہت خوش تھے۔ اس کے بعد یہی طے پایا کہ ہم ان زنجیروں میں فرق نہیں کر پا رہے اس لئے اب عطا ان دونوں کو اپنے پاس رکھے پھر باری باری سب اس کے مالک بنیں گے اور یہ سرکل سا بن جائے گا۔ پانچویں آدمی کے بعد پھر پہلے آدمی کا نمبر آ جائے گا۔ باقی دولت سے بھی ہم نے حصے لے لئے۔ ہم نے سب سے زیادہ جینز کو دیا تا کہ وہ اپنے اندر کے مجرم کا گلا گھونٹ سکے۔ جسے ہم نے بے وجہ ہی مجرم باور کرا دیا تھا۔ اسے میرے جواہرات کی چیزیں دینے کی بجائے ہم

نے کیش رقم دی جو ہم سب نے مل کر جمع کی تھی تا کہ وہ کسی چیز کو مس یوز کر کے ہمیں نہ پھنسوا دے۔

اس دولت نے اس میں بڑی مضبوطی پیدا کر دی پھر اس کا یہ خوف بھی رفتہ رفتہ دور ہو گیا کہ اسے پولیس بالآخر پکڑ لے گی اور اسے اپنے انجام سے ہر حال میں دوچار ہونا ہی پڑے گا۔ ہم سب دوست ایک ساتھ سیاحت پر نکل کھڑے ہوئے۔ اس بار ہمارا پروگرام انڈیا جانے کا تھا کیوں کہ ہم ایشیائی ممالک میں اس خطے کی پُراسرار کہانیوں سے بہت متاثر تھے اور عطا کی دعوت کو اس سے پہلے کئی بار محض پیسوں کی کمی کی وجہ سے مسترد کر چکے تھے۔ حیرت انگیز بات یہ تھی مسٹر ضیاء کہ جس روز ہم نے قبرستان سے دوسری زنجیر حاصل کی تھی۔ اس کے اگلے روز عطا کی ایک لاکھ ڈالر کی لاٹری نکل آئی۔ تم تصور کر سکتے ہو کہ یہ دولت عطا کی تھی مگر اس کی خوشی ہم سب کو کیوں ہوئی تھی؟ ہاں ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ اب ہم سب دنیا کے امیر ترین اور مکمل ترین لوگوں میں شمار کئے جائیں گے۔

کتنا مضحکہ خیز لگ رہا ہوں۔ آج میں کہتے ہوئے کہ ہمیں اپنے مکمل ہو جانے کا غرور ہوا تھا اور میں......... میں اپنی مکمل جسمانی ساخت تک اسی چکر کے ہاتھوں کھو چکا ہوں۔'' وہ آبدیدہ ہو گیا۔

میں نے محسوس کیا کہ کہ میری گردن کی پشت پر یعنی گدی میں سنسناہٹ سی ہو رہی جیسے اندر کہیں گرم گرم لاوہ بہنے لگا ہو۔ میں بے چین ہو گیا۔ میں نے گدی پر ہاتھ پھیرا۔

''ہم نے بحری سفر کا پروگرام بنایا تا کہ وقت کو زیادہ سے زیادہ انجوائے کر سکیں۔'' وہ پھر بولا۔ ''ہم سب نے یہ سوچ کر اپنے اوپر پابندی عائد کر دی کہ اس دوران میں ہم میں سے کوئی اپنی گرل فرینڈ یا بیوی کو سفر میں اپنے ساتھ نہیں لے جائے گا اور اسے اپنا شریک راز نہیں کرے گا۔ ہم نے اپنی کمزوریوں کی بنا پر یہ پابندی عائد کی۔ مجھے اس پابندی سے زیادہ دکھ پہنچا تھا کیونکہ میری گرل فرینڈ روزی نے میرے ساتھ میرے برے دن شیئر کئے تھے۔ میں اسے اپنے آنے والے اچھے دنوں کا یقین دلا کر اس کی مایوسی ختم کرنا چاہتا تھا مگر مجھے ایسا کرنے نہیں دیا گیا۔

یہ پابندی اپنی جگہ ضروری تھی اور اس کی اہمیت سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

- ہم نے اپنے اوپر بے تحاشہ نشے کو بھی حرام کر دیا۔ پابندی لگا دی کہ چار پیگ (جو ہم آسانی سے ہضم کر لیتے تھے) سے زیادہ کوئی نہیں پیئے گا' مجھے اس کا قلق نہیں تھا مگر روزی کی جدائی اور اس کی مایوس کن باتیں سن کر دل ہی دل میں بہت افسردہ اور اداس ہوتا تھا پھر میں نے اسے پروگرام کے مطابق کہہ دیا کہ میں دولت حاصل کرنے اپنے ملک سے دوسرے ملک جا رہا ہوں۔

وہ پہلے مجھ سے لڑی' روئی پیٹی مگر وہ واقعی مجھے چاہتی تھی۔ بالآخر میری خوشی کی خاطر مان گئی۔ میں اسے اسی طرح ایک چھوٹی سے فرم میں کام کرتے چھوڑ آیا لیکن اسے اتنی رقم ضرور دے آیا کہ وہ اپنی ضرورتیں پوری کر سکے اور یہ رقم اسے یہ احساس دلائے رکھے کہ میں دنیا میں صرف اسی کو بہت زیادہ چاہتا ہوں۔

پھر ہم یہاں پہنچے تو ایک عورت پُراسرار انداز میں ہم سے ٹکرائی۔ وہ انڈین تھی اور گوا کی رہنے والی تھی۔ اس نے بڑی جلدی ہمیں اپنے ٹرانس میں لے لیا۔ ہم اس کی دعوت پر اس کے ساتھ گوا چلے گئے پھر ہم نے اس میں بے پناہ صلاحیتیں پائیں۔ وہ جادو وغیرہ بھی کرتی تھی اور ایک روز جب وہاں طوفانی بارش ہو رہی تھی۔ گھپ اندھیرا چھا چکا تھا۔ ہم اس کے چھوٹے سے مکان میں آتش دان کے قریب کمبلوں میں لپٹے' سردی سے ٹھٹھر رہے تھے' برانڈی پی رہے تھے کہ اس نے دھیرے دھیرے ایک کہانی شروع کی۔ پانچ دوستوں کے لالچ کی کہانی اور ہم سب کا رنگ فق ہوتا چلا گیا کیوں کہ وہ ہماری کہانی تھی۔ ہمارا خیال تھا کہ اب وہ ہمیں بلیک میل کرے گی مگر ایسا نہیں ہوا۔ اس عورت کا نام وتسلا کمیکر تھا۔

وہ ایک ہمدرد عورت تھی۔ اس کا احساس ہمیں اس کے پاس سے بھاگ کر آنے کے بعد ہوا۔ اس نے کہا تھا ہم چاہیں تو وہ ہمیں آنے والے خوفناک جال سے نکال سکتی ہے مگر اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم اعتراف گناہ کریں مگر ہم میں سے کوئی بھی اس پر تیار نہیں ہوا حالانکہ نہ معلوم کیوں ہمیں یقین آگیا تھا کہ وہ ضرور ایسا کر سکتی ہے۔ شاید اس یقین کی وجہ یہ بھی تھی کہ ہمارے پاس زنجیروں کی موجودگی اور دولت کی موجودگی کے باوجود اس نے ہمیں کوئی نقصان پہنچایا' نہ ہم سے کچھ حاصل کیا۔ صرف اتنا کہا۔ "تم لوگ بھاگ جانا چاہتے ہو' بھاگ جاؤ مگر بعد میں تمہیں میری تلاش ہوگی۔ مجھ پر یقین آ جائے تو چلے آنا۔"

اس وقت ہم نہیں جانتے تھے کہ وہ کس "جال" کی بات کر رہی ہے مگر جب ہم اس کے پاس سے بھاگ گئے' اس طوفانی رات کو وہاں سے نکل آئے تو یوں لگا جیسے اس کے دروازے سے باہر مصیبتیں اپنی باہیں پھیلائے ہماری منتظر تھیں۔ ہم نے اس وقت اس پر یقین نہیں کیا تھا اس لئے نہیں چاہا کہ ہم اس سے مدد لیتے۔ ہم اس غرور میں بگڑے جا چکے تھے جس کا سبب دولت ہوتی ہے۔ اب وہ زنجیریں سورن سنگھ کی جیب میں تھیں۔ جب ہم گوا سے بمبئی پہنچے تو سورن نے سب سے پہلے اپنے ایک دولت مند چچا سے رابطہ کرنا چاہا جو اس کا واحد رشتے دار تھا اور کبھی کبھی اس کی مدد بھی کر دیا کرتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ عطا کا اس سے تعارف کرائے گا اور بتائے گا کہ عطا لندن میں ایک بڑا بزنس کر رہا ہے اور اسے ضرور بمبئی میں اس کے ان دوستوں کی میزبانی کرنا چاہیے۔ اس کا یہ فون اس کی قسمت بدل گیا۔ نہیں......... یہ فون کا نہیں' یہ انہی زنجیروں کا کمال تھا۔ وہ چچا اپنی ساری جائیداد اور کروڑوں کا بزنس سورن سنگھ کے نام کر کے خودکشی کر چکا تھا۔

یعنی اب ہماری خوشی دیدنی تھی۔ چند روز میں ساری کاغذی کارروائیاں مکمل ہو گئیں اور اب سورن سنگھ نے باقاعدہ مالک کی حیثیت سے اس کا بزنس سنبھال لیا تو ایک بڑی پارٹی دی اور ہم وتسلا کمیکر کی خوفناک باتیں بھول گئے۔ اسی تقریب میں سورن سنگھ نے وہ زنجیریں پرکاش کے حوالے کر دیں۔ ہم سورن سنگھ کو وہیں چھوڑ کر اور اس سے دوبارہ جلد ملنے کا وعدہ کر کے عطا کے ساتھ اس کے شہر کی طرف روانہ ہوئے۔ پرکاش ہمارے ساتھ تھا۔ ان دنوں ہم نے بڑے عیش کئے' اتنی خوشیاں گزاریں کہ ہم دکھ کا ہر لمحہ بھول گئے۔ مجھے روزی کے ساتھ نہ ہونے کا قلق تھا اور میں چاہتا تھا کہ جلدی سے میری باری آ جائے اور دولت پانے کے بعد پابندیوں سے آزاد ہو سکوں۔

مگر اس لئے سزا کے طور پر مجھے آخر میں زنجیریں دی جانی تھیں کہ انہیں لانے کی ذمے داری مجھے سونپی گئی تھی مگر میں اسے پوری نہیں کر سکا تھا اس لئے مجھے انتظار کرنا ہی تھا۔ اب پرکاش' عطا' جینو اور میں' ہم چاروں ٹرین کا سفر کر رہے تھے۔ مجھے عطا پر رشک آ رہا تھا۔ وہ بہت حسین تھا۔ خوبصورت تھا' پُرکشش تھا' دولت مند بھی تھا۔

ہمیں عطا کے شہر جانے کا ہمیشہ سے شوق تھا۔ وہ ہمیں یہاں کی بڑی پُراسرار کہانیاں سنایا کرتا تھا۔ اس نے ذکر کیا تھا کہ یہاں بڑے بڑے جادوگر بھی ہوتے ہیں۔ وہ ٹرین میں ہمیں یہی قصے سناتا رہا۔ پھر اچانک اس نے کہا کہ ہمیں ان زنجیروں کی سخت حفاظت

کرنا چاہیے۔ ہمارا خیال تھا کہ ان دونوں زنجیروں کی موجودگی کسی کے پاس بھی ایک ساتھ ہونا ضروری ہے مگر عطا نے حفاظت کی خاطر ہمیں ان دونوں زنجیروں کو الگ کرنے کی تجویز دی۔

اس نے کہا۔ ''اگر خدانخواستہ کسی پیر فقیر یا سادھو سنت نے کسی طرح ان چیزوں کا احوال معلوم کرلیا تو ہم کبھی ہندوستان کی طلسماتی فضاؤں سے باہر نہیں جاسکیں گے۔ اس کی حفاظت کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اسے اپنی جیب میں نہ رکھو' مجھے دے دو۔ جب تک تم لوگ میرے مہمان ہو' میں اسے امانت کے طور پر رکھوں گا اور جب تم لوگ یہاں سے جانے لگو گے تو میں یہ امانت تمہیں واپس کردوں گا۔''

ہم جانتے تھے کہ عطا اپنے عہد میں سچا ہے' اتنے برس ہم نے اس کی عہد شکنی نہیں دیکھی تھی اس لئے فوراً حفظ ماتقدم کے طور پر زنجیریں اسے دے دیں۔ پھر ہم نے بہت دن اس کے شہر میں انجوائے کیا۔ اس نے میزبانی میں کوئی کسر نہ چھوڑی لیکن ایک روز جب رات کو ہمارے پاس سے گیا تھا' مار دیا گیا۔''

رابرٹ سانس لینے کو رکا۔ میں بول اٹھا۔ ''انہوں نے خودکشی کی تھی۔'' حالانکہ میں خودکشی والے کیس سے متفق نہیں تھا مگر رابرٹ کو اکسانا چاہتا تھا۔

''نہیں......... وہ مارا گیا تھا۔ ہم بھی اسے خودکشی ہی سمجھتے اگر اسی رات ایلن کی روح نے ہمارے کمروں میں چکرا چکرا کر ہمیں خوفزدہ نہ کیا ہوتا۔ اس نے ہمارے کمروں کی چھتوں پر لٹکتے ہوئے پنکھوں میں پھانسی کے پھندے ڈال دیئے تھے مگر ہمیں یہ تنبیہ کرکے چھوڑ دیا تھا کہ اگر ہم اپنی سب کی سلامتی چاہتے ہیں تو وہ زنجیریں اس کے حوالے کردیں۔'' وہ پھر لمحہ بھر کو چپ ہوا۔

''وہ روح تھی۔ کیا وہ زنجیریں خود حاصل نہیں کرسکتی تھی؟'' میرے انداز میں تمسخر تھا۔

''نہیں......... میں نہیں جانتا کہ وہ ایسا کرسکتی تھی یا نہیں۔ مگر اس نے جو شرط عائد کی تھی وہ سخت اذیت ناک تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ ہم سب وہ دونوں زنجیریں لے کر لندن جائیں' اس کی قبر کو اسی طرح کھودیں جیسے ہم نے ایک زنجیر حاصل کرنے کے لئے کھودی تھی اور پھر وہ دونوں زنجیریں اس کی کلائی میں پہنا دیں۔ ہم لوگ اسے یوں سامنے دیکھ کر سخت خوفزدہ تھے اس لئے کہ ہم خود اسے دفنا کر آئے تھے۔ ہم اس بات پر بھی

پریشان تھے کہ عطا نے وہ زنجیریں جانے کہاں رکھ دی تھیں اور تم لوگ اس کی غیرموجودگی میں ہمیں وہ زنجیریں دینے کے لئے تیار بھی نہیں تھے۔ ہم نے ہر جتن کرکے دیکھ لیا۔ جینو تو سخت خوفزدہ ہو کر بیمار پڑ گیا۔ پرکاش کسی سادھو کے چکر میں چلہ کاٹنے بیٹھ گیا۔ میں اکیلا عطا کے گھر کے چکر کاٹتا رہا اور ایلن سبھی سے ملتی رہی۔''

''یہ تمہارا وہم بھی تو ہو سکتا تھا!'' میں نے اسے ٹوکا۔

''ہاں......... اگر اکیلا میں یہ کہتا تو تم یہی سمجھ سکتے تھے مگر جب پرکاش کے اس سادھو کو ایک بہت بڑی اور زہریلی مکڑی نے مار دیا تو اس نے پرکاش کو بھاگ جانے کو کہا اور بتادیا کہ وہ کیسے مارا جارہا ہے۔ پھر پرکاش جانے کہاں گیا؟ جینو اپنے گھر میں بند ہوگیا۔ میں آج بھی اسی عمارت میں قید ہوں جہاں مجھے عطا نے آخری روز چھوڑا تھا۔''

''تم سب تو ساتھ تھے' پھر الگ الگ کیسے رہنے لگے؟''

''نہیں......... ہم سب کو عطا نے الگ الگ جگہ دی تھی۔ یہ میں نہیں جانتا کہ اس نے ایسا کیوں کیا' لیکن میں شاید تمہیں یہ بتانا بھول گیا کہ مرنے سے چند روز پہلے ہی سے عطا بہت پریشان تھا۔ اس سے پہلے تو ہم سب اسی عمارت میں تھے مگر اچانک چند روز قبل عطا نے کہا کہ ایک سادھو ہمارے پیچھے لگ گیا ہے اور ہمیں ایک ساتھ نہیں ہونا چاہیے۔ ہم دولت سے دستبردار ہونے کو تیار نہ تھے اس لئے ہر احتیاطی تدابیر کرنے میں عجلت کیا کرتے تھے۔ وتسلا کمشنر کی خوفناک باتوں نے یوں بھی ہمیں پریشان کردیا تھا۔ اس اطلاع کے ساتھ ہی عطا نے پرکاش اور جینو کے لئے الگ انتظام کردیا اور حیرت کی بات ہے کہ یہ عمارتیں کس کی ہیں' یہ آج تک پتا نہیں چل سکا۔ نہ یہاں کوئی ہمیں نکالنے آیا' نہ پیسا مانگنے' ہمارا خیال تھا کہ یہ عمارتیں عطا ہی کی ملکیت ہیں۔

جب ہم نے ہر احتیاطی تدابیر کرلی۔ کچھ عرصے تک ایک دوسرے سے ملے بھی نہیں تو ایک روز کسی نے فون کرکے مجھے عطا کے مرجانے کی اطلاع دی۔ اطلاع دینے والی کوئی عورت تھی جو یہ خبر بڑی خوش ہو کر دے رہی تھی۔ پہلے تو میں نے یقین نہیں کیا مگر جب عطا نے وعدے کے مطابق ہم سے کوئی رابطہ نہ کیا تو میں تمہارے گھر پہنچ گیا اور وہاں......... ہماری بربادی کا پہلا سامان مہیا ہوچکا تھا۔ عطا مرچکا تھا۔ ہم اس زنجیر سے محروم ہوچکے تھے اور سنہری مکڑیاں ہمارے گرد جالے بننے لگی تھیں۔'' وہ چپ ہو کر گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ جیسے بہت دور سے بھاگتا ہوا آرہا ہو۔ ''اور اب......... اتنے سال

بعد......"

"بس مسٹر رابرٹ!" میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا۔ "اب میں تمہیں زیادہ ٹائم نہیں دے سکوں گا۔ مجھے کچھ دوسرے ضروری کام کرنے ہیں۔ وہ زنجیر تو محفوظ ہے ناں!"

"ہاں..... ...." اس نے فوراً اپنی کلائی دکھائی۔ وہ اسے اپنی جان سے لگائے ہوئے تھا۔ "مگر مسٹر ضیاء ایک زنجیر اور ہوگی۔"

میں نے گہرا سانس لیا اور بولا۔ "وہ بھی تلاش کر لوں گا۔ مگر ابھی نہیں۔ ابھی مجھے بہت سے سوالات کے جوابات تلاش کرنا ہیں۔"

"کیا تم نہیں چاہتے ہو کہ ہم یک لخت ان عذابوں سے چھوٹ جائیں!؟"

"کیسے؟" میں نے چڑ کر پوچھا۔ "تم خود کہہ چکے ہو کہ اب کام بہت بڑھ گیا ہے۔"

"ہاں.......... یقیناً کام بڑھ گیا ہے۔ پہلے مجھے سب کو تلاش کرنا پڑے گا' وتسلا کمیکر بھی ہمارے کام آسکتی ہے' مگر وہ پتا نہیں کہاں ہے؟"

"تم تو امیں اس کے گھر سے فرار ہو کر آئے تھے' یقیناً جانتے ہو گے کہ وہ کہاں رہتی تھی اور اس کا وہ گھر کہاں ہے؟" میں نے طنز کیا۔

"وہ وہاں نہیں ہے۔" اس نے تھکن سے چور انداز میں کہا۔ "میں گیا تھا' وہ گھر ویران تھا۔ کسی نے نہیں بتایا کہ وہ کہاں چلی گئی۔"

"کیا تم سب کو بے وقوف بنا کر وہ دونوں زنجیریں لے کر پھر دولت مند ہونے کا خواب دیکھ رہے ہو؟" میں نے بڑی سفاکی سے پوچھا۔

ایک دکھ بھری مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ وہ چند لمحے دیکھتا رہا پھر بولا۔ "دنیا کی ساری دولت میری پچھلی جسمانی ساخت اور سکون کے سامنے ہیچ ہے مسٹر ضیاء!........ میں جلد از جلد خود کو اور اپنے پُرخلوص دوستوں کو اس اذیت سے نجات دلانا چاہتا ہوں۔"

مجھے لگا جیسے وہ سچ بول رہا ہے۔ "ٹھیک ہے مسٹر رابرٹ! اس وقت تو میں جا رہا ہوں مگر رات کو آؤں گا اگر تمہارا اپنے دوست سورن سنگھ سے ملنے کا پروگرام ہو تو......"

"ہاں ہاں مسٹر ضیاء۔ میں شکر گزار ہوں گا اگر تم مجھے ساتھ لے لو۔"

میں نے ایک منٹ سوچا کہ اسے لے جانا کسی نئے مسئلے سے دوچار تو نہیں کر دے گا' مگر پھر سر جھٹک کر ذہن سے ہر سوچ کو نکال دیا۔ مجھے گھر جانے کی جلدی تھی۔ میں رات بھر جس اذیت میں گرفتار رہا تھا اور جس حادثے سے دوچار ہوا تھا اس نے اعصاب کو چٹخا دیا تھا۔ گو میرے پاؤں کا زخم حیرت انگیز طور پر درست ہو چکا تھا مگر اس سفید چھڑی کی فکر بھی تھی جسے میں نے ٹیکسی میں چھوڑ دیا تھا اور وہ مستعار لی گئی تھی۔ جس اندھے کا سہارا تھی وہ بھی منتظر ہو گا۔ پھر طیب کی طرف سے کچھ پریشانی ہو گئی تھی کہ اب وہ بھی لپیٹ میں آ جائے گا۔

"کیا سوچنے لگے؟"

مجھے رابرٹ نے چونکا دیا تو احساس ہوا کہ میں ابھی تک وہیں' اس کے سامنے کھڑا ہوں۔

"ہاں........ میں تمہیں رات ساڑھے آٹھ بجے لے لوں گا۔"

پھر میں خدا حافظ کر کے چلا آیا۔ طیب گھر پر نہیں تھا۔ ملازم نے بتایا کہ وہ ابھی تک نہیں لوٹا ہے۔ ملازم مجھے صحیح سلامت دیکھ کر حیران تھا۔ میں نے اس سے معذرت کی کہ اس کی چھڑی مجھ سے کھو گئی اور اس کا دادا یقیناً اسی کا منتظر ہو گا مگر طیب بازار سے لے کر آئے گا۔ وہ کھڑا مجھے دیکھتا رہا جیسے میری کوئی بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی ہو۔ میں نیند سے چکرا رہا تھا اس لئے اسے سمجھانے کی بجائے اپنے کمرے میں چلا گیا اور کپڑے بدلے بغیر سو گیا۔

☆============☆============☆

پتا نہیں میں کب تک سویا رہتا تھا اگر طیب نے آ کر مجھے جگا نہ دیا ہوتا۔ میں نے اٹھتے ہی گھڑی دیکھی۔ اچھل کر دروازے کی طرف بھاگا پھر رک کر گاڑی کی چابی میں نے طیب سے مانگی تو اس نے کہا کہ وہ بھی چل رہا ہے۔ ہم دونوں تقریباً بھاگتے ہوئے باہر نکلے۔ گاڑی طیب چلا رہا تھا۔ سوا آٹھ بج چکے تھے۔ مجھے رابرٹ کو لے کر سورن سنگھ کے گھر پہنچنا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ پہلے ہی پہنچ جاؤں۔ جب میں رابرٹ کی عمارت کے گیٹ تک پہنچا تو طیب حیران ہوا مگر میں نے اسے کچھ پوچھنے کا موقع نہیں دیا۔ کچھ دیر بعد جب رابرٹ میرے ساتھ لڑھکتا ہوا باہر آیا تو طیب کی بے ساختہ قسم کی چیخ نکل گئی۔

میں نے اسے فوراً ہی سنبھال لیا۔ وہ خوف سے ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ میں نے اسے برابر میں بٹھا دیا اور خود گاڑی ڈرائیو کرنے لگا۔ رابرٹ نے جب طیب سے معذرت کرنے کے لئے کچھ کہنا چاہا تو اسے خاموش کرا دیا۔ طیب بالکل ساکت ہو چکا تھا۔ اب میں اسے ساتھ لانے پر پچھتا رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ سورن سنگھ کے پاس لے جانے کی بجائے میں اسے گاڑی ہی میں چھوڑ جاؤں۔ رابرٹ کے لئے میں نے پچھلا دروازہ کھولا تو وہ بالکل اسی انداز میں گاڑی میں بیٹھا جیسے وہ ہاتھوں کے بل جھول کر صوفے پر بیٹھتا تھا۔ طیب خوف سے سامنے سڑک پر نگاہیں جمائے بیٹھا تھا ورنہ شاید پھر چیخ پڑتا۔

میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور تیز رفتاری سے سڑکوں پر بھگاتا ہوا سورن سنگھ کے اس پتے پر پہنچ گیا جو ابا کی ڈائری سے اتارا تھا۔ یہ بہت پرانی اور ویران سی عمارت تھی۔ یہاں تو ایک طرف چٹیل میدان پھیلا ہوا تھا اور دوسری طرف گندے پانی کا نالہ بہہ رہا تھا۔ دوسرا گھر بھی اسی عمارت سے کچھ فاصلے پر تھا۔ یہ عمارت مین روڈ سے کافی اندر جا کر تھی اور یہاں تک کا راستہ کچا تھا۔

طیب راستے بھر کچھ نہ بولا تھا‘ نہ میں نے اسے چھیڑا تھا۔ مگر میں اپنا اطمینان کر چکا تھا کہ وہ زندہ سلامت ہے۔ ہم عمارت کے سامنے پہنچے تو پونے نو بجے تھے۔

”طیب میرا خیال ہے کہ تم گاڑی ہی میں بیٹھو۔“

اس نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔ وہ پیچھے کی طرف دیکھنے سے احتراز کر رہا تھا۔ لگتا تھا جیسے گردن گھما کر ادھر ادھر دیکھا تو پتھر کا ہو جائے گا۔ میں نے رابرٹ کے لئے دروازہ کھولا۔ طیب نے اس وقت آنکھیں بند کر لیں۔ ہم عمارت کی طرف بڑھ گئے۔ جب ہم نے گیٹ کھلا دیکھا تو اندر بڑھتے چلے گئے۔ مجھے یقین تھا کہ سورن سنگھ میرا منتظر ہو گا۔

رابرٹ میرے ساتھ تھا۔ یہ گلابی رنگ کی ایک ایسی عمارت تھی جس کی کھڑکیوں اور دروازوں پر پیلا رنگ کیا گیا تھا۔ یہاں قدم قدم پر ویرانی اور وحشت کا احساس ہو رہا تھا مگر میں نے کچھ خوف محسوس نہیں کیا۔ اندرونی حصے میں روشنی تھی جس سے پتا چلتا تھا کہ عمارت آباد ہے۔ ہم عمارت کے بڑے سے دروازے پر پہنچے تو اندر سے ایک ہلکی مگر ناگوار سی آواز آتی محسوس ہوئی۔ میں نے غور کیا تو وہ کسی کے خراٹے لینے کی سی انتہائی کرخت آواز تھی۔ رابرٹ بھی شاید اسے سن چکا تھا۔

”کیا سورن سنگھ اتنی اونچی آواز میں خراٹے لیتا تھا۔“ یہ کہہ کر میں نے دروازے

پر دستک دینے کے لئے ہاتھ رکھا ہی تھا کہ دروازہ چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ کھل گیا۔

”نہیں ہم نے کبھی ایسا نہیں سنا۔“ رابرٹ نے سرگوشی میں جواب دیا۔

مگر اب میری تمام تر توجہ اندر تھی۔ اب مجھے لگ رہا تھا جیسے یہاں یوں سب دروازے کھلے ملنا ہمارے لئے کسی نئی مصیبت کا پیش خیمہ ہے۔ میں نے رابرٹ کو آہستگی سے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ جونہی میں نے کمرے میں قدم رکھا۔ میرے اور رابرٹ دونوں کے حلق سے چیخیں نکل کر دور تک پھیل گئیں۔ ہماری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ مجھے تو لگا جیسے میرا دل پھٹنے والا ہے۔ سامنے سے آنے والا اندھیرا میری آنکھوں میں در آیا اور میں دروازے سے ٹک گیا۔ میں نے آنکھیں بند کر لی تھیں مگر ایک کرخت آواز سن کر پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ آواز چھت کی طرف سے آئی تھی اور پھر یہ ہماری دوسری چیخ تھی۔

ہمیں سورن سنگھ نے پکارا تھا۔ آنکھیں کھولتے ہی مجھے یوں لگا تھا جیسے ہزاروں مکڑیوں نے مجھے جکڑ لیا ہے۔ آواز سورن سنگھ کی تھی مگر جو کچھ میں دیکھ رہا تھا اس نے حقیقت کو گمان ظاہر کیا اور جب صرف لمحے کے ہزارویں حصے میں مجھ پر انکشاف ہوا کہ یہ سب حقیقت ہے تو جیسے میں خود مکڑیوں کے جال میں قید ہو چکا تھا۔ جو کچھ میں بتانے والا ہوں اس پر یقین کر لیجئے گا حالانکہ آپ کو سو فیصد یوں محسوس ہو گا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں لیکن بخدا یہ جھوٹ نہیں‘ ایک ایسی حقیقت تھی جس نے مجھ ایسے حوصلہ مند‘ حاضر دماغ اور باہمت شخص کو بے پناہ خوفزدہ کر دیا تھا۔ سورن سنگھ چھت پر معلق تھا اور اس کے گرد مکڑیوں کا مضبوط جال پھیلا ہوا تھا۔ اسی جال نے اسے چھت کے ساتھ جکڑ رکھا تھا۔ اس جال کی کئی تہیں تھیں جیسے وہ برسوں سے وہاں جکڑا جا چکا ہو۔ میں لڑکھڑا کر گرا تھا اور تبھی میں نے رابرٹ کو باہر کی جانب لڑھکتے دیکھا۔ وہ چیخا تھا۔ ”مسٹر نباء..........! بھاگو۔“

اور میں سرپٹ دوڑ گیا۔ اس سے آگے نکل گیا۔ ایک تکون احاطہ جو اس عمارت کے باہر تھا اسے طے کر کے جب میں باہر والے لکڑی کے گیٹ پر پہنچا تو میری سانس بری طرح پھولی ہوئی تھی اور غالباً میرا رنگ بھی پیلا ہو رہا تھا جس کے بارے میں مجھے بعد میں طیب نے بتایا۔ میں نے کہا ہے نا کہ میں بہت حاضر دماغ تھا اور ہوں‘ یہ میری حاضر دماغی تھی کہ حواس باختہ ہوا ضرور مگر اس چھوٹے سے حصے کو عبور کرتے کرتے مجھے باہر

گاڑی میں بیٹھے خوفزدہ طیب کا خیال آگیا۔ اگر وہ مجھے یوں ہراساں دیکھ لیتا تو جانے کیا ہوتا۔ اس حاضر دماغی نے مجھے فوراً سنبھال لیا اور میں نے خود کو بالکل ایسے روک لیا جیسے آدمی گاڑی کا ایمرجنسی بریک لگا دیتا ہے۔ رابرٹ میرے پیچھے تھا اور میرے رکنے کے چند ہی لمحے بعد میرے قریب پہنچ گیا تھا۔

"نکلو یہاں سے۔" اس نے پھر کہا اور آگے جانے لگا۔

"ٹھہرو رابرٹ!" میں پکار اٹھا مگر وہ رکا نہیں۔ "رابرٹ!" میں پھر چیخا۔ "باہر طیب ہے اور وہ پہلے ہی خوفزدہ ہے۔ ہم یقیناً خطرے سے باہر آچکے ہیں جو اگر ایسا نہ ہوا تو........." میں نے پلٹ کر عمارت کے اس دروازے کو دیکھا جہاں سے اندر داخل ہونے کے فوراً بعد ہی ہم حواس باختہ ہو کر بھاگے تھے۔ وہ دروازہ ویسے ہی کھلا ہوا تھا اور اس کا فریم خالی تھا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔

رابرٹ اس بار رک گیا۔ اس کی پھولی ہوئی سانسوں کی آواز سن کر ایسا لگ رہا تھا جیسے قریب ہی سرکنڈوں کی گھنی جھاڑیوں میں درندے پھر رہے ہوں اور ان کی رگڑ سے عجیب سی ہیبت زدہ کر دینے والی آواز گونج رہی ہو۔

اس نے رک کر اس دروازے کی طرف دیکھا پھر بولا۔ "لیکن یہاں ٹھہرنا خطرناک ہو سکتا ہے۔ مسٹر ضیاء.........! کیا تم نے...... دیکھا.........؟"

"ہاں.........!" میں اور کچھ کہنے والا تھا کہ ایک بار پھر ہم دونوں اچھل پڑے۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں یخ لہریں دوڑ گئیں۔ دبی دبی چیخیں ایک بار پھر ہمارے حلق سے ابل پڑیں۔ پیچھے سے سورن سنگھ کی آواز آئی تھی۔ ہم دونوں بے ساختہ پلٹ پڑے اور ہمیں ایک بار پھر اپنے آپ کو یقین دلانا پڑا کہ ہم جو سمجھ اور دیکھ رہے ہیں، وہ حقیقت ہے۔

سورن سنگھ دروازے کی چوکھٹ پر کھڑا کہہ رہا تھا۔ "مسٹر ضیاء! میں نے تمہیں نو بجے کے بعد آنے کو کہا تھا۔ اپنی اس حالت کے ذمے دار تم خود ہو مگر میں! پھر بھی تم سے معذرت چاہوں گا۔"

وہ بالکل نارمل تھا۔ اس کی آواز پُرسکون تھی۔ اس کے چہرے پر بھی کوئی تردد نہ تھا۔ مجھے لگا بلکہ یقین ہو گیا کہ جو کچھ ہم نے لمحوں پہلے دیکھا تھا، وہ ہمارا واہمہ تھا۔

"مسٹر سورن سنگھ!" میں نے بے یقینی سے کہا۔

"ہاں......... آؤ!" وہ یوں پلٹ گیا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ جیسے ہم نے ابھی ابھی کال بیل دبائی ہو اور وہ ہمارا استقبال کر رہا ہو۔

میں نے پلٹ کر رابرٹ کے چہرے پر نگاہ جما دی۔ اس کا پہلے سے مسخ چہرہ بڑا بدہیت اور خوفناک لگ رہا تھا۔ میں اس کی جانب زیادہ دیر نہیں دیکھ سکا۔ ہم دونوں اب تک اس جگہ جمے کھڑے تھے۔ ایک انچ بھی اپنی جگہ سے نہ ہل سکے۔ سورن سنگھ اندر کہیں جا چکا تھا اور ہم بے یقینی سے اس خالی چوکھٹ کو دیکھ رہے تھے۔ عجیب سی کیفیت تھی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اپنی آنکھوں کو کب جھٹلا دیں اور کب ان کا اعتبار کریں۔ اب ایسے لگ رہا تھا جیسے سورن سنگھ کا دروازے پر آنا ہمارا گمان تھا۔ میں نے پلٹ کر باہر کی جانب دیکھا جہاں طیب کو ہونا چاہیے تھا۔ وہ موجود تھا۔ گاڑی کنارے کھڑی کر کے سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ اس کے سگریٹ کا سلگتا شعلہ مجھے یہاں سے صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اندر کمرے کی روشنی کھلے ہوئے دروازے سے باہر ایک مستطیل روشن ٹکڑا بنائے ہوئے تھی اور ہم اس روشنی کی زد میں تھے۔

اب مجھے ہی نہیں، رابرٹ کو بھی یقین ہو گیا تھا کہ ہم نے دروازے میں سورن سنگھ کو نہیں دیکھا بلکہ یہ ہمارا واہمہ تھا۔ چند ہی لمحوں پہلے ہم جسے چھت پر ایک موٹے جال میں جکڑے دیکھ چکے ہیں، وہ اتنی جلدی اور ایسے پُرسکون انداز میں دروازے پر کیسے آسکتا ہے!

"مسٹر ضیاء! تم یہاں ٹھہر کر بہت بڑی غلطی کر رہے ہو۔" رابرٹ نے صرف اتنا کہا اور باہر کی جانب لڑھکنے لگا۔ میں نے بھی قدم آگے بڑھایا۔ میں پُرسکون نہیں تھا اور سوچنے کے لئے سکون کی اشد ضرورت تھی مگر عجیب بات تھی کہ میں یوں واپس جانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اسے میں ہمدردی نہیں، تجسس کہہ سکتا ہوں۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ وہاں......... چھت پر کیا واقعی سورن سنگھ معلق تھا۔ اگر ہاں تو پھر کل اس نے مجھے آنے کا وقت کیسے دیا تھا؟ وہ بالکل نارمل تھا۔ رات اس سے بات کرتے وقت میں خود بھی ایسی حالت میں نہیں تھا کہ خود کو بہلا سکوں۔ یہ کہہ کر کہ میں حواس باختہ تھا۔ ممکن ہے، میں نے ٹھیک سے سنا نہ ہو۔ لیکن کل میری اس سے فون پر بات ہوئی تھی۔ یہی آواز تھی! نو بجے کے بعد آنے پر اصرار کیا گیا تھا۔ میں نے یہ خیال آتے ہی کلائی پر بندھی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ نو بج کر تین منٹ ہو چکے تھے۔ گویا میں اور رابرٹ نو بجے سے کافی پہلے یہاں پہنچ

چکے تھے۔

رابرٹ بیرونی گیٹ سے باہر نکل رہا تھا جبکہ میں اس سے دو چار قدم پیچھے تھا اور اپنے تذبذب سے الجھا ہوا تھا۔

"مسٹر ضیاء!"

میں اور رابرٹ دونوں ساکت رہ گئے۔ میں نے دھیرے سے اپنا رخ موڑا۔ اب وہ دروازے کو عبور کرکے دو قدم آگے آگیا تھا۔ وہ سورن سنگھ ہی تھا۔ رابرٹ گیٹ کے بیچوں بیچ منجمد تھا۔ ایک پٹ اس کے بدن سے ٹکرا رہا تھا جبکہ گیٹ کے دوسرے پٹ کو اس نے اپنے لمبے بازو سے دھکیلا ہوا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا۔ سورن سنگھ کے چہرے پر دھیمی سی مسکراہٹ تھی جو عموماً کسی نئے ملنے والے کے چہرے پر ہوتی ہے۔

"مسٹر ضیاء! آپ وہی ہیں جس سے کل فون پر بات ہوئی تھی؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

بے اختیار میں بول اٹھا۔ "جی مسٹر سورن سنگھ مگر.......... آپ.........." میں آگے کچھ کہہ نہ پایا۔

وہ مسکراتا ہوا میری جانب بڑھ رہا تھا اور میں اپنی حیرت انگیز بینائی سے کام لے کر اس کے بدن کا جائزہ لے رہا تھا۔ مجھے خوف تھا کہ شاید اس کے بدن سے وہ مکڑیاں چپکی ہوئی ہوں مگر ایسا کچھ بھی نہ تھا۔ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ اس کے کپڑے استری شدہ تھے۔ بال جمے ہوئے تھے۔ وہ ان سکھوں میں سے تھا جو بال کٹوا لیتے ہیں یعنی اسے مذہبی کٹر نہیں کہہ سکتے۔ اس کی طرف سے اطمینان نے میرے دماغ میں ایک ہی بات بٹھائی کہ اب سے پہلے ہم نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا' وہ واہمہ تھا۔

"آیئے نا!" اس نے ہاتھ مصافحے کے لئے بڑھا دیا۔

میں نے بے دھڑک ہاتھ تھام لیا۔

"یہ........" اس نے رابرٹ کی طرف دیکھ کر کچھ حیرانی اور تعجب سے کہا۔ "آپ کے ساتھ ہیں؟"

"جی!" میں نے تھوک نگلا۔ "ہاں..........!" میں خوفزدہ تھا۔

آپ تعجب نہ کریں۔ پے در پے ہونے والے واقعات نے میرے مضبوط اعصاب کو اچھا خاصا نقصان پہنچایا تھا پھر بھی میں نے خود کو جلدی سنبھال لیا۔

"آپ انہیں نہیں پہچانتے؟" میں خود کو نارمل تو نہیں کرسکا تھا مگر ظاہر کر رہا تھا۔

میرا ہاتھ ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ میں نے اپنی توجہ اس کے لمس پر مرکوز کی' شاید میں غیر شعوری طور پر اسے مردہ تصور کر رہا تھا۔ مجھے اس لمحے ایلن کے قرب والی ٹھنڈک یاد آگئی تھی۔ غالباً میں اسی لئے اسے اتنے غور سے دیکھ اور ایسی توجہ سے محسوس کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں حرارت تھی جس نے مجھ میں کافی اطمینان بھر دیا۔

پھر اس کی آنکھوں میں گہری سوچ عود کر آئی۔ اس نے نگاہیں رابرٹ کے چہرے پر جما دیں۔ رابرٹ اب بھی کسی بت کی طرح ساکت تھا اور اس کی گول گول آنکھیں سورن سنگھ کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں جن میں بے پناہ خوف بھی تھا۔

پھر میں نے محسوس کیا کہ سورن سنگھ کا رنگ اچانک پیلا ہوگیا۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ چندھیائی ہوئی آنکھوں سے رابرٹ کو دیکھا۔ وہ اندر سے آنے والی روشنی کی زد میں تھا اور کیوں کہ ہمارے بالکل سامنے تھا اس لئے اس کے چہرے کے تاثرات صاف دیکھے جاسکتے تھے۔ میں سورن سنگھ پر نظریں جمائے اس کے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات کا بڑی گہرائی سے جائزہ لے رہا تھا۔

"تت.......... تم؟" اس نے میرا ہاتھ چھوڑ کر انگلی رابرٹ کی طرف اٹھائی۔ "تم رابرٹ ہو؟"

آخری جملہ ادا کرتے ہوئے اس کی آواز پھٹ گئی۔ بے پناہ خوف تھا اس کی آواز میں۔ اب رابرٹ کے بدن میں خفیف سی حرکت ہوئی۔ وہ جو رخ ترچھا کیے باہر جانے کو تیار تھا' اب سورن سنگھ کی طرف مڑ گیا۔ اس کے چہرے کے عضلات بھی ڈھیلے ہوگئے۔ آنکھوں کی پتلیاں جو پھیل کر تن گئی تھیں' نرم ہو کر سکڑ گئیں۔

"سورن..........! میں.......... رابرٹ ہی ہوں۔"

"رابرٹ..........! میرے دوست..........!" وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھا اور گھٹنوں کے بل اس کے قریب بیٹھ گیا۔ وہ خوف دہشت اور حیرت سے اس کے سکڑے ہوئے وجود کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے رابرٹ سے اس کی محبت کا یقین اس وقت ہوگیا جب اس نے اس کے کریہہ بدن پر ہاتھ پھیر کر اسے پورے کا پورا محسوس کرنا چاہا۔ اب وہ رو رہا تھا۔ اس کی گہری سیاہ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"یہ کیا ہوگیا رابرٹ؟ کیا ہوگیا تمہیں؟" وہ اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہہ رہا تھا پھر وہ تیزی سے کھڑا ہوگیا۔ "چلو اندر چلو۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ آج کا دن میرے لئے

ایسا اذیت ناک ہوگا۔ آج ہی.......... برسوں کے بعد میں نے جینو کی آواز سنی تھی اور آج ہی عطا مجھے یاد آرہا تھا کیوں کہ.........." وہ میری طرف مڑا۔ "غالباً تم نے خود کو اس کا بیٹا بتایا تھا۔ ہاں' تم نے ٹھیک کہا تھا۔ تم بالکل عطا جیسے ہو' وہی لب و لہجہ' آنکھوں میں وہی ذہانت اور وہی قد کاٹھ۔ اگر مجھے یقین نہ ہوتا کہ وہ مر چکا ہے تو شاید میں تمہیں عطا ہی سمجھتا۔ آؤ.......... آؤ!" وہ دروازے کی طرف پلٹ گیا۔

مجھے طیب کی فکر تھی وہ ایسا صابر ہرگز نہیں تھا کہ گھنٹوں باہر سڑک کے کنارے بیٹھا رہتا۔ اس جیسا سیماب صفت اگر اتنی دیر بھی گاڑی میں بیٹھا سگریٹ پھونکتا رہا تھا تو مجھے اس کا احسان مند ہونا چاہیے۔ ایسا اس نے صرف میری خاطر کیا تھا۔ میں نے سورن سنگھ سے کہا۔ "ایک منٹ..........! باہر میرا کزن ہے۔"

"بلالیں اسے۔" اس نے خوش اخلاقی سے کہا۔

"نہیں..........! میرا خیال ہے کہ وہ نہیں آئے گا۔ دراصل اسے کام ہے۔ اگر آپ نہ ملے ہوتے تو ہم چلے جاتے مگر اب اسے بھیج دینا ہی بہتر ہوگا۔ یہاں سے ٹیکسی تو مل جائے گی؟"

"جیسی آپ کی مرضی' سواری کی دشواری البتہ آپ کو نہیں ہوگی۔" وہ اتنا کہہ کر پلٹ گیا۔ اس نے رابرٹ سے کہا۔ "چلو!"

"نہیں..........! سورن..........!" یہ رابرٹ کی آواز تھی۔ میں پلٹا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "ضیاء کو آنے دو۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ خوفزدہ ہے پھر میں تیزی سے باہر گیا۔ میرے قدموں کی آہٹ نے طیب کو چونکا دیا۔ وہ میری طرف دیکھنے لگا۔

"کیا ہوا؟" وہ ایک دم بول اٹھا۔

"کچھ نہیں! تم جاؤ۔ ہمیں سورن سنگھ مل گیا ہے۔" میں نے اسے غور سے دیکھ کر کہا۔ میں اس کے چہرے سے اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ اس تک ہماری چیخوں کی آواز پہنچ تھی یا نہیں؟ وہ ہم سے زیادہ دور نہیں تھا پھر ہم عمارت کا دروازہ بند بھی نہیں کر پائے تھے۔ ایسی صورت میں اس تک ہماری چیخیں پہنچنا چاہیے تھیں مگر اس سے بات کرتے ہوئے مجھے لگا جیسے میں جو کچھ سوچ رہا ہوں وہ غلط ہے۔

"پھر؟" اس نے پوچھا۔

"پھر یہ کہ ہمیں دیر ہو جائے گی۔ تم اندر آؤ گے نہیں۔"

"وہ.......... وہ کون تھا؟" پھر خوف زدہ ہو گیا۔

"رابرٹ..........! جس کے بارے میں' میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ تم خواہ مخواہ اس سے خوفزدہ ہو۔"

"ٹھیک ہے! لیکن خوفزدہ تو تم بھی ہو۔ تمہارا رنگ پیلا یا سفید ہو رہا ہے۔ میں اندھیرے بلکہ اتنی کم روشنی میں ان رنگوں کی تمیز نہیں کر سکتا۔" اس نے میری بات کاٹ دی۔ "پھر میں چلتا ہوں۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن تم آؤ گے کیسے؟"

"آ جاؤں گا۔ تم فکر نہ کرو۔ ہاں' ایاز سے کہہ دینا کہ مجھے اگر دیر بھی ہو جائے تو میرا انتظار کرے۔ وہ گیٹ بند کر کے سو گیا تو رات مجھے فٹ پاتھ پر گزارنا پڑے گی۔"

"میں کہہ دوں گا۔" اس نے گاڑی گیئر میں ڈالی۔ "تم کوشش کرنا کہ جلد آ جاؤ اور اپنا خیال رکھنا۔" وہ میرے لئے فکر مند تھا۔

"مجھے کچھ نہیں ہونے والا۔" میں نے ہنس کر اس کے کندھے کو تھپتھپایا اور جب وہ گاڑی آگے بڑھا کر گلی کا موڑ مڑ گیا تب میں لوٹا۔

☆--------------☆--------------☆

سورن سنگھ اور رابرٹ دروازے کے قریب میرے منتظر تھے۔ میرے پہنچتے ہی سورن سنگھ نے اندر جانے کے لئے قدم آگے بڑھایا۔

رابرٹ اندر جانے سے خوفزدہ تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ میرا پتھر جو شالی بابا نے مجھے دیا تھا' وہ میرے والٹ میں تھا' رابرٹ بھی دوسرا پتھر لایا ہے یا نہیں؟ یہ خیال آتے ہی میں دو قدم پیچھے ہو گیا اور میں نے رابرٹ کو بھی اشارہ کیا پھر سورن سنگھ کے آگے نکلتے ہی اس سے پوچھا۔ میرے سوال کرتے ہی وہ مسکرایا پھر اثبات میں سر ہلا کر کچھ بے پروائی سے آگے بڑھ گیا۔ پتھر کی موجودگی نے جیسے اس میں اعتماد بحال کر دیا تھا۔

سورن سنگھ اندر داخل ہو چکا تھا۔ ہم اس کے پیچھے ہی اندر داخل ہوئے۔ میں نے اندر داخل ہوتے ہی چھت کے اس حصے پر نگاہ ڈالی جہاں میں چند لمحے پہلے سورن سنگھ کو مکڑی کے جالے میں جکڑا دیکھ چکا تھا۔ وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ یعنی حالات مکمل طور پر ایسے تھے کہ میں بلا جھجک لمحوں پہلے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہوئے سین کو واہمہ قرار دے سکتا

تھا اور اس واہمے کی ولالت سورن سنگھ کا حلیہ اور اس کا اطمینان بھی کر رہا تھا مگر میں مطمئن ہونے کی بجائے بے چین ہو گیا تھا۔

رابرٹ بھی وہاں کچھ نہ دیکھ کر بے کل تھا مگر پھر بھی اس کا خوف کم ہو چکا تھا۔ ہم اب بھی سورن سنگھ کے پیچھے چل رہے تھے۔ یہ ایک ہال نما بڑا مستطیل نما کمرا تھا۔ یہاں سامان نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ میں نے اچھی طرح اپنی بے پناہ بینائی کی قوت سے کام لے کر اس کمرے کا ایک لمحے میں جائزہ لے لیا تھا۔ کچھ بھی غیر معمولی نہ تھا۔ پورے گھر میں گہرا سناٹا تھا جس میں ہم تینوں کے چلنے بلکہ میرے اور سورن سنگھ کے چلنے اور رابرٹ کے گھسٹنے کی آواز کی گونج کے سوا کوئی اور آواز نہ تھی۔

ہم اب جس کمرے میں داخل ہوئے وہاں ایک ڈرائنگ روم کا سارا سامان موجود تھا مگر سارے سامان پر بے پناہ گرد جمی ہوئی تھی۔ یہاں فرش پر بھی گرد تھی جس کی وجہ سے رابرٹ کے کپڑے میلے ہو چکے تھے اور ہمارے قدم اپنے نشان چھوڑ رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کمرے کو برسوں کے بعد استعمال میں لایا جا رہا تھا۔ سورن سنگھ جو خود کافی صاف ستھرا تھا' اسے قطعی اس کمرے کی حالت کا احساس نہ تھا۔ اس نے اتنے گندے کمرے میں ہمیں لانے پر نہ کوئی معذرت کی اور نہ اس کے گندہ ہونے پر کوئی عذر پیش کیا بلکہ اس نے استقبالیہ مسکراہٹ کے ساتھ ہمیں ان گرد سے اٹے صوفوں پر بیٹھنے کو کہا۔

رابرٹ کو بھی غالباً اس گندگی کا کوئی احساس نہ تھا' وہ بڑے مطمئن انداز میں گھسٹتا ہوا اپنے مخصوص انداز میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ سورن سنگھ اس کے برابر میں بیٹھا اور میں سامنے کے صوفے پر۔

"رابرٹ.........!" بیٹھتے ہی سورن سنگھ مخاطب ہوا۔ "کیا تم اس حالت کو ایلن کی وجہ سے پہنچے ہو؟"

"ہاں سورن.........! میں پچھتاووں کی آگ میں جھلس جھلس کر بھی اس عذاب سے نجات نہیں پاسکا۔ ایلن پھر کبھی میرے سامنے نہیں آئی ورنہ میں تو اس سے موت مانگ لیتا۔ اس زندگی سے بہتر ہے کہ وہ مجھے مار دے۔"

"مایوسی کی باتیں نہ کرو۔ ویسے تمہیں دیکھ کر باوجود دکھ ہونے کے' میں خود کو خوش بھی محسوس کر رہا ہوں۔"

"یہی حالت میری بھی ہے۔" رابرٹ نے جواب دیا پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔ "اسے جانتے ہو؟"

"ہاں! مگر صرف اس قدر جس قدر انہوں نے خود فون پر بتایا تھا۔"

"کیا جانتے ہو؟" اس نے پھر پوچھا۔

"یہی کہ یہ عطا کے بیٹے ہیں اور غالباً مجھ سے ملنے کے لئے یہاں آنا چاہتے تھے۔ کیوں؟ یہ بھی نہیں جانتا۔"

"سورن! شاید گاڈ نے اسے ہماری مدد کے لئے بھیجا ہے۔ یہ دیکھو۔" اتنا کہہ کر رابرٹ نے وہ سونے کی چین جیب سے نکالی اور سورن کے سامنے لہرائی۔

"یہ.........یہ کہاں تھی؟" وہ اچھل پڑا۔ "اور دوسری؟"

"دھیرج......... مسٹر سورن سنگھ!" میں نہ صرف یہ کہ درمیان میں بول پڑا بلکہ میں نے رابرٹ کے ہاتھ میں جھولتی وہ چین بھی درمیان میں سے اچک لی۔ رابرٹ اور سورن سنگھ ساکت ہو کر میری جانب دیکھنے لگے۔

"پہلے آپ کو میرے کچھ سوالوں کے بالکل درست جواب دینے ہوں گے۔" میں نے چین کو اپنی جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔ رابرٹ میرے رویے پر حیران تھا' اسے ہونا ہی چاہیے تھا۔ میں نے اسے دی ہوئی چین جو اس سے واپس لے لی تھی۔ سورن سنگھ میرے چہرے پر نگاہ جمائے ہوئے تھا۔ اس نے میرا کہا ہوا ہر لفظ خاموشی سے سنا تھا اور اب غالباً میرے سوالوں کا منتظر تھا۔

"مسٹر سورن سنگھ! ہم نے جو کچھ پہلی بار آپ کے کمرے میں داخل ہو کر دیکھا تھا' جس نے ہمیں خوفزدہ کر دیا تھا' کیا وہ حقیقت تھا؟"

اس نے گہری سانس لی پھر دھیرے سے بولا۔ "ہاں! وہ درست تھا اور......... اسی وجہ سے میں نے تمہیں فون پر تاکید کی تھی کہ تم رات نو بجے کے بعد ہی مجھ سے ملنے کے لئے آنا۔ میں صبح کی آمد کے بعد سے رات نو بجے تک اس کی قید میں رہتا ہوں۔ رات میری اپنی ہوتی ہے' میں اپنا تمام کام رات نو بجے کے بعد ہی کر سکتا ہوں۔"

"کس کی قید میں؟" میں نے گہری نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"پتا نہیں......... وہ......... وہ کون ہے؟" سورن سنگھ نے الجھے ہوئے انداز میں جواب دیا۔ "میرا خیال ہے کہ میں ایلن کی پُراسراریت میں قید ہوں' کیا تم جانتے ہو کہ

ایلین کون ہے؟"

"ہاں..........! میں جانتا ہوں مگر تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا؟ مجھے مختصر الفاظ میں بتاؤ۔"

"کیا تم ہماری مدد کرو گے؟ کیا یہ چین ہمارے حوالے کر دو گے؟" اس نے بے چینی سے پوچھا۔

"میں تمہاری مدد ہی کرنا چاہتا ہوں مگر اس کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ مجھے حقیقت کا مکمل ادراک ہو۔"

"کیا جاننا چاہتے ہو؟" وہ پہلو بدل رہا تھا۔

"یہی کہ ایلین نے تمہارے ساتھ کیا کیا' وہ تم سے کیا چاہتی ہے؟"

یہ بہت طویل داستان ہوگی مسٹر ضیاء! کیا تم کسی جاسوسی فلم کی شوٹنگ پر نکلے ہوئے ہو جو ہر آدمی سے تفصیل پتا کرو گے اور وہ بھی خصوصاً جاسوسوں کے انداز میں۔ تمہاری مرضی سے تمہارے اپنے انداز میں' یعنی جہاں تم چاہو وہاں آدمی بولنا شروع ہو جائے اور جہاں چاہو وہ خاموش ہو کر پھر تمہارے اشارے کا انتظار کرے۔ تم ہماری مدد کرنے نہیں غالباً ہمیں بلیک میل کرنے آئے ہو۔"

سورن سنگھ کی بجائے رابرٹ پھٹ پڑا تھا۔ سورن سنگھ یوں سر جھکائے بیٹھا تھا جیسے رابرٹ کے منہ سے نکلے ہر لفظ کی تائید کر رہا ہو۔ "میرا خیال ہے کہ تم یہ چین لے کر واپس چلے جاؤ۔ ہم جس حال میں اتنے برس گزار چکے ہیں' تم نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ اب ان حالات کے عادی ہو چکے ہیں۔ سورن کو دیکھ کر مجھے کسی قدر یہ رنج ضرور ہوا ہے کہ خدا نے ہمیں آزمائش میں ضرور ڈال رکھا ہے مگر اس نے ہمت اور برداشت دینے میں ذرا بھی بخل سے کام نہیں لیا۔ میرا خیال ہے کہ اب ہم خود ہی جینو اور پیاس کے علاوہ پرکاش کو بھی تلاش کر لیں گے پھر کوشش کریں گے کہ ہم سب اکٹھے ہی رہیں اور اکٹھے ہی جان دے دیں۔ تم جا سکتے ہو۔"

رابرٹ سے مجھے ایسی امید نہیں تھی لیکن اس کی بات بھی درست تھی۔ اس کا ایک ایک حرف بڑا ٹھوس تھا۔ میں بے وجہ اپنی طبیعت اور عادت کو ان پر حاوی کرنے کی فضول سی کوشش کر رہا تھا۔ رابرٹ سے چونکہ میں تمام کہانی سن چکا تھا اور وہ میرے بار بار ٹوکنے پر مجھ سے لڑا بھی تھا اسی لئے یہاں وہ پھٹ پڑا تھا۔ مجھے احساس ہو چکا تھا کہ وہ

بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میں بے وجہ ہی ان تفصیلات میں جا رہا تھا جن سے کوئی فائدہ نہیں نہ ان کی ضرورت تھی۔ اس نے اعتراف کر لیا تھا کہ وہ ایلین کی پُراسراریت کی قید میں ہے اور میرے لئے یہ کافی تھا۔

"او کے مسٹر رابرٹ!" میں نے ان کی ناراضگی کو ختم کرنے کے لئے صلح جو انداز میں دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "آئی ایم ساری! اب تم بتاؤ کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ تم دونوں اور تمہارے دوسرے ساتھی کس طرح اس عذاب سے نجات پا سکیں گے؟"

"پیاس اور جینو کا کچھ پتا ہے؟" رابرٹ نے میری بات ختم ہوتے ہی سورن سنگھ سے پوچھا۔

"نہیں رابرٹ! تم پہلے آدمی ہو ہمارے گروپ کے جسے میں سات برس بعد دیکھ رہا ہوں۔ جینو سے آج میری فون پر بات ہوئی تھی۔ جانے وہ کس حال میں ہے؟ وہ رو رہا تھا اور میں.......... میں اس معصوم کی کوئی بھی مدد کرنے سے قاصر ہوں۔ میں نے اتنی بدتر زندگی کا تصور بھی نہیں کیا تھا جو.......... آج گزار رہا ہوں۔" سورن سنگھ نے حسرت انگیز لہجے میں جواب دیا۔ "مجھے تو اتنی اجازت بھی نہیں کہ.........."

وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا پھر چونک کر بولا۔ "پرکاش! وہ کہاں ہے؟"

"پتا نہیں' سورن! دو برس پہلے پتا چلا تھا کہ وہ کسی سادھو کے پاس چلے کاٹ کر اپنے گرو کا حصار توڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ بات مجھے خود' پرکاش ہی نے بتائی تھی۔ اس وقت وہ کافی پُرامید تھا مگر پھر کچھ عرصے بعد وہ ایک دن بہت پریشان اور حواس باختہ آیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کے سادھو کو ایک بڑی مکڑی نے جان سے مار دیا اور سادھو نے اس سے کہا وہ جس قدر جلد ہو سکے' اس علاقے سے دور ہو جائے۔ وہ مجھے بھی ساتھ لے جانا چاہتا تھا مگر میں.......... میں اس حالت میں اس کے ساتھ جا کر کیا کرتا؟ اور پھر میں اپنی حالت سے اس قدر مایوس تھا کہ زندگی میرے لئے بہت غیر اہم ہو چکی تھی۔ میں نے اسے کہہ دیا کہ وہ چلا جائے۔ اس نے کہا تھا کہ وہ علاقے کو چھوڑ کر کہیں دور چلا جائے۔ اس کے بعد سے اس کا پتا نہیں۔ وہ تو ضیاء ہی نہ آ جاتا تو شاید میں اپنی زندگی اس طرح بتا دیتا۔"

"ایلین یہ جان چکی ہے کہ وہ زنجیریں ہمارے پاس نہیں ہیں ورنہ ہم ضرور اس کی خواہش پوری کر دیتے مگر اس کا کہنا ہے کہ یہ سزا تو ہمیں وہ نہیں' زنجیر کی اصل مالک دے

رہتی ہے۔" اس بار سورن سنگھ نے کہا تھا۔

"زنجیر کی اصل مالک کون ہے؟" میں بے ساختہ پوچھ بیٹھا۔

"زیوسا۔" اس نے دھیرے سے کہا اور میں اچھل پڑا۔

"زیوسا!!! یہ.......... یہ کون ہے؟" میں نے پوچھا مگر کل رات والا فون مجھے یاد آگیا تھا۔ وہ جو بھی تھی' اس نے اپنا نام "زیوسا" ہی بتایا تھا۔

"پتا نہیں..........! میں بھی اس سے واقف نہیں ہوں لیکن ایلن کہتی ہے کہ زیوسا جس قدر حسین ہے' اسی قدر سفاک بھی ہے۔ وہ کسی پر رحم کھانے کو تیار نہیں۔ وہ موت سے ذرا رغبت نہیں رکھتی۔ اسے تو اذیتوں میں لطف آتا ہے۔"

"لیکن ایلن اس کی دی ہوئی اذیتوں سے کس طرح محفوظ رہی۔ اس نے اسے تو کبھی تکلیف نہیں دی پھر..........؟" میں نے پوچھا۔

"وہ کہتی ہے وہ زنجیر مجھے اس کی مالک نے دی تھی جبکہ ہم نے اس زنجیر کی خاطر اسے قتل کر دیا اور پھر قبر کھود کر وہ دوسری زنجیر بھی حاصل کر لی۔ بس زیوسا' اسی پر برہم ہے۔"

"کیا تم زیوسا کو دیکھ چکے ہو' وہ کیسی ہے؟" میں بے چینی محسوس کر رہا تھا۔

"نہیں! لیکن ایلن نے ہمیشہ اس کا ذکر اپنے مہربانوں کی طرح کیا ہے۔ یہ بھی اکثر کہا ہے کہ وہ دنیا کی حسین ترین عورت ہے مگر سفاکی پر اتر آئے تو اذیت کے ایسے انوکھے طریقے استعمال میں لاتی ہے کہ روح کانپ اٹھے۔ میں نے نہیں دیکھا اسے مگر.......... ہاں..........! ایک بار اس کی ہنسی سنی تھی۔ جب پہلی بار وہ خوفناک مکڑی میرے بدن پہ جالا بُن رہی تھی۔ جب میں شدید خوف اور اذیت کی وجہ سے چیخ رہا تھا۔ حلق پھاڑ کے چیخ رہا تھا تاکہ میری آواز اس عمارت سے باہر تک پہنچ جائے تو شاید کوئی راہ گیر یا قریب رہنے والا میری مدد کو آ جائے تب وہ ہنسی تھی۔ بہت زور سے اور ہنستی چلی گئی۔ وہ ہنسی اتنی خوفناک لیکن اتنی پُرکشش تھی کہ میرے حواس معطل ہو کر رہ گئے تھے۔ مجھے یہ جتاتے ہوئے شرم آ رہی ہے کہ ایسی حالت میں بھی مجھے.......... نہیں.......... ایسی حالت میں کہ میں اپنے بیڈ پر پڑا تھا۔ مکڑیاں میرے بدن پہ تیزی سے جالے بن رہی تھیں۔ اندھیرے میں سنہری رنگ رینگ کر دور دور تک لہروں کے انداز میں متحرک تھا۔ میرے بدن میں کھنچاؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ یہ معمولی جالے نہیں ہوتے مسٹر ضیاء۔ ان جالوں کو تم

طاقتور ترین چیز سے بھی توڑ نہیں سکتے۔ نہ بہت تیز دھار آلے سے کاٹ سکتے ہو۔"

"ہاں..........! جب وہ ہنسی تھی تو کیا ہوا تھا؟" میں بڑے سلیقے سے اسے ٹوک کر راہ پر لے آیا۔

"ہاں..........! وہ ہنسی.......... اف! اگر اب بھی کسی وقت اس ہنسی کی بازگشت کے بارے میں خیال آ جائے تو بدن میں ستارے ٹوٹنے لگتے ہیں' آنکھوں میں خمار اتر آتا ہے اور ہزاروں انگڑائیاں بدن میں ٹوٹ جاتی ہیں۔" وہ ایک دم چپ ہو کر مجھے دیکھنے لگا۔ پھر کچھ شرمندہ سا ہو کر بولا۔ "معاف کرنا مسٹر ضیاء! تم سوچو گے کہ میں عیاش مردوں کی سی باتیں کر رہا ہوں۔ دراصل مجھے جھجک محسوس ہو رہی ہے' لیکن میں تمہیں جتانا چاہتا ہوں کہ اس کی ہنسی اتنی پُرکشش اور ایسی مقناطیسی ہے کہ انسان کے جذبات کو آسمانوں تک پہنچا کر ہی دم لیتی ہے' خواہ انسان کسی ایسے جنگل کا ہو جس نے صنف مخالف یا صنف نازک کی شکل تک نہ دیکھی ہو' اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکتا۔ اس کی ہنسی نے میرے اندر مکمل مرد کی قیامت خیز تکمیل کی تھی۔ میرا خیال ہے کہ.......... اسے دیکھ کر تو ہر مرد اپنی جان ہی دے دے گا۔ اس کی آواز.......... اس کی ہنسی.........."

اس نے یوں جھرجھری لی جیسے وہ اس ہنسی کو محسوس کر رہا ہے' اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ وہ خوف میں مبتلا نہیں تھا بلکہ عجیب سی سرشاری کی کیفیت تھی جو اسے خمار آلود کر رہی تھی۔ مجھے یہ سب محسوس کرتے ہوئے حیرت ہوئی کیوں کہ زیوسا نے بات تو مجھ سے بھی کی تھی اگر رابرٹ اور جینو کے فون اسی نے اٹھائے تھے تو اس کی ہنسی بھی میں سن چکا تھا اور پھر وہ ہنسی جو میرے گھر میں گونجی تھی' مونیکا کی موجودگی میں۔ میں نے اس میں کچھ ایسی کوئی بات محسوس نہیں کی تھی لیکن اتنا سوچتے ہی میں چونک اٹھا۔ جو کیفیت مونیکا کو دیکھ کر میری ہوئی تھی' سورن سنگھ کچھ اسی قسم کی کیفیت کا ذکر کر رہا تھا۔

مونیکا کو دیکھتے ہی ایک خمار آلود کیفیت نے مجھے بالکل بے حواس کر دیا تھا اور پھر اسی رات میں نے اپنی اس کیفیت کے بارے میں بہت دیر تک' بہت کچھ سوچا تھا۔

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ وہ ہنسی زیوسا کی ہے؟" میں نے اپنے ذہن کو عجیب میٹھی میٹھی سی کیفیت میں ڈوبنے سے بچا کر پوچھا۔

"ہاں..........!" وہ چونک اٹھا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ خالی الذہنی کی سی کیفیت

لہرائی' پھر وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔ پھر بولا تو اس کی آواز میں کافی حیرانی تھی۔ "پتا نہیں'......... لیکن......... لیکن وہ زیوسا ہی تھی۔"

"تمہیں یہ یقین کیوں ہے؟" میں نے اصرار کیا۔ میں بڑے غور سے اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ میرے اصرار کرتے ہی اس کے چہرے پر کچھ ایسے تاثرات پھیل گئے جیسے وہ اچانک کسی ذہنی دباؤ کا شکار ہو گیا ہو۔ اس کی بھنویں تن گئیں' ماتھے پر لکیروں کا جال سا بن گیا۔ ہونٹ ایک دوسرے میں پیوست ہو کر لرزنے لگے۔ دونوں ہاتھ اضطرابی انداز میں اٹھ اٹھ کر گرنے لگے پھر اس نے دائیں ہاتھ کی چاروں انگلیوں کو اپنی دائیں کنپٹی پر رکھ کر دبانا شروع کر دیا۔ اس کے چہرے کی رنگت سرخ ہونے لگی' یوں لگتا تھا' جیسے پورے بدن کا خون سر کی طرف سفر کرنے لگا ہو۔

رابرٹ بھی اس کی اس کیفیت کو دیکھ رہا تھا۔ اب وہ بھی پریشان ہونا شروع ہو گیا پھر اچانک میری جانب پلٹ کر چیخا۔

"تم ٹھیک آدمی نہیں ہو۔" اس نے سورن سنگھ کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ سورن سنگھ اس کے اتنی زور سے چیخنے پر بھی اس کیفیت سے باہر نہیں نکل پایا تھا۔

"تم......... تم خود بھی زیوسا سے کم نہیں ہو۔ تم خدا کی طرف سے بھیجے گئے دوسرے عذاب کی طرح ہمارے اعصاب پر سوار ہو گئے ہو۔ پلیز! خدا کے واسطے! ہمیں چھوڑ دو۔ ہم یقیناً سو برس تک نہیں جئیں گے۔ ہم تو پچاس کیا' پچیس برس تک بھی جی نہیں پائیں گے' دو' تین یا چار برس......... ہم اس عذاب کے عادی ہو چکے ہیں' ہم یہ عرصہ بھی گزار دیں گے مگر تمہاری صورت میں کوئی نیا عذاب ہمیں منظور نہیں ہے۔"

رابرٹ آپے سے باہر ہو گیا تھا۔ وہ بہت زور زور سے چیخ رہا تھا۔

میں جانتا تھا کہ وہ صرف چند لمحوں کے بعد ہی نارمل ہو جائے گا لیکن اس کی یہ اطلاع میرے لئے کافی حیرت انگیز اور مسرت انگیز تھی کہ میں بھی زیوسا سے کم نہیں ہوں۔

یہ آپ اتفاق کہہ لیں کہ میرا اٹھنا بیٹھنا اتنی خراب عورتوں میں نہیں رہا تھا کہ جو برملا میری سحر انگیز شخصیت کے بارے میں رائے دے سکیں بلکہ میں نے تو صرف فرح جیسی چھوئی موئی سی لڑکی سے ہی کچھ باتیں کی تھیں جس میں احتیاط زیادہ اور جذبات کم' خطرات زیادہ اور مفادات کم تھے۔ میں کسی ایسی کیفیت میں کچھ کہنے کا تو سوچ بھی نہیں

سکتا تھا اور اگر اس نے مجھ میں ایسی کسی کیفیت کو محسوس کیا بھی تھا تو ظاہر ہے اس کی شرم مانع رہی ہو گی۔ ہاں' البتہ طبیب مجھے برملا یہ کہہ چکا تھا اور وہ بھی اس نے اپنے چکر ہی میں کہا تھا کہ میں حیرت انگیز طور پر پُرکشش اور سحر انگیز شخصیت کا مالک ہوں۔ مونیکا نے بھی میری اس کشش کا اعتراف کیا تھا۔ مگر یہ دونوں میرے لئے اتنے اہم نہیں تھے کہ میں ان کے کہے کی روشنی میں اپنا تجزیہ کرتا' اس وقت ان دونوں سے قطعی مختلف بات' مختلف لہجے اور مختلف حالات میں کہی ہوئی رابرٹ کی بات نے مجھے زیادہ مسرور کیا۔

"میرا خیال ہے کہ میں چلتا ہوں۔" میں کھڑا ہو گیا۔

سورن سنگھ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔ "کیوں؟"

"رابرٹ کو بہت تکلیف ہو رہی ہے میرے سوالات سے۔" میں نے بے پروائی سے کہا اور کندھے اچکا کر کھڑا ہو گیا۔

"بکواس مت کرو۔" سورن سنگھ کی بجائے رابرٹ چلایا۔

وہ غصے سے پاگل ہو رہا تھا' میرا جی چاہا کہ اس طریقہ کلام پر اس کا منہ پھیر دوں مگر میں نے خود پر ہمیشہ کی طرح کنٹرول کر لیا تھا۔ دراصل آپ کو بتا ہی دوں۔ یہ میرا طریقہ واردات کہہ لیں۔ آدمی کو اگر غصہ دلا دیا جائے تو اس کی وہ مخفی قوتیں جو چالاکی پر منتظم ہوتی ہیں اور اسے ہدایات دیتی جاتی ہیں کہ یہ نہ بتاؤ' یہ غلط ہے یا اسے نہیں بتانا' وہ غصے کو کنٹرول کرنے میں لگ جاتی ہیں' سنسر اس طرف سے ہٹ جاتا ہے۔ ایسے میں کوئی بھی شخص اصل بات' اپنے اصل محرکات کے ساتھ بتاتا چلا جاتا ہے۔ میرے لئے آسانی ہو جاتی ہے مگر یہاں میں ناکام رہا تھا' میری باتوں اور حرکتوں سے رابرٹ کو تو غصہ آ رہا تھا مگر سورن سنگھ نارمل تھا۔ وہ کافی مضبوط اعصاب کا بہت طاقتور آدمی تھا۔ فون پر جس سکون کے ساتھ اس نے میری بات سنی تھی اور جس رویے کا مظاہرہ کیا تھا' وہ اسے مضبوط ثابت کر رہے تھے۔

"رابرٹ!" اس نے اب رابرٹ کو سنبھالا۔ "میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم......... تم اتنے اپ سیٹ کیوں ہو۔ تم خود ہی تو کہہ رہے ہو کہ ہم ان حالات کے عادی ہو چکے ہیں پھر بھی......... پھر بھی تمہارا یہ اضطراب اور اس قدر بے چین رویہ کیوں ہے۔ مسٹر ضیاء جو کچھ پوچھنا چاہتے ہیں' ہم اس کی اجازت دے چکے ہیں اور غالباً اپنے ہی مفاد میں ایسا کر رہے ہیں۔ ہم......... پھر اس قدر چراغ پا ہونے کی کیا ضرورت

ہے۔ کیا تم چاہتے ہو کہ جینو اسی طرح رو رو کر مر جائے۔ میں.......... میں تو اس کی طرف سے بہت پریشان ہوں۔ اس وقت اگر کوئی یہ کہے کہ وہ ہم میں سے صرف جینو کو اس اذیت سے بچالے گا تو میں اس کی ہر بات ماننے کو تیار ہوں۔"

اس پوری گفتگو نے رابرٹ کو سمندر کے جھاگ کی طرح بٹھا دیا تھا۔ سورن سنگھ کا لب و لہجہ متاثر کن تھا۔ وہ اندر اترتا جاتا تھا۔ اگر اس حالت کو نہ پہنچا ہوتا تو یقیناً بہت کامیاب بزنس مین ہوتا۔

"سوری مسٹر ضیاء!" اب وہ میری طرف مڑا۔ "آپ رابرٹ کی ذہنی کیفیت کو نظرانداز مت کیجئے گا۔ وہ بہت پریشان ہے۔ میں رابرٹ کی طرف سے اس کے رویے پر.........."

"نہیں مسٹر سورن سنگھ!" میں نے ہاتھ اٹھا کر اس کی بات کاٹ دی۔ "مجھے اندازہ ہے اور میں اسی لئے ان کی بات کا برا بھی نہیں مانتا۔ آپ جینو کے بارے میں کچھ کہہ رہے تھے۔" میں پھر ان کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"ہم اسے بچانا اپنی پہلی ذمہ داری سمجھتے ہیں مسٹر ضیاء! وہ معصوم صرف ہماری وجہ سے پھنس گیا ہے۔ ہم تو اپنی زندگیاں گزار چکے ہیں مگر اس نے تو ابھی نوجوانی میں ہی قدم رکھا تھا۔ اس کے ساتھ جو کچھ ہم کر چکے ہیں وہ بڑا ظلم اور بے حد سفاکی ہے۔ میں شاید اس لئے اس اذیت ناک قید کو اور ان جالوں کی جکڑن کو برداشت کر رہا ہوں کہ میرے نزدیک میرے ضمیر کی دی ہوئی سزا سے یہ سب کچھ بہت کم ہے۔"

میں نے اس وقت سورن سنگھ میں بڑی عظمت محسوس کی مگر جلد ہی خود کو یاد دلایا کہ یہی وہ شخص تھا جس نے دولت کے حصول کے لئے ایک اکیلی عورت کے قتل کے ڈرامے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

"ہم جینو کو بچانے کے لئے کیا کر سکتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"کاش! وہ.......... زیوسا.......... وہ جو بھی ہے' میرے سامنے آ جائے تو میں اس کے پیر پکڑ کر جینو کو مانگ لوں۔" سورن سنگھ نے بھیگے ہوئے لہجے میں کہا۔

"یہ کام آپ ایلن سے نہیں کروا سکتے؟"

"نہیں.......... ! وہ اس سلسلے میں معذوری ظاہر کر چکی ہے۔ اس کی صرف ایک ہی شرط ہے کہ وہ زنجیریں ہم اس کی قبر پر پہنچا دیں تو وہ سب کو نجات دلا دے گی۔"

"ہوں.........!" میں نے پُرسوچ انداز میں ہنکارا بھرا۔ زنجیریں میں ان لوگوں کو دے سکتا تھا۔ یہ لوگ اسے اس کی قبر تک بھی پہنچا سکتے تھے مگر اس سے کیا ہوتا؟ وہ حادثے جو میرے خاندان میں یا میرے علاقے میں گزر چکے تھے' ان کا کیا مداوا تھا۔ تایا جی' بابا' بڑی بوا' تحسین خالہ اور بی جان کے منشی کی بیٹیاں' مبشر.......... یہ سب کس کھاتے میں جاتے۔ ایلن یا زیوسا کے باپ کا راج تھا کہ اس نے جس کو چاہا اسے یوں موت کی ہولناکیوں میں دھکیل دیا' صرف اس لئے کہ سونے کی وہ زنجیریں اس کی قبر میں پہنچا دی جائیں۔ میرے اندر لاوا سا ابلنے لگا۔ میں جو بڑے خلوص سے ان لوگوں کی مدد کے لئے نکلا تھا' اچانک ہی اُلٹ گیا۔ میں نے ان سب کے خلاف ایک دم اپنے اندر نفرت محسوس کی۔ انہی لوگوں کی وجہ سے میرے ابا موت کے حق دار ٹھہرے تھے' انہی کی وجہ سے تحسین خالہ جدا ہوئیں اور فرحت ایسی معصوم لڑکی دنیا میں تنہا رہ گئی۔ ان ہی لوگوں کی وجہ سے میرے دادا نے اس بڑھاپے میں دو جوان بیٹوں کے لاشے اٹھائے تھے۔ انہی کی وجہ سے ہم میرٹھ چھوڑنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

"مسٹر ضیاء! تم کن سوچوں میں ہو۔" یہ رابرٹ تھا' اس نے مجھے چونکا دیا تھا۔

"ہاں.........! ہاں.........! میں سوچ رہا تھا کہ تم لوگوں کی سفاکیوں کی سزا کتنے معصوم لوگوں نے بھگتی ہے۔ ایسے لوگ جنہیں تم جانتے تک نہیں' نہ کبھی تم لوگوں کو ان کا خیال ہی آیا ہو گا۔"

"وہاٹ ڈو یو مین بائی دیٹ!" سورن سنگھ نے کچھ حیرانی سے کہا۔

"مسٹر سورن سنگھ! آئی مین کہ تم میری تحسین خالہ کو نہیں جانتے۔ تم مبشر سے بھی واقف نہیں ہو۔ تم میری نانی کے منشی کی دو جوان سال بیٹیوں سے بھی نہیں ملے۔ تم میرے تایا کو بھی نہیں جانتے۔ تم بڑی بوا سے بھی یقیناً ناواقف ہو۔ تم مرنے والوں میں سے صرف عطاء الرب رضوی کو جانتے ہو اور یقیناً ان کی موت پر تم لوگوں نے یہ سوچ لیا کہ یہ ہمارے ساتھ شریک جرم تھا اس لئے مارا گیا۔ ٹھیک ہے ناں! لیکن مسٹر سورن سنگھ! یہ تمام اموات ہمارے خاندان میں ہوئی ہیں۔ آدمی معذور ہو کر جیتا بھی ہے تو وہ موت سے بدتر حالت میں ہوتا ہے مگر وہ لوگ.......... جنہیں تمہاری ایلن نے محض اس لئے اپنا شکار بنا ڈالا کہ وہاں ان لوگوں کے قریب ہی کہیں وہ زنجیر تھی۔ مگر ان لوگوں کا قصور کیا تھا؟"

"مسٹر ضیاء! تھوڑا قصور تمہارا تھا۔ تم نے وہ زنجیر چرا کر........"

"ایک منٹ مسٹر رابرٹ! تم مجھے الزام نہیں دے سکتے۔ اس لئے کہ میں نے وہ زنجیر دولت کے حصول کے لئے نہیں چرائی تھی۔ وہ میرا معصومیت سے بھرپور ایک ایسا جرم تھا جس کی سزا صرف والدین تو دے سکتے ہیں مگر تمہاری یہ شہزادیاں........ جن کے تم پیر پڑنے کو تیار ہو........ جن کی قید میں رہ کر تم لوگ بے بسی سے ان کے قہقہے سنتے ہو اور ان کے آگے گڑگڑاتے ہو' یہ مجھے یا میرے خاندان کو سزائیں دینے کی حقدار نہیں تھیں۔ میں........ میں ان دونوں سے اپنے خاندان کے ہر حادثے اور ہر حادثے سے ہونے والے ہر نقصان کا بدلہ لوں گا۔"

"مسٹر ضیاء! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

رابرٹ حیرت سے میری صورت دیکھ رہا تھا۔ "مسٹر سورن سنگھ! کیا یہاں پینے کے لئے پانی مل سکے گا؟" آخری جملہ اس نے سورن سنگھ سے کہا تھا۔ میں نے دیکھا' سورن سنگھ کے چہرے پر انتہائی لاچاری اور بے بسی چھائی گئی۔ اس نے شرمندگی سے ادھر ادھر دیکھ کر سر جھکا لیا۔ اب رابرٹ میری طرف دیکھ رہا تھا۔ سورن سنگھ کی حالت دیکھ کر میرے حلق سے ایک زوردار قہقہہ ابل پڑا اور پھر میں ہنستا ہی چلا گیا۔ وہ دونوں حیرت سے منہ کھولے مجھے تک رہے تھے۔

"مسٹر ضیاء! کیا تم وہی ضیاء نہیں ہو جو ہماری مدد کرنے کے لئے گھر سے نکل کر ہمیں ڈھونڈتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا؟" رابرٹ اب میرے قریب آ کر اپنے لمبے سے ہاتھ سے میرے کاندھے کو چھو کر کہہ رہا تھا۔

"ہاں! ہاں! میں تو وہی ضیاء ہوں مگر میں تمہاری مدد کے ساتھ ساتھ ان اموات کا بدلہ بھی لینا چاہتا ہوں۔ کیا تم لوگ نہیں چاہتے کہ اپنی اس معذوری' بے بسی اور لاچاری کا بدلہ لو!"

"مسٹر ضیاء!" اس بار سورن سنگھ بولا۔ اس کی آواز میں خوف تھرتھرا رہا تھا۔ "تم بہت ہولناک باتیں کر رہے ہو۔ ہم نجات پا جائیں' یہ بہت ہے۔ بدلہ لینے کا تو تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

"تم ہو گئے اس قدر بزدل........ مسٹر سورن سنگھ اور مسٹر رابرٹ' میں نہیں........ میں ان دونوں کو اپنے قدموں میں ناک رگڑ کر معافی مانگنے پر مجبور کر دوں

گا۔ جو کھیل تم لوگوں نے شروع کیا اور جو کھیل یہ دونوں رچا رہی ہیں' ان کی حقیقت مجھ سے مخفی رہ نہیں سکتی۔"

"مسٹر ضیاء!" سورن سنگھ کچھ حیران ہوا۔ "کہیں تم کسی شدید غلط فہمی کا شکار تو نہیں ہو رہے ہو!"

"نہیں........! بلکہ کچھ حقیقتوں کا ادراک تو مجھے ابھی ابھی........ یہیں پر ہوا ہے۔"

"مسٹر ضیاء! دوسروں کو صاف اور سیدھی بات کہنے کے لئے بار بار ٹوکنے کے باوجود تم خود صاف اور سیدھی باتوں سے کترا رہے ہو۔" رابرٹ بھی اب کچھ خوفزدہ تھا۔

"صاف اور سیدھی بات یہ ہے میرے دوستو! کہ وہ دونوں زنجیریں میرے پاس موجود ہیں اور اب تم لوگ اپنی ایلن سے کہہ دینا کہ اگر اس میں ہمت ہے تو وہ ان دونوں زنجیروں کو حاصل کر لے اور اگر خود حاصل نہ کر سکے تو کسی سورما کو بھیج دے۔ اب جھگڑا اس کا اور میرا ہے۔ اسے اپنی روح کے سکون کے لئے وہ زنجیریں چاہئیں تاکہ وہ مرنے کے بعد بھی دنیا میں خوار نہ پھر سکے۔ اور وہ زیوسا! یہ پردہ نشین جو بھی ہے' اب مجھ سے ٹکر لے۔"

واقعی سیما! میں نہیں جانتا تھا کہ لمحوں میں میرا دماغ اس قدر کیوں الٹ گیا تھا۔ میں نے تو کبھی' اس سے پہلے اس طرح' اس موضوع پر سوچا تک نہیں تھا بلکہ میں نے اپنے ابا جی کو قصور وار جانتا تھا۔ مجھے دادا نے بھی یہی بات باور کرائی تھی مگر جانے اس وقت میرے اندر کون تھا جو یہ سب کہتا چلا گیا پھر اچانک میں سیدھا رابرٹ کی طرف بڑھا۔ "مسٹر رابرٹ! کیا تم وہ پتھر مجھے دینا پسند کرو گے؟"

پتھر کا نام سنتے ہی رابرٹ کا سفید ہوتا چہرہ بالکل لٹھے کی طرح کا ہو گیا۔ "کک........ کیوں........؟ کیوں مسٹر ضیاء!" اس کی آواز خوف سے پھٹ رہی تھی۔ مجھے اس پر ترس آ گیا۔

"ٹھیک ہے........! اسے تم رکھو۔ اگر چاہو تو اس سے تم جینو کی مدد بھی کر سکتے ہو۔" میں یہ کہتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ "مسٹر رابرٹ! میں جانا چاہتا ہوں۔ تمہیں گھر چھوڑ دوں یا تم لوگ ماضی کے سنہرے دنوں کی یادیں تازہ کرو گے!"

"نہیں........! میں گھر سے باہر نہیں رہ سکتا۔" وہ جلدی سے صوفے سے نیچے

اتر آیا۔

سورن سنگھ نے بھی کلائی میں بندھی گھڑی دیکھی۔ "اوہ جاؤ! تم لوگ چلے جاؤ۔ وقت کم ہے۔" وہ حواس باختہ ہو گیا۔

"کیوں! کیا وہ.......... زیوسا آنے والی ہے؟"

"پلیز! مسٹر ضیاء! تم بچپنے کی سی حرکتیں کر رہے ہو۔ میں تمہیں وارننگ دیتا ہوں کہ محتاط رہو ورنہ کل تمہیں پچھتانے کا بھی موقع نہیں ملے گا۔"

"میں ایسے مواقع خود پیدا کر لیا کرتا ہوں مسٹر سورن سنگھ! میرا نظریہ زیست ذرا دوسری قسم کا ہے۔"

"تمہاری مرضی.......... لیکن.......... میں سمجھا نہیں کہ تم یہاں تک کیوں آئے تھے، تم ہم سے مل کر، کیا چاہتے تھے۔ دوسری بات یہ کہ آنے والے مسٹر ضیاء اور اس وقت جانے والے مسٹر ضیاء میں زمین آسمان کا فرق کیوں ہے؟ ایسا کیوں ہے، میں سمجھنے سے قاصر ہوں۔ بہرحال، میں اس سلسلے میں زیادہ بحث نہیں کروں گا، صرف تنبیہہ کروں گا کہ ایسی غلطی کو نہ دہرانا جس کا ازالہ تمہارے اور تمہارے خاندان کے لئے مشکل ترین ہو جائے۔"

"نصیحت کا شکریہ مسٹر سورن سنگھ!" میں کھڑا تو تھا ہی، میں نے مصافحے کے لئے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا، جسے اس نے بڑی نرمی سے تھام لیا۔ اس کے ہاتھ کے ملائم لمس اور دھیمی حرارت نے ایک بار پھر میرے دل میں نرمی پیدا کی۔ مجھے افسوس ہوا کہ میں نے بڑی سفاکی سے کام لیا ہے۔ مگر دوسرے ہی لمحے میں خود پر قابو پا چکا تھا۔ میں اپنے اندر تضاد کی اس کیفیت کا ایک بار نہیں کئی بار شکار ہوا تھا اور ایسے میں میری قوت فیصلہ ختم ہو جاتی تھی۔ اس وقت بھی میں ہر دو جانب سے آنے والے جذباتی طوفان میں گھرا ہوا تھا۔

سورن سنگھ ہمیں چھوڑنے دروازے تک نہیں آیا بلکہ وہیں اس نے رابرٹ سے الوداعی جملے کہے، رابرٹ نے وعدہ کیا کہ وہ ضرور آئے گا یا پھر کم از کم فون پر رابطہ رکھے گا۔ رابرٹ نے سورن سنگھ سے میرے سامنے ہی یہ بھی کہا کہ وہ میرے رویے پر زیادہ افسردہ نہ ہو کیوں کہ رابرٹ مجھے منا لے گا اور یہ بھی کہ میں دل کا اتنا برا آدمی نہیں ہوں جتنا زبان کا۔

مجھے اس کے اس طرح بہلانے پر ہنسی بھی آئی مگر میں ہنسا نہیں۔

☆----------☆----------☆

جب ہم اس عمارت سے باہر نکلے تو دور تک گھپ اندھیرا تھا۔ سڑک کے دونوں اطراف کھڑے لمبے لمبے اونچے درخت قطعی ساکت تھے۔ ان کے پیچھے خودرو جھاڑیاں تھیں جو دم سادھے کھڑی تھیں۔ بڑا حبس تھا۔ سیاہ چمکیلی سڑک کسی سیاہ ناگ کی کینچلی کی طرح پیروں کو گدگداتی سی محسوس ہوئی۔ یہ خیال مجھے جانے کیوں آیا تھا پھر یوں لگا جیسے وہ واقعی سیاہ چمکیلی کھال والا کوئی زہریلا ناگ ہے جو اب پلٹے گا اور میری پنڈلی پر ڈس لے گا۔ اس کے چلنے کی سرسراہٹ میرے اندر دھیرے دھیرے خوف پیدا کر رہی تھی۔ میری رفتار دھیمی ہو گئی۔ آگے جاتی سڑک کے پلٹ کر ڈس لینے کا خوف مجھ پر حاوی ہو رہا تھا۔

"مسٹر ضیاء! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم نے اپنا سابقہ ارادہ کس بنیاد پر تبدیل کیا ہے؟"

رابرٹ کی آواز نے مجھے ایک دم چونکا دیا۔ میں تھم گیا۔ وہ مجھ سے ایک قدم پیچھے گھسٹ رہا تھا اور پھر میں اپنی مضحکہ خیز سوچ پر بے ساختہ ہنس دیا۔ وہ جو سرسرانے کی سی آواز مجھے خوفزدہ کر رہی تھی' وہ تو رابرٹ کے گھسٹنے کی آواز تھی اور پھر سڑک تو سڑک تھی' بھلا ناگ اور سڑک کا کیا تعلق؟ میں ایک بار پھر زور سے ہنس پڑا۔ رابرٹ اب میرے بالکل برابر میں آ چکا تھا۔ وہ حیرت سے منہ اٹھائے بلکہ کاندھوں پر سر کو ایسے رکھے کہ اس کا رخ آسمان کی طرف تھا۔ اپنی گول گول آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

"کیا میں سمجھ لوں مسٹر ضیاء کہ تم بھی ایلین کے کسی سحر میں جکڑے جا چکے ہو یا میں یہ سمجھوں کہ عطا نے جان بوجھ کر وہ زنجیریں ہم لوگوں سے لے کر اپنی اولاد کے حوالے کر دیں اور اولاد کو دنیا بھر کی آسائشوں سے مالا مال کر دینے کی خواہش موت کے سامنے بھی نہیں ہارتی اور ممکن ہے کہ اسے اپنے یوں مارے جانے کا یقین ہی نہ ہو۔ کیا تم اپنے باپ کی لالچ میں حصے دار ہو؟"

"بکواس بند کرو۔" اس نے مجھ غصہ دلا دیا تھا۔ "میں اپنے باپ کی طرح لالچ نہیں

کرتا۔ میں تم لوگوں کی طرح نہ دولت کے حصول کے لئے قتل کر سکتا ہوں اور نہ دولت میرے لئے اتنی اہم ہے کہ میں دوسرے بہت سے معصوم لوگوں کو اپنی ہوس کی بھینٹ چڑھا دوں۔ میں تمہاری مدد ہی کرنا چاہتا تھا مگر بھول گیا تھا کہ تمہاری اس ایلین کی پُراسراریت سے جن لوگوں کا کوئی تعلق نہیں تھا انہیں اپنا شکار بنانے کا اسے حق نہیں تھا۔ میں اس کے آگے کیوں جھکوں گا۔ تم لوگوں کے جھکنے کا تو جواز ہے مسٹر رابرٹ! مگر میں......... میں ان دونوں کو اپنے پیر پکڑنے پر مجبور کرنے کے بعد ان کی امانت ان کے حوالے کروں گا اور رہی ایلین کے سحر میں جکڑ جانے والی بات' تو کان کھول کر سن لو مسٹر رابرٹ! میں انہیں چیلنج کرتا ہوں کہ اگر ان میں دم ہے تو مجھے اپنے سحر میں جکڑ کر دکھا دیں۔ میں وہ زنجیریں ایلین کی قبر میں نہیں پہنچنے دوں گا۔ اب وہ تاقیامت یونہی خلاؤں میں ڈولتی پھرے گی۔ بغیر بدن لئے۔ کسی کے سامنے دو چار منٹ بیٹھنے کی ہمت بھی نہ کر سکے گی۔ بہرحال تم لوگ پریشان نہ ہو۔ میں تمہیں جو پتھر دے چکا ہوں وہ تمہارے کام آئے گا۔"

"مگر پرکاش' جیتو اور سورن سنگھ کے علاوہ........" رابرٹ نے کچھ کہنا چاہا۔

میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "ان لوگوں کے لئے بھی کچھ ایسا ضرور کروں گا کہ وہ اس کی چیرہ دستیوں سے محفوظ رہیں مگر....... یہ زنجیریں....... یہ میں اب اسے نہیں دوں گا۔ کسی کو بھی نہیں دوں گا۔"

"مگر ضیاء.........! کیا تم ہم سب کی حالت سے ذرا سی بھی عبرت پکڑنے کو تیار نہیں ہو؟" اس کی آواز میں تشویش تھی۔

"نہیں.........! میرا خیال ہے کہ میں اس کے اس سحر سے جلد ہی نجات پا لوں گا اور اپنے گرد ایسا حصار کھینچ لوں گا کہ اسے عبور کر کے مجھ تک پہنچنا اس کے لئے خطرناک ہو گا۔"

"کیا.........؟ کیا تم ایسا کر سکتے ہو؟" وہ ایک دم لڑھک کر میرے سامنے آ گیا۔ اس نے اپنے لمبے لمبے ہاتھوں سے میری پنڈلیوں کو تھام کر روک لیا۔

"ہاں.........! ایسا کرنا کچھ ایسا مشکل نہیں ہو گا۔ میں ایسی بہت سی چیزیں جانتا ہوں جن سے آدمی اپنے گرد مضبوط حصار کھینچ سکتا ہے۔"

"تو پھر......... تم ہمیں محفوظ کر سکتے ہو مسٹر ضیاء۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم اپنے

گرد حصار بنانے سے پہلے ہمیں محفوظ کر دو!"

"تم بہت خود غرض ہو مسٹر رابرٹ!" میں زور سے ہنسا۔ "بہرحال میں جلد ہی جینو اور پرپاس کے علاوہ پرکاش کے لئے بھی کچھ کروں گا اور ہاں! تم کوئی سادھو' سنت یا پیر مت سمجھ لینا۔ اس کے لئے میں شالی بابا کو تلاش کروں گا۔"

باتیں کرتے کرتے ہم کافی سڑک عبور کر چکے تھے مگر یوں لگتا تھا جیسے یہ سڑک شیطان کی آنت کی طرح لمبی ہو گئی ہے۔ پوری سڑک ویسی کی ویسی ہمارے سامنے موجود تھی۔ وہی کنارے لگے اونچے درخت' وہی ان کے پیچھے دور تک پھیلی خودرو جھاڑیاں۔ وہی ساکت ہوا' وہی حبس اور وہی سناٹے میں رابرٹ کے گھسٹنے کی آواز۔ چاروں طرف کا سین ذرا بھی نہیں بدلا تھا۔

"مسٹر رابرٹ!"

"ہوں!!!" وہ شاید کسی گہری سوچ میں تھا۔

"یہ سڑک.......... کہاں تک جاتی ہے اور یہاں سواری کہاں ملے گی؟"

"اوہ! ہم غلط آ گئے ہیں۔ ہمیں دائیں طرف آنے والی ذیلی سڑک پر مڑنا تھا۔" اس نے جواب دیا۔

"میں نے کوئی ذیلی سڑک نہیں دیکھی۔"

"ہم نے شاید باتوں میں کچھ خیال نہیں کیا۔"

"پھر.......... کیا تمہارے اندر اتنا دم ہے؟"

"نہ بھی ہو گا تو کیا کروں گا۔ میں زندگی سڑک پر گزار سکتا ہوں مگر اس دنیا میں رہنے والی مخلوق کو خوفزدہ نہیں کر سکتا۔" اس نے پلٹتے ہوئے کہا۔ "چلو! ہمیں واپس جانا ہو گا۔ یہ سڑک تو شاید جہنم تک یونہی چلتی چلی جائے گی۔"

میں ہنس کر پلٹ گیا۔ میں تو بہت چل سکتا تھا۔ میرا تو اب پیر بھی زخمی نہیں تھا۔ بدن جوان اور توانا تھا مگر رابرٹ کے لئے ایک گٹھڑی نما وجود کو گھسیٹنا یقیناً محنت طلب کام ہو گا۔

پھر ہمیں تقریباً کئی فرلانگ تک لوٹنا پڑا۔ ہم واقعی باتوں میں وہ ذیلی سڑک دیکھے بغیر آگے بڑھ گئے تھے۔ اس ذیلی سڑک سے آگے بڑھتے ہی کچھ ہی فاصلے پر ہمیں ایک ٹیکسی مل گئی۔ ٹیکسی والا نیم تاریکی میں رابرٹ کو آگے بڑھتے دیکھ کر اچھل پڑا تھا مگر جب میں

نے اسے تسلی دی تو وہ خوفزدہ ہونے کے باوجود بھی چلنے کو تیار ہو گیا۔ راستے بھر میں خاموش رہا اور رابرٹ بھی ٹیکسی والے کا رد عمل دیکھ چکا تھا اس لئے خاموش ہی رہا۔ میں نے اسے عمارت کے دروازے پر اتارتے ہوئے کہا۔

"میں جلد تم سے رابطہ کروں گا۔"

"کیا تم شالی بابا سے مل لینے کے بعد رابطہ کرو گے؟" اسے ساری احتیاط بالائے طاق رکھ کر بولنا پڑا۔ میں نے دیکھا ٹیکسی والے کے بدن میں جھرجھری سی چھوٹ گئی تھی۔

"نہیں......! شالی بابا سے تو جانے کب ملاقات ہو' میں تم سے جلد رابطہ کروں گا۔ میں جینو اور پرپاس کے علاوہ پرکاش کو بھی تلاش کر لینا چاہتا ہوں۔"

"مسٹر ضیاء! مجھے امید ہے کہ تم میرا ساتھ دو گے تو ہم سب اکٹھے ہو جائیں گے۔"

"اوکے!" میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے الوداع کہا تو اس نے ٹیکسی کا کھلا دروازہ چھوڑا اور خود سرک کر پیچھے ہو گیا۔ میں نے دروازہ بند کیا پھر ٹیکسی والے کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "چلو بھیا!"

ٹیکسی والے نے گاڑی اسٹارٹ کی اور پھر خوفزدہ آواز میں بولا۔ "صاحب! انہیں کیا ہوا ہے..........؟"

"ہاں بھیا!" میں نے گہرا سانس لیا۔ "بس! اللہ جیسے چاہے۔"

اور نہ آگے میں نے ہی کچھ کہا اور نہ اس نے پوچھا۔ بس ٹیکسی کی رفتار بڑھا دی۔ ہم گھر کے دروازے پر پہنچے تو رات کے ساڑھے بارہ کا عمل تھا۔ مجھے بہت حیرت ہوئی' میرا خیال تھا کہ ابھی مشکل سے ساڑھے دس ہی بجے ہوں گے یا زیادہ سے زیادہ گیارہ بجے ہوں گے۔ میں نے ٹیکسی والے کو پیسے ادا کئے۔ گیٹ کی طرف بڑھا ہی تھا کہ طیب اور وہ دونوں گیٹ کھول کر آگے بڑھے۔ وہ دونوں میرے منتظر تھے۔ گیٹ کے دونوں طرف لگے بلب روشن تھے اور جب طیب اس روشنی کے قریب پہنچا تو میں اسے دیکھ کر دہل کر رہ گیا۔ اس کے چہرے کے نقوش خوف یا کسی افتاد کی وجہ سے مسخ ہو رہے تھے۔

"کیا ہوا طیب؟" میں لپک کر اس کے قریب پہنچ گیا۔

"ضیاء تم.......... تم تو ٹھیک ہو نا!" وہ مجھے ٹٹول رہا تھا۔

"ہاں! میں بالکل ٹھیک ہوں' تمہیں کیا ہوا ہے؟"

یہ جب سے آئے ہیں بھیا جی! تب سے یہیں کھڑے ہیں۔ میں بھی انہی کی وجہ سے یہیں ٹکا رہا۔ سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ اندر جاؤں یا باہر رہوں۔" ایاز نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

"آؤ اندر!" میں نے طیب کو کندھے سے تھام لیا پھر بازو اس کی گردن کے گرد حمائل کر کے اسے لئے اندر اس کے کمرے تک چلا آیا۔ ایاز پیچھے پیچھے تھا۔ "ارے ایاز! طیب نے کھانا تو نہیں کھایا ہو گا۔" میں نے چلتے چلتے رک کر پوچھا۔

"نہ بھیا! بتایا تو.......... جب سے آئے تھے' وہیں کھڑے تھے۔"

"تو چلو! جلدی سے کھانا لگاؤ۔ خود میری بھی بھوک سے بری حالت ہے۔"

میں طیب کے کمرے میں آ گیا۔ میں نے ساری بتیاں روشن کر دیں۔ طیب پر نگاہ پڑی تو وہ حیرت سے میرے پیروں کو دیکھ رہا تھا۔ تبھی مجھے احساس ہوا کہ پیر کی تکلیف ختم ہونے کے بارے میں' میں اسے کچھ بھی نہیں بتا سکا تھا۔ جب میں دن میں رابرٹ کے گھر سے لوٹا تھا تو وہ گھر پر نہیں تھا۔ میں سو گیا اور جب اس نے مجھے اٹھایا تو وقت نہیں تھا' ہم دونوں ہی بھاگتے ہوئے نکل گئے تھے۔

"اوہ ہاں.......... طیب.......... ! یہ.........." میں نے چاہا کہ فی الوقت کوئی ایسی بات بتا دوں جو اس کے خوف میں اضافہ نہ کر سکے مگر میں اس کی سرگوشی سن کر سناٹے میں رہ گیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"ہاں.......... ! تمہیں کوئی تکلیف نہیں رہے گی۔" وہ کسی ہپناٹائز کیے ہوئے آدمی کی طرح بولا تھا۔ "مجھے بتا دیا ہے اس نے۔"

"طیب.......... ! طیب..........؟" میں نے اسے کاندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ دیا۔

"تم ہوش میں تو ہو! کس کی بات کر رہے ہو!"

"آں..........؟" پہلے تو وہ چونکا پھر اس نے آنکھیں میرے چہرے پر گاڑ دیں۔

"کیا کہہ رہے ہو؟"

"ہاں! تمہاری کوئی گرل فرینڈ ہے زیوسا! اس نے فون کیا تھا۔"

"زیوسا!! میری گرل فرینڈ؟" صرف لمحہ بھر کو میں الجھا اور پھر اچھل پڑا۔ "!!

زیوسا! اور کیا کہہ رہی تھی۔ کب کیا تھا فون؟" میں جو باتھ روم جانے کے لئے تیار تھا' کرسی گھسیٹ کر بیڈ کے سامنے بیٹھا اور بیٹھتے ہوئے میں نے طیب کے دونوں کاندھوں پر ہاتھوں کا دباؤ ڈال کر اسے بھی اپنی سامنے بٹھا دیا تھا۔

"میں تمہیں چھوڑ کر گھر میں داخل ہی ہوا تھا کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے فون اٹھا لیا اور پھر میں نے دنیا کی سب سے حسین اور پرکشش آواز سنی۔"

وہ دھیرے دھیرے اپنے مخصوص انداز کو اپنا رہا تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو شاید میں جھنجلا کر اسے برا بھلا کہتا مگر میں نے محسوس کیا کہ خوف کی جو کیفیت اس پر طاری تھی وہ کم ہو رہی ہے تو میں بے ساختہ مسکرا دیا۔

"لیکن! میں پریشان ہو گیا تھا۔ اس نے کچھ اس انداز میں تمہاری تکلیفوں کا ذکر کیا کہ مجھے لگا' میں نے تمہیں وہاں چھوڑ کر اچھا نہیں کیا۔ ایک تو وہ رابرٹ.......... اسے دیکھ کر ہی میری جان نکل گئی تھی۔ وہ تو خود کسی مدد کا محتاج ہے' وہ بھلا کسی ایسی ویسی بات میں تمہاری کیا مدد کرتا۔ وہ بار بار مجھے ایسے تسلی دے رہی تھی جیسے تمہیں وہ مجھ سے زیادہ جانتی ہے۔ مجھ سے زیادہ تمہارے قریب رہتی ہے اور تمہاری سب سے بڑی ہمدرد ہے۔ اس کی ساری گفتگو سے یہ تاثر مل رہا تھا کہ تم جس جگہ گئے ہو' وہ تمہارے لئے بہت خطرناک جگہ ہے اور اگر تم ٹونے پھونے داخل ہو تو میں قطعی پریشان نہ ہوں کیونکہ وہ خود تمہاری کوئی تکلیف برداشت نہیں کر سکتی اور اس نے کل رات لگے ہوئے گہرے زخم کو بھی اس طرح بھر دیا ہے جیسے کبھی زخم لگا ہی نہیں تھا لیکن ضیاء! وہ یہ تاثر کیوں دے رہی تھی کہ تم ضرور ٹونے پھونے ہی داخل ہو گے۔"

میں کیا جواب دیتا' سو ہنس دیا۔ "میں نہیں جانتا.........." میں نے کندھے اچکائے۔

"بھیا صاحب! کھانا لگا دیا ہے۔" ایاز نے دروازے سے اندر منہ ڈال کر کہا اور الٹے قدموں لوٹ گیا۔

"کیا مطلب؟" وہ کھو جانے والے انداز میں بولا۔

"یار! پہلے تو ہاتھ منہ دھونے دو۔ بھوک سے آنتیں دکھ رہی ہیں۔ کھانے کے بعد بھی بات ہو سکتی ہے۔" میں نے باتھ روم کی طرف جاتے ہوئے آستین چڑھاتے ہوئے جواب دیا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم کھانے کی ٹیبل پر تھے۔ کافی دیر تک تو ہم دونوں خاموشی سے

کھانا کھاتے رہے مگر اب مجھے لگ رہا تھا کہ اگر طیب کو بولنے کی اجازت نہ دی تو اس کی کرسی ضرور بدلنا پڑے گی۔ اس کی کرسی کی تمام چولیں ہل چکی تھیں اور اب وہ موسیقی کے کئی سر بیک وقت نکال رہی تھی۔ لگتا تھا' جیسے نوالہ وہی چبا رہی ہو' ایسی ہی آواز آ رہی تھی۔ یہ سوچ کر میں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور بولا۔ "ہاں! اب بولو۔"

"یہ زیوسا کون ہے؟" اس نے یوں جواب دیا جیسے گولی چلائی ہو۔

"میں اسے نہیں جانتا۔" میں نے صاف گوئی کے ساتھ جواب دیا۔

"یعنی؟"

"یعنی یہ کہ میں زیوسا نامی کسی لڑکی یا عورت سے واقف نہیں ہوں البتہ اس سے قبل غالباً میں نے تمہیں بتایا تھا کہ یہاں ایک فون آیا تھا' جب میں رابرٹ سے مل آیا تھا اور میں نے باقی لوگوں کو بھی کانٹیکٹ کرنے کی کوشش کی تھی تب ایک فون آیا تھا۔ کسی زیوسا نامی عورت نے میرا نام لے کر مخاطب کیا تھا اور کہا تھا کہ میرے لئے بہتر یہی ہے کہ میں یہاں سے چلا جاؤں۔"

"کیا اس عورت کا تعلق بھی چچا صاحب کی موت والی پُراسراریت ہی سے ہے؟"

"یار! میں پوری کہانی سنا چکا ہوں۔ تم اپنی یادداشت کا کچھ علاج کیوں نہیں کرتے۔" میں جھنجلا گیا۔

"اوہ ہاں.........! مگر ضیاء! آج ابو کے علاوہ امی کا فون بھی آیا تھا۔"

"کیا مطلب؟ ابو تو غالباً تم بتا رہے تھے کلکتہ گئے ہوئے ہیں جب کہ امی یعنی چچی صاحبہ تو زہرہ آپا اور طاہر بھائی کے ساتھ ہمارے گھر گئی ہیں۔"

"ہاں' تو؟"

"تو یہ کہ ہمارے گھر فون نہیں ہے۔"

"وہ وہاں نہیں ہیں۔ وہاں سے جا چکی ہیں۔ اپنی بہن کے گھر سے بول رہی تھیں یعنی میری خالہ کے گھر سے اور خالہ کا گھر یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔"

"اور زہرہ آپا وغیرہ؟" میں ان لوگوں کے آنے کی خبر سن کر پریشان ہو گیا تھا۔

"وہ لوگ تو شاید کل یہاں پہنچ جائیں۔ طاہر چچا کو آفس بھی تو جوائن کرنا ہے۔ ضیاء! میں نے تم سے کہا تھا کہ تم اس دوران جیہ سے بھی مل لو۔ اب ان لوگوں کی آنے کے بعد تو........."

"تم کس جیہ کی بات کر رہے ہو؟" میں واقعی نہیں سمجھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور کس کے بارے میں کہہ رہا ہے۔

"یار! وہی......... جس کا ذکر میں نے کیا تھا۔ ضیاء! شرطیہ' تم مونیکا کو بھول جاؤ گے۔" اس نے بھنویں اچکائیں۔

"اوہ.........! سمجھا!"

"کل ملی تھی وہ مجھے مگر......... میں نے بات نہیں کی تھی۔ دراصل میں نہیں چاہتا تھا کہ تم سے ٹائم سیٹ کئے بغیر اسے لے آؤں اور پھر مونیکا کی طرح اس کے سامنے بھی مجھے شرمندہ ہونا پڑے۔" اس نے پانی کا گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے کہا پھر سالن کی پلیٹ سامنے سرکا کر کھانا کھانے لگا۔

"طیب! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کس خمیر سے بنے ہوئے ہو؟ کیا تمہیں مونیکا سے ڈر نہیں لگا؟"

"ارے.........!" وہ زور سے ہنسا۔ "پاگل ہوئے ہو کیا.........! وہ کوئی ڈرنے کی چیز ہے۔ ایک ایسا جسم جو دیکھنے والے کے اندر جلترنگ سے لے کر پیانو تک بجا رہے۔ ایسی آواز کہ سامنے والے کو محسوس ہو کہ وہ زندگی میں پہلی بار سرور آمیز ارتعاش سے دوچار ہوا ہے اور......... اور اسے لگے جیسے ہزاروں مکڑیاں اس کے بدن کو گدگدانے لگی ہوں۔ اس سے بھلا کوئی ڈر سکتا......... تا......... آ......... غوں.........!"

وہ عجیب سی آواز نکال کر چپ ہو گیا۔ میں سر جھکائے کھانا کھانے میں مصروف تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ طیب کی اس وقت کیا کیفیت ہو گی۔ وہ آنکھیں بند کئے کسی ایسے ہی سرور آمیز لہجے کی گرفت میں ہو گا اور اس کی گرفت کو محسوس کرنے میں بھی پورے تندوہی کے ساتھ مصروف ہو گا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اس کی فضول باتوں کا خاتمہ ضروری ہے۔ سب سے اہم بات تو یہ تھی کہ میں پریشان تھا۔ پریشان ہو گیا تھا۔ اس لئے کہ سب گھر والے واپس آ رہے تھے۔ میں اب تک یہیں تھا' میں نے وہ کچھ اب تک نہیں کیا تھا جس کے کرنے کا ارادہ لے کر یہاں آیا تھا بلکہ اب تو میرا پروگرام ہی تبدیل ہو چکا تھا۔ بہرحال' یہ ایک الگ مسئلہ ہے' فی الحال تو میں یوں پریشان تھا کہ زیوسا اب میری موجودگی ہی میں نہیں' میری غیر موجودگی میں دوسروں سے بھی باتیں کرنے لگی ہے جیسے کہ اس نے طیب سے الٹی سیدھی باتیں کر کے اسے پریشان کیا۔

سوال یہ تھا کہ اگر اس نے اپنا یہ سلسلہ جاری رکھا تو بات بڑھ جائے گی' سارے خاندان میں پھیلے گی۔ خوف جو اب کافی حد تک کم ہو چکا تھا پھر بڑھ جائے گا۔ اس کا فی الحال کوئی دوسرا حل بھی نہ تھا۔ اگر وہ ایک بار اور مجھ سے فون پر بات کر لیتی تو شاید میں اس سے اس کا مقصد پوچھتا یا اسے منع کرتا۔ یکایک مجھے خیال آیا کہ میں طیب سے تفصیل تو پوچھوں۔ یہ سوچ کر جونہی میں نے سامنے دیکھا' میں اچھل پڑا۔ سامنے طیب کرسی کی پشت سے کمر لگائے بالکل سیدھا بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر میرا دل حلق میں آ گیا۔ وہ بے حس و حرکت تھا۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں ساکت تھیں۔ میں نے منہ کا نوالہ بغیر چبائے نگلا اور دھیرے سے سیدھا ہو کر طیب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

"طیب.........! طیب.........؟" میں نے دھیرے سے آواز دی۔ اس کا پھولا ہوا گال بتا رہا تھا کہ اس کے منہ میں نوالا ہے۔ میں دھیرے سے اٹھا۔ ایک ایسا خیال مجھے خوفزدہ کر رہا تھا جسے میں ذہن میں لانا نہیں چاہ رہا تھا۔ کوئی بار بار میرے اندر طوفان سا برپا کر رہا تھا کہ طیب......... طیب اب نہیں رہا اور میرا جی چاہ رہا تھا کہ اس کے کہنے والے کا منہ نوچ لوں مگر کہنے والا سامنے تھا کب؟ میرے اندر ہی سے کھروچے ڈال رہا تھا۔ میری نگاہیں طیب پر جمی ہوئی تھیں۔ میں اس کی ساکت پتلیوں میں زندگی کی رمق تلاش کر رہا تھا اور میری حیرت انگیز بینائی میرا ساتھ نہیں دے رہی تھی بلکہ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں اس کی آنکھوں کے رستے کسی برفیلے میدان میں اترتا جا رہا ہوں۔ تب میں بے ساختہ چیخ اٹھا۔ "طیب.........!"

"ایاز......... طیب کو.........؟" میں یہ کہتا ہوا طیب کی طرف بڑھا ہی تھا کہ ایاز نے درمیان میں میرا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"صاحب جی! انہیں ایسے ہی چھوڑ دیں۔" اس نے میری بات کاٹ دی تھی۔

"پاگل ہو گئے ہو کیا؟" میں نے جھٹکے سے بازو چھڑایا۔ طیب کی حالت میں ذرہ برابر فرق نہ آیا تھا۔ ایاز بھاگ کر اس بار مجھ سے لپٹ گیا۔ ورنہ میں طیب کے کندھے پکڑنے ہی والا تھا۔

"صاحب جی.........! وہ......... فون آیا تھا۔ اس نے کہا ہے' طیب کو چھوا تو وہ مر جائے گا۔ جب تک ایسے ہی چھوڑ دو گے تو تھوڑی دیر میں خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔"

جلدی جلدی بتا رہا تھا۔

"کیا.........؟" میں چونک اٹھا۔ "فون......... کس کا؟"

"پتا نہیں جی.........! کوئی عروسا......... ازوسا.........! پتا نہیں' کون تھی۔ ابھی ابھی اس نے فون کر کے مجھے دوڑایا کہ جا کر اپنے صاحب کو کہہ دو کہ طیب کو چھوا تو وہ مر جائے گا۔" اتنا کہہ کر اس نے طیب کو غور سے دیکھا پھر بولا۔ "جب رات یہ آپ کو چھوڑ کر اکیلے آئے تھے تب بھی فون سننے کے بعد ان کی یہی حالت ہو گئی تھی۔ میں تو......... میں تو جی ڈر کے مارے یہاں سے اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ پھر طیب جی خود ہی باہر آئے تو آئے' میں تو پلٹ کر اندر نہیں آیا۔"

"اوہ.........! زیوسا.........؟" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

"ہاں جی.........! ہاں جی.........! بالکل یہی نام بتایا تھا اس نے۔"

"ہاں......... سنو! اب اگر اس کا فون آئے تو......... کہنا کہ......... اچھا چھوڑو........." میں بے قراری میں ٹہلنے لگا تھا پھر مجھے خیال آیا کہ ایاز بہت خوفزدہ ہے۔ وہ بار بار کن انکھیوں سے طیب کی طرف دیکھ رہا تھا۔ "سنو! تم جاؤ چائے لے آؤ......... دو کپ۔" یہ سنتے ہی وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ میں دھیرے دھیرے طیب کے قریب آیا۔ میں نے اس کے چہرے کے قریب چہرہ کر کے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اس کی پتلیاں پتھر کی لگ رہی تھیں۔ ان میں چمکدار روشنی کا نقطہ جامد تھا۔

"طیب......... طیب.........! کیا تم میری بات سن سکتے ہو؟ طیب کیا تم میری آواز سن رہے ہو؟" میں اتنی زور سے بول رہا تھا کہ اگر وہ گہری نیند سو رہا ہو تب بھی اٹھ جائے مگر......... اس پر کوئی بھی اثر نہ ہوا پھر مجھے یاد آیا کہ اب سے ذرا دیر پہلے جو میں نے چیخ ماری تھی اس سے تو مردہ بھی جاگ اٹھتا مگر وہ یونہی ساکت تھا۔

بات اب واقعی بہت بڑھ گئی تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ اب آنے والا وقت اپنے جلو میں کیا کچھ لا سکتا ہے۔ گھر والوں کے آنے کے بعد یہاں کیسا خوف و ہراس پھیلتا' اس کا میں تصور کر سکتا تھا۔ خاص طور پر ان حالات میں کہ ناصر چچا کے بچے چھوٹے بھی تھے۔ پھر زہرہ آپا تو جانے کیسے خوف کے حصار سے نکل پائی تھیں' میں نہیں چاہتا تھا کہ میری وجہ سے یہ لوگ پھر کسی حادثے کا شکار ہوں۔ خیر' یہ تو وہ باتیں تھیں جنہیں سوچا جا سکتا تھا' اس کا حل بھی نکالا جا سکتا تھا مگر فی الوقت تو طیب کی طرف سے میری پریشانی بڑھتی جا

رہی تھی۔ پتا نہیں' یہ زیوسا کون تھی اور کیوں میرے پیچھے پڑ گئی تھی۔ میرا بس چلتا اور وہ صرف ایک بار مجھے مل جاتی تو میں مار مار کر اس کا چہرہ بگاڑ دیتا۔

طیب کی حالت میں فرق نہیں آیا تھا۔ میں انتہائی مضطرب تھا۔ ٹہل رہا تھا۔ ایاز چائے لینے جا چکا تھا۔ اچانک میں رکا۔ میں نے غور سے طیب کی طرف دیکھا پھر اپنا والٹ نکال کر اس میں سے شالی بابا کا دیا ہوا پتھر نکالا اور دھیرے سے طیب کی طرف اس طرح پھینکا کہ وہ سیدھا اس کی گود میں جا گرا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ پتھر کوئی معجزہ دکھا سکتا ہے۔ میں جانتا تھا کہ اس میں میرے اعتقاد کا بڑا دخل ہے اور میں' جو لاجک کے بغیر کچھ بھی ماننے کو تیار نہیں ہوتا تھا' بہرحال اس پتھر کی افادیت کا قائل ہو چکا تھا۔ قائل کرنے میں دادا کی بیماری کے دوران کا واقعہ اہم تھا۔

اسے آپ میرے اعتقاد کی انتہا کہہ لیں یا جو کچھ بھی۔ میں ابھی یونہی کھڑا طیب کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اچانک اس میں حرکت ہوئی اور وہ نوالہ چبانے لگا۔ میں اچھل پڑا۔ وہ یوں نظریں سالن کی پلیٹ پر جمائے تھا جیسے نارمل حالت میں کھانا کھا رہا ہے۔ شاید اسے احسا بھی نہیں ہوا تھا کہ اب سے پہلے وہ کس حالت میں تھا۔ میرے اچھلنے اور اس کی طرف لپکنے پر اس نے مجھے چونک کر دیکھا اور بولا۔

"تم کھا چکے؟"

"آں.......... ہاں.........." میں نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا۔ لوٹا اور اس کی سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس دوران میں ایاز جانے کب واپس آ چکا تھا۔ اب تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کا رنگ بالکل سفید تھا۔ اچھا ہی ہوا کہ وہ کمرے سے باہر چلا گیا ورنہ جانے کیا کہہ دیتا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ طیب کو کچھ پتا چلے۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ اسے کیا محسوس ہوا تھا۔

"ہاں طیب! تم کچھ کہہ رہے تھے۔" میں نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں' میں کہہ رہا تھا کہ تم جب جیہ کو دیکھو گے تو تمہیں احساس ہو گا کہ دنیا میں کس قدر حسین چیزیں موجود ہیں مگر یار.......... ایک بات تو بتاؤ! یہ تم ہو کس ٹائپ کے؟"

میں مسکرا اٹھا۔ اس کی وجہ ایک تو اطمینان تھا کہ وہ ذہنی طور پر وہیں تھا جہاں اس حالت میں جانے سے قبل تھا' دوسرے اس کے انداز سے بالکل پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ کسی

تبدیلی سے واقف ہے۔ "بس طیب.......... میں کچھ اسی ٹائپ کا ہوں۔ بہرحال' کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم فی الوقت اپنی ان حرکتوں سے باز آ جاؤ۔"

"کن حرکتوں سے؟" اس نے ناگواری سے میری طرف دیکھا۔

"یہ.......... یہی عورتوں سے میل ملاپ اور دوستیوں والی حرکتوں سے۔"

"تو کیا میں مر جاؤں؟"

"اس میں مرنے کی کیا بات ہے؟"

"نہ تو میں جب غیر فطری زندگی گزاروں تو بھلا کیوں..........؟ تمہاری کیا زبردستی ہے کہ میں فطرت سے ہٹ کر زندہ رہوں۔"

"میں نے یہ نہیں کہا کہ تم فطرت سے ہٹ کر کوئی کام کرو۔ میں نے کہا ہے کہ فی الوقت ان حالات میں اس حرکت سے اجتناب کرو۔ ابھی تو بڑی زندگی پڑی ہے۔"

"تو کس حکیم نے کہا ہے کہ زندگی کا کچھ حصہ غیر فطری اسٹائل میں بسر کرو۔" اس نے نیپکن سے ہاتھ اور منہ پونچھتے ہوئے سامنے رکھی پلیٹ سرکا دی۔ "میں تمہیں ا۔ بچے ڈھب پر لانے کی کوشش کر رہا ہوں اور تم مجھ سے ہی چکر چلا رہے ہو۔"

وہ اچھے موڈ میں تھا۔ میں جان گیا کہ اسے یوں سیدھے سادے طریقے سے میں کسی بھی حال میں قائل نہیں کر سکتا۔ اسی وقت ایاز چائے لے آیا۔ کمرے میں گھستے ہی اس کی خوفزدہ نگاہیں طیب کی طرف اٹھ گئیں۔ طیب کی نگاہ بھی اس پر پڑی۔ وہ کچھ چونک سا گیا۔

"تمہیں کیا ہوا..........؟" اس نے اس کے ہاتھ سے چائے کا کپ لیتے ہوئے پوچھا۔ "باہر کوئی بھوت وغیرہ ہے کیا؟"

"نن.......... نہیں صاب.......... آپ.........."

"ایاز..........! جاؤ.......... تم جا کر سو جاؤ۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ایاز نے ایک نظر مجھے دیکھا اور پھر سمجھ گیا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ جلدی سے چپ ہو کر کمرے سے نکل گیا۔ میں چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے سوچنے لگا کہ کیا کروں؟ اب اسے حالات سے آگاہ کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ ورنہ وہ نہ سنجیدہ ہونے کو تیار تھا نہ میری باتوں پر دھیان دینے کو.......... ایک فیصلہ میں اس کی خوفناک حالت کے درمیان میں کر چکا تھا کہ اس سے پہلے کہ گھر والے آئیں' مجھے یہ گھر چھوڑ دینا چاہیے۔ اس کے بارے میں طیب کو

اعتماد میں لینا بہت ضروری تھا پھر میں نے دھیرے دھیرے اسے سب کچھ بتا دیا۔ جب پتھر کا ذکر آیا تو اس نے چونک کر اپنی گود کی طرف دیکھا' پتھر کو دو انگلیوں کے درمیان میں دبا کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی کے ساتھ ہلکا سا خوف بھی تھا۔

"ضیاء! تم.......... تم مذاق تو نہیں کر رہے نا؟"

"تم ایاز سے پوچھ سکتے ہو۔ اس نے تو یہ بھی بتایا تھا کہ جب تم مجھے چھوڑ کر آئے تھے اور فون کی گھنٹی بجنے پر فون اٹھا لیا تھا۔ اس کے بعد بھی تم کم از کم پندرہ منٹ تک اسی حالت میں رہے تھے اور پھر اب.......... دیکھو طیب.......... میں بالکل پاگل نہیں ہوں۔ ایک سنجیدہ اور بردبار انسان ہوں۔ ایک اچھی جاب سے منسلک ہوں' میرے پاس وقت نہیں ہے کہ فضول اور غلط باتوں پر اپنا وقت ضائع کروں' میں اگر چھٹی لے کر یہاں آیا ہوں تو اس کی وجہ انتہائی معقول اور میرے نزدیک انتہائی اہم ہے۔ وہ جو اموات ہمارے خاندان میں ہو چکی ہیں' وہ مسلم حقیقت ہیں' کوئی مذاق نہیں۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں سنجیدہ ہو کر میرا ساتھ دینا چاہئے۔ بات بہت بڑھ چکی ہے۔ گھر کے لوگ آنے والے ہیں' میں کسی بھی حال میں نہیں چاہتا کہ ان لوگوں کو کسی بھی قسم کی تکلیف ہو۔ زیوسا' وہ جو بھی ہے اس کی ایکٹی وٹیز یہاں بڑھتی جا رہی ہیں اور یہ کوئی اچھا شگون نہیں ہے۔ تم اس معاملے میں ملوث ہو چکے ہو اس لئے میری خواہش ہے کہ اسے سمجھنے اور سنجیدگی سے توجہ دینے کی کوشش کرو۔ میں اکیلا ہوں۔ مجھے ایسے میں ایک ساتھی کی شدید ضرورت ہے۔"

"میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔" اس نے اچانک پُرجوش انداز میں کہا۔

مجھے اس کا انداز دیکھ کر خوشی ہوئی۔ "مگر.......... تم خود پر قابو پانے سے قاصر ہو۔ عورت تمہاری کمزوری ہے۔ اس پر تمہیں مکمل کنٹرول کرنا پڑے گا اس لئے کہ زیوسا خود ایک عورت ہے۔"

"عورت ہے..........؟" وہ ہنسا۔

"میرا مطلب ہے کہ وہ جو بھی ہے' ہے تو مونث اور میرا خیال ہے کہ مونیکا کا اس سے تعلق ہے۔"

"کیا..........؟ تم.......... تم ہوش میں تو ہو؟"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں طیب.......... شاید تم ابھی میری بات کا یقین نہ کرو

مگر.......... مجھے یقین ہے کہ تم بہت جلدی قائل ہو جاؤ گے۔"

"ٹھیک ہے ضیاء! میں تمہارا ساتھ دینے کو تیار ہوں مگر ایک شرط پر۔" وہ کچھ آگے کو سرک کر بیٹھ گیا۔

"بولو؟"

"یہ کہ جب یہ چکر ختم ہو جائے گا تو.......... تو تمہیں میرا ساتھ دینا پڑے گا۔"

میرا جی چاہا کہ میں میز کے بیچوں بیچ رکھا بھاری گلدان اس کے سر پر دے ماروں مگر میں برداشت کر گیا۔ "کس سلسلے میں؟"

"فرحت سے شادی کروانے کے سلسلے میں۔"

مجھے یوں لگا جیسے کسی تیز دھار چیز سے مجھے دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا گیا ہو۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے کرسی کو نیچے سے سختی سے تھام لیا اور خود پر قابو پا لیا۔ وہ استفہامیہ انداز میں میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے.......... فی الوقت تم ان باتوں کو ذہن سے نکال دو۔" میں نے گہرا سانس لے کر کہا۔ میں نارمل ہو چکا تھا۔ اس معاملے کو سنبھالنے کے لئے ابھی میرے پاس بڑا وقت تھا۔ وہ میری بات سن کر خوش ہو گیا۔ پھر بولا۔

"او کے! اب بتاؤ' مجھے کیا کرنا ہے؟"

"سب سے پہلے تو میرے رہنے کا کہیں اور بندوبست کرو۔ میں یہاں سے اس سلسلے کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ یہ میں کر سکتا ہوں۔ اندھیری میں میرے ایک دوست کی کوٹھی ہے۔ وہ خود دوبئی میں ہوتا ہے۔ اکیلا ہے' وہیں کاروبار کرتا ہے۔ بہت عیاش طبیعت کا مالک ہے۔ جب تک یہاں رہا' اس نے اپنے گھر کو قحبہ خانہ بنائے رکھا۔ دولت کی کمی نہیں ہے اس لئے کوٹھی کو بیچنے یا کرائے پر اٹھانے کی بجائے یونہی چھوڑ گیا۔ چابی مجھے دے گیا ہے اور میں.......... " وہ آگے کچھ کہتے کہتے ذرا جھجک گیا۔

"اور کیا؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"میں.......... کبھی کبھی وہاں جاتا رہتا تھا۔ میرا مطلب ہے کہ کبھی کبھی وہاں پارٹیز کا اہتمام کرتا تھا۔ میرے کچھ دوست.........."

"ٹھیک ہے۔ میں سمجھ گیا۔ مگر طیب.......... میرے وہاں رہنے کے بعد تمہاری یہ

عیاشیاں وہاں نہیں چلیں گی۔ اس لئے تم سوچ لو۔"

"نن.......... نہیں.......... اب تو میں خود تمہارے ساتھ ہوں۔ آج سے سب ختم' لیکن یہ مسئلہ ختم ہونے کے بعد تم مجھے نہیں روکو گے۔"

"ہاں' جب میں وہ گھر چھوڑ دوں گا تو جو چاہے کرنا۔"

"چلو یہ تو ہو گیا۔ ویسے تمہیں کیسے پتا کہ تمہارے یہاں سے چلے جانے کے بعد زیوسا یہاں کوئی افراتفری نہیں پھیلائے گی۔"

"وہ صرف میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ جو کچھ وہ یہاں کر رہی ہے اس کا تعلق بھی مجھ سے ہے۔ وہ مجھے پریشان کر رہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میرے یہاں سے جانے کے بعد وہ بے وجہ ان لوگوں کو پریشان نہیں کرے گی۔"

"اور میں.......... بقول تمہارے اب تو میں بھی اس کے چکر میں آ چکا ہوں۔"

"تم یہ پتھر اپنے پاس رکھ لو۔" میں نے بہت بڑی قربانی دی تھی۔ وہ پتھر میرے لئے بہت اہم تھا۔ شالی بابا کہہ چکے تھے کہ تم ہمیشہ اسے اپنے پاس رکھنا ورنہ کسی پریشانی میں پڑ سکتے ہو مگر میں اپنی وجہ سے طیب کو کسی قسم کی تکلیف اٹھاتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں شالی بابا کو تلاش کر سکتا تھا اور جب تک وہ نہ ملتے' اس وقت تک خدا سے دعا کر سکتا تھا کہ وہ مجھے اپنی پناہ میں رکھے۔ بہرحال' میں ہر اذیت برداشت کر سکتا تھا مگر طیب کو کسی مصیبت میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"اور تم کیا کرو گے؟" اسے بھی میری فکر تھی۔

"اللہ مالک ہے۔ میں اپنا دفاع کر سکتا ہوں۔ تم فکر نہ کرو۔ اب پہلی فرصت میں اس گھر کا انتظام کرو۔ وہاں اور کوئی ہے؟ میرا مطلب ہے کہ کوئی ملازمہ وغیرہ..........؟"

"ہاں! ایک عورت ہے کرچن.......... ایلیسا.......... وہ گھر کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ وہیں ایک کمرے میں رہتی ہے۔ ویسے تم فکر نہ کرو۔ وہ بوڑھی عورت ہے۔ بہت کم گو ہے۔ اوپر کی منزل پر ایک کمرا اور کچن بنا ہوا ہے۔ وہ اس کے استعمال میں ہے۔ وہ تمہارا بھی خیال رکھے گی۔ میں ابھی فون کر کے اسے کہہ دیتا ہوں کہ تم صبح آ رہے ہو۔"

اس غیر سنجیدہ سے طیب نے میرا ایک بہت بڑا مسئلہ حل کر دیا تھا۔ مجھے خوشی ہوئی۔ مجھے یہاں آئے چار روز ہو چکے تھے۔ میں وقت کے زیاں پر کافی پریشان تھا مگر اب میں مطمئن ہو چکا تھا۔ میں ہر قسم کے حالات سے نمٹنے کے لئے تیار تھا۔

"اگر تم کہو تو میں بھی تمہارے ساتھ رہ لوں!" طیب نے خواہش کا اظہار کیا۔

"نہیں! فی الحال اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ویسے اگر میں تمہارا ساتھ دوں گا تو مجھے تمہارے ساتھ ہی تو رہنا پڑے گا ناں!"

"نہیں' ضروری نہیں ہے۔ تم آ جایا کرنا مگر میں نہیں چاہتا کہ تمہارے گھر چھوڑنے پر گھر والے پوچھ گچھ کریں۔"

"یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ تم آئے ہوئے ہو اور وہاں رہ رہے ہو تو میں بھی وہاں رہ سکتا ہوں۔"

"چلو! بعد میں دیکھیں گے۔ فی الحال تم فون کرو وہاں۔"

چائے ختم کئے ہوئے دیر ہو چکی تھی۔ ہم وہاں سے اٹھ گئے۔ اسی وقت طیب چونک اٹھا۔

"ارے ہاں.......... تمہارا زخم.......... کیا واقعی وہ درست کہہ رہی تھی۔"

اتنا کہہ کر اس نے میرے پیر کو دیکھا اور پھر مجھے جواب دینے کی ضرورت نہیں پڑی۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ میں نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔ اس کے چہرے کا خوف پہلے بے یقینی میں پھر یقین میں بدل گیا۔

"حیرت انگیز.......... یہ میرے لئے بڑا انٹرسٹنگ ہے ضیاء! مجھے پراسراریت سے بے پناہ دلچسپی ہے۔"

"میں جانتا ہوں لیکن بھیا جی! سب دلچسپی ہوا ہو جائے گی اگر کچھ تمہارے ساتھ پیش آ گیا تو.......... اسی لئے کہتا ہوں کہ ہمت پیدا کرو.........."

"بڑی ہمت ہے مجھ میں۔ دیکھ لینا تم.........." وہ پرجوش انداز میں بولا۔

"چلو!" میں نے مسکرا کر کہا۔ وہ آگے بڑھ گیا۔ ہم ہال سے ٹیلیفون سیٹ اٹھا کر طیب کے کمرے میں چلے آئے۔ رات کافی گہری ہو چکی تھی۔ ایاز غالباً اپنے کوارٹر میں جا چکا تھا۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ بجلی بڑے زور سے چمکی تو احساس ہوا کہ باہر مطلع ابر آلود ہے۔ کچھ ہلکے ہلکے بادل تو شام ہی سے آسمانوں میں بھٹکتے پھر رہے تھے مگر اس وقت بارش کا کوئی امکان نہیں تھا۔

طیب نے نمبر ڈائل کیا۔ پھر چند لمحے بعد بولا۔ "ہیلو! ایلیسا! میں طیب ہوں۔ کیسی ہو تم؟" پھر چند لمحے چپ رہا اور بولا۔ "ایلیسا' میرا ایک دوست دہلی سے آیا ہے۔ کل صبح

میں اسے لے کر وہاں آ رہا ہوں۔ وہ کچھ عرصے تک وہیں رہے گا۔ تم ذرا صفائی وغیرہ کر لو۔ ہاں.......... ہاں وہ اکیلا ہے۔ ٹھیک ہے۔ کل میں تمام سامان ڈال دوں گا۔ ہاں.......... اچھا' ٹھیک ہے۔ ہم گیارہ بارہ بجے تک پہنچ جائیں گے۔ ہاں.......... وہ سب میں لیتا آؤں گا۔ اچھا.......... ٹھیک ہے۔ میرے خیال میں اسے کوئی دشواری نہیں ہو گی۔ نہیں نہیں' اس کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ بڑا سلجھا ہوا اور شریف آدمی ہے۔ تمہاری بیٹی جب تک چاہے رہے۔ نہیں.......... وہ ایسا آدمی نہیں ہے۔ تم خود اس سے ملو گی تو جان جاؤ گی۔ او کے.......... پھر کل ملاقات ہو گی۔ گڈ بائی.........."

"ہوں.......... کیا ہوا؟" اس کے ریسیور رکھتے ہی میں نے پوچھا۔

"اس کی ایک ہی بیٹی ہے۔ گوا میں رہتی تھی۔ اس کا شوہر اسے مارتا پیٹتا تھا' اس نے طلاق لے لی ہے اور اب وہ ماں کے پاس وہیں آ گئی ہے۔ ایلیا پریشان تھی کہ وہ کہاں بھیجے گی اسے۔ میں نے کہہ دیا ہے کہ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اصل میں وہ میرے دوست شیکھر اور اس کے دوستوں سے واقف ہے اور غالباً وہ یہ بات مجھے بھی سنا رہی تھی تاکہ میں کسی قسم کی پارٹیز وغیرہ کا اہتمام نہ کر لوں اپنے دوست کے اعزاز میں۔ میں نے اسے اطمینان دلا دیا ہے۔ کل میں سویرے آفس جا کر جلدی لوٹ آؤں گا۔ تمہاری ضرورت کی چیزیں لے لیں گے' پھر وہاں چلیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں تمہیں تیار ملوں گا۔" میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "مجھے نیند آ رہی ہے۔ تم بھی سو جاؤ اور ہاں.......... وہ پتھر.........."

"یہ ہے۔" اس نے ہتھیلی کھول دی۔

"اسے کسی کپڑے وغیرہ میں ڈال کر بازو پر باندھ لو۔ یہ بہت ضروری ہے۔"

اس نے سعادت مندوں کی طرح سر ہلایا۔ میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ مجھے بے پناہ تھکن تھی۔ میں آج کے گزرے ہوئے دن کی جزئیات پر سوچنا چاہتا تھا مگر میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ میں نے کپڑے بدلے اور بستر میں گھس گیا۔ بارش شروع ہو چکی تھی اور کافی زوردار بارش تھی۔ خنکی بھی بہت بڑھ گئی تھی۔ ہوا سرد تھی۔ کمرا ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ میں نے کمبل اپنے گرد لپیٹ لیا اور لائٹ بجھا کر کروٹ لے لی۔

☆----------------☆----------------☆

دوسرے دن میں ابھی سو کر بھی نہیں اٹھا تھا کہ طیب آفس سے ہو کر لوٹ آیا۔

اس نے مجھے اٹھایا۔ میں نے ہلکا سا ناشتا کیا اور اپنا سامان لے کر اس کے ساتھ نکل آیا۔ طیب کی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر مختلف تھیلے اور لفافے رکھے تھے۔ اس نے بتایا کہ یہ وہ راشن اور کھانے پینے کی چیزیں ہیں جو وہ میرے لئے لایا ہے۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ وہ اس سلسلے میں پریشان نہ ہو۔ اس نے برا مانا۔ اس کا کہنا تھا کہ میں کیوں کہ اس کا مہمان ہوں اس لئے فضول تکلف کی باتیں نہ کروں۔ راستے میں ہم زیادہ تر وہی باتیں کرتے رہے کہ اب دیکھتے ہیں زیوسا کیا کرتی ہے۔ میں نے اسے تاکید کی کہ ایاز کو سختی سے منع کر دے کہ وہ اس کے فون کا یا اس کے ساتھ ہونے والے کسی معاملے کا ذکر گھر کے افراد سے نہ کرے۔ دوسری تاکید یہ کی کہ اپنی موجودگی میں فون وہ خود اٹھائے اور اگر دوسری جانب زیوسا ہو تو اسے میرا نمبر دے کر صاف کہہ دے کہ میں یہ گھر چھوڑ چکا ہوں۔ ذرا بھی ظاہر نہ کرے کہ وہ میرے یا اس کے کسی پراسرار چکر کے بارے میں جانتا ہے۔ یہی ظاہر کرے کہ وہ اسے میری دوست سمجھ رہا ہے۔ ہمیں یہ بھی ڈر تھا کہ طیب کی غیر موجودگی میں اس کا فون آ سکتا ہے مگر اس بارے میں ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔

یہی باتیں کرتے کرتے ہم اندھیری پہنچ گئے۔ وہاں ریلوے لائن کے قریب ہی ایک بہت قدیم طرز پر بنی کوٹھی تھی جس کے باہر ایک بڑا لان تھا جس کی مسلسل دیکھ بھال ہو رہی تھی کیونکہ یہاں پودے ترتیب میں لگے تھے اور سرسبز تھے۔ باہر کا احاطہ لوہے کی باریک سلاخوں سے بنا ہوا تھا۔ ایک بڑا گیٹ تھا۔ اس گیٹ کے دائیں جانب کسی شیکھر گپتا کے نام کی پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ یہ سیمنٹ ہی کی پلیٹ تھی جسے دیوار میں چنا گیا تھا۔ اس نیم پلیٹ کے اوپر ایک ابھری ہوئی کال بیل لگی تھی۔ ایسی کال بیلیں پرانے زمانے میں استعمال ہوا کرتی تھیں' کال بیل سے ایک سیاہ رنگ کا بجلی کا موٹا سا تار اندر کی طرف چلا گیا تھا۔ اندر کی عمارت خیالے رنگ کی تھی جس میں بڑی بڑی کھڑکیاں تھیں۔ مین عمارت کا دروازہ کافی چوڑا تھا اور یہاں سے صاف دکھائی دے رہا تھا۔ گیٹ کے سامنے باریک بجری ڈال کر روش سی بنائی ہوئی تھی جو اس مین دروازے کے سامنے کی چند سیڑھیوں تک جاتی تھی۔

دائیں جانب ٹین کا چھجا سا بنا ہوا تھا جہاں غالباً کاٹھ کباڑ پڑا تھا' وہیں قریب ایک دیوار سے دوسری دیوار تک موٹی سی رسی بندھی ہوئی تھی اور اس پر کچھ رنگین اور زنانہ کپڑے پھیلے ہوئے تھے۔ طیب نے گیٹ کے عین سامنے گاڑی کھڑی کی اور خود اتر کر

گاڑی میں رکھے تھیلے' لفافے اور پیکٹ اٹھانے لگا پھر پلٹ کر مجھ سے بولا۔

"کال بیل بجاؤ۔"

میں آگے بڑھا۔ میں نے کال بیل بجائی اور جھٹکے سے ہاتھ ہٹا لیا۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے اس میں کرنٹ دوڑ رہا ہو۔

"کیا ہوا؟" طیب نے قریب آتے ہوئے پوچھا۔ میں ہاتھ جھٹک رہا تھا۔

"شاید کرنٹ آ رہا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"ہاں' رات بارش ہوئی ہے۔ دیواریں گیلی ہیں اس لئے......"

ابھی اس نے بات پوری نہیں کی تھی کہ گیٹ کا لاک جو اندر سے لگا ہوا تھا' ایک کھٹکے سے کھل گیا۔ میں نے حیرت سے دیکھا۔

"یہ خود کار لاک ہے۔ اسے کھولنے اور بند کرنے کا سسٹم اندر ہے۔" طیب نے آگے بڑھتے ہوئے جواب دیا۔ میں نے کچھ پیکٹ اس کے ہاتھ سے لینا چاہے۔ اس نے منع کر دیا کیونکہ میں پہلے ہی اپنا اٹیچی کیس اٹھائے ہوئے تھا۔ میں اس کے پیچھے چلتا ہوا مین عمارت کے دروازے تک پہنچ گیا۔ طیب نے پھر ایک طرف اشارہ کیا۔ "اس کال بیل کو بجاؤ۔"

میں نے دیکھا' یہاں بھی دائیں جانب ویسی ہی کالے رنگ کی کال بیل لگی تھی جس کے بیچوں بیچ سرخ رنگ کا بٹن تھا۔ میں نے اس سرخ رنگ کے بٹن پر انگلی رکھ دی اور پھر مجھے بڑے زور کا جھٹکا لگا۔ میں سیڑھی سے گرتے گرتے بچا۔ طیب ہنسنے لگا اور بولا۔

"اسی لئے تم سے کہا تھا۔" مجھے بھی ہنسی آ گئی۔ عین اسی وقت کسی نے دروازہ کھولا اور دروازہ کھلتے ہی میں ساکت رہ گیا۔ اپنے پیچھے میں نے طیب کے ہاتھ سے گرنے والے پیکٹس کی آوازیں سنیں پھر میرے کانوں میں سیٹیاں سی بجتی محسوس ہوئیں۔ ساتھ ہی طیب کی آواز آئی۔

"آ...... آپ......؟"

میں اسے نہیں جانتا تھا۔ میرے کانوں میں بجنے والی سیٹیوں کا سبب وہ ذہنی جھٹکا تھا جو دروازہ کھلتے ہی اس کی چمکدار آنکھوں سے نکلنے والی شعاعوں نے کرنٹ کی سی صورت اختیار کر کے مجھے پہنچایا تھا۔ یوں لگا تھا جیسے اس میں نہ جانے کتنے پاور کی الیکٹرک سٹی دوڑ رہی تھی جو ہاتھ چھوئے بغیر میرے جسم میں کرنٹ دوڑا گئی۔ عجیب سے سفید

کپڑوں میں ملبوس وہ لڑکی بلاشبہ دنیا کی حسین ترین لڑکی تھی۔

میرے خیال میں حسن کا کوئی پیمانہ نہیں۔ آنکھیں بڑی یا غلافی یا بادامی ہونا' گہری سیاہ جھیل جیسی ہونا' ناک ستواں اور چھوٹی ہونا' دہانہ چھوٹا یا بڑا ہونا اور ہونٹ پتلے یا گداز ہونا حسن کا معیار نہیں بلکہ وہ عجیب و غریب اور پُراسرار سی مقناطیسیت ہی حسن کا ثبوت ہوتی ہے جو دیکھنے والے کو مبہوت کر دے یا چونکا دے۔ اسے مڑ کر دیکھنے یا تکتے رہ جانے پر مجبور کر دے۔ وہ ایسی ہی حسین تھی۔ میں مبہوت کھڑا تھا۔ خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میری حالت ایسی تھی جیسے میں تیز آندھی کی زد پر ہوں جو مجھے آگے کی طرف دھکیل رہی ہے اور میں آگے بڑھنا نہیں چاہ رہا۔ قدم جمانے کی کوشش کر رہا ہوں جب کہ آندھی میرے پاؤں اکھاڑے دے رہی ہے۔ میں نے بے ساختہ دروازے کی چوکھٹ کو اتنی سختی سے پکڑ لیا کہ میری انگلیوں کے اوپر کے حصے سفید ہو گئے۔ ہمارے بیچ گہرا سناٹا تھا۔

"جی؟" گھنٹیاں سی بجی تھیں۔ نہیں! جلترنگ...... نہیں' بلکہ کوئی اور ساز تھا۔ کوئی ایسا ساز جو شاید ابھی ایجاد نہیں ہوا۔ جس کی آواز کا تصور انسانی ذہن کر ہی نہیں پایا۔ موسیقی تھی جو آدمی کے اندر کے ہر تار کو چھیڑ دیتی ہے اور پھر وہ بہت دیر تک بجتا ہی رہتا ہے۔

"وہ...... وہ جی......!" طیب بھی شاید آندھی کے انہی جھکڑوں سے لڑ رہا تھا جن سے لڑتے لڑتے میرے اعصاب شل ہو چکے تھے۔

اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ مونا لیزا کی مسکراہٹ تو بہت بکواس مسکراہٹ ہے۔ پتا نہیں' وہ کتنا بدذوق آدمی تھا جس نے پہلی بار اپنی محبوبہ کی مسکراہٹ کو مونا لیزا کی مسکراہٹ سے تشبیہ دی تھی۔ یقیناً اس نے طنز کیا ہو گا...... اب میں آپ کو کیا بتاؤں کہ اس کی مسکراہٹ کیا تھی؟ کیسی تھی اور اس مسکراہٹ نے ہماری آنکھوں کے سامنے بکھری دھوپ میں بھی کہکشاں سی بکھیر دی تھی۔ ہمیں یوں لگا تھا...... جانے مجھے...... کہ جیسے میرے چاروں طرف گہرا اندھیرا ہو۔ بس سامنے کہکشاں دور تک پھیل چکی ہے۔ میں نے صحراؤں میں آگ برساتے سورج سے منعکس ہونے والی شعاعوں کو ریت کے ذروں میں بھرنے اور پھر انہیں سونے کے ذروں میں تبدیل ہوتے بھی دیکھا ہے۔ مگر میں ان کی تشبیہ بھی مناسب نہیں سمجھتا۔ میں نے تیزی سے ساحل کی طرف

آئی' بل کھاتی ان لہروں کی چمک بھی دیکھی ہے جو ڈوبتے سورج کا شفق رنگ چرا کر بھاگ اٹھتی ہیں۔ میں نے چاندنی رات میں پھولوں کی پتیوں پر ٹکے اوس کے قطروں میں قید ہو جانے والے ننھے سے چاند کی بھرپور چمک دیکھی ہے۔ بس.......... میں بتا نہیں سکتا کہ وہ مسکراہٹ کیسی تھی۔ میں درحقیقت اس کے حسن کی تاب نہیں پا رہا تھا اور یہ میرے لئے ایک حیرت انگیز اور بہت ہی عجیب لمحہ تھا۔

"آپ کو کس سے ملنا ہے؟" اس نے پورا جملہ ادا کیا۔

میرے سر کے اوپر کہیں بگولے سے اڑ گئے۔ سنسناہٹ نے میری پنڈلیوں میں بجلی سی دوڑا دی پھر میری گرفت دروازے کی چوکھٹ پر ڈھیلی پڑ گئی۔ میرے ہاتھ پیروں کی جان نکل چکی تھی۔ مجھے شدت سے اپنی بے پناہ شکست کا احساس ہو رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میں جو چھ سات فٹ کا ہوں' گرفت ڈھیلی پڑتے ہی اس کے قدموں میں ڈھیر ہو جاؤں گا۔ اب مجھے نہیں پتا کہ طیب کی کیا حالت تھی۔ وہ مجھ سے پیچھے تھا اور اب اس کی آواز بھی نہیں آ رہی تھی مگر دھونکنی کی طرح چلتی سانس کی آوازیں میں صاف سن رہا تھا۔

پھر میں نہیں جانتا کہ کیا ہوا۔ شاید اس نے نگاہوں کا زاویہ تبدیل کر لیا تھا۔ مجھے ایک جھٹکا بالکل ایسا لگا جیسے میں نے کھلے سوئچ پر سے ہاتھ کھینچ لیا ہو یا بجلی کے جھٹکے نے ہی مجھے چھوڑ دیا ہو۔ میں لڑکھڑا گیا۔

"وہ.......... ہمیں ایلیا سے ملنا.......... ہے.........." یہ میری ہی آواز تھی مگر یہ لب و لہجہ میرے اپنے لئے قطعی اجنبی تھا۔

"اوہ..........! میڈم سے..........؟" وہ پلٹ گئی۔ آندھی ختم گئی۔ گو اس کا سراپا ہمارے سامنے تھا مگر پشت تھی۔ یہاں بھی کشش اتنی ہی تھی مگر شاید اس کی آنکھیں زیادہ خطرناک تھیں۔ طیب گر پڑا۔ شاید اسے کرنٹ نے جھٹکا دے کر دور پھینک دیا تھا۔ میں نے طیب کی مدد کرنا چاہی مگر میں اپنا رخ ہی نہ پھیر سکا تو مدد کیا کرتا؟ وہ میرے سامنے نپے تلے قدم اٹھاتی اندر جا رہی تھی۔

"وہ ابھی آتی ہیں۔ بازار تک گئی ہیں۔ آپ کا نام ضیاء الرب رضوی ہے نا؟" اس کا آخری جملہ سرگوشی اختیار کر چکا تھا بلکہ سرگوشی کی بازگشت بن کر جیسے پوری کائنات میں چکراتا ہوا میری سماعت میں اترا تھا۔ اس سرگوشی میں تنبیہہ تھی' فاتحانہ غرور تھا۔ کسی کو ڈھونڈ لینے' کچھ پا جانے کی سرخوشی بھی تھی۔ وہ میری طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ اس کے

سیاہ لمبے اور بے پناہ گھنے بال سفید ریشمی رومال میں جکڑے ہوئے تھے مگر کولھوں پر جیسے ہزاروں سانپوں کے پھن پھیلے تھے۔ اور میں ان سے وحشت محسوس کر رہا تھا۔

"وہ.......... مجھے نہیں.......... طیب کو جانتی ہیں.......... آپ کو میرا نام.........."

اس نے پوری بات نہیں سنی۔ وہ ہنس پڑی اور مجھے اور طیب کو دوبارہ زمین سے اٹھ جانا پڑا۔ ہاں' ہمیں ایسا ہی لگا تھا جیسے زمین نے ہمیں فضاؤں میں اچھال دیا ہو۔ میں نے یہ ہنسی اپنے گھر میں اس روز سنی تھی جب مونیکا آئی ہوئی تھی اور طیب.......... میں جان چکا تھا کہ وہ کیوں اچھلا' لڑکھڑایا اور پھر سنبھل گیا۔ اس بار میں نے طیب کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ تبدیل ہو چکا تھا۔ نقش و نگار جیسے اپنی جگہ پر ہی نہ تھے۔ یہ تجربات نہ صرف میرے لئے نئے تھے بلکہ حیرت ناک بھی تھے۔ میں اپنی خوبی کی وجہ سے اس کیفیت میں ڈوبا نہیں۔ میں نے نہ صرف یہ کہ خود کو سنبھال لیا بلکہ اپنی اس کیفیت کا گہرائی سے اندازہ بھی لگاتا رہا۔ میری طبیعت ہی کچھ ایسی ہے اس لئے میں کہہ سکتا ہوں کہ میں نے واقعی دنیا دیکھی ہے اور زندگی گزاری ہے ورنہ جس سرسری انداز میں لوگ جیتے اور جس بے وُقعتی سے مرجاتے ہیں' انہیں دیکھ کر مجھے افسوس ہوتا ہے۔

بہرحال میں سنبھل چکا تھا۔ میں نے دھیرے سے طیب کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ سرد تھا' تبھی مجھے احساس ہوا کہ اس کے دونوں ہاتھ خالی ہیں۔ "پیکٹس کہاں گئے؟" میں نے پوچھا۔

وہ چونکا پھر پلٹا۔ پیکٹس وہیں سیڑھیوں میں بے ترتیب پڑے تھے۔ وہ اس نے اٹھا لئے' ایک پیکٹ میں نے سنبھال لیا۔ میرے دوسرے ہاتھ میں اٹیچی کیس بھی تھا۔ اس نے اب تک میری بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ وہ اب ہمیں لئے ہوئے ایک خوبصورت ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ یہاں کے خوابناک ماحول میں وہ کسی شاعر کے خیال کی طرح فضا میں تیرتی محسوس ہو رہی تھی۔

"آپ یہاں رہیں گے۔ میں جانتی تھی۔ اصل میزبان میں ہوں۔ مجھے آپ کا استقبال کرنا ہی تھا۔" اس نے ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

سنہرے رنگ کے دبیز قالین پر سیاہ اور سنہرے پرنٹ کے وکٹورین صوفے تھے۔ نرم گدیوں والے جس پر قوس قزح کے سب رنگوں والے چھوٹے بڑے کشنز رکھے تھے۔ ان تمام کشنز میں پر بھرے تھے' نرم و ملائم پر۔ بڑی بڑی کھڑکیوں پر پڑے پردوں کا

رنگ بھی سنہری تھا اور اس پر کالے رنگ کے عجیب سے پرنٹ تھے جو دیکھنے والے کے بدن میں سنسنی تو پھیلا دیتے ہیں مگر واضح نہیں ہونے دیتے کہ پرنٹ کیا ہے۔ میں نے اس وقت کمرے کا سرسری جائزہ لیا۔ بڑے سے آتش دان پر کئی خوبصورت چیزیں سجی ہوئی تھیں جن میں سب سے خوبصورت وہ تصویر تھی جو عین آتش دان کے اوپر لگی تھی۔ قد آدم تصویر میں دنیا جہاں کا حسن سمو دیا گیا تھا۔ یہ بھی ایک بے حد حسین عورت کی تصویر تھی۔ میں نے تو اس تصویر سے فوراً نگاہ ہٹالی تھی کہ اس لڑکی کی موجودگی میں اسے غور سے دیکھنا قطعی غیراخلاقی حرکت ہوتی کیونکہ اس کے جسم پر لباس کے نام پر ایک سنہرے رنگ کا بہت بارک سا کپڑا پڑا تھا۔ تصویر کے کالے بیک گراؤنڈ میں اس لڑکی کا کندن سا بدن اور سنہرے کپڑے کی سلوٹوں کے برابر سے پھوٹی سنہری شعاعیں آدمی کو نگاہ جمائے رکھنے پر مجبور کرنے کے لئے کافی تھیں۔

"آپ بیٹھیں.......... آپ کو یہاں کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہو گی۔ آپ کی ضرورت کی ہر چیز آپ کو ملتی رہے گی۔" اس نے پُراسرار سی مسکراہٹ کے درمیان مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

اب ایک بات میں نے بالکل واضح طور پر محسوس کی کہ وہ صرف مجھ سے مخاطب ہے۔ اس نے دیکھا بھی صرف مجھے تھا۔ طیب پر ایک بار بھی نگاہ نہیں ڈالی تھی۔ یوں جیسے میں اکیلا ہی آیا ہوں۔

"شکریہ..........! کیا میڈم ایلیا..........؟" میں نے پوچھنا چاہا مگر میرا حلق اتنا خشک ہو گیا کہ لگا' یہ تین لفظ نہیں کانٹے میرے حلق میں گزر کر ہونٹوں تک آئے ہیں۔ میرا گلا چھل گیا تھا۔

"جی..........! وہ آجائیں گی مگر.......... اب آپ ان کی فکر چھوڑ دیں۔" عجیب سے انداز میں جواب دیا تھا اس نے۔ "میں پانی لاتی ہوں۔" وہ پلٹی۔

وہ میری ضرورت سے آگاہ ہو چکی تھی۔

"سنئے!" جانے طیب نے کیسے ہمت کر لی۔ وہ ٹھہر گئی۔ اس بار اس نے طیب کو یوں دیکھا جیسے وہ میرا ساتھ آنے والا کوئی کیوٹ سا بچہ ہو' کوئی فرمائش کرنے والا ہو۔

"جی..........! فرمایئے؟" وہ یوں جھکی جیسے اس کے بولنے پر خوش ہو اور حیران بھی۔

"آپ.......... ایلیا کی بیٹی ہیں..........؟"

بڑی ہمت تھی طیب میں۔ مجھے حیرت ہوئی مگر دوسرے ہی لمحے یہ حیرت ہمدردی میں بدل گئی۔ اس کا رنگ سفید ہو گیا تھا۔ پتا نہیں کیوں؟ ایک اندازہ تھا کہ اب وہ بول نہیں سکے گا۔ کم از کم اس لڑکی کے سامنے۔

"نہیں..........!" وہ سیدھی کھڑی ہو گئی۔

اب میری نگاہ اس کے لباس پر پڑی۔ مجھے کچھ حیرت ہوئی۔ وہ اس طرح کا لباس پہنے ہوئی تھی جیسے آج سے ہزاروں برس پہلے کی یونانی عورتیں پہنتی تھیں۔ اس کی گول' چکنی اور سنہری پنڈلیاں نظر آ رہی تھیں۔ پیروں میں عجیب و غریب قسم کے چپل تھے۔ ایک حریری چادر سی اس کی کمر پر اس طرح بندھی تھی جس نے اس کے گھٹنے چھپائے ہوئے تھے اور اوپر جا کر وہ ساڑی کے پلو کی طرح لپٹی ہوئی دائیں کندھے پر چلی گئی تھی جب کہ بایاں کاندھا عریاں تھا۔ اس کے متناسب جسم سے نکلنے والی شعاعیں اس کے گرد جیسے حصار بنائے ہوئے تھیں۔ میں تو اس کے چہرے ہی کو دیکھ کر حواس باختہ ہو چکا تھا۔ اس کے جسم کا جائزہ لینے کا یارا نہ تھا اس لئے نگاہ پھیر لی۔

"وہ بھی یہاں ہے مگر.........." اتنا کہہ کر اس نے میری طرف دیکھا۔ بڑا فاتحانہ سا انداز تھا۔ "اب ان کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ میں ہوں نا.......... اور پھر.........." وہ کچھ کہتے کہتے رکی اور مسکرا کر پلٹ گئی۔

اس کے کمرے سے نکلتے ہی ہم دونوں ہوش میں آ گئے۔ طیب تو خوفزدہ ہو گیا اور میرا ہاتھ تھام کر بولا۔

"ضیا..........! کچھ گڑبڑ ہے.......... بھاگ چلو.........."

میں ہنس پڑا۔ "کیوں..........؟ یہ مونیکا سے زیادہ پُرکشش نہیں ہے؟"

"ایسی تیسی اس کشش کی.........."

وہ اتنا ہی کہہ سکا اور گلے پر ہاتھ رکھ کر رہ گیا۔ میرے حلق میں بھی جلن ہو رہی تھی۔ عین اسی لمحے وہ اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں بلوریں ٹرے تھی۔ اس میں نازک کانچ کے پیلے اور لمبے لمبے سے گلاس تھے۔ ان گلاسوں میں کوئی سنہرے رنگ کا مشروب تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اسکوائش بنا کر لائی تھی مگر اتنی جلدی آنے پر مجھے حیرت تھی۔ "ممکن ہے' ایلیا کچن میں ہو۔" میں نے یہ سوچ کر خود کو مطمئن کر لیا۔ اس نے

گلاس ہماری طرف بڑھائے۔ حیرت ہے' آندھی کے جھکڑ تھم چکے تھے یا ہم اس کے حسن کی تباہی کے عادی ہو گئے تھے۔ میں نے ایک گھونٹ میں مشروب حلق سے اتار لیا۔ بڑی فرحت محسوس ہوئی۔ کسی حد تک نارمل ہو گیا۔ بڑا تیکھا اور انوکھا سا ذائقہ تھا۔ میں نے ایسا اسکوائش کبھی نہیں پیا تھا۔ نہ اس ذائقے کی شراب کے بارے میں کبھی سنا یا پڑھا تھا۔ میں نے کبھی شراب پی نہیں تھی۔

"میں چلتا ہوں۔" طیب نے اچانک کھڑے ہو کر کہا۔ میں بھی حیران رہ گیا۔

"کیوں.........؟ ایلیا سے نہیں ملو گے؟" میں نے پوچھا۔ وہ ویسے ہی سر جھکائے کھڑی تھی پھر اچانک پلٹی اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

"یار! تم سمجھتے کیوں نہیں ہو۔ میں کہہ رہا ہوں کچھ گڑبڑ ہے یہاں۔" وہ اس کے جاتے ہی میرے قریب بیٹھ کر بولا۔ اب اس کی بوکھلاہٹ بڑھ گئی تھی۔ "ایلیا کہیں نہیں جا سکتی۔ میں نے فون کر کے کہا تھا کہ میں سامان لے کر آؤں گا۔ اسے بازار کیوں جانا پڑتا؟ پھر......... اسے پتا تھا کہ میں آنے والا ہوں۔ اس کی بیٹی بھی سامنے نہیں آئی۔ چلو' وہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ ایلیا اس کے سلسلے میں ذری ہوئی ہے مگر......... وہ خود کہاں ہے؟ یہ کون ہے' اسے میں نہیں جانتا۔ میرا خیال تھا کہ وہی ایلیا کی بیٹی ہو گی مگر تم نے سنا......... اس نے اس بات سے بھی انکار کیا ہے۔"

وہ بولتا ہی چلا گیا۔ "مگر اس میں بھاگنے کی کیا ضرورت ہے۔ کچھ انتظار کر لیتے ہیں۔ ایلیا آجائے گی پھر تم میرا تعارف کرانے کے بعد چلے جانا۔ اسی سے پتا چلے گا کہ یہ کون ہے؟ ہو سکتا ہے' یہی اس کی بیٹی ہو اور مذاقاً انکار کر رہی ہو۔ کیا ایلیا کی جھلک نہیں ہے اس میں؟"

"توبہ کرو یار.........! اسے دیکھ کر تو آدمی ڈر جاتا ہے اور......... یہ......... خدا کی پناہ......... مونیکا اور جیہ تو اس کے آگے تیل بیچتی ہیں۔ یار ضیاء! میری چولیں تو اسے دیکھتے ہی ہل گئیں۔ یار! میں' میں بڑا کم ظرف آدمی ہوں۔ زیادہ برداشت ہے نہیں مجھ میں۔ کوئی الٹی سیدھی حرکت ہو گئی تو......... سالی کو دیکھ کر حلق چھل گیا۔ آنکھوں کے اندر بھٹی جل اٹھی ہے اور......... اور......... خیر' چھوڑو......... بھائی! تم مجھے معاف کرو۔ پتا نہیں' یہ ایلیا کی بچی گئی کہاں؟ اسے تو گیٹ پر انتظار کرنا چاہئے تھا۔"

وہ بڑا مضطرب تھا۔ دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے سے مسل رہا تھا۔ ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

"کچھ انتظار کر لو۔" میں نے دھیرے سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے تھپتھپایا کہ وہ ریلیکس ہو سکے۔ اس نے نگاہ اٹھا کر مجھے دیکھا پھر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے کمرے کا پھر جائزہ لیا اور بولا۔ "بڑا خوبصورت کمرا ہے۔ میرا خیال ہے تمہارا واحد دوست ہو گا جو اس قدر خوش ذوق ہے۔"

"نہیں یار.........! وہ بیچارہ تو بڑا بدذوق ہے۔ صرف اسی قدر خوش ذوقی ہے اس کے اندر کہ اسے یہ احساس ہے کہ وہ بہت بدذوق ہے۔" طیب نے بھی ستائشی نگاہوں سے کمرے کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"پھر یہ کمال تمہاری اس میڈیم ایلیا کا ہے۔"

"نہیں.........! وہ بھی بہت پھوہڑ عورت ہے۔ پارٹی سے پہلے یا......... میرا مطلب ہے کہ کسی دوست کو لانے سے پہلے ہمیشہ مجھے یہ تاکید کرنا پڑتی ہے کہ وہ صفائی ضرور کر لے۔ میرے دوست صفائی پسند یا وی وی آئی پی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی میں یہ بھی باور کراتا ہوں کہ اس طرح اس کی ورزش بھی ہو جائے گی اور وہ اس بار یقیناً مجھے پانچ سال چھوٹی دکھائی دے گی تبھی کچھ ہاتھ پاؤں ہلا لیتی تھی مگر اپنے بناؤ سنگھار کے سلسلے میں زیادہ اور صفائی ستھرائی کے لئے کم۔"

"پھر یہ کمال اس کی بیٹی کا ہو گا۔" میں نے پریقین انداز میں کہا۔ "یہ لڑکی........."
میں نے اس دروازے کی طرف اشارہ کیا جہاں اس پراسرار لڑکی کا وجود غائب ہوا تھا۔
"یقیناً اس کی بیٹی ہے۔ شاید اس کے بے پناہ حسن کی وجہ سے ہی ایلیا پریشان تھی کہ کہیں تم یا......... تمہارے دوست........."

"اگر یہ اس کی لڑکی ہے تو میں اسے دنیا کا آٹھواں عجوبہ یا خدا کا آخری معجزہ ماننے کو تیار ہوں۔ ایلیا کے کمرے میں' میں نے اس کے شوہر کی تصویر بھی دیکھی ہے۔ جو نیگرو تھا۔ انتہائی بدشکل' بدہیئت اور خوفناک تھا جب کہ خود ایلیا بھی انیس بیس کے فرق سے ویسی ہی ہے۔"

وہ کافی حیران تھا۔ میں پھر اسی لڑکی کو دوبارہ دیکھنے کی توقع میں کھلے دروازے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ کسی کے چلنے کی آہٹ محسوس ہوئی۔ چاپ ابھری تو میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اب میں خود کو کافی مضبوط محسوس کر رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ جواب سے پہلے

ایک دھندلایا ہوا سا منظر تھا' اب کی بار خاصا واضح ہو گا۔ میں اپنے حواسوں پر گرفت سخت کر چکا تھا۔ میں بڑی گہرائی سے اسے دیکھنے اور محسوس کرنے کا متمنی تھا۔

کمرے کے دروازے پر پہلے سایہ پڑا تھا۔ بڑا لمبا سا پھر جو عورت سامنے آئی اسے دیکھ کر طبیعت مکدر ہو گئی۔ طیب کے فوراً کھڑے ہو کر مخاطب کرنے سے جانا کہ وہ ایلیا ہے۔ طیب کہہ رہا تھا۔

"کہاں تھیں تم؟"

"ام کچن میں .....ادھر تھا۔ تمہارا ویٹ کرتا تھا۔ ام کو پتا تھا تم آتے ہی چائے کا ہنگامہ کرتا ہے۔ ام سوچا پانی رکھ کر گیٹ کھول دے گا مگر....." اچانک وہ بولتے بولتے حیران ہو گئی ہے۔ اس نے پلٹ کر دور نظر آنے والے بیرونی دروازے کو دیکھا پھر ہم دونوں کو حیرت سے تکتے ہوئے بولی۔ "تم لوگ ادھر میں کیسا آیا؟"

"کیسا آیا' کیا مطلب.......... تمہیں بتایا تو تھا کہ ہم آ رہے ہیں۔" طیب جھلا گیا۔

"بٹ.........! ڈور کون کھولا؟" وہ اب بھی حیرت سے پریشان تھی۔

"تمہاری بیٹی نے کھولا تھا۔" میں نے جواب دیا۔ وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔

"یہ میرے دوست ضیاء ہیں۔ یہ یہیں رہیں گے۔ یہ پیکٹس اٹھا لو۔ ان میں ضرورت کی تمام چیزیں ہیں' اگر پھر بھی.........."

"امارا بیٹی......... یو مین' مائی ڈاٹر؟" اس نے طیب کی بات پر دھیان نہیں دیا۔

"اوہ یس مادام.........! تمہاری بیٹی نے گیٹ کھولا' یہاں بٹھایا اور.........." طیب اس ٹرے کی طرف ہاتھ پھیلا کر رہ گیا جو وہ لڑکی یہاں رکھ گئی تھی اور جس میں اب بھی کانچ کے گلاس خالی ہوئے رکھے تھے۔

"یہ........." اس نے پھر طیب کی بات کاٹ دی۔ "یہ........ کون لایا........؟"

اب اس کا ایک ہاتھ دروازے کی چوکھٹ پر اور دوسرا اپنی کنپٹی پر جم گیا۔ میں کچھ کچھ اس کی کیفیت کو سمجھ رہا تھا۔ میں جلدی سے آگے بڑھا۔ میں نے اسے سہارا دے کر قریبی صوفے پر بٹھا دیا۔ اب طیب بھی کچھ پریشان ہو گیا۔

"میڈم! کیا بات ہے......... آپ کیوں پریشان ہیں؟" میں نے سوال کیا۔

"امارا ڈاٹر آج سویرے چلا گیا۔ اس کا انکل اور انکل کا ڈاٹر آیا اور اس کو اپنے گھر لے گیا اور بولا ادھر گیسٹ آنا مانگتا ہے اور تم......... تم لوگ بولتا کہ امارا ڈاٹر بٹھایا اور

یہ.......... یہ.........." اس نے بھی ٹرے کو خوفزدہ نگاہوں سے دیکھا۔

"مگر وہ لڑکی.........."

طیب نے کچھ کہنا چاہا مگر میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ "آپ کہاں تھیں؟" میں نے ایلیا سے سوال کیا۔ وہ چند لمحے خالی خالی نگاہوں سے مجھے دیکھتی رہی پھر چونک اٹھی' بولی۔

"ام کچن میں تھا۔ چائے بناتا تھا۔ ڈور اچانک بند ہو گیا۔ ہوا تیز تھا یا شاید.......... ام ایک غلطی کیا' سویرے سے پچھلا ڈور کچن کا بند کر دیا کیونکہ ادھر سے مٹی بھوت آتا تھا اور اسے لاک کر دیا تھا۔ کی ادھر امارا کمرے میں تھا۔ ادھر کا ڈور بند ہو گیا تو ام بھوت اپ سیٹ ہو گیا۔ ام اندر لاک تھا اور تم لوگ آتا تھا۔ ام بھوت شور مچایا' پر جانتا تھا ادھر میں دور تک کوئی امارا آواز نہیں سن سکتا۔"

"پھر اب......... تم کیسے نکلیں؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی اچانک ڈور کھل گیا۔ ام بھوت کوشش کیا تھا۔ پر.......... پتا نہیں.......... مگر.......... نہیں.......... یہ ٹرے.......... گلاس.......... یہ ادھر میں کیسا آیا؟ کون لایا؟ یہ تو کچن میں تھا۔"

اب طیب سفید ہو چکا تھا۔ میں جان گیا کہ بات اس کی سمجھ میں آ چکی ہے۔ میں تو بہت کچھ سمجھ گیا تھا اور یہ بھی سوچ چکا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔ مگر ایلیا کو مطمئن کرنا بہرحال ضروری تھا۔ یہ جاننا بھی کہ یہاں ایسا واقعہ پہلی بار ہوا ہے یا اب سے پہلے بھی ہوا ہے۔ طیب اسے حقیقت بتانے کو بے چین تھا۔ میں نے اسے بولنے دیا۔ خود ایلیا کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا۔ وہ واقعی ایک بدشکل عورت تھی۔

لمبا چوڑا جسم' مردانہ ساخت کے چوڑے چوڑے' موٹے موٹے ہاتھ پاؤں' موٹی موٹی سیاہ پنڈلیاں' چوکور چہرہ' چھوٹی اور اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں' پتلی پتلی بھنویں' اوپر سے پتلی مگر نتھنوں تک آتے آتے ایک دم چوڑی ہو جانے والی ناک اور اتنی بڑی ناک کے نیچے دو لکیروں کی مانند بھنچے ہوئے ہونٹ۔ ایسے چہرے پر جب خوف پھیل جائے تو وہ اور بھیانک لگتا ہے مگر اس کے چہرے پر جبڑے کے نیچے لٹکی ہوئی کھال کچھ اور لٹک آئی تھی اس کے علاوہ اس کی آنکھوں میں خوف تھا مگر چہرے کے زرد ہونے کا کوئی چانس نہیں تھا اس لئے کہ وہ کالی تھی البتہ اس کا چہرہ اودا اودا سا ہو رہا تھا۔ جب وہ بولنے کی

کوشش کرنے لگی تب احساس ہوا کہ وہ بہت زیادہ خوفزدہ ہے۔ وہ ہکلا کر رہ گئی اور اس کا چہرہ اور اس پر تنگی کھال میں لرزہ سا پیدا ہو گیا۔

"نہیں..........! ادھر میں کوئی نہیں ہے۔" وہ بڑی ہمت کر کے بولی۔

"ممکن ہے' کوئی پڑوسن ہو۔ کوئی شریر سی پڑوسن جس نے تمہیں اندر بند کر دیا اور پھر ہم لوگوں پر یہ تاثر دیا کہ وہی ہماری میزبان ہے۔" طیب نے کہا۔

"نہیں..........! برابر والا کوٹھی میں مسز جیکس تھا۔ پرسوں اس کا ڈیتھ ہو گیا۔ اس کا ڈاٹر اور ایک سن تھا' انگلینڈ سے آیا تھا۔ وہ کل یہ کوٹھی بند کر کے چابی ام کو دے کر چلا گیا۔ دوسری طرف کوئی نہیں.......... کوئی بلڈنگ تک نہیں۔ ایک ڈینٹل کالج کا پلاٹ ہے۔ پیچھے بھی کچھ نہیں۔ بہت دور جا کر ایک فیکٹری ہے اور بس.......... ادھر میں کوئی نہیں ہے۔"

وہ جلدی جلدی بتا رہی تھی۔ مصیبت یہ تھی کہ ٹرے ہمارے سامنے دھری تھی ورنہ اس کے لئے ہماری بات کو جھٹلا دینا مشکل نہ تھا۔ اب ہم سوچتے رہتے کہ اسے سچ کیسے ثابت کریں۔ اب بھی وہ ہماری بات ماننے کو تیار نہ تھی مگر مجبوری سخت آڑے آ رہی تھی۔ اچانک طیب کھڑا ہو گیا۔

"ضیاء بھیا..........! میں تو چلا۔"

"کہاں؟" میں چونک گیا۔

"کسی گوشہ عافیت میں۔ تمہارا تو اٹھنا بیٹھنا ہی ایسے لوگوں میں ہے مگر میں باز آیا۔ ایسا حسن جو وحشت زدہ کر دے' چولیں ہلا دے۔ آدمی کو جیتا نہ چھوڑے۔ اس سے توبہ ہی بھلی۔"

"کمال ہے' حسن اور حسین لوگوں کا مجھے تو نہ تجربہ ہے' نہ ان میں اٹھنے بیٹھنے کی تمیز.......... نہ دوستی کا شوق.......... تمہارے لئے تو یہاں کافی چارم موجود ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم مونیکا کو بھول جاؤ گے۔" میں مسکرایا۔

"نہیں یار! ٹھیک ہے کہ مونیکا اس کا عشر عشیر بھی نہیں مگر میرے لئے وہی کافی ہے۔ ویسے میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ تم واپس گھر چلو۔ یہاں معاملہ زیادہ گمبھیر لگتا ہے۔"

"نہیں!" میں نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا۔ "میں یہیں رہوں گا۔ وہ دو باتیں مجھے بھی پسند ہیں۔"

ایلیا حیران سی ہماری باتیں سن رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ اس کا تجسس اس کی پریشانی بڑھانے کا سبب تو بن سکتا ہے کچھ اور نہیں۔ اس لئے کہا۔ "ایلیا! تم پریشان نہ ہو۔"

اس نے میری پوری بات سنے بغیر ہی کاٹ دی۔ "مگر مسٹر ضیاء! ایسا ممکن نہیں ہے۔ کیا کوئی لڑکی گیٹ کے اوپر سے آ سکتی ہے؟"

"وہ کہیں سے بھی آ سکتی ہے۔" طیب نے جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔

ممکن ہے' وہ اس سے زیادہ بھی کچھ کہتا مگر میں نے آنکھ کے اشارے سے اسے منع کر دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ایلیا خوفزدہ ہو۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ میں اندر سے بے پناہ مطمئن ہو چکا تھا۔ مجھے یقین آ گیا تھا کہ وہ زیوسا یا اس کی کوئی کارستانی ہو گی۔ اطمینان بھی بہت تھا کہ اسے علم ہو چکا ہے کہ میں طیب کا گھر چھوڑ آیا ہوں اور یہی تو میں چاہتا تھا۔ خود مجھے تو اس کی گرفت سے نکل جانے میں کوئی بھی دشواری نہ تھی مگر پچھلا حساب بے باق کرنے کا جو سودا سمایا تھا' وہ مجھ پر غالب تھا۔

"کون؟" ایلیا اب ہراساں نظر آ رہی تھی۔

"نہیں ایلیا! ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ تم سے مذاق کر رہا ہے۔" میں نے اسے اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ "یہاں کوئی نہیں تھا۔ تم نے یقیناً میرے بیڈ روم کا کوئی انتظام کر لیا ہو گا؟"

"اوہ.......... ہاں مسٹر ضیاء.......... آپ کا بیڈ روم پہلی منزل پر ہے۔ ایک گیسٹ روم نیچے بھی ہے مگر.......... وہ صاف نہیں تھا۔ امارا ڈوٹر ادھر اپنا سامان چھوڑ گیا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میرے لئے کوئی مسئلہ نہیں۔ آپ یہ اٹیچی کیس.........." میں کہتے کہتے رک گیا۔ "چلیں مجھے بیڈ روم دکھا دیں۔ میں اسے وہاں رکھ دیتا ہوں۔"

وہ مڑ گئی مگر اس کے چہرے پر چھائی الجھن ابھی موجود تھی۔ میں خود کو بہت نارمل سا ظاہر کر رہا تھا۔ اس لئے شاید اس کی الجھن بڑھ گئی تھی جب کہ طیب کے تاثرات غالباً اس کی سمجھ سے بالکل باہر تھے۔ طیب بھی میرے ساتھ ہو لیا۔ یہاں اندر ہی کی جانب کچن کے دروازے سے ملی ہوئی سیڑھیاں تھیں جو پہلی منزل تک جا رہی تھیں۔ یہ سیڑھیاں لکڑی کی تھیں جو ہمارے قدموں تلے چرک چوں بول رہی تھی۔ ایلیا بھاری بھر کم عورت تھی۔ طیب دبلا پتلا تھا مگر میں اچھا خاصا لمبا چوڑا اور بھاری تھا۔ مجھے موٹا تو ند نکلا

ہوا کوئی بنیا ٹائپ کا آدمی نہ سمجھنے لگا۔ میرا جسم سمٹا ہوا ضرور تھا مگر تھا بھاری۔ مجھے یقین تھا کہ میرے اور ایلیا کے وزن ہی سے یہ سیڑھیاں بول رہی تھیں۔ مگر مضبوط تھیں۔ لگتا تھا کہ ٹوٹیں گی نہیں۔ ہم پہلی منزل پر پہنچے۔ یہ منزل خالصتاً لکڑی سے تعمیر کی ہوئی تھی ورنہ اصل عمارت تو بہت اونچی تھی۔ اتنی اونچی چھت تھی کہ اس کے اندر ہی دوسری منزل پر دو کمرے اور باتھ روم بنائے گئے تھے۔ اسی لئے باہر سے اس کی دوسری منزل نظر نہیں آتی تھی بلکہ یہ ایک ہی منزلہ کوٹھی نظر آتی تھی۔

ہم ایلیا کے پیچھے ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ یہ بڑا صاف ستھرا اور قیمتی سامان سے سجا ہوا بیڈ روم تھا۔ الماریاں دیوار میں نصب تھیں۔ بہت بڑا بیڈ روم تھا۔ ضرورت کی ہر چیز یہاں موجود تھی۔ بیڈ پر ہلکے نیلے رنگ کی چادر بچھی تھی جس کے کنارے سیاہ تھے۔ گہرے نیلے رنگ کے بھاری پردے کھڑکیوں پر پڑے تھے۔ ایک کھڑکی تھی جو پچھلی دیوار پر بنائی گئی تھی جو باہر کی جانب کھلتی تھی جب کہ دوسری کھڑکی لکڑی کی دیوار میں تھی جو اندرونی جانب کھلتی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کھلی کھڑکی سے جھانکا تو نیچے ڈرائنگ روم کا وہی حصہ تھا جہاں اب سے ذرا دیر پہلے ہم بیٹھے تھے۔ یہاں سے عمارت کا وہ دروازہ بھی نظر آ رہا تھا جہاں سے اندر داخل ہو کر ہمارا پہلا قدم ڈرائنگ روم میں پڑا تھا۔

دوسری کھڑکی سے باہر گیٹ کا منظر دائیں جانب نظر آتا تھا۔ گویا میں اندر اور باہر دونوں طرف کا نظارہ ان کھڑکیوں سے کر سکتا تھا۔ باہر والی کھلی کھڑکی سے دھوپ اور تازہ ہوا اندر آ رہی تھی۔ کمرا روشن تھا۔ ایک جانب لکڑی کے تختے لگا کر بڑی خوبصورت سی الماری بنائی گئی تھی جہاں کئی طرح کی شراب کی بوتلیں سجی ہوئی تھیں۔ اس الماری سے دو قدم آگے کی طرف ایک لمبا تختہ تھا جو کاؤنٹر کی طرح تھا اور اس تختے کے نیچے گول اسٹول رکھے تھے۔ نازک کانچ کے مختلف ڈیزائن کے گلاس اور جام رکھے تھے۔ جن سے اس کوٹھی کے مالک کی عیاش طبیعت کا خوب اندازہ ہوتا تھا۔ دیواروں پر اکثر جگہ عورتوں کی پینٹنگ لگی ہوئی تھیں۔ ان کے خطوط واضح نہ تھے بلکہ یہ تجریدی آرٹ کے نمونے تھے۔ ایک تصویر بیڈ کے بالکل سامنے والی دیوار پر لگی تھی۔ اس میں مصور نے سب رنگ کو جا بہ جا ہلکے اور گہرے رنگ میں استعمال کیا ہوا تھا۔ پہلی نگاہ میں میں جان نہیں پایا کہ اس نے کیا بنانے کی کوشش کی ہے مگر وہاں ایک آنکھ بے حد واضح نظر آئی تھی۔

میں کمرے کا تفصیلی جائزہ لے رہا تھا۔ ممکن ہے اس تصویر کو بھی سمجھنے کی کوشش کرتا کہ طیب نے میری توجہ ادھر سے ہٹا دی۔

"ضیاء! تم بہت ڈھیٹ مگر بے خوف آدمی ہو۔ تمہیں ذرا ڈر نہیں لگ رہا کہ وہ یہاں بھی پہنچ گئی۔" وہ بیڈ پر بیٹھا تھا۔

میں اس بیڈ کے دائیں طرف دیوار کے ساتھ بنے صوفے پر بیٹھ گیا۔ ایلیا غالباً نیچے جا چکی تھی۔ "اسی لئے تو یہاں آیا ہوں۔" میں نے گہرا سانس لیا۔ "یہی مقصد تھا میرا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری وجہ سے تم لوگوں کو............"

"تمہیں کیسے پتا کہ وہ اب ہم لوگوں کو تنگ نہیں کرے گی۔ یار! جو آفت میرٹھ سے دہلی اور پھر دہلی سے بمبئی آ سکتی ہے وہ............" طیب جھلا گیا تھا۔

"گمان ہے کہ اگر اس میں ذرا بھی شرافت ہوئی تو اسے ادھر کا رخ نہیں کرنا چاہئے۔ اگر وہ باز نہیں آئی تو............ تو پھر میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔"

"طیب نے بڑا زوردار قہقہہ لگایا۔ "پاگل ہو گئے ہو تم! اتنی خوش فہمیاں مت پالو۔ مکڑی کی طرح مسل ڈالے گی وہ تمہیں۔"

"اور جو میں نے اسے مسل ڈالا تو؟" میرے انداز میں چیلنج محسوس کر کے طیب مزید حیران ہو گیا۔ میرے چہرے کو کچھ دیر تک چپ چاپ گردن ٹیڑھی کئے دیکھتا رہا پھر گہرا سانس لے کر سیدھا ہو گیا۔

"دیکھو یار ضیاء! میرا اس سلسلے میں کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ وہ اگر تمہیں ملے تو اسے بتا دینا۔"

"کیوں............ تمہیں تو پُراسراریت بڑا اٹریکٹ کرتی ہے............" میں نے اسے طیش دلانا چاہا۔

"پُراسراریت نہیں 'پُراسرار عورتیں............" وہ جلدی سے بولا مگر شاید پھر اسے فوراً ہی احساس ہو گیا کہ وہ غلط بول گیا۔

"وہی 'وہی............" میں نے بات پکڑ لی۔ "کیا یہ عورت پُراسرار نہیں تھی جس کے ہاتھ سے تم مشروب پی چکے ہو؟"

میرے اس جملے نے اسے سفید کر دیا۔ اچانک اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں اور اس خوف اور پھیلی ہوئی آنکھوں ہی نے مجھے لمحہ بھر کو ساکت کر دیا۔ مجھ پر بھی

پہلی بار ادراک ہوا کہ ہم دونوں ہی اس کی چال میں آ گئے ہیں۔ یہ خیال مجھے کیوں اور کیسے آیا' بخدا میں نہیں جانتا مگر یہ احساس شدید سے شدید تر ہوتا چلا گیا کہ وہ ہم پر غالب آنے کو کمند پھینک چکی ہے۔ اسی شدید احساس نے مجھے طیب کی طرف سے خوفزدہ کر دیا اور میں نے لمحہ ضائع کیے بغیر اپنا والٹ نکالا۔ میں وہ پتھر دیکھنا چاہتا تھا مگر پھر مجھے یاد آ گیا کہ وہ میں طیب کو دے چکا ہوں۔

"طیب! وہ پتھر........ وہ ہے تمہارے پاس؟"

"نن......... نہیں تو......... وہ تو میں......... وہیں اپنے کمرے میں......... بیڈ کی دراز میں........."

"اوہ!" میں نے اپنا سر تھام لیا۔ "جاؤ......... جلدی گھر جاؤ۔" میں کھڑا ہو گیا۔ طیب بھی بدحواس ہو کر کھڑا ہو چکا تھا۔ میں نے اسے کاندھے سے تھام کر کہا۔

"طیب! اس پتھر کو ابھی جاتے ہی موم جامہ کر کے اپنے بازو پر باندھ لو۔ سن لیا تم نے؟ جو کچھ میں نے کہا ہے وہ فوراً کر ڈالو۔ وقت ضائع کیے بغیر۔"

یہ کہہ کر میں نے فوراً ہی اسے کاندھوں سے پکڑ کر اس کا رخ باہر کی طرف کر دیا۔

"جلدی۔"

وہ تیزی سے کمرے سے باہر چلا گیا۔ اور پھر میں نے کھڑکی کی سیڑھیوں پر اس کے بھاگتے ہوئے اترنے کی آواز سنی۔

"اے......... اے مین.........! چائے........."

باہر سے ایلیا کی آواز آئی مگر طیب نے شاید کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے جلدی سے اندرونی جانب کھلنے والی کھڑکی سے جھانکا۔ وہ ڈرائنگ روم عبور کر کے دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ پھر میرے سامنے ہی وہ دروازہ بھی عبور کر گیا۔ میں اٹھ کر دوسری جانب کھڑکی تک آ گیا۔ یہاں سے میں گیٹ تک اسے دیکھ سکتا تھا۔ میں نے دیکھا۔ وہ تیزی سے درمیانی راستہ عبور کر رہا تھا۔ میرا دل حلق میں دھڑکنے لگا۔ میں دعا کر رہا تھا کہ وہ خیریت سے باہر نکل جائے۔ گیٹ کے باہر' سڑک کے کنارے اس کی گاڑی بھی یہاں سے صاف دکھائی دے رہی تھی۔ میری دعائیں قبولیت پا رہی تھیں۔ وہ گیٹ سے نکل کر گاڑی میں جا بیٹھا۔ کچھ بھی نہ ہوا۔ پھر اس کی گاڑی اسٹارٹ ہوئی اور دور تک سڑک پر جاتی دکھائی دیتی رہی۔ میری جان میں جان آئی۔ گاڑی موڑ پر مڑی تو میری نگاہوں سے

اوجھل ہو گئی۔ عین اس لمحے دروازے پر آہٹ ہوئی۔ میں اچھل پڑا۔ سامنے ایلیا کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چائے کی ٹرے تھی۔ ٹرے میں دو کپ تھے۔

"یہ......... مسٹر طیب کو کیا ہوا؟"

"ضروری کام یاد آ گیا۔" میں نے اس کے ہاتھ سے ٹرے لے لی۔ "بیٹھیں! آپ پی لیں۔" میں نے اپنا کپ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"اوہ نو.........! ام چائے نہیں پیتا۔" وہ اسی طرح کھڑی رہی۔ وہ میرا جائزہ لے رہی تھی۔ "تم کتنا دن یہاں رہے گا؟" اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"ابھی تو کچھ کہہ نہیں سکتا۔ لیکن......... کیا آپ کو کچھ پریشانی ہے؟"

"نن......... نہیں.........! وہ اماں یا ڈارٹر........."

آپ اسے بلا لیں۔ میں طیب کی کمپنی کا نہیں ہوں۔ آپ کو مجھ سے قطعی خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔" میں نے اسے اطمینان دلانا چاہا مگر شاید میں کامیاب نہیں ہو سکا کیونکہ وہ بغیر جواب دیئے الٹے قدموں پلٹ گئی۔

دروازے سے نکلنے ہی والی تھی کہ اسے کچھ یاد آ گیا۔

"آپ ڈنر میں کیا لے گا؟"

"جو کچھ آپ پسند کرتی ہوں۔" میں نے انتہائی اپنائیت سے کہا۔ مجھے اپنے لہجے پر شروع ہی سے پورا عبور حاصل تھا۔ اسی لئے مجھے یقین ہوتا ہے کہ جو میں چاہوں' آدمی پر وہی تاثر چھوڑ کر اپنے لئے راہ ہموار کر سکتا ہوں۔ اس نے ایک لمحے کے لئے میری طرف دیکھا پھر اس کے کرخت چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ام میٹ پسند نہیں کرتا۔"

"اچھا ہے۔ مجھے خود بھی میٹ سے اتنا لگاؤ نہیں۔ میرے گھر میں دالیں اور سبزیاں شوق سے کھائی جاتی ہیں۔"

وہ ایک دم خوش ہو گئی۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس نے کوٹھی کے پچھلے لان میں جگہ جگہ سبزیاں بوئی ہیں اور وہ دانوں کو بھیگی ہوئی بوری میں پھیلا کر ان کے ڈنٹھل نکلنے کے بعد پکا کر کھانے کی شوقین ہے۔ میں نے بھی اسے پسند کیا۔ وہ کچھ اور کھل گئی۔ اس نے اپنے شوہر کے بارے میں بتایا کہ وہ صرف شراب کی وجہ سے مرا ہے۔ اس کا جگر اور پھیپھڑے خراب ہو چکے تھے۔ سگریٹ اور شراب اس کی زندگی کا اہم جزو تھے اور ان

دونوں چیزوں سے اسے اسی لئے نفرت ہو گئی۔ غنیمت تھا کہ میں نے اس وقت تک اس کے سامنے سگریٹ نہیں پیا تھا ورنہ میں اسے خود سے بھی متنفر کر دیتا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں بھی ان دونوں چیزوں سے دور رہتا ہوں تو یوں لگا جیسے ہمارے درمیان کی ساری دیواریں گر گئی ہوں۔ وہ اتنی بے تکلف اور بے خوف ہو گئی کہ اس نے مجھے بڑی تفصیل سے بتا دیا کہ اس کی بیٹی نے اپنے شوہر سے لڑ جھگڑ کر طلاق لی اور اب کیسی پریشانی میں یہاں پہنچی ہے۔

اس نے یہ بھی بتا دیا کہ ہمارے آنے کا سن کر ہی اس نے بیٹی کو زبردستی اپنی بہن کے گھر بھیج دیا ہے کیونکہ وہ طیب اور اس کے دوستوں سے واقف ہے۔ اس کوٹھی کے مالک نے ایلیا کے شوہر کو بچانے کے لئے کافی وقت اور پیسا پانی کی طرح بہایا تھا۔ برے وقت میں اس کا بہت ساتھ دیا تھا۔ وہ اس کے شوہر کا اپنے باپ کی طرح اور اس کا اپنی ماں کی طرح احترام کرتا تھا مگر کیونکہ اسے عورت اور شراب کی لت تھی اس لئے اس نے اپنی بیٹی کو کبھی اس کی موجودگی میں یہاں نہیں بلایا تھا۔ وہ اسے پسند کرتی تھی مگر ان برائیوں کی وجہ سے اس پر اعتماد نہیں کرتی تھی۔ پھر اس نے جو پارٹیاں یہاں دیکھی تھیں اور جس قسم کی ہلڑ بازیاں یہاں مچائی گئی تھیں، وہ اسے محتاط رویہ اپنانے پر مجبور کرتی تھیں۔

اس کے جانے کے بعد اکثر یہاں سکون ہو جانے کے بعد اس نے بیٹی کو بلایا اور ٹھہرایا ہے مگر جب کسی دوست کا فون آیا کہ وہ صفائی ستھرائی یا پارٹی کا اہتمام کر لے۔ اس نے فوراً ہی اپنی بیٹی کو روانہ کر دیا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ ایسی پارٹیوں سے اسے بہت فائدہ پہنچتا ہے کیونکہ اکثر کھانے پینے کی چیزیں وافر مقدار میں بچ جاتی ہیں اور اس کا کافی پیسہ بچ جاتا ہے کہ جس سے وہ اپنی بیٹی یا داماد کو تحفہ بھیج سکتی ہے مگر اسے یہ پارٹیاں بالکل پسند نہیں تھیں۔ شوہر کی موجودگی میں تو اسے ان پارٹیوں سے بے پناہ وحشت ہوتی تھی کیونکہ وہ ان لوگوں کے ساتھ بھی ڈرنک کرتا تھا اور اکثر بوتلیں بچا کر بعد میں بھی وحشت پڑا رہتا تھا۔ اب بچی ہوئی بوتلیں اکثر دوسری پارٹی پر کام آ جاتی ہیں۔

☆=============☆=============☆

"یہ دیکھو..........." اس نے سامنے بنے بار کی طرف اشارہ کیا۔

"انہیں ضائع کر دو۔" میں نے کہا۔

"وھاٹ؟" وہ حیران ہو گئی۔ "طیب ناراض ہو جائے گا۔"

"نہیں.......... میری موجودگی میں ایسی کوئی پارٹی یہاں نہیں ہو سکتی۔ میں ذرا دوسری قسم کا آدمی ہوں۔"

وہ بہت خوش ہو گئی۔ "مسٹر ضیاء! ام.......... امارا ڈاٹر کو بلا لیوے؟"

"آں.......... ہاں.......... میں نے تو پہلے ہی کہا ہے کہ آپ بے فکر ہو جائیں مگر.......... آپ کی مرضی.........."

وہ خوش ہو گئی پھر وہ ڈنر کا انتظام کرنے کا کہہ کر چلی گئی۔ اس وقت مجھے اس میں اپنے یہاں کی ماؤں میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوا۔ وہ.......... مغرب کی عورت بھی اپنی بیٹی کے لئے اسی طرح پریشان اور محتاط تھی جیسے مشرق کی عورت ہوتی ہے۔ مجھے طیب پر غصہ آیا اور اس انجانے شخص پر بھی جسے میں نہیں جانتا تھا اور جو اس کوٹھی کا مالک تھا۔ اس نے اس عورت کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کے باوجود اسے وسوسوں میں گھیر دیا تھا۔

ایلیا کے جانے کے بعد میں نے کمرے کا ایک بار پھر جائزہ لیا۔ سب کچھ سلیقے کا عکاس تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ میں کھانے میں بھی کوئی بدذائقہ چیز نہیں پاؤں گا۔ چائے اچھی تھی۔ "وہ لڑکی کون تھی؟" یہ کانٹا ابھی ذہن میں چبھا ہوا تھا۔ اچانک بجلی سی کوندی۔ "کیا وہی ایلیا کی بیٹی ہے؟ کیا ایلیا اسی لئے اس کی طرف سے اس قدر پریشان رہتی ہے۔ ہو سکتا ہے اس نے خود اسے کمرے ہی میں رہنے کو کہا ہو۔ وہ نہیں ہو اور ایلیا حفظ ماتقدم کے طور پر مجھ سے اگلوا رہی تھی کہ میں کس ٹائپ کا بندہ ہوں، مجھ سے اس کی بیٹی کو کوئی خطرہ تو نہیں؟ اور پھر وہ کس قدر خوش ہوئی ہے۔ اس نے اجازت بھی چاہی ہے کہ وہ بیٹی کو بلا لے۔ ظاہر ہے ایک ہی گھر میں رہ کر کسی بھی وقت سامنا ہو سکتا

ہے اور پھر ہم تو اسے بتا بھی چکے کہ وہ ہمیں مشروب بھی دے گئی ہے۔ ہاں' ہو سکتا ہے اس نے پیا ہو۔ ایلسیا اسی لئے پریشان ہوئی ہو کہ منع کرنے کے باوجود........."

سارا معاملہ میرے سامنے کھل گیا۔ بے ساختہ مسکراہٹ لبوں تک آ گئی۔ اب یقیناً وہ بیٹی کو اس کی اس حرکت پر ڈانٹنے گئی ہے لیکن بہرحال اب وہ مطمئن ہو گی۔ میں نے پوری کوشش کی تھی اسے اطمینان دلانے کی۔ اب آگے اس کی مرضی۔ میں لیٹ گیا۔

میں نے ہاتھ سر کے نیچے رکھنے کے لئے اوپر کی جانب کیا تو سائیڈ پر رکھا ہوا ٹیلی فون سیٹ گرنے لگا۔ میں نے لپک کر سنبھال لیا۔ خیال آیا تو ریسیور کان سے لگا کر چیک کیا۔ فون ٹھیک تھا۔ ٹون آ رہی تھی۔ میں ریسیور رکھنے ہی والا تھا کہ مجھے طیب کا خیال آیا۔ اسے یہاں سے نکلے ہوئی ابھی اتنی دیر نہیں ہوئی تھی کہ وہ گھر پہنچ جاتا پھر بھی میں نے نمبر ڈائل کئے۔ دوسری طرف بیل بجتی رہی پھر کسی نے فون اٹھا لیا۔

"ہیلو؟" میں نے کہا۔

"ہیلو! کس سے بات کریں گے؟" زہرہ آپا کی آواز تھی۔

"زہرہ آپا!"

"ارے ضیاء! تم.......... کہاں چلے گئے تم؟" وہ میری آواز سن کر خوش ہو گئی تھیں۔ "وہاں پہنچے تو پتا چلا کہ یہاں ہو اور یہاں پہنچے تو ایاز نے بتایا کہ اپنی اٹیچی سمیت جا چکے ہو۔ تم بول کہاں سے رہے ہو؟"

"آپا میں یہیں ہوں۔ بمبئی میں......... آؤں گا کسی وقت......... آپ ٹھیک ہیں نا!"

"نہیں تو تم گئے کہاں؟ اٹیچی کیوں لے کر گئے ہو! پتا ہے' طاہر ناراض ہو رہے تھے۔"

"میں آ کر منا لوں گا مگر آپا وہاں رہنا تو ٹھیک نہیں ہے نا!"

وہ چپ رہیں۔ وہ اسی خاندان کی تھیں جس کا میں تھا' وہ بھی جانتی تھیں کہ بہنوں اور بیٹیوں کے گھر جانا اور بالخصوص رہنا اچھا نہیں سمجھا جاتا۔

"ٹھیک ہے مگر آج رات کھانے پر تو آ جاؤ۔ یہ لو طاہر سے بات کرو۔"

میں یہ سن کر بور ہو گیا کہ اب طاہر بھائی گھنٹا بھر تک اصرار کریں گے کہ میں فوراً چلا آؤں۔ ویسے ان سے علیک سلیک کے فوراً بعد ہی میں نے طیب کا پوچھ لیا پتا چلا کہ وہ

ابھی تک نہیں پہنچا ہے۔ میں نے طاہر بھائی سے باتوں کے دوران ہی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی۔ اب کافی دیر ہو چکی تھی۔ اسے تو بڑی تیز رفتار سے گھر پہنچنا چاہئے تھا۔ مجھے تشویش ہو گئی۔ میں بات ختم کرنا چاہتا تھا مگر طاہر بھائی نے زچ کر دیا۔ آخر ان سے وعدہ کیا کہ رات کا کھانا ان کے ساتھ ہی کھاؤں گا تب میری جان چھوٹی اور میں نے فوراً ہی ریسیور رکھ دیا۔ اس خوف سے کہ کہیں پھر زہرہ آپا نہ لے لیں' ریسیور رکھنے سے پہلے ہی میں طاہر بھائی سے کہہ چکا تھا کہ طیب جیسے ہی پہنچے اسے کہیں' مجھے فون کر لے۔

☆--------------☆--------------☆

اب دھوپ کی تپش میں قدرے کمی ہو چکی تھی۔ دائیں جانب جو کھڑکی باہر کھلتی تھی۔ وہاں سے اندر آنے والی دھوپ ترچھی ہو چکی تھی اور اب اس تصویر پر پڑ رہی تھی جو میری سمجھ میں نہیں آئی تھی' میں وہاں صرف ایک آنکھ دیکھ سکا تھا جو خاصی واضح تھی۔ میں اب دونوں ہاتھوں کو سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا اور اس تصویر پر نگاہ جما دی۔ پہلے تو اسے سمجھنے کی کوشش کرتا رہا پھر دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ یوں لگا جیسے میرے دماغ کو کسی نے لوہے کی باریک جالی والے خول میں کس دیا ہے۔ اب اس جالی کی باریک باریک لوہے کی تیلیاں دماغ کے اندر کھب رہی ہیں۔ کنپٹیوں میں دھمک سی ہونے لگی تو میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ادھر ادھر کا جائزہ لیا تو سب سے پہلے شدید سناٹے کا احساس ہوا۔

"ایلیسا.......؟" میرے لبوں سے سرگوشی نکلی۔ مجھے خیال آیا کہ وہ اس وقت کہاں ہے؟ گو ابھی تک مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں رہتی تھی۔ شاید طیب نے بتایا ہو مگر میں بھول چکا تھا۔ میں نے اندرونی حصے میں کھلنے والی کھڑکی سے نیچے جھانکا۔ نیچے گہرا اندھیرا تھا۔ شاید ایلیسا نے اس کمرے کی تمام کھڑکیاں اور دروازے بند کر کے ان پر پردے کھینچ دیئے تھے ورنہ ابھی تک تو دھوپ بھی نہیں ڈھلی تھی اور جب ہم آئے تھے تو وہ کمرا بہت روشن تھا۔ میں نے اس اندھیرے میں بھی کچھ دیکھنے کی کوشش کی اور مجھے یہ جان کر زیادہ حیرت ہوئی کہ وہاں کوئی تھا۔ ایک ہیولا سا تھا جو یہاں وہاں بے مقصد ٹہل رہا تھا۔ میں نے نگاہیں اس ہیولے پر جما دیں۔ اپنی نظر کی باریکی اور حیرت انگیز صلاحیت نے یہاں بھی میرا بھرپور ساتھ دیا مگر اس آگہی نے میرے پورے وجود کو برف کی سل میں تبدیل کر دیا۔ میں تصدیق کے لئے تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔

عین اسی لمحے اچانک مجھے احساس ہوا کہ میرے اس کمرے کا فرش بھی لکڑی کا

ہے۔ میرے جوتوں کی دھمک گونجی اور میں ٹھٹک کر رک گیا۔ میں نے جلدی سے مگر پوری احتیاط کے ساتھ اپنے بوٹ اتارے اور ننگے اور دبے پاؤں رکھتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ سیڑھیاں بھی نچلے کمرے کی کھڑکیاں اور دروازے بند ہونے کے سبب اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھیں گو مجھے سب صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے بڑی احتیاط سے سیڑھیوں پر قدم رکھے اور ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہاں ٹہلنے والے وجود سے مخفی رہوں گا اس لئے کہ نیچے پہنچتے پہنچتے اندھیرا اور گہرا ہو گیا تھا۔ اوپر چڑھتے ہوئے میں دن میں دیکھ چکا تھا کہ بائیں دیوار پر ایک سوئچ بورڈ ہے۔ مجھے یقین تھا کہ یہ سیڑھیوں پر روشنی کا سبب ہوگا اور یہاں پھیلنے والی روشنی ہی ڈرائنگ روم میں ٹہلنے والے کو واضح کر دے گی۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر سوئچ آن کر دیا۔ عین میرے سر پر لگا ہوا بلب جو ایلومینیم کے بڑے سے شیڈ کے نیچے لٹک رہا تھا۔ روشن ہو گیا اور اسی شیڈ کی روشنی کا احاطہ اس حصے کو اپنی لپیٹ میں لے آیا جہاں میں نے اسے دیکھا تھا۔ وہ اچھل پڑی۔

"کیا ہو گیا؟" میں نے ایک دم پوچھ لیا۔

وہ ہونقوں کی طرح منہ کھولے مجھے دیکھے گئی۔ پھر اس کی نگاہ میرے پیروں پر گئی تو میں خجل سا ہو گیا۔ میں صرف موزے پہنے تھا۔

"وہ......... مجھے کچھ آہٹ سی محسوس ہوئی تھی۔" میں نے شرمندہ ہو کر جواب دیا۔ "میں نے کھڑکی سے جھانکا تو......... آپ ٹہل رہی تھیں۔ میں سمجھا' پتا نہیں کون ہے؟ میں جوتے اتار کر لیتا ہوا تھا۔ اسی لئے......... میں اپنی صفائی میں بول رہا تھا اور وہ فق چہرہ لئے مجھے تک رہی تھی۔ میں نے اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار دیکھ لئے تھے۔ اب دوبارہ جو چہرے پر نگاہ ڈالی تو یوں لگا جیسے وہ لہرا کر گرنے والی ہو۔ میں لپک کر آگے بڑھا اور ایسا میں نے بروقت ہی کیا تھا ورنہ وہ گرتی تو ضرور زخمی ہو جاتی کیونکہ اس کے بالکل پیچھے شیشے کی میز تھی اور دائیں جانب پیتل کا بہت بڑا اسٹینڈ جس پر پیتل ہی کا بڑا سا گلدان رکھا تھا۔

"ایلیسا!" میں نے اسے سنبھال کر آواز دی۔ اس کی آنکھیں چڑھنے لگی تھیں۔ میری آواز سے وہ چونک اٹھی۔

"آں......... اوہ......... مائی گاڈ......... مسٹر......... مسٹر ضیاء......... مائی

ڈاٹر.........!!"

صرف اتنا ہی کہا تھا اس نے کہ وہ بے ہوش ہو گئی۔ اس کا رنگ سفید ہو چکا تھا۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی تھیں اور اس کا بے جان بھاری بھرکم جسم میرے بازوؤں میں لٹک گیا تھا۔ وہ بہت بھاری تھی اگر میں نے خود کو نہ سنبھال لیا ہوتا تو اس سمیت گرتا اور شاید ہم دونوں ہی بری طرح زخمی ہوتے۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے تھاما۔ صوفے پر لٹایا۔ پہلے مجھے خیال آیا کہ میں اس کے چہرے پر پانی ڈالوں' ہوش میں لاؤں مگر پھر مجھے خیال آیا کہ اس کی بیٹی کہاں ہے؟ سچی بات یہ ہے کہ میں سخت بوکھلاہٹ کا شکار ہو گیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کی بیٹی کو کیا ہوا ہے یا اب اس کو کیا ہو گیا۔

میں تیزی سے باہر نکلا۔ باہر سناٹا تھا۔ دور دور تک کوئی نہیں تھا۔ میں نے وہیں دروازے پر رک کر جہاں تک نگاہ جا سکتی تھی' دیکھا پھر پلٹ کر کمرے میں آ گیا۔ ایلیا ویسی ہی بے سدھ لیٹی تھی۔ میری نگاہ ڈائننگ ٹیبل پر رکھے جگ گلاس پر پڑی۔ میں نے لپک کر اسے اٹھا لیا۔ اس وقت تک یہ بات میری سمجھ میں آ چکی تھی کہ پہلے ایلیا کو ہوش میں لانا ضروری ہے۔ اسی سے مجھے پتا چل سکے گا کہ مسئلہ کیا ہے۔ لیکن اتنا یقین تو مجھے ہو چکا تھا کہ وہی حسین و جمیل لڑکی اس کی بیٹی ہے کیونکہ میرے خیال میں اس نے ہم سے جھوٹ بولا تھا کہ وہ اس کی بہن کے گھر جا چکی ہے۔ حیرت تھی تو صرف اس کے انداز و اطوار پر......... جو یقیناً کچھ عجیب سا تھا۔

میں نے پانی کے چھینٹے اس کے منہ پر مارے تو اس نے چند لمحوں بعد آنکھیں کھول دیں۔ کچھ دیر تو وہ یونہی بے خیال سی پڑی رہی پھر اچانک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"ایلیا......... کیا پرابلم ہے۔ پلیز مجھے بتاؤ۔" میں نے انتہائی اپنائیت سے کہا۔

اس نے چونک کر مجھے دیکھا پھر گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ "وہ......... مسٹر ضیاء......... مائی ڈاٹر واز ہیئر......... بٹ رائٹ ناؤ شی از ناٹ۔"

"مطلب.........؟ میں سمجھا نہیں۔" حالانکہ میں سمجھ گیا تھا مگر میں وضاحت چاہتا تھا۔

"ہم نے تم کو سچ نہیں بولا تھا۔ ہمارا ڈاٹر اپنا روم میں تھی۔ ہم نہیں چاہتا تھا کہ وہ تم لوگ کے سامنے آئے۔ بٹ تم جنٹل مین ہے۔ تم سے بات کرنے کے بعد ہم اس کا روم میں گیا تو وہ وہاں نہیں تھا۔"

"تو وہ یہیں کہیں ہو گی ایلیا......... تمہیں اس کے لئے فکرمند نہیں ہونا چاہئے۔ ویسے بھی وہ کافی شریر لگتی ہے۔ دیکھا نہیں تم نے......... تمہیں کچن میں بند کر کے ہمیں ریسیو کیا کمرے میں بٹھایا۔ مشروب دیا اور پھر غائب ہو گئی۔ جب ہم نے پوچھا کہ تم ایلیا کی بیٹی ہو تو......... تو جانتی ہو اس نے کیا جواب دیا تھا؟"

"کیا؟" وہ ہونق سی مجھے دیکھ رہی تھی۔

"نہیں' اس نے صاف منع کر دیا کہ وہ تمہاری بیٹی نہیں ہے اور پھر غائب ہو گئی۔ یقیناً اسے تمہارا ڈر ہو گا پھر اس نے کچن کا دروازہ کھول دیا ہو گا۔ وہ بہت شریر ہے ایلیا......... مجھے حیرت ہے کہ اس کے شوہر نے اسے کیوں طلاق دی۔" میں اسے تسلیاں دے رہا تھا اس لئے کہ اس کے چوڑے چوڑے' موٹے موٹے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

"وہ......... وہ بہت بیوٹی فل ہے اس لئے........." ایلیا نے ادھر ادھر دیکھ کر پریشان لہجے میں جواب دیا۔

"کیا.........؟" مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ "یعنی وہ خوبصورت ہے اس لئے اس گدھے نے اسے اس کی خوبصورتی کی سزا دی ہے۔"

"نہیں......... آئی مین......... کہ ہمارا ڈاٹر اس کے مقابلے میں کم صورت ہے۔ اگلی (Ugly) تم سمجھا؟"

"وھاٹ؟ وہ......... وہ لڑکی Ugly ہے......... اف......... تو اس کا شوہر کیسا ہو گا؟"

"ابھی اس ٹائم تم ایسا باتیں کرتا ہے۔ اینا کو ڈھونڈو......... وہ گھر میں نہیں ہے۔" ایلیا نے پریشان ہو کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے باہر آ گئے۔ سامنے کا کچھ حصہ کھلے میدان کی شکل اختیار کئے ہوئے تھا مگر یوں لگتا تھا جیسے اس کی صفائی کی گئی ہے کہ کیاریاں بھی نئی کھدی ہوئی لگ رہی تھیں۔ غالباً ان میں نئے پودوں کے بیج ڈالے گئے تھے۔ دوسرا کچھ حصہ لان کا تھا جس میں پھول کھلے ہوئے تھے۔ ہم اس حصے سے ہوتے ہوئے عمارت کے دائیں جانب آ گئے۔ میں ایلیا کے تعاقب میں تھا۔ وہ کافی پریشان تھی جس کی وجہ سے بار بار

لڑکھڑا جاتی تھی۔ میں مسلسل اسے تسلیاں دے رہا تھا۔ اچانک وہ رک گئی۔ میری نگاہ اٹھی۔ دائیں جانب ایک دروازہ کھلا ہوا تھا۔ یہ دروازہ ڈرائنگ روم کے پچھلی طرف تھا۔ میں ڈرائنگ روم کے اندر بھی اس جانب ایک دروازہ دیکھ چکا تھا۔ غالباً وہ اندر سے ایلیا لاک کر چکی تھی۔ اس دوران میں ایلیا اس کھلے دروازے کے اندر داخل ہو گئی۔ کمرا خالی تھا۔ وہ رونے لگی۔ باہر آ گئی۔ اس بار وہ گھر میں نہیں رکی بلکہ باہر بھاگتی چلی گئی۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ بڑی مشکل سے اسے سنبھال کر اندر لایا۔ عین اسی لمحے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ مجھ سے پہلے ہی ایلیا نے بڑھ کر ریسیور اٹھا لیا۔ شاید اسے امید تھی کہ اس کی بیٹی کا فون ہو گا مگر دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے پر مایوسی چھا گئی۔ اس نے ریسیور میری طرف بڑھا دیا۔ میں کچھ حیران ہوا۔ میں نے چاہا کہ ایلیا وہاں سے ہٹ جائے۔ وہ شاید میرا خیال جان گئی اور دوسری طرف جا کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ میں نے ریسیور کان سے لگایا۔

"ہیلو!"

"ہیلو ضیاء!" آواز طیب کی تھی۔ وہ کافی گھبرایا ہوا تھا۔

"ہاں...... کیا بات ہے؟ کہاں سے بول رہے ہو؟"

"ضیاء...... میں...... میں سخت پریشانی میں گھر گیا ہوں۔ کیا تم فوراً آ سکتے ہو......؟"

"تم کہاں ہو؟" میں نے اپنے اندر بے چینی سی پھیلی محسوس کی۔

"میں...... میں گھر پر ہوں۔ ابھی ابھی پہنچا ہوں۔"

"ابھی...... کیا تم یہاں سے کہیں اور گئے تھے؟"

"نہیں...... میں فون پر نہیں بتا سکتا ضیاء...... پلیز...... تم آ جاؤ۔"

وہ روہانسا ہو رہا تھا۔ میں نے پلٹ کر ایلیا کو دیکھا۔ سخت پریشان ہو گیا۔ ایلیا کو اس حال میں چھوڑ کر جانا میرے لئے ممکن نہیں تھا مگر طیب بھی پریشانی میں تھا۔ میں نے چند سیکنڈ سوچا پھر کہا۔ "طیب! ایلیا بھی سخت پریشانی میں ہے۔ اس کی بیٹی گھر سے کہیں چلی گئی ہے اور ابھی تک نہیں آئی۔ وہ سخت پریشان ہے۔ کچھ دیر پہلے تو وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں تمہارے پاس آؤں یا اسے سنبھالوں۔ اب تم اس کی پریشانی سے واقف ہو چکے ہو۔ تم بتاؤ...... مجھے کیا کرنا چاہئے؟"

"اوہ......" طیب کی آواز آئی۔ "میں...... میں بھی آنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں...... ورنہ...... اچھا...... دیکھو...... میں...... میں کوشش کرتا ہوں اور ضیاء سنو! سب خیریت ہے نا؟"

"ہاں...... ویسے تو سب ٹھیک ہے۔ طیب اگر تمہاری پریشانی ایسی ہے جسے تم برداشت کر سکو تو پلیز! تم یہاں آ جاؤ۔ ایلیا کو اس خراب حالت میں چھوڑ کر میرا کہیں جانا ممکن نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے مگر...... وہ تو کہہ رہی تھی کہ اس کی بیٹی جا چکی ہے' غالباً اپنی آنٹی یا انکل کے ساتھ۔"

"نہیں...... وہ بات...... تم آ جاؤ پھر بتاؤں گا......" میں ٹال گیا۔

"میں...... کوشش کرتا ہوں ضیاء...... کہہ نہیں سکتا کہ......"

"طیب!" اس بار میں نے پوری توجہ سے اسے پکارا۔ "تم ٹھیک تو ہو نا؟" میں نے اپنی سماعت کو اس کے لہجے کی جانب مرتکز کر لیا۔

"ہاں...... میں تو ٹھیک ہوں...... لیکن وہ...... اچھا...... میں آتا ہوں۔" طیب نے یہ کہہ کر اچانک فون بند کر دیا۔

مجھے سخت الجھن ہوئی۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ کوئی بڑی گڑبڑ ہے۔ کیا......؟ اس کا میں اندازہ نہیں کر پایا۔ بہرحال ایک بات واضح ہو چکی تھی کہ وہ خود ٹھیک تھا اور غالباً اس پراسرار عورت کی کسی حرکت کا نشانہ نہیں بنا تھا۔ میں نے یہ بات ریسیور رکھ کر ایلیا کی طرف آتے ہوئے سوچی۔ ایلیا زار و قطار مگر بے آواز رو رہی تھی۔ میں نے اسے چپ کرانے کی بہت کوشش کی۔ پانی پلایا۔ حوصلہ دیا کہ کچھ دیر اسے انتظار ضرور کرنا چاہئے۔ وہ کچھ کچھ میری بات کو سمجھ گئی۔ اس نے خود کو سنبھال لیا پھر وہ مجھے یقین دلانے لگی کہ اس کی بیٹی اینا بہت سیدھی سادی اور کم گو سی لڑکی ہے جو اپنے شوہر کے رویے کی وجہ سے عدم اعتماد کا شکار بھی ہے۔ وہ شریر قطعی نہیں ہے بلکہ وہ شدید احساس کمتری کا شکار ہے اور اکثر کسی کے سامنے جانے سے کتراتی ہے۔ اسے زیادہ بولنا بھی نہیں آتا۔ وہ ایک ایسی شخصیت بن چکی ہے جو اپنی حیثیت منوا ہی نہیں سکتی جب کہ شریر لوگ اپنی حیثیت کو منوانا جانتے ہیں اور اس کا اظہار بھی بڑے اعتماد سے کرتے ہیں۔

مجھے یہ سب سن کر حیرت ہو رہی تھی۔ میں اس لڑکی کے ان دیکھے شوہر سے

مرعوب ہوگیا تھا۔ یہ جان کر کہ وہ اس لڑکی سے بھی اس قدر حسین ہے کہ اس نے اسے صرف اس کی "بدصورتی" کی وجہ سے طلاق دے دی اور اس کی اس بدصورتی نے میرے اور طیب کے حواس گم کر دیئے تھے۔ وہ جس اعتماد سے کھڑی باتیں کر رہی تھی۔ جو وقار اس کی شخصیت میں تھا وہ ہمارے بھی چھکے چھڑا گیا تھا اور...... مجھے یہ سب کچھ افسانوی سا لگ رہا تھا پھر ذہن کے اندر کہیں گرہ سی پڑ گئی۔ کوئی الجھن سی محسوس ہونے لگی۔

میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ تمہاری بیٹی دنیا کی حسین ترین اور پُروقار عورت ہے مگر ایلیا بولے جا رہی تھی۔ وہ ٹوٹ چکی تھی۔ اس وقت یوں لگ رہا تھا جیسے وہ صرف اپنی بیٹی کی گمشدگی پر ہی نہیں' اس کے ہر دکھ پر رو رہی ہو۔

"اس کا فادر اسے بھوت لو کرتا تھا۔ ام کو بلتا تھا' اینا کو کچھ مت بولا کرو۔ باہر بچے اور اسکول میں ٹیچرز اور بچے دونوں اس کا اعتماد توڑتے ہیں۔ وہ اس کا بھوت تعریف کرتا تھا۔ مسٹر ضیاء...... دنیا کا لوگ بہت سنگدل ہوتا ہے۔ سب جانتا ہے کہ اس کو گوڈ نے بنایا ہے' کوئی بھی اپنے ہاتھ سے اپنے کو خوبصورت یا بدصورت نہیں بنا سکتا مگر گوڈ کا کریڈٹ وہ لوگ خود لیتا ہے اگر وہ اچھا صورت کا ہو تو...... اور...... جو صورت اچھی نہیں ہوتی اس کا کریڈٹ اس کو دیتا ہے جس کا صورت خراب ہو۔ یہ لوگ اندر سے کالا ہوتا ہے۔ بالکل Ugly...... خراب لوگ......"

وہ روئے جا رہی تھی اور ٹشو پیپر سے ناک رگڑے جا رہی تھی۔ مجھے اس کی باتیں سن کر اب حیرت کے ساتھ ساتھ کوفت بھی ہو رہی تھی۔ مجھے یقین بھی ہو گیا تھا کہ اینا کی بداعتمادی میں اس کے شوہر کے ساتھ اس کی ماں کا بھی ہاتھ ہو گا۔ یہ بے وقوف عورت بھی اسے اس کے شوہر سے کمتر سمجھتی ہو گی تبھی تو ایسی باتیں کر رہی تھی۔ اسے یہ احساس بھی نہیں تھا کہ اس کی بیٹی ایک آدمی سے کم صورت ہے تو دنیا کی کروڑوں عورتوں سے زیادہ پُرکشش اور حسین ہے۔ اب میں اکتا چکا تھا۔

"ایلیا! تم ماں ہو کر اتنی پیاری بیٹی کی اتنی برائی کر رہی ہو تو وہ...... کمینہ...... اس کا شوہر......"

"ام برائی نہیں کرتا...... ہم حقیقت جانتا ہے۔ ام بھوت دکھی ہے۔ اینا کتنی پیاری اور اچھی لڑکی ہے ام جانتا ہے مگر......" اس کا جملہ پورا نہیں ہوا تھا کہ اچانک

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے لپک کر فون لے لیا۔ دوسری طرف کوئی اجنبی آواز تھی۔

"مسز تھامسن؟"

"سوری...... یہاں کوئی تھامسن نہیں رہتے۔ رونگ نمبر......" میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ ایلیا چیخ اٹھی۔

"ہاں...... امارا فون ہے۔" وہ اٹھی اور اس نے جھپٹ کر فون مجھ سے چھین لیا۔ "ہیلو...... ہیلو......"

شاید دوسری طرف سے لائن کٹ چکی تھی۔ وہ میری طرف پلٹی۔ "کون تھا...... کیا اینا تھی......؟"

"اینا......؟ نہیں تو...... وہ کوئی مرد تھا۔ کسی مسز تھامسن کو پوچھ رہا تھا۔"

"مسٹر ضیاء...... تھامسن امارا ہسبنڈ تھا۔ اینا کا فادر......" اس نے نڈھال انداز میں فون کا ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔

"سوری......" میں بولا۔ "تم نے اب تک اپنے ہسبنڈ کا نام نہیں لیا تھا ورنہ......"

وہ پھر رونے کے لیے اسٹارٹ لینے لگی تھی کہ فون کی بیل ایک بار پھر بج اٹھی۔ اس بار بھی میں ہی قریب تھا میں نے ریسیور اٹھا لیا۔ "ہیلو!"

دوسری طرف پھر وہی آدمی تھا جو مسز تھامسن کے بارے میں استفسار کر رہا تھا۔

"جی مسٹر! ایک منٹ ہولڈ کیجیے۔" ایلیا شاید سمجھ چکی تھی۔ لپک کر قریب آگئی۔ پھر جانے کیا ہوا کہ وہ پہلے جیسی پھر لہرا کر گرنے لگی۔ میں نے اس کے ساتھ ہی ریسیور بھی تھام لیا۔ "ہیلو...... ہیلو......!" میں چیخا۔

"آپ اینا تھامسن کے کون ہیں؟" دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

"بات کیا ہے؟ وہ میری جاننے والی ہیں۔" میں نے تیزی سے پوچھا۔ میں نے اس دوران میں ایلیا کے بھاری وجود کو صوفے پر لڑھکا دیا تھا۔

"جن خاتون نے ابھی بات کی تھی وہ کون ہیں؟" میری بات کا جواب دیئے بغیر بولنے والے نے دوسرا سوال کر ڈالا۔

"وہ مسز تھامسن تھیں' اینا ان کی بیٹی ہے۔ آپ مجھے یہ بتائیں کہ آپ کون ہیں اور کیا بات ہے؟ کہاں سے بول رہے ہیں؟" میں نے ایک ساتھ کئی سوال کر دیئے۔

"دیکھیں مسٹر! بات یہ ہے کہ ہمارے پاس ایک لاش آئی ہے۔ میں بی سی ہاسپٹل سے بول رہا ہوں۔ ایکسیڈنٹ کا کیس ہے۔ اس لڑکی کے بارے میں ہمیں کچھ پتا نہیں تھا مگر کچھ دیر پہلے ہمیں کسی عورت نے فون پر اطلاع دی کہ اس لڑکی کا نام اینا تھامسن ہے اور وہ جی آئی سی روڈ پر رہتی ہے۔ اسی عورت نے ہمیں یہ فون نمبر دیا تھا پھر یہ بتائے بغیر کہ وہ کون ہے فون بند کر دیا تھا۔ ہمارا خیال ہے کہ ایکسیڈنٹ اسی عورت سے ہوا ہے اور وہ اسے ہسپتال کے باہر چھوڑ کر غائب ہو گئی۔ پلیز اگر آپ آ کر شناخت کر لیں تو........."

دوسری طرف سے وہ بول رہا تھا اور میرا کلیجہ پھٹ رہا تھا۔ اس حسین و جمیل لڑکی کی کشش، خوبصورتی اور مقناطیسیت مجھے یاد آ رہی تھی۔ اس کی ہر حرکت، اس کی آواز، اس کی مسکراہٹ.........

"ہیلو! ہیلو مسٹر!" دوسری طرف سے اس آدمی نے مجھے چونکا دیا۔

"جی! جی آپ کا نام؟" میں نے فوراً خود کو سنبھال لیا۔

"ڈاکٹر واجیت شرما......... پلیز جلدی کیجئے گا۔"

"اوکے ہم پہنچ رہے ہیں۔" میں نے اتنا کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔ مجھے ایلیا پر ہی نہیں خود پر بھی ترس آ رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں......... شاید میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ حسین عورت یوں ایک جھلک دکھا کر مر جاتی اور وہ بھی ایسی کسمپرسی میں......... مجھے اس عورت سے شدید نفرت محسوس ہوئی جس نے حادثہ کیا اور پھر ہسپتال اطلاع دی۔ میں اب پھر ایلیا کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر مجھے یہ خیال بھی آیا کہ چلو اتنی نیکی تو کی اس عورت نے کہ لاش کو اسپتال پہنچا دیا اور یہاں کا پتا بھی دے دیا مگر اس خیال کے فوراً بعد میں چونک اٹھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ عورت خوب جانتی تھی کہ مرنے والی کون ہے، کہاں رہتی ہے، کس کی بیٹی ہے اور اس کا فون نمبر تک جانتی تھی۔

یہ سب میں نے ایلیا کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارتے ہوئے سوچا۔ کچھ دیر کی کوشش کے بعد ایلیا ہوش میں آ گئی مگر اب وہ دھاڑیں مار رہی تھی۔ کہہ رہی تھی۔

"مسٹر ضیاء......... وہ......... وہ زخمی ہے۔ جلدی چلو......... وہ......... باہر کیوں گئی تھی......... اوہ مائی سویٹ ڈارلنگ........."

میں جان گیا کہ اطلاع دینے والے نے کرم کیا ہے۔ اس نے ایلیا کو اس کی موت

کی اطلاع نہیں دی بلکہ اسے زخمی ظاہر کیا ہے۔ میں اسے سنبھالتا ہوا باہر آیا۔ اب مجھے گاڑی کی پریشانی تھی پھر ایک ہی بات مجھے سوجھی کہ ایلیا کو وہیں گیٹ پر چھوڑ کر اگلی سڑک تک پیدل جاؤں اور ٹیکسی لے آؤں۔ یہ ذیلی سڑک تھی اس پر زیادہ ٹریفک اس لئے بھی نہیں تھا کہ آگے سے یہ سڑک مڑ کر سنسان چھوٹے سے پہاڑی سلسلے تک چلی گئی تھی اور اسی لئے غالباً ادھوری تھی۔ میں نے ایلیا کو کہا کہ وہ یہیں میرا انتظار کرے۔ میں ٹیکسی لے کر آتا ہوں۔ وہ سر ہلا کر وہیں کیاری کی منڈیر پر بیٹھ گئی۔

میں سامنے سڑک کی طرف بھاگتا چلا گیا۔ جہاں سے یہ سڑک مڑتی تھی، وہاں ٹیکسی ملنے کی امید تھی۔ میں چند ہی منٹوں میں کافی فاصلہ طے کر گیا۔ سامنے والی سڑک پر ٹریفک رواں تھا۔ دھوپ ڈھلنے کو تھی۔ میں نے اپنی رفتار کم کر لی، عین اسی لمحے ایک ٹیکسی اسی جانب مڑی۔ میرے پاس سے زن کر کے گزر گئی پھر مجھے کسی کی آواز آئی۔ میں پلٹا، دیکھا ٹیکسی ریورس ہو کر میری طرف آ رہی تھی۔ میں حیران ہوا اور جب ٹیکسی کچھ قریب آ گئی تو میری حیرت بھی دو چند ہو گئی۔ اس میں طیب تھا۔ سفید رنگ، پھٹی ہوئی وحشت سمیٹے آنکھیں، بال بکھرے ہوئے۔ وہ میرے قریب آتے ہی اتر گیا اور تیزی سے میری طرف بڑھا۔

"تم........." میں نے کہا۔

"ہاں ضیاء......... ادھر آؤ۔" وہ مجھے ٹیکسی سے کچھ فاصلے پر لے گیا۔

"گاڑی کہاں ہے؟ اور تمہیں کیا ہوا ہے؟"

"بتا رہا ہوں۔ گاڑی کی حالت ایسی نہیں کہ لے کر نکلتا۔ گھر کے گیراج میں کھڑی ہے۔ ضیاء! یہاں سے جاتے ہوئے ایک لڑکی میری گاڑی سے ٹکرا گئی تھی۔"

میں اچھل پڑا۔ "کیا.........؟ کہاں پر......... کیا وہ........."

"نہیں......... کچھ آگے......... وہ تو شکر کرو کہ اس وقت اس جگہ کوئی گاڑی نہیں تھی ورنہ میں یہاں نہ ہوتا۔"

"سنو! کیا وہ وہی لڑکی تھی جو ہمیں ایلیا کے گھر پر ملی تھی؟" نہ معلوم یہ سوال میں نے کیوں کر لیا۔

"نہیں یار! پتا نہیں کون تھی۔ سخت زخمی حالت میں، میں نے اسے گاڑی میں ڈالا اور تقریباً گھنٹا بھر کے بعد موقع دیکھ کر ہسپتال کے ایک کونے میں ڈال آیا جہاں اس وقت

کوئی نہیں تھا۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ میں ایسا کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ میں اسے طبی امداد پہنچانا چاہتا تھا مگر........ اتنی ہمت نہیں تھی کہ ایکسیڈنٹ کا اعتراف کر لیتا........ اگر وہ مرجاتی تو........؟ بہرحال........ میں سخت پریشان ہوں۔"

یہ سن کر کہ وہ لڑکی ایلیا کی بیٹی نہیں تھی۔ میں کچھ مطمئن ہو گیا۔

"طیب تمہاری پریشانی ایسی نہیں جیسی ایلیا کی ہے اور تمہیں پتا ہے کہ یقیناً وہ لڑکی ایلیا ہی کی بیٹی تھی جو اس وقت سے غائب ہے۔ اب اس بات کو کئی گھنٹے گزرنے کے بعد، ابھی ابھی بی سی ہاسپٹل سے فون آیا کہ کسی ایکسیڈنٹ میں اس کی ڈیتھ ہو چکی ہے۔"

"نہیں........" طیب اپنی پریشانی بھول کر اچھل پڑا۔ "وہ........ وہ مر گئی........؟"

"ہاں........ مگر مرنے والی بات ایلیا کو نہیں پتا۔ کسی ڈاکٹر نے فون کر کے اسے تو اتنا ہی بتایا ہے کہ وہ زخمی ہے مگر مجھے بتا دیا کہ وہ مر چکی ہے۔ میں ٹیکسی کی تلاش میں نکلا تھا۔ یوں تو میں بھی اسے شناخت کر سکتا ہوں مگر ایلیا نہیں مانے گی جائے بغیر........ اچھا ہوا تم آ گئے۔ چلو........ وہ ہلکان ہو رہی ہو گی۔" میں اسے لئے ہوئے ٹیکسی کی طرف بڑھا۔ طیب کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ وہ بولا۔

"اوہ ضیاء........! اسے تو نہیں مرنا چاہئے تھا........ وہ تو........"

"یہاں ہر چیز فانی ہے طیب! حسن ہو یا طاقت........ ہر چیز مٹی میں مل جاتی ہے۔ بس........ وہ عکس رہ جاتا ہے جو آدمی چھوڑ جاتا ہے۔ میں نے بھی اتنا ہی دکھ محسوس کیا ہے اور شاید اس لئے کہ اس کی شخصیت کے سحر سے ابھی نکل ہی نہیں پایا تھا۔"

پھر میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ کسی عورت نے ہسپتال فون کر کے اس کا نام، پتا اور فون نمبر بتا دیا تھا۔ اسے بھی یقین ہو گیا کہ اس کی طرح ایک جرم ایک عورت سے بھی سرزد ہو چکا ہے بلکہ اس کے مقابلے میں اس عورت نے زیادہ انسانیت کا مظاہرہ کیا تھا کہ کم از کم اس لڑکی کا نام، پتا اور فون نمبر بتا دیا تھا کہ وہ لاوارثوں کی طرح کسی اسپتال کے مردہ خانے میں تو نہ پڑی رہے۔ اس کے گھر والے اسے مٹی میں دبا کر صبر تو کر لیں جب کہ وہ تو اس قدر حواس باختہ ہوا تھا کہ اس نے ایسی کوئی کوشش ہی نہ کی بلکہ اسے تو ہسپتال پہنچانے میں بھی خوف ہی محسوس ہو رہا تھا۔ ہسپتال پہنچانے کے بعد خوف ہی آیا تھا

کہ اس نے اتنی ہمت بھی کیسے کر لی۔ وہ تو قسمت نے ہی ساتھ دیا تھا کہ کسی نے دیکھا نہیں ورنہ پھنس گیا ہوتا۔ میں اسے تسلی دیتا رہا۔ میں نے جتایا کہ کبھی کبھی آدمی کسی طوفانی کیفیت کا شکار ہو کر غیر اخلاقی حرکت کر بیٹھتا ہے۔

ہم دونوں اسی ٹیکسی میں گیٹ کے قریب پہنچے تو ایلیا دور سے ہمیں اپنی جانب آتی نظر آ گئی۔ وہ لڑکھڑا رہی تھی۔ رو رہی تھی اور خاصی حواس باختہ تھی۔

"وہ اپنی بیٹی کے لئے بہت جذباتی ہے ضیاء........! پتا نہیں، اس کی موت کا سن کر کیا ہو گا؟" طیب اب اپنی پریشانی بھی یکسر بھول چکا تھا۔

"ہر ماں اپنی اولاد کے لئے جذباتی ہوتی ہے۔" میں نے قریب پہنچنے پر ٹیکسی رکوا لی۔ اسے سہارا دے کر بٹھایا اور خود آگے جا بیٹھا۔ طیب اب اسے دلاسے دے رہا تھا مگر مجھے یقین تھا کہ وہ کچھ نہیں سن رہی۔

"کہاں جانا ہے صاحب؟"

ٹیکسی والے کے پوچھنے پر میں چونک اٹھا۔ "ہاں........! بی سی ہاسپٹل چلو۔"

"بی سی ہسپتال؟" طیب کی آواز میں خوف تھا۔

"ہاں........! کیوں........؟" میں نے پلٹ کر اسے دیکھا۔

"وہ........ وہیں تو........" وہ کہنے والا تھا مگر جھجک کر چپ ہو گیا۔ میں سمجھ گیا۔

"یار........! وہاں تو........"

"کچھ نہیں ہو گا۔" میں نے اسے تسلی دی۔ میں جان گیا تھا کہ غالباً وہ بھی اس عورت کو اسی ہسپتال میں چھوڑ آیا ہے۔ "تم فکر نہ کرو۔"

مجھے پتا تھا کہ طیب کا خون خشک ہو رہا تھا۔ مگر یہ حوصلہ تو مجھے دینا ہی تھا۔ اب یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ وہ ایک جرم کر کے ساری زندگی چھپتا پھرے اور جرم بھی اس نے یقیناً دانستہ نہیں کیا ہو گا۔ طیب کچھ نہیں بولا۔ اب ایلیا اپنی بیٹی کو یاد کر رہی تھی۔ رو رہی تھی اور ہمیں بتا رہی تھی کہ اس پوری کائنات کا سارا چارم اس کی بیٹی ہی میں تھا، اسے کچھ ہو گیا تو وہ جیتی نہ رہے گی۔

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ واقعی اس پوری کائنات کا تمام حسن اور تمام چارم اس کی بیٹی میں تھا۔ یہ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ مر چکی ہے۔ اسے جو کچھ ہونا تھا، وہ ہو چکا ہے۔ میں اب صرف یہ سوچ رہا تھا کہ اب آنے والا کافی وقت مجھے ایلیا کی بیٹی کو اس کی آخری

آرام گاہ تک پہنچانے میں لگے گا۔ طیب کا آجانا بہتر ہوا تھا۔ وہ ایلیا کو سنبھال سکتا تھا اور میری مدد بھی کر سکتا تھا' مجھے یوں بھی نہیں معلوم تھا کہ یہاں کا نزدیکی چرچ کون سا ہے۔ لیکن میں نے یہ ضرور فیصلہ کر لیا تھا کہ کسی بھی طرح ہو' میں اینا کے شوہر کو ایک بار ضرور دیکھوں گا۔ بلکہ اس کی موت کی اطلاع میں ہی پہنچاؤں گا اور ہو سکا تو اس کے خوبصورت چہرے پر ایک اتنا زوردار گھونسا مار کر آؤں گا کہ ایک نہ ایک عیب اس میں ضرور پیدا ہو جائے۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ ایلیا کی بیٹی نے اسی کی باتوں سے دل برداشتہ ہو کر خودکشی کر لی ہو۔

لیکن وہ ایسی لگتی نہیں تھی۔ دل گرفتہ' عدم اعتماد کا شکار یا نفساتی مریضہ..........

نہیں.......... اس میں جو اعتماد اور جو وقار و غرور تھا' اس نے تو اس کی شخصیت کو اور سحرانگیز بنا دیا تھا۔ ایسی پُر اعتماد عورت.......... یا لڑکی خودکشی نہیں کر سکتی۔ اس کی بھی تو آنکھیں تھیں۔ یہ احساس تو اسے بھی ہو گا کہ وہ بہت سی عورتوں سے زیادہ حسین ہے۔ ہاں' ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے شوہر سے جدائی کا تصور تک کرنے کو تیار نہ ہو۔ اسے ٹوٹ کر چاہتی ہو اور اس کی طلاق والی حرکت سے دل برداشتہ ہو گئی ہے۔

شاید میں اور بھی بہت کچھ سوچتا مگر اسی وقت ٹیکسی ایک جھٹکے سے رک گئی۔ ہم ہسپتال کے گیٹ کے سامنے تھے۔ میں نے جلدی سے ٹیکسی کا کرایہ ادا کیا۔ طیب ایلیا کو سنبھالتا ہوا نیچے اترا۔ میں نے طیب کو اشارہ کر دیا تھا کہ وہ اسے لے کر کسی طرف بیٹھ جائے۔ یہ اشارہ کرتے ہی میں تیزی سے ایمرجنسی کی طرف بڑھا۔ وہاں سے معلوم کرنے کی کوشش کی مگر انہوں نے استقبالیہ کی طرف بھیج دیا۔ وہاں سے ڈاکٹر اجیت شرما کے بارے میں معلوم کر کے میں ایک لڑکے کی رہنمائی میں ڈاکٹر کے کمرے تک پہنچ گیا۔ ابھی میں اندر داخل ہی ہوا تھا کہ طیب بھی آگیا۔ پتا نہیں وہ ایلیا سے کیا کہہ کر آیا تھا۔

"ڈاکٹر میں ضیاء الرب ہوں۔ مسز تھامسن میرے ساتھ ہیں۔ ہم نے ابھی تک انہیں یہ نہیں بتایا کہ ان کی بیٹی کی ڈیتھ ہو چکی ہے۔ ہو سکتا ہے' یہ بات غلط ہو۔ کوئی مغالطہ ہو۔ میں اسے شناخت کر سکتا ہوں۔"

"آیئے!" ڈاکٹر اجیت شرما کھڑے ہو گئے۔ میں نے طیب کے بارے میں بھی انہیں بتایا۔ طیب اور میں دونوں ان کے پیچھے چلتے ہوئے ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ یہاں ایک نہیں تین ڈیڈ باڈیز رکھی تھیں۔ تینوں غالباً ٹریفک حادثے کا شکار ہوئی تھیں۔ اس لئے

کہ تینوں پر پڑی سفید چادریں خون میں تر تھیں۔ میرا جی متلا گیا۔ طیب کی حالت تو بہت خراب ہو گئی۔ اس کا رنگ بھی سفید پڑ گیا۔ ڈاکٹر ایک ڈیڈ باڈی کی طرف بڑھ رہا تھا اور میرا جی چاہا کہ آنکھیں بند کر لوں۔ میں حسن کی موت دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔

"یہ دیکھئے..........! یہ ہیں مس اینا۔" اس نے غالباً چادر ہٹا دی تھی۔ میں نگاہ چرائے ہوئے تھا مگر جب میں نے طیب کی چیخ کی آواز سنی تو نگاہ اٹھا ہی لی مگر اس سے پہلے ہی میرے سینے پر بڑا بوجھ سا آن گرا تھا اور پھر میں بھی اچھل پڑا۔ یہ لڑکی وہ نہیں تھی۔ پتا نہیں' کیوں میرے اندر دور تک سکون پھیل گیا۔ میں نے ایک خوشی سی محسوس کی۔

"نہیں..........! یہ وہ نہیں ہے۔" میں نے ڈاکٹر سے کہہ کر طیب کی طرف دیکھا۔ وہ ایک جانب دیوار پکڑے لرز رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اپنے حلقوں میں سے نکلی پڑ رہی تھیں۔ میں نے لپک کر اسے کاندھوں سے تھام لیا۔ "طیب..........! طیب! ہوش میں آؤ۔ یہ اینا نہیں ہے۔ یہ تو کوئی بہت بدشکل عورت ہے اور تمہیں تو پتا ہے نا کہ اینا.........."

"ضیاء..........! ضیاء..........!" اس نے میرا کاندھا تھام لیا۔ اس کی انگلیاں میرے شانے میں کھب کر رہ گئیں۔ ڈاکٹر چند لمحے ہماری طرف حیرت سے دیکھنے کے بعد اب دوسری ڈیڈ باڈی کی طرف بڑھ چکا تھا۔ طیب نے اسے دور جاتے دیکھا اور سرگوشی کے سے انداز میں بولا۔ "ضیاء! یہ وہی ہے۔"

"کون.......... اینا..........؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں..........! وہی جو میری گاڑی.........."

"بس..........!" میں نے جلدی سے اس کا ہاتھ دبا دیا اور ڈاکٹر کی طرف متوجہ ہو گیا۔ جو دوسری ڈیڈ باڈی کی چادر اٹھا کر جھانک رہا تھا۔

"آیئے مسٹر ضیاء..........! ایک عورت یہ بھی ہے۔"

میں جلدی سے آگے بڑھا۔ میرا دل پھر دھڑکنے لگا تھا مگر پھر میرا جی چاہا کہ قلانچیں مارتا ہوا کمرے سے باہر نکل جاؤں کیونکہ یہ بھی میرے حساب سے اینا نہیں تھی یعنی یہ وہ حسین لڑکی نہیں تھی جس سے میں اور طیب ملے تھے۔

"سوری..........! وہ تیسری لاش تو لڑکے کی ہے مگر مسٹر ضیاء..........! کیا آپ اینا کو پہچانتے ہیں؟ اس لئے کہ ہمیں جس عورت نے انفارمیشن دی تھی اس نے بڑی تفصیل

سے ہر بات بتائی تھی۔ میرا خیال ہے کہ آپ مسز تھامسن کو لے آئیں۔ انہیں بہرحال یہ صدمہ برداشت تو کرنا ہی ہے نا!"

"ہاں ضیاء.........! ضروری تو نہیں کہ جسے ہم نے دیکھا تھا' وہی اینا ہو۔" طیب اب خود پر قابو پا چکا تھا مگر اب بھی اس کی بھٹکی ہوئی خوفزدہ نگاہ بار بار اسی اسٹریچر پر جا رہی تھی۔ جہاں وہ اس لڑکی کو پہچان چکا تھا جس کی موت کا ذمے دار وہ تھا۔

"آں.........! ہاں.........! ہو......... ہو سکتا ہے۔" اب میں خود کچھ گڑبڑا گیا۔ یوں لگا جیسے ذہن میں پڑی کوئی گرہ کھل رہی ہو۔ اینا سے مسز تھامسن نے ہمارا تعارف تو نہیں کرایا تھا۔ ضروری تو نہیں تھا کہ جو میں سمجھ رہا ہوں' وہی حرف بہ حرف سچ ہو۔

"طیب.........! تم مسز تھامسن کو لے آؤ۔" میں نے کہا پھر ڈاکٹر کی طرف متوجہ ہو گیا۔

طیب باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آیا تو ایلیا نڈھال ہوئی اس کے ساتھ تھی۔ اس کی ناک مسلسل رگڑنے سے اور سوج چکی تھی اور آنکھوں کے پپوٹے بھی لٹک آئے تھے جب کہ جبڑوں کے نیچے لٹکی ہوئی کھال بھی لرز رہی تھی۔

طیب نے اندر جانے کی ہمت نہیں کی اور طیب ہی کیا' میں خود بھی باہر آ گیا۔ مجھے تو شاید یہ گمان تھا کہ ایلیا خوشی خوشی باہر آئے گی اور اطلاع دے گی کہ ان میں اس کی بچی اینا نہیں ہے مگر لاشیں دیکھ کر اس کی کیا حالت ہو گی اور وہ کس دل سے اس اسٹریچر تک جائے گی یہ سب دیکھنے کی تاب نہیں تھی مجھ میں......... ڈاکٹر اندر ہی تھا۔ میں اور طیب ذرا فاصلے پر کھڑے ہو گئے۔ میں طیب کو سمجھا رہا تھا کہ وہ صورت سے مجرم نظر آ رہا ہے اس لئے خود کو نارمل رکھے کہ اچانک ہمیں اندر سے ایلیا کے چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں اور طیب ایک دوسرے کو دیکھ کر' پھر اچھل کر اندر بھاگے۔

"اینا.........! اینا میری بچی.........!" اندر کا منظر دیکھ کر ہم ٹھٹکنے میں رہ گئے۔ مجھ سے زیادہ طیب کی حالت خراب ہو گئی کیونکہ ایلیا اس لڑکی کی لاش سے لپٹی رو رہی تھی جس کے بارے میں طیب نے بتایا تھا کہ وہ اسے ہسپتال کے کونے میں پھینک گیا ہے۔ میں آپ کو بتا نہیں سکتا کہ ہم نے کیسے ایلیا کو سنبھالا اور کیسے اپنے اتھل پتھل ہوتے دل کو سہارا......... طیب تو اب باقاعدہ رو رہا تھا۔ اس بہانے اسے رونے اور اپنے جرم پر پچھتانے کا شاید موقع مل گیا تھا۔ وہ ایسے بلک رہا تھا جیسے اینا خود اس کی بیٹی ہو۔ ایلیا کو کسی نہ کسی طرح میں باہر لے آیا۔ وہ ہاتھوں سے نکلی جا رہی تھی۔ اپنے آپ کو مار رہی

تھی۔ ڈاکٹر نے اسے مسکن دوا کا انجکشن لگایا اور ایک بیڈ پر لٹا دیا۔ اس کے لئے یہی بہتر تھا۔ یہ پولیس کیس تھا اس لئے اس کی لاش لینے میں بڑی دشواریاں پیش آئیں۔ پولیس کا سامنا میں نے کیا جب کہ طیب ایلیا کی خدمت کر کے اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ تمام دن ہی نہیں' اگلی تمام رات بھی انہی چکروں کی نذر ہو گئی۔ ایک لمحے کے لئے یہ سوچنے کا موقع نہ ملا کہ وہ لڑکی کون تھی لیکن اتنا میں جان گیا کہ ایلیا نے جو قصہ اینا کے بارے میں سنایا تھا۔ اس کی جس بدصورتی کا ذکر کیا تھا وہ درست تھا۔ وہ لڑکی ایلیا کی دوسری کاپی تھی۔ اس کے مقابلے میں جس لڑکی کو میں اینا سمجھ رہا تھا' وہ تو دنیا کی حسین ترین لڑکی تھی۔ گویا دماغ میں پڑی گرہ کھل چکی تھی مگر یہ سوچنے یا جاننے کا موقع نہیں تھا کہ وہ کون تھی اور کہاں سے آئی تھی پھر جب میں ایک لمحے کے لئے اکیلا ہوا تو دماغ میں کوندے سے لپکنے لگے۔ مجھے اس کی ہنسی' اس کا انداز یاد آیا اور پتا نہیں کیوں زیوسا کا نام بار بار چاروں طرف گونجنے لگا۔ گویا ہم جو کچھ پہلے سمجھے تھے' وہی درست تھا۔ ایک مغالطہ تھا' ایک غلط فہمی تھی جو میرے ذہن میں پنجے گاڑ گئی تھی ورنہ وہی درست تھا۔ یہ بات مجھے خوفزدہ کرنے والی قطعی نہیں تھی اس لئے کہ میں تو خود زیوسا کو دعوت دینے کے موڈ میں تھا۔ نہیں.........! میں کوئی ایسا پیر' فقیر یا طاقتور آدمی نہیں تھا کہ جنوں' بھوتوں اور چڑیلوں سے منگے لے لوں بلکہ میرے خاندان میں ہونے والی اموات کے علاوہ میری ضدی طبیعت' ہٹ دھرمی اور ارادوں کی پختگی کے سوا کوئی طاقت میرے پاس نہیں تھی۔ ہاں' ایک شالی بابا کا ضرور خیال تھا حالانکہ میں ان کے دیئے ہوئے پتھر بھی بانٹ چکا تھا۔

بہرحال ابھی تک زیوسا کا رخ میری طرف مکمل طور پر نہیں تھا۔ وہ یقیناً جانتی تھی کہ زنجیریں میرے پاس ہیں مگر اب تک اس نے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا یا نہیں پہنچا سکی تھی۔ اسی بات نے میرے حوصلے بلند کر دیئے تھے۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ اب اس کا رویہ میرے ساتھ کیا ہو گا۔ مجھے ذرا سا بھی گمان ہوتا کہ یہاں ہمارا استقبال کرنے والی زیوسا خود یا اس کی کوئی کارستانی ہو گی تو میں بھی اسے خوش آمدید ضرور کہتا۔

"ضیاء.........! ضیاء.........!" طیب اچانک میرے کمرے میں چلا آیا۔ اس کے منہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"کیا ہو گیا؟" میں چونک کر اٹھ بیٹھا۔

"اسی کا.......... اسی کا فون آیا تھا۔" وہ پھولی سانس میں بولا۔

"کس کا..........؟"

"وہی تمہاری چہیتی..........! کیا فضول سا نام ہے اس کا.......... زیوسا..........!" وہ نڈھال سا میرے قریب بیٹھ گیا۔

"فون آیا تھا۔" میں حیران ہوا کیونکہ یہاں ایک ہی فون تھا جس کا ایکسٹینشن میرے پاس اوپر بھی تھا۔ گھنٹی دونوں فونوں کی بجتی تھی اور میں نے ایسی کوئی آواز نہیں سنی۔ کمال یہ کہ اندرونی حصے والی کھڑکی بھی کھلی ہوئی تھی پھر بھی نیچے سے مجھے ٹیلی فون کی بیل سنائی نہیں دی تھی۔

"مگر..........!!" میں نے ٹیلی فون سیٹ کی طرف دیکھا۔

"یہاں نہیں.......... گھر پر آیا تھا۔"

"کیا؟" اب مجھے بھی تشویش ہونے لگی۔ ایسا نہ چاہنے کی بنا پر ہی تو میں یہاں شفٹ ہوا تھا۔ "کیا کہتی تھی؟"

طیب نے یہ سن کر کھڑکی کے قریب جا کر نیچے جھانکا پھر کھڑکی بند کر دی۔ اس کی حرکتیں خاصی پُراسرار سی لگ رہی تھیں۔ شاید وہ ایلیا سے خوفزدہ تھا۔ جب اس نے دروازہ بھی باہر دونوں جانب دیکھنے کے بعد بند کر دیا تو میں ذرا سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اب وہ میرے قریب آ گیا۔

دیباچہ

ہمارے ملک میں ایسے قارئین کی تعداد بہت زیادہ ہے جو پراسرار اور خوفناک کہانیوں کے شیدائی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان جتنا متجسس شاید ہی کوئی اور ہو۔ ہر شے کے بارے میں تجسس اور جاننے کی جستجو کرتا ہے اور اگر کوئی بھید اس کی سمجھ میں نہ آئے اور اس کی عقل سے ماورا کوئی بات ہو جائے تو اسے پراسرار کہہ کر اپنے اندر کے تجسس کی تسکین کرنا چاہتا ہے۔

پراسرار، خوفناک اور ڈراؤنی کہانیاں لکھنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ معدودے چند قلمکاروں نے ہی اس میدان میں طبع آزمائی کی بات کی ہے۔ محترمہ سیما غزل نے "کالی بیل" لکھ کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ کسی بھی طرح مرد حضرات مصنفین سے کم نہیں ہے۔

سات سو صفحات پر پھیلی ہوئی یہ طویل داستان اتنی دلچسپ اور اسرار انگیز ہے کہ ایک بار شروع کر کے ختم کیے بغیر چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ پوری کہانی وحشت، خوف اور اسرار میں ڈوبی ہوئی ہے۔ سسپنس اتنا کہ ہر صفحے پر یہ توقع ہوتی ہے کہ کوئی ہنگامہ ہونے والا ہے۔

کہانی میں خوفناک آدم خور مکڑیوں نے اتنی وحشت پھیلائی ہے کہ پڑھنے والا بار بار اپنے کپڑے جھاڑنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار ایک مسلمان نوجوان ہے جس پر یونان کی دیوی "زیوسا" جو سیکس، بدی، تباہی اور موت کی دیوی کہلاتی ہے، عاشق

ہو جاتی ہے۔ دوسری طرف ایک عیسائی لڑکی "ایلین کی بدروح" ایک ساحرہ کی مدد سے موت کا بازار گرم کیے ہوئے ہے اور اس نوجوان کی جان کے درپے ہے۔ "زیوسا" اور "ایلین" کا ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔ کہانی کی اس موڑ پر سسپنس اور تجسس انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔

کتاب کی زیادہ تعریف کرنا مناسب نہ ہوگا کیونکہ بہترین منصف قارئین ہیں جو خود اس کے بارے میں کوئی رائے قائم کریں۔

طوالت کی وجہ سے کہانی دو حصوں میں پیش کی جا رہی ہے۔ قارئین سے التماس ہے کہ اپنی قیمتی آراء اور مشوروں سے نوازتے رہا کریں۔ خاص طور پر تعمیری تنقیدی خطوط کا انتظار رہے گا۔

اب میں کہانی اور آپ کے درمیان سے ہٹ جاتا ہوں۔ کہانی شروع کرنے سے پہلے اپنے آس پاس یہ ضرور دیکھ لیجیے گا کہ کوئی مکڑی تو نہیں ہے!

نیاز مند

عبدالغفار

کالا تیل

"طیب! خیریت ہے نا؟"

"خیریت ہی تو نہیں ہے۔ وہ مجھے بلیک میل کر رہی ہے۔ اس نے مجھے یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ میں ہی ایلیا کا قاتل ہوں اور اگر وہ یہ بات پولیس کو اور ایلیا کو بتا دے تو مجھے کہیں پناہ نہیں ملے گی۔ میں گاڑی ٹھیک کرانے کی وجہ سے گیا تھا۔ اس کے ٹائروں پہ خون تھا اور بمپر پر ڈینٹ پڑنے کے علاوہ اس کے خون کے دھبے اور بال چپکے ہوئے تھے۔ میں نے تین گھنٹے کی محنت سے گاڑی صاف کی ہے مگر وہ کہتی ہے کہ وہ جب چاہے گی' گاڑی بالکل اسی پوزیشن میں پولیس کو مل جائے گی جس پوزیشن میں ایکسیڈنٹ کے بعد تھی۔"

"یار ضیاء! خدا کی قسم! وہ اچانک میرے سامنے آ گئی تھی۔ میں نے اسے بچانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی مگر میں جدھر گاڑی موڑتا تھا' وہ بھی ادھر ہی بھاگتی اور بالآخر........"

"اوہ........!! یہ بتاؤ' آگے' پیچھے تو فون نہیں آیا اس کا؟"

"نہیں........! شاید نہیں........! میں نے کسی سے ذکر نہیں سنا۔ ممکن ہے' وہ کرے۔ یہ ہے کیا بلا یار؟" وہ کافی پریشان تھا۔ "اگر یہ بات کسی کو پتا چل گئی تو!"

"تم نے کہا نہیں کہ وہ مجھ سے رابطہ کرے۔" میں نے پوچھا۔

"اتنا ہوش کب رہا تھا۔"

"خیر........! تم نے پتھر کا کیا کیا؟"

"یہ........ باندھ لیا........" اس نے دایاں بازو آگے کر دیا۔ وہ واقعی موم جامہ کر کے اسے باندھ چکا تھا۔

"یہ تم نے بہت اچھا کیا۔ اب تم بے فکر ہو جاؤ۔ وہ تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکے

گی۔" میں واقعی مطمئن ہو گیا۔

"لیکن ضیاء.........! تم......... تم کیا کرو گے؟"

"میری فکر نہ کرو۔ میں آج رات یہ طے کر لوں گا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔"

"ایلسیا کی حالت خراب ہے۔" اس نے چند لمحے کی خاموشی کے بعد کہا۔

"ہاں.........! میں نے اسے ڈاکٹر کو دکھایا تھا۔ اسے بہت صدمہ پہنچا ہے لیکن تم فکر نہ کرو۔ کیا تم گاڑی میں آئے ہو؟"

"ہاں.........! میں فون پر بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔"

"اچھا کیا۔ فون پر کرنے والی بات بھی نہیں ہے۔ آئندہ بھی احتیاط کرنا اور سنو! اب اگر فون آئے تو کہہ دینا کہ میں اس کے فون کا منتظر ہوں۔ اس سے زیادہ بات نہ کرنا اور فون بند کر دینا۔ دیکھیں گے کہ اس کا اگلا قدم کیا ہو گا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں چلتا ہوں۔" وہ کھڑا ہو گیا۔ "تم ایلسیا کا خیال رکھنا۔"

"اوکے.........! تم جلدی چلے جاؤ۔" مجھ پر اچانک ہی گھبراہٹ کا دورہ پڑ گیا۔ میں کھڑا ہو گیا۔ ایک عجیب سی بے چینی ٹیس کی طرح مجھ میں اٹھی تھی جیسے کچھ ہونے والا ہو یا کچھ ہو گیا ہو۔ میں طیب کے ساتھ نیچے تک آیا۔ اسے گاڑی میں بٹھا کر روانہ کر دیا۔ کچھ دیر تک اس کی گاڑی کو جاتے دیکھتا رہا پھر لوٹ کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ ایلسیا بے سدھ سی صوفے پر پڑی تھی۔ میں اس کے قریب بیٹھ گیا۔

"ایلسیا.........! تم ٹھیک ہو نا.........؟" میں نے دھیرے سے اسے پکارا تو اس نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا۔ وہ انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔

"ایلسیا! ہر شخص مرنے کے لئے ہی دنیا میں آتا ہے۔ کہیں ایسی جگہ سے جو اس کے ذہن سے محو ہو جاتی ہے اور آگے ہی آگے بڑھتا ہے۔ یہ ارتقاء کی منازل ہیں' ہمیں خوب علم ہے کہ اب اس زندگی کے بعد ہمیں کسی اور زندگی میں' کسی اور دنیا میں جانا ہے۔ جیسے ہم اب سے پہلے کے حالات سے ناواقف ہیں' ویسے ہی آنے والے واقعات سے بھی ناواقف ہیں۔ تم بھی چلی جاؤ گی۔ میں بھی اور باقی سب بھی......... ہماری جگہ نئے آنے والے لے لیں گے۔ تم نہ بچی ہو' نہ زندگی اور موت کی حقیقت سے ناواقف......... مجھے نہیں معلوم کہ بعد از موت زندگی کا تمہارے ہاں کیا تصور ہے مگر ہمارے ہاں اس کا بڑا خوبصورت تصور ہے۔ ہمیں قدم قدم پر اس حقیقت کا احساس دلایا

گیا ہے کہ ہم ایک سایہ دار جگہ میں چند لمحے ستانے کو رکے ہیں مگر یہی دنیا کسی کسی کے لئے کانٹوں سے بھرا میدان' کسی کے لئے خوفناک درندوں سے پٹا جنگل اور کسی کے لئے لق و دق تپتے صحرا کی طرح ہے۔ ہم یہاں سے اپنے دکھ سکھ' اپنے اعمال' نیکی اور بدی' بدنیتی اور خلوص یہ سب کچھ لے کر آگے چلے جائیں گے۔ ہمارے کردار کی مضبوطی' ہماری نیکیاں آگے آنے والے اندھیری راہوں میں روشن ہو کر ہمیں راستہ دکھائیں گی۔ کیا تم ان باتوں پر بلیو کرتی ہو؟"

میں نے دیکھ لیا تھا کہ اس کے چہرے کے عضلات ڈھیلے پڑ گئے ہیں۔ اس کی آنکھوں میں صبر ہچکولے لینے لگا ہے۔ یہ بات میرے لئے امید افزا تھی۔ اس نے دھیرے سے سر ہلا دیا۔ میں نے اسے چائے آفر کی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر میں نے اسے منع کر دیا۔ میں اسے اپنے ہاتھوں سے چائے بنا کر پلانا چاہتا تھا۔ میں دن میں اس پوری عمارت کا جائزہ لے کر دیکھ چکا تھا کہ کچن کدھر ہے۔ اس نے تشکرانہ انداز میں مجھے دیکھا اور لیٹ گئی۔ میں کچن میں چلا آیا۔

چائے بناتے ہوئے میں نے تمام کیبنٹ کھول کر ہر چیز کا جائزہ لیا۔ مجھے پتا تھا کہ ایلسیا بہت دنوں تک کچھ پکانے کے قابل نہیں ہو سکے گی۔ ہوٹلنگ میرے لئے ناقابل برداشت تھی اس لئے میں خود ہی پکانا اور کھانا چاہتا تھا۔ میں نے چائے بنا کر ٹرے میں سامان رکھا۔ اس وقت چمچوں کی دراز کھولی تو سامنے ہی ایک بڑی سی چمکدار چھری پر میری نگاہ پڑی۔ بجلی سی کوندی' پتا نہیں کیوں میں چند لمحے تک اسے تکتا رہا حالانکہ وہ ایک عام سی چھری تھی جو کچن میں کام آتی تھی۔ اس کا پھل غالباً چاندی کا تھا جو چمک رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس چھری پر نگاہ پڑتے ہی میرا ذہن ماؤف ہو گیا ہے۔

پھر میں خود بخود چونک کر ٹھیک ہو گیا۔ میں نے چمچہ نکال کر جھٹکے سے دراز بند کر دی۔ چائے لے کر ایلسیا کے پاس آیا۔ ہم نے چائے پی۔ میں ایلسیا کو بہلانے میں کافی حد تک کامیاب رہا تھا۔ وہ اب پہلے کی نسبت بہت تیز تھی۔

"مسٹر ضیاء! سوری.........! مجھے تمہارے کام کرنا چاہیے تھے مگر........."

"نہیں ایلسیا! تم میری ملازم نہیں ہو۔ یہ بھی تمہاری مہربانی ہے کہ تم ہم سے اتنا خلوص برت رہی ہو۔ ویسے بھی میرا کام کرنا تمہاری ڈیوٹی قطعی نہیں تھی۔ میں ایسی بے ترتیب اور تکلیف دہ تقسیم کو پسند نہیں کرتا۔ میں اپنا کام اپنے ہاتھ سے کر کے خوش رہتا

ہوں۔ مجھے کسی پر بوجھ بننے کی عادت بھی نہیں ہے۔ تم اس طرف سے کوئی فکر نہ پالو۔ نہ ذہن کو بوجھل کرو۔ بس میں تمہیں صحت مند دیکھنا چاہتا ہوں۔ تم صرف اتنا سوچو کہ اب تمہاری بیٹی یہاں کے سنگدل لوگوں کے درمیان نہیں ہے کہ گھٹ گھٹ کر زندگی گزارے۔ وہ اب بڑی مہربان اور رحم کرنے والی ذات' خدا تعالیٰ کے پاس ہے۔ وہ جو اپنے بندوں سے کسی بے پناہ شفیق ماں سے بڑھ کر پیار کرتا ہے۔"

"تم بہت نائس مین ہو مسٹر ضیاء! مجھے افسوس ہے کہ میں نے تم سے ملے بغیر' تمہارے لئے بری رائے قائم کرلی تھی میری اسی غلطی کی مجھے اتنی بڑی سزا ملی ہے۔ اگر میں ایناکو یوں نہ چھپاتی تو شاید وہ اس وقت میرے ساتھ کچن میں ہوتی اور بقول تمہارے' وہ یہ شرارت نہ کرتی جو اس نے میرے ساتھ کی اور ہاں' مسٹر ضیاء.........! کیا تم میری ایک بات کا بالکل سچائی کے ساتھ جواب دو گے؟"

"کیوں نہیں.........؟" میں جھوٹ کو صرف اس وقت اچھا سمجھتا ہوں جب وہ کسی کی بہتری کے لئے بولا جائے۔"

"جب اینانے تم لوگ کو اسکوائش دیا تھا تب تم نے یا......... طیب نے اس کو ڈس ہارٹ تو نہیں کر دیا تھا کہ وہ یوں گھر چھوڑ کر چلی گئی اور........."

"نہیں ایلیا! اس سے تو ہم ملے بھی نہیں تھے۔" میں بے ساختہ کہہ بیٹھا۔ شاید اس لئے کہ میں اس سے سچ بولنے کا وعدہ کر چکا تھا۔

"مگر تم کہہ رہے تھے کہ........."

"اوہ! وہ......... وہ تو........." میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں اسے کیا جواب دوں۔ مجھے بات ٹالنا پڑی۔ بہانہ کیا کہ مجھے اچانک یاد آگیا ہے کہ ایک اہم فون کرنا ہے۔ اٹھتے اٹھتے میں نے شک کے گہرے سائے دیکھ لئے تھے جو اس کی بوڑھی آنکھوں میں چمکتے گدلے پانی میں تیر رہے تھے۔ میں اس حالت میں اسے خوفزدہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

میں نے طیب کے گھر کا نمبر ڈائل کیا۔ فون حسب توقع زہرہ آپا نے اٹھایا۔ میں ان سے بات کرتا رہا۔ میں نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ رات ڈنر پر پہنچوں گا مگر رات تو میری ایناکی تجہیز و تدفین میں گزری تھی۔ میں نے ان سے نہ پہنچنے پر معذرت کی۔ انہیں طیب کی زبانی پتا چل چکا تھا کہ کیا ہوا ہے لیکن وہ اب پھر آنے کو کہہ رہی تھیں۔ میں نے آفس کے کام کے بہانہ کر کے ان سے چند روز کی چھٹی لے لی۔ انہی سے پتا چلا کہ ابھی تک

طیب واپس گھر نہیں پہنچا ہے۔ ایسی کوئی بات انہوں نے نہ کی جس کا تعلق زیوسایا کسی قسم کے حیرتناک واقعے سے ہو۔ مجھے کچھ اطمینان ہوا۔ میں کن انکھیوں سے ایلیا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ اب کمزوری کے باعث اونگھ رہی تھی۔ میں نے چاہا تھا کہ وہ اپنے کمرے میں جا کر آرام کرے مگر اس نے کہہ دیا تھا کہ وہاں وہ اینا کے ساتھ رہتی تھی اس لئے اب اس کی غیر موجودگی کو بہت زیادہ فیل کرتی ہے اور وحشت کا شکار ہو جاتی ہے اس لئے میں نے اصرار نہیں کیا مگر وہ یہاں صوفے پر قطعی بے آرام تھی۔ اس لئے میں فون رکھ کر اس کے قریب آگیا۔

"ایلیا! کیا اس کمرے اور میرے والے کمرے کے علاوہ اتنی بڑی کوٹھی میں دوسرا کوئی کمرا نہیں......... آئی مین بیڈ روم........."

"ہاں.........! ہے......... تمہارا روم کے بازو والا روم ہے مگر وہ گیسٹ کا ہے۔ ام وہ روم یوز نہیں کرتا۔"

"یہاں اب کوئی گیسٹ نہیں آئے گا۔ تم وہاں آرام کرو۔"

وہ تیار نہیں تھی مگر میں نے زبردستی اسے راضی کیا۔ اس سے چابی لے کر اوپر گیا۔ کمرا کھولا تو ایک مہک سی چاروں طرف پھیل گئی۔ یہ کمرا اندر سے سفید رنگ سے پینٹ کیا گیا تھا اور یہاں کا سارا فرنیچر بلیک لکڑی کا تھا جس کے کناروں پر سنہرے رنگ کی باریک پٹیاں سی پڑی تھیں۔ یہاں سفید' سنہرے اور کالے رنگ کے پردے پڑے تھے۔ درمیان میں گول بیڈ تھا جس پر سفید' سنہرے اور کالے ہی بہت سے کشن بے ترتیبی سے پڑے تھے۔ مجھے یہ کمرا بہت اچھا لگا۔ جی چاہا کہ یہاں خود شفٹ ہو جاؤں اور اپنا کمرا ایلیا کو دے دوں۔ میں نے نیچے آ کر کہا کہ وہ میرے کمرے میں چلی جائے اور میں اس کمرے میں شفٹ ہو جاتا ہوں۔ وہ مان گئی۔ میں اسے لئے ہوئے اپنے کمرے میں آگیا۔ وہاں اسے بٹھایا اور اپنے اٹیچی کیس لے کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ مجھے یہاں چلے آنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ شام گہری ہو چکی تھی۔ میں نے بازار سے کھانا لانے کا سوچا اور کپڑے بدل کر' ایلیا کو بتا کر وہاں سے نکل گیا۔ ٹیکسی کے لئے دور تک جانا میرے لئے بہتر تھا' اس بہانے میری واک ہو جاتی تھی اس لئے یہ مجھے دشوار نہیں لگا۔ مجھے جلد ہی ایک ٹیکسی مل گئی۔ یہاں سے قریب ترین علاقے میں' میں نے ایک بہتر ہوٹل تلاش کیا۔ ٹیکسی روکے رکھی اور کھانا پیک کرا کے واپس آگیا۔

مجھے بہت بھوک لگ رہی تھی۔ ایلیا سو چکی تھی۔ میں نے اپنے لئے کھانا نکالا اور وہیں ڈرائنگ روم میں پڑی ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ گیا۔ ابھی میں ٹھیک سے کھا بھی نہیں پایا تھا کہ کال بیل بج اٹھی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی۔ آنے والے نے وہ کال بیل بجائی تھی جو اندرونی عمارت کے یعنی ڈرائنگ روم کے دروازے پر لگی تھی۔ ایلیا مجھے بتا چکی تھی کہ باہر گیٹ والی کال بیل کا کنکشن کچن میں ہے جبکہ ڈرائنگ روم کے باہر والے دروازے کی کال بیل کا کنکشن ڈرائنگ روم میں۔ میں نے نوالہ پلیٹ میں رکھ دیا۔ اٹھ کر دروازے تک گیا اور یہی سوچتا رہا کہ بھلا کون آسکتا ہے۔

"طیب.........؟" ایک خیال آیا۔

میں نے دروازہ کھولا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں ایک قدم آگے بڑھا۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ اب عمارت کی باہر والی دیواروں کے کناروں سے اندھیرے پھوٹنے لگے تھے۔ میں نے باہر کی طرف لگے سوئچ بورڈ کا بٹن آن کر دیا۔ باہر لان کے قریب لگا بلب روشن ہو گیا۔ کہیں بھی کوئی نہیں تھا۔ میں نے ڈرائنگ روم کے دروازے کی پیشانی پر لگا بلب بھی روشن کر دیا پھر پلٹ کر دیکھا مگر کوئی نظر نہیں آیا۔ میں اندر داخل ہونے لگا تبھی میری نگاہ کال بیل کے قریب سے اندر جاتی ایک بڑی سی مکڑی پر پڑی۔ میں ٹھٹک گیا۔ میں نے غور سے دیکھا۔ اس کی جسامت تو کافی بڑی تھی مگر وہ قطعی عام سی مکڑی تھی۔ خوف کی ایک لہر جو مجھ میں اٹھی تھی، ختم ہو گئی۔ وہ یوں رینگتی ہوئی اندر جا رہی تھی جیسے کال بیل اسی نے بجائی ہو اور میں نے اسی کے لئے دروازہ کھولا ہو۔

مجھے ہنسی آگئی۔ میں نے ہنس کر کہا۔ "بی مکڑی! بھلا کال بیل بجانے کی کیا ضرورت تھی؟ تم تو دروازے کے نیچے سے رینگ کر بھی آسکتی تھیں۔" وہ اندر داخل ہو گئی۔ میں نے اسے مارنے یا بھگانے کی کوشش نہیں کی۔ جب وہ چوکھٹ سے ہوتی ہوئی اندر کی دیوار پر پہنچ گئی تب احتیاط سے دروازہ بند کیا۔ واپس ڈائننگ ٹیبل پر آبیٹھا اور کھانا کھانے لگا پھر وہ مکڑی میرے ذہن سے بالکل نکل گئی۔ میں نے کھانا کھا کر برتن کچن میں رکھے اور ایلیا کا کھانا فریج میں رکھ کر اوپر اپنے کمرے میں آگیا۔

میں سونا چاہتا تھا۔ نیند اور تھکن مجھ پر غالب تھی۔ میں کمرے میں آتے ہی کپڑے تبدیل کر کے لیٹ گیا۔ یہ شاید پہلا موقع تھا کہ میں اتنی جلدی لیٹا ہوں۔ ورنہ عام طور پر رات گئے تک جاگتا رہتا ہوں۔ میں نے لائٹ بند کر دی۔ نائٹ

بلب جلا دیا مگر کچھ دیر بعد مجھے اس بلب کی روشنی بھی چبھنے لگی تو میں نے اٹھ کر وہ بلب بھی بجھا دیا۔ کمرے میں گھپ اندھیرا چھا گیا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ دھیرے دھیرے ذہن کو سوچوں سے آزاد کر لیا اور مکمل آرام دہ نیند لینے کا ارادہ کر کے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

اب احساس ہو رہا تھا کہ میرے اعصاب میں بے پناہ کھنچاؤ ہے۔ چند لمحے کو تو بے چینی سی رہی پھر نیند غالب آنے لگی۔ غنودگی سی چھا گئی۔ باہر گہرا سناٹا مجھے بڑا پرسکون لگ رہا تھا جبکہ طیب کا گھر ایسی جگہ تھا جہاں تین اطراف بڑی مصروف سڑکیں تھیں۔ آدھی رات کو وہاں سے گزرنے والے ٹریفک کی سماعت چیر ڈالنے والی آواز مجھے سخت اذیت دیتی تھی جبکہ یہاں دور دور تک نہ رہائشی علاقہ تھا، نہ فلیٹ جس میں دن رات بچوں کا شور گونجتا اور نہ ہی کوئی مصروف سڑک کہ ٹریفک کی آواز نیند اور سکون میں حارج ہوتی۔

میں دھیرے دھیرے جیسے اندھے کنوئیں میں اتر رہا تھا۔ اچانک میری حس سماعت چونک اٹھی۔ عجیب سی سرسراہٹ تھی جسے میں نے پہلے پہل تو کوئی اہمیت نہ دی مگر جب مسلسل یہ آواز آنے لگی تو بہت ناگوار گزری۔ پہلے میں غنودگی میں اس کو محسوس کر رہا تھا اور ختم ہونے کا منتظر تھا پھر میں مکمل طور پر بیدار ہو گیا۔ بیدار ہو کر میں نے قوت سماعت کو اس آواز پر مرکوز کر لیا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ یہ آواز کہاں سے آرہی ہے اور کس کی آواز ہے؟ ذرا غور کرنے پر محسوس ہوا جیسے کوئی کسی چیز کو فرش پر گھسیٹ رہا ہے۔ میں نے پھر غور کیا اور اپنے اس خیال کی خود ہی تردید کر دی۔ آواز ایسی تھی جیسے کوئی چیز رینگ رہی ہو۔ کوئی ایسی چیز جس کے رینگنے سے ہلکی سی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ پہلا خیال مجھے یہی آیا کہ سنسان علاقہ ہے۔ شاید کوئی جانور، کتا یا بلی......... یا کوئی اور جانور اپنے کسی شکار کو گھسیٹ کر کسی کونے میں لے جانے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں نے سر اٹھا کر باہر والی کھڑکی کو دیکھا۔ یہاں بھی دونوں طرف کھڑکیاں اسی رخ پر تھیں جس رخ پر دوسرے کمرے کی کھڑکیاں تھیں۔ باہر والی کھڑکی بند تھی۔ میں نے سامنے والی اس کھڑکی کی طرف دیکھا جو ڈرائنگ روم کی طرف کھلتی تھی، وہ بھی بند تھی۔

مجھے یاد آگیا کہ میں نے کھڑکیاں کھولی ہی نہیں تھیں۔ اب میں نے نائٹ بلب جلا دیا۔ اس کی روشنی اندھیرے میں کافی تھی۔ میں نے کمرے میں چاروں طرف نگاہ ڈالی۔

فرش دیکھا' کچھ دکھائی نہ دیا۔ سب کچھ ٹھیک تھا۔ میں نے روشنی بجھادی اور تکیہ کانوں پر رکھ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ اب وہ سرسراہٹ یا تو ختم ہو گئی تھی یا یہ تکیے سے کان بند کرنے کا نتیجہ تھا۔ میں پھر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ گہری غنودگی تھی کہ میں نے چرچراہٹ کی کریہہ آمیز آوازیں سنیں۔ میں پھر ڈسٹرب ہو گیا۔ یہ بھی یقین ہو گیا کہ شاید کوئی کتا یا بلی ڈنر کر رہے ہیں اور بڑی بد تمیزی سے کر رہے ہیں۔ میں نے زور سے کروٹ لی۔ دوسرا تکیہ بھی اٹھا کر کان پر رکھ لیا مگر آوازیں جیسے تکیے میں جذب ہونے کے بعد سماعت میں اتر رہی تھیں۔ ایسی خوفناک سی اور اتنی کریہہ آوازیں تھیں کہ میرا جی متلا گیا۔ یوں لگنے لگا جیسے کوئی میرے سرہانے بیٹھا کسی وجود کو ادھیڑ ادھیڑ کر کھا رہا ہو۔ اس کا لہو چاٹ رہا ہو۔ میں نے ہر طرح کوشش کی کہ وہ آوازیں میری سماعت سے دور اور ذہن سے محو ہو جائیں مگر میں بری طرح ناکام ہو گیا تھا جبکہ وہ آوازیں اب میرے اعصاب پر' میرے حواسوں پر چھا کر مجھ سے اور قریب......... بالکل قریب محسوس ہونے لگی تھیں۔

آخر میں اچھل کر اٹھ بیٹھا۔ میں نے لائٹ جلائی اور سامنے لگے وال کلاک پر نگاہ پڑتے ہی میری آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ گھڑی رات کے تین بجا رہی تھی۔ "یہ کیسے ممکن ہے؟" بے ساختہ میرے منہ سے نکلا اور پھر میں نے سرہانے رکھی اپنی رسٹ واچ اٹھا کر دیکھی۔ اس میں بھی تین ہی بجے تھے۔ اب میری توجہ پھر اسی آواز کی طرف ہو گئی جو بتدریج بڑھ رہی تھی۔ میں نے باہر والی کھڑکی کھولی۔ آواز کے اتار چڑھاؤ میں نہ اضافہ ہوا' نہ کمی ہی آئی پھر بھی میں نے چاروں طرف دیکھنے کی کوشش کی۔ باہر دیکھنے سے اندازہ ہوا کہ واقعی رات بہت زیادہ بیت چکی ہے مگر کیسے.........؟

اس سوال کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ میں بستر پر لیٹا ہوں تو بہ مشکل رات کے آٹھ بجے ہوں گے۔ سویا بھی نہیں تھا' اس کا بھی مجھے یقین تھا۔ میں نے زیادہ سے زیادہ بستر پر ایک گھنٹا یا ڈیڑھ گھنٹا گزارا تھا۔ یہ سب سوچتا اگر وہ آواز اب گرم گرم سیسے کی طرح میرے کانوں میں نہ اتر رہی ہوتی۔ باہر نہ کوئی کتا یا بلی اور نہ ہی کوئی اور جانور تھا۔ میں نے توجہ دی تو لگا کہ آواز اس سمت سے نہیں آ رہی۔ اب میں نے اندرونی کھڑکی کھولی اور پھر......... گھبرا کر بند کر لی کیونکہ کھڑکی کھولتے ہی آواز کسی ہوا کے طوفانی جھکڑ کی طرح اندر داخل ہوئی تھی۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ "یہ کیا ہو رہا ہے.........؟ یہ کون ہے.........؟ ڈرائنگ روم سے یہ آوازیں آ رہی ہیں؟" آوازیں اتنی کریہہ اور

خوفناک تھیں کہ مجھے کھڑکی دوبارہ کھولنے کی ہمت نہ ہو رہی تھی مگر میں یوں تو نہیں بیٹھا رہ سکتا تھا۔ مجھے کچھ نہ کچھ تو کرنا تھا۔ اسے ڈھونڈنا تھا جو ان آوازوں کا سبب تھا۔

میں نے اس بار خود پر قابو پا کر پھر کھڑکی کھول دی۔ چرڑ چرڑ کی تیز اور کریہہ آوازوں نے میری سماعت اور حلق تک میں خراشیں ڈال دیں مگر میں نے اس بار سر نکال کر ڈرائنگ روم کا جائزہ لیا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا لیکن......... میری ریڑھ کی ہڈی میں برف جمنے لگی۔ بے پناہ شدید بدبو کے بھبکے مجھے پیچھے دھکیل رہے تھے۔ میں نے کھڑکی بند کر دی۔ اس سے پہلے ہی میں سانس روک چکا تھا۔ مجھے الٹی آنے لگی۔ میں بھاگ کر باتھ روم میں گیا۔ لگا جیسے کلیجہ منہ کے ذریعے باہر آنے کو ہے۔ آنتیں کھنچ گئیں۔ جتنا کھایا پیا تھا' سب باہر آ گیا۔ بدن پر برف جمی محسوس ہونے کے باوجود میری پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے۔ میں نے چند لمحے خود کو سنبھالنے کے لئے وقف کر دیئے پھر میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ کوئی ایسی چیز نظر نہ آئی جسے میں لاٹھی کے طور پر استعمال کر سکتا۔ اب مجھے یہ یقین ہو گیا تھا کہ نیچے کوئی کتا یا بلی ہے جو اپنے شکار کو بھنبھوڑ رہا ہے۔ وہ بدبو بھی سڑے ہوئے گوشت کی سی تھی۔ اب میری حالت کچھ بہتر ہو چکی تھی۔ میں نے کسی بھی ایسی چیز کی تلاش شروع کر دی جو اس جانور کو بھگانے اور خود کو بچانے کے کام آ سکے۔ مجھے بیڈ کے نیچے سے ایک چمکدار راڈ مل گئی جو غالباً پنکھے وغیرہ میں کام آتی ہے۔ میرا حوصلہ بڑھ گیا۔ میں دبے پاؤں نیچے چل پڑا۔ مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ بند کمرے میں وہ جانور آیا کیسے؟

میری حیرت انگیز بینائی میرا ساتھ دے رہی تھی۔ میں ایک دم نیچے نہیں اترا بلکہ میں نے وہیں آڑ میں کھڑے ہو کر پورے کمرے کا جائزہ لیا۔ جہاں جہاں میری نگاہ جا سکتی تھی' وہاں وہاں کچھ بھی نہیں تھا تبھی میں نے محسوس کیا کہ آواز اس کمرے سے نہیں آ رہی بلکہ کہیں اور سے آ رہی ہے۔ میں الجھ گیا پھر بھی میں نے بڑے محتاط انداز میں ڈائننگ ٹیبل کے نیچے' صوفوں کے پیچھے دیکھا اور پھر چپے چپے کو چھان مارا مگر یہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ آواز مسلسل آ رہی تھی۔

یہ انکشاف مجھ پر اچانک ہوا کہ آواز اوپر سے آ رہی ہے۔ بے اختیار میں نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ اوپر میرا کمرا تھا یا پھر وہ کمرا جو آج سے پہلے میرا تھا اور اس وقت اس میں ایلیا سو رہی تھی۔ میں تیزی سے سیڑھیوں کی جانب بڑھا' تاکہ اوپر جا سکوں مگر پھر ٹھٹکی

فون کی تیز آواز سن کر میں اچھل پڑا۔ مجھے حیرت بھی ہوئی اور خوف سے بدن میں سنسناہٹ پھیل گئی میں پلٹا۔ ٹیلی فون مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر رکھی اونچی سی ٹیبل پر رکھا تھا جو صرف ٹیلی فون کے لیے مخصوص ہوتی ہے۔ بیل مسلسل بج رہی تھی۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ کچھ بولا نہیں اور پھر میں زہرہ آپا کی آواز سن کر سناٹے میں رہ گیا۔ وہ مجھے پکار رہی تھیں۔ زور زور سے۔ "ضیاء.........! ضیاء!"

"زہرہ آپا!!! کیا بات ہے؟" میں چیخا اور پھر زہرہ آپا کی آواز بے پناہ چیخ پکار میں کہیں کھو گئی۔ مجھے لگا تھا جیسے اس کوٹھی میں طوفان سا آگیا ہو۔ اوپر سے ایلیا ذبح کیے ہوئے جانور کی طرح چیخ رہی تھی۔ اس کی کربناک چیخیں تیز دھار بھالے کی طرح میرے وجود میں اتر گئیں۔ ادھر زہرہ آپا وحشت ناک آواز میں مجھے پکار رہی تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کروں۔ ریسیور پھینک کر اوپر بھاگوں یا زہرہ آپا کی بات سنوں جو کچھ اور کہنے کی بجائے صرف مجھے پکارے جا رہی تھیں پھر ان کا جملہ بدل گیا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے......... ضیاء.........! یہ کیا ہو رہا ہے؟"

میں بری طرح بوکھلا چکا تھا۔ اچانک اسی وقت جب یہ طوفان زوروں پر تھا' کال بیل بج اٹھی۔ مجھے یوں لگا جیسے پوری کوٹھی ایک بگولے کی طرح زمین سے اٹھ کر فضا میں گول گول چکر لگانے لگی ہو۔ ریسیور میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اسی لمحے ایلیا جو کسی نہ کسی طرح کھڑکی تک پہنچ گئی تھی' مجھے پکارنے لگی۔

"ضیاء.........!! مسٹر ضیا.........! غوں......... غوں......... غیا........."

میں عین اسی کھڑکی کے نیچے تھا۔ دروازے پر جو بھی تھا' کال بیل پہ ہاتھ رکھ کر مسلسل بجائے جا رہا تھا۔ میں نے اوپر دیکھا۔ اسی وقت میرے چہرے پر کوئی چیز گری۔ گیلی گیلی' لجلجی سی۔ میں گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہٹا۔ میں نے ہاتھ سے چہرے کو صاف کیا اور اپنے ہاتھ میں گوشت کا خون میں لتھڑا ہوا ٹکڑا دیکھ کر بے ساختہ چیخ اٹھا۔ ریسیور سے اب تک زہرہ آپا کی آواز آرہی تھی۔ ایلیا چیخ رہی تھی۔ میں بوکھلایا ہوا تھا۔ کال بیل بج رہی تھی۔

میرا چہرہ اوپر سے گرنے والے خون اور گوشت کے قطروں سے لتھڑا ہوا تھا۔ جی متلا رہا تھا۔ سناٹے تھے' بجلیاں تھیں کہ دھماکے۔ جیسے میرے وجود کے ٹکڑے بکھیر رہے تھے۔ بے پناہ طوفان تھا' آوازوں کا' ایک شور تھا جو تباہی پھیلا رہا تھا۔ میں پاگلوں کی طرح

اچھل رہا تھا۔ کبھی فون کی طرف...... کبھی سیڑھیوں کی طرف اور پھر......... میں ایک دم دروازے کی طرف بھاگا اور میں نے دروازہ کھول دیا۔

سامنے طیب کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ شاید اندر سے چیخوں کی آواز باہر جا رہی تھی۔ دروازہ کھلتے ہی وہ بھی چیخ پکار سن کر پاگلوں کی طرح ناچ گیا۔ "کیا......... کیا ہو رہا ہے یہ......... ضیاء......... تم ٹھیک ہو۔"

اس نے مجھے ایسے ٹٹولا جیسے میرے ٹکڑے بکھرنے کی اطلاع سن رہا ہو۔

"طیب........." میں بے بس بے ساختہ چیخا اور پھر ٹیلیفون کی طرف لپکا۔ زہرہ آپا اب چیخ چیخ کر رو رہی تھیں۔ ان کے پیچھے اور آوازیں بھی تھیں۔ "زہرہ آپا! کیا بات ہے؟" میں چیخا۔ میری نگاہیں اوپر کی طرف تھیں۔ ایلیا اب بھی ذبح کیے ہوئے بکرے کی طرح چیخ رہی تھی۔ طیب آدھی سے زیادہ سیڑھیاں چڑھ کر' خوفزدہ ہو کر دوبارہ اتر آیا تھا۔ شاید اس کی اوپر جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ ابھی تک اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔

"ضیاء! تم ٹھیک ہو نا؟" زہرہ آپا نے بڑی مشکل سے خود پر قابو پا کر کہا۔

"میں ٹھیک ہوں۔ آپ کو کیا ہوا ہے؟" میں نے بات کے دوران میں ہی اس طرف جھانکنے کی کوشش کی جہاں سے ایلیا نیچے کی طرف جھکی تھی۔ وہ یہاں سے دکھائی نہیں دے رہی تھی مگر یوں لگتا تھا جیسے وہ لکڑی کے فرش پر گری ہو اور اب گھسٹ رہی ہو۔ اس کے حلق سے نکلنے والی آواز غرغراہٹ میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔

"مجھے......... تمہاری فکر تھی......... یہ کیا ہو رہا ہے۔ طیب کوئی فون سن کر تمہاری طرف بھاگا ہے۔ طیب کہاں ہے؟"

"وہ پہنچ گیا ہے۔ ٹھیک ہے۔ میں آپ کو کچھ دیر میں فون کرتا ہوں۔" میں سخت پریشان ہو گیا کہ کس طرح ان کی تسلی کراؤں۔

"ضیاء......... یہ کون......... کون ہے......... کون چیخ رہا ہے۔ وہاں کیا ہو رہا ہے؟" وہ اب بھی روہانسی ہو کر پوچھ رہی تھیں۔

"آپا! ایلیا کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ پلیز' آپ خود کو سنبھالیں۔ ہم دونوں بالکل ٹھیک ہیں۔ میں فون کرتا ہوں۔ پلیز........."

"ٹھیک ہے! اپنا خیال رکھنا ضیاء........."

ممکن ہے' وہ آگے بھی کچھ کہنا چاہتی ہوں مگر میں نے فون بند کر دیا۔ میں اتنا تو جان چکا تھا کہ وہ ٹھیک ہیں۔ وہاں سب خیریت ہے۔ ریسیور کریڈل پر ڈالتے ہی میں اوپر لپکا۔ طیب خوفزدہ کھڑا اوپر دیکھ رہا تھا۔ ایلیا کی چیخوں کا طوفان ابھی تک نہیں تھما تھا۔ ایسی خوفناک چیخیں تھیں کہ میرا روم روم لرز رہا تھا۔ طیب سفید ہو چکا تھا۔ میرے پیچھے وہ بھی اوپر لپکا.......... مگر سیڑھیوں کے آگے آنے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ میں چھلانگیں لگاتا ہوا اوپر پہنچ کر ایلیا والے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اچانک طیب نے پیچھے سے میرا بازو پکڑ کر کھینچ لیا۔

"ضیاء! وہاں خطرہ ہے.......... اسے کیا ہوا ہے..........؟ اندر مت جاؤ۔" اس کے جملے بے ترتیب' اور لہجہ بے معنی تھا۔

"طیب! اسے بچانا ہے۔" میں نے جھٹکے سے بازو چھڑایا۔ طیب میرے پیچھے اوپر آگیا۔ میری وجہ سے غالباً اسے ڈھارس ہوئی تھی۔ ہم جونہی ایلیا والے کمرے کے دروازے پر پہنچے' بے ساختہ ہم دونوں کے حلق سے چیخ نکلی اور مجھے تو یوں لگا جیسے میرا کلیجہ منہ کے راستے باہر آجائے گا۔ طیب کو تو سکتہ ہو گیا۔ اس نے یہ منظر پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑے' سفید چہرہ لئے ساکت کھڑا تھا پھر جیسے اسے جھرجھری سی آئی اور "غوں.......... غوں.........." کرتا ہوا بھاگتا چلا گیا۔ اس نے سیڑھیاں بھی بھاگتے ہوئے عبور کیں۔ میں ایک لمحے کے لئے ایلیا سے نگاہ چراتے ہوئے خود پر قابو پا رہا تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ایلیا کے بدن پر جیسے سونا چڑھا ہوا تھا.......... نہیں.......... سونے کا پانی تھا جو ہلکورے سے لے رہا تھا۔ لاکھوں' بلکہ لاتعداد سنہری مکڑیاں تھیں جو اس کے بدن کو چاٹ رہی تھیں۔ اس کا بدن جگہ جگہ سے ادھڑا ہوا تھا۔ مجھے اس کی حالت دیکھ شدید حیرت اور خوف محسوس ہوا۔ اتنی چھوٹی چھوٹی مکڑیاں گوشت کے اتنے بڑے بڑے ٹکڑے کیسے اتار سکتی تھیں' جتنے بڑے بڑے ٹکڑے اس کے بدن سے الگ ہو کر بکھرے ہوئے تھے۔ ایلیا کی ہذیانی چیخیں اب صرف غرغراہٹ میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ اس کی ایک آنکھ مجھ پر جمی تھی جب کہ دوسری آنکھ کی جگہ مکڑیاں بھری ہوئی تھیں۔ پھر میں نے اس کی آخری ہچکی.......... سسکی یا کراہ.......... جو بھی سمجھ لیں' سن لی۔ وہ عجیب سی آواز تھی جس نے بدن میں اٹھنے والی خوف کی لہروں میں یخ بستگی بھی بھر دی تھی۔ اب ایلیا کی مدد کرنا بے کار تھا۔ اور میں نہیں جانتا تھا کہ میں ان مکڑیوں سے اس کی لاش

کو کیسے بچا سکتا ہوں۔ میں الٹے قدموں نیچے چلا آیا۔ مجھے طیب کی فکر تھی۔ خود بھی مجھے خوف محسوس ہو رہا تھا جس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ پتھر اب میرے پاس نہیں تھا۔ پھر اچانک مجھے خیال آیا کہ مجھے ان مکڑیوں سے ہمیشہ اس پتھر نے تو نہیں بچایا.......... میں نے ایک بار نہیں' ہزار بار ان مکڑیوں کو دیکھا ہے۔ مبشر کی ادھڑی ہوئی لاش سے چمٹی مکڑیاں تو میں نے بہت قریب سے دیکھیں تھیں۔ انہوں نے کبھی مجھے نقصان نہیں پہنچایا تھا۔

میں تو صندوقچی میں مکڑی کو کتنے ہی دن تک قید رکھ چکا ہوں۔ تب بھی مجھے کچھ نہیں ہوا تھا۔ پتھر تو مجھے شالی بابا نے بہت بعد میں' کچھ ہی عرصہ پہلے دیا تھا۔ مبشر کی موت سے ایک ہی دن پہلے.......... تب میں نے اسے بازو سے باندھا نہیں تھا۔

میں نیچے آیا تو طیب بہت نڈھال تھا۔ وہ باتھ روم سے نکلا تھا۔ بدن پر پسینے کی وجہ سے کپڑے تر ہو چکے تھے۔ اس نے چہرے پر جو چھپاکے مارے تھے' ان سے بھی قمیض گیلی ہو چکی تھی۔ آنکھوں میں وحشت ناک سرخی تھی' چہرہ اب بھی سفید تھا۔

"طیب! تم ٹھیک ہو؟" میں اس کے قریب چلا آیا۔

اس نے سر اٹھا کر اوپر کی کھڑکی کی جانب دیکھا۔ میں نے غور کیا' اب سرسراہٹ کی آواز تھی نہ غرغراہٹ کی۔ اوپر گہری خاموشی پھیل چکی تھی۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ باہر کا دروازہ جو میں نے طیب کے لئے کھولا تھا' اب بھی کچھ کھلا ہوا تھا۔ نیچے بھی ہمارے سانسوں کی مدھم آواز کے سوا کوئی دوسری آواز نہیں تھی۔ میں نے پھر طیب کی طرف دیکھا' وہ بازو کی پشت سے منہ صاف کر رہا تھا۔ اس کی نگاہیں اب بھی اوپر اٹھی ہوئی تھیں۔

"وہ.......... ایلیا..........!!" اس کے منہ سے کرب انگیز سسکاری نکلی۔

"مر چکی ہے۔" میں نے ٹھنڈے لہجے میں جواب دیا۔

"اوہ.......... وہ تو.......... مکڑیاں.........."

"طیب!" میں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "ابا کی موت مختلف تھی مگر باقی سب کی اموات ایسے ہی ہوئی ہیں۔ تحسین خالہ' چچا صاحب' مبشر.......... اور وہ منشی کی بیٹیاں.......... سب اسی طرح مری ہیں۔ میں نے ایسی زیادہ تر اموات دیکھی ہیں۔ پہلی مرتبہ بڑی بوا سے چمٹی مکڑیوں نے میرا بھی یہی حشر کیا تھا مگر اب.......... اب میں ان سے اتنا خوف زدہ نہیں ہوا۔ تمہیں بھی خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ مکڑیاں نہ

تمہیں کچھ کہیں گی نہ مجھے............"

"کیوں.........یہ یقین تمہیں کیوں؟" وہ اب کچھ سنبھل رہا تھا۔

"میرے اس یقین کی وجہ اتنے بہت سے گزرے ہوئے برس اور ان پراسرار حالات میں بھی میرے گرد بنا ایک ان دیکھا حصار ہے' میں نہیں جانتا کہ کیوں؟ لیکن میں ایسا جاننا ضرور چاہتا ہوں اور یہ سب جان کر رہوں گا' تبھی تو اتنے قیمتی لمحات ضائع کر رہا ہوں۔ لیکن یہ یقین کہ یہ مکڑیاں تمہیں بھی کچھ نہیں کہیں گی' اس کی وجہ وہ پتھر ہے جو میں نے تمہیں دیا اور تم سے استدعا کروں گا کہ کسی بھی حال میں تم اسے خود سے الگ نہ کرنا۔ ایک بات تو طے ہے کہ تم بھی اب ان حالات کی لپیٹ میں ہو۔ خود کو سنبھالو' مردانگی سے حالات کا مقابلہ کرو اور خیالوں کی فضاؤں میں اڑنے کی بجائے زمین پر قدم جما کر چلنا اور جینا سیکھو۔"

"ضیاء! اب کیا ہوگا؟"

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔" میں نے تسلی دی۔

اچانک یوں لگا جیسے میری باتیں سنتے سنتے وہ کہیں بھٹک گیا ہو۔ اس کی آنکھوں کا خالی پن' ویرانی کا احساس بڑھا گیا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔" میں نے تسلی دی۔

"ضیاء! اس نے اینا کو میرے ہاتھوں مروا دیا اور ایلیا......... خود اس کا شکار ہو گئی۔ کیوں.........؟ ان دونوں کا کیا قصور تھا؟"

"ہاں......... یہی غصہ مجھے ہے۔ زیوسا کون ہے؟ میں نہیں جانتا' اس کا ان واقعات سے کیا تعلق ہے! میں اتنا جان گیا ہوں' رابرٹ کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ زیوسا ایک اہم چیز ہے۔ ایلن سے اس کو نسبت تھی سو وہ ایلن کے حق میں ہمارا پیچھا کر رہی ہے مگر وہ کیا چاہتی ہے' ان لوگوں کا شکار کیوں کر رہی ہے جن کا ان واقعات سے قطعی براہ راست تعلق ہے نہ کسی اور اعتبار سے......... شاید وہ ہمارے اردگرد اچھل مچا کر مجھے خوفزدہ کرنا چاہتی ہے مگر اس کا کیا مقصد ہے' جب کہ وہ یقیناً جان چکی ہو گی کہ زنجیریں میرے پاس ہیں اور میں چٹانوں کا سا حوصلہ رکھتا ہوں۔ اسے چاہیے تو یہی کہ وہ مجھ سے بات کرے مگر......... بہرحال......... اب تمہیں مکمل طور پر میرا ساتھ دینا چاہیے۔ اس نے ایلیا اور اینا کو ختم کر کے یقیناً اپنے لئے راستے صاف کئے ہیں۔"

"ضیاء! یہ ہم دونوں کو قتل کے کیس میں پھنسانے کی کوشش بھی تو ہو سکتی ہے۔" طیب نے بڑے پتے کی بات کی تھی۔ سو فیصد یہی مقصد ہو گا۔ یا پھر وہ ہمیں اس طرح بلیک میل کرنا چاہتی ہے۔ اس لاش کو ٹھکانے لگاؤ ضیاء......... ورنہ........."

"تم یہ بتاؤ کہ ایلیا سے اس کا کوئی رشتے دار ملنے آیا تھا؟"

"ہاں' اس کی بہن اور ایک اینا کا انکل تھا جو کبھی یہاں آ کر شراب پیا کرتا تھا اور ایلیا کے ماضی کے زخم کریدا کرتا تھا۔ ایلیا اس سے بہت خوش ہوتی تھی۔ اکثر اسے بلایا کرتی تھی۔ بہن کم آتی تھی کیونکہ ایک تو وہ بوڑھی ہے پھر اسے گنٹھیا کا مرض بھی ہے۔ اس کے لئے آنا کافی دشوار ہوتا ہے۔"

"نہیں......... ہاں......... ٹھہرو......... وہ کسی وتسلا کمیکر نامی عورت کا ذکر کیا کرتی تھی۔ غالباً وہ اس کی دوست تھی۔ شاید گوا میں رہتی تھی۔ وہ اکثر کہا کرتی تھی کہ وہ گوا اس کے پاس جانا چاہتی ہے مگر اپنی بیٹی اینا کی وجہ سے یہاں رہنے پر مجبور تھی۔"

وتسلا کمیکر کا نام سن کر میرے کان کھڑے ہو گئے۔ یہ نام میرے لئے نیا نہیں تھا۔ رابرٹ نے اس عورت کا ذکر کیا تھا۔ گویا کڑی مل چکی تھی' وتسلا اور ایلیا ایک دوسرے سے واقف تھیں مگر اس واقعے کا اس واقفیت سے کیا تعلق تھا؟ یہ میں جانتا تو نہیں تھا مگر اب معلوم کرنا آسان ضرور ہو گیا تھا۔ دوسری بات یہ کہ یہ اطمینان بھی ہو گیا کہ میں ایلیا کے ملنے والے سے کہہ سکتا تھا کہ وہ گوا گئی ہوئی ہے وتسلا کے پاس۔

"ٹھیک ہے۔ اب تم بتاؤ تمہاری کیا کیفیت ہے؟" میں نے طیب سے پوچھا۔

"اب بہتر ہوں۔" وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔

"کیا اتنی ہمت ہے کہ ایلیا کی لاش کو ٹھکانے لگانے کے لئے میری مدد کر سکو؟"

"کیا کرو گے اس کا؟" اس کے چہرے پر سایہ سا آ کر گزر گیا۔

"کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑے گا۔ چلو اٹھو' مجھے کوٹھی کا پچھلا حصہ دکھاؤ۔ بہتر تو یہی ہے کہ ہم اسے یہیں کہیں دفن کر دیں۔ باہر لے جانا ہمارے لئے ہزاروں دشواریاں پیدا کر دے گا۔"

"تم......... اسے یہیں دفنا دو گے اور خود......... کیسے رہو گے؟"

"میں قبرستان میں بھی رہ سکتا ہوں۔ میری فکر نہ کرو۔"

"ضیاء! میرا خیال ہے کہ تم واپس گھر چلے چلو۔"

گھر کا نام سن کر میں اچھل پڑا۔ مجھے یاد آگیا کہ زہرہ آپا میری طرف سے فکر مند تھیں اور کہہ رہی تھیں کہ طیب کسی کا فون سن کر میرے پاس آیا ہے۔ میں اب تک اس سے یہ نہیں پوچھ سکا تھا کہ وہ اتنی رات گئے کیوں اور کیسے آیا ہے۔ "طیب! تم یہاں کیوں آئے تھے؟"

اور میں نے دیکھا کہ وہ خود بھی چونک اٹھا۔ شاید وہ خود بھی بھول چکا تھا۔ یہاں کے طوفان نے اسے سب کچھ بھلا دیا تھا۔ "وہ......... ہاں ضیاء......... میں تو بالکل بھول گیا۔ میں یہاں سے جا کر بہت بے چین تھا۔ سونا چاہتا تھا مگر اینا کی لاش اور ایلیا کا بنگلہ یاد آجاتا تھا۔ نیند نہیں آرہی تھی۔ پتا نہیں کیا وقت ہو چکا تھا۔ میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ میں بستر پر دراز کروٹیں بدل رہا تھا۔ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اتنی رات گئے کبھی ہمیں کسی نے فون نہیں کیا۔ گھر کے تمام لوگ گہری نیند میں تھے۔ اچھا ہوا کہ میں جاگ رہا تھا۔ میں نے پہلی بیل پر ہی فون اٹھا لیا۔ دوسری طرف وہی منحوس عورت تھی۔ کہنے لگی۔ "تم یہاں آرام سے لیٹے ہو۔ ضیاء کی خبر لو۔" اتنا کہہ کر اس نے فون رکھ دیا۔ میں پاگل ہو گیا۔ ہیلو ہیلو کر کے چیخنے لگا' یہ خیال بھی نہ آیا کہ میری آواز سے گھر کے لوگ اٹھ جائیں گے۔ اس نے فون بند کر دیا تھا۔ اچانک میں اٹھا اور نیچے بھاگ۔ میں نے گاڑی کی چابی لی اور دروازہ کھول رہا تھا کہ زہرہ چچی گھبرائی ہوئی میری طرف لپکیں۔ شاید انہوں نے فون سن لیا تھا۔ وہ تمہارے بارے میں استفسار کر رہی تھیں۔ میں نے کہہ دیا کہ میں تمہارے پاس جا رہا ہوں۔ فون کے بارے میں بھی میں نے انہیں بتا دیا پھر وہ چیختی رہ گئیں اور میں نکل آیا۔

"ہوں.........!" میں نے گہرا سانس لیا۔ "میں سمجھ گیا کہ اس نے تمہیں کیوں بھیجا ہے۔"

"کیوں.........؟" وہ بے چینی سے پہلو بدل کر بولا۔

"تمہیں خوف زدہ کرنا مطلوب تھا۔ بہرحال' تمہاری آمد نے مجھے حوصلہ ہوا ہے۔ آؤ اٹھو.........! وقت ضائع کرنا خطرناک ہے۔ ہم اس کی اگلی چال سے واقف نہیں ہیں۔"

میں کھڑا ہو گیا۔ ابھی صبح نہیں ہوئی تھی لیکن میرا اندازہ تھا کہ اب کچھ ہی دیر میں سورج کی کرنیں سارا اندھیرا نگل لیں گی۔ طیب واقعی خود کو کافی حد تک سنبھال چکا تھا۔

ہم دونوں باہر آگئے۔ باہر بھی گہرا سناٹا تھا جس میں بولتے بولتے اچانک دم سادھ لینے والے جھینگر اس سناٹے کو توڑ اور جوڑ رہے تھے۔ میں نے دیوار کے ساتھ رکھے درازوں والے لمبے ریک کی ایک دراز سے ٹارچ نکال لی۔ یہ میں اس وقت دیکھ چکا تھا جب ایلیا آرام کر رہی تھی اور میں نے گھر کا جائزہ لیا تھا تاکہ ہر چیز دیکھ سکوں اور کسی چیز کے لئے ایلیا کو زحمت نہ دینا پڑے۔

ہم دائیں جانب کی طرف سے ہوتے ہوئے اس طرف آگئے جہاں اینا کا کمرا تھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ لائٹ آن تھی۔ اندر اینا کا سامان رکھا ہوا تھا۔ ایک بیگ تھا اور چند جوڑے ہینگر میں لگے دیوار پر لٹکے ہوئے تھے۔ میں پہلے اندر چلا گیا۔ طیب میرے ساتھ تھا۔ اندر جا کر میں نے اس کا سامان سمیٹا۔ کپڑے بیگ میں ٹھونسے اور بیگ کو بیڈ کے نیچے گھسا دیا پھر میں باہر چلا گیا۔ طیب ٹارچ لئے آگے بڑھ رہا تھا۔ یہاں اندھیرا تھا اور جب میں نے اینا کے کمرے کی لائٹ بند کر کے دروازہ بھیڑ دیا تو یہ اندھیرا اور گہرا ہو گیا۔ اب ہم ٹارچ کے روشن دائرے کے تعاقب میں تھے۔ یہ حصہ جھاڑ جھنکاڑ سے بھرا ہوا تھا۔ دور تک پھیلے اس کچے حصے کی صفائی یوں بھی اس بوڑھی اور موٹی ایلیا کے بس کی بات نہیں تھی۔ پچھلا حصہ آگے کے حصے سے کافی بڑا تھا۔ اتنا بڑا کہ اس کے اندر ایک اور کوٹھی تعمیر ہو سکتی تھی۔

"یہ جگہ ایک لاش نہیں بلکہ کئی لاشیں دبانے کے لئے بھی انتہائی موضوع ہے۔" بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

"ہاں.........! لگتا ہے' جیسے قبرستان ہو۔" طیب نے جھری جھری لے کر کہا۔

یہاں جھینگروں کی آواز تیز ہو گئی تھی جو کبھی کبھی ہمارے قدموں کی آہٹ پر اچانک ڈوب جاتی تھی۔ طیب ٹارچ سے زمین کو روشن کر رہا تھا۔ ہمیں بہت سنبھل کر چلنا پڑ رہا تھا۔ یہاں جگہ جگہ کیکٹس لگے تھے۔ کانٹے دار جھاڑیاں بھی بکثرت موجود تھیں۔ میں ایک جگہ رک گیا۔ میں نے ٹارچ سے دور تک کا جائزہ لیا۔ احاطے کی دیوار کافی اونچی تھی۔ دائیں بائیں......... آگے پیچھے کوئی عمارت نہ تھی۔ یہ میرے حق میں بہتر تھا۔

"آؤ طیب!" میں واپس لوٹ گیا۔

"تم کیا کرنا چاہتے ہو ضیاء!؟"

"ایلیا کی لاش کو دفن کرنا ہے۔ ہمیں پھاوڑا' کدال' بیلچہ جیسی چیزوں کی ضرورت ہو گی۔ لان میں تازہ کھدائی سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمیں یہاں ان چیزوں میں سے کچھ نہ کچھ ضرور مل جائے گا۔ کہاں............؟ یہ دیکھنا ہے۔"

"میں جانتا ہوں تمہیں ایسی چیزیں کہاں ملیں گی۔"

"کہاں............کہاں............؟"

"بائیں طرف جو گیراج سا بنا ہوا ہے' اس طرف لکڑی کا ایک کیبن ہے۔ غالباً یہ کیبن چوکیدار کے لئے بنایا گیا ہو گا مگر ایلیا اسے اسٹور روم کی طرح استعمال کرتی تھی۔"

"مگر ضیاء! ایلیا کی لاش کو ہم وہاں تک کیسے لے کر جائیں گے؟"

"میرے بازوؤں میں بڑا دم ہے طیب............" میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"نہیں' میرا مطلب ہے کہ وہ مکڑیاں............ اور سنو............!" اچانک وہ خوفزدہ ہو کر رک گیا۔ میرا بازو پکڑ کر مجھے بھی روک لیا۔

"ہاں!"

"وہ مکڑیاں پورے گھر میں پھیل جائیں گی۔ پھیل گئی ہوں گی ضیاء!" اچانک وہ اپنے کپڑے جھاڑنے اور اندھیرے میں یوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے بدن کو دیکھنے لگا جیسے ان مکڑیوں کو تلاش کر رہا ہو۔

"کچھ نہیں ہے طیب۔" میں نے ایسا کہنے سے پہلے اپنی بینائی کی اس پُراسرار قوت سے کام لے کر اس کے اور اپنے بدن پر دیکھ لیا تھا۔

"مگر وہ گھر پر تو............"

"نہیں ہوں گی۔ اب ایلیا کی لاش کو بھی یوں ہی چھوڑ گئی ہوں گی۔ مت گھبراؤ۔"

اب ہم ڈرائنگ روم کے دروازے تک پہنچ گئے تھے۔ یہاں روشنی تھی۔ میرے اطمینان دلانے کے باوجود طیب نے سیڑھی پر قدم رکھنے سے پہلے سیڑھی کو غور سے دیکھا۔ اس کا ایک ہاتھ اب بھی اپنے بدن کو ٹٹول رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ کپڑے جھاڑنے لگتا تھا۔ کبھی گدی پر ہاتھ پھیرتا جیسے کسی رینگتی ہوئی چیز کو جھاڑ رہا ہو۔

"میں نے کہا ناں کہ اب کچھ نہیں ہے۔ اطمینان رکھو۔" میں اندر داخل ہوتے

ہوئے بولا۔ وہ پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا۔ جب اسے اطمینان ہو گیا' تب پُرسکون ہوا۔

"آؤ' اوپر چلتے ہیں۔ پہلے ایلیا کو دیکھ لیں پھر چیزیں تلاش کریں گے۔" میں نے ٹارچ رکھ کر سیڑھیوں کی طرف قدم بڑھایا۔

"نہ............ نہیں ضیاء............ یار............ میری ہمت نہیں ہو رہی۔" وہ جھجکا۔

"طیب! یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آئندہ پیش آنے والے حالات اس سے بھی زیادہ خوفناک ہوں۔ کیا تم عورتوں کی طرح خوف سے مر جانا چاہتے ہو؟"

"نہیں............ اس وقت ذرا............" وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"کچھ نہیں' چلو آؤ۔" میں نے ذرا سرد لہجے میں کہا۔ "بچوں کی طرح سہمے ہوئے ہو جب کہ جانتے ہو کہ نہ تمہیں کوئی گزند پہنچی ہے نہ مجھے۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اب میں آگے آگے تھا اور طیب میرے پیچھے۔ لکڑی کی سیڑھیاں بول اٹھیں۔ پل بھر کو اس آواز سے طیب ٹھٹکا پھر اوپر چڑھنے لگا۔ میں اپنی بینائی سے کام لے کر چپے چپے کا جائزہ لے رہا تھا۔ سب ٹھیک تھا۔ میں اپنے کمرے کے دروازے کے قریب سے گزرا تو میں نے احتیاطاً اپنے کمرے کے بند دروازے کو کھول کر اندر جھانکا۔

یہاں ہر طرح سکون تھا۔ میں پھر دروازہ بھیڑ کر آگے بڑھا۔ ایلیا کمرے کے بیچوں بیچ پڑی تھی۔ اس کے بدن کا آدھے سے زیادہ گوشت ادھڑ چکا تھا۔ کئی جگہ سے کھال پھٹی ہوئی تھی۔ گوشت کے ٹکڑے بھی لٹکے ہوئے تھے مگر حیرت انگیز بات تھی کہ اس کے بدن کا گوشت بالکل سفید تھا۔ خون کا ایک قطرہ تک نہ تھا۔ نہ فرش پر ہی پھیلا ہوا خون نظر آ رہا تھا جو میں اب سے پہلے دیکھ چکا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے پونچھا دے کر سب کچھ صاف کر دیا ہو۔ ایلیا کا چہرہ سلامت تھا۔ ایک بھی مکڑی اس کے بدن پر یا کمرے میں نہ تھی۔ سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا میں نے پہلے دیکھا تھا۔ جو چیزیں ایلیا کے تڑپنے اور اٹھنے بھاگنے کی وجہ سے بے ترتیب ہو گئی تھیں' وہ بھی جوں کی توں پڑی تھیں۔ میں نے بیڈ کی چادر گھسیٹ کر ایلیا کی لاش پر ڈال دی۔ پلٹ کر طیب کی طرف دیکھا تو وہ منہ پھیرے کھڑا تھا۔

"دیکھا تم نے............ ایک بھی مکڑی نہیں ہے۔ میں نے کہا تھا ناں؟"

"مگر ضیاء............! یہ کیسی مکڑیاں ہیں یار............! نہ کہیں پڑھا' نہ سنا' نہ

دیکھا..........'' وہ جھرجھری لے کر بولا۔

''اب تو دیکھ لیا نا۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے۔ مجھے یاد ہے' جب تم چچا صاحب کی موت پر آئے تو کس قدر بے چین تھے کہ کاش تم وہ تمام حالات دیکھ پاتے جس میں وہ مرے ہیں۔''

''ہاں.......... مگر.......... مجھے ان باتوں سے ویسی ہی دلچسپی تھی جیسے پُراسرار کہانیاں پڑھنے سے ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں ایسی خونخوار پُراسراریت کو افورڈ نہیں کر پا رہا۔''

''چلو! وہ چیزیں تلاش کرتے ہیں۔'' میں واپس پلٹا۔

اب وہ کافی حد تک خود پر قابو پا چکا تھا۔ ہم پھر ٹارچ لے کر باہر آگئے۔ بائیں جانب بھی کافی جھاڑیاں اُگ آئی تھیں۔ پتا نہیں لان ٹھیک کروانے کے بعد ایلیسا اس حصے کی طرف کیوں توجہ نہیں دیتی تھی۔ حالانکہ یہ صفائی وہ کسی مالی سے بھی کرا سکتی تھی' یقیناً" لان بھی خود اس نے ٹھیک نہ کیا ہو گا وہ کافی لیزی عورت تھی۔ تقریباً پچاس قدم کے فاصلے پر ٹین کا ایک چھپر ڈال کر گیراج بنا گیا تھا۔ اس گیراج کے ساتھ ہی لکڑی کا وہ کیبن تھا جو اس وقت بند تھا۔ یہاں باہر سے کنڈی لگی تھی مگر تالا نہیں تھا۔ میں نے باہر کوئی سوئچ تلاش کرنے کی کوشش کی۔ سوئچ تو مل گیا مگر سارے سوئچ آن کرنے کے باوجود اس حصے میں روشنی نہیں ہوئی۔ غالباً" بلب نہیں لگے تھے یا خراب تھے۔ میں نے کنڈی کھولی۔ اندر جھانکا۔ کاٹھ کباڑ بھرا ہوا تھا مگر بے ترتیب نہ تھا۔ اندر کی دیوار پر ایک سوئچ مل گیا۔ میں نے بٹن دبایا تو اسٹور روشن ہو گیا۔ میں نے ٹارچ بجھا دی۔ پھر ہم نے جلد ہی گھاس کی مشین کے سوا تینوں چیزیں اٹھالیں۔ ایک نظر پورے اسٹور پر ڈالی۔ یہاں کام کی بہت سی چیزیں موجود تھیں۔ گاڑی کی دو تین بیٹریاں بھی رکھی تھیں مگر اتنا وقت نہیں تھا کہ میں ہر چیز کا جائزہ لیتا۔

ہم اپنے مطلب کی چیزیں لئے پھر اسی پچھلے حصے کی طرف آگئے۔ میں نے زمین پر مستطیل نشان لگایا اور پھاوڑا طیب کے ہاتھ میں تھما کر کہا۔ ''دوسری طرف سے تم کھودنا شروع کر دو۔''

پھر ہم دونوں نے زمین کھودنا شروع کر دی۔ پتا نہیں ہم کتنی دیر تک کھودتے رہے۔ ہمارے بدن پسینے میں شرابور ہو گئے۔ سانس بری طرح پھول گئی مگر ہم رکے

نہیں۔ میں نے کدال اس وقت پھینکا جب اطمینان ہو گیا کہ اتنی گہرائی کافی ہے۔ طیب تو ہانپنے لگا تھا۔ اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ شاید اس نے پہلی بار اتنی جسمانی محنت کی تھی۔ اس کی قمیض اب پسینے سے بھیگ چکی تھی۔ میں اور وہ دو بڑے پتھر قریب کر کے وہیں بیٹھ گئے۔ میں سانس کے قابو میں آنے کا منتظر تھا۔ چند ہی لمحوں میں' میں نے خود پر قابو پالیا۔ طیب کی حالت کافی ابتر تھی پھر رفتہ رفتہ وہ بھی نارمل ہو گیا۔

''چلیں..........؟''

''ہاں!'' اس نے سر ہلایا اور پھاوڑا رکھ کر کھڑا ہو گیا۔

ہم دونوں پھر گھر کے اندر آگئے۔ ہم نے ایلیسا کی لاش کو اس پر پھیلی چادر ہی میں لپیٹا اور بڑی مشکلوں سے نیچے لائے۔ وہ مرنے کے بعد اور زیادہ بھاری ہو گئی تھی پھر عجیب بات یہ تھی کہ اس کی لاش میں سے ایک عجیب سی بدبو آرہی تھی جو ہم دونوں کو بے پناہ ناگوار گزر رہی تھی مگر اسے اٹھانا اور دفنانا ہمارے لئے بہت ضروری تھا اس لئے برداشت کر رہے تھے۔ طیب کو تو کئی بار ابکائیاں بھی آئیں مگر وہ جانتا تھا اسے اکیلے باہر لے جانا میرے بس کا کام نہیں ہے۔ اس لئے وہ میری مدد کر رہا تھا۔ ہمیں اس کی لاش کو باہر لے جانے اور اسے دفنانے میں تقریباً" گھنٹا بھر لگ گیا۔

ہم نے وہ گڑھا بھر کے اس پر کانٹے دار جھاڑیاں بھی ڈال دیں۔ طیب نے بتایا تھا کہ یہاں بھیڑیے بھی ہوتے ہیں۔ میں نے حفظِ ماتقدم کے طور پر بہت سی جھاڑیاں پھیلا دی تھیں ورنہ کوئی بھوکا بھیڑیا۔ ایلیسا کی موت کا راز فاش کر سکتا تھا۔

یہ سب کرتے کرتے ہم بری طرح نڈھال ہو گئے۔ گھر کے اندر داخل ہوئے۔ گھڑی پر نگاہ پڑی تو ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ دو ڈھائی گھنٹے میں اس عمارت کے اندر ایک قیامت آکر گزر چکی تھی اور سارا عالم گہری نیند میں تھا مگر نہیں.......... زہرہ آپا اب بھی ہماری طرف سے پریشان تھیں۔ اس کا احساس اچانک بج اٹھنے والے فون نے مجھے دلایا۔ پہلے تو ہم دونوں ہی بیل سن کر اچھل پڑے۔ پھر ریسیور اٹھاتے ہی میں زہرہ آپا کی آواز پہچان گیا۔ وہ اب بھی رو رہی تھیں۔ آواز بھاری ہو رہی تھی جیسے اس وقت سے اب تک روتی رہی ہوں۔ مجھے ندامت ہوئی۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ میں انہیں فون کرتا ہوں مگر..........

''ہیلو ضیاء.......... خدا کے واسطے.......... مجھے بتاؤ تم کیسے ہو؟ تم یہاں کیوں نہیں

آجاتے۔ طیب کہاں ہے۔ کیا ہوا تھا ضیاء!"

"پلیز زہرہ آپا!" میں نے بڑے پُر سکون اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ سب ٹھیک ہیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں اور طیب بھی ٹھیک ہے۔"

"مگر طیب کہہ رہا تھا کہ فون.........."

"وہ......... میرے ایک دوست نے شرارت کی تھی۔ بلاوجہ اسے پریشان کیا مگر سب ٹھیک ہے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں اور طیب بھی ٹھیک ہے۔"

"اور وہ شور......... وہ چیخیں کس کی تھیں.........؟" ان کی تسلی نہیں ہو رہی تھی۔

"اوہ! وہ........" میں زور سے ہنسا۔ "وہ ایلیا سیڑھیوں سے گر گئی تھی۔ عین اسی وقت جب آپ نے فون کیا تھا۔ دراصل میں سو رہا تھا۔ وہ بیل کی آواز سن کر جلدی سے نیچے آکر فون اٹھانا چاہتی تھی کہ میری نیند خراب نہ ہو۔ مگر اسی عجلت کی وجہ سے اس کا پیر پھسل گیا۔ دوسری طرف کال بیل بھی بجنے لگی تھی۔ طیب آگیا تھا۔ میں سخت بوکھلا گیا تھا۔ ایک طرف آپ چیخ رہی تھیں، دوسری طرف ایلیا اور یہ......... طیب مسلسل بیل بجا رہا تھا۔ بس اتنی سی بات تھی۔"

"ضیاء.........! تم جھوٹ تو نہیں بول رہے ناں!" وہ مشکوک تھیں۔

"نہیں بھئی.........! جھوٹ کیوں بولوں گا۔" میں نے طیب کو اشارہ کیا اور زہرہ آپا سے کہا۔ "یہ طیب سے بھی بات کر لیں تاکہ آپ کو اطمینان ہو جائے۔" میں نے ریسیور طیب کے حوالے کر دیا۔ خود صوفے پر ڈھے گیا۔

طیب نے زہرہ آپا کو اطمینان دلایا تب وہ کچھ نارمل ہوئیں۔ غالباً وہ طیب سے اصرار کر رہی تھیں کہ وہ مجھے لے کر گھر پہنچے۔ طیب نے کہہ دیا کہ مجھے آفس کا کافی کام ہے جو میں وہاں نہیں کر سکوں گا اور طیب بھی اب میرے ساتھ رہے گا۔ یہ بھی کہ اب انہیں بالکل مطمئن ہو جانا چاہیے۔ ریسیور رکھ کر طیب بھی پاس آبیٹھا۔

"اب......... اب کیا ہو گا؟" وہ بولا۔

"کس بارے میں؟" میں نے وہاں ٹیبل پر پڑا سگریٹ کیس اٹھا کر سگریٹ سلگاتے ہوئے پوچھا۔

"ایلیا اور اینا کے بارے میں......... میرا مطلب ہے کہ اگر اس کی بہن اینا کا

انکل آیا تو.........؟"

"ہاں! ہم کہہ دیں گے کہ ایلیا، اینا کو لے کر گوا گئی ہے۔ وتسلا کمیشکر کے گھر۔" پھر میں چونک اٹھا۔ "طیب! مگر ایلیا کی بہن اور اینا کا انکل اینا کی تدفین پر کیوں نہیں آئے؟"

"پتا نہیں......... ہاں واقعی......... ایلیا نے کوشش بھی نہیں کی انہیں اطلاع کراتی......... شاید انہیں فون کیا ہو اور وہ نہ ملے ہوں۔ پتا نہیں ضیاء......... اور یہ اچھا ہی ہوا ناں! ورنہ اگر........."

"ہاں! اچھا ہی ہوا مگر کیا اس کی بہن کا وتسلا سے رابطہ نہیں ہوا ہو گا؟ یا ممکن ہے بعد میں ہو جائے تب اسے پتا چل جائے گا کہ ہم نے ان سے جھوٹ بولا ہے۔"

"کہہ دینا کہ یہاں سے تو یہی کہہ کر گئی تھیں۔ میرا خیال ہے کہ ان دونوں کو ان دونوں سے اتنی دلچسپی نہیں تھی کہ وہ کھوج میں لگیں۔ اس کا انکل البتہ شراب کی بو سونگھتا ہوا آسکتا ہے۔ بہن شاید سال میں دو چکر لگا لے۔ پہلے چکر پر ہی جب اسے پتا چلے گا کہ وہ اب یہاں نہیں ہے تو شاید دوسرا چکر بھی نہ لگائے۔" طیب نے جگ سے گلاس میں پانی انڈیلتے ہوئے کہا اور ایک ہی گھونٹ میں گلاس خالی کر دیا۔

صبح کے آثار نمایاں ہو رہے تھے اور مجھ پر ہی نہیں، طیب پر بھی نیند غالب آتی جا رہی تھی۔ "چلو کچھ دیر کو سو لیتے ہیں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"یار یہ عجیب کوٹھی ہے۔ اتنی بڑی ہے مگر اس میں کمرے کم ہیں۔" طیب نے چاروں طرف دیکھا۔

"ہاں.........! یہ بات مجھے بھی عجیب لگتی ہے۔ ویسے سنو!" میں ٹھٹک گیا۔ "جب ہم پچھلی طرف گئے تھے تو اندرونی عمارت کافی بڑی محسوس ہوئی تھی۔ اس کا رقبہ اتنا نہیں تھا جتنا اندر سے نظر آ رہا ہے۔" طیب بھی میری بات سن کر چونک اٹھا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔

ڈرائنگ روم کے پچھلے حصے کی پوری دیوار بھاری پردوں میں چھپی ہوئی تھی۔ دروازے کے قریب دائیں جانب اوپر جاتی سیڑھیاں تھیں جب کہ ان سیڑھیوں سے کچھ فاصلے پر کچن تھا۔ کچن کافی بڑا تھا۔ چار کرسیاں اور چوکور میز کچن میں بھی تھا۔ فریج تھا جو کافی قدیم لگتا تھا۔ بائیں طرف ایک بڑا باتھ روم تھا مگر باہر سے لگتا تھا کہ نیچے کچھ اور بھی

ہے بلکہ اس حساب سے کہ اس رقبے کے اندر اوپر بھی کمرے بنائے گئے تھے لگتا تو یہ بھی تھا کہ اوپر بھی کچھ اور ہونا چاہئے۔ میں جائزہ لیتا ہوا اس پچھلی دیوار کی طرف بڑھا جو بھاری پردوں کے پیچھے تھی۔ میں نے ایک جانب لٹکی ڈوری کھینچی تو بہت اونچائی سے لٹکے بھاری پردے کا ایک حصہ ایک جانب ہٹ گیا۔

بجلی کا کوندا سا لپکا۔ یہاں بھی درمیان میں لکڑی کی دیوار تھی گویا اس ڈرائنگ روم کے پچھلے حصے کو اس حصے سے علیحدہ کرنے کے لئے دیوار لگائی گئی تھی۔ اس حصے میں مجھے بظاہر کوئی دروازہ نظر نہیں آیا۔ میں نے ہاتھ سے ٹٹولا۔ وہ صرف دیوار تھی۔ میں نے دوسرا پردہ بھی ہٹا دیا۔ میں اور طیب دونوں چونک اٹھے۔ یہاں لکڑی کا ایسا جوڑ تھا جیسے دروازہ ہوتا ہے مگر نہ تو ہینڈل تھا، نہ ناب اور نہ ہی کوئی لاک یا کنڈی۔ میں نے اس حصے کو دھکا دیا۔ لگا، جیسے وہ دروازہ ہی ہے مگر اندر سے لاک ہے۔ طیب بھی جلدی سے میرے قریب آ گیا۔

"یہ دروازہ ہی ہے۔" اس نے اوپر دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں! لگ تو رہا ہے مگر.........."

"ٹھہرو!" طیب نے کہا اور تیزی سے کچن میں چلا گیا۔ چند لمحوں بعد واپس لوٹا تو اس کے ہاتھ میں بڑی سی چمکدار چھری تھی۔ وہی چھری جسے میں اب سے پہلے کچن کی دراز میں دیکھ چکا تھا۔ جس کا ہتھا چاندی کا تھا اور جسے دیکھ کر مجھے اپنے بدن میں سنسناہٹ محسوس ہوئی تھی۔ اس کا چمکدار پھل مجھے دور سے ہی نظر آ گیا تھا۔ وہی سنسناہٹ محسوس ہوئی مگر میں نے نگاہ ہٹائی تو سب ٹھیک ہو گیا۔

"ہٹو!"

طیب نے مجھے پیچھے کیا مجھے طیب کو ایکٹو دیکھ کر خوشی ہوئی۔ وہ آگے بڑھا۔ اس نے دروازے یا لکڑی کے اس ٹکڑے کے روزن سے پھل ڈال کر زور لگایا۔ چوں کی آواز ہوئی اور پتلی سی جھری پیدا ہو گئی مگر جوں ہی طیب کی گرفت ڈھیلی ہوئی، دروازہ دوبارہ اپنی جگہ پہنچ گیا۔ اتنا ہوا کہ ہم جان گئے کہ یہ جگہ بند کی گئی ہے۔ مگر کیوں؟ یہ جاننے کے لئے مضطرب تھے۔

"ضیا! میں پھل اندر ڈال کر زور لگاؤں گا، تم جھری میں انگلیاں پھنسا کر اسے کھولنے کی کوشش کرنا۔" طیب نے کہا اور پھر پھل اندر گھسانے لگا۔

"چھوڑنا نہیں۔ انگلیاں کچل جائیں گی میری۔" میں نے دوسری طرف آتے ہوئے کہا۔

"لیکن دوسرے دن ٹھیک ہو جائیں گی۔ وہ تمہاری چھپتی سب ٹھیک کر دے گی۔ تم جانتے ہو پھر بھی ڈرتے ہو۔" طیب ہنسا۔

مجھے یاد آ گیا کہ میرے بازو کا زخم ایسے بھر گیا تھا جیسے کسی نے جادو کی چھڑی گھما دی ہو۔

"ہاں! یہ تو ہے۔ مگر یار ہے، جب زخم لگتا ہے، تکلیف تو ہوتی ہے ناں!؟" طیب نے پھر زور لگایا۔ میں نے انگلیاں پھنسا کر اپنی ساری طاقت صرف کر دی۔ اچانک بڑی زور کا کھٹکا ہوا۔ لگا جیسے اندر لگی کنڈی ٹوٹ گئی ہو۔ ایک جھٹکا لگا۔ طیب بھی جھٹکے سے پیچھے ہوا اور میں نے بھی بے ساختہ اپنی انگلیاں کھینچ لیں۔ واقعی دروازہ ڈھیلا ہو گیا مگر پورا پھر بھی نہیں کھلا۔ میں نے کھولنے کی کوشش کی مگر وہ جم کر رہ گیا۔ بہرحال اتنی جگہ بن گئی تھی کہ ایک آدمی آڑھا ہو کر اس سے گزر سکتا تھا۔ اندر گھپ اندھیرا تھا۔ کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں جلدی سے ٹارچ اٹھا لایا۔ میں نے وہیں سے ٹارچ گھمائی۔ یہاں وال ٹو وال کارپٹ تھا۔ گہرے سرخ رنگ کا کارپٹ اور ویلوٹ کے گہرے سرخ پردے پڑے تھے۔ سامان نام کی کوئی چیز دکھائی نہ دی۔ یہاں سے کمرے کا ایک حصہ ہی نظر آ رہا تھا۔ میں نے دوسرا حصہ دیکھنے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہا۔ پورے کمرے کا جائزہ لینے کے لئے اندر جانا ضروری تھا۔

"تم یہیں ٹھہرو۔ میں اندر جاتا ہوں۔" میں نے طیب سے کہا اور ٹارچ اس کے ہاتھ میں تھما کر فوراً اندر جانے کی کوشش کرنے لگا۔ میں آڑھا ہو گیا تھا۔ چند انچ اندر کی طرف سرکا بھی مگر مجھے اندازہ ہو گیا کہ میرا جسم کچھ فربہ ہے اور جگہ اتنی نہیں کہ میں اندر جا سکوں البتہ طیب اگر کوشش کرتا تو کامیاب ہو سکتا تھا مگر جب میں نے طیب سے کہا تو وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"نہیں یار.........! میں نہیں جاؤں گا۔"

"ارے.........! بہت بزدل ہو تم۔"

"ایسی پراسرار چیز کے سامنے ہر شخص بزدل ہوتا ہے۔" اس نے برا مانے بغیر اعتراف کر لیا۔

"کچھ نہیں ہے۔ جہاں تک نظر آ رہا ہے' وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔"

"پھر یہ بند کیوں تھا؟" اس نے استفسار کیا۔

"ممکن ہے' کافی عرصے سے بند رہنے کی وجہ سے دروازے اور دیوار کی لکڑی سیلن زدہ ہو کر پھیل گئی ہے اس لئے یہ اتنا سخت ہو رہا ہے۔" میں نے دروازے کو دھکیل کر مزید کھولنے کی کوشش کی مگر وہ اپنی جگہ اڑا رہا۔ "لیکن تم اندر تو جا کر دیکھو۔"

"نہیں یار ضیاء! مجھ میں اب ہمت نہیں ہے۔ ویسے بھی اب نیند اور تھکن سے بری حالت ہے۔ دن میں دیکھیں گے۔" وہ چاقو لئے پھر کچن میں چلا گیا۔ واپس آ کر صوفے پر ڈھیر ہونے لگا مگر میں نے لیٹنے نہیں دیا۔

"اوپر چلو! میرے ساتھ' میرے کمرے میں سونا۔"

"اس......... اس کمرے میں؟ جس میں ایلیا۔"

"نہیں! نہیں.........! وہ کمرا ایلیا نے لے لیا تھا۔ میں دوسرے کمرے میں شفٹ ہو گیا تھا۔ خوب صورت کمرا ہے۔ چلو۔"

اب طیب میں مزاحمت کی ہمت بھی نہیں تھی۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

میرے کمرے کی خوبصورتی بھی اسے متاثر نہ کر سکی' نیند کی وجہ سے اسے کچھ بھائی ہی نہیں دے رہا تھا۔ بیڈ دیکھ کر وہ اوندھا گرا اور پھر بے حس و حرکت ہو گیا۔ میں نے اس پر کمبل ڈال دیا اور خود اس کے پہلو میں لیٹ گیا۔ فوراً ہی میں بھی نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

☆-----------☆-----------☆

یہ بے پناہ تھکن کا نتیجہ تھا کہ ہم سوئے تو شام تک سوتے رہے۔ پہلے میری آنکھ کھلی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے مجھے اٹھایا گیا ہے۔ کوئی بات ہوئی ہے جس کی وجہ سے میری آنکھ کھلی ہے۔ میں چند لمحے تو بستر پر خالی الذہنی کی حالت میں پڑا رہا پھر میری نگاہ وال کلاک پر پڑی جو شام کے چھ بجا رہا تھا۔ میں چونک کر اٹھ بیٹھا۔ میں نے بستر سے اترے بغیر باہر والی کھڑکی کھولی۔ سورج کی کرنیں نرم ہو چکی تھیں۔ میں نے طیب کی طرف دیکھا' وہ اب بھی اسی پوزیشن میں بے سدھ پڑا تھا جس پوزیشن میں رات تھا۔ میں نے اسے ہلایا۔ کچھ دیر تک اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ جب میں نے کہا کہ شام ہو رہی ہے تو وہ اچھل کر اٹھ بیٹھا۔

"شام ہو رہی ہے؟" اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔

"ہاں!"

ابھی میں بستر سے اتر ہی رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ بیل کی آواز سن کر مجھے پہلا خیال یہی آیا کہ شاید اب سے پہلے بھی میری آنکھ فون کی بیل سے ہی کھلی تھی۔ میں نے ریسیور اٹھا لیا۔ "ہیلو!"

"ہیلو ضیاء!" دوسری طرف طاہر بھائی تھے۔

"جی طاہر بھائی آداب!"

"آداب.........! کیا ہوا بھئی! زہرہ کا فون آفس آیا تھا۔ وہ سخت پریشان ہے۔ کئی بار تمہیں فون کر چکی ہے۔ طیب بھی نہ گھر پہنچا' نہ آفس میں ہے۔" طاہر بھائی بہت گھبرائے ہوئے تھے۔

"نہیں طاہر بھائی! ایسی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ رات ایلیا کی طبیعت خراب ہو گئی تھی جس کی وجہ سے ہم رات گئے تک اسپتال میں رہے۔ پھر اس کے رشتے داروں

کو ڈھونڈا۔ اسے وہاں پہنچایا۔ اس میں صبح ہو گئی۔ صبح سوئے تو ہوش ہی نہیں رہا۔ ابھی ابھی آنکھ کھلی ہے۔" میں نے انہیں تسلی دی اور لمبا چوڑا جھوٹ بولا۔ "طیب میرے ساتھ ہی ہے۔"

"طیب نے ہمیشہ غیر ذمے داری کا ثبوت دیا ہے مگر......... تم تو بہن کا خیال کرتے۔ وہ ہلکان ہو چکی ہے اور رو رہی ہے کہ آپ پتا کریں۔ ڈھونڈیں۔ اسی نے فون نمبر دیا ہے اور کہا ہے کہ میں ڈائریکٹری سے ایڈریس نکال کر خود جا کر دیکھوں کہ کیا بات ہے۔"

"سوری طاہر بھائی! اصل میں یہاں سچویشن ایسی ہو گئی تھی کہ........."

"خیر.........! طیب کہاں ہے؟"

"باتھ روم گیا ہے۔" میں نے طیب کے اشارہ کرنے پر کہہ دیا تھا حالانکہ وہ اب بھی وہیں لیٹا تھا۔ "ہم ایک گھنٹے بعد گھر پہنچ رہے ہیں۔ میں زہرہ آپا کو فون کر دیتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے' فوراً فون کرو۔" اتنا کہہ کر طاہر بھائی نے فون بند کر دیا۔

"ابے یار.........! اب ہزاروں باتیں سننا پڑیں گی۔" طیب نے جھنجلا کر کہا۔

"ایک تو تمہاری بہن کو ہولانے کا بے حد شوق ہے۔ کوئی بات ہو' یہ ضرور ہولاتی ہیں اور ضروری نہیں کہ بات پریشانی کی ہو یا کوئی حادثہ ہو۔ تقاریب پر بھی ماشاء اللہ یہی حال ہوتا ہے۔ کھانا کم نہ پڑ جائے۔ کوئی ناراض نہ ہو جائے۔ کسی کی مرضی کے خلاف کچھ نہ ہو جائے۔" وہ اب اٹھ گیا تھا اور بستر سے پاؤں لٹکائے' میری جانب پشت کیے مسلسل بڑبڑا رہا تھا۔

"اچھا! اب اٹھ جاؤ اور دیر کرو گے تو جوتے بھی پڑیں گے۔ وہ کل سے میری منتظر ہیں۔"

"اف ضیاء.........!" اچانک وہ میری طرف مڑا۔ "کل کا دن اور گزشتہ رات کس قدر خوفناک گزری ہے۔"

"ہاں.........! مردوں کی زندگی میں ایسا اکثر ہوتا ہے۔" میں نے باتھ روم کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "بس اب حواس بحال کرو۔"

طیب نے کھڑے ہو کر زوردار انگڑائی لی اور باہر کی جانب کھلی کھڑکی میں کھڑے ہو کر' سینے پر دونوں ہاتھ باندھ کر لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ میں باتھ روم سے نکلا تو وہ ہلکی

پھلکی ورزش کر رہا تھا۔ میں اس کے قریب آ گیا۔ "جاؤ.........! منہ ہاتھ دھو لو۔ میں چائے بناتا ہوں۔"

"یار! کندھے شل ہو گئے پھاوڑا چلاتے چلاتے۔ یہ قبرستانوں کے گورکن بڑے مضبوط ہوتے ہوں گے۔" اس نے تولیہ اٹھا کر باتھ روم کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کپڑے تبدیل کیے۔ جوتے پہنے اور نیچے کچن میں آ گیا۔ فریج میں سے انڈے نکال کر ابالنے کو رکھے۔ چائے کا پانی رکھا اور باہر آ کر ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول دیا۔ مجھے ڈرائنگ روم میں وہی بدبو محسوس ہو رہی تھی جو رات ایلیا کی لاش میں سے آتی محسوس ہوئی تھی۔ سارے پردے بھی ہٹا کر کھڑکیاں کھول دیں۔ اترتی دھوپ کی کرنیں گو نرم ہو چکی تھیں مگر وہ کمرے میں پھیلیں تو خوشگواری کا احساس ہوا۔ طیب تیار ہو کر نیچے آیا تو میں چائے بنا چکا تھا۔ انڈے ابلے ہوئے تھے مگر طیب سیدھا کچن میں گھس گیا۔

"ان سے پیٹ بھرے گا؟" اس نے انڈوں کی طرف اشارہ کیا۔

کچھ دیر میں وہ کچن سے باہر آیا تو میں چائے پیالیوں میں نکال چکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ڈبل روٹی' مکھن' پنیر اور جام کی شیشی تھی۔ "یہ سب کھاؤ گے؟"

"ہاں! پیٹ کیسے بھرے گا؟" اس نے چیزیں ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

"ہوں.........! یعنی کچھ ہی دن میں تمہارا سینہ چالیس انچ اور پیٹ پینتالیس انچ ہو جائے گا۔"

"یار! پیٹ اور سینہ دونوں انسان کے لیے ضروری ہیں۔ بھلے ایک دوسرے کی جگہ پر ہی کیوں نہ ہوں۔"

اس نے سلائس پر مکھن لگاتے ہوئے کہا اور پھر آدھے گھنٹے تک مسلسل ناشتا کرتا رہا۔ میرا جی متلانے لگا۔ میں اس دوران میں دو کپ چائے پی چکا تھا۔ وہ انڈے کھا چکا تھا اور تین سگریٹ پھونک چکا تھا۔ حیرت کی بات ہے کہ طیب کو آپ موٹا نہیں کہہ سکتے تھے وہ بے حد اسمارٹ تھا۔ مجھ سے کم ہی ہو گا حالانکہ میری غذا بہت کم تھی۔ میں صحت کے معاملے میں کافی حساس تھا۔ آدھے گھنٹے کے بعد اس نے لمبی ڈکار لی۔ برتن کچن میں رکھے اور ہاتھ دھو کر آ گیا۔

"چلو!" اس نے تولیے سے منہ پونچھتے ہوئے کہا۔ "ایک مسئلہ ہو جائے گا تمہارے

لئے۔" اس نے میرے پیچھے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

"کیا؟"

"یہ اتنے برتن کون دھوئے گا؟ صفائی ستھرائی کون کرے گا؟" ایلیا لیزی سہی' کسی نہ کسی طرح کام تو نمٹا ہی لیا کرتی تھی۔"

"ہاں........ ان کاموں کی عادت نہیں ہے مجھے۔" میں نے کھڑکیاں بند کرتے ہوئے کہا۔ طیب بھی میری مدد کرنے لگا پھر میں نے پردے برابر کئے۔ ہر طرح کا اطمینان کرنے کے بعد میں اور طیب باہر آ گئے۔ "یار پیچھے ایک نظر مار لیں۔" میں نے گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے طیب کو روک کر کہا۔

"ہاں تم دیکھ لو۔ میں گاڑی اسٹارٹ کرتا ہوں۔ ایکسیڈنٹ کے بعد کچھ پرابلم ہو گیا ہے اس میں۔"

وہ گاڑی کی طرف بڑھا۔ میں پیچھے چل پڑا۔ میں نے دور ہی سے اس حصے کی طرف دیکھا جہاں رات ایلیا کو دفنایا تھا۔ سب ٹھیک تھا۔ جھاڑیاں اسی طرح رکھی تھیں جیسے رات میں نے رکھی تھیں۔ میں اطمینان کر کے لوٹ آیا۔ گاڑی اسٹارٹ ہو چکی تھی۔ ہم نے باہر نکل کر گیٹ بند کیا۔ یہاں ایک بڑا سا تالا پڑا تھا جس کی چابی ایلیا نے مجھے دے دی تھی۔ میں نے تالا لگایا اور ہم گھر کی طرف چل پڑے۔

☆----------☆----------☆

طاہر بھائی پہنچ چکے تھے کیوں کہ باہر پورچ میں ان کی گاڑی کھڑی تھی۔ زہرہ آپا اب بھی ہولائی ہوئی تھیں۔ ان کے چہرے پر نقاہت اور وحشت تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی یہ وحشت ختم ہو گئی مگر نقاہت طاری رہی۔ میں جانتا تھا کہ وہ اتنی ہی نازک مزاج ہیں جب کہ عصمت آپا ذرا سخت دل کی اور زیادہ قوت برداشت کی مالک تھیں۔ انہوں نے بہت سی شکایتیں کیں طاہر بھائی نے زور دیا کہ میں فوراً اپنا سامان لے کر یہاں چلا آؤں میں نے بہت مشکل سے انہیں قائل کیا کہ جہاں رہ رہا ہوں' وہ میرے آفس کے ہیڈ کوارٹر سے کافی قریب ہے اور وہاں مجھے بہت سی سہولتیں میسر ہیں۔ بڑے جان جوکھوں اور طیب سے تصدیق کروانے کے بعد ان لوگوں نے ہار مانی۔ زہرہ آپا نے کھانے کا انتظام کیا مگر ہم تو اس وقت ناشتا کر کے آ رہے تھے۔ رات کے کھانے کے لئے البتہ رک گئے۔ یہ ضروری تھا۔ اگر میں آج بھی نہ رکتا تو ان لوگوں کا اصرار جاری رہتا اور میں وقت ضائع کرتا۔

آج مجھے کوئی کام نہیں تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ رات کو رابرٹ سے فون پر بات کروں گا اور اس سے جینو کی خیریت دریافت کروں گا پھر اس کے پاس جانے کا پروگرام بناؤں گا۔ طیب آج آفس نہیں جا سکا تھا اس لئے کچھ لوگوں کو فون کرنے لگا۔ میں زہرہ آپا سے گھر کی خیریت پوچھتا رہا۔ انہی کی زبانی پتا چلا کہ اماں اور عصمت آپا ٹھیک ہیں۔ شجاع بھائی کا فون آیا تھا۔ دادا کی طبیعت بھی ٹھیک ہے اور انہوں نے مجھے پیغام بھیجا تھا کہ جس قدر جلد ہو سکے میں لوٹ آؤں۔ پھر میں یہ سن کر اچھل پڑا کہ شالی بابا دادا کے پاس پہنچے تھے اور میرے لئے انہوں نے بھی یہی پیغام دیا ہے کہ ان سے میرٹھ پہنچ کر ملوں۔

اب تو میری بے قراری عروج پر پہنچ گئی۔ ہر کام کرنے سے پہلے میرا شالی بابا سے ملنا ضروری ہو گیا۔ میں تو خود پریشان تھا کہ ان سے کیسے ملوں گا' میں نے زہرہ آپا سے کہہ دیا کہ ہو سکتا ہے' میں کل ہی دہلی چلا جاؤں۔ وہاں سے میرٹھ جاؤں گا۔ انہوں نے تاکید

کی کہ ان سے مل کر ہی جاؤں۔ وہ یہاں کے حکیم سے دادا کے لئے ضروری دوائیں لے کر بھجوانا چاہتی تھیں۔ میں نے وعدہ کر لیا۔ رات کے کھانے پر طیب نے بھی گھر میں بتا دیا کہ وہ جب تک میں یہاں ہوں' میرے ساتھ ہی رہے گا۔ زہرہ آپا کے سامنے اس نے دست بستہ اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ وہ ہولانا چھوڑیں یا نہ چھوڑیں مگر اسے ہولانے سے باز رہیں۔ پھر جب میں نے اسے بتایا کہ میں شاید دو چار روز کے لئے دہلی اور میرٹھ جاؤں تو شالی بابا کے ذکر پر اس نے بھی اعلان کر دیا کہ وہ اب میرے ساتھ ہی جائے گا' بلکہ اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ میں جنم جنم تک ضیاء کا ساتھ نبھاؤں گا۔

"کیوں بھائی! میں نے کیا قصور کیا ہے؟" میں نے ہنس کر کہا۔

"دل ہی تو ہے' گدھے پر آگیا۔" اس نے نوالہ چباتے ہوئے کہا۔

اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس وقت بھی وہ ایسے کھانا کھا رہا تھا جیسے یہ اسے کئی دن بعد نصیب ہوا ہو۔ بہرحال میں اس کے اندر ایک نئی امنگ' نیا حوصلہ اور واضح تبدیلی محسوس کر رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس نے ٹریک تبدیل کر لیا ہو۔ میرے حساب سے یہ ایک خوش آئند تبدیلی تھی۔ میں اس کے اس فیصلے پر خوش ہوا کہ وہ ان خوفناک حالات کے باوجود میرے ساتھ رہنے پر تیار ہے بلکہ میرے ساتھ سفر پر بھی آمادہ ہے۔

کھانے کے بعد ہم لوگ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ رات تقریباً دس بجے میں اٹھ کھڑا ہوا۔ زہرہ آپا نے حسب عادت اصرار کیا کہ کل صبح بھی آ جاؤں مگر میں نے آفس کے کام کا بہانہ کر کے معذرت کر لی لیکن جانے سے پہلے آنے کا وعدہ کر لیا۔ ہم اجازت لے کر وہاں سے نکل آئے۔

طیب نے ایک چھوٹا سا اٹیچی کیس ساتھ لے لیا تھا جس میں اس نے اپنی ضرورت کی چیزیں رکھ لی تھیں۔

ہم اس پُراسرار کوٹھی میں دس بج کر پینتیس منٹ پر داخل ہوئے۔ پوری کوٹھی گھپ اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ میں نے اترتے ہی سب سے پہلے باہر کا بلب جلایا۔ پھر دروازہ کھولا۔ ہاتھ بڑھا کر اندر بھی روشنی کر دی۔

"یار ضیاء! کیا یہاں بارش ہوئی ہے؟"

طیب نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے پلٹ کر اسے' پھر زمین کی طرف دیکھا۔ گیٹ سے دروازے تک آنے والی کچی روش بھیگی ہوئی تھی پھر میں نے لان پر نگاہ ڈالی۔ یہاں سے

وہاں تک پہنچنے والی روشنی میں اس کا جتنا حصہ بھی نظر آ رہا تھا' وہ گیلا تھا مگر جب ہم دونوں نے گیٹ کے باہر اور کوٹھی کی بائیں طرف نگاہ ڈالی تو سب خشک تھا۔

"میرا خیال ہے مالی نے چھڑکاؤ کیا ہے۔" میں یہ کہتا ہوا اندر بڑھنے لگا۔ مگر طیب نے میرا بازو پکڑ کر مجھے روک لیا۔

"کون سا مالی؟" اس نے پوچھا۔

"ہو سکتا ہے' اس نے کوئی مالی لگایا ہوا ہو۔ اتنے بڑے لان کی دیکھ بھال وہ خود تو نہیں کرتی ہو گی۔" میں نے جواب دیا۔

"لیکن مالی کہاں سے آیا۔ کوٹھی کے اندر تو کوئی نہیں ہے اور باہر گیٹ پر ہم تالا لگا کر گئے تھے۔"

اب میں چونک کر پلٹ گیا۔ چند لمحے میں نے طیب کی آنکھوں میں جھانکا اور سوچتا رہا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ باہر سے کسی کے آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ گیٹ بھی کافی اونچا تھا۔ اب میں نے جائزہ لینا شروع کیا۔ باہر کے جتنے بلب ٹھیک تھے سب روشن کر دیئے۔ ایک بلب لان کا بھی روشن ہو گیا۔ یہاں صرف لان اور سامنے کی روش کو پانی دیا گیا تھا۔ پائپ لان کے ایک کونے میں لگے نلکے پر فٹ تھا اور اب بڑے سلیقے سے گولائی میں لپٹا رکھا تھا۔ یہ سب دیکھ کر میرے دماغ میں سنسنی سی پھیل گئی۔

"آؤ.........! اندر کا حال دیکھیں۔" میں نے اندر جانے کے لئے پلٹتے ہوئے کہا۔

طیب بھی کافی حیران تھا مگر حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس وقت اس کے چہرے پر خوف نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ میں نے سنجیدگی سے سوچا کہ مجھے طیب کے بارے میں اپنی رائے شاید تبدیل کرنا پڑے مگر میں اس میں کچھ وقت اور لینا چاہتا تھا۔ جس کی امید اب بندھ گئی تھی۔ اب میں طیب کو قریب سے دیکھ کر جانچ سکتا تھا۔

ہم آگے پیچھے اندر داخل ہوئے۔ لائٹ جلائی' چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ سب ٹھیک تھا۔ ویسا ہی تھا جیسا چھوڑ کر گئے تھے۔ میں اب اوپر کی طرف چلا۔ طیب میرے پیچھے تھا۔ اپنے کمرے میں داخل ہوا تو لگا جیسے کچھ گڑبڑ ہے۔ چونکا۔ میں نے دیکھا کہ طیب کے چہرے پر بھی ہلکی سی الجھن ہے۔ میں نے پھر کمرے کا جائزہ لیا۔ اس بار جلد ہی خیال آ گیا کہ کیا گڑبڑ ہے۔ وہ کمبل پائنتی پر سلیقے سے تہہ کیا رکھا تھا جسے میں یونہی چھوڑ گیا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے یہ خیال بھی آیا کہ میں نیچے چلا گیا تھا طیب بعد میں آیا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ

سلیقہ مند آدمی ہو۔ اس نے تہہ کیا ہو پھر بھی میں نے اس سے پوچھا تو وہ اچھل پڑا۔

"ہاں.........! مجھے لگ رہا ہے کہ کچھ ہوا ہے۔ میں تو کمبل یونہی چھوڑ گیا تھا اور میرے کپڑے!" اتنا کہہ کر وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ "کہاں تھے؟" میں نے پوچھا۔

"یہاں.......... بستر پر ہی چھوڑ گیا تھا۔" وہ ڈھونڈتے ہوئے بولا پھر باتھ روم میں گیا۔ "مل گئے' یہاں لٹکے ہیں۔ مگر یار.........! کیسے؟" وہ سخت حیرت زدہ تھا۔

حیرت' مجھے بھی تھی۔ میری بھی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا مگر ذہن کچھ سوچنے سے بھی انکاری تھا۔ میں بستر کے کنارے بیٹھ گیا۔ طیب آ کر سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"ضیاء........! یہاں کوئی ہے۔" اس نے ایسے انداز میں سرگوشی کی جیسے کوئی بڑے پتے کی بات بتا رہا ہو۔

میں ہنس پڑا۔ "ظاہر ہے' مگر کوئی کون؟ یہ سوچنے کی بات ہے۔"

"اینا کی لاش ہم نے دیکھی اور لا کر دفنا دیا۔ ایلیا کا حشر بھی ہم یہی کر چکے ہیں۔ تیسرا یہاں کوئی تھا' نہ ہو سکتا ہے۔ اور وہ بھی ایسا جو یہیں رہتا اور کوٹھی کا خیال رکھتا ہو۔"

"اس چور حسینہ کو بھول گئے جس نے استقبال کیا اور کچن سے مشروب چرا کر ہمیں پلایا تھا؟"

"ارے ہاں.........! مگر وہ تھی کون اور کہاں گئی؟ تم نے ایلیا سے کچھ پوچھا تھا۔"

"ہاں! مگر اس نے صاف انکار کر دیا تھا کہ اس کی بیٹی کے سوا کوئی نہیں ہے۔ میں اسی کو ایلیا کی بیٹی سمجھتا رہا مگر وہ......... وہ نہیں تھی۔"

"میں چائے بناتا ہوں۔ تم سوچو۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

میں باتھ روم چلا گیا۔ نہا کر اور کپڑے تبدیل کر کے رابرٹ کو فون کرنے کا ارادہ تھا۔ ابھی میں نے اندر جا کر باتھ روم کا دروازہ بند بھی نہیں کیا تھا کہ طیب کے پکارنے کی آواز سن کر باہر آ گیا۔ وہ نیچے ہی سے مجھے آواز دے رہا تھا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے اوپر ہی سے جھانکا۔

"جلدی آؤ!" اس نے کہا اور کچن میں گھس گیا۔

میں تیزی سے نیچے اترا۔ کچن میں داخل ہوا تو سناٹے میں رہ گیا۔ پورا کچن چمک

رہا تھا۔ برتن دھلے ہوئے تھے۔ ہر چیز جو بے ترتیب پڑی تھی اب اپنی جگہ پر تھی۔ "یہ تم نے دھوئے ہیں؟" میں نے برتنوں کی طرف اشارہ کیا۔

"پاؤ لے ہوئے ہو کیا؟ میں دھوؤں گا؟ ضیاء! وہ یہیں کہیں ہے۔"

"کون؟" مجھے اب حیرت کے ساتھ' الجھن بھی ہو رہی تھی۔ تجسس اپنے پنجے گاڑ رہا تھا۔

"وہی جو ہماری خدمت پر مامور ہے۔ چلو! اس طرف سے تو اطمینان ہو گیا ورنہ میں سوچ رہا تھا کہ کام بانٹ لیں یا پھر کسی دل' گردے والی عورت کا بندوبست کرنا پڑے گا۔"

"یہ سب عجیب ہے۔ میں کسی مافوق الفطرت یا ماورائی ہستی کی موجودگی کے احساس کے ساتھ یہاں رہنے میں دشواری محسوس کروں گا۔ وہ جو بھی ہے' اسے سامنے آنا پڑے گا۔" میں نے ہونٹ دانتوں میں دباتے ہوئے کہا۔

"کاش! وہ چائے بھی بنا کر رکھتی۔ کتنی آسانی ہو جاتی۔" طیب نے یہ کہتے ہوئے چائے کا پانی رکھ دیا۔

"تمہیں کیسے پتا کہ وہ مونث ہے؟" میں نے مسکرا کر پوچھا۔

"ظاہر ہے' اتنا سلیقہ کسی مذکر میں تو ہو نہیں سکتا۔ خیر چائے پی کر اطمینان سے تلاش کریں گے اور ہاں.........! ابھی ہمیں وہ حصہ بھی دیکھنا ہے جو رات کھولا تھا۔"

اس کے یاد دلانے پر میں چونکا۔ میرے ذہن سے تو نکل ہی گیا تھا۔ میں تیزی سے اسی پچھلی دیوار کی طرف بڑھا۔ میں نے پردہ ہٹا کر دیکھا۔ دروازہ بند تھا اور بالکل اسی حالت میں تھا جیسا ہمارے کھولنے سے پہلے تھا۔ طیب بھی کچن کے دروازے سے ادھر ہی دیکھ رہا تھا۔

"اف.........! پھر اتنی ہی محنت کرنا پڑے گی۔ یار! حیرت ہے۔ دوسری طرف قبضے بھی تو نہیں ہیں کہ آدمی انہیں ہی کھول لے۔ کس طرح بنایا گیا ہے؟"

میں بھی سوچ میں پڑ گیا۔ بہرحال فی الوقت تو نہ ہمت تھی نہ طاقت۔ میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا تھا۔ پھر رابرٹ کو فون کرنا بھی ضروری تھا۔ جینو کی مجھے بھی فکر تھی حالانکہ میں نے جینو کو دیکھا نہیں تھا مگر سورن سنگھ اور رابرٹ نے اس کا جس انداز میں ذکر کیا تھا اور ان میں' میں نے جینو کے لئے جس جذبے کو محسوس کیا' وہ مجھے بھی پریشان

کئے ہوئے تھا۔

میں سوچ میں غرق تھا کہ طیب چائے لے آیا۔ چائے پینے سے پہلے ہی وہ کپڑے تبدیل کرنا چاہتا تھا۔ وہ اوپر چلا گیا۔ میں نے ٹیلیفون اٹھایا اور واپس صوفے پر آ بیٹھا۔ رابرٹ کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری جانب فوراً ہی فون اٹھا لیا گیا۔ "ہیلو مسٹر رابرٹ!" میں نے کہا۔

"اوہ یس.........! ہاؤ آر یو مسٹر ضیاء؟" وہ چہکا۔ مجھے لگا جیسے وہ خوش ہے۔

"آپ کیسے ہیں؟"

"فائن......... مسٹر ضیاء! جینو تم سے ملنا چاہتا ہے۔"

"میں نے اسی لئے فون کیا تھا۔ میں اس کے بارے میں خیریت جاننا چاہتا تھا۔"

"وہ کس حالت میں ہے' یہ تو اس نے مجھے نہیں بتایا۔ وہ بات کم کرتا ہے مسٹر ضیاء اور روتا زیادہ ہے مگر جب میں نے اسے بتایا کہ تم فرشتہ بن کر ہمارے پاس پہنچ گئے ہو تو اس نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں اسے بھی تم سے ملا دوں مگر ضیاء.........! حیرت کی بات ہے کہ اسے یہ نہیں معلوم کہ وہ خود کہاں ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں حیران ہو گیا۔

"میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کہاں رہا ہے۔ اپنا ایڈریس مجھے بتائے' میں تمہیں لے کر اس تک پہنچ جاؤں گا مگر وہ اور زور زور سے رونے لگا۔ اس نے کہا۔ میں نہیں جانتا کہ یہ کون سی جگہ ہے۔ میں ایک روز وہیں سویا تھا جہاں ہم سب ساتھ تھے مگر اگلے روز آنکھ کھلی تو لکڑی کے بنے کسی ایسے تہ خانے میں قید تھا جس میں نہ کوئی کھڑکی ہے' نہ دروازہ اور نہ ہی کوئی ایسا روزن جہاں سے باہر کچھ دکھائی دیتا ہو۔"

"کوئی روشن دان تو ہو گا مسٹر رابرٹ.........!"

"نہیں! کہتا ہے' ایک سوراخ بھی نہیں ہے۔ وہ پورے قید خانے کو دیکھ چکا ہے اور مسٹر ضیاء.........! ایک بری خبر یہ ہے کہ وہ چل نہیں سکتا۔ اس کی ٹانگیں بھی میری ہی طرح سکڑ کر مڑ گئی ہیں۔" رابرٹ کی آواز بھیگی ہوئی تھی۔

"اوہ......... رابرٹ! یہ پتا چلنا بہت ضروری ہے کہ وہ کہاں ہے؟ اور سنو! کیا تم مجھے اس کا فون نمبر دے سکتے ہو؟"

"ہاں.........!" اس نے جواب دیا۔ میں نے طیب سے اشارے سے کہا کہ وہ کاغذ

اور پین دے۔ یہ چیزیں فون والی ٹیبل پر رکھی تھیں۔ وہ اٹھا لایا۔ رابرٹ نے مجھے فون نمبر لکھوا دیا۔

"کیا تم اس سے بات کرو گے؟"

"ہاں' میں کوشش کروں گا کہ پتا چل سکے۔ مگر سنو رابرٹ! اگر اس جگہ کوئی روزن بھی نہیں ہے تو وہ زندہ کیسے ہے؟ یہ ممکن نہیں ہے اور کیا وہاں کھانے پینے کا بندوبست ہے؟"

"پتا نہیں مسٹر ضیاء! اول تو مجھے یہ خیال ہی نہیں آیا کہ میں اس سے یہ بات پوچھتا۔ دوسرے یہ کہ وہ روتا بہت ہے۔ اچھے بھلے آدمی کی کھوپڑی اڑ جاتی ہے۔ وہ بہت معصوم ہے مسٹر ضیاء! مجھے زندگی بھر افسوس رہے گا تو صرف جینو کا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ اس سے رابطہ رکھوں اور پتا کروں کہ وہ کہاں ہے؟ مگر میرا ارادہ ہے کہ کل دہلی جاؤں۔" پھر میں نے اسے شالی بابا کے بارے میں بتا دیا۔ مجھے اس وقت اس سے نفرت محسوس ہوئی جب شالی بابا کا سنتے ہی وہ جینو کا بھول گیا اور بولا۔

"اوہ مسٹر ضیاء! تم فوراً چلے جاؤ۔ وہ ہمارے لئے ضرور کچھ نہ کچھ کر لیں گے۔ پلیز......... دیر نہ کرو۔ یہ سب کچھ بعد میں بھی ہو سکتا ہے۔"

"تم بہت خود غرض اور کمینے آدمی ہو رابرٹ!" میں نے سرد لہجے میں جواب دیا۔

"کک......... کیا......... کیا مطلب.........؟" وہ ایک دم ہکلانے لگا۔ جان گیا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں اور کیوں کہہ رہا ہوں۔

"مطلب تم اچھی طرح جانتے ہو۔"

"دیکھو مسٹر ضیاء......... تم غلط سمجھ رہے ہو۔ میں اس لئے جذباتی ہو گیا تھا کہ وہ ہمیں......... سب کو اس عذاب سے نجات دلا سکتے ہیں۔ جینو کو بھی......... جہاں اس نے اتنی اذیت اٹھائی ہے۔ ایک آدھ دن اور اٹھا لے گا مگر پھر اسے عذابوں سے مکمل نجات مل جائے گی۔"

"اس ایک آدھ دن میں وہ مر بھی تو سکتا ہے مسٹر رابرٹ........."

"نہیں......... ایسا نہیں ہو گا۔"

"کیوں......... یہ یقین کیوں ہے تمہیں؟"

"بس.......... میرا دل کہتا ہے۔ وہ جو بھی ہے' ہمیں صرف اذیتیں دینا چاہتی ہے۔ مر گئے تو اسے کچھ ملنے والا نہیں۔"

"وہ تو وہ' اتنے برسوں میں جان چکی ہو گی کہ تم لوگوں سے اسے کچھ ملنے والا نہیں۔ بہرحال' یہ فیصلہ مجھے کرنا ہے کہ مجھے کب جانا ہے اور کب ان سے ملنا ہے۔ میں واپس آکر تم سے رابطہ کروں گا۔"

"سنو! پلیز فون بند نہیں کرنا۔ دیکھو مسٹر ضیاء.......... پہلے تم اپنا دل صاف کر لو۔ میرا مطلب قطعی وہ نہیں تھا جو تم نے سمجھا ہے۔ میں جینو سے بہت پیار کرتا ہوں۔"

"میں نے اسے بتایا اور پھر فون نمبر دیکھنے لگا جو طیب نے لکھ لیا تھا۔ میں نے نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف سے بیل سنائی دیتی رہی پھر کافی دیر بعد میں فون رکھنے ہی والا تھا کہ کسی نے فون اٹھا لیا مگر ریسیور اٹھانے والا بولا نہیں۔

"ہیلو! ہیلو.......... مسٹر جینو پاپا..........؟" میں نے سانس کی آواز سن کر پوچھا۔

"آپ..........؟ کیسے ہیں آپ؟" مانوس سی آواز لگی تھی اور یہ سن کر تو میں اچھل ہی پڑا تھا کہ بولنے والی کوئی لڑکی یا عورت تھی۔

"کک.......... کون؟" میں سمجھا کہ شاید میں نے بے خیالی میں کوئی غلط نمبر ڈائل کر دیا یا رابرٹ نے ہی غلط نمبر لکھوایا ہے۔

"آپ کی دوست!" دوسری جانب سے کھلکھلاتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"میری دوست؟" میں نے حیرت سے کہا۔ میں اس کی آواز پھر سننا اور اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ وہ کون ہے اور کیوں مجھے اس کی آواز مانوس محسوس ہوئی ہے۔

طیب یہ سب کچھ سن کر آگے کی طرف سرک آیا۔ وہ اشارے سے پوچھ رہا تھا کہ کون ہے؟ میں نے اشارے ہی سے بتایا کہ میں نے جینو کا نمبر ڈائل کیا ہے اور وہاں سے کوئی عورت بول رہی ہے۔ طیب نے ریسیور مجھ سے مانگا مگر میں نے نہیں دیا۔

"ہاں.......... میں منتظر تھی۔" دوسری طرف سے بڑی اپنائیت سے کہا گیا۔

"مگر میں آپ کو نہیں جانتا۔"

"جان جائیں گے۔ اب تو جان ہی جائیں گے۔" دوسرا جملہ بڑے معنی خیز انداز میں ادا کیا گیا تھا۔

"مطلب..........؟"

"اب ہمیں ساتھ ہی رہنا ہے۔"

"وہاٹ.......... کون ہیں آپ..........؟ اور سنیں.......... غالباً آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں ایسا کوئی نہیں ہوں جس کے ساتھ آپ کو رہنا پڑے۔ آپ مجھے یہ بتایئے کہ مسٹر جینو پاپا رہتے ہیں یہاں یا میں نے رانگ نمبر ڈائل کیا ہے؟"

وہ ہنسی اور ہنستی چلی گئی۔ وہی کھنک' تارے سے بکھر گئے میرے آس پاس۔ ہاتھ میں ریسیور لرز گیا۔ رنگین تتلیاں سی فضاؤں میں اڑتی محسوس ہونے لگیں۔

"کک.......... کون ہو تم..........؟ سامنے کیوں نہیں آتیں..........؟"

"آئی تو تھی!" وہ اتنا کہہ کر شرارت سے ہنس دی۔

"کون ہو تم؟" میں اس بار چیخا۔ "اور کیوں سب کو پریشان کر رہی ہو۔"

"میں سب کو پریشان کرنا چھوڑ دوں گی اگر تم.......... تم مجھے اپنا لو تو۔" وہ بڑے جذباتی انداز میں بول رہی تھی۔ اس کی آواز کی بھراہٹ نے میرے پورے وجود میں عجیب کیف اور سنسنی سی پھیلا دی تھی۔

"دیکھیے خاتون! آپ کو سو فیصد غلط فہمی ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے رانگ نمبر ڈائل ہو گیا ہے۔" میں نے اس سے زیادہ بات نہیں کی اور طیب کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو نظر انداز کر کے ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔

"کون تھی.......... وہی ہو گی یار.......... زیوسا.........."

"ہو سکتا ہے۔ مگر.......... جینو! لیکن طیب' یہ وہ آواز نہیں تھی جو میں نے رابرٹ کے فون پر پہلی بار سنی تھی پھر بھی.......... آواز مانوس تھی۔ مجھے ایسا ہی لگا تھا۔"

"تمہیں نام تو پوچھنا چاہیے تھا۔" طیب جھلا گیا۔

میں نے اس کے سامنے رکھا کاغذ اٹھا کر دوبارہ نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف بیل بج رہی تھی۔ میں ریسیور کان سے لگائے رہا۔ دو تین بار گھنٹی بجنے کے بعد کسی نے ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو رابرٹ..........! کیا یہ تم ہو؟" دوسری طرف سے کسی لڑکے کی سرگوشی ابھری۔ وہ بڑی رازداری سے بات کر رہا تھا۔

"مسٹر جینو پاپا!" میں نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

"کک.......... کون ہو تم؟" دوسری جانب سے گھبرائی ہوئی آواز آئی۔

"میں ضیاء ہوں۔ ضیاء الرب رضوی۔ عطاء الرب رضوی کا بیٹا۔" میرا اندازہ تھا کہ دوسری جانب جینو ہی ہے۔

"اوہ.......... تم.......... تم.......... ضیاء ہو.......... اوہ' میں بہت خوش ہو گیا ہوں۔ مجھے رابرٹ نے بتایا تھا۔ مگر سنو! تم کچھ دیر بعد فون کرنا۔ میں منتظر رہوں گا۔ فون ضرور کرنا ضیاء.........."

وہ گھبرا گھبرا کر بول رہا تھا۔ اس کی آواز سرگوشی کی صورت میں آ رہی تھی جیسے وہ کسی کی موجودگی کی وجہ سے آہستہ بول رہا ہو۔

"مسٹر جینو! کیا وہاں کوئی ہے؟ کیا تمہارے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟"

"بعد میں.......... بعد میں.........." اس نے پورا جواب دیئے بغیر فون بند کر دیا۔

طیب بے چین تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ غالباً پہلی بار جینو کا نمبر ملا تھا اور وہ کسی کی موجودگی سے خوفزدہ تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ گیارہ بج کر بائیس منٹ ہو رہے تھے۔ میری چائے ویسی ہی رکھی تھی۔ میں نے ایک ہی گھونٹ میں کپ خالی کر دیا۔

"شاید وہ اسی عورت سے خوفزدہ ہو اور کیا پتا' وہ عورت وہی زیوسا ہو۔ یار' عورت اور خوف دو متضاد چیزیں ہیں مگر یہاں بات الٹی نظر آتی ہے۔ زیوسا خوف کی علامت بن گئی ہے۔"

"تمہارے لئے وہ خوف کی علامت ہو گی۔" میں نے منہ بنایا۔

"اور تمہارے لئے؟" اس نے میرا سگریٹ کا پیکٹ اٹھا کر اس میں سے سگریٹ نکالتے ہوئے مجھے دیکھا۔

"چیلنج بن گئی ہے۔ سنو!" میں چونک اٹھا۔ "وہ کہتی تھی کہ وہ آئی ہے۔ میں نے کہا تھا کہ تم سامنے کیوں نہیں آتیں تب ہنسی اور بولی' آئی تو تھی۔"

"ضیاء.......... کیا یہ وہ لڑکی نہیں ہو سکتی جس نے یہاں ہمارا استقبال کیا تھا! جس نے ایلن اور روشنی کو پانی دیا ہے' جس نے کچن صاف کیا اور برتن دھوئے ہیں۔"

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ یہ یقین تو مجھے ہو گیا تھا کہ زیوسا ہمارا سایہ بن گئی ہے۔ یہ بھی یقین تھا کہ طیب کی گاڑی کو اسی نے ٹکرایا' اسے مروانا' ایلیا کو ختم کرانا' یہ سب بھی اسی کا کام تھا.......... وہ مجھے زچ کرنا چاہتی تھی مگر جو بات میں نے مونیکا کی موجودگی میں محسوس کی' وہی اس لڑکی کی موجودگی میں بھی محسوس ہوئی تھی۔ حالانکہ یہ

دونوں ایک ہی نہیں تھیں۔ جو آواز میں نے رابرٹ کے فون پر سنی تھی وہ اس آواز سے مختلف تھی۔ دونوں کی ہنسی بھی سنی تھی۔ جو ہنسی اس کی تھی' اس نے مجھے جھنجھنا دیا تھا جب کہ میں رابرٹ کی فون پر جو اس کی ہنسی سن چکا تھا' اس میں سفاکی اور تمسخر تھا' طنز تھا' غرور تھا۔ اگر یہ لڑکی جس نے ہمارا استقبال کیا تھا' یہی زیوسا تھی تو پھر وہ کون تھی؟

میں الجھتا چلا گیا۔ طیب مجھے دیکھتا رہا۔ اب وہ سامنے کی صوفے پر لیٹ گیا تھا۔ میں نے سگریٹ سلگا لیا۔ میں گھڑی دیکھتا جا رہا تھا۔ تقریباً دس منٹ تک میں ان عورتوں کا موازنہ کرتا رہا پھر میں نے فون سرکا کر نمبر ڈائل کیا۔ اس بار فون پہلی ہی بیل پر اٹھا لیا گیا۔ دوسری جانب جینو تھا۔ اب اس کی آواز نارمل تھی بس اس میں بے تابی بہت تھی۔

"ہیلو مسٹر ضیاء! یہ تم ہو نا!"

"ہاں جینو.......... تم کیسے ہو؟"

اتنا پوچھنا غضب ہو گیا۔ وہ ایسا بلک کر رو دیا کہ میرا جی بھر آیا۔ وہ روتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"مسٹر ضیا بائی گاڈ.......... اس سارے کھیل میں میرا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ بس جوان تھا نا! جذباتی ہو کر ایلن کے بیڈ روم میں چلا گیا تھا۔ مجھے بتاؤ.......... میرا کیا قصور تھا۔ ان لوگوں نے میرے ساتھ یہ سب کیوں کیا! مجھے تو دولت سے کبھی پیار نہیں رہا۔ میں تو لڑکیوں پر بھی بری نگاہ ڈالنا پسند نہیں کرتا تھا مگر ایلن بہت پرکشش عورت تھی۔ اس نے مجھے خود دعوت دی تھی۔ یقیناً وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ وہ جانتی ہے کہ میں بے قصور ہوں پھر یہ میرے کیوں پیچھے کیوں پڑی ہے؟ کیوں؟ مسٹر ضیاء..........! وہ مجھے مرنے بھی نہیں دیتی۔ وہ مجھے کچے گوشت کے' خون میں لتھڑے ہوئے ٹکڑے کھلاتی ہے۔ میں قریب المرگ ہو جاتا ہوں' سینہ پھٹنے لگتا ہے۔ پیٹ پھٹنے لگتا ہے مگر وہ.......... پھر مجھے بچا لیتی ہے۔ ضیاء..........! پلیز! مجھے بچا لو یا پھر مجھے زہر دے دو۔"

"میں تمہارے پاس کیسے پہنچ سکتا ہوں جینو!"

میرے سوال کرتے ہی دوسری طرف گہرا سناٹا چھا گیا پھر یہ سناٹا اس کی سسکیوں ہی سے ٹوٹا۔ وہ پھر بلک بلک کر رو رہا تھا۔ "میں نہیں جانتا.......... یہ میں نہیں جانتا کہ میں کہاں ہوں۔"

"دیکھو جینو! میری بات غور سے سنو! تم مرد ہو۔ تمہیں ہمت سے کام لینا ہو گا۔ تمہیں زندہ رہنا ہے جینو' پہلے تو یہ بات طے کر لو۔ زندہ رہنے کا ارادہ کرو گے تو ہمت اور جرات بھی پیدا کر سکو گے۔ زندگی کے لئے جس جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے جینو وہ پہلے ایک جذبے کی شکل میں ہی آدمی میں پیدا ہوتی ہے' وہی جذبہ اسے کچھ کر گزرنے پر اکساتا ہے۔ آنسو پونچھ لو۔ وعدہ کرو کہ اب تم موت کے بارے میں نہیں' زندگی کے بارے میں سوچو گے۔"

وہ ہچکیوں کے درمیان میری بات سن رہا تھا۔ میرے خاموش ہوتے ہی اس کی سسکیاں ختم ہو گئیں۔

"جینو! تم سن رہے ہو' میں کیا کہہ رہا ہوں؟"

"ہاں.......... ہاں.........."

"شاباش جینو! اب اپنے اردگرد غور سے دیکھو۔ مجھے بتاؤ' کیا تم کسی زیر زمین جگہ میں قید ہو؟"

"پتا نہیں مسٹر ضیاء! مگر یہاں میرے تین اطراف بدبو دار لکڑی کی دیواریں ہیں۔ سیلن زدہ فرش پر چھوٹے چھوٹے کیڑے رینگ رہے ہیں۔ وہی سفید کیڑے جو گندگی میں پلتے ہیں۔ پہلے مجھے ان سے خوف آتا تھا مگر اب میں ان کا عادی ہو گیا ہوں۔ یہ اب مجھے کچھ نہیں کہتے بلکہ ان کی بدن پر سرسراہٹ ہی اب مجھے اپنے زندہ ہونے کا احساس دلاتا ہے۔ میں ان سے مانوس ہو چکا ہوں۔"

"کیا یہاں تمہارے علاوہ بھی کوئی ہے؟"

"ہاں.......... مگر وہ کون ہے' مجھے نظر نہیں آتی۔ صرف سنائی دیتی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میں اس کی قید میں ہوں۔ وہی میرے لئے غلیظ کھانے کا بندوبست کرتی ہے اور مسٹر ضیاء.......... وہ مجھے ہراساں کرتی رہتی ہے۔ کیوں! یہ میں نہیں جانتا۔ میں اسے بتاتا ہوں کہ میں بے قصور ہوں۔ وہ بھی جانتی ہے۔ کہتی ہے کہ اسی لئے وہ میرا خیال رکھتی ہے۔ مگر مسٹر ضیاء..........!"

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر پھر رونے لگا۔ وہ واقعی بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ میرا دل بھی بھر آیا۔ "جینو! تم پریشان مت ہو۔ مجھے اس کے اور اپنے بارے میں جس قدر بتا سکتے ہو بتاؤ۔ میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔ پلیز.......... روؤ نہیں.......... مجھے بتاؤ.........."

"مسٹر ضیاء.......... مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ بس آزاد ہونا چاہتا ہوں۔ مجھے بچا لو۔ مجھے اس کی قید سے نجات دلا دو مسٹر ضیاء میں زندگی بھر تمہارا یہ احسان نہیں بھولوں گا۔ پلیز!"

"ٹھیک ہے جینو..........! میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم اس قید سے نجات پالو گے مگر اس کے لئے میرا تم تک پہنچنا بہت ضروری ہے۔ پلیز! مجھے اندازہ لگا کر بتاؤ کہ یہ کیسی جگہ ہے! تم کیا سنتے اور کیا محسوس کرتے ہو؟"

"وہ آتی ہے' ہنستی ہے' میرا تمسخر اڑاتی ہے' مجھ پر طنز کرتی ہے کہ تم نے اپنی زندگی کی پہلی اور آخری لذت آمیز رات ایلن کے ساتھ گزاری تھی۔ اب اسی کے سہارے پوری زندگی گزار دو۔ وہ میری بات نہیں سنتی۔ میرے رونے پر ہنستی ہے اور.......... اور ہاں مسٹر ضیاء! جب وہ مجھ سے باتیں کرتی ہے تو میرے بالکل سامنے دیوار پر ایک بڑی سی مکڑی بیٹھی رہتی ہے مگر جب وہ چلی جاتی ہے اور میں اس مکڑی کو تلاش کرتا ہوں تو وہ بھی مجھے نظر نہیں آتی۔ جب وہ آتی ہے تو میں مکڑی کو اترتے دیکھتا ہوں مگر جب وہ چلی جاتی ہے تو مکڑی جاتی ہوئی دکھائی نہیں دیتی۔ اچانک نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے اور سنو..........! ایسا ہونے سے پہلے.......... یعنی اس کی آمد سے پہلے مجھے کہیں دور کال بیل بجنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ ممکن ہے' یہ میرا وہم ہو۔ ممکن ہے' یہاں قریب کوئی ایسا گھر ہو جہاں سے کال بیل کی آواز مجھے سنائی دیتی ہو اور یہ اتفاق ہو کہ عین اسی وقت وہ آجاتی ہے۔ ممکن ہے' میں پاگل ہو گیا ہوں۔ سب بے سروپا باتیں مجھے مربوط نظر آتی ہیں۔ مسٹر ضیاء پلیز! تم.......... تم میری باتوں پر دھیان نہیں دینا۔ تم نے کہا ہے ناں کہ میں سب کچھ بتا دوں' جو سنتا اور محسوس کرتا ہوں۔"

"ہاں جینو..........! تمہاری ساری باتیں کام کی ہیں۔ ان میں کوئی بات بے سروپا نہیں۔ تم بتاؤ' اور تم کیا محسوس کرتے ہو؟"

"کبھی کبھی کسی گاڑی کے رکنے اور اسٹارٹ ہونے کی آواز بھی سنتا ہوں۔ شاید یہاں قریب ہی کوئی رہتا ہے مگر یہ کتنی اذیت ناک بات ہے مسٹر ضیاء کہ میں پھر بھی بے بس ہوں۔ کوئی میری مدد کو نہیں آتا۔ میں نے برسوں سے کسی کو نہیں دیکھا۔ کبھی کبھی رابرٹ مجھے فون کر لیتا ہے۔ ایک بار سورن سنگھ نے بھی مجھے فون کیا تھا اور آج تم.........."

"کیا تم خود کسی کو فون نہیں کر سکتے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں.........! یہاں ڈائل والا فون نہیں ہے۔ میں صرف آنے والے فون سن سکتا ہوں۔ مجھے یہ بھی اس کی مہربانی لگتی ہے کہ اس نے اس پر کوئی پابندی نہیں لگائی۔ میں کبھی کبھی تم لوگوں سے بات کر سکتا ہوں۔"

"کیا تم اندازہ کر سکے ہو کہ وہ تم سے کیا چاہتی ہے؟"

"نہیں.........! وہ کبھی یہ نہیں بتاتی۔ میں نے کہا تھا کہ مجھے مار دو۔ اگر میں قصور وار ہوں تو ایک ہی بار میری جان لے لو مگر ایسے میں وہ بے حد ہمدردی سے کہتی ہے کہ اسے میری اذیت پر ترس آتا ہے۔ وہ میری تکلیفوں کو کم کرنا چاہتی ہے۔ وہ مجھے یقین دلانے لگتی ہے کہ میں قطعی بے قصور ہوں' اصل مجرم تو رابرٹ' سورن' پرکاش اور عطا ہیں اور جب میں روتا ہوں' کہتا ہوں کہ مجھے آزاد کر دو تو قہقہے لگاتی ہے۔ کہتی ہے' میں جس کی تلاش میں ہوں۔ اگر وہ مجھے نہیں ملا تو میں کسی کو بھی نہیں بخشوں گی۔ میں نہیں جانتا کہ وہ کس کی بات کرتی ہے؟"

"کیا وہ زنجیروں کے سلسلے میں کوئی بات کرتی ہے؟"

"نہیں! وہ کسی ایسے شخص کا ذکر کرتی ہے جسے وہ چاہتی ہو اور جو اس کی دسترس سے باہر ہو۔ میں نے پوچھا بھی تھا کہ وہ کون ہے جس کے نہ ملنے کا بدلہ وہ مجھے قید کر کے لے رہی ہے مگر وہ جواب نہیں دیتی۔ ہنستی ہے پھر اچانک مجھے تسلیاں دینے لگتی ہے پھر روہانسی ہو کر بتانے لگتی ہے کہ وہ ایک مشکل میں گرفتار ہو چکی ہے۔ وہ بچپن ہی سے ایک ایسے شخص کی محبت میں گرفتار ہو گئی ہے جس کا حصول اس کے لئے مشکل ہے۔ اس نے یہ وعدہ بھی کیا ہے کہ اگر وہ شخص اسے مل گیا تو وہ مجھ ہی نہیں' رابرٹ' پرکاش' سورن اور پیاس کو بھی معاف کر دے گی۔"

"پیاس کہاں ہے؟" میں چونک اٹھا۔ پیاس کا تو کچھ پتا ہی نہیں تھا۔

"پتا نہیں' مگر وہ کہتی ہے وہ تم سے زیادہ دور نہیں ہے۔"

"سنو جینو! اب جب وہ تمہیں ملے گی تو اسے میرا پیغام دے دینا۔ اسے کہنا کہ ضیاء تمہاری مشکل حل کر سکتا ہے' وہ مجھ سے براہ راست ملے۔ کسی ڈرامے بازی کے بغیر۔ دوبدو بیٹھ کر بات کرے۔"

"نہیں ضیاء.........'' وہ ایک دم خوفزدہ آواز میں چیخ اٹھا۔ "ایسا نہیں کرنا۔ وہ

تمہیں بھی اپنے جال میں پھانس لے گی۔"

"کیا تم نہیں چاہتے کہ تم سب اس عذاب سے نجات پا جاؤ؟"

"مگر میں احسان فراموش نہیں ہوں مسٹر ضیاء' تم ہم پر احسان کرنے والے ہو۔ مسٹر عطا مجھے بہت پسند تھے۔ تم ان کے بیٹے ہو۔ میں کبھی نہیں چاہوں گا کہ تم کسی مصیبت میں گرفتار ہو۔"

"تھینک یو جینو! میں تمہارے جذبے کی قدر کرتا ہوں۔ مگر تم میری طرف سے پریشان مت ہو۔ میں ہر طرح سے محفوظ رہوں گا۔ اور ہاں سنو! میں چار پانچ روز کے لئے دہلی اور میرٹھ جا رہا ہوں۔ وہاں سے ایسا انتظام کر کے آؤں گا کہ وہ میرا بال بھی بیکا نہیں کر سکے گی۔ تم اس سے یہی کہنا کہ وہ کچھ دن انتظار کرے۔ پھر مجھ سے بات کرے یا ملے۔"

"ٹیک کیئر مسٹر ضیاء!"

"ڈونٹ وری......... تمہیں کل پھر فون کروں گا۔ جانے سے پہلے.........''

"میں انتظار کروں گا مسٹر ضیاء........."

میں نے فون بند کر دیا۔ میں جینو سے بات کر کے بہت افسردہ ہو گیا تھا۔ وہ اب یقیناً بچہ نہیں رہا ہو گا مگر مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اب بھی بچہ ہے حالانکہ جو کہانی میں سن چکا تھا اس کے حساب سے اسے مجھ سے عمر میں پندرہ بیس برس بڑا ہونا چاہئے مگر وہ معصوم تھا اس کا اندازہ مجھے اس سے بات کر کے ہی ہو گیا تھا۔

"کیا چکر ہے یار؟"

طیب جو صوفے پر آنکھیں موندے لیٹا تھا اور جسے میں سمجھ رہا تھا کہ سو چکا ہے' بول اٹھا۔ میں نے تفصیل سے اسے سب کچھ بتا دیا۔

"کیا پتا' وہ اسی عمارت میں قید ہو جہاں سورن سنگھ مکڑی کے جالے میں لپٹا رہتا ہے۔ اسے بھی تو اسی نے قید کر رکھا ہے۔"

"ہاں! یہ بھی ممکن ہے' میں تو اب تک رابرٹ والی عمارت بھی پوری نہیں دیکھ سکا حالانکہ جب بھی گیا' یہ ارادہ کر کے گیا کہ اس پوری عمارت کو ایک نظر ضرور دیکھوں گا مگر ہمیشہ یہ بات وہاں جا کر بھول گیا۔ تم یاد رکھنا۔ ہمیں سورن سنگھ والی اور رابرٹ والی دونوں عمارتوں کا اچھی طرح جائزہ لینا ہے۔ ہو سکتا ہے تمہاری بات ہی ٹھیک ہو۔ یہ بھی

ممکن ہے کہ وہ رابرٹ والی عمارت میں کہیں قید ہو۔ میں نے ایک بار وہاں اوپر کی منزل پر کسی عورت کا سایہ بھی دیکھا تھا۔

''دہلی کا کیا پروگرام ہے؟'' طیب نے انگڑائی لیتے ہوئے پوچھا۔

''کل سوچوں گا' میرا خیال ہے کہ پرسوں سویرے نکل جاؤں۔''

''نکل جاؤں نہیں' نکل جائیں۔'' طیب نے صوفے پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''کیا تم واقعی سنجیدہ ہو؟'' میں ہنسا۔

''تم مذاق سمجھ رہے ہو؟'' اس نے مجھے گھورا۔ ''چلو کمرے میں' مجھے نیند آرہی ہے۔''

''ہاں.........! مجھے یقین ہے کہ کل تم اپنا ارادہ تبدیل کر دو گے۔'' میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

''خام خیالی ہے تمہاری۔ میں فیصلہ کرنے میں وقت ضرور لیتا ہوں۔ کسی معاملے کو کافی دن تک سنجیدگی سے بھی نہیں لیتا۔ یہ میری خامیاں ہیں لیکن میں فیصلہ کر لیتا ہوں تو پھر سوچنے کی گنجائش نہیں رکھتا۔''

وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے اس کے چہرے پر بڑی گمبھیرتا' بڑی سنجیدگی اور لہجے میں بڑی پختگی محسوس کی۔

''یہ آخری والی بات تمہاری خوبی ہے۔'' میں اس کے پیچھے اوپر جانے لگا۔

''شکریہ۔ مجھے کل آفس جا کر چھٹی لینی ہوگی اور بس۔ تم کل سوچ لو۔ کہیں جانا تو نہیں ہے ناں۔''

''نہیں فی الحال تو کوئی پروگرام نہیں ہے۔''

''اگر تم سوئے ہوئے ہو گے تو میں نکل جاؤں گا۔ آفس ہو کر میں واپس آؤں گا' تم گھبرانا نہیں۔''

اس نے یوں تسلی دی جیسے کسی چھوٹے سے بچے کو اکیلے میں نہ ڈرنے کا حوصلہ دے رہا ہو۔ میں نے آگے بڑھ کر اپنے کمرے کا دروازہ کھولا۔ طیب کپڑے بدلنے کے لئے باتھ روم چلا گیا۔ میں جوتے اتار رہا تھا کہ اچانک نیچے کال بیل بجی۔ یہ کال بیل باہر والے گیٹ کی بجائی گئی تھی۔ میں سخت حیران اور پریشان ہو گیا۔ میں نے باہر والی کھڑکی کھول کر دیکھا۔ گیٹ کے باہر ایک ہیولا سا کھڑا تھا۔ روشنی کم تھی اس لئے یہاں سے

دکھائی نہ دیا کہ کون ہے لیکن اتنا اندازہ ہوا کہ وہ کوئی آدمی ہے۔ فربہ اور لمبا۔ کال بیل کی آواز طیب نے بھی سن لی تھی۔ اس نے باتھ روم کا دروازہ کھول کر جھانکا۔

''کون ہے ضیاء؟''

''پتا نہیں.........کوئی آدمی ہے۔''

''ایک منٹ.........صبر کرو' میں آتا ہوں۔''

پھر غالباً طیب نے جلدی جلدی کپڑے بدلے اور باہر آگیا۔ ''کون ہو سکتا ہے؟'' میں بڑبڑایا۔ طیب کھڑکی کے قریب آگیا۔ وہ غور سے دیکھ رہا تھا۔ اچانک میں نے اپنی حیرت انگیز بینائی کا خیال کیا اور غور سے دیکھنا شروع کیا۔ اس نے کال بیل پھر بجائی۔

''طیب! یہ موٹا سا کافی لمبا آدمی ہے۔ اس کا رنگ سانولا ہے' نچلا ہونٹ موٹا اور اوپر کا پتلا ہے۔ یہ ہونٹ سیاہی مائل ہیں۔ اس کی آنکھیں موٹی موٹی ہیں۔ بال سامنے سے اڑے ہوئے ہیں۔ ایک کان آگے کی طرف جھکا ہوا ہے۔ دایاں کان۔ ناک پھیلی ہوئی ہے۔ وہ سگار پی رہا ہے۔'' میں نے اتنا بتا کر طیب کی طرف دیکھا۔ طیب پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

''تت.........تم.........ضیاء تم.........کیا ہو؟''

''چھوڑو یہ بات' پہلے بتاؤ کہ اس حلیے کے آدمی کو جانتے ہو؟''

''ہاں.........یہ وہی ہے اینا کا انکل۔ وہی جو محض شراب کی خاطر ایلیسیا کے پاس آیا کرتا تھا۔ میں جا کر اسے ٹالتا ہوں۔''

طیب اتنا کہتے ہی نکل گیا۔ میں کھڑا رہا۔ کھڑکی سے اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیتا رہا۔ چند لمحوں بعد طیب بھی مجھے نظر آگیا جو اب گیٹ کی طرف جا رہا تھا۔ طیب کو غالباً وہ دیکھ چکا تھا اس لئے کہ میں نے اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی دیکھ لی تھی پھر طیب گیٹ پر پہنچ گیا۔ اس نے گیٹ کھولا۔ آنے والے سے مصافحہ کیا اور غالباً اسے بتانے لگا کہ ایلیسیا چلی گئی ہے۔ میں وہیں کھڑکی میں کھڑا دیکھ رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ یہ سن کر چلا جائے گا مگر شاید وہ شراب کے نشے میں دھت تھا۔ میں نے اس کے زور زور سے بولنے کی آواز سنی۔ الفاظ سمجھ میں نہیں آرہے تھے مگر تیز آواز مجھ تک پہنچ رہی تھی پھر پتا نہیں طیب نے کیا کہا۔ میں نے دیکھا کہ طیب نے اسے باہر ہی چھوڑ کر گیٹ بند کر لیا ہے۔ وہ اب بھی بول رہا تھا۔ طیب واپس چلا آیا۔ اس شخص نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔

یقیناً" میں کمرے کی روشنی کی وجہ سے اسے کھڑکی میں کھڑا نظر آ رہا تھا۔ طیب میرے قریب پہنچا تو میں نے جھک کر پوچھا۔

"کیا بات ہے؟ یہ کیا کہہ رہا ہے؟"

"پاگل ہے۔ کہتا ہے' ایلیا نے اسے فون کر کے بلوایا ہے۔ وہ واڈکا کی نئی بوتلیں لئے اس کی منتظر ہے اور وہ رات یہیں' اس کے ساتھ گزارنا چاہتا ہے۔ کہتا ہے کہ ہم اکثر ماضی کی باتیں کر کے دل بہلایا کرتے تھے' بالخصوص آج کے دن کیوں کہ آج ایلیا کے شوہر کی برسی کا دن ہے۔"

طیب نے سر اٹھا کر مجھے بتایا۔ میں نے دیکھا' وہ اب بھی کھڑا تھا اور میری اور طیب کی گفتگو سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ غالباً" وہ مجھے ایلیا سمجھ رہا ہو گا کیوں کہ یہاں سے گیٹ تک کافی فاصلہ تھا' اسے میں صرف ہیولے کی شکل میں نظر آ رہا ہوں گا۔ اب میری آواز سن کر اس کی یہ غلط فہمی دور ہو گئی ہو گی۔ کیوں کہ جب طیب باہر آنے لگا اور میری نگاہ سے اوجھل ہو گیا تو میں نے دیکھا کہ وہ پلٹ گیا مگر وہ اب بھی پلٹ کر زور زور سے کچھ کہہ رہا تھا۔ میں وہیں کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ اس دوران میں طیب بھی میرے قریب آ گیا۔

"سالا بری طرح وحشت ہے۔" وہ بڑبڑایا۔

"تم نے اسے کیا کہا؟" میں نے بیچ سڑک پر ڈولتے ہوئے اس کے سائے پر نگاہ جمائے جمائے پوچھا۔

"میں نے کہہ دیا کہ ایلیا اپنی بیٹی کو لے کر گوا چلی گئی ہے۔ مگر وہ کہتا ہے کہ تم جھوٹ بول رہے ہو اور یہ وہ کام ہے جو تم کرنا نہیں جانتے۔ اس کا کہنا ہے کہ ایلیا سب کچھ کر سکتی ہے مگر آج کا دن فراموش نہیں کر سکتی۔ وہ صرف سال میں ایک بار ہی شراب کی بوتلوں کو ہاتھ لگاتی ہے۔ کچن کی میز سجاتی ہے۔ میز پر میرے اور اپنے شوہر کے لئے گلاس سجاتی ہے پھر اس کے گلاس میں شراب بھرتی ہے۔ میرے گلاس کو بھرتی ہے پھر وہ اپنے شوہر کی طرف سے میرے گلاس سے اس کا گلاس ٹکراتی ہے۔ ایک گھنٹے تک روتی ہے پھر آنسو پونچھ کر ماضی کے اوراق پلٹتی ہے۔ میں جب تھک جاتا ہوں تو وہ لان میں بیٹھ کر ساری رات بتا دیتی ہے اور میں صوفے پر لیٹ کر تھامسن کو یاد کرتا رہتا ہوں۔ صبح کی پہلی کرن کے ساتھ وہ اٹھ جاتی ہے پھر میں ایک برس تک اس محفل کا انتظار کرتا ہوں۔ درمیان میں جب بھی آتا ہوں' وہ بوتلیں میرے حوالے کر دیتی ہے' خود انہیں

ہاتھ بھی نہیں لگاتی اور پتا نہیں کیا کیا بکواس کر رہا تھا۔"

طیب اکتا کر پلٹ گیا۔ میں نے سڑک پر دیکھا۔ اب وہ موڑ پر پہنچ چکا تھا پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ میں نے کھڑکی بند کر دی۔

"نہیں یار!........" طیب نے پلٹتے ہوئے کہا۔ "اسے کھلا رہنے دو۔ مجھے گھٹن محسوس ہو رہی ہے۔"

"طیب! یہ ہمارے لئے مسئلہ تو نہیں بن جائے گا؟"

"نہیں! نہیں!........ جھکی آدمی ہے۔ وحشت ہے۔ کہیں سڑک پر ہی پڑ کر سو جائے گا۔ ہمارے لئے مسئلہ کیسے بن سکتا ہے۔" طیب کی آواز نیند میں ڈوبی ہوئی تھی۔

"تم سو جاؤ۔" میں نے کہا اور لائٹ بجھا دی۔ یوں بھی میں جینو کے بارے میں سوچنا چاہتا تھا۔ اگر بہت دیر نہ ہو گئی ہوتی تو میں رابرٹ کو بھی فون کرتا مگر میں نے اس لئے فون نہیں کیا کہ وہ بھی بہت باتونی تھا۔ بے چارہ کم گو بھی ہوتا تو بات کرنے کو ترستا تھا۔ میں فون کرتا تو جان چھڑانا مشکل ہو جاتی۔ مجھے نیند تو نہیں تھی کہ صبح سے شام تک سویا تھا مگر سستی اور کسل مندی محسوس ہو رہی تھی۔ طیب بہت جلد سو گیا۔ اس نے "خراٹے لینے شروع کر دیئے۔ میں جو سونے کی کوشش کر رہا تھا' اس کے خراٹوں سے عاجز آ کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ یہاں کتابوں کی الماری کوئی بھی نہیں تھی البتہ ہر جگہ شراب کی بوتلیں سجی ہوئی تھیں۔ ان سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں ڈرائنگ روم میں آ کر صوفے پر لیٹ گیا۔ میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ رات کے پونے دو بج چکے تھے۔ آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔

پھر شاید مجھے نیند آ گئی۔ اچانک میری آنکھ کھلی۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھے شاید جھٹکا لگا تھا۔ شاید میں خواب دیکھ رہا تھا۔ اٹھ گیا تو اوپر چلا گیا اور طیب کے برابر میں لیٹ گیا۔ نیند نے جلد ہی مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔ مجھے نہیں پتا کہ میں کتنی دیر سویا تھا۔ اٹھا تو میرا سر جھنجھنا رہا تھا۔ یوں جیسے کسی تیز آواز کی وجہ سے میری آنکھ کھلی ہے۔ کچھ دیر تو میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔ میں نے طیب کی طرف دیکھا۔ وہ بے خبر سویا ہوا تھا۔ اچانک میں نے کسی کی آواز سنی۔ آواز بہت قریب سے آئی تھی۔ میں چونک اٹھا۔ پہلے کمرے کا جائزہ لیا پھر میں نے کمرے کی وہ کھڑکی کھولی جو اندر ڈرائنگ روم میں کھلتی تھی' نیچے جھانکا۔ لائٹ جل رہی تھی۔ شاید میں نیند کے غلبے کی وجہ سے لائٹ جلی چھوڑ

کرا وپر آ گیا تھا۔ میں نے کان لگائے، وہاں سناٹا تھا پھر مجھے خیال آیا کہ شاید آواز باہر لان کی طرف سے آئی ہے۔ میں نے بہت آہستگی سے باہر والی کھڑکی کھولی۔ میرے کمرے میں نائٹ بلب روشن تھا۔ جسے میں نے کھڑکی کھولنے سے پہلے ہی بجھا دیا تھا۔ میں نے آہستہ سے باہر جھانکا اور لان میں نگاہ پڑتے ہی اچھل پڑا۔ وہاں دو کرسیاں اور میز رکھی تھی۔ یہ وہ میز کرسیاں تھیں جو کچن میں رکھی ہوئی دیکھی تھیں۔ ایک کرسی پر وہی موٹا کرسچن براجمان تھا۔ اس کے سامنے رکھی میز پر واڈکا کی بوتل اور گلاس رکھا تھا جب کہ دوسرا گلاس اس کے سامنے والی کرسی کے سامنے رکھا تھا مگر وہ کرسی خالی تھی۔ میں نے گھبرا کر طیب کو جھنجوڑا۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔

"کیا ہوا یار؟"

"ہش.........!" میں نے اشارے سے اسے چپ کرایا۔ مجھے دیکھتے ہی اور اشارہ سمجھتے ہی طیب الرٹ ہو گیا۔ "کیا ہے؟" اس نے سرگوشی میں پوچھا۔

"باہر وہی بڈھا بیٹھا شراب نوشی کر رہا ہے۔" میں نے بھی دھیمی آواز میں جواب دیا۔

"کیا؟" وہ اچھل پڑا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" اس نے خود کلامی کے سے انداز میں گھڑی پر نگاہ ڈالی۔

میں نے دیکھا، گھڑی کی سوئیاں چار بج کر گیارہ منٹ کا اعلان کر رہی تھیں۔

"آؤ......... دیکھتے ہیں۔ یہ اندر آیا کیسے......... یہ ہے کہاں؟" طیب نے کھڑکی میں سے جھانکا۔ "ارے......... یہ یہاں۔"

"سنو! پہلے ہم دیکھتے ہیں کہ یہ کیا کر رہا ہے۔ میں اس کی آواز سن کر اٹھا ہوں۔" میں نے کھڑکی کے پٹ کی اوٹ میں ہوتے ہوئے کہا۔ طیب دوسری طرف کھڑا ہو گیا۔ پھر حیرت سے بولا۔

"یار ضیاء! یہ کرسیاں اور ٹیبل کہاں سے آ گئیں۔"

"یہ کچن میں رکھی تھیں۔" میرے جواب نے اسے چونکا دیا۔

"کچن میں......... مگر......... کیا یہ اندر بھی آیا تھا مگر کیسے؟ گیٹ میں نے بند کیا تھا۔ پھر یہ دروازہ بھی لاک کر کے آیا تھا۔ وہ اندر کیسے آیا؟ کیا اس کے پاس ایکسٹرا چابی ہے۔"

"ہو سکتا ہے ایلیا نے احتیاطاً اسے چابی دے رکھی ہو۔ اگر ایسا ہے تو ہمیں وہ چابی اس سے لینا ہو گی طیب۔" میں نے پھر باہر جھانکا۔ اب وہ گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگا رہا تھا۔

"ہاں......... یہ تو گڑبڑ والی بات ہے۔ اس سے چابی........." ابھی طیب کا جملہ پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ ہم دونوں چونک اٹھے۔ وہ بول رہا تھا۔ کہہ رہا تھا۔

"ایلیا! تمہیں ان دونوں سے کہہ دینا چاہئے کہ وہ کل ہی دن میں اس کوٹھی کو خالی کر دیں۔ مجھے وہ آدمی بہت بدتمیز اور بدتہذیب لگا تھا جس نے گیٹ پر آ کر جھوٹ بولا تھا کہ تم اپنا کو لے کر جا چکی ہو۔ میں نے کہہ دیا تھا کہ ایلیا سب کچھ کر سکتی ہے مگر آج کی رات کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ چیئرز۔"

اس نے اپنا گلاس ہوا میں یوں لہرایا جیسے کسی گلاس سے ٹکرا رہا ہو اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ میں نے گلاسوں کے ٹکرانے کی آواز بھی سنی تھی حالانکہ سامنے والا گلاس اب بھی ٹیبل پر جوں کا توں رکھا تھا۔ میں نے طیب کی طرف چونک کر دیکھا۔ لگ رہا تھا کہ آواز اسے بھی سنائی دی ہے۔ اس کا رنگ فق ہو رہا تھا۔ آنکھیں خوف اور وحشت سے پھیل گئی تھیں۔

"آؤ۔" میں نے تیزی سے کہا اور دروازے کی لپکا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" اس نے لپک کر مجھے پکڑ لیا۔

"اس بڈھے سے پوچھنے کہ یہ اندر کیسے آیا اور یہاں کیا کر رہا ہے۔" میں نے اس سے اپنا بازو چھڑواتے ہوئے جواب دیا۔

"باؤلے ہو گئے ہو کیا؟" وہ جھلا گیا۔

"اس میں باؤلے پن کی کون سی بات ہے۔"

"یہاں جو کچھ اب تک ہو چکا ہے، اس میں یہ واقعہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے۔ تم نے سنا نہیں کہ اس کے گلاس سے کوئی ان دیکھا گلاس ٹکرایا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ ایلیا واقعی اس رات کو فراموش نہیں کر سکتی ہو۔ اس کی روح یہ غم منانے کے لئے باہر آ گئی ہو۔ اسی نے بڈھے کو اندر بلا لیا ہو گا۔"

میں دوسرے ہی لمحے پر سکون ہو گیا۔ اس وقت طیب مجھ سے زیادہ مردہ باد نظر آ رہا تھا۔ واقعی یہاں جو بھی ہوتا، کم تھا۔ "لیکن ہمیں جا کر دیکھنا اور پوچھنا تو چاہئے۔" میں نے

نرم انداز میں جواب دیا۔

"یہ اور بات ہے کہ ہمیں جانا چاہئے مگر جس انداز میں تم جا رہے تھے ویسے نہیں۔" طیب نے قدم آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

ہم آگے پیچھے چلتے ہوئے سیڑھیوں تک پہنچے۔ ہمیں اوپر ہی سے کچن کی روشنی نظر آگئی۔ میں آگے بڑھ گیا۔ میں نے نیچے پہنچتے ہی کچن میں نگاہ دوڑائی۔ کرسی میز واقعی غائب تھی۔ ڈرائنگ روم کا بیرونی دروازہ پورا کھلا ہوا تھا اور وہ بوڑھا ہمیں یہاں سے بھی صاف نظر آ رہا تھا۔ اب وہ لہک لہک کر کوئی گانا گا رہا تھا جس میں ماضی کی رنگین راتوں اور لمبے لمبے سفر پر نکلنے کی تیاریوں کا ذکر تھا جو نئے نویلے جوڑے ہنی مون کے نام پر اختیار کرتے ہیں۔ اس میں محبوب کے انتظار میں بار بار دروازے پر جاتی اور بے قراری سے ٹہلتی ہوئی لڑکی کا بھی ذکر تھا اور اچانک آ کر دبوچ لینے والی موت کا بھی۔ جو آدمی کو جھپٹا مار کر دبوچ لیتی ہے اور وہ اپنے محبوب کو خدا حافظ بھی نہیں کر پاتا۔

"اے مسٹر!" میں دروازے سے باہر نکلتے ہی للکارا۔ میں نے لان والا بلب بھی جلا دیا تھا۔ میری آواز اور ساتھ ہی ہونے والی روشنی نے اسے چونکا دیا۔ وہ لہرایا' پلٹا اور پھر مجھے دیکھ کر جھومنے لگا۔

"آؤ مسٹر.......... تم بھی آؤ۔ آؤ! آج ہم اداس ہیں۔ میں جب اداس ہوتا ہوں تو شراب میری اداسی کو ختم کر دیتی ہے مگر یہ .... ایلیا.......... یہ مجھے پھر اداس کر دیتی ہے۔ میں ایک اور جام پیتا ہوں' جیسے ہی خوش ہوتا ہوں.......... یہ پھر شروع ہو جاتی ہے۔ اور پھر جام بھر.......... پی۔"

اتنی دیر میں ہم اس کے قریب پہنچ چکے تھے۔ "تم کون ہو؟" میں نے اس کے بالکل سامنے جا کر پوچھا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر لڑکھڑا کر پھر دھم سے کرسی پر بیٹھ گیا۔

"میں.......... تھامسن کا دوست ہوں مگر مسٹر میں شراب کی بے حرمتی سمجھتا ہوں اگر یہ پی کر آدمی سچ چھپانے لگے۔ میں اس کا دوست ضرور ہوں مگر میں ایلیا کو بھی پسند کرتا ہوں۔ یہ بات میں نے ہمیشہ ایلیا سے چھپائی مگر تھامسن کی موت کے بعد پہلی برسی مناتے ہوئے میں نے صاف گوئی سے اسے سب کچھ بتا دیا تھا۔ اس نے برا نہیں مانا۔ اب ہم دونوں اس کا سوگ مل کر مناتے ہیں۔ میں خوش ہو کر اس سے اظہار محبت کرنا چاہتا ہو

مگر یہ.......... تھامسن کے لئے اتنا روتی ہے کہ میں بھی رونے لگتا ہوں۔"

"بات سنو! بوڑھے عاشق.......... تم اندر کیسے آئے؟" اس بار طیب نے اس کی ناک سے ناک ملا کر پوچھا۔

اس نے زوردار قہقہہ لگایا۔ "ارے تم مذاق سمجھ رہے ہو!! مجھے ایلیا نے بلوایا ہے۔ ہم اتنے برسوں سے یہ رات یہاں ایک ساتھ گزارتے ہیں۔ آج رات میں اپنے آپ کو جوان محسوس کرتا ہوں مگر یہ بڑھیا.......... مجھے میرے بڑھاپے کا مکمل احساس دلا کر مجھے نڈھال کر دیتی ہے لیکن ایک بات ہے' سرور' غم اور خوشی کی اس درمیانی کیفیت میں بھی بہت ہے۔"

"سرور کے بچے!" طیب نے اسے گریبان سے پکڑ کر کھڑا کر دیا۔ اس کے ہاتھ میں بھرا ہوا گلاس تھا جو چھلک گیا اور وہ چیخ اٹھا۔

"اے..........! تم میری جان لے سکتے ہو مگر اس کا ایک قطرہ بھی اگر ضائع ہو گیا تو انتڑیاں نکال دوں گا۔" اس نے آنکھیں نکالیں۔

"کیا کر رہے ہو طیب؟" میں نے اس کا گریبان چھڑایا پھر اس کو کرسی پر بٹھا دیا۔ "آپ بیٹھیں!"

"تھینک یو..........! تم تہذیب یافتہ لگتے ہو۔" اس نے مسکرا کر مجھے دیکھا پھر منہ بنا کر طیب کی طرف دیکھا اور چونک کر بولا۔ "تم.......... تم وہی ہو نا جس نے گیٹ سے مجھے بھگا دیا تھا۔ یہ جھوٹ بول کر کہ ایلیا چلی گئی ہے۔ مجھے ہر برے شخص سے مل کر دکھ ہوتا ہے۔ غصہ نہیں آتا مگر تم میں اخلاق کی کمی بہت زیادہ ہے۔ تمہیں مہمانوں سے بات کرنے کی تمیز نہیں ہے۔ تم نے نہ صرف مجھ سے جھوٹ بولا بلکہ مجھ سے بداخلاقی سے بھی پیش آئے ہو۔ مجھے تمہاری موجودگی پسند نہیں ہے۔ مجھے تم پر غصہ بھی آ رہا ہے۔"

"وہ جھوٹ نہیں تھا مسٹر عاشق! سچ تھا۔ ایلیا اینا کو لے کر تین روز پہلے ہی گوا جا چکی ہے اور کہہ گئی ہے کہ وہ اب کبھی یہاں واپس نہیں آئے گی۔ اب اپنے شوہر کی موت کا دن وہ گوا میں منایا کرے گی۔" طیب نے دانت کچکچا کر جواب دیا۔

"بدتہذیب بچے! تمہیں یہ سن کر حیرت ہو گی کہ میں بددل ہو کر گھر چلا گیا تھا اور وہیں غم منانے کا اہتمام کر رہا تھا کہ ایلیا کا فون آ گیا۔ اس نے شکوہ کیا کہ میں اب تک یہاں کیوں نہیں پہنچا۔ میں نے اسے تمہاری بدرستانی کے بارے میں بتایا تو وہ بڑبڑانے لگی

کہ اسے کبھی تم پسند نہیں آئے اور تمہاری ساری حرکتیں ایسی ہی ہیں پھر اسی نے مجھے فوراً" پہنچنے کی ہدایت کی۔ میں پہنچا۔ وہ گیٹ کھولے' لان میں میز کرسی لگائے' گلاس اور بوتل سجائے' میری منتظر تھی۔ سمجھے تم' جھوٹے لڑکے!"

طیب نے یہ سن کر تھوک نگلا۔ میں خود بھی دم بخود کھڑا تھا۔ اس کا کہا ہوا حرف بہ حرف سچ لگ رہا تھا۔ وہ گھر میں کیسے آسکتا تھا اور اگر اس کے پاس چابی تھی بھی تو وہ یہ دیکھ کر کہ میں اور طیب یہاں موجود ہیں' اتنی جرات کیسے کر سکتا تھا۔ پھر میں نے اس سے پوچھا۔ "اور ایلیا نے کچھ نہیں کہا۔"

"کیا مطلب؟ اب تم ہماری باتیں بھی پوچھو گے؟"

"نہیں.......... وہ.......... وہ ہے کہاں؟"

"ابھی ابھی اس طرف گئی ہے۔" اس نے کوٹھی کے اس حصے کی طرف اشارہ کیا' جہاں ہم نے کل رات اسے دفنایا تھا۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر دوڑ گئی۔

"ک.......... کیوں؟" میری بجائے طیب بول اٹھا۔

"مسٹر..........!!" میں نے جلدی سے اسے مخاطب کیا۔

"ڈگلس.......... تم ڈگلس کہہ سکتے ہو۔ میں اجنبیوں کو یہی نام بتاتا ہوں۔" اس نے نہایت صاف گوئی سے بتا دیا کہ وہ اپنا نام ہمیں بتانا نہیں چاہتا۔

"مسٹر ڈگلس! کیا یہ تہذیب میں شامل ہے کہ آپ اتنی رات گئے کسی کے گھر میں آکر اتنا شور شرابا کریں۔"

"کسی کا گھر! تمہارا مطلب کیا ہے اس سے!" اس نے برا سامنہ بنایا اور ایک طویل گھونٹ لے کر گلاس میز پر رکھ دیا۔

"یہ ایلیا کا گھر نہیں ہے۔ ہمارا ہے۔ وہ یہاں ملازم تھی اور اب جا چکی ہے۔ اگر تم سے کسی نے مذاق کیا ہے تو وہ ضرور کوئی چڑیل ہو گی جس نے تم کو پسند کر لیا ہو گا۔" طیب نے جل کر کہا۔

"میں اب تمہاری عمر کے کسی بھی آدمی پر اعتبار نہیں کر سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ سب بھی جھوٹے ہوں۔" شراب نے اس کا برا حال کر دیا تھا۔ اب وہ بیٹھ بھی نہیں پا رہا تھا۔

"مسٹر ڈگلس!" میں نے اسے اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ "میرا خیال ہے کہ اب ایلیا سونے جا چکی ہو گی۔ آپ بھی اب گھر چلے جائیں۔ اب صبح ہونے والی ہے۔"

"نہیں..........! اس نے مجھے تاکید کی ہے کہ میں یہیں رہوں۔ کہیں بھی نہ جاؤں۔" اس نے جھومتے ہوئے کہا۔

"اب اٹھتا ہے یا دوں ایک جھانپڑ۔"

طیب پھر دانت کچکچا کر اس کی طرف لپکا مگر میں نے اسے درمیان میں ہی پکڑ لیا۔ اسے گھورا۔ اس نے بڑبڑاتے ہوئے اپنا رخ دوسری طرف کر لیا۔

"طیب' پلیز! تم مجھے پریشان کرنے والی حرکتیں کر رہے ہو۔ یہ اپنے آپ میں نہیں ہے۔"

"میں گاڑی نکالتا ہوں۔ اس حرامزادے کو کہیں پھینک کر آنا پڑے گا۔" طیب بھی باؤلا ہو رہا تھا۔

"صبر کرو۔" میں چیخ اٹھا۔ وہ سر جھٹکتا ہوا کچھ دور چلا گیا۔ میں نے دیکھا' ڈگلس اب کرسی پر سنبھل نہیں رہا تھا۔ سامنے رکھی اتنی بڑی بوتل اب خالی ہو چکی تھی۔ اس نے بچی ہوئی شراب بھی گلاس میں انڈیل لی تھی۔ اسے خود کو سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا مگر وہ گلاس کو اس مضبوطی سے پکڑے تھا جیسے اس کی جان اس چھلکتی شراب میں ہو۔

"اٹھو مسٹر ڈگلس!" میں نے بغل میں ہاتھ ڈال کر اسے کھڑا کر دیا۔ اس نے کھڑے ہوتے ہوئے بھی وہ گلاس منہ سے لگا کر خالی کر دیا۔

"کیا کر رہے ہو تم.......... مسٹر!"

"تمہیں آرام دہ بستر پر لٹاؤں گا۔" میں نے جواب دیا۔

"یار ضیاء! یہ کیا کر رہے ہو تم.......... اسے فری نہ کرو ورنہ یہ زندگی بھر نہیں جائے گا اور اگر چلا بھی گیا تو ہر ویک اینڈ پر تمہارے سامنے ہو گا۔" طیب کو وہ بڈھا زہر لگ رہا تھا۔

"اسے یہاں نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنا پڑے گا۔" میں نے اسے سنبھالتے ہوئے جواب دیا پھر اسے لئے ہوئے ڈرائنگ روم میں آگیا۔ اسے صوفے پر پٹخ کر میں سیدھا ہو گیا۔ "مسٹر اب تم بالکل خاموشی سے یہاں پڑے رہو' سمجھے!" میں نے اسے جھنجھوڑا۔ اس کی آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں۔

☆==============☆==============☆

طیب ڈرائنگ روم کا دروازہ بند کر کے اوپر جا رہا تھا۔ ڈگلس بے سدھ پڑ گیا تو میں بھی اوپر چلا آیا۔ طیب بیڈ پر نیم دراز سگریٹ پی رہا تھا۔

"طیب! کیا واقعی اسے ایلیا نے فون کر کے بلایا ہو گا؟" میں نے سگریٹ کیس میں سے ایک سگریٹ منتخب کرتے ہوئے پوچھا۔

"ایلیا کا تعلق زیوسا کے خاندان سے نہیں تھا ضیاء! نہ وہ کوئی ماورائی مخلوق تھی۔ وہ مر چکی ہے۔ اسے تو اس وقت تھامسن کے ساتھ وقت گزارنا چاہئے نہ کہ اس بڈھے کے ساتھ۔ میرا خیال ہے کہ اس نے گھر میں بھی اچھا خاصا غم منا لیا تھا' وہ بہک کر یہاں چلا آیا۔ اسے تھامسن کا غم نہیں' ایلیا سے اظہار محبت کا حوصلہ یہاں لایا ہو گا۔ بڈھا بدکردار!"

"ایلیا اور زیوسا.......... کتنے ملتے جلتے نام ہیں۔" میں نے چونک کر کہا۔ طیب پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ "مگر اس کے لہجے میں سچ زیادہ تھا۔ میں نے سنا ہے کہ شراب پی کر لوگ جھوٹ نہیں بولتے۔"

"اگر خصلت کے کمینے نہ ہوں تو۔" طیب نے سگریٹ کا آخری کش لے کر سگریٹ کو کھلی ہوئی کھڑکی سے باہر اچھالتے ہوئے جواب دیا۔ پھر چونک کر مجھے دیکھا۔ "تم مجھے خوفزدہ کرنے کی کوشش کر رہے ہو؟" اس کے انداز میں تمسخر تھا۔

"نہیں.......... میں تو اپنا خیال ظاہر کر رہا ہوں۔"

"مطلب' باآواز بلند سوچ رہے ہو۔"

"ہاں۔"

"سو جاؤ یار.......... حرام خور نے نیند برباد کر دی۔ ٹائم کیا ہوا ہے۔" طیب نے لیٹتے ہوئے پوچھا۔

"ابھی صبح ہونے میں دیر ہے اور تمہیں کون سا کہیں جانا ہے۔" میں بھی لیٹ گیا۔

"جانا ہے۔ آفس جاؤں گا۔ چھٹی لوں گا۔"

"جب اٹھو گے' چلے جانا۔ چھٹی ہی تو لینی ہے۔ اس میں وقت کی پابندی کرنے کی کیا ضرورت ہے؟" میں نے کروٹ لے لی۔ مجھے یقین تھا کہ اب نیند نہیں آئے گی' جانے کب میں سو گیا۔

کسی نے مجھے جھنجوڑا تھا۔ میری آنکھ کھلی تو طیب وحشت زدہ چہرہ لئے میرے

جھکا ہوا تھا۔

"ضیاء.......... نیچے.......... نیچے دیکھو۔"

"کک.......... کیا بات ہے۔" میں اچھل کر اٹھ بیٹھا۔

"نیچے۔" اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ میں چھلانگ لگا کر کھڑکی کی طرف بھاگا۔ نیچے جھانکا تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کانوں میں سیٹیاں سی بجنے لگیں۔

دن کا اجالا پھیل چکا تھا۔ ڈرائنگ روم میں کافی روشنی تھی اور میرے سامنے ڈگلس بہت سے ٹکڑوں کی شکل میں خون میں لتھڑا پڑا تھا۔ اس کے قریب ہی وہ چھری پڑی تھی جسے دیکھ کر میرے بدن میں سنسنی دوڑا کرتی تھی۔

"آؤ!" میں سیڑھیوں کی طرف بھاگا۔

"ضیاء.......... پاگل ہوئے ہو۔" طیب چیخا اور اس نے پیچھے سے میری شرٹ پکڑ کر مجھے روک لیا۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھیلی ہوئی تھیں۔ رنگ سفید ہو رہا تھا۔

"اسے کیا ہوا ہے؟" میں حواس کھو بیٹھا تھا۔ "کس نے مارا ہے اسے؟"

"ضیاء.......... ! کیا تم نے دیکھا نہیں۔"

طیب کی آواز سن کر میں ایک دم چونک اٹھا۔ میں نے پہلے خود پر قابو پا لیا۔

"ہاں.......... ! ڈگلس.........."

"نہیں! اس کے قریب.......... دائیں طرف.......... کیا تم نے نہیں دیکھا؟"

اور میں اس کی بات سمجھ کر پھر کھڑکی تک پہنچ گیا۔ اب میں نے نیچے جھانکا تو دم بخود رہ گیا۔ پھر طیب کے چیخنے کے باوجود اسے دھکا دے کر نیچے بھاگا۔ میں اسے بھاگنے نہیں دینا چاہتا تھا۔ طیب میرے پیچھے چلاتا ہوا آ رہا تھا۔ ابھی میں نے آخری سیڑھی کو عبور بھی نہ کیا تھا کہ کال بیل بج اٹھی۔

میں نے دروازے پر باہر جانے کی بجائے صوفے کے پیچھے چھلانگ لگائی مگر میرے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی وہ عجیب و غریب انسان کہیں غائب ہو چکا تھا۔ ہاں.......... ! وہ انسان ہی تھا مگر ترامڑا سا۔ یوں جیسے انسان نہ ہو۔ بھیڑیا ہو۔ خونخوار بھیڑیا۔ جب میں نے طیب کے کہنے پر کھڑکی سے اندر جھانکا تو اسے ایک کونے میں دبکا دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں گوشت کا ایک ٹکڑا تھا اور منہ خون میں لتھڑا ہوا تھا۔ وہ ایسی جگہ بیٹھا تھا کہ روشنی اس پر براہ راست نہیں پڑ رہی تھی مگر چھن کر

آنے والی روشنی نے اسے اور زیادہ وحشت ناک بنا دیا تھا۔ سفید رنگ، سرخی مائل بھورے بکھرے ہوئے بڑے بڑے بال، چوڑے کاندھے اور چوڑا سینہ۔ وہ ایسے بیٹھا تھا جیسے بھیڑیا اپنی پچھلی ٹانگوں کو موڑ کر بیٹھتا ہے۔ جھکے ہوئے کندھوں کے درمیان اس کا سر جھوم رہا تھا، بالوں کی لمبی لمبی لٹوں نے بھی اس کے چہرے کے نظر آنے والے حصے پر اندھیرا سا بکھیرا رکھا تھا مگر وہ پھر بھی مجھے صاف دکھائی دے گیا تھا لیکن جب تک میں اور طیب سیڑھیاں پھلانگ کر نیچے پہنچے، وہ غائب ہو چکا تھا مگر کہاں..........؟ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ طیب دروازے پر ساکت کھڑا تھا۔ اب کال بیل نہیں بج رہی تھی۔ طیب بہت خوفزدہ تھا۔ اس کی وحشت بھری نگاہیں بھی اس عجیب الخلقت بھیڑیے نما آدمی کو کمرے میں تلاش کر رہی تھیں۔

"کون ہے وہاں؟" میں نے طیب کو ساکت کھڑے دیکھ کر پوچھا اور چاروں طرف اسے تلاش کرنے کے لئے نگاہیں دوڑانے لگا۔

"پتا نہیں.......... میں.......... میں نے دروازہ نہیں کھولا۔ وہ.......... کہاں گیا؟"

"سنو طیب..........! دروازہ مت کھولنا۔" اچانک مجھے خیال آیا کہ وہ یہیں کہیں چھپا ہوا ہے اور دروازہ کھلتے ہی بھاگ سکتا ہے۔ دروازے پر جو بھی تھا شاید اب واپس جا چکا تھا۔ میں نے صوفے کی پچھلی دیوار والی میز پر رکھا لیمپ آن کر دیا۔ تیز روشنی نے میرے بدن پر چبھتی ہوئی سرد لہر سی دوڑا دی۔ پورا صوفہ خون سے تر تھا۔ ڈگلس کے گوشت کے ٹکڑے ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی ادھڑی ہوئی خون میں لت پت ٹانگ اب صوفے کے پیچھے اسی جگہ پر پڑی تھی جہاں میں نے اوپر سے اس بھیڑیے نما آدمی کو دیکھا۔ میں اس طرف بڑھا اور پھر یہ دیکھ کر میرے بدن میں پچھلی سنسنی میں اضافہ ہو گیا کہ زمین پر خون آلود کپڑوں کے گھسیٹے جانے کے سے نشان صوفے کے نیچے اس دیوار تک چلے گئے تھے جہاں رات ہم نے لکڑی کا دروازہ دیکھا تھا اور جو ہماری پوری کوشش کے باوجود نہیں کھلا تھا۔ میں وحشت سے لرزتے دل اور ڈگمگاتے قدموں کے ساتھ لکڑی کی دیوار تک پہنچ گیا اور پھر جو کچھ میں نے دیکھا، وہ شاید طیب نے بھی دیکھ لیا جو جانے کب میرے پیچھے چلا آیا تھا۔

خون آلود جسم کے گھسیٹے جانے کے نشان دروازے تک آ کر یوں اس دیوار کی دوسری طرف چلے گئے تھے جیسے اب سے پہلے وہ دروازہ کھلا ہوا ہو اور وہ عجیب الخلقت

آدمی دیوار، اندر چلا گیا ہو حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ دروازہ کھلا ہی نہیں تھا ورنہ اوپر سے نظر آ جاتا یا پھر نیچے آ کر جب میں نے اس طرف چھلانگ لگائی تھی تبھی میں اسے کھلا اور بند ہوتا تو دیکھ لیتا مگر نہیں.......... اس انکشاف نے تو میری حالت ہی خراب کر دی کہ وہ جو چیز بھی تھی، لکڑی کے اس دروازے کے نیچے بنی جھری سے اندر گئی تھی اور یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ وہ خوفناک سوال تھا جو مجھے ہولائے دے رہا تھا۔ وہ جو بھی چیز تھی، میں بتا چکا ہوں کہ بھیڑیا نما تھی اور بھیڑیا کسی دروازے کے نیچے جھری سے رینگ کر اندر نہیں جا سکتا۔

مگر ایسا ہی ہوا تھا۔

"ضیاء..........! یہ.......... یہ تو.........."

طیب نے اپنا لرزتا ہوا ہاتھ میرے کندھے پر رکھا تو میں اس کی موجودگی سے واقف ہوتے ہوئے بھی یوں اچھل پڑا جیسے اچانک اکیلے میں کسی نے آ کر مجھے ڈرا دیا ہو۔ میں نے بے اختیار اس کا ہاتھ پکڑ کر دبایا۔

"یہ وہی جگہ ہے جو ہم نے رات دیکھی تھی طیب.......... اب اسے کھولنا ضروری ہے۔" میں نے چند لمحے خود پر قابو پانے میں لگائے پھر پرعزم لہجے میں کہا۔

"نہیں ضیاء..........! ایسا مت کرنا۔ یہ ہمارے لئے بہت خطرناک ہو سکتا ہے۔"

"کیا تم نے اسے دیکھا تھا؟" میں نے اپنے ہاتھوں میں پسینا محسوس کر کے اپنی ہتھیلیاں کپڑوں سے مسلتے ہوئے طیب سے پوچھا۔

"ہاں۔" اس نے جھرجھری۔ "وہ کون تھا ضیاء اور گیا کیسے؟"

"خدا جانے.........." میں ادھر سے پلٹا اور ڈگلس کا ادھڑا ہوا بدن میرے سامنے بکھرا پڑا تھا جسے غالباً میں اور طیب اس عجیب الخلقت شخص کو دیکھ کر بھول گئے تھے۔ طیب بھی اب اس طرف متوجہ تھا۔ اس کا رنگ سفید تھا اور آنکھوں میں بلا کی وحشت تھی۔

"ضیاء..........! اب.......... ایک اور قبر۔"

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ ٹھیک کہتا تھا۔ اب ہمیں ایک اور قبر کھودنا تھی۔

"ضیاء! یہاں.......... یہاں تو ٹکڑیاں.........." طیب اتنا کہتے ہوئے اچھل کر دور ہٹ گیا۔ اس لئے کہ اس کے دائیں جانب صرف دو قدم کے فاصلے پر رکھے صوفے پر ڈگلس کی لاش کے کچھ حصے پڑے تھے۔ وہ اسی صوفے پر سویا تھا۔

"میں نے بہ غور دیکھا۔ وہاں کچھ نہیں تھا۔ کوئی مکڑی نہیں تھی اور اب سے پہلے جب میں نیچے اترا تھا تب بھی میں نے وہاں کوئی مکڑی نہیں دیکھی تھی۔ "نہیں طیب! موت بالکل مختلف ہے' یہاں مکڑیاں نہیں۔ اسے اسی درندے نما انسان نے مارا ہے۔"

"ضیاء! یہاں سے چلو۔" طیب نے ایک دم کہا اور میں چونک اٹھا۔ وہ ٹھیک کہہ ر تھا۔ یہاں گزرنے والا ہر لمحہ ہمیں ایک نئے حادثے' ایک نئے سانحے سے دوچار کر تھا۔ یہ بڑی خوف ناک اور پراسرار کوٹھی تھی۔ حد درجہ پراسرار' پتا نہیں' کس لمحے ہونے والا تھا۔ شالی بابا مجھے پیغام دے چکے تھے۔ دادا میرے منتظر تھے۔ اب مجھے واقعی د نہیں کرنا چاہیے تھی۔

"ہاں طیب......! یہاں سے نکلنا بہت ضروری ہو گیا ہے۔ یار یہ آخر کس کوٹھی ہے۔ ایسی خوفناک۔"

"یہ خوفناک تھی نہیں...... جب سے تم نے یہاں قدم رکھا ہے' یہ پراسرار ہو گئی ہے اور خوفناک بھی۔ میں ایک عرصے یہاں رہا ہوں۔ ہم نے رقص و سرود محفلیں جمائی ہیں یہاں۔ ڈرنک پارٹیز کی ہیں۔ راتیں جاگ کر اور دن سو کر گزارے ہیں ایک بڑھیا ایلیا کے علاوہ مجھے یہاں کسی چیز میں نہ کبھی پراسراریت محسوس ہوئی تھی کسی چیز سے کبھی الجھن ہوئی۔ بہرحال ضیاء...... میں زندگی کو ہنس کھیل کر گزارنے شوقین تھا اور ہوں...... میں ان عذابوں میں گھرنا نہیں چاہتا مگر...... تمہیں یہاں چھوڑنا بھی میرے بس میں نہیں ہے۔ پلیز! یہاں سے نکل چلو۔ ایسا نہ ہو کہ کوٹھی کا دور تک پھیلا ہوا ویران حصہ ہمیں قبرستان میں بدلنا پڑے۔ تم اسے زنجیریں دے نہیں دیتے یا رابرٹ کو دے دو یا تم انہیں سورن سنگھ کو بھی دے سکتے ہو۔ میرے میں وہ دونوں ہم سے بہتر پوزیشن میں ہیں۔"

"اٹھو!" میں نے ڈگلس کے گوشت کے ٹکڑوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ یہ نہیں تھا میں نے اس کی بات غور سے سنی نہیں تھی یا اس سے متفق نہیں تھا مگر یہ وقت باتوں کا نہیں تھا۔ یہ فیصلہ ہمیں کرنا ہی تھا کہ اب کیا کریں' مگر فی الوقت ڈگلس کے ٹک کو دفنانا اور کمرے کو صاف کرنا ضروری تھا۔ میرے ذہن میں وہ بھیڑیا نما شخص اور ا دروازے سے رینگ کر اندر جانا پھوڑے کی طرح پک رہا تھا۔ میں دنیا کا ہر کام چھو بیٹھا تھا۔ آفس سے چھٹیاں لے لی تھیں مگر اب تک میں کسی کام کو مکمل نہیں کر سکا

پھر دادا کی طرف سے بھی پریشان تھا۔ میں الجھ گیا' بیزار ہو گیا' میرے اعصاب آہنی نہیں تھے کہ میں ان ہیبت ناک تماشوں کا متحمل ہو سکتا۔ جن' بھوت' معجزے' اور بھی جتنے اس قسم کے معاملے تھے' یہ ان سب سے مختلف تھا۔ یہ مکڑیاں جادوئی نہیں تو کس کی دسترس میں تھیں' میں نہیں جانتا تھا۔ ایلن ایسی کون سی خاص چیز تھی کہ ایک اس کے قتل سے اتنے بہت سے لوگ تماشا بن چکے تھے۔ اس دنیا میں ہزاروں قتل ہوتے ہیں مگر ایسا کسی کے بھی ساتھ نہیں ہوتا۔ یہ ساری باتیں میرے اندر کی بیزاری کو بیدار کر گئیں۔

"چلو اٹھو یار......! اسے دفنا کر کمرے کو صاف کرنے میں صبح ہو جائے گی۔"

"مگر ضیاء......! یہ سب کب تک؟" طیب اب بھی نڈھال اور خوفزدہ سا تھا۔

"صبح تک......" میں نے دوٹوک انداز میں جواب دیا۔ میرے جواب نے اس میں پھرتی بھر دی۔ وہ فوراً کھڑا ہو گیا۔

"چلو۔ ٹارچ کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"دراز میں۔" اتنا کہہ کر میں آگے بڑھا۔ میں نے ایک جانب رکھی سینٹرل ٹیبل کے نیچے لگی لوہے کی چپٹی راڈ نکال لی۔ اس کے لئے مجھے اس میں لگے اسکرو کھولنا پڑے پھر میں نے اس چپٹی پٹی کی مدد سے ڈگلس کے جسم کے ٹکڑے ایک جگہ ڈھیرے کی شکل میں جمع کر لئے۔ طیب ٹارچ لے کر باہر جا چکا تھا۔ اس لمحے مجھے خیال آیا کہ جانے کون آیا تھا' کس نے بیل بجائی تھی؟ کیوں چلا گیا؟ بہرحال ان باتوں کا کوئی جواب میرے پاس نہیں تھا۔ میں نے ڈگلس کے جسم کے ٹکڑوں کو میز پوش میں جمع کیا۔ انہیں گھسیٹتا ہوا کمرے سے باہر لے آیا گو اس طرح گھسیٹنے سے سارا فرش خراب ہو رہا تھا مگر ہمت نہ تھی کہ اس گٹھڑی کو اٹھا کر کندھے پر رکھ لیتا۔ یہ اتنا کراہت آمیز کام تھا جو شاید میرے سوا کوئی نہیں کر سکتا تھا۔

میں باہر کوٹھی کی پچھلی جانب پہنچا تو طیب ضرورت کی چیزوں کے ساتھ وہاں موجود تھا۔

"میں اب ان چیزوں کو اسٹور میں نہیں رکھوں گا۔ روز ڈھونڈنا اور اٹھا کر یہاں لانا محنت طلب کام ہے۔" وہ بڑبڑایا تھا۔

میں نے ایلیا کی قبر کے برابر میں اس گٹھڑی کو رکھ دیا۔ طیب نے کوئی بات کئے بغیر زمین کھودنا شروع کر دی۔ میں بھی پھاوڑا اٹھا کر شروع ہو گیا۔ معلوم نہیں کتنی دیر لگی مگر

ہم نے ایک گہرا گڑھا کھود لیا۔ گٹھڑی کو گڑھے میں پھینک کر اسے بند کرنے میں جیسے صدیاں بیتتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ تھکن اور اعصابی ٹوٹ پھوٹ سے بدن چیخ رہا تھا مگر آرام ابھی ہماری قسمت میں نہیں تھا۔ طیب کا حوصلہ دیکھ کر میں خود کو مضبوط کر رہا تو اور اس میں شاید حوصلہ اس لئے جوان تھا کہ میں نے کہہ دیا تھا کہ صبح تک ہی یہ سب کچھ کریں گے اور پھر یہ کوٹھی چھوڑ دیں گے۔

کمرا صاف کرنے‘ اسے ترتیب دینے اور درست کرنے میں صبح ہو گئی۔ چڑیوں کی چہچہاہٹ اور کھڑکی کے شیشوں سے شفق کی سرخی مائل سنہری کرنیں کمرے میں داخل ہوئیں تو میں آخری نگاہ کمرے میں ڈال رہا تھا۔ طیب صوفے پر لیٹا ہانپ رہا تھا۔ میں نے اور اس نے اس صوفے کو جس پر ڈگلس کا خون لگ چکا تھا۔ باہر لے جا کر پانی کی بالٹیاں بھر بھر کر ڈالیں اور اس میں سے خون نکال دیا تھا اور سوکھنے کے لئے اسے باہر ہی چھوڑ دیا تھا۔

”کیا اب تم اس صوفے کے سوکھنے کا انتظار کرو گے؟“

طیب نے مجھے چونکا دیا۔ وفعتاً مجھے محسوس ہوا کہ میرا حلق خشک ہو چکا ہے۔ میں نے کچن میں جا کر ٹھنڈا پانی پیا‘ طیب کی نگاہیں مسلسل میرا تعاقب کر رہی تھیں۔

”پھر کیا کرو گے۔ اسے یہیں چھوڑ جاؤ گے۔ یہ تمہارے دوست کی امانت ہے۔ وہ کیا سوچے گا کیوں کہ اگر یہ باہر ہی پڑا رہا تو خراب ہو جائے گا۔“

”یہ تمہارا معاملہ نہیں ہے ضیاء! میں اسے نیا صوفہ لے دوں گا مگر خدا کے واسطے‘ اب یہاں سے نکلو۔“

وہ کھڑا ہو گیا۔ میں نے چند لمحے سوچا‘ وہ ٹھیک کہتا تھا‘ یہ میرا معاملہ نہیں تھا۔ میں اوپر جانے کے لئے آگے بڑھا۔ طیب میرے ساتھ تھا۔

ہم نے اپنا سامان سمیٹا اور اس کوٹھی پر آخری نگاہ ڈال کر وہاں سے نکل آئے حالانکہ مجھے نہ معلوم کیوں یہ شک تھا کہ ہم وہاں سے نکل نہیں پائیں گے۔ وہ جو بھی تھی‘ میرے پیچھے پڑ چکی تھی۔ طیب بھی اب اس کے حصار میں تھا۔ مجھے یہ یقین تھا کہ ہمارے نکلتے نکلتے ایسا کوئی حادثہ ضرور ہو گا کہ جس سے ہم نکل نہیں پائیں گے مگر حیرت انگیز طور پر ہم کوٹھی کو لاک کر کے اس کے گیٹ کو عبور کر آئے تھے۔ طیب کی گاڑی خراب تھی اور گیراج گئی ہوئی تھی اس لئے ہم اس چوڑی سڑک کی طرف چل دیئے

جہاں سے ہمیں ٹیکسی مل جاتی۔ ہمارے بیگ ہمارے کاندھوں پر تھے ان میں اتنا سامان نہ تھا مگر کندھے تو قبریں کھودتے کھودتے شل ہو چکے تھے اس لئے مجھے لگ رہا تھا جیسے میں ایک پہاڑ کندھے پر رکھے چل رہا ہوں۔

ہمیں جلد ہی ٹیکسی مل گئی۔ ”ریلوے اسٹیشن چلو۔“ میں نے اس ٹیکسی میں بیٹھتے ہی کہا۔

طیب نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ”کیوں؟“ وہ بولا۔

”ہم پہلے دہلی جائیں گے۔“ میں نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر اس میں سے سگریٹ منتخب کرتے ہوئے جواب دیا۔

”پاگل ہوئے ہو کیا۔ حالت دیکھ رہے ہو اپنی اور میری؟“ اس نے میری توجہ اپنے اور میرے حلیے کی طرف دلائی۔ یہ میں دیکھ چکا تھا کہ ہمارے کپڑوں پر خون کے دھبے نہیں کیوں کہ ہم کپڑے بدل چکے تھے مگر نہائے بغیر۔ ہمارے جسم مٹی سے اٹے تھے اور پسینے نے اس مٹی کو ہمارے بدن پر قلعی کی طرح جما دیا تھا۔ یقیناً ہم گرم پانی سے غسل ہمیں ہلکا پھلکا کر سکتا تھا مگر میں گھر نہیں جانا چاہتا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے زیوسا کا سایہ میرا تعاقب کر رہا ہے۔ پُراسراریت اب بھی ان دیکھی زنجیر کی طرح میرے پیروں میں لپٹی ہوئی ہے اور میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے ساتھ زیوسا کا منحوس سایہ زہرہ آپا کے گھر کو بھی اپنی خوفناک بانہوں میں لے لے مگر طیب یہ سب نہیں سوچ رہا تھا۔

”ہم اسٹیشن کے قریب حمام میں نہا لیں گے۔“ میں نے اسے تفصیل بتانے کی بجائے اسے ٹالنا چاہا۔

”کیوں...........؟ ہمارے پیچھے کیا جنگلی لگے ہیں؟“

وہ عجیب آدمی تھا۔ لمحہ بھر میں پچھلے خوفناک واقعات کو بھول جانا اس کے لئے ایک نعمت ہی تھا۔ پہلے میں نے چاہا کہ اسے یاد دلاؤں مگر بے وجہ اسے اذیت میں مبتلا کرنا میں نے مناسب نہیں سمجھا۔ ”نہیں...........! جنگلی تو نہیں لگے ہیں‘ واوا کی طرف سے پریشانی ہو گئی ہے پھر شاہی بابا کسی جنگل یا غاروں میں گم نہ ہو جائیں‘ بس یہی پریشانی ہے۔“

”دہلی جانے والی ٹرین چلنے میں ابھی ڈھائی گھنٹے ہیں۔“ طیب نے اکتائے ہوئے انداز میں جواب دیا۔ ٹیکسی درمیانی رفتار سے اسٹیشن کی طرف بڑھ رہی تھی۔

”یہ ڈھائی گھنٹے ہمارے نہانے‘ اچھے سے ہوٹل میں بہترین قسم کا ناشتا کرنے اور

گرما گرم چائے پیتے میں گزر جائیں گے۔" میں نے کہا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

مجھے اب بھی خوف تھا' کسی انہونی کا' کسی حادثے کا! سانحے کا............ کسی خوفناک واقعے کے رونما ہونے کا' مگر سکون اتنا گہرا ہو چکا تھا کہ مجھے میرے دل کے دھڑکنے کی آواز اپنے پورے وجود میں گونجتی محسوس ہو رہی تھی۔ ہم بے پناہ مصروف سڑک پر سے گزر رہے تھے مگر سناٹا گہرا ہی ہوتا چلا جا رہا تھا۔ میرے اندر صرف سناٹے کی گونج تھی' اپنی تمام حسوں پر گراں گزرنے والی گونج۔

طیب اب چپ ہو گیا تھا۔ ٹیکسی والا چپ تھا۔ شیشے چڑھے ہوئے تھے۔ مجھے لگا' جیسے حبس سے مر ہی جاؤں گا۔ شیشوں کا خیال آتے ہی میں نے خود کو تسلی دینا چاہی کہ میں اس لئے سناٹا محسوس کر رہا تھا۔ میں نے فوراً شیشے اتار دیئے۔ باہر ٹریفک کا شور تھا مگر یوں جیسے ایک چھوٹے سے ڈبے میں سمٹا ہوا ہو۔ شیشے کھول دینے کے باوجود میرے اندر کے سناٹے میں کوئی فرق نہ پڑا' نہ اندر گرد کی طرح بیٹھے سکون میں۔ گھبراہٹ اور بڑھ گئی۔

"طیب! باتیں کرو۔" میں نے گھبرا کر کہا۔

طیب نے مجھے حیرانگی سے دیکھا پھر شاید اسے میرے چہرے سے اندر کی کیفیت کا احساس ہو گیا۔ "کیا ہوا ضیاء؟" اس نے میری جانب سرک کر سرگوشی کی۔

"کچھ نہیں............ کچھ............ گھبراہٹ سی ہو رہی ہے۔ وہ............ وہ پتھر ہے نا تمہارے پاس!"

"ہاں۔"

طیب کا ہاتھ بے ساختہ اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں رینگ گیا۔ میں نے اس کے چہرے پر اطمینان پھیلا دیکھا جس کا مطلب تھا کہ اس نے چھو کر تصدیق کر لی ہے۔

"نکال دوں؟"

"نہیں۔" میں نے جواب دیا پھر جانے مجھے کیا ہوا کہ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ میری اس بے ساختہ قسم کی حرکت نے مجھے جیسے ایک جادوئی حصار سے باہر نکال لیا۔ ٹریفک کے بے پناہ شور نے مجھے اچھل جانے پر مجبور کر دیا۔

"کیا............ کک............ کیا ہو رہا ہے تمہیں ضیاء؟"

اب طیب پریشان ہو گیا۔ "کچھ نہیں............ اب............ اب میں ٹھیک ہوں۔"

میں نے مسکرا کر اسے دیکھا

"کیا تم کچھ محسوس کر رہے ہو؟"

"نہیں............ اب نہیں کر رہا۔"

"اسٹیشن آگیا سر۔"

ٹیکسی والے نے ہمیں چونکا دیا پھر ٹیکسی کو ایک طرف پارک کیا۔ میں اسے کرایہ دے کر طیب کا ہاتھ تھامے باہر آگیا۔ یہاں کچھ ہی فاصلے پر حمام بنے تھے۔ ہم دونوں اسی طرف بڑھ گئے۔

"ضیاء!" طیب چلتے چلتے ایک دم رک گیا۔

"کیا؟"

"زہرہ آپا وغیرہ کو نہیں پتا کہ ہم یہاں ہیں' اور یہاں سے کہاں جا رہے ہیں۔ وہ گھر فون کریں گی اور تمہیں پتا ہے کہ نہ صرف خود ہولاتی رہیں گی بلکہ پورے سسرال اور شاید میکے تک کو ہولا دیں۔"

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ انہیں دہلی جانے کی اطلاع دینا ضروری تھا۔ میں نے نگاہ ادھر ادھر دوڑائی۔ پبلک ٹیلی فون بوتھ دور نہیں تھا۔ میں طیب کو لئے اس طرح بڑھ گیا۔ میں نے فون ملایا۔ دوسری طرف طاہر بھائی تھے اور حسب سابق میری آواز سنتے ہی برس پڑے۔

"یار ضیاء............! اس سے تو بہتر تھا کہ تم آتے اور یہاں اطلاع ہی نہ کرتے' دن اور رات زہرہ روتی اور بسورتی رہتی ہے۔ اب کیا بمبئی اتنا چھوٹا ہے کہ میں روز تمہیں تلاش کر کے' تمہاری خیریت کی اطلاع لے کر گھر لوٹوں! کہاں ڈھونڈوں تمہیں؟ بات کرو اس سے۔"

انہوں نے میری بات سنے بغیر ہی فون زہرہ آپا کو دے دیا۔ مجھے سخت غصہ آگیا تھا۔ فون پر زہرہ آپا کی بسورتی آواز سنتے ہی میں اکھڑ گیا۔ "زہرہ آپا! یہ کیا تماشا بنایا ہوا ہے آپ نے۔ میں کوئی ننھا سا دودھ پیتا بچہ ہوں کہ کھو جاؤں گا۔ گر جاؤں گا اور............"

"ضیاء تم ٹھیک تو ہو ناں!" انہوں نے میری بات کا کوئی بھی اثر لئے بغیر کہا اور مجھے بے ساختہ ان پر پیار آگیا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں آپا۔ خدا کے واسطے آپ میری فکر چھوڑ دیں اس لئے کہ

میں ابھی اسٹیشن سے بول رہا ہوں۔ میں اور طیب دہلی جا رہے ہیں۔"

"ارے........ ملے بغیر۔ تم نے تو اتنے دن شکل ہی نہیں دکھائی۔"

"آپ بھول رہی ہیں' پرسوں میں آپ کے گھر پر تھا۔ میری شکل میں ابھی تک کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی کہ میں آپ کو ضرور دکھاتا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر ملے بغیر........"

"ہاں آپا! وقت نہیں ہے۔ میں دادا کی طرف سے پریشان ہوں۔"

"ارے ہاں! کل دہلی سے فون آیا تھا۔ دادا تمہارے لئے پریشان ہیں۔ میں نے رات کو اس لئے فون نہیں کیا کہ تم ڈانٹو گے' صبح کیا تو کسی عورت نے اٹھایا اور کہا کہ تم وہاں نہیں ہو۔"

میں سناٹے میں آگیا۔ "کون........ کون تھی وہ........ میرا مطلب ہے اس نے بتایا کہ وہ کون بول رہی ہے؟"

"آں........ ہاں! بتایا تو تھا' وہ........ ہاں ایلیا........"

میں نے چونک کر طیب کو دیکھا۔ طیب بات چیت سے اندازہ لگا چکا تھا کہ کچھ ہو چکا ہے۔ پوچھنے کے لئے بے چین تھا۔ "لیجئے طیب سے بات کرلیں۔ یہ میرے ساتھ ہی جا رہا ہے۔ اب اس کے گھر میں عذاب نہ مچا دیجئے گا۔" پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور پوچھتیں۔ میں نے طیب کو ریسیور تھما دیا اور اشارہ کیا کہ جلدی سے بات کر کے ختم کرے' ٹائم کم ہے۔ اس نے جلدی جلدی اطلاع دی۔ نہ گھبرانے کی تلقین کی۔ غالباً انہوں نے کہا تھا کہ وہ ظاہر بھائی سے بات کرے مگر طیب نے منع کر دیا اور فون بند کر دیا۔ فون بند کرتے ہی وہ میری طرف پلٹا۔

"کیا کہہ رہی تھیں؟ کس عورت کی بات کر رہے تھے؟"

میں نے اسے بتایا کہ زہرہ آپا سے ایلیا نے کہا کہ ہم وہاں سے جا چکے ہیں۔ یہ سنتے ہی اس کے چہرے پر سفیدی پھیل گئی۔

"ضیاء! یہ بڑا کمال نہیں ہوا کہ ہم وہاں سے صحیح سلامت نکل آئے۔"

اسے اب احساس ہوا تھا جب کہ میں جانے کب سے یہ سب سوچ رہا تھا۔ "ہاں لیکن میں اب بھی مطمئن نہیں ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے اس کا خوف بڑھا دیا تھا۔ اس کا احساس مجھے اس کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی ہوا تھا۔ "لیکن بہرحال........ اب ہم کسی حد

تک محفوظ ہیں۔" میں نے اس کا اعتماد بحال کرنا چاہا۔ "چلو........ جلدی کرو۔ ٹائم نہیں ہے۔"

وہ میرے پیچھے چلا آیا۔ میں نے اب اس کی طرف نہیں دیکھا اور خود کو بھی بالکل نارمل ظاہر کیا۔ میں جانتا تھا کہ کچھ ہی دیر بعد وہ سب کچھ بھول جائے گا اور ہوا بھی یہی۔ دس منٹ بعد ہی وہ حمام میں زور زور سے فلمی گانا گا رہا تھا۔ "برسات میں........ ہم سے ملے تم سجن تم سے ملے ہم........ برسات میں۔"

ہم نہا کر باہر نکلے تو لگا جیسے کئی پہاڑ اپنے اوپر سے اتار آئے ہوں۔ طیب تو بہت چہک رہا تھا۔ یقیناً وہ سب کچھ بھول چکا تھا۔ ہم نے اچھے سے ہوٹل میں ڈٹ کر ناشتا کیا پھر بھاگم بھاگ ٹرین پکڑی۔ ٹرین روانہ ہونے تک میں نے طیب کا ہاتھ کسی نہ کسی بہانے تھامے رکھا۔ میں جانتا تھا کہ اس پتھر کی موجودگی' طیب کو اور اس کا ہاتھ تھامے رہنے سے مجھے بھی محفوظ رکھے گی۔ ویسے اس پُراسرار ہستی کی طرف سے اتنا سکون کسی طوفان کا پیش خیمہ ہی لگ رہا تھا مگر میں جلد از جلد دہلی پہنچ جانا چاہتا تھا۔

ایک دن اور رات کا ایک طویل حصہ ہمیں سفر میں گزارنا تھا۔ میں خیریت سے سفر کٹ جانے کی دعائیں مانگ رہا تھا۔ طیب یا تو گنگنا رہا تھا یا پھر چنے کھا رہا تھا جو اس نے اسٹیشن سے کلو بھر خرید لئے تھے پھر وہ برابر بیٹھے ایک مراٹھی لڑکے سے ساتھ باتیں کرنے لگا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ بڑی ٹھیٹھ مراٹھی بول رہا تھا۔ میں کھڑکی سے باہر دیکھ کر سوچنے لگا کہ پتا نہیں فرحت اور بی جان دہلی میں ہوں گی۔ وہ دونوں تو شاید رک جائیں مگر خالہ بی کا دل زیادہ دن تک کسی ایک جگہ نہیں لگتا تھا۔ ویسے میں فرحت اور بی جان سے کہہ آیا تھا کہ وہ یہیں رہیں جب تک میں لوٹ نہ آؤں' مگر وہ مرضی کی مالک تھیں' وہ سکتا ہے چلی گئی ہوں پھر اچانک مجھے طیب کا خیال آیا۔ اس کی فرحت میں دلچسپی یاد آئی تو لگا جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ طیب میرے ساتھ جا رہا تھا۔ بے ساختہ میرے دل سے دعا نکلی کہ فرحت اور بی جان میرٹھ جا چکی ہوں۔ میں نے یہ فیصلہ بھی کر لیا کہ اگر وہ میرٹھ میں ہوئیں تو میں اکیلا ہی میرٹھ جاؤں گا۔

"یار ضیاء! اب کیا کریں؟"

اچانک طیب نے مجھے چونکا دیا۔

"کیوں؟" میں نے اسے دیکھا۔ اس کی برابر والی سیٹ خالی تھی۔ وہ مراٹھی لڑکا

وہاں نہیں تھا۔

"وہ تین فلموں کی کہانیاں سنا چکا تھا۔ جب میں نے اسے سنانا چاہیں تو وہ سونے کے بہانے اوپر چلا گیا۔"

طیب مجھے معصوم سا بچہ لگا جو کھیلتے کھیلتے آ کر شکایت کرتا ہے کہ مقابل اپنا کھیل کھیل کر چلا گیا' اس کی باری نہیں آنے دی۔ "تم بھی سو جاؤ۔ تھکے نہیں ہو گیا۔"

"ہاں........! یہ ٹھیک ہے۔"

اتنا کہہ کر وہ لیٹ گیا۔ خود میرے بدن میں بھی اب درد کی ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔ بالخصوص میری پنڈلیاں اکڑی ہوئی تھیں' میں بیگ کو سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ میرے ذہن میں کچھ نہیں تھا یا میں خود ہی کچھ سوچنے سے احتراز کر رہا تھا۔ میں نے سونے کی کوشش کی اور اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی ہو گیا۔ سوتے سوتے میں نے طیب کے خراٹے سنے تھے پھر میرا ذہن اندھیروں میں گم ہوتا چلا گیا۔

"انکل........! انکل!"

☆☆☆

پہلے تو مجھے لگا جیسے میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ کوئی چھوٹا سا' معصوم سا بچہ میری ٹانگوں سے لپٹا ہوا ہے اور گود میں لے لینے کی ضد کر رہا ہے۔ مگر یہ خیال زیادہ دیر تک برقرار نہیں رہا۔ کسی نے مجھے زور سے ہلایا تھا۔ میں اچھل کر اٹھ بیٹھا جسے میں خواب سمجھ رہا تھا' وہ حقیقت تھی۔ ایک چھوٹا سا معصوم سا بچہ میری ٹانگوں سے تو نہیں لپٹا ہوا تھا مگر میرا کندھا ضرور ہلا رہا تھا۔

"انکل........! انکل!"

"کیا بات ہے؟" میں نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"انکل! یہ ان آنٹی نے دیا ہے۔" اس پانچ چھ برس کے پیارے سے بچے نے میرے سامنے اپنی ہتھیلی کھولی اور دوسرے ہاتھ سے کھڑکی سے باہر کی طرف اشارہ کیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ ٹرین کسی اسٹیشن پر رکی ہوئی ہے۔ میری سرسری نگاہ اس کی ہتھیلی پر پڑی اور میں باہر دیکھنے لگا۔ مگر مجھے یوں لگا جیسے میری نگاہیں اس نرم اور چھوٹی سی ہتھیلی ہی سے چپٹی رہ گئی ہوں۔ میں چونکا' پلٹا اور میں نے بچے کی ہتھیلی کی طرف دیکھا۔ وہاں شالی بابا کا دیا ہوا وہ پتھر چمک رہا تھا جو میں طیب کو دے چکا تھا اور جسے طیب کپڑے میں موم جامہ کر کے اپنے بازو پر باندھ چکا تھا۔ وہی پتھر۔ سیاہ چمکدار پتھر اس وقت بچے کی ہتھیلی پر دھرا تھا اور میرے دماغ میں دھماکے ہو رہے تھے۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ وہاں طیب نہیں تھا۔ میں نے پہلے وہ پتھر اپنی مٹھی میں چھپا لیا پھر کھڑکی سے باہر اس طرف دیکھا جہاں بچے نے اشارہ کیا تھا اور جو اب بھی پُرشوق نگاہوں سے اسی جانب دیکھ رہا تھا۔

"کس نے........ کس نے دیا ہے یہ تمہیں؟"

"وہ وہاں آنٹی تھیں........ ابھی تو تھیں۔"

وہ بچہ کھڑکی کے قریب آ کر خود بھی چاروں طرف دیکھنے لگا۔ سامنے چائے کا ہوٹل

تھا' وہاں لوگ تھے مگر وہ ایسا ہوٹل نہیں تھا کہ وہاں عورتیں بھی جاتیں۔ آس پاس بھی تمام مرد ہی نظر آئے۔

"کہاں ہے بیٹا؟" میں اب اس کے پیچھے کاندھے پر جھک گیا۔ وہ اتنا چھوٹا بچہ تھا کہ وہ کسی بات کا جواب دے ہی نہیں پاتا' اس کی تو خود آنکھوں میں سوال ہی سوال تھے۔ وہ کبھی باہر دیکھتا اور کبھی میری طرف۔ میں باہر ہجوم میں طیب کو بھی تلاش کر رہا تھا۔ کبھی خیال آتا کہ وہ چائے یا کھانے کی کسی چیز کی تلاش میں اترا ہو گا اور کبھی اس پتھر کے ہتھیلی میں چبھتے ہوئے لمس سے بدن میں خوف کی لہر سی دوڑ جاتی۔ لگتا' جیسے زیوسا کو اپنا کام دکھانے کا موقع مل گیا ہے۔ بار بار طیب کا چہرہ کبھی خوف میں لپٹا اور کبھی ہنستا مسکراتا اپنی جانب آتا محسوس ہوتا۔

"پتا نہیں انکل! وہ کہاں گئیں؟" بچہ شاید باہر کے مناظر سے بور ہو گیا تھا۔ "آپ سو رہے تھے نا تو انہوں نے کہا' یہ ان انکل کو دے دو' پھر مجھے چاکلیٹ بھی دیا تھا۔"

وہ اب میری طرف پلٹ گیا۔ "تم.......... تم اکیلے ہو گیا؟"

میں نے ڈبے میں نگاہ ڈالی۔ مجھے ایسی کوئی فیملی نظر نہ آئی جن میں سے کسی کی نگاہ بچے کی طرف اٹھی ہو۔ "نہیں تو.......... میری امی ہیں.......... وہ.......... وہ رہیں۔" وہ ذرا اچکا اور اس نے چھوٹے سے پارٹیشن کے دوسری طرف بیٹھے ہوئے کچھ لوگوں کی طرف اشارہ کیا۔ ان میں دو عورتیں بھی تھیں۔ "ادھر آؤ کیلاش!"

عورت کی آواز پر میں چونک اٹھا۔ وہ بچہ بھاگتا چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی مجھ پر گھبراہٹ کا دورہ سا پڑ گیا۔ میں دوسری جانب کھڑکی میں گیا مگر اس طرف پلیٹ فارم نہیں تھا پھر بھی میں نے دور لگے نلکے پر پانی بھرتے لوگوں کو غور سے دیکھا۔ ان میں طیب نہیں تھا۔ میں بھاگ کر واش روم کی طرف گیا۔ میں نے بے ساختہ اس پر دستک دی۔ طیب کو آوازیں دیں مگر جواب میں ایک خرانٹ سی "ہوں!" کے سوا کچھ سنائی نہیں دیا۔ گھبراہٹ' مایوسی اور خوف نے مجھے بے حال کر دیا۔ میں پھر دوڑ کر کھڑکی پہ چلا آیا جو پلیٹ فارم کی طرف تھی۔

عین اسی لمحے ٹرین نے وسل دی۔ میرے پسینے چھوٹ گئے۔ طیب کا دور دور تک کہیں پتا نہیں تھا۔ کوئی میرے دل میں چٹکیاں سی بھر رہا تھا۔ میری پیشانی عرق آلود ہو چکی تھی۔ اب تو ٹانگوں میں کھڑے رہنے کا دم بھی نہیں تھا۔ میں سیٹ پر بیٹھ گیا۔ نڈھال ہو

کر میں نے اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور نگاہ باہر جما دی۔ لوگوں کا رش تھا۔ ٹرین پھر وسل دے رہی تھی۔ لوگ ٹرین کی طرف بھاگ رہے تھے مگر ان میں کہیں بھی طیب نہیں تھا۔ میرا جی چاہا کہ ٹرین سے اتر جاؤں۔ میں اسٹیشن کے پکے فرش پر جا بیٹھوں یا پھر اس کے چاروں طرف بھاگوں اور طیب کو زور زور سے آوازیں دوں۔

اچانک ایک جھٹکا لگا اور ٹرین نے رینگنا شروع کر دیا۔ میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ کھڑکی پر جھکا اور باہر دیکھنے لگا۔ اسی وقت میری نگاہ ایک برقعہ پوش عورت پر پڑی جو میری ہی طرف دیکھ رہی تھی اور مسکرا رہی تھی۔ پہلے تو میں اسے اپنا وہم سمجھا۔ میں نے دائیں بائیں کی کھڑکیوں کی طرف دیکھا' وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ مجھے ہی دیکھ کر مسکرا رہی ہے۔ اب میں نے اس پہ نگاہ جما دی۔ اس نے ہاتھ اٹھایا اور ہلانے لگی جیسے مجھے خدا حافظ کہہ رہی ہو۔ میری گدی پر پسینا رینگ گیا۔ حلق خشک ہو گیا۔ کانٹے سے اگتے محسوس ہوئے۔ حلق میں بھی اور سینے میں بھی۔ اب میں نے فیصلہ کر لیا کہ مجھے اتر جانا چاہئے۔ میں طیب کو یہاں کی مصیبت میں پھنسا کر کیسے جا سکتا تھا؟ میں نے پلٹ کر تیزی سے اپنا بیگ اٹھایا۔ اسی وقت میری نگاہ طیب کے بیگ پر پڑی۔ میں نے وہ بھی اٹھا لیا اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔ ٹرین کی رفتار تیز ہو چکی تھی اور میں اس کے مزید تیز ہونے سے پہلے کود جانا چاہتا تھا۔ میں جھٹکے سے دروازے پہنچا' ایک ہاتھ میں لوہے کی گول سلاخ تھامی اور اپنے قدم جمانے لگا۔ میں رفتار کا اندازہ بھی کر رہا تھا تاکہ کود سکوں۔

"ارے ارے بھیا! کیا ہوا..........؟"

اس آواز نے میرے ہوش اڑا دیئے۔ میں آدھا باہر کی طرف لٹک گیا۔ میں کودنا چاہتا تھا اور آواز نے لوہے کی سلاخ پر میری گرفت سخت کر دی تھی۔ ہاں.......... وہ طیب کی آواز تھی۔ اس نے مجھے نہ تھام لیا ہوتا تو میں گر چکا ہوتا اور پلیٹ فارم پہ نہیں بلکہ پٹڑیوں پہ جا گرا ہوتا بلکہ اب تک تو ہوتا بھی نہیں۔ ٹرین کا پورا ڈبا میری نگاہوں میں گول گول گھوما اور پھر اچانک ساکت ہو گیا۔ طیب مجھے ایک ہاتھ سے تھامے کھڑا تھا۔ دوسرے ہاتھ میں بڑے بڑے پتوں میں کچوریاں مسالہ تھا۔

"کہاں تھے تم؟" میں نے پھٹی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"بابا..........! ذرا دیر ہو گئی تھی۔ ٹرین رینگنے لگی تب بھاگا۔ ابھی ابھی تو چڑھا

تھا۔ بھوک اتنی لگ رہی تھی مگر.........." وہ ایک دم چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔ "مگر تم.......... تم کیا کرنے جا رہے تھے؟ خودکشی..........؟"

"بہت بے وقوف ہو تم۔" میں نے دانت کچکچائے اور جھٹکے سے اپنا بازو چھڑا کر اپنی سیٹ کی طرف بڑھا۔

"پرانی بات ہے۔" وہ میرے پیچھے آتے ہوئے بولا۔ "ویسے یار ہوا کیا؟ ایسی کون سی بات ہو گئی کہ تم خودکشی پر مجبور ہو گئے تھے؟"

میں نے اپنا اور اس کا ہینڈ بیگ اوپر برتھ پر رکھا اور جھٹکے سے بیٹھ گیا۔ وہ میرے برابر میں آ بیٹھا۔

"او، کچوری کھاؤ۔ بہت مزے کی ہے۔ میں نے کھالی تھی۔ پیٹ بھر گیا مگر دل نہیں بھرا اس لئے اپنے لئے بھی لے آیا۔ لو کھاؤ۔"

میں ابھی تک سنبھل نہیں پایا تھا۔ اس کے اس انداز سے اور چڑ گیا۔ جی چاہا کہ مکا مار کر اس کا چلتا ہوا جبڑا توڑ دوں۔ اس نے میری طرف قطعی دھیان نہ دیا بلکہ پوری دل جمعی سے کچوریاں کھاتا رہا۔ اسے دیکھ دیکھ کر میرا بھی جی چاہنے لگا تھا مگر میرا ذہن اس پتھر میں چپک کر رہ گیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے کیسے بات کروں۔ یہ اندازہ تو مجھے ہو گیا تھا کہ اس کے ساتھ کوئی انہونا واقعہ پیش نہیں آیا اور جیسا کہ میرا خیال تھا کہ وہ پتھر اس والا ہو گا تو یہ بات بھی اب غلط لگ رہی تھی۔ میں کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ ایک پتھر میں رابرٹ کو دے چکا تھا اور دوسرا طیب کو۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا جو پتھر مجھے منے نے لا کر دیا ہے' وہ کون سا ہے؟ طیب والا یا رابرٹ والا..........؟

"طیب!" میں نے اسے منہمک دیکھ کر آواز دی۔

"ہوں!" وہ کچوری چباتے ہوئے مجھے دیکھ کر بولا۔

"وہ.......... پتھر کہاں ہے؟"

"کون سا پتھر؟"

"شالی بابا والا.......... موم جامہ کیا تھا نا!"

"ہوں.......... ہوں.........."

اس نے اپنے بازو کی طرف اشارہ کیا۔ منہ میں کچوریاں بھری تھیں۔ میں نے اس کا بازو ٹٹولا۔ پتھر موم جامہ کیا موجود تھا۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور وہ پتھر نکال لیا جو

مجھے منے نے دیا تھا۔ طیب کی نگاہ اس پر پڑی' پہلے تو اس نے سرسری نگاہ ڈال کر ہٹائی مگر دوسرے ہی لمحے وہ اچھل پڑا۔ اس نے کچوری کا نوالہ چبائے بغیر نگل لیا اور بولا۔

"یہ.......... یہ کہاں سے آیا؟" اس کے ساتھ ہی اس نے اپنا بازو ٹٹولا اور وہاں پتھر موجود دیکھ کر مطمئن ہو گیا۔

میں نے اسے ساری داستان سنائی۔ وہ حیرت سے مجھے تکتا رہا۔ "وہ کون ہو سکتی ہے؟ اور.......... کیا پتا یہ نقلی ہو۔"

اس کی بات سنتے ہی میں نے اسے غور سے دیکھا۔ اس میں اور اصل میں کوئی فرق نہیں تھا مگر یہ اس وقت چمکدار اور سخت پتھر ہی کی شکل میں تھا۔ میں نے چاہا کہ اسے ویسا دیکھ سکوں جیسا کہ اصل پتھر کو دیکھ چکا تھا۔ نرم' بہت سی نسوں والا۔ زندہ دھڑکتا ہوا مگر وہ ایسا نہ ہو سکا پھر بھی مجھے نہ معلوم کیوں اس کے اصلی ہونے کا یقین تھا۔ میں نے اسے احتیاط سے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا۔

"سنو ضیاء!" طیب نے رومال سے منہ پونچھتے اور میرے حصے کی کچوریاں ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ بھی تو ہو سکتا ہے نا کہ اسے تم تک پہنچانے والے شالی بابا ہوں۔"

"نہیں.......... میں نے اس برقعہ پوش عورت کو دیکھا تھا۔"

"ہاں.......... وہ تو ٹھیک ہے مگر اس کے ذریعے تم تک تو پہنچا تو سکتے ہیں نا.........."

"ہو سکتا ہے۔" میں پُرسوچ انداز میں بولا۔ "اس کا مطلب ہے کہ سفر میں کہیں نہ کہیں دشواری آنے والی ہے۔" میں زیرِ لب بڑبڑایا۔

"ہیں.......... کیا؟"

تب میں نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ "یار! تم اس مصیبت سے نجات کیوں نہیں پا لیتے؟ ان زنجیروں کو چاٹو گے کیا؟ جو مر گئے' سو مر گئے۔ اب مزید عذاب کیوں مول لیتے ہو!"

بات وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ میں ان چکروں سے خود بھی تنگ آ گیا تھا۔ پے در پے ہونے والے واقعات اور حادثات نے مجھے بھی سن کر دیا تھا۔ سارا ولولہ' سارا جوش اور سارا انتقام' بے زاری میں تبدیل ہو گیا تھا۔

"شمالی بابا سے مل کر سوچیں گے۔" میں نے گہرا سانس لے کر خود کو کافی حد تک سنبھالا اور پکوڑیاں کھانے لگا۔

"ہاں! تم پکوڑی کھاؤ۔ بڑے مزے کی ہیں۔" وہ سیٹ پر نیم دراز ہو گیا۔ ہمارے حصے میں اب میرے اور طیب کے سوا کوئی نہیں تھا۔ بچے کے ساتھ کی فیملی دوسرے حصے میں تھی۔ یہاں والا مراٹھی راستے میں کہیں اتر چکا تھا۔ میں بھی سیٹ پر لیٹ گیا۔ ٹرین تیز رفتاری سے بنجر علاقے عبور کر رہی تھی۔

"طیب سنو! میں کچھ دیر کو سوؤں گا۔ تم کہیں نہیں جاؤ گے سمجھے' نہ پکوڑیاں لینے نہ کچھ اور........"

"ہاں! ہاں! میں نے بندوبست کر لیا ہے۔ یہ دیکھو۔" اس نے جانے کہاں سے ایک کتاب نکال کر دکھائی۔ "تم سو جاؤ۔ میں یہ پڑھوں گا۔"

میں نے مطمئن ہو کر آنکھیں موند لیں حالانکہ میں کچھ دیر پہلے ہی سو کر اٹھا تھا' ذہن اب بھی بوجھل تھا۔ نیند آنکھوں میں چبھ رہی تھی۔ ٹرین کے ہچکولے اچھے لگ رہے تھے۔ میں سو گیا۔

طیب نے مجھے اٹھایا تو سورج غروب ہونے والا تھا۔ وہ کہیں سے تھرماس بھر چائے لے آیا تھا۔ غالباً یہ تھرماس بھی اس نے خریدا ہو گا۔ چائے کی شدید طلب تھی۔ میں نے منہ پر پانی کے چھپاکے مارے اور چائے پینے لگا۔ طیب کو اچانک جیہ یاد آ گئی تھی۔ وہ جیہ کی باتیں کرتا رہا۔ بتاتا رہا کہ اس نے اظہار محبت تو نہیں کیا مگر اسے یقین تھا کہ اس سے محبت کرنے لگی ہے۔

"اظہار کے بغیر تمہیں کیسے پتا چلا؟" میں نے یونہی چھیڑا۔

"اس کی آنکھیں بولتی ہیں۔" وہ فوراً بولا۔

"تم کیسے سن لیتے ہو؟ کیا تمہارے کان بجتے ہیں؟" میں ہنسا۔

"تم غلط محاورہ استعمال کر رہے ہو۔"

"تم پروا مت کرو۔ بامحاورہ زبان پر مجھے عبور حاصل نہیں ہے۔"

"اسے دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے اس کی آنکھوں میں وارفتگی ہو۔ خود سپردگی کی خمار آلود کیفیت مجھے اس کی جانب کھینچنے لگتی ہے اور شدید محبت کی یہی نشانی ہوتی ہے۔"

"اور مونیکا کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"ہاں! چاہتی تو وہ بھی ہے مجھے مگر یار..........! وہ.......... اس کے بارے میں تو تم کہہ رہے تھے کہ اس کی ڈبی.......... نہیں! نہیں! وہم ہو گا تمہارا۔ اس کا بھلا زیوسا سے کیا تعلق! اسے تو میں بہت عرصے سے جانتا ہوں۔"

"کتنے عرصے سے؟" میں نے چائے کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے پوچھا۔

"پتا ہے! ایک ماہ پہلے میں نے اسے اس ریستوران میں دیکھا۔" وہ یوں کہہ رہا تھا جیسے ایک ماہ نہیں' ایک سال یا ایک صدی کی بات کر رہا ہے۔

"اور زیوسا میرے ساتھ بچپن سے لگی ہوئی ہے۔"

"اچھا یار! چھوڑو یہ باتیں' مجھے تو اس تجسس سے اب تکلیف ہونے لگی ہے۔ جو ہو گا' سامنے آ جائے گا۔ ویسے میرا مشورہ یہی ہے کہ جان چھڑاؤ۔ زندگی میں بڑی رنگینیاں ہیں۔ بڑے مزے ہیں۔"

"ہاں! تھک تو میں بھی گیا ہوں۔" میں نے سر سیٹ کی پشت سے لگا دیا۔

رات ہو چکی تھی۔ چند گھنٹے باقی تھے۔ ہم نے جو ٹرین لی تھی' وہ صبح چار بجے ہمیں دہلی پہنچانے والی تھی۔ اب تک سفر عافیت سے کٹا تھا۔ میری خواہش تھی کہ مزید سفر بھی سکون سے کٹ جائے۔ اب طیب جھکولے کھا رہا تھا۔ اس پر غنودگی طاری تھی۔ وہ تھوڑی دیر بیٹھا اونگھتا رہا پھر نیچے سرکتے سرکتے لیٹ گیا۔

"وہ کتاب مجھے دے دو۔" میں نے اسے چھو کر جگایا۔

"وہاں ہے۔" اس نے بیگ کی طرف اشارہ کیا۔

بیگ کے اوپر ہی کتاب رکھی تھی۔ میں وہ لے کر لیٹ گیا۔ عجیب فضول سا رومانی ناول تھا۔ کسی بہت ہی بے وقوف مصنف کا لکھا ہوا مگر وقت گزارنے کے لئے اسے پڑھنا ہی پڑا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ بیٹھ کر کھڑکی سے باہر تاریک فضاؤں میں گھوروں اور سوچوں کے بھنور میں ڈولتا پھروں' سو کسی نہ کسی طرح وہ پڑھتا ہی چلا گیا۔ اب ڈبے میں سکون چھایا ہوا تھا۔ بچے والی فیملی بھی شاید سو چکی تھی یا اونگھ رہی تھی۔ سناٹا چھایا ہوا تھا کہ اچانک لگا ڈبے میں قیامت آ گئی ہو۔ طیب اتنی ہی زور سے چیخا تھا کہ میں ہی نہیں' وہ سب بھی ہڑبڑا کر اٹھ گئے۔

"کیا بات ہے.......... طیب.......... طیب..........!" میں نے اسے جھنجوڑ دیا۔ وہ آنکھیں بند کئے چیخ رہا تھا۔

''وہ......... وہ......... ضیاء.........! کسی نے......... ابھی ابھی......... دادا ابو کو قتل کر دیا۔''

میں سناٹے میں رہ گیا۔ دوسری جانب کا مرد اور لڑکا بھی اٹھ کر ہمارے قریب آ گئے تھے اور اس ہنگامے کی وجہ جاننا چاہتے تھے کہ طیب کی بات سن کر حیران ہو گئے۔ عورتیں سر اچکائے ادھر ہی دیکھ رہی تھیں۔ بچہ بھی اٹھ چکا تھا اور خوفزدہ تھا۔

''پاگل ہو تم......... خواب دیکھا ہے تم نے.........'' میں نے ان سب کے چہروں پر حیرانی دیکھ کر کہا۔

''نہیں......... یہ خواب نہیں تھا۔'' طیب نے اپنے لہجے میں وزن پیدا کرتے ہوئے کہا پھر ان لوگوں کی شکلیں دیکھ کر ایک دم چپ ہو گیا۔ اسے احساس ہوا کہ اسے ایسی باتیں ان لوگوں کے سامنے نہیں کرنا چاہئیں۔ وہ جھینپ گیا پھر کھسیا کر بولا۔

''ہاں......... شاید......... میں خواب دیکھ رہا تھا۔''

''شاید نہیں' یقیناً' تم خواب دیکھ رہے تھے۔ تم یہاں ٹرین میں ہو اور سو رہے تھے جب کہ دادا دہلی میں ہیں۔'' میں نے طیب کو گھورتے ہوئے کہا پھر پلٹا۔

''آئی ایم سوری!'' میں نے ان لوگوں سے معذرت کی۔ وہ لوگ پلٹ گئے مگر طیب کے چہرے پر دہشت اور خوف چھا گیا۔ ان لوگوں کے جاتے ہی اس نے سرگوشی کی۔

''ضیاء.........! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ دادا ابو تمہیں بلا رہے تھے اور بار بار کہہ رہے تھے' جلدی پہنچو......... ورنہ کبھی گھر نہیں پہنچ پاؤ گے۔''

''میں اڑنا نہیں جانتا۔'' میں نے جھنجلا کر جواب دیا۔ ''جب ٹرین پہنچائے گی تو پہنچوں گا۔''

''اور......... ضیاء.........! میں نے خواب میں ان کے قریب ایک بھیڑیا نما انسان دیکھا تھا۔ وہ للچائی ہوئی نگاہوں سے دادا ابو کو دیکھ رہا تھا۔ ایسے جیسے گدھ مرتے ہوئے آدمی کے مرجانے کا انتظار کرتا ہے۔''

''تم خواب دیکھ رہے تھے۔'' میں نے جواب دیا۔

''ہاں! خدا کرے' یہ خواب ہی ہو۔'' وہ بڑبڑایا مگر اس کا خوف کم نہیں ہوا۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ تین بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔ اب سفر کم رہ گیا تھا۔ میں کھڑکی سے باہر دور نظر آتی ہوئی روشنیوں کو دیکھنے لگا جو جگنوؤں کی طرح ٹمٹما رہی تھیں۔ ''دہلی آنے والا ہے۔''

طیب جلدی سے کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔ برابر والی فیملی بھی اب اترنے کی تیاری کر رہی تھی۔

اور پھر حیرت انگیز طور پر سفر بخیر و عافیت ختم ہو گیا۔ ہم دہلی پہنچے تو وہاں اسٹیشن کی رونق نے بڑی ڈھارس بندھائی۔ وہاں سے ہمیں گھر پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ دروازے پر ٹیکسی رکی تو میرے اندر عجیب سی بے چینی پھیل گئی۔ گھر کے اندر بڑی روشنی تھی۔ صحن کی روشنی دیواروں کو پھاند کر سڑک تک پہنچ رہی تھی۔ تمام کمروں کی ساری کھڑکیاں روشن تھیں جب کہ ایسا ہونا نہیں چاہئے تھا۔ اماں سونے سے پہلے تمام بتیاں بجھا کر سوتی تھیں۔ پورے گھر میں کہیں کوئی ایک بجلی جلتی رہتی تھی مگر اس وقت تو یوں لگ رہا تھا جیسے پورا گھر جاگا ہوا ہو۔ طیب ٹیکسی والے کو کرایہ دینے لگا اور میں لپک کر دروازے پر پہنچ گیا۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ یہ دستک کافی تیز تھی۔

دوسرے ہی لمحے دروازہ کھل گیا۔ سامنے عصمت آپا کھڑی تھیں۔ ان کے چہرے پر پریشانی تھی۔ ''تم......... جلدی آؤ۔'' وہ ایک دم پلٹ گئیں۔

میں تقریباً دوڑتا ہوا اس طرف بڑھا جہاں میں نے اماں' دادی اور گھر کے دوسرے افراد کو دیکھا تھا۔ وہ سب دادا کے کمرے میں جمع تھے۔

''کیا ہوا اماں؟'' میں نے اندر داخل ہوتے ہی روتی ہوئی اماں سے پوچھا اور لپک کر دادا کے قریب پہنچ گیا جن کا سفید چہرہ مجھے دہلا گیا۔ پہلی نگاہ میں مجھے لگا جیسے وہ ہم سب کو چھوڑ کر جا چکے ہیں مگر میں نے ان کی نبض دیکھی' پھر مجھے احساس ہوا کہ ان کا سانس بہت آہستہ چل رہا ہے مگر وہ زندہ تھے۔

''ڈاکٹر کو بلایا ہے؟'' میں نے پلٹ کر عصمت آپا سے پوچھا۔ کونے میں دادی بیٹھی رو رہی تھیں۔ میں ان کے قریب چلا گیا۔

''دادی اماں......... وہ ٹھیک ہیں۔'' میں نے دھیرے سے تسلی دی۔ عصمت آپا نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

اتنی دیر میں طیب بھی اندر آ چکا تھا۔ وہ بھی یہ سب دیکھ کر پہلے وہی سمجھا جو میں سمجھا تھا مگر میں نے فوراً ہی اسے تسلی دلائی۔ اشارے سے بتایا کہ دادا ٹھیک ہیں۔ میں ڈاکٹر کا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ منے دادا گاڑی لے آئے تھے۔ میں اور طیب دادا کو اٹھا کر

گاڑی تک لے گئے۔ میں انھیں اسپتال لے جانا چاہتا تھا۔ عین اسی وقت فیملی ڈاکٹر
گاڑی آ کر رکی۔ اس نے دادا کو گاڑی ہی میں چیک کیا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں انھیں
اسپتال لے جا رہا ہوں۔ اس نے سر ہلایا اور بولا۔

"ٹھیک ہے چلیں.......... میں بھی ساتھ چل رہا ہوں۔"

ہم گاڑی میں بیٹھ گئے۔ ڈاکٹر اپنی گاڑی میں ہمارے پیچھے روانہ ہو گیا۔

دادا کو بے حد کمزوری تھی۔ ڈاکٹر حیران تھے کہ وہ تنفس کو کیسے برقرار رکھے ہوئے
ہیں۔ ان کی عمر، حالت اور بیماری ایسی تھی کہ جس میں اکثر حوصلہ بیٹھ جاتا ہے۔ ڈاکٹروں
کے مطابق ان کے پھیپھڑے زخمی تھے۔ جگر بڑھ چکا تھا۔ خون میں سرخ خلیوں کی تعداد
کم ہو چکی تھی۔ ذہن کام نہیں کر رہا تھا۔ بینائی بہت کم ہو چکی تھی مگر وہ زندہ تھے۔ وہ
ہم نے اسپتال میں گزارا۔ میں نے طیب کو رات گئے گھر بھیج دیا کہ عورتوں کو تسلی دے
انھیں ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ وہ کبھی کبھی چونک کر آنکھیں کھولتے اور یوں خلاؤں میں تکتے
جیسے ان کے سامنے کوئی منظر نہ ہو۔ میں نے بہت چاہا کہ انھیں اپنی جانب متوجہ کروں۔
انھیں آوازیں دیں۔ بتایا کہ میں آ گیا ہوں مگر لگا جیسے انھیں کچھ سنائی ہی نہیں دے رہا۔
اسپتال کا ایم ایس او بار بار آ کر دیکھتا رہا۔ اس نے ایک سینئر ڈاکٹر کی ڈیوٹی لگا دی تھی، جو
بھی بار بار چیک کرتا۔ مجھے اس نے صاف طور پر کہہ دیا تھا کہ میں صبر کر لوں۔ وہ اس
حالت میں زندگی کی حد پار کر چکے ہیں۔

مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا تھا مگر میری خواہش تھی کہ ایک بار دادا ہوش میں
آ جائیں۔ مجھے بتا دیں کہ وہ میرا انتظار کیوں کر رہے تھے۔ مجھے بتائیں کہ شالی بابا انھیں
ملے تو انھوں نے کیا کہا تھا۔ آپ کہیں گے کہ یہ میری خود غرضی تھی۔ ہاں.......... یقیناً
تھی۔ ہر آدمی اتنا ہی خود غرض ہوتا ہے۔ رشتے اپنی حیثیت کھو دیتے ہیں۔ اجنبیت کی
دیوار آدمی کے جذبوں کو سلا دیتی ہے اور پھر دادا تو اپنی عمر کو پہنچ چکے تھے۔ آدمی کا جوان
بیٹا بھی دم توڑ رہا ہو تو اس کے وجود میں آخری لمحات برف کی طرح پگھل کر اس کی
ٹھنڈک کو منجمد کر دیتے ہیں۔ وہ ساکت تھے۔ ان کا ہلکا سا تنفس مجھے بے چین کیے ہوئے
تھا۔ میں پورا سگریٹ کا پیکٹ پھونک چکا تھا۔ یہ دن مجھے بالکل ویسا ہی لگ رہا تھا جیسا کہ
اس سے قبل میں ان کے ساتھ اسپتال میں گزار چکا تھا۔ وہی سناٹا.......... وہی بے چینی
اور وہی کچھ انہونی ہونے کا دھڑکا۔ اسپتال میں دھیرے دھیرے سناٹا اترنے لگا۔ آوازیں

معدوم ہو گئیں۔ میرا دم حلق میں آ گیا۔ پہلے بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ بالکل ایسا ہی.......... یہ
اسرار تھا اور اسے ہونا ہی تھا۔ میں اس کا منتظر تھا مگر..........

باہر سے آنے والی آہٹ نے سب کچھ ختم کر دیا۔ وہ سناٹا، وہ عجیب سی گھٹن آمیز
فضا، وہ دھڑکا سب کا سب ختم ہو گیا جیسے ہوا میں تحلیل ہو گیا ہو۔ باہر سے آتے ہوئے
قدموں کی چاپ میرے قریب آ رہی تھی۔ پھر مجھے نرس کی آواز سنائی دی۔

"ان کا پوتا ان کے پاس ہے۔"

"کون..........؟" یہ مردانہ اور بھاری آواز تھی۔

"پتہ نہیں، نام نہیں جانتی۔"

پھر دستک سنائی دی۔ دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ بند نہیں تھا۔

"آ جائیے۔" میں نے سگریٹ فرش پر پھینک کر جوتے سے رگڑتے ہوئے کہا۔

پھر میں حیران رہ گیا۔ میرے سامنے نرس تھی اور اس کے پیچھے شالی
بابا.......... "شالی بابا! آپ..........؟" میں لپک کر آگے بڑھا۔

وہ دھیرے سے مسکرائے پھر پلٹ کر نرس کو دیکھا۔ نرس چلی گئی۔ میں نے کرسی
گھسیٹ کر دادا کے بیڈ کے قریب کر لی۔ "میں آپ سے ملنے کو سخت بے چین تھا۔"

"اور پھر بھی فضول خرافات میں پڑے رہے۔" ان کے لہجے میں ناراضگی تھی۔

"کچھ عجیب سا چکر چل پڑا تھا۔" میں خجل ہو گیا۔

"سب بکواس ہے۔ وہ عورت بہت مکار ہے۔ مجھے افسوس یہ تھا کہ تم ایک
چھچھوری عورت کے تماشوں میں گم ہو کر رہ گئے ہو۔"

"میں اصل حقیقت جاننا چاہتا تھا شالی بابا!"

"کیا ایک شعبدے باز عورت تمھیں حقیقت سے روشناس کرا سکتی ہے؟" انھوں
نے ہنکارا بھر کر کہا۔ "وہ بچوں سے آنکھ مچولی کا کھیل کھیل رہی ہے۔" اتنا کہہ کر انھوں
نے دادا کے سینے پر دایاں ہاتھ رکھ دیا اور منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگے۔

میں ساکت بیٹھا دادا کو دیکھتا رہا۔ میں نے محسوس کیا کہ ان کا تنفس دھیرے
دھیرے تیز ہو رہا ہے۔ ان کے پیلے چہرے پر ہلکا سا گلابی پن پھیل گیا۔ دس منٹ، دس
صدیوں کی طرح سینے پر بھاری دھمک پیدا کرتے ہوئے گزرنے لگے۔

دس منٹ بعد شالی بابا نے ہاتھ اٹھا لیا پھر مجھے دیکھ کر مسکرائے۔ "ہندوستان

جادوگروں کی سرزمین ہے ضیاء بیٹا.........!"

"اسرار تو پوری دنیا میں ہیں بابا!" میں نے دھیرے سے کہا۔

"ہاں.........کچھ تو خدا کی قدرت ہے مگر اکثر انسان پستی میں گر کر شعبدے بازی شروع کر دیتا ہے۔ ذرا سا علم حاصل کر لے تو کم ظرفی اسے ہضم نہیں کرنے دیتی اور وہ اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آتا ہے۔ تمہیں پتا ہے.........جب انسان بلندیاں طے کرتا ہے تو پستی کے فاصلے اس میں خوف بھر دیتے ہیں اور یہ خوف بلندی کے ساتھ ساتھ بڑھتا چلا جاتا ہے مگر ایسا صرف تب ہی ہوتا ہے جب اس انسان کو اپنے بلندی پر پہنچنے کا غرور ہو جائے۔ جو لوگ بے خوف و خطر' بے غرض بلندیاں طے کرتے ہیں۔ وہ نگاہ پستی پر نہیں ڈالتے۔ وہ انجام سے بے پرواہ ہو کر آگے بڑھتے ہیں۔ تب ان کے اندر حوصلے ہی حوصلے ہوتے ہیں' خوف جگہ نہیں بنا پاتا۔ دنیا سے مختلف بن جانے کا خبط' دوسروں پر دسترس حاصل کرنے کا گھمنڈ' علم حاصل کر لینے کا غرور اس میں حرص و ہوس کے خزانے بھر دیتا ہے۔ تب وہ نہیں سوچتے کہ بلندیاں دو طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو پستیوں کا خوف بن جاتی ہیں اور دوسری؛ وہ جو تمام عالم کو منظر بنا کر ان کے سامنے پیش کر دیتی ہیں۔ حوصلے جگمگا دیتے ہیں جبکہ خوف مرجھا دیتا ہے۔"

وہ پتا نہیں کیا کہہ رہے تھے اور کیوں کہہ رہے تھے۔ بس بول رہے تھے اور ان کی آنکھوں کی سرخی بڑھتی جا رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے انہیں کسی پر غصہ ہے۔ بے پناہ غصہ.........اچانک دادا دھیرے سے کراہے' میں اور شالی بابا چونک کر ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ عین اسی لمحے مجھے خیال آیا کہ بابا سے اس پتھر اور برقع پوش عورت کے متعلق استفسار کروں مگر دوسرے ہی لمحے میرے ذہن سے یہ بات نکل گئی کیونکہ دادا آنکھیں کھولے مجھے دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں کوئی تاثر نہ تھا۔

"دادا.........کیسے ہیں آپ.........؟" میں ان پر جھک گیا۔

شالی بابا نے دادا کی آنکھوں میں دیکھا پھر اپنا ہاتھ ان کے سینے پر رکھ دیا۔ چند ہی ثانیے بعد دادا کی آنکھوں میں پہچان پیدا ہو گئی۔ ان کے لب ہلے اور وہ بے۔

"ضیاء.........!ضی.........یا.........!"

"جی دادا.........!میں ہوں.........ضیاء.........!"

"تم نے اتنی دیر لگا دی۔" ان کی آنکھیں نم ناک ہو گئیں۔

"دادا! میں آنا چاہتا تھا مگر........."

"اب آ گیا ہے یہ........."

شالی بابا نے میری بات کاٹ دی۔ مجھے احساس ہوا کہ شالی بابا مجھے کچھ بتانے سے روکنا چاہتے ہیں۔ میں چپ ہو گیا۔ دادا نے چونک کر شالی بابا کو دیکھا۔

"آپ.........آپ.........نے کہا تھا' ضیاء کو کچھ نہیں ہو گا۔" دادا کی آواز بھر گئی۔ ان کے لہجے میں شکایت تھی۔

"میں نے ٹھیک کہا تھا' آ گیا ہے یہ.........اسے کچھ نہیں ہوا۔ سب شعبدے بازی ہے۔ وہ نقصان نہیں پہنچا سکتی۔" شالی بابا نے پہلے دھیرے اور نرمی سے کہا مگر آخری جملہ کہتے کہتے ان کی آنکھوں کی سرخی پھر بڑھ گئی۔

میں نے دادا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دھیرے سہلایا۔ "میں بالکل ٹھیک ہوں دادا۔ آپ فکر نہ کریں۔"

"اب تم بالکل ٹھیک ہو۔ سو جاؤ.........سو جاؤ تم......... تمہیں ذہنی سکون کی ضرورت ہے۔"

"تمہارے دادا' تمہارے لئے فکر مند تھے۔ وہ انہیں بھی پریشان کر رہی تھی۔" شالی بابا نے باہر آ کر کہا اور دادا کے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔

"وہ کون ہے شالی بابا؟ وہ ہمیں پریشان کیوں کر رہی ہے؟"

"تم نے ضد کیوں باندھ لی ہے۔ تم ہر ایک سے ٹکر نہیں لے سکتے۔"

"مگر وہ.........وہ سب کو پریشان کر رہی ہے۔" میں نے غصے میں کہا۔ میری آنکھوں میں رابرٹ کا خوفناک روپ اور کانوں میں جینو کی سسکیاں گونجنے لگیں۔

"ان لوگوں کا عمل درست تھا کیا؟" شالی بابا نے نرمی سے پوچھا۔

"کن لوگوں کا؟"

"رابرٹ وغیرہ کا.........معاف کرنا بیٹا.........!میں نے عطا سے کہا تھا کہ اسے یہ سب نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"ٹھیک ہے بابا.........!لیکن مبشر کا کیا قصور تھا؟ تایا نے کیا کیا تھا؟ منشی کی بیٹیوں اور تحسین خالہ نے کب نقصان پہنچایا ہے اور پھر بڑی بوا.........؟"

"ضیاء.........تم بات کو سمجھ نہیں رہے ہو۔ جب تمہیں پتہ چلے گا کہ اصل بات

کیا ہے تو......... تو.........؟"

وہ ادھوری بات چھوڑ کے رک گئے۔ میں نے اپنے اندر بے چینی محسوس کی۔

"کیا بات ہے بابا؟"

"بیٹا! تم نے معصومیت میں ایک بہت بڑی غلطی کر دی ہے۔"

"کیسی غلطی؟"

"وہ زنجیر......... وہ تمہارے پیچھے پڑ چکی ہے ضیاء......... اور تم ایک بڑے عذاب میں گھر گئے ہو۔"

"وہ کون ہے؟"

"میں کروں گا کچھ......... ورنہ......... سب ختم ہو جائے گا۔" وہ بڑبڑائے۔

مجھے یوں لگا جیسے وہ عالم غنودگی میں چلے گئے ہوں۔ ان کی آواز گہرے کنوئیں سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

"بابا......... بابا......... آپ میرا خوف بڑھا رہے ہیں۔ مجھے حوصلے کی ضرورت ہے اور سنیں........." اچانک مجھے اس پتھر کا خیال آیا۔ "بابا! کیا ٹرین کے سفر میں آپ نے مجھے یہ بھیجا تھا۔" اتنا کہہ کر میں نے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا جس میں وہ پتھر رکھا تھا مگر میرا ہاتھ خالی واپس آ گیا۔

"کیا؟" وہ ایک دم ہراساں ہو گئے۔

"وہ......... وہ پتھر تھا......... ویسا ہی جیسا........." میں نے اپنی ساری جیبیں دیکھ ڈالیں اور ساتھ ہی میری نگاہ شانی بابا کے چہرے پر پڑی۔

ان کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ وہ میری پشت پر دادا کے کمرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہرے کا رنگ پیلا ہو چکا تھا۔ یوں لگا جیسے انہوں نے میرے پیچھے کوئی خوفناک چیز کو دیکھ لیا ہے۔ میں جھٹکے سے مڑا اور پھر اس سے پہلے کہ میں کچھ کرتا میرے سر پر جیسے پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ میرا ذہن گہرے اندھیروں میں ڈوبنے لگا اور میں جیسے کسی گہری سرنگ میں گرنے لگا۔ گرتے گرتے میں نے بے پناہ شور کی آوازیں سنیں۔

آخری آواز شانی بابا کی تھی جو دادا کو پکار رہے تھے۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنی بند ہوتی آنکھیں کھول کر اور ہاتھ پاؤں چلا کر خود کو سنبھالنا چاہا۔ آنکھیں کھلتے ہی تیز روشنی کا جھماکا ہوا۔ سامنے کھڑی لڑکی وہی تھی جسے میں نے اور طیب نے پہلی بار اپنے

والی کوٹھی میں دیکھا تھا۔

پھر اس لڑکی نے ایک دم مجھے تھامنا چاہا مگر میں نے دیکھا کہ شانی بابا میرے اور اس کے درمیان آ گئے......... اور پھر میں......... اندھیروں میں ڈوب گیا۔

ہوش آیا تو گھر پہ تھا۔ زہرہ آپا اور بی جان میرے قریب بیٹھی تھیں۔ گھر کا کوئی دوسرا فرد کمرے میں نظر نہیں آ رہا تھا مگر باہر بہت سے لوگوں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ مخصوص سا لہجہ تھا جیسے سب مل کر کچھ پڑھ رہے ہوں۔ میں نے آنکھیں موند کر باہر کی آوازوں پر غور کیا تو میرے بدن میں سنسنی سی پھیل گئی۔ یہ احساس ہوا کہ باہر کافی لوگ ہیں اور غالباً باآواز بلند قرآن کی تلاوت ہو رہی ہے۔ گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ بی جان کی نگاہ اب مجھ پر پڑی تھی۔ وہ مجھ پر جھک گئیں۔

"کیسا ہے چاند!"

"بی جان......... ! یہ......... یہ کیسی آوازیں ہیں' کون لوگ آئے ہوئے ہیں؟"

"ضیاء......... ! دادا ہم سے بچھڑ گئے۔" زہرہ آپا نے ایک دم ہی اپنا سر میرے سینے پر رکھ کر روتے ہوئے کہا۔

ایک گہرا سناٹا میں نے اپنے اندر پھیلتا محسوس کیا۔ عجیب سا خالی پن تھا جیسے صرف دادا نہیں ساری دنیا مر گئی ہو۔ کوئی آواز' کوئی حرکت' کوئی ارتعاش زندہ نہ ہو۔ کوئی خیال' کوئی سوچ' کوئی تحریک نہ رہی ہو۔ ویرانی' سناٹا اور خالی پن بڑھتا چلا جا رہا ہو۔ فضائیں تک ساکت ہو گئی ہوں۔ ایسا نہیں تھا کہ دادا کی عمر ابھی مرنے والی نہیں تھی یا یہ موت بالکل ہی غیر متوقع تھی بلکہ ایسا تھا کہ میں کچھ وقت چاہتا تھا۔ تھوڑا سا وقت مگر وہ مجھے نہیں مل سکا۔ میں خود بھی چند لمحے ساکت رہا پھر ذہن میں شور سا بلند ہوا۔ ساری آوازیں زندہ ہو گئیں۔ زہرہ آپا رو رہی تھیں۔ باہر سے قرآن خوانی کی آوازیں آ رہی تھیں۔ قدموں کی چاپ' لوگوں کی سرگوشیاں پھر ایک خیال نے مجھے چونکا دیا۔ "مجھے کیا ہوا تھا؟" یہ خیال الفاظ کی صورت میں بے ارادہ ہی میرے ہونٹوں پر آ گیا۔

"پتا نہیں ضیاء! شانی بابا تمہیں یہاں لائے تھے اور سنو! انہوں نے تمہیں یہاں سے اٹھنے کو منع کیا ہے۔ انہوں نے میری ڈیوٹی لگا دی ہے کہ تم ہوش میں آؤ بھی تو تمہیں اس پلنگ سے قدم نیچے نہ اتارنے دوں۔ وہ رات تک لوٹ آئیں گے۔ تمہیں

کسی بھی حال میں یہاں سے کہیں نہیں جانا۔"

"مگر کیوں..........؟ میرا خیال ہے کہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔" میں الجھ گیا۔

"بیٹا! ان کا کہا ماننا ضروری ہے۔ وہ بہت پریشانی میں صرف اتنا کہہ کر گئے ہیں۔" بی جان نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ وہ میری رازدار تھیں۔ میں حالات کی ساری سنگینی ان سے ڈسکس کر چکا تھا۔ خاص طور پر شالی بابا کے بارے میں ان سے پہلے بات ہو چکی تھی۔ ایسا کہتے ہوئے ان کی آنکھوں میں کوئی ایسی بات بھی تھی جسے میں خوف کا نام تو نہیں دے سکتا مگر پھر بھی وہ کیفیت خوف سے ملتی جلتی ضرور تھی۔ کہیں کہیں اطمینان کا شائبہ بھی ہوتا تھا مگر میں شاید ذہنی حالت پر قابو نہیں پا سکا تھا اس لئے بات واضح طور پر محسوس نہیں کر پا رہا تھا۔ بس اتنا احساس ہو چکا تھا کہ کوئی گڑبڑ نہیں ہے۔ شاید بی جان کو سب کچھ ٹھیک ہو جانے کا احساس بھی ہو۔

دادا کے بارے میں بہرحال مجھے تشویش تھی۔ پوچھنے پر پتا چلا کہ شالی بابا مجھے اور دادا کی میت کو لے کر گھر پہنچے تھے جبکہ طیب اور منے دادا اسی وقت ہسپتال کے لئے گھر سے نکل چکے تھے۔ گھر میں کوئی مرد نہیں تھا۔ محلے کے کچھ لوگوں نے مجھے اندر پہنچایا اور دادا کی میت کو بڑے چبوترے پر رکھوا دیا۔ گھر میں کہرام مچا مگر اس کہرام میں دادی کی دبی دبی سسکیاں کسی کو بھی سنائی نہ دیں۔ وہ خاموش ہو کر رہ گئیں۔ دیرینہ ساتھی اور رفیق کو بے حس و حرکت اور مردہ دیکھنا کیسے دل گردے کا کام ہوتا ہے۔ مجھے اس کا اندازہ تھا شاید پھر بھی میں کم محسوس کر رہا تھا۔ ان کے چہرے کی زردی تو مجھے ہسپتال میں بھی نظر آ رہی تھی۔ اب جانے کیا حال ہوگا۔ میں ان کے پاس جانا' انہیں تسلی دینا چاہتا تھا مگر شالی بابا کے عجیب و غریب حکم نے مجھے بے بس کر دیا تھا۔

میں بی جان سے تفصیل پوچھنا چاہتا تھا مگر زہرہ آپا میری پٹی سے لگی بیٹھی تھیں۔ انہوں نے میرے لئے اورنج جوس بھی وہیں بیٹھے بیٹھے نکالا تھا اور محبت سے لبریز نگاہیں مجھ پر گاڑے اب مجھے جوس پی لینے کی ہدایت کر رہی تھیں۔

"آپ کب آئیں زہرہ آپا؟"

"ابھی کچھ ہی دیر پہلے پہنچے ہیں۔ رات ہی منے دادا نے فون کر دیا تھا۔ اتفاق سے رات والی گاڑی بھی مل گئی۔ طاہر بھی آئے ہیں اور ناصر چچا بھی۔"

"طیب کہاں ہے؟"

"وہ باہر ہے۔ دادا کو ابھی دفنایا نہیں گیا ہے۔ شالی بابا نے روکنے کو کہا تھا۔ وہ آئیں گے تو انہیں دفنایا جائے گا۔"

یہ سن کر مجھے اتنی تسلی ضرور ہو گئی کہ میں دادا کو کاندھا دے سکوں گا۔ یقیناً شالی بابا مجھے اس پابندی سے نجات دے دیں گے پھر اچانک ہی مجھے وہ آخری سین یاد آ گیا جسے میرے اندھیرے میں ڈوبتے ذہن نے محفوظ کر لیا تھا۔ ہاں! وہ وہی تھی۔ وہی حسین و جمیل اور بلا کی ساحرہ لڑکی جسے ہم پہلی نگاہ میں ایلیا کی بیٹی سمجھ بیٹھے تھے۔ وہ میری پشت پر تھی اور میرے سر پر کسی نے زوردار وار کیا تھا۔ یہ خیال آتے ہی میں نے اپنے سر کا پچھلا حصہ سہلایا۔ وہاں گومڑ پڑا ہوا تھا۔

"کیا اس لڑکی نے مجھ پر حملہ کیا تھا؟" تیزی سے سوال کونجا مگر پھر یہ بھی یاد آ گیا کہ شالی بابا نے جب دہشت زدہ نگاہوں سے میرے پیچھے دیکھا تھا تب وہ دادا کو پکار رہے تھے مگر وہ انہیں کیوں پکار رہے تھے! کیوں کہ دادا تو میرے علم کے مطابق کمرے میں بیڈ پر نیم بے ہوشی کی حالت میں تھے پھر جب حملہ آور نے مجھے تارے دکھا دیئے تھے تب میں نے پلٹ کر دیکھا اور اسے اپنے سامنے پایا تھا۔ اس نے تھامنے کی کوشش کی تو شالی بابا درمیان میں آ گئے تھے۔ "کیا ہوا تھا وہ سب کچھ؟ وہ تھی تو اب کہاں ہے؟ وہ تھی کون؟ شالی بابا نے دادا کو بھلا کیوں پکارا تھا' وہ کب کسی کی مدد کرنے کے قابل تھے؟"

میرا سر چکرانے لگا۔ میں نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے دونوں کن پٹیاں دبائیں۔ بی جان مجھے بہت غور سے دیکھ رہی تھیں۔ بول اٹھیں۔

"ضیاء..........! چندا..........! تم کچھ نہ سوچو.......... سب خیریت ہے۔ دادا کو تو جانا ہی تھا۔ اب اتنا بوڑھا آدمی جوان بچوں کو کندھا دے کر کب مضبوط رہتا ہے کہ زیادہ جی سکے۔ وہ تو پھر ہمت والے تھے۔ میری تحسین مجھے نچوڑ گئی۔ ان کے تو جواں کڑیل بیٹے تھے جنہیں کاندھا بھی دیا تھا انہوں نے۔ غم آدھا کر دیتا ہے آدمی کو۔ حوصلے تو جواں بچوں کے وجود سے ہی جوان رہتے ہیں بیٹا۔ جوان اولاد مٹی میں ملا کر بھلا حوصلے کب سمیٹے رہ سکتا ہے آدمی۔ اپنے آپ کو سنبھالو۔ اب گھر میں تم ہی رہ گئے۔ شجاع اور رضا تو یہاں ہیں ہی نہیں۔ تمہاری اماں' منی دادی اور ہم تمہارے بل پر ہی جیتے رہ سکتے ہیں۔"

انہوں نے بوڑھی اور دھندلی آنکھوں میں آئے گدلے پانی کو دوپٹے کے پلو میں جذب کرتے ہوئے کہا۔ "ان کے "ہم" کہنے پر مجھے پہلے فرحت کا پھر خالہ جی کا خیال

آگیا۔

"بی جان! خالہ بی اور فرحت کیسی ہیں؟"

"آں.........! ہاں.........!" ان کی بجھی اور دھندلی آنکھوں میں لحہ بھر کو کہیں ستارہ سا چمکا۔ "فرحت! ہاں وہ غم سے تو نڈھال ہے مگر اب سے پہلے تو بہت سہمی ہوئی تھی۔ اب بھی ہراساں ہے۔ میں اسے بتا تو آؤں کہ تم ہوش میں آگئے ہو۔ تین چار مرتبہ چکر لگا چکی ہے۔" بی جان یہ کہہ کر اٹھ گئیں۔

زہرہ آپا محبت پاش نگاہوں سے مجھے تکے جا رہی تھی مگر ان کی آنکھوں میں نمی اب بھی تھی۔

مجھ میں اٹھنے کی ہمت نہیں تھی مگر اٹھنا ضروری تھا۔ میں دادا کا آخری دیدار کرنا چاہتا تھا۔ زہرہ آپا نے مجھے سہارا دیا۔ میرے سر میں دھماکے سے ہونے لگے۔ آنکھوں کے آگے زرد رنگ ناچنے لگا مگر میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"کیا شالی بابا ہیں؟" میں نے دھیرے سے پوچھا۔ لگ رہا تھا جیسے زور سے بولا تو سر ایک زوردار دھماکے سے پھٹ جائے گا۔

"نہیں! کہیں گئے ہیں اور کہہ گئے ہیں کہ ان کا انتظار کیا جائے۔"

میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا باہر نکل آیا۔ بڑے برآمدے میں سناٹا چھا گیا۔ سب سر اٹھا کر یا پلٹ کر مجھے دیکھنے لگے۔ آنگن کے بیچوں بیچ دادا کی میت رکھی تھی۔ برآمدے میں لوگ دریوں پر بیٹھے قرآن پاک کی تلاوت میں مصروف تھے۔ طاہر بھائی اور ناصر بھائی کے علاوہ خاندان کے دوسرے لوگ بھی مختلف انتظامات میں لگے تھے۔ گہری خاموشی اور افسردگی میں لپٹی یہ مصروفیات' یہ بھاگ دوڑ' دل میں کانٹے سے چبھا رہی تھی۔ اماں باورچی خانے کے قریب کھڑی تھیں۔ بڑے حکیم صاحب کے منجھلے بیٹے کے گھر سے آئے ہوئے لوگ مجھے ماں کے قریب کھڑے نظر آئے۔ مجھے دیکھتے ہی اماں تیز قدموں سے میرے قریب آگئیں۔ وہ لوگ جو اب تک کافی رو چکے تھے' جن کی سرخ اور سوجی ہوئی آنکھوں میں اب ایک بے نام سی خاموش اداسی ٹھہر چکی تھی' وہ سب مجھے دیکھ کر چونک اٹھے تھے۔

منے دادا جو ایک طرف نڈھال سے بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی خود کو سنبھالتے ہوئے میرے قریب آگئے۔ زہرہ آپا نے مجھے منے دادا کے قریب چھوڑ دیا۔ انہوں نے

مجھے تھام لیا۔ میرے قدم دادا کی میت کی طرف اٹھ رہے تھے اور طوفان دل میں۔ باوجود کوشش کے میں منے دادا سے ایک لفظ بھی تعزیت کا نہ کہہ سکا۔ میرے حلق میں جیسے گولہ سا اٹکا ہوا تھا اور یہ گولہ نمکین تھا۔

"ضیاء! آج تو میں بھی یتیم ہو گیا" منے دادا کی بھرائی ہوئی آواز نے مجھے لرزا دیا۔ اتنی بے بسی اور ایسی بے چارگی میں نے لوگوں کے چہروں پر دیکھی تو تھی مگر سنی نہیں تھی۔ اس لرزتی کانپتی آواز نے میری سماعت میں خراشیں ڈال دیں' میرے حلق میں پھنسا گولہ ایک سسکی کے ساتھ ہی کہیں تحلیل ہو گیا اور بے اختیار میں پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ میں بابا کی موت پر بھی اتنا نہیں رویا تھا' شاید اس لئے کہ ان کے اور میرے درمیان جو رشتہ تھا اس کی ساری حدت ان کے سرد رویے نے نگل لی تھی بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے انجانا سا اطمینان ہوا تھا کہ اب اماں سکون سے میرے پاس سو سکیں گی' پیار نہ انہوں نے دیا تھا نہ انہیں ملا مگر دادا.........! انہوں نے مجھے جو پیار' جذبوں کی جو حدت اور رشتوں کا جو تقدس دیا تھا' وہ آج آنسوؤں کی شکل میں اپنی موجودگی کا احساس اور میرے اکیلے رہ جانے کا خوف دلا رہا تھا۔

دور بیٹھے یا کھڑے لوگ سمٹ کر میرے قریب آگئے تھے۔ میری نگاہیں دادا کے وجود پر جمی تھیں' مجھے یہاں سے ان کا چہرہ تو دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر سفید کفن میں لپٹا لاغر سا وجود وہیں سے میرے دل کو لرزائے دے رہا تھا۔ یہ نہیں ہے کہ مجھ میں ضبط کا یارا نہ تھا یا میں عورتوں کی سی غمزدہ کیفیت کا شکار تھا' نہیں میرے تمام آنسو میرے اندر' میرے دل پر گر رہے تھے۔ میری آنکھیں خشک تھیں' زلزلے اندر آرہے تھے۔ چہرے پر سنگلاخی کا احساس مجھے پوری شدت سے تھا اس لئے کہ میں اس کی کوشش میں بھی تھا۔ میں اندر سے دو حصوں میں منقسم تھا۔ ایک وہ جو دادا کی جدائی پر بچھاڑیں کھانے کو مچل رہا تھا' میرے اندر طوفان اٹھا رہا تھا اور دوسرا وہ جو مجھے مضبوط' جوان اور صابر مرد ہونے کا احساس کچوکے دے کر لگا رہا تھا۔

دادا کے چہرے پر بلا کا سکون تھا اور ان کے چہرے پر پھیلے اس سکون کی لہروں نے میری آنکھوں میں اتر کر میرے اندر کے تمام طوفان کو منجمد کر دیا۔ ایک دم اندر سناٹا چھا گیا' مگر باہر اماؤں کی سسکیاں گونجنے لگیں۔ سب جانتے تھے کہ میں تب سے اب تک بے ہوش تھا۔ اب دادا کی صورت دیکھ کر وہ میرے ردعمل سے ناواقف تھے مگر شاید میرے

غم کو راہ دکھا رہے تھے۔ میں ان کے قریب بیٹھ گیا۔ منے دادا کا وہ ہاتھ کانپ رہا تھا جس نے میرا بازو تھام رکھا تھا۔ میں نے ہلکے سے انہیں تھپکی دی۔

طیب جانے کہاں تھا' لپک کر میرے قریب آگیا۔ میں نے سرد نگاہوں سے اسے دیکھا' وہ بچوں کی طرح منہ بسور رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف اور دکھ دونوں ہلکورے لے رہے تھے۔ میں نے نگاہ پھر دادا کے چہرے پر جما دی۔ میں انہیں دیکھتا رہنا چاہتا تھا۔ ان کے چہرے پر پھیلے سکون نے مجھے ہلکا پھلکا کردیا تھا۔ اب میرے اندر غم نہیں' سناٹا تھا۔ طوفان نہیں' سکون تھا۔ عجیب سا خوف ناک سکون' وہ خاموشی جو قبرستانوں میں جاکر محسوس ہوتی ہے' مجھے یہاں محسوس ہو رہی تھی حالانکہ لوگوں نے مجھے خاموش دیکھ کر پھر اپنی جنبشیں سنبھال لی تھیں' کسی ہنگامے یا غم کے طوفان اٹھنے کے منتظر لوگ میرے ردعمل سے مایوس ہو کر دوبارہ سیپارے پڑھنے میں محو ہو چکے تھے۔ وہ بھاگ دوڑ جو اب سے پہلے تھم چکی تھی' پھر شروع ہو گئی۔ اماں جن کی آنکھیں آنسوؤں سے اچانک بھر گئی تھیں' وہ انہیں دوپٹے سے رگڑ کر صاف کرچکی تھیں۔

پھر کسی نے آواز لگائی۔ "کلمہ طیبہ پڑھو' ڈولا اٹھاؤ!" ایک شور اٹھا' رونے اور کلمہ پڑھنے کا۔ عورتوں کی سسکیوں کا' قدموں کی چاپ ابھری اور گھر میں کہرام مچ گیا۔ "شالی بابا آگئے؟"

☆——————☆——————☆

بس یہ آخری جملہ مجھے یاد رہ گیا۔ میرے سر کی چوٹ کافی گہری تھی جس نے مجھے ہلکان کردیا تھا۔ میں جنازے کے ساتھ جانے کے قابل نہیں تھا۔ ذرا سی حرکت مجھے دکھن میں مبتلا کردیتی تھی۔ منے دادا' اماں اور خود شالی بابا نے مجھے روک دیا۔ شالی بابا مجھ سے کہہ گئے کہ میں اپنے کمرے میں رہوں' باہر نہ نکلوں' وہ واپس آرہے ہیں۔ طیب نے مجھے کمرے تک پہنچا دیا۔ میں دادی سے بھی نہ مل سکا۔

شالی بابا کے اس جملے میں کہ میں کمرے سے باہر نہ نکلوں' ہدایت نہیں تنبیہ تھی۔ کم از کم میں نے یہی محسوس کیا تھا۔ عصمت آپا میرے پاس آگئیں۔ مجھے پتا تھا کہ اس بار زہرہ آپا کیوں نہیں آئیں۔ انہیں یقیناً غشی کے دورے پڑ رہے ہوں گے' ان کے ہاتھ پیروں کی جان نکل چکی ہوگی۔ ممکن تھا کہ ان میں ہلنے جلنے کی بھی سکت نہ ہو۔ عصمت آپا وہی سپاٹ چہرہ لئے میرے سرہانے آبیٹھیں۔ مجھے پہلی مرتبہ بے حسی کی

افادیت کا احساس ہوا۔

مجھے نہیں پتا تھا کہ اتنا بہت سا وقت کیسے گزر گیا۔ میری آنکھ گھر میں بہت سے قدموں کی چاپ اور سرگوشیوں سے کھل گئی تھی۔ لوگ قبرستان سے واپس آگئے تھے۔ دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ باہر روشنی نظر آرہی تھی مگر کمرے میں روشنی نہیں تھی۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی' اچانک مجھے اپنے کندھے پر کسی کے نرم ہاتھ کا لمس محسوس ہوا۔ کسی نے دھیما سا دباؤ ڈالا تھا۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ وہاں ایک ہیولا سا نظر آیا۔ یہ کسی عورت کا ہیولا تھا۔ میں سمجھا عصمت آپا ہیں۔

"عصمت آپا! شالی بابا آگئے؟" میں نے دھیرے سے پوچھا۔

"نہیں! وہ نہیں آئیں گے۔" ایک اجنبی آواز سنائی دی۔ "تم ان کا انتظار مت کرو ضیاء.........!"

"کک......... کون ہو تم!" میں باوجود تکلیف کے اٹھنے کی بھرپور کوشش کرنے لگا مگر اس کے ہاتھ کا ہلکا سا دباؤ کسی پہاڑ کا سا بوجھ محسوس ہوا۔

"زیوسا!" اس کا لہجہ نمناک تھا۔

میری سماعت میں جیسے بم سا پھٹا ہو۔ وہ جس نے مجھے پریشان کردیا تھا۔ وہ جو ان تمام حادثوں' سانحوں اور اموات کی ذمے دار تھی' وہ جسے دیکھنے کو میں بے چین تھا۔ وہ میرے بالکل قریب بیٹھی تھی۔ "زیوسا!" میرے ہونٹوں سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔

"ہاں.........! اور میں صرف یہ بتانے کے لئے آئی ہوں کہ میں تمہیں تکلیف میں نہیں دیکھنا چاہتی۔ نہ تکلیف دینا چاہتی ہوں۔ تم بھی ایسی کوئی کوشش نہ کرو کہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ۔ میں ہر طرح سے تمہاری مدد کرنا چاہتی ہوں۔ ضیاء! تم میری بات سمجھ رہے ہو ناں!"

"تم بکواس کررہی ہو۔" غصے نے میرے مردہ ہوتے جسم میں جیسے بے پناہ حرارت بھردی تھی۔ "تم نے ہی مجھے اس حال میں پہنچایا ہے' تم ہی ان تمام اموات کا سبب ہو۔ تم ہم سب کو ہراساں کررہی ہو اور......... اور کہتی ہو کہ تم میری مدد کرنا چاہتی ہو۔ مجھے تکلیف میں نہیں دیکھنا چاہتیں۔"

"میں......... میں نے تمہیں کوئی تکلیف نہیں دی ہے ضیاء.........! وہ......... وہ تو ولینا ہے۔ ولینا جو قابل نفرت ہے' اس نے ایک کھیل کھیلا اور جیت گئی۔ میں اس

سے تمہیں بچانا چاہتی ہوں۔ وہ افریقہ کے تاریک جنگلوں اور وہاں رہنے والے بدصورت مردوں سے جادو سیکھ کر' ہر سال دسمبر کی آخری شب ایک نیا کھیل شروع کرتی ہے اور پھر اس کھیل کو برسوں جاری رکھتی ہے۔ اس کا یہ جال اب تک جانے کہاں کہاں پھیل چکا ہے۔ پتا نہیں' کتنے لوگ اس کا شکار بنتے ہیں اور جانے کون کون اس کا شکار ہونے والا ہے۔ اس کھیل کا اہم کردار یہاں.......... انڈیا میں وتسلا کمیکر ہے۔ اسے تلاش کرو ضیاء اسے تلاش کرو۔"

وہ سیاہ ہیولے کی طرح نیم تاریکی میں میرے سامنے بیٹھی تھی مگر اس کا حسین چہرہ میرے سامنے روشن تھا۔ اس کی آب دار آنکھوں میں بے پناہ اپنائیت' محبت اور اپنی جانب کھینچ لینے کی کشش تھی۔

"تم..........!" میں چیخنے والا تھا۔ چیخنا چاہتا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے دھکا دینا اور اپنے سامنے سے ہٹانا چاہا کہ اچانک کسی نے مجھے جھنجوڑ دیا۔

"ضیاء.......... ضیاء ہوش میں آؤ ضیاء۔ یہ کیا بدتمیزی ہے۔ کیا کر رہے ہو تم!" یہ آواز طیب کی تھی۔ جھنجلائی اور غصے بھری آواز۔

پھر یوں لگا جیسے میں سوتے سے اٹھ بیٹھا ہوں۔ ٹرین کے ہچکولے' لوگوں کے بولنے کی آوازیں۔ ٹرین کے انجن کی چھک چھک۔ سب گڈمڈ ہو گئے۔

میں ٹرین میں تھا۔ سامنے والی سیٹ پر بیٹھی فیملی سامان باندھ رہی تھی۔ بچہ میری کھڑکی سے باہر جھانک کر شور مچا رہا تھا۔ میں سیٹ پر بیٹھا ہچکولے کھا رہا تھا اور طیب جو اب سے پہلے مجھے جھنجوڑ رہا تھا' چیخ رہا تھا۔ اب سر جھکائے میری آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ اس کے چہرے پر تشویش تھی۔ نہ گھر تھا' نہ میرا کمرہ' نہ آنگن میں دادا کی میت' نہ میرے سامنے زیوسا!

"ضیاء..........؟" طیب میرے قریب بیٹھ گیا۔ "کیا بات ہے ضیاء؟"

"طیب.........." میں بول اٹھا مگر میری آواز خود مجھے ہی اجنبی لگی۔

"ہاں بولو.......... کیا بات ہے؟"

"طیب دادا کا انتقال ہوا تھا' ہم گھر میں تھے' شالی بابا.......... زیوسا سب.......... تھے۔"

"ضیاء! دادا کے انتقال کو کافی عرصہ گزر چکا ہے۔ ان کا انتقال تو تمہارے بمبئی آنے سے پہلے ہوا تھا اور ابھی تو دہلی آیا ہی نہیں ہے۔ ہم گھر کیسے پہنچیں گے؟ وہ دیکھو' لوگ دہلی کے اسٹیشن پر اترنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ یہ بچہ.......... یہ بچہ دیکھو' وہی جس نے وہ پتھر لا کر دیا تھا۔ ضیاء.......... ہوش میں آؤ۔ شاید تم نے بھی میری ہی طرح کوئی خواب دیکھا ہے۔"

"تو اب.......... کیا میں سو گیا تھا؟"

"نہیں.......... سوئے تو نہیں تھے۔" وہ الجھن آمیز لہجے میں بولا۔ "ابھی ابھی.......... تو تم ٹھیک تھے جب دہلی کا اسٹیشن قریب تھا اور دیکھو ہم اب اسٹیشن کی حدود میں داخل ہو رہے ہیں۔"

میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ ٹرین پلیٹ فارم کی طرف بڑھ رہی تھی۔ قلی اور لوگوں کو ریسیو کرنے آنے والے ہماری کھڑکیوں کے ساتھ ساتھ بھاگ رہے تھے۔

"آپی.......... آپی۔"

اچانک میری کھڑکی میں کھڑا بچہ چیخا۔ یہ وہی بچہ تھا جس نے کسی عورت سے شالی بابا والے پتھر جیسا ایک سیاہ پتھر لا کر مجھے دیا تھا۔ وہ اسٹیشن پر کسی کو دیکھ کر چیخ رہا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ ابھی ابھی میں نے جو خواب دیکھا تھا (بقول طیب کے' میں تو اب بھی اسے خواب ماننے کو تیار نہیں ہوں) اس میں' شالی بابا کسی بھی پتھر کو کسی کے ہاتھ مجھ تک بھیجنے سے انکار کر چکے ہیں۔ بے اختیار میرا ہاتھ کوٹ کی اندرونی جیب میں رینگ گیا۔ وہ پتھر موجود تھا۔ میں نے اسے نکال لیا۔ ہتھیلی پر رکھ کر غور سے دیکھا۔ وہ بے جان پتھر تھا۔ اس میں مجھے وہ زندگی نظر نہ آئی جو میں پہلے اور دوسرے پتھر میں دیکھ چکا تھا۔

"ضیاء! ہوا کیا تھا؟" طیب بہت پریشان تھا۔

میں نے خالی خالی آنکھوں سے اس کی جانب دیکھا۔ اس دوران میں اچانک بے پناہ شور شرابا ہو گیا۔ ٹرین اب جھٹکے سے رک چکی تھی۔ قلی ڈبے میں گھس آئے تھے۔ کچھ اور لوگ بھی تھے جو سامنے والی فیملی کو لینے آئے تھے اور اب ان کا سامان قلی سے نیچے اتروا رہے تھے۔ اسٹیشن پر ہر شخص جیسے دوسرے کو پکار رہا تھا۔

"چلو.......... ! راستے میں سنانا۔" طیب نے اپنا اور میرا بیگ اٹھا لیا۔ میں بے حد تھکاوٹ محسوس کر رہا تھا۔ اٹھا تو لگا جیسے میرا سر چکرا گیا ہو۔ بے اختیار میرا ہاتھ سر کے پچھلے حصے کی طرف گیا۔ وہاں دکھن تھی' وہاں ہاتھ لگتے ہی تکلیف کی ایک لہر سی دماغ سے

لے کر ایڑی تک دوڑ گئی۔ میرے منہ سے سسکاری نکلی اور میں حواس باختہ ہو گیا۔

"طیب.......... یہاں.......... یہاں دیکھو.......... کیا ہے؟" میں نے سر کا پچھلا حصہ اس کی طرف کر دیا۔

"میرا خیال ہے خوابیدہ کیفیت میں تمہارا سر سیٹ سے ٹکرایا ہے۔ گومڑ سا بنا ہے اور شاید کھال بھی پھٹی ہے۔" وہ سر کو ٹٹول ٹٹول کر کہہ رہا تھا اور تکلیف اور حیرت سے میری حالت خراب تھی۔

"وہ خواب نہیں تھا طیب۔" میں نے سرسراتے ہوئے انداز میں کہا۔

"گویا دادا تیسری بار مرے تھے۔" اس نے مضحکہ خیز انداز میں آنکھیں پھیلا کر پوچھا۔ "ایک مرتبہ سچ مچ' دوسری مرتبہ میرے خواب میں وہ اس بھیڑیا نما انسان کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے اور اب تیسری مرتبہ.......... چلو یار ورنہ یہ ٹرین ہمیں واپس بمبئی لے جائے گی۔"

اب ڈبا خالی ہو چکا تھا مگر باہر اب بھی بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ اسے سب کچھ بتائے بغیر کوئی بات کرنا فضول ہی تھا۔ میں اس کا سہارا لے کر ٹرین سے نیچے اتر آیا۔

صبح کے دس بج چکے تھے۔ ہم اسٹیشن سے اتر کر سیدھے تانگا اسٹینڈ کی طرف چل پڑے۔ یہاں سے گھر کا راستہ کافی تھا۔ یہی سوچ کر کہ راستے میں طیب کو تفصیل سے بتاؤں گا۔ ہم اسٹیشن سے باہر آ گئے۔ اس زمانے میں بمبئی میں کچھ ٹیکسیاں تھیں مگر دہلی میں سائیکل رکشا یا تانگے چلا کرتے تھے اور سائیکل رکشا کو آدمی کھینچا کرتے تھے۔ میں نے کبھی سائیکل رکشا میں بیٹھنا پسند نہیں کیا اور یہاں سے گھر تک کے لئے تو کوئی بھی تیار نہ ہوتا کہ گھر بہت دور تھا۔ ہم نے جلدی تانگا لے لیا۔

"اب بتاؤ! کیا ہوا تھا تمہیں! کیا تم بیٹھے بیٹھے اور کھلی آنکھوں بھی سونے کے عادی ہو؟"

مجھ سے زیادہ بے چین طیب تھا۔ اب اس میں کچھ بردباری اور سنجیدگی آ چکی تھی۔ وہ میری کیفیت دیکھ کر جان چکا تھا کہ معاملہ کافی گھمبیر ہے۔ میں نے دھیرے دھیرے اسے سب کچھ بتا دیا کہ ہم دہلی اتر کر گھر پہنچے تھے۔ وہاں دادا زندہ تھے۔ بعد میں مرے اور پھر زیوسا سے ملاقات۔ زیوسا کی باتیں' وتسلا کمینگر کے بارے میں شکوک۔ ایلین کے بارے میں تفصیل۔ یہ سب اس نے بہت سنجیدگی سے سنا۔

"میں تو سوچ بھی نہیں سکتا کہ اتنا لمبا عرصہ میں نے لمحوں کے ایک خواب میں بتا دیا۔"

"بیٹا جی! تم جن چکروں میں پڑ چکے ہو۔ ان میں سب کچھ ممکن ہے۔"

طیب نے اسی سنجیدگی سے جواب دیا پھر چند لمحے کچھ سوچتا رہا' اچانک وہ چونک کر میری طرف متوجہ ہو گیا۔

"ضیاء! ان تمام واقعات کا کیا جواز ہے؟ یہ سب خواب ہے یا حقیقت' یہ تو میں نہیں جانتا مگر ایک بات کا مجھے اب یقین ہوتا جا رہا ہے کہ دادا کی موت نارمل نہیں تھی۔ میں نے بھی انہیں خواب میں قتل ہوتے دیکھا۔ تم نے انہیں دوسری بار مرتے دیکھا حالانکہ وہ مر چکے ہیں۔ کہہ سکتے ہو کہ خواب صرف میں نے دیکھا تھا کہ دادا مرے پڑے تھے اور وہ بھیڑیا نما انسان پاس بیٹھا تھا۔ ممکن ہے' اس بھیڑیے نما انسان کے خوف نے مجھے خواب دکھایا ہو مگر تم.......... نے جس تسلسل اور جس انداز میں سب کچھ دیکھا پھر تمہارے سر پر چوٹ کا نشان' تمہاری حالت.......... یہ سب.......... ضیاء! میری بات لکھ کر رکھ لو۔ دادا نارمل انداز میں نہیں مرے۔ کوئی چکر ہے.......... دعا کرو گھر میں سب خیریت ہو۔"

طیب کی بات میں وزن تھا۔ میں اب بھی گزرے ہوئے لمحوں کو خواب سمجھنے پر تیار نہ تھا۔ مجھے گھبراہٹ ہونے لگی۔ دادا کی موت کو یاد کیا تو یاد آیا کہ اس وقت بھی میں صاحب فراش ہو گیا تھا۔ ایک عرصہ بیمار رہا تھا اور اس وقت بھی تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ وہی کچھ ہوا تھا۔ دل نے بے اختیار دعا مانگی کہ گھر میں خیریت ہو۔ میں نے اضطرابی کیفیت میں تانگے والے کو ڈانٹ دیا کہ وہ تیز چلائے۔

"ضیاء.......... ! زیوسا کیسی تھی؟ کیا وہی جو ایلیا کے گھر.......... ؟"

"نہیں!" میں نے بات کاٹ دی۔ وہ قطعی مختلف تھی مگر بے حد پرکشش اور حسین۔ اس کا انداز ہمدردانہ تھا۔"

"دیکھے یار! تم آدمی دوسری قسم کے ہو' اگر میرے آگے پیچھے اتنا حسن ہوتا تو میں.......... میں آسمانوں میں اڑتا۔"

"زیوسا دوسری ہی کہانی سنا رہی تھی۔"

"میں سب کی سب کہانیاں سن کر ہر ایک پر ایمان لے آیا کرتا۔" وہ اپنی ہی رو

میں بہا جا رہا تھا۔

"اس میں.......... اس میں عجیب سا سنہرا پن تھا طیب اور.......... اور......"

میری عجیب سی کیفیت ہو گئی' بے وجہ اس لکڑی کا خیال آ گیا جسے میں نے کافی دنوں صندوقچی میں چھپائے رکھا تھا۔

"بس اسی سنہرے پن پہ تو جان لٹا دینا ہیں۔"

"بکواس بند کرو۔" میں نے اسے جھڑک دیا۔

"بالکل اسی انداز میں تم نے زیوسا کو بھی ڈانٹا تھا ضیاء! یار تمہارا اخلاق خراب ہے۔ کم از کم عورت سے بات کرتے ہوئے تو.........."

"عورت.........." مجھے تو نہیں لگا کہ وہ عورت ہے۔ یہی تو میں تمھیں جتاتا ہوں طیب کہ اب جب میں زیوسا کا تصور بھی کرتا ہوں تو وہ سنہری لکڑی میرے دماغ اپنی باریک مگر چبھتی ہوئی بہت سی ٹانگوں سے رینگنے لگتی ہے۔"

"لا حول ولا..........! بہت ہی بدذوق ہو یار۔ میں تو کہتا ہوں کہ اگر کوئی ناگن بھی خوبصورت عورت کا روپ میں آئے تو تمہیں اس سے اخلاق اور محبت سے بات کرنا چاہیے۔" طیب ہنسنے سے وکھڑ چکا تھا۔ "ایک مرتبہ ایک چڑیل مجھ سے ٹکرا گئی تھی۔ میں نے لفٹ نہیں کرائی مگر جیسے ہی اس نے ایک حسین عورت کا روپ دھارا میں اس پہ فریفتہ ہو گیا۔ اب وہ اگر مجھ سے ملنے آتی ہے اور میں.........."

"تم چپ نہیں رہ سکتے؟" میں جھلا گیا۔

"رہ سکتا ہوں مگر تم اپنے ذہن کو ان لمحوں کی قید سے آزاد کر لو تو.........." طیب نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

"ہوں!" میں نے گہرا سانس لے کر چاروں طرف دیکھا۔ اب گھر زیادہ دور نہیں تھا۔ "پتا نہیں' شالی بابا سے کیسے ملاقات ہو گی؟" میں زیر لب بڑبڑایا۔

اچانک تانگا رک گیا۔ بیچ سڑک پر۔ ہمارے ارد گرد سناٹا تھا حالانکہ یہ کوئی سنسان سڑک نہیں تھی۔ میں چونک اٹھا۔ ایسا کیوں تھا؟ یہ تو مصروف سڑک تھی۔ یہاں دائیں طرف جا کر اگر ہم گلی میں مڑ چکے ہوتے تب تو ٹھیک تھا کہ ذیلی گلیاں کسی بھی وقت سنسان ہو سکتی ہیں۔ ویسے بھی یہ وقت ایسا تھا جب لوگ اپنے اپنے کام پر جا چکے تھے مگر یہ سڑک.......... طیب بھی تانگے کے رکنے پر حیران تھا۔

"کیا بات ہے بھیا!" اس نے پلٹ کر تانگے والے سے کہا۔ میں بھی اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میں نے پہلی بار تانگے والے کی طرف دیکھا تھا۔ وہ ایک سیاہ چادر کو اپنے گرد لپیٹے ہوئے تھا۔ سر پر اس نے غالباً اونچی ٹوپی پہن رکھی تھی اور چادر کو اس ٹوپی کے اوپر ڈال کر اپنے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ اس چوڑی چادر میں چھپے ہوئے تھے۔ وہ ساکت تھا۔ اس کا رخ اپنے سامنے کی طرف تھا جبکہ ہم صرف اس کی پشت دیکھ سکتے تھے۔

"میں تم سے پوچھ رہا ہوں یار! کیا گھوڑا اڑ گیا؟" طیب نے ذرا سا اچک کر اس کا چہرہ دیکھنا چاہا۔

عین اسی لمحے وہ دھیرے سے مڑا۔ میں اچھل پڑا۔ وہ شالی بابا تھے۔

"شالی بابا! آپ۔"

"ہاں بیٹا! میں۔ یہاں تم اتر کر پیدل گھر چلے جاؤ۔"

"لیکن شالی بابا..........!" میں نے اضطرابی کیفیت میں بولنا شروع کر دیا۔ "میں تو آپ سے ملنے کے لئے بے چین ہوں۔ میں تخت بر شالی میں ہوں۔"

"میں جانتا ہوں۔ ساری کہانی سن چکا ہوں۔ زیوسا ٹھیک کہتی ہے۔ وہ خنجر مجھے دے دو۔ وہ میں نے نہیں بھیجا تھا' تم نے جو اذیت کاٹی ہے وہ چھری ہی اس کا سبب ہے ورنہ میں نے تو ایسا حصار کھینچ دیا تھا کہ سفر سکون سے کٹ جاتا۔"

"یہ.......... یہ شالی بابا ہیں؟" طیب اب تک غالباً حیرت سے ساکت تھا۔

"ہاں!" میں نے پلٹ کر کہا اور شالی بابا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اسی دوران میں میں نے وہ خنجر نکال کر شالی بابا کو دے دیا۔ ان کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر رکھتے ہی وہ چھری پانی ہو گیا۔ میں اور طیب حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"یہ لو۔" شالی بابا نے ہرے رنگ کے کپڑے میں لپٹا ایک تعویذ مجھے دے دیا۔ اس تعویذ میں چاندی کی زنجیر پڑی تھی۔ "اسے گلے میں پہن لو۔"

میں نے وہ ان سے لے لیا اور اسے غور سے دیکھنے لگا۔ اسی دوران میں شالی بابا کی آواز آئی۔ لہجہ گھبرایا ہوا تھا۔ "جلدی کرو ضیاء"

میں نے چونک کر انہیں دیکھا۔

"وہ دیکھو!" طیب چیخا۔ وہ سامنے سڑک کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

میری نگاہ سڑک پر پڑی' وہاں ایلیا اپنی بیٹی اور ڈگلس کے ساتھ بڑے خونخوار انداز میں میری جانب بڑھ رہی تھی۔ میں ان تینوں کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ تینوں تو مرچکے تھے' میں نے اور طیب نے ان تینوں کو اپنے ہاتھ سے ایلیا کی کوٹھی کے پچھلے حصے میں دفن کیا تھا۔

"جلدی پہنو۔" شالی بابا چیخے۔

مجھے ہوش آگیا۔ میں نے جلدی سے تعویذ گلے میں ڈال لیا۔ سناٹا سا چھایا۔ طیب آنکھیں دونوں ہاتھوں سے ملنے لگا۔ سڑک سنسان تھی۔ ہر طرف سکون تھا۔

"وہ......... وہ لوگ.........."

"کوئی نہیں تھا ضیاء! یہ وتسلا! کمیشکر کی کارستانیاں ہیں۔" شالی بابا بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں بولے۔ "جاؤ......... گھر جاؤ۔"

"بابا! یہ زیوسا' ایلن اور وتسلا کمیشکر.........."

"میں تم سے جلد ملوں گا ضیاء! لیکن صرف اتنا سمجھ لو' زیوسا ٹھیک کہتی ہے۔ وہ تمہارے رویے کی وجہ سے الجھ جاتی ہے ورنہ واقعی تمہاری مدد کرنا چاہتی ہے۔ تم اپنے رویے میں لچک پیدا کرو۔ تمہیں ہراساں کرنے والی زیوسا نہیں' ایلن اور وتسلا ہیں۔"

"مگر بابا.........!" میں نے کہنا چاہا۔

"اترو جلدی۔ مجھے جانا ہے میں مصروف تھا' اگر مجھے تمہارے بارے میں اس نے نہ بتایا ہوتا تو شاید میں کبھی نہ آتا' میں وہ وظیفہ چھوڑ کر آ ہی نہیں سکتا تھا۔ میں پھر ملوں گا۔ تم اپنے اندر قوت پیدا کرو۔ خود اعتمادی کو مضبوط کرو۔ تم بے ہمت ہوتے جارہے ہو اور یہ تمہارے لئے خطرناک ہے۔ خدا کو یاد رکھو ضیاء! وہ بھولنے کی چیز نہیں ہے۔ عطا اسا نہیں تھا تو بچتا رہا اور جب اس نے ہمت ہار دی تو جان ہار بیٹھا۔"

طیب نے اس دوران میں سامان تانگے سے اتار لیا تھا۔ میں بھی نیچے اتر آیا۔ شالی بابا نے لگامیں ڈھیلی کیں' میں مضطرب ہو کر آگے بڑھا۔ "بابا! میں جاننا چاہتا ہوں۔"

"سب کچھ جان لو گے۔ جو غلطی کرچکے ہو اسے سدھارنا تمہارا ہی کام ہے۔ یہ خوش قسمتی ہے کہ زیوسا تمہارے ساتھ ہے۔ میں میرٹھ میں......... اپنے گھر پر ملوں گا جب ہارنے لگو تو وہاں آجانا۔"

یہ سب کچھ شالی بابا نے جاتے جاتے کہا تھا۔ تانگہ آگے بڑھ رہا تھا اور میں اس کے

ساتھ بھاگ رہا تھا پھر اس کی رفتار اتنی تیز ہوگئی کہ میرا سانس پھولنے لگا۔ شالی بابا کے آخری جملوں سے لگتا تھا جیسے اب وہ نہیں آئیں گے بلکہ جو کچھ سہنا ہوگا وہ مجھے تنہا ہی سہنا پڑے گا۔ تانگہ میری نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔ طیب دونوں اٹیچی کیس اٹھائے میری طرف بڑھ رہا تھا۔

"ضیاء.........! ابھی ابھی مجھے یہ خیال آیا ہے کہ......... کہ یہ شالی بابا......... یہ بھی کہیں اس زیوسا کا کوئی چکر یا تماشا نہ ہوں۔ جس نے محض اس لئے انہیں بھیجا ہو کہ تم زیوسا کی طرف سے دل صاف کرلو۔"

طیب نے مجھے چونکا دیا تھا۔ میرے دماغ میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ "ہاں......... آں.........!"

"یہ پکڑو اور جلدی نکل لو اس سڑک سے۔ اگر پھر ایلیا بیٹی ڈگلس کو لے آئی تو کچا چبا جائے گی۔" طیب نے میرا اٹیچی کیس آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

ہم پیدل گھر کی طرف چل پڑے۔ میں سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ "تمہیں کیسے پتا چلا؟" میں نے اچانک طیب سے پوچھا۔ وہ اس غیر متوقع اور مبہم سوال کے لئے تیار نہ تھا۔ ٹھٹھک گیا۔

"کیا کیسے پتا چلا؟"

"یہی کہ یہ......... شالی بابا نہیں تھے۔"

"نہیں! نہیں.........! میں یہ نہیں کہہ رہا تھا یار' تم شالی بابا سے بچھڑ گئے! میں نے تو یونہی ایک خیال ظاہر کیا تھا۔ اصل میں پتا ہی نہیں چل رہا کہ ہو کیا رہا ہے' کیا سچ ہے' کیا خواب' زیوسا ہمدرد ہے کہ دشمن' یہ......... تانگے والا زیوسا تھا' ایلن تھا کہ شالی بابا......... ویسے میرا خیال ہے کہ شالی بابا کو اتنا بداخلاق نہیں ہونا چاہئے۔ کبھی گھر تک تو ذرا آپ کرتے۔ ویسے ضیاء......... اب میں بڑی سنجیدگی سے سوچ رہا ہوں کہ مصلے پر بیٹھ کر توبہ کروں۔ پُراسراریت سے پناہ مانگوں اور اپنی سیدھی سادی زندگی کی طرف لوٹ جاؤں۔ جہاں مونیکا تھی......... میں تھا اور ہمارے درمیان رنگین تتلیوں کی طرح اڑتے ہوئے لمحے۔"

"ہاں......... طیب......... میں خود بھی ایسا ہی چاہتا ہوں۔ یہ میری جنگ ہے' اسے مجھے ہی لڑنا اور جیتنا ہوگا۔ تم بے وجہ کود پڑے ہو۔ یہ بھی سچ ہے کہ پتا نہیں یہ شالی

بابا تھے کہ نہیں.......... بہرحال تم نکل سکتے ہو' میرا خیال ہے کہ وہ جو بھی ہے' جان رہا ہوگا کہ تم محض میری ہمدردی میں میرے ساتھ ہو۔ آج کنارا کر لو گے تو.......

یہ............

"کیا مبشر تمہارے ساتھ تھا؟ کیا تحسین خانہ نے تم سے مل کر اس کے خلاف کوئی سازش کی تھی؟ کیا عطا چچا بھی تمہارے ساتھ تھے۔ کیا مبشر کی بیٹیاں........ بڑوڑ!! اور.......... اور ایشیا.......... ڈگلس' ایلی.........." طیب کا لہجہ سفاک اور کھردرا ہوگیا۔

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ اس کے جبڑے بھنچے ہوئے تھے۔ اس کی سیاہ گہری آنکھوں میں غصہ تھا' جذبوں کی شدت سرخ ڈورے بن کر آنکھوں میں پھیل گئی تھی۔ میں نے کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ اب ہم اپنی گلی میں داخل ہو چکے تھے۔ دھوپ نرم تھی ورنہ شاید اتنی دور پیدل چلنا مشکل ہو جاتا۔

ہم گھر پہنچے تو سب کچھ ٹھیک تھا۔ منے دادا اور اماں میرے لئے پریشان تھے' مجھے دیکھتے ہی ان کے چہروں پر بشاشت آگئی۔ منی دادی بھی آئی ہوئی تھیں اور دادی تو مجھے دیکھتے ہی رو پڑیں۔ میں نے انہیں تسلی دی۔ اتنے عرصے کے بعد انہیں دیکھا تھا' ان کے چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی تھی ان کا درد گہرا لگا۔ اماں اپنے گھریلو جھمیلوں میں لگی رہتی تھیں۔ وہاب چاچو اپنی ڈیوٹی میں مست تھے۔ شجاع بھائی اور رضا بھائی بھی باہر تھے' عصمت آپا عجیب سی طبیعت کی مالک تھیں' اکیلی اکیلی' خاموش' بکھرائی سی' دادی سے باتیں کرنے والے اکیلے دادا تھے جو جا چکے تھے شاید اسی لئے منے دادا اور منی دادی یہاں تھیں۔ منی دادی کی حالانکہ ہمیشہ ان سے ان بن رہی مگر آج ان کا رویہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا تھا۔

"اسے دن نگا دیجئے۔" اماں نے شکایت کی۔ "بھاڑ میں جھونکو ایسی نوکری کو۔ اتنا کچھ تو ہے' ہمیں کون سا قبر میں لے کر جانا ہے۔ حالت دیکھی ہے اپنی!" اماں بولے چلی گئیں۔ عصمت آپا کے پیار کا وہی انداز تھا' گہری نگاہوں سے لمحہ بھر کو دیکھا اور کچھ دیر بعد چائے کا پیالہ بھر لائیں۔ منے دادا طیب کو ساتھ دیکھ کر خوش تھے۔

"ناصر ٹھیک ہے؟" منے دادا نے طیب سے پوچھا۔

"جی.........! شاید اگلے ماہ ادھر آنا ہو ان کا۔ اس طرف کا ٹور ہے۔"

"اس کی نوکری بھی خانہ بدوشوں جیسی ہے۔" منی دادی بولیں۔ "ظاہر تو ٹھیک

ہے نا!"

سب کی خیریت پوچھی جا رہی تھی۔ سب بڑے برآمدے میں دھوپ کی جانب تخت ڈالے' کچے آنگن میں چھڑکاؤ کئے' ٹھنڈی دریوں پر بیٹھے تھے۔ سب کچھ ٹھیک تھا' سکون تھا مگر میرے اندر عجیب اضطراب تھا۔ ایسا اضطراب جو کہیں جس کے پیچھے تھا نہیں ...... اچانک جیسے اضطراب کا سبب سمجھ میں آگیا۔

"اماں! بی جان اور خالہ بی چلی گئیں؟"

طیب میری بات سن کر چونک اٹھا۔ "ارے ہاں.......... میں بھی تو کہوں اتنے بہت سے لوگوں کے ہوتے ہوئے بھی یہ کیسی ویرانی ہے۔"

وہ بات کرتے ہوئے سوچتا نہیں تھا۔ میں نے فرحت کی کمی محسوس کر کے بی جان کا پوچھا تھا اور وہ.......... وہ براہ راست فرحت کا ذکر کر رہا تھا۔ یہ فرحت کا ذکر ہے' یہ تو میں ہی جان سکا' اور یہ احساس ہوتے ہی کہ وہ فرحت میں دلچسپی لے رہا تھا' اور لے رہا ہے' میرا دل بیٹھ گیا۔

"تمہیں خالہ بی کا پتا ہے؟" اماں نے پاندان اپنے قریب سرکاتے ہوئے جواب دیا۔ "ذرا جو کہیں ٹک کر رہ جائیں۔ پتا نہیں' اس بھاڑ سے گھر کے ایک کمرے میں چھت پر کون سے فانوس لٹکے ہیں جنہیں سارا دن گھورتے گزار دیں' تب بھی وقت کھونے کا احساس نہ ہو۔"

"وہ یادوں کے فانوس ہوں گے چچی بی۔"

طیب نے پان کا ٹکڑا ان کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ اماں کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔

"اکیلی رہ گئی ہیں نا وہ۔" طیب میرے گھورنے پر بولا۔

"سبھی اکیلے رہ جاتے ہیں۔" اماں نے سرد آہ کھینچی۔ دادی تکیہ لے کر لیٹ گئیں۔

"آپ نے جانے ہی کیوں دیا۔ میں کہہ کر گیا تھا کہ وہاں نہ جائیں۔" میں نے اماں کی گھبیر تا کو بڑھنے سے روک دیا۔

"سنتی کب ہیں وہ۔ اکیلی جانے کو تیار تھیں۔ کہتی تھیں میرا دل ہول رہا ہے۔"

"بی جان بھی حکم کا غلام بنی رہتی ہیں ان کے سامنے۔ چلو' جانا ہی تھا تو اکیلی چلی

جائیں ان کے ساتھ' فرحت وہاں کون سے فانوس ٹکے گی۔" طیب نے اماں کا نگایا ہوا پان کا ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے کہا اور کتھے میں سنی انگلیوں کو اپنے سر میں رگڑ لیا۔

"بہت گندے ہو تم۔" میں غصے سے بول اٹھا۔

طیب چونک اٹھا۔ اس کے چہرے پر ہی نہیں سب کے چہرے پر حیرت تھی۔ مجھے احساس ہوا کہ غصے کا بگولہ پوری قوت سے اٹھا تھا اور لہجے کو غبار آلود کر گیا تھا۔

"یہ.......... گندی انگلیاں سر میں مل لیں۔" میں نے بوکھلا کر صفائی پیش کرنے کے سے انداز میں کہا۔

"اوہ.......... تو اس میں اتنے غصے کی کیا بات ہے یار۔"

"اونہہ..........!" منے دادا کھنکارے۔ "یہ بمبئی جا کر تمہارا انداز تخاطب کافی بگڑ گیا ہے۔"

"چلو بھائی! کھانا کھا لو۔" عصمت آپا نے آکر اطلاع دی۔ سب سے پہلے طیب کھسک لیا۔ منے دادا اسے گھورتے رہ گئے اور میں سوچنے لگا کہ مجھے غصہ فرحت کے بارے میں طیب کے انداز پر آیا تھا یا واقعی گندی انگلیاں سر میں رگڑنے پر۔

"اماں! ان کا وہاں جانا خطرناک تھا۔" میں نے چپکے سے اماں کے کان میں سرگوشی کی۔

"ابھی کیا کروں میں۔ بہتیرا کہا مگر.......... اب گلے میں تو جھولنے سے رہی۔"

اماں نے جھنجلا کر جواب دیا اور تکیہ منے دادا کی طرف بڑھا دیا۔ منے دادا نے تکیہ منی دادی کو دیا اور خود اٹھ کھڑے ہوئے۔ مجھے لگا جیسے انہوں نے مجھے ہلکا سا اشارہ کیا ہے۔ سب میری ہی طرف متوجہ تھے اس لئے میں الجھ گیا۔ میں نے دیکھا کہ منے دادا' دادا والے کمرے میں جا رہے تھے' میری نگاہیں ان کا تعاقب کر رہی تھیں' دروازے پر رکے اور انہوں پلٹ کر مجھے دیکھا' تصدیق ہو گئی کہ وہ میرا شک نہیں تھا۔ ادھر عصمت آپا طیب اور اماں سے لڑ رہی تھیں کہ انہوں نے پان کیوں کھایا جب وہ کھانا لگا چکی ہیں۔ میں ان لوگوں کی توجہ بٹتے دیکھ کر اٹھ گیا۔ اماں نے سب سے کہا کہ وہ جا کر کھانا کھائیں۔ طیب اب کلی کرنے چلا گیا۔ میں بھی ایسے ہی اٹھا جیسے ہاتھ دھو کر کھانے پر جاؤں گا مگر سیدھا دادا کے پاس چلا آیا۔

منے دادا کے چہرے پر پریشانی تھی۔ "ضیاء..........! تم بھائی کی قبر پر چلے جاؤ۔"

"جی! میں حیران ہو گیا۔ "کیا بات ہے.......... خیریت تو ہے نا؟!"

"نہیں..........! مجھے لگتا ہے کہ خیریت نہیں ہے۔" انہوں نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا اور کمرے میں ٹہلنے لگے۔

"منے دادا..........! آپ پُر سکون رہ کر مجھے بتایئے۔" میں نے ان کے کاندھے تھام لئے۔

"کیا تم.......... تم محسوس کر رہے ہو کہ یہاں سکون ہے؟"

"جی..........! میرا خیال ہے کہ یہاں کافی سکون ہے۔" میں الجھا ہوا تھا مگر اس کے سوا کیا کہہ سکتا تھا۔ میں نے ایسی کوئی ابتری نہیں دیکھی تھی۔ "میرے حساب سے تو سکون ہی ہے۔"

"نہیں ضیاء..........! مجھے نہیں لگتا کہ یہاں سکون ہے۔ میں یہاں ہر رات بھائی کو ٹہلتا ہوا اور مضطرب دیکھتا ہوں۔"

"منے دادا..........! آپ کی محبتیں ہیں' جذبوں کی شدتیں ہیں جو مجسم ہو جاتی ہیں۔" میں انہیں تسلی دے رہا تھا مگر سچی بات یہ ہے کہ یہ خبر میرے لئے بھی تکلیف دہ اور ایک مستند خبر تھی۔ میں ہی نہیں' طیب بھی دادا کو دیکھ چکا تھا۔ یہ خیال طیب کا بھی تھا کہ کوئی چکر ہے اور جو کچھ مجھ پر بیتا تھا وہ تو میں ہی جانتا تھا۔ کتنا ہی حقیقی کیوں نہ لگے' خواب بہرحال اپنی پہچان کرا دیتا ہے۔ آدمی کو جاگتے ہی احساس ہوتا ہے کہ وہ حالت خواب میں رہا ہے مگر میں اب تک ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے یہ سب آج ہی بیتا ہے۔ دادا آج مرے ہیں' میرے سر میں اب بھی تکلیف تھی۔ گو شالی بابا سے ملاقات نے' طیب نے' زرین میں ہونے نے اور اب گھر آنے نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ سب خواب تھا مگر.......... اس کے علاوہ بھی کچھ تھا۔ یہی بات منے دادا بھی کر رہے تھے۔

"ضیاء! سب ٹھیک ہے۔ میں مانتا ہوں.......... ہو سکتا ہے' میرے ذہن سے ان کے ٹہلنے اور مضطرب رہنے والا سین نہ نکل سکا ہو لیکن.......... وہ کچھ کہتے ہیں' زیر لب بڑبڑاتے ہیں جو میری سمجھ میں نہیں آتا' صرف تمہارا نام سنائی دیتا ہے۔ اسی لئے کہہ رہا ہوں کہ پہلی فرصت میں ان کی قبر پر جا کر فاتحہ پڑھ آؤ۔"

"میں آج ہی جاؤں گا منے دادا۔ میں بھی انہیں خود سے قریب اور مضطرب محسوس کرتا ہوں۔" میں نے دادا پر قطعی یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ یہ کوئی سنجیدہ نشان

کن بات ہے بلکہ یہی ظاہر کیا کہ ان کا بے چین دل ہے جو انہیں ڈسٹرب کر رہا ہے اور وہ ان کی جدائی کو برداشت نہیں کر پا رہا۔

"ٹھیک ہے........ مگر ضیاء.........!" اس بار وہ اور زیادہ پریشان تھے۔

"کیا بات ہے منے دادا؟"

"ضیاء میں بھی وہاں جانا چاہتا ہوں مگر........ پتا نہیں، کون سا خوف ہے جو مجھے ڈراتا ہے۔"

"کوئی بات نہیں منے دادا! میں ہوں نا! میں اور طیب چلے جائیں گے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔"

"وہاں تاج الدین ہوگا۔ اس سے کہنا، قبر پکی کر دے۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ چلیں کھانا کھا لیں۔"

میں انھیں تسلی دے کر لے آیا۔ سب کے سامنے خود کو مطمئن ظاہر کرنا کتنا مشکل کام ہے، اس کا اندازہ مجھے آج ہو رہا تھا۔ وہ اضطراب جو اندر محسوس ہوا تھا اس کا سبب بھی سمجھ میں آ چکا تھا۔ کہیں نہ کہیں، کچھ نہ کچھ غلط ضرور تھا۔ شالی بابا نے ذرا سا بھی وقت نہیں دیا تھا، نہ یہ بتایا تھا کہ آخر گھر کے دوسرے افراد کو کس طرح محفوظ کروں۔ مسئلہ میرے اکیلے کا نہیں تھا۔ میں تو ہر فرد کو خوف کی اس کیفیت سے نکالنا چاہتا تھا۔ یہاں تو ہر فرد مطمئن تھا سوائے منے دادا کے۔

☆============☆==========☆

کھانے سے فارغ ہو کر میں اور طیب کچھ آرام کرنے کے لئے اپنے کمرے میں آ گئے۔ منے دادا جب بھی یہاں آتے دادا ہی کے کمرے میں قیام کرتے تھے۔ اب بھی وہیں تھے۔ دادی، اماں کے ساتھ برآمدے میں لیٹی تھیں، عصمت آپا حسب معمول غائب تھیں، میں نے کمرے میں آتے ہی سب سے پہلے طیب کو منے دادا والا واقعہ سنایا۔ اس نے بھی فتویٰ دے دیا کہ ضرور کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہے۔

"اب آخر کروں کیا؟" میں پریشان ہو گیا۔

"اللہ سے مدد مانگو۔" طیب نے یونہی سرسری انداز میں کہا تھا مگر بات میرے دل میں جم گئی اور ایسی بیٹھی کہ میں پھر کچھ نہیں سوچ سکا۔ طیب ذرا ہی دیر بعد خراٹے لے رہا تھا۔ مجھے اس پر رشک آیا، میں تو آنکھیں بھی نہیں موند سکا تھا۔ اٹھا اور غسل کرنے کے بعد وضو کیا، جائے نماز پر بیٹھا اور سر بسجود ہو گیا۔ اس سے مدد مانگنا چاہیے تھی، یہ احساس کچوکے لگا رہا تھا۔ میں تو پابندی سے نماز تک نہیں پڑھتا تھا۔ اپنی طاقت پر اتنا گھمنڈ کیا کہ اس پراسرار طاقت سے ٹکرا گیا اور کبھی یہ خیال نہ آیا کہ خدا کے سوا میری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ شالی بابا نے تعویذ دیا تھا۔ ہمت پیدا کرنے کو کہا تھا مگر ان کی پوری توجہ اب بھی نہیں پا سکا تھا۔ نماز ادا کی، دعا کی تو لگا جیسے ہمت اس لئے ٹوٹ گئی تھی کہ خدا کو بھول گیا تھا، شالی بابا نے توجہ نہ دی تو یقیناً اس کا سبب بھی یہی ہوگا ورنہ وہ وعدہ کر چکے تھے، صرف وعدہ نبھانے کو چلے آئے اور اشارہ دے کر پھر غائب ہو گئے۔

نماز اور دعا سے بڑا سکون ملا۔ نیند نہیں آئی۔ اٹھ کر دادا کے کمرے کی طرف گیا تو وہاں منے دادا کو سر بسجود دیکھا، وہ بلند آواز میں شیطانوں سے پناہ مانگ رہے تھے۔ ان کے رخسار گیلے تھے۔ دل رقت سے لرز اٹھا۔ اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔ نہ جانے کیا خیال آیا، شالی بابا کا دیا ہوا تعویذ کھول کر پڑھا۔ قرآنی آیات لکھی تھیں۔ چوم کر دوبارہ بند کیا اور

گلے میں پہن لیا۔ اب دل ٹھہر گیا تھا' اضطراب 'سکون میں تبدیل ہو گیا۔ نیند کا غلبہ ہوا اور میں بے فکر ہو کر سو گیا۔

☆-----☆-----☆

شام ڈھلے آنکھ کھلی۔ گھر میں چہل پہل تھی۔ طیب منی دادی اور دادی کو لئے بیٹھا میرٹھ چلنے پر آمادہ کرنے میں لگا ہوا تھا۔ اماں ڈانٹ رہی تھیں کہ اتنا لمبا سفر کر کے آئے ہو' سکون سے بیٹھے رہو۔ منے دادا مغرب کی نماز پڑھ رہے تھے۔ صحن میں بچھی چوکی پر بیٹھے وہ دور سے بالکل دادا ابا جیسے لگ رہے تھے۔ میں بھی وضو کر کے تیار ہو گیا۔ منے دادا کے چوکی سے اترنے کے بعد اس طرف بڑھا تو طیب مجھے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اماں خوش تھیں' دادی خود بھی شاید نماز سے فارغ ہو کر بیٹھی تھیں اور اب تسبیح کے دانے پھیر رہی تھیں۔ میں طیب کی طرف دیکھے بغیر نماز کے لئے کھڑا ہو گیا۔ اتنا سنا کہ اماں طیب' بھی حیا ولا رہی تھیں۔

میرا ارادہ' نماز کے بعد قبرستان جانے کا تھا۔ میں نے پھر اپنے خدا سے مدد مانگی' دعائیں کیں اور فارغ ہو کر طیب سے قبرستان چلنے کو کہا۔ طیب نے نماز ادا کی مگر بڑی بے دھیانی سے' اس کے چہرے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ صرف لوگوں کے کہنے میں آکر فرض ادا کر رہا ہے۔ میں نے سوچا کہ راستے میں اسے سمجھاؤں گا کہ خدا کے آگے آدمی کا جسم ہی نہیں' روح بھی جاتی ہے اور روح تیار ہو تو اس کا رابطہ باقی دنیا سے کٹ جاتا ہے۔ آدمی آنکھیں نچا نچا کر اپنے گردوپیش سے باخبر نہیں رہ پاتا۔

ہم قبرستان کے لئے روانہ ہوئے تو منے دادا نے کچھ پڑھ کر ہم دونوں پر پھونکا۔ طیب میری بدلی ہوئی کیفیت سے ابھی تک پریشان تھا۔ "یار یہ کایا کیسے پلٹ گئی! اتنے دنوں میں نے تمہیں نماز پڑھتے نہیں دیکھا اور اب.........؟"

"اگر میں بے پروائی کر رہا تھا اور آج مجھے اپنے فرائض کا احساس ہو گیا ہے تو کیا یہ تشویش کی بات ہے؟"

"نہیں.........! حیرت کی تو ہے؟" وہ بولا۔

"ہاں! لیکن خوشگوار حیرت کی۔" میں مسکرایا۔ "ہم اپنے فرائض سے غافل ہو جاتے ہیں طیب اور چاہتے ہیں کہ دوسرے اپنے فرائض ادا کرتے رہیں۔ خود حق ادا نہیں کرتے اور دوسروں سے چاہتے ہیں کہ وہ ہمارے حقوق ادا کر دیں۔ یہی خدا کے

معاملے میں بھی ہوتا ہے۔ ہم خدا سے چاہتے ہیں کہ وہ ہمارے ساتھ سب کچھ ٹھیک اور اچھا کرتا رہے اور ہم اس سے غافل رہیں۔ میں تمہیں مثال دیتا ہوں' اگر میں کمرے میں دھوپ کے رخ کھلنے والی کھڑکی بند نہ کروں اور یہ چاہتا رہوں کہ کمرا ٹھنڈا رہے تو یہ کیسے ممکن ہے یا ہوا کے رخ والی کھڑکی نہ کھولوں اور چاہوں کہ فرحت انگیز ہوا مجھے چھوتی رہے' تو کیا یہ ہو سکتا ہے؟"

طیب خاموش ہو کر مجھے دیکھنے لگا۔ پھر ہم نے تانگا کر لیا۔ قبرستان کافی دور تھا۔ سورج اپنی تمازت کو سمیٹ چکا تھا۔ سرمئی پن بڑا اچھا لگ رہا تھا۔ سڑکوں پر چہل پہل تھی۔ تانگہ درمیانی رفتار سے چل رہا تھا۔ طیب اب تک کچھ نہیں بولا تھا۔ اچانک اس نے کہا۔

"ضیاء! تمہیں ڈیوٹی کب جوائن کرنا ہے؟"

"کیوں؟"

"کام ہے......... تم بتاؤ تو؟"

"اصولاً تو مجھے اب سے ہفتہ بھر پہلے ہی ڈیوٹی جوائن کرنا چاہئے تھی مگر......... میرا خیال ہے کہ مجھے مزید چھٹیاں لینا پڑیں گی۔"

"کیوں؟" وہ کسی اندرونی خلفشار کا شکار تھا۔

"میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا کرنا چاہیے؟ ویسے کل جاؤں گا آفس۔"

"تم کل مزید چھٹی لے لو۔"

"کیوں؟"

"ہم میرٹھ چلیں گے۔" خلفشار کی وجہ سمجھ میں آگئی۔ اس کا براہ راست فرحت یا بی جان سے کوئی رشتہ نہیں تھا اس لئے اس کا اکیلے جانا بھی ٹھیک نہیں تھا' نہ ہی بی جان بھی اس سے اس حد تک بے تکلف ہوئی تھیں کہ وہ وہاں جائے۔ ان پُر اسرار واقعات سے بھی اس کا براہ راست تعلق نہیں تھا شاید یہی خلفشار تھا جو اسے بے چین کر رہا تھا۔

"کہہ نہیں سکتا کہ آفس میں کیا صورت حال ہوتی ہے۔" میں نے ٹال دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس موضوع پر زیادہ بات کرے۔

"یار ضیاء......... تمہیں اپنا وعدہ یاد ہے ناں؟"

"کون سا وعدہ؟"

"فرحت والا۔"

"کیا مطلب؟" میں الجھ گیا۔ مجھے یاد نہیں تھا کہ میں نے اس سے کوئی وعدہ بھی کیا ہے۔

"میں نے تمہیں بتایا تھا ناں۔ وہ مجھے پسند ہے۔"

"اور وہ مونیکا...... نیہ...... ان کا کیا ہوگا؟" میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

"ان کے معاملے میں میں سنجیدہ نہیں ہوں۔ یہ دل کا معاملہ نہیں ہے۔"

"پہلے تم سنجیدگی کی عمر کو پہنچ جاؤ پھر دیکھیں گے۔" میں نے بات کا جواب دے کر اپنا رخ دوسری جانب کرلیا۔ مقصد یہ تھا کہ وہ اس موضوع پر بات نہ کرے۔ میں نہیں جانتا کہ وہ کیا سوچ کر چپ ہوگیا۔

اب اندھیرا گہرا ہونے لگا تھا۔ ہم شہر کی مصروف سڑک سے نسبتاً سنسان راستے پر سفر کر رہے تھے۔ یہ سڑک بہت دور تک جاتی دکھائی دے رہی تھی۔ یہاں آبادی نہیں تھی اور دونوں جانب دور دور تک جھاڑیاں تھیں۔ قبرستان کے آثار بھی کہیں نظر نہیں آرہے تھے۔

"بابا کیا ہم صحیح راستے پر جارہے ہیں؟" میں نے تانگے والے کو مخاطب کیا۔

"ہاں میاں جی...... ! یہی راستہ آگے جاکر دائیں کو مڑتا ہے۔ ابھی تین روز پہلے ہی آیا ہوں یہاں۔" اس نے پان سے پیلے دانت نکال کر جواب دیا۔

میں مطمئن ہوگیا مگر طیب کو گہری سوچ میں ڈوبا دیکھ کر جان گیا کہ وہ ابھی تک وہ کچھ سوچ رہا ہے' جو میں سوچنا نہیں چاہتا۔ اس بنا پر میں نے تانگے والے سے گفتگو شروع کردی۔ وہ بولتا رہا۔ بمبئی کا تھا' وہیں کے قصے سناتا رہا پھر اچانک بولا۔ "میں گورکن تھا ناں!"

"کیا...... گورکن! پھر تانگہ کیوں چلانے لگے؟"

"کیا کریں جی! پیٹ نہیں بھرتا تھا۔ اکیلے کے بس کی بات بھی نہ تھی کہ رات کو قبرستان میں رہ لے۔ قبر کھودنا' لیپنا' پوتنا مشکل نہیں تھا مگر یہ جو بدروحیں ہوتی ہیں' یہ ناک میں دم کردیتی تھیں۔"

"ہیں! کیا!! کیسی بدروحیں؟" طیب جانے کیسے اس طرف متوجہ ہوگیا۔

"بدروحیں ایک ہی طرح کی ہوتی ہیں جی...... ! تنگ کرنے والی' جھنگنے اور ڈرانے والی۔"

"تمہیں بھی تنگ کرتی تھیں؟" اس نے پوچھا۔

"بہوت...... بہوت تنگ کرتی تھیں۔ وہ تو ہماری دادی کا کارنامہ تھا کہ کبھی ہمارا بال بھی بیکا نہ کرسکیں ورنہ ہم نے انہیں لوگوں کو پٹخنیاں دیتے تک دیکھا ہے۔"

"یار ضیاء...... ! یہ آدمی کام کا لگتا ہے۔" طیب نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

مجھے سو فیصد یقین تھا کہ وہ گپ ہانک رہا ہے مگر طیب کافی سنجیدہ ہوچکا تھا۔

"نام کیا ہے بھیا تمہارا!"

"پیٹر۔" اس نے پھیپڑیا سے پان نکال کر کھاتے ہوئے کہا۔

"تمہاری دادی ہر قسم کی روح بھگا دیتی ہیں؟"

"روحیں بھاگتی کہاں ہیں' غائب ہوتی ہیں۔" وہ زور سے ہنسا۔

"ہاں! وہی' وہی یار! ہمیں ان سے کچھ کام ہے۔ واپسی تک تو رکو گے ہی' ذرا ان سے ملا دینا۔"

طیب واقعی سنجیدہ نظر آرہا تھا۔ میں نے سوچا چلو' اس بہانے دماغ کا خناس اترا رہے گا۔ فرحت کے بارے میں زیادہ ترکیبیں نہیں سوچے گا۔ ویسے فرحت کی وجہ سے میں واقعی بہت پریشان تھا۔ مگر طیب کی موجودگی پتا نہیں کیوں مجھے خوفزدہ کررہی تھی۔ شاید اس کے شگفتہ انداز گفتگو' برجستگی' جرأت اور...... اور چہکتے بولتے رہنے کی عادت سے خوفزدہ تھا۔ بہرحال کچھ تھا جو میں اسے وہاں نہیں لے جانا چاہتا تھا اور یہ بھی چاہتا تھا کہ انہیں یہاں لے آؤں۔

"ضیاء!" طیب نے مجھے چونکا دیا۔ "ہوں!" میں نے سگریٹ جیب سے نکالتے ہوئے کہا۔

"واپسی پہ پیٹر بھیا کی دادی سے ضرور ملیں گے۔ کبھی کوئی ایسا بندہ بھی کام کا نکل آتا ہے جس کی طرف نہ دھیان جائے' نہ اس سے توقع ہو۔"

"ٹھیک ہے مگر......" میں نے کن انکھیوں سے تانگے والے کی طرف دیکھا اور اسے اپنی ہی جانب متوجہ پاکر چپ ہوگیا۔

"مگر کیا؟"

"مگر پہلے فاتحہ پڑھنے دادا کی قبر تک تو پہنچو۔" میں جھلا گیا" پھر میں ہی نہیں 'طیب اور تانگے والا بھی چونک اٹھا۔

"ارے ہاں............! وہ دائیں ہاتھ پر راستہ تو آیا ہی نہیں۔" تانگے والا خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑایا۔

ہم نے پلٹ کر دور تک دیکھا۔ "شاید آگے ہو۔" میں نے کہا۔

"نہیں میاں جی! اتنی دور تو نہیں تھا۔ یہ تو ہم کئی فرلانگ دور آگئے۔"

"تو پھر باتوں میں پیچھے رہ گیا ہوگا۔" طیب نے کہا۔ "چلو واپس چلو۔"

پھر ہم پلٹ کر بڑی سڑک کے کنارے تک چلے آئے مگر کہیں کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں خود بھی حیران تھا' گو میں اس سے پہلے اس سڑک سے تو قبرستان نہیں آیا تھا مگر یہ سڑک بھی بڑی سڑک سے اندر کو مڑتی تھی پھر آگے راستے کے ساتھ ہی قبرستان کی چار دیواری نظر آنے لگتی تھی جبکہ ہم اس سڑک پر کافی دور تک اندر جا کر لوٹے تھے۔

"کسی سے پوچھ لو۔" طیب نے مصروف سڑک کے قریب پہنچ کر کہا۔

تانگے والے نے ایک چھابڑی والے سے پوچھا جو امرود صاف کر کے سجا رہا تھا۔ اس نے پھر اسی سڑک پر اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہی سڑک آگے دائیں کو مڑے گی' وہاں مڑتے ہی آپ کو قبرستان کی چار دیواری نظر آجائے گی۔"

مگر ایسا نہیں تھا' ہم لوٹے تو کافی دھیان سے تھے اور تانگے والا یہ ماننے کو تیار نہ تھا کہ جہاں سے ہم لوٹے ہیں' راستہ اس سے کہیں آگے ہوگا۔

"یہ ضرور بدروحوں کا چکر ہے۔" اس نے تانگے کو بڑی سڑک پر لاتے ہوئے کہا۔ "دوسرا راستہ دیکھ لیتے ہیں۔"

اب وہ جس کے راستے پر آیا تھا۔ وہ میرا جانا پہچانا تھا' یہ وہی راستہ تھا جہاں میں اکثر آیا کرتا تھا۔ دادا کے انتقال کے بعد کئی بار آچکا تھا۔

"ہاں بھئی! اب جو راستہ بائیں کو آئے گا' اس سے اندر لے لینا۔" میں نے تانگے والے کو جتایا اور طیب کی طرف متوجہ ہوگیا جو گنگنانے لگا تھا۔

"چھوڑ بابل کا گھر' موہے پی کے نگر آج جانا پڑا۔" یہ گیت گنگناتے سنا تو مجھے ہنسی آئی پھر ایک دم غصہ آگیا۔

"انتہائی فضول ذوق ہے تمہارا۔"

"لو............! اس میں ذوق کی کیا بات ہے۔ خوشی کا گانا ہے۔ آدمی خوش ہوگا تو تیری دنیا میں جی لگتا نہیں' واپس بلا لے' تو گائے گا نہیں۔ یار! تمہیں صرف اعتراض کرنا آتا ہے۔" وہ چڑ گیا۔ جو ہنسی میں نے دبائی تھی وہ ہونٹوں تک رینگ آئی جس نے طیب کو چپتی حوصلہ دیا اور وہ پھر گنگنانے لگا۔

"میاں جی قبرستان کے آس پاس اور وہ بھی مغرب کے بعد' ایسی حرکتیں مردے پسند نہیں کرتے۔" تانگے والے نے کہا تو میں بے ساختہ ہنس پڑا۔

"اچھا گویا اب تک میں زندوں کے لئے تو جذبات دبا تا ہی رہا ہوں' ارمانوں کا گلا بھی اکثر گھونٹتا رہا ہوں' اب مجھے مردوں کی پسند ناپسند کا بھی خیال کرنا پڑے گا۔" طیب جل گیا۔

"نئی............ ہمیں ذاتی طور پر کوئی اعتراض نہیں ہے' مگر میاں جی ہمارا ان کی کسی حرکت سے واسطہ نہیں ہے۔ آپ اس کے گواہ رہیے گا۔"

اس نے یوں مجھے گواہ بنایا جیسے جلد ہی مجھے اس کے حق میں کسی مردے کے سامنے گواہی کے لئے تیار رہنا ہوگا۔

طیب جل کر چپ ہوگیا۔ وہ خاموش ہوا تو کہیں دور سناٹے میں کسی اور تانگے کی موجودگی کا احساس گھوڑے کی ٹاپوں اور پہیوں سے نکلنے والی چوں چاں سے ہوا۔

"وہ راستہ............؟" میں چونک اٹھا۔ ہم اب بھی سیدھا جا رہے تھے اور یہ سڑک بالکل ویسی ہی لگ رہی تھی جس کو ہم اب سے پہلے چھوڑ آئے تھے۔ اس کے بھی دونوں اطراف دور تک جھاڑیاں تھیں' دائیں بائیں کہیں کوئی راستہ نہیں تھا۔ ہو بہو وہی ذیلی سڑک۔ "یار! یہ............ یہ وہ راستہ تو نہیں۔" میں بے ساختہ بول اٹھا۔ "اس راستے پر تو پھولوں والوں کی دکانیں تھیں۔

ایک دھوبی کا گھاٹ بھی پڑتا تھا۔"

"ارے ہاں............! یاد آیا............ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ یہ سب تھا میاں جی!" تانگے والے نے باگیں کھینچ لیں۔ "یہ............ یہ تو وہی رستہ ہے۔" وہ غور سے چاروں طرف دیکھ کر بڑبڑایا۔

اب مجھے گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔ رات نہ صرف اتر آئی تھی بلکہ اندھیرا بڑھتا ہی

بارہا تھا۔ یہ سڑکیں دور دور لگے پولوں کی روشنی میں نیم روشن تھیں۔ ویرانی بے وجہ پُراسرار لگنے لگی تھی۔

"واپس چلو۔" طیب گھبرا گیا۔

تانگے والے نے پھر راستہ بدل لیا۔ اب ہم پھر بڑی سڑک پر جا رہے تھے۔ دونو جانب دیکھ رہے تھے کہ کہیں راستہ اس بار پھر بے دھیانی میں نہ نکل گیا ہو لیکن یہ سو صد وہی سڑک تھی۔ یہ وہی چھابڑی والا تھا جس سے ہم نے چپلی نہیں بلکہ غالباً ا سڑک پر قبرستان کا راستہ پوچھا تھا۔ تانگے والے کے چہرے پر زردی چھا گئی۔ چھابڑی وا جو ایک کپڑے سے امرود صاف کر کر کے سجا رہا تھا تانگے والے کو دیکھنے لگا۔

تانگے والا بے اختیار وہی جملے دوہرا بیٹھا جو اس نے کچھ دیر پہلے کہے تھے۔ چھابڑ والا اسی سڑک کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ "یہی سڑک آگے دائیں کو مڑے گی' وا مڑتے ہی آپ کو قبرستان کی چار دیواری نظر آ جائے گی۔"

اس بار تانگے والے نے اس کا پورا جملہ نہیں سنا' گھوڑے پر چابک برسایا ا چوڑی مصروف سڑک پر تانگا ڈال دیا۔ میں اور طیب اسے روکتے رہ گئے۔ وہ رکا مگر دور جا کر۔ وہ ایسے ہانپ رہا تھا جیسے ہمیں اور چھکڑے کو گھوڑا نہیں' وہ خود کھینچ کر لایا ہو۔

"دیکھا آپ نے.......... ہم نے کہا تھا نا کہ ایسی حرکتیں مردے پسند نہ کرتے۔" وہ طیب پر گرم ہو گیا۔

"ابے! تو مردے نے کیا کیا ہے۔" طیب بھی جل گیا۔

"لو..........! انھیں پتا ہی نہیں۔"

"پیٹر بھیا!" میں نے اسے مخاطب کیا اور کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ میرے ا سے نرم ہو گیا مگر چہرے پر زردی کم نہ ہوئی۔ "یہ ہوا کیا' ہم دوسری مرتبہ تو گھوم دوسری سڑک پر گئے تھے ناں؟"

"اور کیا.......... دودھ والے کی دکان والے نکڑ سے اندر گئے تھے۔ سیدھے گئے تھے۔ کہیں مڑے بھی نہیں تھے پھر بھی.......... پھر بھی لوٹے تو.........." خوف رفتہ رفتہ اسے جکڑ لیا تھا۔ وہ جملہ پورا نہیں کر پایا' آواز گھٹ کر رہ گئی۔

میں طیب کو اور طیب مجھے دیکھ رہا تھا۔ جو کچھ ہم دونوں سوچ رہے تھے' تھوڑ سے فرق کے ساتھ وہی بات تانگے والے نے کہہ دی۔

"یہ کسی بدروح کا کارنامہ ہے۔ قسم یسوع مسیح کی! ایسی ہی حرکتیں کرتی ہیں وہ۔" وہ روہانسا ہو کر پُریقین انداز میں بولا۔

"پھر تم کیا کرتے ہو؟" میں اب کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔

"سیدھا دادی کے پاس جاتا ہوں۔ جب تک پھنکوا نہ لوں اپنے گھر نہیں جاتا۔ میاں جی' معصوم بچیاں ہیں گھر پر۔ بات ان پر جا پڑی تو کیا کروں گا۔"

"پہلے بھی کبھی ایسا ہوا ہے؟" طیب نے پوچھا۔

"ہاں..........! شاید دو برس ہو گئے۔ اپنے دوست کی دادی کی قبر پر جا رہا تھا اس کے ساتھ۔ اس وقت میری دادی گوا میں رہتی تھیں۔ بدروح نے مجھے ادھ موا کر کے رکھ دیا تھا۔ زیادہ حالت خراب ہوئی تو میری ماں اور باپ نے دادی کو بلوا لیا۔ تب سے وہ یہیں ہیں۔ بہت سے لوگ آتے ہیں ان کے پاس۔ میرا خیال ہے آپ کو بھی اپنے گھر جانے سے پہلے ان سے مل لینا چاہیے۔"

نہ معلوم کیوں گوا کے نام پر میرے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔ "کیا نام ہے تمھاری دادی کا؟"

"وتسلا۔"

پھر میں ہی نہیں طیب بھی اچھل پڑا۔ اگر یہ وہی وتسلا کھنیکر تھی جو بقول رابرٹ کے گوا میں رہتی تھی اور پھر وہاں سے غائب ہو گئی تھی' اگر یہ وہی وتسلا تھی جس کے بارے میں مجھے خواب میں زیوسا نے الین کا دست راست بتایا تھا تو ہمارا کام آسان ہونے والا تھا۔ میں گزرے واقعات کو قطعی بھول گیا اور خود پر خوف طاری کرنے کو اداکاری کر کے پیٹر کو شیشے میں اتار لیا کہ ہم اس کی دادی سے ملے بغیر اب گھر نہیں جا سکتے۔ میں نے اس کا بہت شکریہ بھی ادا کیا کہ اس نے ہماری خاطر یہ پریشانی اٹھائی۔ اسے دس روپے بھی دیے جو اس وقت شاید ایک ہزار روپے کے برابر تھے۔ کوئی اور ہوتا تو شاید اتنی رقم دیکھ کر سارا خوف بھول جاتا مگر اس نے کہا۔

"چھوڑیں میاں جی! بات پیسے کی نہیں' وقت کم ہے۔ ہمیں جلدی چلنا چاہیے۔"

میں نے دس کا نوٹ اس کی جیب میں ٹھونس دیا۔ اس نے گھوڑے پر چابک برسانے شروع کر دیے۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم ایک ایسے علاقے میں داخل ہو گئے جہاں زیادہ آبادی

عیسائیوں کی تھی۔ میں نے عیسائیوں کو کبھی تانگہ چلاتے نہیں دیکھا تھا جو اپنے آپ کو گورکن اور اب تانگے والا ثابت کر رہا تھا وہ۔ اردو بہت صاف بول رہا تھا۔ اپنے انداز سے وہ قطعی عیسائی نہیں لگ رہا تھا۔ اس کا رنگ صاف تھا۔ گلے میں صلیب والا لاکٹ بھی نہیں تھا۔ کرتے پاجامے میں ملبوس تھا' سوائے نام کے مجھے اس میں کہیں سے بھی عیسائیت کی جھلک دکھائی نہیں دی تھی۔

ایک بہت بڑے چرچ کے پاس جاکر اس نے گھوڑے کی لگامیں کھینچ لیں۔

"آجایئے!" وہ عجلت میں چھلانگ لگا کر نیچے اتر گیا۔ یہاں کافی روشنی تھی۔ چرچ کے دائیں جانب لکڑی کی ایک عمارت تھی جو تین منزلہ تھی۔ یہاں چھوٹے چھوٹے سے گھر بنے ہوئے تھے۔ انڈیا میں اس قسم کے چھوٹے چھوٹے کمروں والی عمارت کو چال کہا جاتا ہے۔ وہاں تک پہنچنے کے لئے ہمیں چرچ کے مین گیٹ کو عبور کرکے جانا تھا۔ میں اور طیب بھی اتر آئے۔ اندر جس طرف ہم جا رہے تھے وہاں قدرے اندھیرا تھا۔ فلیٹوں کی روشنی چھن چھن کر باہر آ رہی تھی۔ اس طرف باہر' پرانے زمانے کے لیمپ پوسٹ تو تھے مگر ان میں بلب روشن نہیں تھے جبکہ دوسری طرف چرچ کے سامنے' سیڑھیوں پر اور عمارت کے قریب کافی روشنی تھی۔

پیٹر بہت تیز چل رہا تھا۔ اچانک وہ پلٹا اور بولا۔ "دیکھو میری آنکھوں میں نباہت تو نہیں ہے۔"

"اس اندھیرے میں تو آنکھ کا شہتیر بھی دکھائی نہیں دے گا پیٹر بھیا! رنگ کہاں سے نظر آئے گا۔" طیب نے جواب دیا جو اس کے پیچھے تیز تیز چلنے کی وجہ سے جھنجلایا ہوا تھا۔ "اور کتنی دور جانا ہے؟" اس نے منہ بنا کر پوچھا۔

"اس طرف کچھ دور چلنا ہے۔" اس نے عمارت کے پیچھے پہنچنے کے بعد پرانے راستے کی طرف اشارہ کیا جو گھوم کر گیٹ کے قریب جاتا تھا۔

"تو دوسری طرف سے کیوں نہیں آئے' یہ لمبا راستہ ہے۔"

"اب تو ہر راستہ لمبا لگے گا میاں جی۔ شکر کرو ہم یہاں پہنچ گئے۔ روحیں تو سارے راستے بدل دیتی ہیں۔ آدمی چلا کہیں اور جانے کے لئے ہے اور جا نکلتا ہے کہیں اور۔ یہ ہوتے ہیں بدروحوں کے کھیل۔"

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا' ہم بھی تو کہاں تھے اور کہاں آ پہنچے تھے ورنہ کہاں میرٹھ؟

پرسکون' بے فکری زندگی اور کہاں یہ ہنگامے' خوف اور مسئلوں کی بھول بھلیاں۔ ٹکریاں ہوئیں' پے در پے ہونے والے حادثات' یہ سب کیا تھا' بقول پیٹر بدروحوں کا کھیل' اور ہم نہ چاہتے ہوئے بھی اس گھناؤنے اور تھکا دینے والے کھیل میں گھرتے جا رہے تھے۔

اچانک پیٹر رک گیا۔ وہ ان چھوٹے چھوٹے فلیٹوں والی عمارت کے ایک طرف بنے 'ٹانگ۔ سے کوارٹر کے سامنے کھڑا تھا۔ اس مکان کا دروازہ ہمارے سامنے تھا۔ اس میں کنڈی لگی ہوئی تھی اور بڑا سا تالا ہمارا منہ چڑا رہا تھا۔ پیٹر اسے دیکھ کر ہراساں ہو گیا۔

"یہ........ یہ تو۔"

"نہیں ہیں۔" طیب نے جملہ پورا کردیا۔ "سوال یہ ہے کہ انہیں اس عمر میں گھومنے پھرنے سے فرصت نہیں ہے۔"

"نہیں........! وہ تو چل ہی نہیں سکتیں۔"

"ہیں........! پھر........! کہاں جاسکتی ہیں؟ کیا کوئی اور انہیں لے گیا ہے؟"

"نہیں........! انہوں نے تو گزشتہ دو برس سے پلنگ سے پاؤں بھی نہیں اتارا۔ انہیں کوئی بھی کہیں لے جانے والا نہیں ہے" وہ پریشان تھا۔ "اب میرا کیا ہوگا؟"

"ہوسکتا ہے' تمہارا باپ اسے تمہارے گھر لے گیا ہو۔" طیب جو سوچتا تھا' وہ بولتا رہتا تھا۔

"میرا باپ نہیں ہے۔" اس نے جواب دیا اور کوئی ایسی روزن تلاش کرنے لگا جہاں سے اندر جھانک سکے۔

"پھر ماں ہوگی۔"

"وہ بھی نہیں ہے۔" پیٹر نے دروازے کے ابھرے ہوئے پٹ کو انگلی کی پوروں سے کھولنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"بھائی وغیرہ........"

"کوئی نہیں ہے میاں جی! دادی کا دنیا میں میرے سوا کوئی نہیں ہے۔" وہ پلٹ کر چیخنے کے سے انداز میں بولا۔

میں نے محسوس کیا کہ اس کی حالت واقعی بہت خراب ہے۔ وہ سخت خوفزدہ ہے۔

"پیٹر گھبراؤ مت۔" میں نے ہاتھ اس کے شانے پر رکھ دیا۔ اس کی دادی کی غیر موجودگی نے مجھے بھی مایوسی سے دوچار کیا تھا مگر اس میں خوفزدہ ہونے والی کوئی بات نہیں تھی۔ جو

کچھ پیٹر کے ساتھ پیش آیا تھا وہی کچھ ہمارے ساتھ بھی پیش آیا تھا اور یہ قطعی اس قدر ہراساں ہونے والی بات نہیں تھی۔

"وہ کہاں چلی گئیں؟" پیٹر دیوار سے ٹیک لگا کر نڈھال ہو گیا۔

"جہاں بھی گئی ہیں لوٹ آئیں گی' میرا مطلب ہے کہ انہیں اگر کوئی لے کر گیا ہے تو وہ ضرور واپس لائے گا' تم یہ سوچو کہ آخر کون انہیں لے جا سکتا ہے؟؟"

"بھیا جی! میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

عین اسی لمحے ہمیں اندر آہٹ محسوس ہوئی۔ یہ آواز پیٹر نے بھی سن لی تھی۔ اب وہ حیرت سے بند دروازے کو دیکھ رہا تھا پھر ہماری طرف پلٹا۔ "آپ نے سنا!! آواز آئی تھی؟؟"

"وہ شاید اندر ہی ہیں۔"

میں دروازے کے قریب ہو گیا۔ میں نے اور طیب نے' دونوں نے ہی اندر آہٹ سننے کے علاوہ کچھ دیکھنے کی کوشش کی۔ اندر اندھیرا تھا مگر لگتا تھا' جیسے واقعی اندر کوئی ہے۔ "سنو پیٹر! کوئی چابی ہے۔" میں نے پوچھا۔

اس نے جیب ٹٹول کر چابیوں کا گچھا نکالا مگر کوئی چابی بھی تالا نہ کھول سکی۔ میں نے محسوس کیا کہ جب ہم تالا کھولنے کی کوشش کر رہے تھے' اس وقت آواز تھم گئی تھی۔ یوں جیسے اندر جو بھی کوئی ہے۔ اسے ہماری دروازے پر موجودگی کا احساس ہو گیا ہو۔

"توڑ دو .... توڑ دو اسے۔" پیٹر ایک دم چلایا اور پھر رکا نہیں' اس نے ایک زوردار لات دروازے پر مار دی۔ دروازہ بہت پرانی اور بوسیدہ لکڑی کا تھا۔ ایک ہی ضرب سے کنڈی الگ ہو گئی اور دروازہ کھل گیا۔ ہم تینوں تیزی سے اندر داخل ہو گئے۔ طیب چیخا۔ "پیٹر! لائٹ آن کرو۔"

پیٹر نے فوراً ہی لائٹ آن کر دی۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ یہ کمرہ چھوٹا اور سیلن زدہ تھا۔ دو کرسیاں ایک ٹیبل اور ایک سنگل بیڈ تھا۔ پیٹر یہاں بھی نہیں رکا' سیدھا سامنے دکھائی دینے والے کی طرف بڑھ گیا۔ ہم دونوں اس کے پیچھے تھے۔ اس کمرے میں ایک زرد بلب جل رہا تھا۔

"پیٹر! آ گیا تو؟" ایک لرزتی ہوئی آواز نے ہمارے قدم تھام لئے۔

"مدر .... ! آپ .... آپ ٹھیک ہیں نا؟؟"

پیٹر نیم روشن کمرے میں ایک طرف بڑھ گیا۔ میں اور طیب دونوں چونک اٹھے۔ سامنے بیڈ پر ایک بوڑھی عورت لیٹی تھی۔ یہ بہت کمزور اور زرد تھی پھر بھی ہمیں یہ گمان ہوا جیسے وہ ایلیا ہو۔ طیب نے مجھے کہنی ماری۔ میں اور وہ' اس عورت کی طرف بڑھ گئے۔ میں اسے قریب سے دیکھنا چاہتا تھا۔ ایلیا سے مشابہت نے ثابت کر دیا تھا کہ یہ وہی وسلا کمشنر ہے جس کے بارے میں ڈیوسا نے مجھے بتایا تھا۔ ایلیا سے اس کا کیا رشتہ ہے' یہ میں تفصیلاً نہیں جانتا تھا مگر اتنا مجھے علم تھا کہ ایلیا گوا جانے والی تھی۔ پیٹر نے قریب جا کر اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے تھے۔

"میں پریشان ہو گیا تھا مدر! باہر تالا کس نے ڈالا تھا؟"

"انجلا آئی تھی۔ وہ چرچ گئی ہے۔ کہہ گئی تھی کہ لوٹ آئے گی۔ شاید اس نے ڈالا ہو۔ یہ .... یہ لوگ کون ہیں؟"

اس نے ہم پر نگاہیں جماتے ہوئے پیٹر سے سوال کیا مگر یوں لگا جیسے وہ جان گئی ہو کہ ہم کون ہیں۔ میں اس سے کبھی نہیں ملا تھا مگر پھر بھی اس کی دھندلی آنکھوں میں جھلک اٹھنے والی پہچان کی چمک بھی مجھے بالکل ایلیا جیسی لگی تھی۔

پیٹر نے اسے تمام واقعہ سنا ڈالا۔ اس دوران میں ہماری نگاہیں اس کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھیں' زیادہ تر وہ مجھے گھورتی رہی۔ چہرہ سپاٹ رہا مگر آنکھوں میں عجیب سا رنگ ابھر ابھر کر ڈوبتا رہا۔ کبھی لگتا جیسے وہ میرے لئے دل میں سخت نفرت محسوس کر رہی ہے' کبھی تمسخرانہ انداز میں یوں دیکھتی جیسے میری حالت زار پر خوش ہو۔ مجھے رہ رہ کر ڈیوسا کا کہا ہوا جملہ یاد آ رہا تھا کہ یہاں انڈیا میں اس بھیانک کھیل کا اہم کردار وسلا کمشنر ہے' اسے تلاش کرو۔

"مدر .... ! شاید بدروح ہم میں سے کسی کے سائے سے چمٹ گئی ہو۔ آپ کو یاد ہے نا! پہلے بھی ایسا ہوا تھا۔" پیٹر کہہ رہا تھا۔ "یہ دونوں بھی میرے ساتھ ہی تھے' جب میں نے بتایا کہ آپ ...."

"پیٹر .... !" اس نے پیٹر کو جملہ پورا نہیں کرنے دیا۔ اس بار اس کی آواز قدرے مضبوط تھی۔ وہ لرزش بھی نہیں تھی جو اب سے پہلے ہم نے محسوس کی تھی۔ "پریشان مت ہو اور یہ خوش خبری بھی سن لو کہ اب تمہاری مدر پھر سے مضبوط' توانا اور صحت مند ہو جائے گی۔"

اب بھی اس کی نگاہیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ مجھے الجھن اور گھبراہٹ سی محسوس ہوئی۔

"مجھے سہارا دے کر بٹھا دو۔ میں تمہارے مہمانوں سے باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

پیٹر اس بات سے خوش ہو گیا کہ وہ ہمیں ضرورت سے اہمیت دے رہی ہے۔ اس نے اسے سہارا دے کر بٹھا دیا' پشت سے کئی تکیے اور کشن لگا دیئے۔ ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ہم نے دیوار سے لگی کرسیاں بیڈ کے قریب سرکا لیں اور ان پر بیٹھ گئے۔ وتسلا نے ہمیں قریب آجانے کا اشارہ کیا تھا۔

"اب جاؤ........ ٹھنڈا مشروب بنا لاؤ۔"

وتسلا نے آرام سے سر پشت سے ٹیکتے ہوئے پیٹر سے کہا۔ پیٹر باہر چلا گیا۔

"میں آپ کی تلاش میں تھا۔" پیٹر کے جاتے ہی میں بول اٹھا۔ وہ چونک گئی۔ حیرت اور الجھن اس کی آنکھوں میں لہرائی۔ شاید اسے توقع نہیں تھی کہ میں اس کے بارے میں کچھ جانتا ہوں یا یوں برملا ایسی کوئی بات کر سکتا ہوں۔ میں واقعی اس کے بارے میں بالکل نہیں جانتا تھا۔ جو کچھ رابرٹ نے بتایا تھا' وہ قطعی حیران کن یا اہم نہیں تھا۔ اس سے وتسلا کے کردار کے بارے میں اچھا تاثر ہی ابھرتا تھا کہ وہ ابا اور ان کے دوستوں کی مدد کرنا چاہتی تھی اور جب ان لوگوں نے انکار کر دیا تو اس نے کچھ بھی نہ کہا مگر زیبو سا مجھے بتا گئی تھی کہ میرے ساتھ ہونے والے ان واقعات اور حادثات میں وتسلا کا ہاتھ ہے' مجھے اس بات کا یقین تو نہیں تھا' نہ کوئی ایسی بات ہوئی تھی جو یہ یقین دلاتی مگر اتنا ضرور ہوا تھا کہ وتسلا کا نام دوسری مرتبہ آیا تھا' بلکہ تیسری مرتبہ' ایلیا کے بارے میں بھی پتا چلا کہ وہ گوا میں اس کے پاس جانا چاہتی تھی جبکہ رابرٹ کے مطابق وتسلا گوا چھوڑ چکی تھی۔

"تمہیں میری تلاش کیوں تھی؟ میرا خیال ہے کہ میں تم سے کبھی نہیں ملی۔"

"میرے والد سے تو ملی تھیں۔"

اس کے چہرے پر آکر گزر جانے والے سائے سے اندازہ ہو گیا کہ وہ اب میرے بارے میں سب کچھ جان گئی ہو گی۔

"تمہارا والد؟ شاید میں کبھی اس سے ملی ہوں۔ مجھے یاد نہیں۔ بڑھاپا سب سے پہلے یادداشت پر اثر انداز ہوتا ہے۔"

"کیا آپ ایلن کو بھی بھول گئیں؟" یقین نہ ہونے کے باوجود اندھیرے میں تیر چلانے میں کوئی حرج نہ تھا۔ اگر بات درست نہ ہوتی تو بھی کوئی نقصان نہیں تھا۔ مجھے پتا تھا کہ وہ بھی کسی بات کا اقرار نہیں کرے گی مگر میں تو اپنی بصارت پر بھروسہ کر رہا تھا۔ اس کے چہرے کی ہر جھری میں پیدا ہو کر معدوم ہونے والا تاثر ہی میرے لئے کافی تھا۔

"کک........ کس ایلن کی بات کر رہے ہو؟"

"یہ ایلن جسے قتل کیا گیا تھا۔" میں تفصیل سے بچ رہا تھا۔ "جس کی روح سے تمہیں کافی عقیدت ہے۔"

"تم کون ہو؟"

"ضیاء........! عطاء الرب رضوی کا بیٹا' ضیاء الرب رضوی۔ کیا یہ اب بھی بتاؤں کہ کون عطاء الرب رضوی؟"

"تمہیں کس نے یہاں بھیجا ہے؟" وہ گھبرا رہی تھی۔

"تمہارا یہ پوتا ہی لے کر آیا ہے۔" طیب نے جواب دیا جو اب تک بڑی برداشت سے کام لے رہا تھا۔

"نہیں........! یہ نہیں ہو سکتا۔ سنو! میں ایلن سے تنگ آچکی ہوں۔ اس لئے گوا چھوڑ آئی۔"

"کیوں........؟ کیا ایلن کی روح گوا سے باہر نہیں نکل سکتی؟" طیب نے جل کر کہا۔

"نکل سکتی ہے مگر بہت کم وقت کے لئے۔ پھر وہاں لوٹ جانے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ لوٹ جائے' جہاں اس کے لئے سکون ہے۔ آدمی جب مر جاتا ہے تو اسے وہیں رہنا چاہئے' جہاں وہ پہنچا دیا گیا ہے۔ اگر وہ بے جگہ ہوتا ہے تو اذیت سے دوچار رہتا ہے۔ وہ صرف ہٹ دھرمی میں یہ اذیت برداشت کر رہی ہے اور وہ........ وہ کچھ دوسرے لوگوں کو........ میرا مطلب ہے کہ روحوں کو بھی روک لینے کا ہنر جانتی ہے' وہ سب اذیت میں ہیں۔"

"اور اسے اس اذیت سے نجات دلانے کے لئے تم دوسروں کو بھی اذیتیں دے رہی ہو۔" میں نے غصے سے کہا۔ میں اس پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے' میں اسے نہیں سمجھ رہا ہوں۔ ایلن کن لوگوں کو روک رہی ہے' کس ہٹ دھرمی کی بنا پر وہ خود اذیت اٹھا رہی ہے اور اس کا ایلن سے کیا واسطہ ہے۔ مجھے کچھ

اندازہ تو تھا مگر یقین سے کوئی بات نہیں سوچ سکتا تھا۔

"ہاں.........! میں نے پہلے کیا تھا ایسا مگر اب وہ حد سے بڑھی چلی گئی تو میں مجبور ہو گئی۔ کیا تمہیں یقین آجائے گا کہ میں یہاں 'ایلین سے چھپ کر رہ رہی ہوں!"

"کیا مطلب؟" طیب آگے کو سرک آیا۔ "کیا ایلین اس قدر پُر اسرار ہونے کے باوجود' اور روح ہونے کے باوجود یہاں کے بارے میں نہیں جانتی؟"

"فضول باتیں نہ کرو طیب!" میں نے اسے ڈانٹ دیا۔ "ہاں.........' تم کیا سارے دنیا کو بے وقوف سمجھتی ہو؟" اب میں وتسلا کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ جب تم اس گھر سے باہر جاؤ گے تو دیکھنا۔ اس گھر کی چاروں دیواروں پر سفید رنگ سے ایک نقش بنا ہوا ہے۔ وہ نقش ہی مجھے اس سے محفوظ کئے ہوئے ہے۔ میں موت کی منتظر ہوں۔ سکون چاہتی ہوں مگر......... پتا نہیں' کیوں مجھے موت بھی نہیں آتی۔ اور سنو! تم مجھ سے اس انداز میں باتیں مت کرو۔ میں نے تمہارے فادر کو آفر کی تھی کہ میں اس کی مدد کر سکتی ہوں مگر اس نے وہ قبول نہیں کی۔"

"اس کے بعد تم نے اس کے سارے خاندان کو ایک ایک کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا اور یہ کھیل اب بھی جاری رکھے ہوئے ہو۔ تم نے رابرٹ' جینو' سورن سنگھ' پیاس کے ساتھ کیا کیا!"

وہ حیران کن نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ "نہیں.........! ایسا نہیں ہے......... مجھے نہیں معلوم کہ ان سب کے ساتھ کیا ہوا۔ تم سے یہ کس نے کہا ہے کہ میں ہر گڑبڑ کی ذمے دار ہوں؟"

"زیوسا نے۔"

مجھ سے پہلے طیب بول اٹھا اور ایک دم گہرا سناٹا چھا گیا۔ مجھے تو افسوس ہوا تھا کہ میں نے طیب کو یہ بات کیوں بتائی تھی مگر وتسلا زیوسا کا نام سن کر جیسے پتھر کی ہو چکی تھی۔

"زیوسا! وہ.........؟ اوہ.........! مجھے یہی ڈر تھا اس لئے میں نے ایلین کو منع کیا تھا۔ اسے بہت غرور تھا۔ پاگل ہو گئی تھی وہ........." وہ اضطراب میں اٹھ بیٹھی۔

مجھے لگا جیسے وہ زیوسا کا نام سن کر خوفزدہ ہو گئی ہے۔ بعد میں ایک دم مرعوب ہو گئی۔

"ہاں! مجھے زیوسا نے بتایا ہے۔"

تیر' کمان سے نکل چکا تھا اس لئے میں نے بھی بتا دیا ورنہ میں بات کی تہہ تک پہنچے بغیر کوئی بات کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ سچی بات تو یہ تھی کہ میں نہ زیوسا سے واقف تھا نہ ایلین سے اور نہ ہی میری سمجھ میں یہ آیا تھا کہ آخر ایلین ان زنجیروں کے لئے یہ کیا کر رہی ہے اور اب جبکہ اسے مرے ہوئے بھی برس بیت گئے ہیں' وہ ان زنجیروں کو حاصل کر کے کیا کرے گی۔ میں تو جاننا چاہتا تھا کہ وہ کس طرح ہمارا پیچھا چھوڑے گی' ٹھیک ہے کہ میں غصے میں اس سے ٹکر لینے کی ٹھان چکا تھا مگر اب گھر میں اور دینے کو کوئی نہیں بچا تھا۔ میں صرف یہ چاہتا تھا کہ اس سے سودے بازی کر لوں۔

رابرٹ' جینو' پیاس اور سورن سنگھ کو عذاب سے نکال لوں۔ ان واقعات کی حقیقت کو جان لوں اور ان تمام چکروں سے خود بھی نکل جاؤں اور باقی سب کو بھی نکال لوں۔

وتسلا خود کیا چیز ہے یہ جاننا بھی منصوبہ تھا۔

"تم کیا چاہتے ہو؟" وہ ایسے بولی جیسے ہار گئی ہو۔

"حقیقت کا ادراک۔"

"کیا مطلب؟" وہ چونکی۔

"ایلین کیا چاہتی ہے؟"

"سونے کی وہ زنجیریں جو اس کے دوستوں نے اسے مارنے کے بعد حاصل کی تھیں۔" اس نے تھکے تھکے انداز میں سر کو تکیوں پر رکھ لیا۔

"کیوں؟"

"تاکہ وہ مرنے کے بعد بھی زیوسا کو اپنے قبضے میں رکھ سکے۔"

"کیا مطلب؟"

"پیٹر آ رہا ہے۔ تم بعد میں آؤ تو بتا دوں گی۔" وہ یہ کہہ کر چپ ہو کر دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔

باہر گلاسوں کے ٹکرانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ شاید بازار سے مشروب لایا تھا ورنہ اتنی دیر نہ ہوتی۔ میں نے طیب کی طرف دیکھا۔ وہ بہت حیران تھا اور حیرت انگیز طور پر چپ بھی۔

پیٹر مشروب سے بھرے گلاس لے آیا۔ وہ اپنی دادی کے رویے پر حیران اور خوش

تھا۔ اس نے ہم سب کو مشروب دیا پھر داوی کے قریب بیٹھ گیا۔ "ڈر.........! مجھے ڈر ہو گا تو نہیں!" وہ پریشان بھی تھا۔

میری نگاہ وتسلا کے چہرے پر جمی ہوئی تھی۔ اچانک میں نے دیکھا کہ وہ پیٹر کو دیکھ کر سفید ہو گئی' خوف سے اس کا چہرہ مسخ ہو گیا۔ میں نے پیٹر کی طرف دیکھا۔ غالباً عین اس وقت طیب نے بھی اسے دیکھ لیا تھا اس لئے کہ میری آواز کے ساتھ ہی طیب اور وتسلا کے حلق سے بھی عجیب و غریب سی آواز نکلی تھی اور پھر پیٹر کسی کٹے ہوئے درخت کی طرح بیڈ کے قریب فرش پر ڈھے گیا۔

میں اور طیب اچھل پڑے۔ میں نے اور طیب نے ایک ساتھ جھک کر پیٹر کو دیکھا۔ وہ ساکت تھا' اس کی کھلی ہوئی آنکھوں میں نیلاہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ یہ نیلاہٹ آنکھوں سے نکل کر جیسے دھیرے دھیرے چہرے پر بھی پھیلنے لگی تھی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا اچانک احساس ہوا کہ وتسلا خاموش ہے اور ساکت بھی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا وہ آنکھیں بند کئے تیزی سے کچھ پڑھ رہی تھی۔ میں نے پیٹر کی نبض ٹٹولی تو سرد لہر سی میری ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ گئی اس لئے کہ مجھے لگا جیسے میں نے کسی سرد لوہے کی سلاخ کو تھام لیا ہو۔

"اونہہ ہوں!"

مجھے وتسلا کی آواز سنائی دی۔ سر اٹھا کر دیکھا تو وہ مجھے چھونے سے منع کر رہی تھی۔ پتا نہیں' بند آنکھوں سے اس نے کیسے دیکھ لیا کہ میں پیٹر کو چھو رہا ہوں۔ میں کھڑا ہو گیا۔ طیب حیرت اور خوف سے ساکت تھا۔ جونہی اس کی نگاہ مجھ پر پڑی' وہ چونکا۔ جیسے ہوش میں آ گیا ہو۔ جھرجھری لی اور سر کے اشارے سے بتایا کہ وہ جا رہا ہے' باہر.........
اس نے مجھے بھی باہر چلنے کو کہا۔ میں اس حالت میں پیٹر کو ایک معذور عورت کے پاس چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔ جب میں نے منع کر دیا تو وہ پاس والی اس کرسی پر ڈھے گیا جس پر اب سے پہلے بیٹھا ہوا تھا۔

وتسلا اسی رفتار سے کچھ پڑھ رہی تھی۔ اضطراب نے مجھے بے چین کیا ہوا تھا۔ کمرے کی گہری خاموشی میں وتسلا کی تیز سانسوں کی آواز خراٹوں کی طرح گونج رہی تھی پھر وہ خاموش ہوئی۔ اس نے اپنے سرہانے رکھے ایک چاندی کے ڈبے کو اٹھایا۔ وہ ایک لمبوترا سا ڈبا تھا۔ اس نے اسے کھول کر اس پر پھونک ماری اور پھر مجھے پتا چلا کہ اس میں

پڑتا ہے۔ اب وہ وہیں بیٹھے بیٹھے وہ پانی پیٹر پر چھڑک رہی تھی' ابھی تک اس کے ہونٹ تیزی سے ہل رہے تھے۔ میں اور طیب اسے دیکھ رہے تھے۔ پیٹر کے پورے بدن پر پانی چھڑکنے کے بعد اس نے ایک بار اس پر پھونکا اور دوسرے ہی لمحے وہ نارمل ہو گئی۔

"اسے سنبھال کر بستر پر لٹا دو"۔ وہ ذرا سی پیچھے کی طرف سرک کر بولی۔ اس کے بیڈ پر بالشت کو اتنی جگہ ہو گئی تھی کہ پیٹر کو اٹھا کر لٹایا جا سکتا تھا۔

میں نے فوراً جھک کر پیٹر کو اٹھانا چاہا تب ہی یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ میں تنہا اسے ہلا بھی نہیں سکتا۔ میں نے طیب سے مدد کرنے کو کہا۔ طیب غالباً وتسلا کی پرسکون حالت دیکھ کر نارمل ہو چکا تھا۔ فوراً بولا۔

"ایک آدمی نہیں اٹھ سکتا تم سے؟"

"آؤ! تم بھی کوشش کرو"۔ میں نے جبڑے بھینچ کر اپنے غصے کو دبایا۔ مجھے طیب کی یہ عادت بہت بری لگتی تھی کہ وہ حالات کی نزاکت کو سمجھے بغیر بول پڑتا تھا یا حالات کی سنگینی محسوس کرنے کے باوجود بے حسی طاری کر لیتا تھا۔ میرے کہنے پر اس نے تمسخرانہ انداز میں مجھے پھر وتسلا کو دیکھا اور جھک گیا۔

دوسرے ہی لمحے اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک گئے۔ میں نے کچھ نہیں کہا صرف نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا اور دوسری طرف سے اکڑے ہوئے پیٹر کی کمر کے نیچے ہاتھ ڈال کر پوری طاقت لگا دی۔

پیٹر کو بستر پر لٹانے میں دس منٹ لگ گئے۔ وہ اتنا بھاری ہو چکا تھا جیسے فرش میں گڑا ہوا ہو یا جیسے اس میں منوں لوہا بھرا ہو۔ جب ہمیں اندازہ ہو گیا کہ ہم آسانی سے اسے نہیں اٹھا پائیں گے تب ہم نے اسے سرکا کر بیڈ کے بالکل قریب کر دیا' اس دوران میں طیب کئی بار ہانپا۔ اس نے کھڑے ہو کر کمر سیدھی کی' آستین سے پسینا پونچھا۔ میری حالت بھی اس سے کچھ مختلف نہیں تھی مگر میں بہرحال اس سے زیادہ طاقت ور تھا اور مجھ میں اپنی حالت کو کنٹرول کرنے کی صلاحیت بھی اس سے زیادہ تھی۔ بیڈ کے قریب لا کر ہم نے اسے کس طرح اوپر لٹایا' یہ ہم ہی جانتے ہیں۔ وتسلا کو ہماری حالت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ ذرا بھی تشویش کا اظہار نہیں کر رہی تھی۔

پیٹر کو بستر پر لٹا کر ہم کچھ دیر کے لئے اپنی سانسوں پر قابو پاتے رہے۔ جب کچھ حالت سنبھلی تو وتسلا کے چہرے پر چھایا سکون دیکھ کر حیران رہ گئے۔

"پیٹر کو کیا ہوا؟ کیا یہ مر چکا ہے؟" میں نے پوچھا۔ میں آپ کو پہلے بھی بتا چکا ہ
کہ میں نے اسے چھو کے، سمجھنے کی کوشش کی تھی' مجھے تو وہ انسان ہی محسوس نہیں
تھا۔ زندگی یا موت کا اندازہ کیسے ہوتا؟

"نہیں! یہ ٹھیک ہے۔ کچھ دیر بعد یہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا لیکن ضیاء......
اسے تم لوگوں کے ساتھ قبرستان نہیں جانا چاہئے تھا۔ ایلن تمہارے دادا کی روح کو رو
ہوئے ہے۔ وہ وہاں یقیناً تمہاری منتظر ہو گی۔ تم کسی مضبوط حصار میں ہو' تمہارے سا
کو بھی وہ کوئی گزند نہیں پہنچا سکتی تب اس نے تم لوگوں کو خوفزدہ کرنے کے لئے پیٹر
ساتھ ایسا کیا"۔

"ممکن ہے' وہ جان گئی ہو کہ پیٹر تمہارا پوتا ہے"۔ طیب نے معقول بات کی تھی۔

"نہیں......؟ وہ نہیں جان سکتی لیکن ایسا کر کے اس نے اچھا نہیں کیا۔ مجھے پ
کی سخت ضرورت ہے۔ میں جب تک زندہ ہوں' اسے زندہ دیکھنا چاہتی ہوں۔ اگر ذرا
بھی کوتاہی ہو جاتی تو......" وہ جھرجھری لے کر خاموش ہو گئی۔

"وتسلا! میں اس تمام چکر سے سخت پریشان ہوں۔ مجھے ایلن سے کوئی دلچ
نہیں۔ سونے کی وہ زنجیریں میرے کسی کام کی نہیں' بلکہ میرے خیال میں تو انہی کی و
سے میرا پورا خاندان زیر عتاب آیا ہے۔ میں اس شیطانی چکر سے نکلنا چاہتا ہوں"۔

میں واقعی تھک گیا تھا۔ میرے نڈھال لہجے نے طیب اور وتسلا دونوں کو چونکا دیا۔
وتسلا مجھے دیکھتی رہی' چند لمحے بعد بولی۔

"وہ زنجیریں مجھے دو۔ میں تمہیں ان چکروں سے نکال دوں گی۔ ایلن تمہیں ک
نقصان نہیں پہنچا سکے گی مگر......"

"مگر کیا؟" مجھ سے پہلے طیب نے بے چین ہو کر پوچھ لیا۔

"مگر زیوسا کے معاملے میں' میں بالکل بے بس ہوں"۔

"زیوسا کون ہے؟ اور کیوں میرے پیچھے پڑی ہے؟"

"اس کا تعلق یونان سے ہے۔ وہ پارس دیوی ہے مگر بے پناہ سفاک بھی۔ اگر
یونانی مائتھالوجی پڑھو گے تو جان سکو گے کہ زیوسا کا بیک گراؤنڈ کیا ہے۔ میں ان
زیادہ نہیں جانتی جس قدر مجھے ایلن نے بتایا تھا۔ ایلن کو جس عورت نے زیوسا کو ق
کرنے کے لئے وہ زنجیریں دی تھیں' پتا نہیں' اس نے ایلن کو کیوں نہیں بتایا کہ جب

آدمی مر جاتا ہے تو اس کا اس دنیا سے ناطہ ختم ہو جاتا ہے۔ ہماری مذہبی کتابوں میں دنیا کو
"سرائے" اسی لئے کہا گیا کہ آدمی یہاں کی چیزوں' اولادوں یا دولت و جائیداد سے جذباتی
وابستگی پیدا نہ کرے اس لئے کہ یہ سب یہیں رہ جاتا ہے جبکہ آدمی کو یہاں سے کہیں اور
جانا ہوتا ہے۔ جذبات کا تعلق روح سے ہوتا ہے۔ یہ جذباتی وابستگی روح کو بے چین
رکھتی ہے اگر وہ مان لے کہ یہاں کی چیزیں یہاں رہ جائیں گی' وہاں کام نہیں آئیں گی تو
وہ اگلے سفر میں آسانی محسوس کرے"۔

"یہ کس کا عقیدہ ہے' کیا تمہارا؟" طیب نے اسے سانس لینے کے لئے رکتا دیکھ کر
سوال کر ڈالا۔

"میرا خیال ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب کا"۔

"مگر ہندو کا یہ عقیدہ نہیں ہے۔ وہ اس دنیا میں دوبارہ جنم لینے کو مانتا ہے"۔ میں
نے وتسلا سے کہا۔

"لیکن کیا کوئی اولاد' دوبارہ اپنے ہی ماں باپ کے گھر پیدا ہوئی ہے یا ماں' باپ یا
کوئی دوسرا رشتے دار......... اگر ان کے عقیدے کو مان بھی لیا جائے' ایک لمحے کے لئے
تو بھی' جانے والے کے تمام رشتے دار تمام کچھ وہیں......... رہ جاتا ہے۔ اگر ان کے
خیال میں وہ دوسرا جنم لیتے بھی ہیں تو ایک نئی' علیحدہ اور کسی دوسری حیثیت میں' تب
بھی ثابت ہوتا ہے کہ جو اس جنم میں جہاں اور جیسا ہے' اس کے اگلے جنم میں اس سے
کوئی ناطہ نہ ہو گا۔ اگر ایسا ہوتا تو ایک کروڑ پتی مرتا اور دوبارہ جنم لیتا تو اس کی چھوڑی
ہوئی جائیداد اور اولاد پھر اس کی ہو جاتی مگر ایسا نہیں ہے"۔

"میں نے ایک واقعہ پڑھا تھا کہ ایک بچی پیدا ہوئی اور پھر ماں باپ کو ایک ایسے گھر
میں لے گئی جہاں کچھ اجنبی رہتے تھے مگر اس نے ان سب سے اپنا رشتہ ماں کا بتایا اور
سب کی زندگی کے حالات' نام اور ان سے متعلق تمام جزئیات بھی' بالآخر وہ مان گئے کہ وہ
ان کی مر جانے والی ماں ہے جو دوسرا جنم لے کر آئی ہے"۔ میں نے کہا۔

طیب اطمینان سے یوں بیٹھا تھا جیسے دادی سے کہانی سن رہا ہو۔ مجھے گھر جانے کی
جلدی تھی۔ میرے دادا اب تک پریشان ہو چکے ہوں گے۔ مجھے اس کا احساس تھا پھر پیٹر اتنی
دیر گزر جانے کے باوجود اسی حالت میں تھا۔ اور آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایک شخص جو
کسی حالت میں پڑا ہو' اس کے بارے میں یہ بھی کنفرم نہ ہو کہ زندہ ہے یا مر گیا' ایسے

حالات میں اس کے سرہانے ایسے معاملات یا کہانیاں کیا اچھی لگتی ہوں گی! میں نے چاہا کہ وتسلا کو ٹوک دوں مگر وہ کہہ رہی تھی۔

"تو کیا وہ اپنی حیثیت میں واپس چلی گئی یا نئے رشتوں سے اس کا ناطہ ٹوٹ گیا؟.......... ویسے ایسے واقعات چیدہ چیدہ ہی ہوتے ہوں گے جبکہ ان کے عقیدے کے تحت ہر شخص سات جنم لیتا ہے"۔

"یہ لمبی بحث ہے۔ ختم کرو اسے"۔ میں نے ذرا تیز لہجے میں کہا۔ "پیٹر کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی' کیوں؟" میں نے وتسلا سے کہا۔

"یہ ٹھیک ہو جائے گا تم فکر نہ کرو۔ ایسا اسے آج تیسری بار ہوا ہے"۔ وہ اب بھی مطمئن تھی۔

"مگر اسے ہوا کیا ہے؟" طیب نے پوچھا۔

"جب یہ قبرستان میں رہتا تھا تب اسے کسی بد روح نے پریشان کیا تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ خود اس نے اسے پریشان کیا تھا۔ یہ کسی قبر کی مٹی اٹھا اٹھا کر اپنے کمرے کے فرش کی لپائی کیا کرتا تھا۔ کاہل تھا۔ کھدی ہوئی نرم مٹی اس وقت حاصل کرتا تھا جب کسی کی قبر کھو دی جا رہی ہو۔ بہر حال.......... اس قصے سے تمہارا کوئی تعلق نہیں حالانکہ آج کی اس کیفیت کے ذمے دار تم دونوں ہی ہو لیکن تشویش کی کوئی بات نہیں۔ جاؤ"۔ پھر وہ میری طرف متوجہ ہوئی۔ "تمہیں سوچنے کے لئے وقت دے رہی ہوں' یہ آفر میں نے تمہارے فادر کو بھی کی تھی"۔

میں چند لمحے اسے دیکھ کر سوچتا رہا۔ میں اگلے ہی روز اس کے چکر سے نکل سکتا تھا۔ اس کی آفر قبول کر سکتا تھا مگر ایک بات میرے دماغ میں سوئی کی طرح چبھ رہی تھی کہ وہ زیوسا کے سلسلے میں معذرت کر چکی تھی اور زیوسا کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کئے بغیر میں زنجیریں اس کے حوالے کر دینے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اتنا اندازہ تو مجھے بھی ہو گیا تھا کہ ان زنجیروں سے زیوسا کا براہ راست تعلق ہے۔ اگر ایلن انہیں حاصل کرنا چاہتی تھی تو بقول وتسلا کے محض اس لئے کہ زیوسا کو قابو میں کر لے اب اگر وہ زنجیریں میں اسے دے دیتا تو اس کا مطلب تھا کہ وہ پھر وتسلا کے زیر تسلط آ جاتی اور ایسا کر کے میں یقیناً اس پر ظلم کرتا خاص طور پر ان حالات میں جب شالی بابا کے علاوہ وتسلا بھی یہ اقرار کر چکی تھی کہ وہ میری ہمدرد ہے کیوں؟ یہ جاننا بہت ضروری تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" وتسلا نے مجھے چونکا دیا۔

"ہاں..........! میں تمہاری آفر کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ مجھے کچھ وقت دو۔ میں کل پھر تم سے ملنا چاہتا ہوں"۔

"کل تم دوپہر میں آ سکتے ہو"۔

میں نے طیب کو کھڑے ہونے کا اشارہ کیا اور خود بھی کھڑا ہو گیا۔ پیٹر ابھی تک اسی اکڑی ہوئی حالت میں بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں کی نیلاہٹ میں البتہ مجھے کچھ کمی محسوس ہوئی۔ میں نے اس پر آخری نگاہ ڈالی اور ہم کمرے سے باہر آ گئے۔

رات کافی بیت چکی تھی۔ باہر آتے ہی میں گھر والوں کی پریشانی کے متعلق سوچنے لگا۔ طیب بھی وقت دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔ ہم گھر سے مغرب سے کچھ پہلے نکلے تھے اور اب رات کے تقریباً سوا دس ہو رہے تھے۔ یہاں سے گھر کا فاصلہ بھی بہت تھا۔ ہم نے تانگہ لیا اور اسے کہہ دیا کہ وہ تیز رفتاری سے چلائے۔ ہمیں گھر پہنچنے میں پندرہ منٹ لگ گئے۔ منے دادا گلی میں ٹہل رہے تھے۔ تانگہ دیکھتے ہی انہوں نے ہماری جانب بڑھنا شروع کر دیا تھا۔ ہمیں دیکھ کر ان کی جان میں جان آئی۔ باہر انہوں نے کوئی بات نہیں کی۔ صرف اتنا کہا۔

"اتنی دیر کر دی"۔

میں نے جواب نہیں دیا لیکن مسکرا دیا تاکہ وہ ہمارے چہروں پر اطمینان دیکھ کر مطمئن ہو جائیں۔ تانگے والے کے پلٹ جانے کے بعد میں انہیں لے کر گھر میں داخل ہوا' اماں' دادی' وغیرہ کو ہمارے دیر سے آنے پر کوئی تشویش نہیں تھی۔ سب ٹھیک تھا' منے دادا ہی بے حد پریشان تھے۔ طیب دادی اور اماں کی طرف چلا گیا اور میں منے دادا کو لے کر دادا والے کمرے میں آ گیا۔ میں راستے میں یہ بات سوچ چکا تھا کہ مجھے منے دادا کو اعتماد میں لینا پڑے گا۔ وہ نہ صرف یہ کہ تمام حالات سے واقف تھے بلکہ عمر کے حساب سے ان میں تحمل' عقل' اور برداشت بھی تھی۔ پہلے تو دادا تھے جن سے میں ہر بات کہہ اور کر سکتا تھا۔ یوں تو میں بی جان کو بھی بتا چکا تھا مگر بی جان بہر حال ایک کمزور عورت تھیں' میں بہت سی باتیں ان سے نہیں کر سکتا تھا۔

"کیا ہوا ضیاء..........! تم نے بہت دیر کر دی اور.........." وہ بڑے غور سے

میرے چہرے کو دیکھ رہے تھے۔

میں نے گہرا سانس لیا۔ انہیں بیڈ پر بٹھایا اور پھر کرسی کھینچ کر ان کے سامنے بیٹھ گیا۔

"منے دادا! آپ اس معاملے کو کہاں تک جانتے ہیں؟ کیا آپ کو معلوم ہے کہ یہ سب کچھ کیوں اور کیسے ہو رہا ہے؟" میں نے جواب دینے کی بجائے سوال کر ڈالا۔

"ہاں!"

ان کے جواب نے مجھے چونکا دیا۔ "کیا معلوم ہے؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

پھر جو کچھ انہوں نے بتایا' ان میں صرف وہ واقعات نہیں تھے جو میرے ساتھ پیش آئے اور جنہیں میں انہیں نہیں بتا سکا بلکہ الین اور زنجیروں کا قصہ بھی شامل تھا۔ بابا کی تمام حرکتیں' ان کے دوستوں کا سارا حال' سب کچھ انہیں پتا تھا بلکہ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ میں نے اپنی معصوم غلطی کی وجہ سے اس معاملے کو اس حد تک بگاڑ دیا ہے ورنہ کم از کم یہ عذاب ہمارے پورے خاندان یا محلے والوں پر کبھی نازل نہ ہوتا۔ یہ سب کچھ انہیں دادا نے بتایا تھا اور وہ واقعات بھی بتا دیئے تھے جو میرے ساتھ پیش آئے اور جن کا ذکر میں دادا سے کر چکا تھا۔ گویا اب ان سے کچھ چھپانا بیکار تھا۔ میں نے یہ سوچ کر وہ سب بھی انہیں بتا دیا جو میں بمبئی میں بھگت کر آیا تھا اور یہاں آج جو کچھ ہمارے اور طیب کے ساتھ پیش آیا تھا وہ بھی۔ وتسالا کا نام سن کر تو وہ اچھل ہی پڑے۔ ان کے چہرے پر خوف کی ہلکی سی رمق پھیلی اور معدوم ہو گئی پھر وہ بولے۔

"میں سوچ رہا ہوں کہ میں اور تم' شالی بابا سے مل لیتے ہیں"۔

"میں خود ان سے تفصیلی ملاقات کرنا چاہتا ہوں مگر وہ ہمیشہ جلدی میں ہوتے ہیں"۔

"ہاں.........! ہم اگلے ہفتے ان سے تفصیلی ملاقات کر سکتے ہیں"۔ منے دادا نے کہا۔

"آپ کو کیسے پتا؟"

"وہ ایک وظیفے میں مصروف ہیں۔ جمعے کے روز فارغ ہوں گے' ہمیں جمعے سے پہلے پہنچ جانا چاہئے"۔

میں اور منے دادا پروگرام بنا کر ہی اٹھے۔ عصمت آپا دو بار آ کر کھانے کا کہہ

تھیں۔ طیب کے مسلسل بولنے کی آوازیں دادا کے کمرے تک آ رہی تھیں۔ میں کمرے سے باہر نکلنے لگا تو اچانک مجھے یاد آیا کہ طیب بھی میرٹھ جانے کے چکر میں ہے۔ میں نے دادا کو وہیں روک کر کہہ دیا۔ "میں طیب کو ساتھ نہیں لے جانا چاہتا۔ وہ وقت بہت ضائع کرتا ہے۔ میری بات نہیں مانے گا۔ آپ اسے بمبئی روانہ کریں"۔ منے دادا بھی اس کے چلبلے پن سے الجھ جایا کرتے تھے' انہوں نے وعدہ کر لیا بلکہ خفگی کا اظہار بھی کیا کہ یہ نوکری چھوڑ کر سیر سپاٹوں کے لئے کیوں آیا ہے۔

کھانے پر ہی منے دادا نے طیب کی کھنچائی کر دی۔ "تم یہاں آ بجے ہوئے غالباً نوکری چھوڑ آئے ہو؟"

دادا کی بات سن کر طیب کے حلق میں نوالہ پھنس گیا۔ جسے نگل کر وہ جلد سے بولا۔ "نہیں دادو.........! چھٹیاں لے کر آیا ہوں"۔

"کیوں' بہت تھک گئے تھے کیا؟" ان کے لہجے میں طنز تھا۔ "ویسے کتنے دن کی چھٹیاں ہیں؟"

"دو......... بس دو دن کی۔ اور........." وہ گڑبڑا رہا تھا۔ میں سر جھکائے کھانے میں مصروف رہا۔ میں نے قطعی ان لوگوں کی باتوں پر توجہ نہ دی۔ مجھے ان کی طرف دیکھے بغیر بھی محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بار بار میری طرف دیکھ کر میری مدد کا طالب گار ہے۔

"گھر سے تمہاری دلچسپیوں کی کمی کی کافی شہرت پہنچی ہے مجھ تک"۔ منے دادا نے نرم مگر چبھتے ہوئے انداز میں کہا۔ "طاہر اور زہرہ بھی تمہاری غیر حاضریوں سے پریشان رہتے ہیں"۔

"وہ......... وہ تو میں ضیاء کے ساتھ........."

"یہ ضیاء کے وہاں جانے سے پہلے کی بات کر رہا ہوں میں"۔ انہوں نے ڈانٹنے والے انداز میں جواب دیا۔

طیب کے لئے کھانا کھانا مشکل ہو گیا۔ شاید اسے گمان بھی نہ ہو گا کہ دادا اسے کسی اتنی پرانی بات پر ڈانٹیں گے۔ وہ ان کے رویے پر کچھ حیران بھی تھا۔ مجھے امید ہو چلی تھی کہ اب اگر اسے پتا چلا کہ منے دادا میرے ساتھ میرٹھ جا رہے ہیں تو وہ یقیناً بمبئی کا ٹکٹ کٹا لے گا۔ اس روز منگل تھا۔ منے دادا کا پروگرام مجھ سے پہلے وہاں پہنچنے کا تھا۔ اب میں چاہتا تھا کہ اسے پروگرام کے بارے میں بھی پتا چل جائے۔ میں نے بڑی بے پروائی سے

کہا۔

"منے دادا! شاہی بابا سے ملنا ضروری ہے"۔ ایسا کہتے ہوئے میں بھول گیا کہ میری اس بات سے وہ لوگ بے چین ہو جائیں گے جو اس وقت قدرے پُرسکون ہیں۔ مثلاً منی دادی' دادی اور اماں.......... عصمت آپا کو تو سیاروں کے مسائل سوچنے سے فرصت نہ تھی کہ وہ دنیا کے بارے میں کسی تشویش میں مبتلا ہوتیں۔ لگتا ایسا ہی تھا جیسے وہ کسی سیارے سے یونہی ذرا گھومنے کے لئے' کچھ روز کو دنیا میں چلی آئی ہیں۔ انہیں واپس جاکر بہت سے کام نمٹانے ہیں جن کے سلسلے میں وہ سوچ بچار کر رہی ہیں۔ ہم لوگوں سے بھی کسی طبقاتی وابستگی کا اظہار ان کے کسی رویے سے نہیں ہوتا تھا اس لئے اس وقت بھی وہ بے نیاز کھانے میں مصروف تھیں جب اماں نے چونک کر مجھے دیکھا۔

"اب کیا ہوا؟" ان کے چہرے پر تفکر پھیل گیا تھا۔

"نہیں..........! کچھ ہوا نہیں"۔

منے دادا نے میرے گڑبڑانے سے پہلے ہی بات سنبھالی لی۔ طیب یقیناً سمجھ گیا ہوگا وہ خوش بھی ہوگیا۔

"ضیاء! کا خیال ہے کہ ان سے ایسی کوئی چیز لے لی جائے جس سے یہ سکون قائم رہے' وہ کہہ بھی گئے تھے کہ میں ان سے میرٹھ میں مل لوں' میں ضیاء کا منتظر تھا۔ اکیلے سفر کرنے کی عادت ہی نہیں رہی"۔

اماں مطمئن ہوگئیں۔ طیب ہونقوں کی طرح مجھے تکنے لگا۔ اس نے سن لیا تھا کہ منے دادا میرٹھ جانا چاہتے ہیں' وہ بھی میرے ساتھ۔ اس کے ارمانوں پر جیسے پانی پڑ گیا۔ میں پھر بے پروائی سے بولا۔

"کب جانے کا ارادہ ہے؟"

"آج منگل ہے' اگر کل نکلیں تو زیادہ بہتر ہے۔ ایک دن گھر میں گزار لیں گے"۔

"گھر میں نہ رہیئے گا"۔ اماں بوکھلا گئیں۔ "بی جان کے پاس چلے جایئے گا اور بھائی صاحب! میں چاہتی ہوں کہ مکان بیچ دوں۔ اب وہاں رہنا میرے لئے ممکن نہیں ہے"۔

منی دادی فوراً تائید کرنے لگیں جبکہ میں اس حق میں نہیں تھا۔ وہ برسوں ہمارا مسکن رہا تھا پھر جدی پشتی حویلی تھی۔ آپ کو اندازہ ہوگا کہ پرانے لوگ اپنے اسلاف کے علاوہ اپنے ورثے کے معاملے میں بھی بہت جذباتی تھے۔ میں بھی ایسا نہیں چاہتا تھا' اماں کی

خواہش کے بارے میں کہہ نہیں سکتا کہ انہوں نے اتنا بڑا معاملہ کیسے اتنی آسانی سے اٹھا دیا۔ عورتیں تو پرانے مکانوں کے کھنڈر بننے تک اس سے چمٹی رہتی ہیں۔ منے دادا نے بھی شاید اس غیر متوقع خواہش پر انہیں چونک کر دیکھا تھا۔

"بھابی دلہن! قصور اس مکان کا تو نہیں' وہ تو آسیب زدہ ہے' جو کچھ ہوا اس کے اسباب [illegible] تو آپ کو بھی ہوگا"۔

میں جانتا تھا کہ وہ میرے ابا پر طنز کر رہے تھے۔ وہ کبھی ان کی حرکتوں سے خوش نہیں رہے تھے بلکہ اکثر و بیشتر وہ دادا سے ابا کی شکایتیں بھی کیا کرتے تھے۔ انہیں شکوہ تھا کہ دادا انہیں بگاڑ رہے ہیں۔

"مگر بھائی صاحب! عصمت کی شادی کرنے میں وہاں اکیلی کیسے رہوں گی؟"

"کیوں ضیاء نہیں ہے آپ کے ساتھ پھر ماشاء اللہ شجاع اور رضا بھی تو ہیں۔ آخر کو لوٹ کے آئیں گے۔ ان کی شادی کریں گی تو گھر بھر جائے گا"۔

ان کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ اماں کے فیصلے پر خوش نہیں ہیں۔ ٹھیک ہے کہ اس مکان میں منے دادا کا کوئی حصہ نہیں تھا مگر پھر بھی اتنی بڑی بات کا اکیلا طے کر لینا انہیں کھل گیا تھا۔ میرے خیال میں بھی وہ بالکل ٹھیک کہہ رہے تھے۔ میں جانتا تھا کہ عورت فیصلہ کرنے میں بہت جلدی کرتی ہے بلکہ جتنا غلط فیصلہ ہوتا ہے' اتنی ہی جلدی بھی کرتی ہے۔ منے دادا میرے جذبات کی صحیح ترجمانی کر رہے تھے اس لئے میں چپ تھا۔

"پھر بی جان اور خالہ بی کے علاوہ فرحت ہے وہاں پر۔ آپ نے مشورہ تو کیا ہوتا کسی سے"۔ انہوں نے پھر کہا۔

ان کی ناگواری کو محسوس کر کے اماں بل کھا کے رہ گئیں۔ اس دوران میں انہوں نے کئی بار میری طرف بھی دیکھا مگر میں سر جھکائے مصروف رہا۔ اس طرح میرے کچھ کہے بغیر میرا مدعا پورا ہو رہا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ وہ مجھ سے براہ راست پوچھیں گی تو بات کروں گا۔ انہوں نے مجھ سے بھی مشورہ نہیں کیا تھا' میں ان کا چھوٹا بیٹا سہی مگر تھا تو بڑا۔

اماں چپ ہوگئیں۔ منی دادی کن انکھیوں سے انہیں دیکھتی رہیں۔ دادی تو بے چاری چپ چاپ بیٹھی رہیں جیسے انہوں نے اس گھر سے بھی اپنی پرانی وابستگیاں ختم کر لی ہوں حالانکہ سب سے زیادہ انہی کو دُکھ ہونا چاہئے تھا کہ جیسے دنیا ہی لٹ گئی تھی۔ وہ چند نوالے نگل کر ہاتھ کھینچ چکی تھیں۔ چہرے سے اداسی ٹپک رہی تھی۔

منے دادا نے کھانے پر ہی سارے معاملات نمٹا دیئے۔ سب سے پہلے طیب ہی اٹھا تھا۔ سیدھا میرے کمرے میں چلا گیا۔ منے دادا بھی سمجھ رہے تھے کہ وہ ڈانٹ کھا کر بدمزہ ہو چکا ہے۔ میں منے دادا سے رازداری پر خود کو کچھ مضبوط محسوس کر رہا تھا۔ یہ جان کر بھی اطمینان ہوا تھا کہ سب کچھ واقعات پر یقین دلانے کے لئے مجھے انرجی ضائع نہیں کرنا پڑی۔ دادا انہیں سب کچھ بتا چکے تھے۔ کھانا کھا کر میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ منے دادا نے کہہ دیا تھا کہ ہم کل سویرے میرٹھ کے لئے نکل جائیں گے۔ سچی بات یہ ہے کہ میرٹھ کے نام پر میرے ذہن میں صرف اور صرف فرحت کا نام جگمگایا تھا۔ حالانکہ تمام برے حالات و واقعات اور کئی اموات بھی میرٹھ ہی میں ہوئی تھیں' طبیعت کو مکدر ہونا چاہئے تھے مگر آج پہلی بار میں نے محسوس کیا کہ حالات کچھ بھی ہوں' محبت کا جذبہ سب پر حاوی ہوتا ہے۔ ہاں..........! کم از کم میں اس وقت اپنے اس بے نام سے جذبے کو ان کے علاوہ کوئی نام نہیں دے پایا تھا۔ آج سوچتا ہوں تو جذبوں کو الگ الگ کر سکتا ہوں' اس کی بنیاد اور پھر وسعت کے بارے میں دلائل دے سکتا ہوں۔ انسانی نفسیات اور جذبوں کے مابین اس بے نام کشش کی نشاندہی بھی کر سکتا ہوں۔ اسباب کے بارے میں مدلل ثبوت دے کر ثابت کر سکتا ہوں کہ کون سا جذبہ بے دھیانی میں محبت کا روپ دھار کر کچھ عرصے تک آدمی کو ٹرانس میں رکھ سکتا ہے۔

بہرحال یہ لمبی بحث ہے' گو کہ کہانی کے اختتام پر یہ بحث بہت ضروری ہے مگر یہاں اس کا ذکر کروں گا تو آپ اپ سیٹ ہوں گے اور کہانی میں بھی شاید جھول پیدا ہو جائے۔ میں اس کہانی کو سیدھے سپاٹ انداز میں بتانا چاہتا ہوں۔ جہاں جس معاملے کی ضرورت ہوگی' میں وہاں آپ کی الجھن دور کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔

ہاں' تو میں بتا رہا تھا کہ میرٹھ سے وابستہ فرحت کا وجود میرے انتشار کو ختم کرنے کا سبب رہا مگر جیسے ہی میں نے اپنے کمرے میں قدم رکھا' طیب نے مجھے ہیجانی کیفیت میں مبتلا کر دیا۔

"یار ضیاء! یہ منے دادا کون ہوتے ہیں میرے معاملات میں دخل دینے والے؟" وہ پھٹ پڑا۔

"تمہارے سگے دادا ہیں"۔ میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ اس کے ساتھ مسئلہ یہی تھا کہ وہ حالات کی ہی نہیں' رشتوں کی سنگینی کا بھی خیال نہیں کرتا تھا۔

"ہیں..........! وہ پہلے چونکا' کچھ سوچا پھر گہرا سانس لے کر بولا۔ "ہاں یار! وہ تو ہیں"۔

"تم چڑی سے اتر جاتے ہو۔ پہلے تولا کرو پھر بولا کرو۔ میں کب تک ترازو لئے تمہارے ساتھ رہوں گا؟" میں نے بستر پر بیٹھتے ہوئے کہا اور جوتے اتارنے لگا۔ اب میں واقعی اسے ساتھ لانے پر پچھتا رہا تھا۔

"لیکن یار! بڑا ہونے اور دادا ہونے کا مطلب یہ تو نہیں کہ آپ ہر معاملے میں دخل دے سکتے ہیں۔ دل کے معاملات میں بھی"۔

"تمہارے دل کے معاملات ماشاء اللہ اتنے وسیع و عریض ہیں کہ اس رقبے میں دوسرے بہت سے دل اور معاملات بھی آجاتے ہیں اور یہیں سے تمام ہنگامے شروع ہوتے ہیں"۔ میں چت لیٹ گیا۔

"نہیں! میں شاہی بابا کے پاس نہیں جاؤں گا۔ زیوسا سے کوئی مطلب نہیں رکھوں گا۔ تمہارے کسی معاملے میں نہیں پڑوں گا۔ اس خوفناک اور عجوبہ شخص' رابرٹ کو قطعی طور پر بھول جاؤں گا۔ ایلیا والی کوٹھی کے بارے میں تو خیر بالکل نہیں سوچوں گا' مونیکا کی ناک کا ایک نتھنا مجھے یوں بھی پسند نہیں تھا کہ ذرا سا اوپر کو اٹھا ہوا تھا۔ اس سے تو ملاقات سمجھو ختم۔ جیہ سے بھی بس واجبی سی دوستی سمجھ لو۔ وہ ختم لیکن میں میرٹھ ضرور جاؤں گا"۔

"بول چکے تم"۔ میں جھنجھلا کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے یوں بولنا شروع کر دیا تھا جیسے حلف اٹھا رہا ہو۔

"ہاں!" وہ ملتجی انداز میں بولا۔ "مگر ضیاء..........! پلیز! میری پرابلم کو سمجھنے کی کوشش ضرور کرو۔ سارے کام چھوڑ کر تم پہلے یہ مسئلہ حل کرو"۔

وہ میرے پلنگ پر آ بیٹھا۔

"اٹھو..........!" میں نے غصے میں کہا۔

"کیوں؟" وہ بوکھلا کر بولا۔

"اٹھو یہاں سے"۔ میں نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

"لو! اب بولو۔ یار! تم کہو گے تو میں مرغا تک بن جاؤں گا مگر.........."

میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے کھینچتا ہوا کمرے سے باہر لے گیا۔

"کیا کر رہے ہو یار؟" وہ بوکھلا گیا اور یہ دیکھ کر تو اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں کہ میں اسے منے دادا کے کمرے کی طرف لے جا رہا تھا۔ اماں وہیں صحن میں لیٹی تھیں اور دادی مصلّے پر بیٹھ کر تسبیح پڑھ رہی تھی۔ دونوں نے حیرت سے میری اور طیب کی طرف دیکھا۔ طیب ان دونوں کو دیکھ کر گڑبڑا گیا۔

"ضیاء! میری بات تو سنو"۔ اس نے دھیمے سے کہا اور خود کسی اڑیل گھوڑے کی طرح زمین پر جم گیا۔

"یہ معاملہ میں نہیں' منے دادا ہی حل کر سکتے ہیں"۔

اس سے پہلے کہ میں اسے دادا کے کمرے تک لے جاتا' وہ بدک گیا۔ ہاتھ چھڑا کر کمرے کی طرف دوڑ لگا دی۔

"ارے! کیا ہوا ہے' کیوں دھاچوکڑی مچا رکھی ہے"۔ اماں اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

"کچھ نہیں اماں.........!" میں واپس اپنے کمرے میں چلا آیا۔

طیب اپنے اٹیچی کیس میں کپڑے رکھ رہا تھا۔ بری طرح جھلایا ہوا تھا۔ مجھے آتا دیکھ کر وہ آخری جوڑا اٹیچی کیس میں پٹخ کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔

"تم میرے کسی کام نہیں آ سکتے۔ مونیکا کو تم نے الٹی سیدھی حرکتیں کر کے گھر سے نکالا اور الٹے سیدھے الزامات رکھ کر میرے دل سے۔ جیہ سے تم ملنے کو تیار نہیں ہوئے۔ اس پیکر حسن کو' جس نے مجھے پہلی بار مدہوش کیا تھا' جو ایلیا کی کوٹھی میں صرف میرے استقبال کو کھڑی تھی' پُراسرار کہہ کر ٹال دیا۔ اب تو مجھے لگتا ہے کہ عورتوں کی طرح مجھے بھی بن دیکھے کسی سے بیاہ دیا جائے گا۔ دادا میرا جھکا ہوا سر قاضی کے سامنے ہلا دیں گے اور پھر......... پتا نہیں' میرا کیا حشر ہوگا"۔

میری ہنسی چھوٹ گئی۔ وہ کسی جلی بھنی عورت کی طرح ہاتھ نچا نچا کر کہہ رہا تھا۔ اس نے میرے موڈ سے آناً فاناً فائدہ اٹھایا۔ فوراً میرے قریب چلا آیا اور بولا۔

"اچھے ضیاء! میں خود کو ادھورا ادھورا محسوس کرتا ہوں۔ ایک خلاء سا محسوس ہوتا ہے مجھے اپنے اندر......... میں......... میں تمہاری مدد کا طالب ہوں ضیاء! اس ظالم دنیا میں پیار کے دشمن بہت ہیں مگر دوست.........! دوست کوئی نہیں"۔

جب وہ یہ سب کچھ دلیپ کمار کے انداز میں کہہ رہا تھا تو مجھے نہ صرف وہ فلم یاد آ گئی جس کے یہ ڈائیلاگ تھے بلکہ کچھ گانے بھی یاد آ گئے۔

"دیکھو طیب.........! یہ جو ادھورا پن اور خلاء تم محسوس کرتے ہو نا اپنے اندر........." میں نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

اس نے شکل پر مسکینی طاری کر لی اور بڑی زور سے اثبات میں سر ہلایا۔ "یہی تو!"

"اس ادھورے پن کا احساس نہ صرف مجھے ہے بلکہ منے دادا کو بھی شدت سے یہ احساس ہے۔ بلکہ وہ تو یہاں تک کہہ چکے ہیں کہ یہ ادھورا پن اس لئے ہے کہ تم سن بلوغت کو نہیں پہنچے اور ابھی تمہاری عقل داڑھ بھی نہیں نکلی اس لئے تم اپنے دماغ میں خلاء سا محسوس کرتے ہو"۔

اس کے چہرے کے تاثرات پہلے تو ایسے رہے جیسے میں اس پر ہونے والے ظلم کی وضاحت کر رہا ہوں پھر اچانک شاید بات اس کی سمجھ میں آنا شروع ہو گئی' اس نے آنکھیں پٹپٹا کر مجھے دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتا۔ میں نے کہا۔

"اور پیار کے سب دشمنوں میں تمہارا اپنا نام سرفہرست ہے!"۔

"بکواس مت کرو" وہ ایک دم اچھل پڑا۔

"یہ سو فی صد حقیقت ہے۔ ان پُراسرار حالات میں گو یہ حقیقت بھی کافی پُراسرار محسوس ہو رہی ہو گی تمہیں مگر ہے"۔

"لعنت ہے ایسی زندگی پر!" اس نے پھر کپڑے نکال کر دوبارہ اٹیچی کیس میں رکھنا شروع کر دیے۔ "سالے تم پر برا وقت پڑا تو دیکھوں گا۔ اللہ کرے تمہیں بھی کسی سے پیار ہو جائے۔ اللہ کرے جدائی کی رت تم دونوں کے درمیان دیوار چین بن جائے۔ اللہ کرے ایک منے دادا تمہارے سامنے بھی ظالم سماج کی طرح اکڑ کر کھڑے ہو جائیں......... اللہ کرے........."

"بس!" میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے چپ کرا دیا۔

"اسے اور بہت سے کام ہیں"۔

"کسے؟" اس نے ہونقوں کی طرح پوچھا۔

"اللہ تعالیٰ کو......... یہ سارے کام تو بندے خود ہی نمٹا لیتے ہیں۔ مجھے نیند آ رہی ہے' تم بھی سونے کی [illegible]"۔ میں بستر پر لیٹ گیا۔ طیب واقعی حیرت انگیز طور پر [illegible] عجیب و غریب فطرت کا تھا۔ وہ آج ہونے والے واقعے پر ذرا بھی نہیں سوچ رہا تھا جبکہ میں سوچ بچار کا عادی تھا اور دن بھر ہونے والے واقعات پر رات کو ضرور سوچتا تھا۔ اس

طرح اپنا محاسبہ بھی آسان ہو جاتا تھا اور واقعات کے اسباب کی وضاحت بھی ہو جاتی تھی مگر وہ لیٹنے کی بجائے ٹہلنے لگا۔ اس کی تمام تر کوشش تھی کہ میں اسے اٹیچی کیس تیار کرتے نہ صرف یہ کہ دیکھ لوں بلکہ پوچھوں کہ وہ کہاں جا رہا ہے اور پھر یہ جان کر کہ وہ کہیں جانے کا مصمم ارادہ کر چکا ہے اسے مناؤں۔ کہوں کہ میں منے دادا سے بات کرتا ہوں کہ وہ میرٹھ لے چلیں مگر میں ایک گھنا آدمی تھا۔ یہ میری ہی تو خواہش تھی کہ وہ بمبئی چلا جائے۔ میں نے اٹیچی کیس کی طرف دیکھا نہ اسے کپڑوں کی اٹھا پٹخ کرتے دیکھ کر تشویش کا اظہار کیا بلکہ میں نے لائٹ بجھا دی۔ اندھیرا ہوتے ہی اس کی آواز سنائی دی۔

"یہ اندھیرے جو تم میری زندگی میں بھرنے کی کوشش کر رہے ہو ضیاء..........! ایک نہ ایک دن یہی اندھیرے سیاہ ناگ بن کر تمہیں ڈس لیں گے"۔

"کون سی فلم کا ڈائیلاگ ہے؟" میں نے فوراً پوچھا۔

وہ بے اختیار بولا۔ "رام تیری گنگا میلی" پھر خود ہی کھسیا گیا۔ "بکواس کر لو۔ آج تمہاری باری ہے نا.......... کل جب میری باری ہو گی تب میں بتاؤں گا تمہیں"۔

میں نے جواب نہیں دیا۔ میں وتسلا اور پیٹر کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں پیٹر کو جس حالت میں چھوڑ آیا تھا' وہ تشویشناک تھی۔ پتا نہیں' وہ ٹھیک ہوا ہو گا یا نہیں۔ وتسلا ایک معذور عورت تھی مگر ہم بھی کیا کرتے! مزید رکنا ہمارے بس میں نہیں تھا۔ منے دادا کی پریشانی الگ تھی۔ اب احساس ہو رہا تھا کہ ہمیں یوں نہیں آنا چاہئے تھا۔ پیٹر نے ہمارا ساتھ دیا تھا' وتسلا سے ملایا تھا اسے اس حالت میں چھوڑ آنا صد فی صد ہماری بے حسی تھی لیکن اب رات تو گزارنا ہی تھی پھر وتسلا نے ان زنجیروں کا مطالبہ کیا تھا۔ وہ میرے کسی کام کی نہ تھیں۔ میرے حساب سے تو انہیں وتسلا کے حوالے کر دینا ہی بہتر تھا کہ منے دادا نے مجھے اس سلسلے میں شالی بابا سے مشورہ کرنے کی ہدایت کی تھی اور یہ ایک معقول بات تھی۔ ورنہ یہ بھی ممکن تھا کہ جلد ہی مجھے اس پر بھی پچھتانا پڑتا۔

طیب کی آواز بند ہو چکی تھی۔ میں نے دھیرے سے سر گھما کر دیکھا۔ وہ کروٹ لئے لیٹا تھا۔ اٹیچی کیس اب بھی اس کے پلنگ کے اوپر ایک طرف رکھا تھا۔ پہلے میں نے سوچا کہ اسے اٹھا کر نیچے رکھ دوں مگر پھر یہ سوچ کر ڈر گیا کہ وہ بولنا شروع ہو گیا تو ساری رات بولتا رہے گا۔ جتنا وقت اسے سوچنے کو مل چکا تھا' اس میں تو اس نے کئی فلموں کے ڈائیلاگ یاد کر لئے ہوں گے۔ میں دم سادھے لیٹا رہا اور دوسرے ہی لمحے اچھل پڑا کیونکہ

اچانک ہی کمرا اس کے خراٹوں سے گونجنے لگا تھا۔

اگلی صبح مجھے اٹھانے والا طیب تھا۔ اس کے چہرے پر انتہائی بے بسی اور بے چارگی کے تاثرات تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے بس وہ اب رونے ہی والا ہے۔ پہلے تو میں چونکا مگر فوراً ہی سنبھل گیا' اٹھ بیٹھا۔ اس نے ناک سڑکی' شاید وہ چاہ رہا تھا کہ میں اسے غور سے دیکھوں مگر میں نے چپل پہنے اور کمرے سے نکل گیا۔

پراٹھوں کی خوشبو نے بھوک بڑھا دی تھی۔ میں منہ ہاتھ دھو کر برآمدے تک پہنچا تو طیب پراٹھے کھا رہا تھا۔ اماں' دادی اور منی دادی کو "مغل اعظم" کی اسٹوری سنا رہا تھا۔ میں نے شکر بھیجا کہ اس کا موڈ بحال ہے۔

"بس کرو۔ تین دفعہ کی دیکھی ہوئی فلم ہے"۔ عصمت آپا نے سپاٹ انداز میں اسے ڈانٹ دیا۔

"تین دفعہ..........! ارے! میں نے تمیں دفعہ دیکھی ہے مگر اب بھی ایک بار اور دیکھنے کی حسرت نے دم نہیں توڑا"۔

"یہ حسرت تمہارے دم کے ساتھ ہی ٹوٹے گی" انہوں نے چائے کی پیالی اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

اگر اس وقت منے دادا نہ آ گئے ہوتے تو جانے کیا ہوتا کیونکہ میں طیب کے چہرے پر تمتماہٹ بھی دیکھ چکا تھا اور اس کے نتھنوں کو پھڑکتے ہوئے بھی.......... عصمت آپا کو بھی احساس ہو گیا تھا کہ بات اس کے لبوں کے کناروں تک آ پہنچی ہے۔ انہیں شاید ترس آ گیا تھا کہ وہ اٹھ کر جلدی سے چلی گئیں ورنہ بات اس کے لبوں سے پھسل جاتی اور وہ صبح سویرے منے دادا کی ڈانٹ کھاتا۔

منے دادا کی صورت دیکھ کر مجھے فوراً ہی احساس ہو گیا کہ وہ تمام رات نہیں سو سکے تھے۔ کیوں..........؟ یہ کافی سوچنے کے بعد بھی میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اب وہی گھر رہ گئے تھے۔ پہلے تو صرف ان کا گھرانہ تھا مگر اب اماں اور ہماری موجودگی نے ان کی ذمے داریوں میں اضافہ کر دیا تھا۔ سب سے زیادہ پریشانی انہیں دادی کی تھی جو منی کی سوت بن کر رہ گئی تھیں۔ مجھے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ وہ دادا سے اس قدر محبت کرتی ہوں گی۔ میں نے زندگی میں تو انہیں ابا کی وجہ سے دادا سے لڑتے ہی دیکھا تھا۔ یہ تو گمان بھی نہیں تھا کہ دادا کی موت ان کی زندگی کو یوں اپنی بانہوں میں لے لے گی کہ وہ زندہ

رہتے ہوئے بھی زندوں میں شامل نہ ہوں گی۔ یقین ہوگیا کہ محبت گریز پا تھی۔

میں تو ناشتا خاموشی سے کرتا رہا۔ منے دادا سے اس وقت کچھ پوچھنے کا موقع نہ تھا' طیب سے بات کرنا شہد کی مکھیوں کے چھتے کو چھیڑنے کے مترادف تھا۔ دادی چپ تھیں' وہ زندہ رہنے کو دو نوالے کھا لیتی تھیں اور گھر میں کسی سائے کی طرح بے چاپ پھرا رہتی تھیں۔ اماں اپنے ہی جھمیلوں میں لگ گئی تھیں۔ جب ابا کی موت نے ہی انہیں اتنا نڈھال نہیں کیا تو دادا کی موت کب تک اثر انداز ہوتی۔

"ہم آج شام کو نکل لیں گے"۔ اچانک منے دادا نے کہا۔ "جی منے دادا.........!" میں نے قطعی سر نہیں اٹھایا۔ طیب جہاں بیٹھا تھا' وہاں جیسے کسی طوفان نے کروٹ لی تھی۔

"اور تم.........!" دادا نے گونج دار آواز میں کہا تو میں نے انہیں دیکھا۔ وہ طیب سے مخاطب تھا۔ "تم بمبئی جاؤ۔ انسانوں کی طرح گھر میں رہو۔ نوکری پر پابندی کے ساتھ جاؤ اور مغرب سے پہلے گھر لوٹ آنے کی عادت ڈالو۔ بمبئی جاکر رہنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آدمی اپنی تہذیب بدل ڈالے"۔

"جی.........! جی منے دادا.........! میں آج تو نہیں' کل چلا جاؤں گا"۔ اس نے نوالہ شاید بغیر چبائے نگل لیا تھا کیونکہ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور آنکھیں بھی سرخ تھیں۔

"کیا کرو گے یہاں رہ کر؟ ضیاء جا رہا ہے"۔ انہوں نے اس بار کچھ نرمی سے کہا۔

"منے دادا! ابھی تو میں نے منی دادی سے جی بھر کر باتیں بھی نہیں کیں"۔ وہ روہانسا ہوگیا۔

"تمہیں منی دادی سے اتنی محبت کب سے ہوگئی؟" انہوں نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

"ارے! کیا ہے۔ آپ تو پیچھے پڑ کر رہ گئے بچے کے......... ضروری تو نہیں کہ طاہر میاں نے جو کچھ کہا اور زہرہ بی نے جو بتایا' وہ سب کا سب سچ ہو۔ ہمارے یہاں تو بڑے ہونے کا صرف ایک ہی فائدہ اٹھایا جاتا ہے کہ خوب بھی خوب ڈانٹو اور دوسروں سے بھی ڈانٹ پڑواؤ۔ چلا جائے گا بس......... آپ جائیں میرٹھ.........."

منی دادی کو طیب کی حالت پر ترس آیا تھا یا اندر چھپی کسی محبت کا ابال تھا بہرحال

طیب کے چہرے کی مسکینی اور بڑھ گئی۔ ناشتے کے فوراً بعد منے دادا کے باہر جاتے ہی اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور کھینچتا ہوا اندر کمرے میں لے گیا۔

"میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں ضیاء! طاہر بھائی سے بھی جاکر پوچھوں گا کہ وہ یہاں اس لئے آئے تھے اور یار! یہ تمہاری بمن کس مٹی کی بنی ہوئی ہے!"

"اس بارے میں معلومات کم ہیں میری۔ بہرحال تمہارا کیا پروگرام ہے؟" میں نے انتہائی سنجیدگی سے جواب دیا۔ وہ جو اس کے اندر ایک ابال سا آیا ہوا تھا' جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ وہ کچھ دیر لٹا لٹا سا بیٹھا رہا پھر بولا۔

"جاتا ہوں بمبئی......... ورنہ منے دادا مجھے خود چھوڑنے جائیں گے"۔

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس کا اتنی جلدی مان جانا معجزہ ہی تھا ورنہ مجھے یہ شک تھا کہ وہ کوئی بے وقوفی کی ترکیب ضرور بتائے گا۔ اب میں نے اس سے کوئی بات کرنے کی بجائے تیاری شروع کر دی۔ جانا تو ہمیں صرف دو تین دن کے لئے تھا مگر حالات کیا رخ اختیار کر لیں' یہ اعتبار ختم ہوگیا تھا۔ بمبئی میں تو طیب تھا' طاہر بھائی تھے' ان کے کپڑے کام آگئے تھے مگر میرٹھ میں ایسا کوئی نہیں تھا کہ میں ایمرجنسی میں ان کی چیزیں استعمال کرسکوں۔ طیب مجھے تیاری کرتا دیکھتا رہا اور ٹھنڈی آہیں بھرتا رہا۔

"سنو! میرا سلام محبت تو کہہ دو گے نا!" وہ اچانک بولا۔ جی تو چاہا کہ پلٹ کر الٹا ہاتھ دوں مگر ضبط کر گیا۔

"کہہ دوں گا۔ اگر جواباً تھپڑ پڑا تو وہ تم سے چکا لوں گا۔ اب فرحت کے اور میرے تھپڑ میں فرق تو ہے ناں!"

"ارے نہیں یار.........! تم دیکھنا' اس کی آنکھوں میں چراغ جل اٹھیں گے۔ ہونٹوں پہ مسکان پھیل جائے گی۔ لانبی لانبی پلکیں حیا کے بوجھ سے جھک جائیں گی اور.........."

"بس.........!" میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ میرا لہجہ تیز اور انداز اکھڑا ہوا تھا مگر اس پہ ذرہ برابر اثر نہ ہوا۔ میں اس کی طرف پلٹا تو وہ خلا میں تک رہا تھا اور اس کے چہرے پہ مسکراہٹ تھی۔

میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ پتا نہیں' کیوں میرا غصہ بڑھنے لگا۔ یہ سچ ہے کہ فرحت سے میرے جذباتی لگاؤ کا خود مجھے بھی اندازہ نہ تھا۔ ہم نے کوئی عہد و پیمان بھی

نہیں کئے تھے۔ ہاں' بی جان نے میں ایک وعدہ کر چکا تھا' اس ناطے میں اس کے لئے جذباتی بھی ہو سکتا تھا مگر ایسا کہ میرا دماغ اڑ جائے' یہ میرے لئے حیرت کی بات تھی شاید اس میں زیادہ ہاتھ طیب کے چھچھورے انداز کا تھا۔ بہرحال اس کے بعد میں کچھ مصروف ہو گیا۔

مجھے واقعی آفس جا کر حالات معلوم کرنا تھے۔ میرا ایم ڈی بڑا خر دماغ آدمی تھا۔ میری کافی چھٹیاں ہو چکی تھیں۔ مجھے امید نہیں تھی کہ میں مزید چھٹیاں حاصل کر سکوں گا۔ بہرحال حالات کا جائزہ تو لینا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہاں میرے ہی ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک اور درخواست پہنچ چکی تھی جس میں مزید ایک ماہ کی چھٹی طلب کی گئی تھی اور وہ چھٹی منظور بھی ہو چکی تھی حالانکہ میں نے ایسی کوئی درخواست نہیں دی تھی بلکہ آج اپنے ساتھ لکھ کر لے گیا تھا۔ جب مجھے علم ہوا تو زیوسا کا نام میرے دماغ میں سرسرایا مگر یہ بھی ضروری نہیں تھا' میں ابھی تک ایلن اور زیوسا کو الگ کر کے نہیں سوچ سکا تھا۔

☆==========☆==========☆

میں گھر پہنچا تو دن کے تین بج رہے تھے۔ اس زمانے میں پانچ بجے میرٹھ کے لئے گاڑی روانہ ہوتی تھی اور گھنٹوں میں کہیں جا کر رات گئے میرٹھ اتارتی تھی۔ منے دادا تیار تھے۔ اماں نے بی جان' خالہ بی اور فرحت کے لئے بہت سی چیزیں دیں۔ رات کے لئے چائے' کھانا سب ساتھ کر دیا۔ طیب کسی اداس الو کی طرح برآمدے کے پلنگ پر اکڑوں بیٹھا ہمیں تیاری کرتے دیکھ رہا تھا۔ اس کا اٹیچی کیس بھی قریب ہی رکھا تھا حالانکہ اسے بمبئی کے لئے کل صبح روانہ ہونا تھا۔ اٹیچی کیس سے شاید وہ منے دادا کا دل پگھلانے کا آخری چانس لینا چاہتا تھا۔ میں نے رخصت ہوتے ہوئے اس سے ہاتھ ملایا تو اس نے مجھے آنکھ سے اشارہ کر کے اور ہاتھ ماتھے تک لے جا کر "سلام محبت" پہنچانے والا وعدہ یاد دلایا۔ میں جبڑے بھینچ کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ دروازے سے نکلتے ہوئے میں نے منے دادا کا جملہ سنا جو وہ منی دادی سے کہہ رہے تھے۔

"اس بندر کو میری واپسی سے پہلے بھیج دینا"۔

"اگلے پل کی خبر نہیں ہے منے دادا! موت ہر وقت آدمی کے تعاقب میں رہتی ہے۔ آپ جاتے جاتے میرا دل دکھا رہے ہیں۔ وہاں ہر بات کا حساب ہو گا"۔ یہ طیب کی

آواز تھی۔

"ارے! کیا بک رہا ہے تو؟" منی دادی کی آواز آئی۔

"نہیں! نہیں! میرا مطلب یہ تھا کہ کیا پتا' میں جاؤں تو پھر کبھی لوٹ کے نہ آسکوں"۔ طیب نے گھبرا کر جواب دیا۔ میں باہر کھڑا ہنس رہا تھا۔

"ہاں۔ آیا تو جوتے کھائے گا"۔ منے دادا نے غصے سے کہا اور باہر نکل آئے۔

☆==========☆==========☆

ہم اسٹیشن پہنچے تو ٹرین چلنے میں کافی دیر تھی۔ ہم نے چھوٹی بوگی بک کرائی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ ہم اس معاملے پر بہرحال سوچ بچار اور بات چیت کرنا چاہتے تھے۔ یہ گھر میں بھی ممکن نہ تھا کہ کوئی نہ کوئی آتا رہتا تھا۔ گھر والے ہی چاروں طرف منڈلاتے رہتے تھے۔ میں نے آپ کو بتایا ہے کہ صبح منے دادا کی شکل دیکھ کر مجھے احساس ہوا تھا کہ وہ رات بھر جاگتے اور پریشان ہوتے رہتے ہیں لیکن ابھی تک ان سے کچھ پوچھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ سیٹوں پر بیٹھ کر ٹرین چلنے کا انتظار کرنے کے دوران میں' میں نے منے دادا کے اضطراب کو بڑھتا محسوس کیا۔ یہ اضطراب اس وقت تک رہا جب تک ٹرین نہیں چل پڑی۔ گو میں دروازہ بند کر چکا تھا مگر کھڑکی سے شور کی آوازیں اب بھی آ رہی تھیں کیونکہ پلیٹ فارم پر رش تھا اور گاڑی رینگ رہی تھی۔

جیسے ہی اسٹیشن ختم ہوا' دادا ذرا سنبھل کر بیٹھ گئے۔

"ضیاء! ہمیں کچھ ہی دنوں میں کچھ اہم فیصلے کرنے پڑیں گے"۔

"مثلاً.........!" میں ان کی طرف پوری طرح متوجہ ہو گیا۔

"یہ میں شالی بابا سے ملاقات کے بعد بتاؤں گا مگر......... ضیاء.........! شاید تمہیں ان فیصلوں سے مایوسی ہو"۔

اب میں چونک اٹھا۔ ان کے جملے کا مطلب تھا کہ وہ فیصلے یقیناً میرے خلاف ہوں گے مگر کیا.........؟ میں نے چند لمحے سوچا۔ "منے دادا! کیا آپ نے وہ مکان بیچنے کا فیصلہ کر لیا ہے؟" فوری طور پر میری سمجھ میں یہی بات آئی۔

"نہیں!" وہ جلدی سے بولے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھ سے نگاہ چرا گئے ہیں۔

"پھر.........؟" اب میں مضطرب ہو گیا۔

"میں نے کہا نا کہ میں شالی بابا سے ملاقات کے بعد ہی تمہیں صحیح صورت حال بتا سکوں گا۔ کیا تم ایسا کچھ محسوس نہیں کر رہے؟" ان کی آنکھوں اور انداز میں کھوج تھی۔

"نہیں!" میں نے کچھ دیر خود کو اندر سے ٹٹول کر جواب دیا۔ "میرا خیال ہے کہ کچھ بھی میری مرضی کے خلاف نہیں ہو رہا"۔

"کیا زیوسا نے کچھ نہیں کہا"۔

"جی!" میں چونک اٹھا۔ "میں سمجھا نہیں۔ کیا زیوسا میرے خلاف یا حق میں فیصلہ کرنے کا استحقاق رکھتی ہے؟"

"نہیں! میرا مطلب ہے کہ کیا اس نے تم سے کوئی بات نہیں کی"۔

"میں تو منتظر ہوں کہ وہ مجھ سے کوئی بات کرے" میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ فوراً ہی میں چونک اٹھا۔ ان کے انداز سے پتا چل رہا تھا جیسے زیوسا نے ان سے ضرور کوئی بات کی ہے۔ "کیا بات ہے منے دادا! آپ صاف صاف بتائیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ آپ کو دھوکا دے رہی ہو اور آپ........."

"ضیاء.........! بیٹا! بعض اوقات بچپن کی غلطیاں زندگی بھر تعاقب کرتی ہیں۔ عطا نے جو کچھ کیا' وہ جان بوجھ کر کیا اور تم نے جو کیا' وہ انجانے میں کیا مگر معاملات دونوں ہی سنگین ہیں۔ بہرحال' میرا خیال ہے کہ ہم کوئی نہ کوئی حل نکال لیں گے۔ زیوسا کا انداز نرم ہے حالانکہ میں امید نہیں کر سکتا۔ یہ یونان میں ایک ایسی دیوی کی شہرت رکھتی ہے جو انتہائی سفاک ہے۔ گو اس کا تعلق نفسانی خواہشات سے ہے اور انسانی زندگی میں نفسانی خواہشات لذت اور سرور کا باعث سمجھی جاتی ہیں مگر بیٹا! ہر جذبے کے دو رخ ہوتے ہیں۔ ایک خیر اور دوسرا شر۔ زیوسا نام کی دیوی شر سے منسوب ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ یونان میں بھی یہاں ہندوستان کی طرح ماورائی باتیں یقین کا روپ دھار لیتی ہیں کیونکہ وہاں کے لوگ بہرحال یہاں سے زیادہ سویلائزڈ ہیں مگر پراسرار قوتیں تو پوری دنیا میں ہر جگہ موجود ہیں۔ یہ عقائد کی کمزوری سے ہٹ کر کوئی بات ہے۔ کوئی ایسا اسرار جو نظر نہیں آتا ہے۔ محسوس بھی ہوتا ہے مگر سمجھ میں نہیں آتا۔ میں اس سلسلے میں مزید معلومات حاصل کر رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ میں بہت جلد اصل بات کو پا لوں گا لیکن فی الوقت ہم اپنے آپ کو محفوظ کرنا چاہتے ہیں۔ شالی بابا سے ملتے ہیں اگر وہ نہیں ملے تو وشوا ناتھ کے پاس چلیں گے"۔

میں جو مٹے دادا کی معلومات پر حیران ہو رہا تھا' وشواناتھ کے نام پر چونک اٹھا۔ "وشواناتھ کون ہیں؟"۔

"تم ملو گے تو پتا چل جائے گا"۔ مٹے دادا نے بات ٹال دی۔ "میں کچھ دیر سو لوں گا"۔

وہ تو یہ کہہ کر لیٹ گئے اور مجھے پہلی بار خیال آیا کہ میں جو خود کو بڑا عقل مند معاملہ فہم اور گھاگ سمجھتا ہوں' نرا گاؤدی ہوں۔ یہ تو میں بھی سن چکا ہوں کہ زیوسا کی دیوی یونان میں کس قسم کی شہرت رکھتی ہے۔ یہ خیال مجھے کیوں نہیں آیا کہ وہاں کی مائتھولوجی میں اس کی تفصیل پڑھتا' وہاں کے عقائد جان کر معاملے کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا۔ یہ پتا کرتا کہ آخر ایلن کا ان زنجیروں سے کیا تعلق تھا۔ ٹھیک ہے کہ اسے کسی عورت نے یہ کہہ کر دی تھیں کہ وہ ان کی مالک بن کر دنیا کی امیر ترین عورت بن جائے گی مگر وتسلا نے مجھے بالکل مختلف بات بتائی تھی کہ وہ زنجیروں کو محض اس لئے حاصل کرنا چاہتی ہے کہ زیوسا کو قابو میں کر سکے۔ یعنی اس طرح تو ابا اور رابرٹ کے ساتھ ہونے والی ساری کہانی ہی بے بنیاد ہو جاتی تھی پھر وتسلا نے یہ بھی کہا تھا کہ ایلن مر جانے کے باوجود کچھ روحوں کو روکنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور انہیں اذیت سے دوچار کر رہی ہے۔ وہ زنجیریں حاصل کرنا چاہتی ہے۔ میں یہ سب سوچ رہا تھا اور ساری باتیں آپس میں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔

مٹے دادا آنکھیں بند کئے لیٹے تھے۔ مجھے لگ رہا تھا کہ وہ کچھ چھپا رہے ہیں۔ بہرحال' یہ فیصلہ میں نے کرلیا کہ فرصت پاتے ہی میں اس زیوسا نامی دیوی کے بارے میں معلومات ضرور حاصل کروں گا۔ حیرت مجھے یہ تھی کہ کہاں یونان اور کہاں انڈیا! ابا اگر میرسپاٹوں کے شوقین نہ ہوتے اور رابرٹ وغیرہ سے ان کی دوستی نہ ہوتی تو شاید یونانی دیوی' دیوتاؤں کا چکر انڈیا تک نہ پہنچتا۔ انڈیا میں کم دیوی دیوتا ہیں کہ جو باہر سے بھی اسمگل ہو جاتے مگر جو کچھ ہونا تھا' ہو چکا تھا۔ اب میری پریشانی تو صرف اتنی رہ گئی تھی کہ مٹے دادا ایسے کون سے فیصلے کرنا چاہتے ہیں یا کرنے پر مجبور ہیں جو میرے خلاف ہوں گے۔ جب سوچ سوچ کر میرا دماغ پھوڑے کی طرح پکنے لگا تو میں نے اپنے ذہن کو اندیشے سے خالی کرلیا۔ میں اب کچھ نہیں سوچنا چاہتا تھا۔ ان کریہہ سوچوں سے نجات ملی تو فرحت کا خیال نرم جھونکے کی طرح مجھے تر و تازہ کرگیا۔

وہ مجھے دیکھ کر کتنی حیران ہوگی! یہ خیال بڑا سنسنی خیز تھا۔ دادا کی موت پر بیمار اور بے ہوش رہنے کے بعد سے میری اس سے کوئی بات ہی نہیں ہوئی تھی۔ جب بمبئی گیا تب بھی ایسی کوئی بات نہیں ہوئی جو دماغ کے کسی کونے میں دبکی بیٹھی ہوتی۔ ہاں' اس کی خوبصورت آنکھوں میں ایک روشنی میں محسوس کی تھی۔ جس میں محبت بھی تھی' خوشی بھی' دکھ بھی اور تفکر بھی.......... یا پتا نہیں' ان میں سے کوئی ایک چیز.......... لیکن وہ چمک مجھے یاد رہ گئی تھی۔ شاید بی جان نے اسے بتا دیا تھا یا پھر اس نے بی جان اور خالہ بی کی باتیں سن لی تھیں۔ "اس بار میں اس سے کہہ دوں گا"۔ میں نے فیصلہ کیا۔ کبھی کبھی چند لمحوں کا حسن' زندگی کے طویل بدصورت حصے میں بڑا سہارا بن جاتا ہے۔ شاید اسی لئے لوگ جو محبت میں سرگوشیاں کرتے ہیں' انہیں مدتوں نہ صرف یہ کہ یاد رہتی ہیں بلکہ ہر قسم کے نامساعد حالات میں حوصلہ بھی دیتی رہتی ہیں۔

پھر سارا سفر عام سی باتوں میں کٹ گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ مٹے دادا اس موضوع پر زیادہ بات نہیں کر رہے ہیں۔ حالانکہ میرے ذہن میں یہی تھا کہ ہم اس معاملے پر سوچ بچار کے علاوہ تبادلہ خیال بھی کریں گے۔ کوئی لائحہ عمل طے کریں گے۔ ایک دوسرے کے درمیان انڈر اسٹینڈنگ پیدا کریں گے مگر ایسا ہو نہیں سکا۔ جب میں نے ایسی کوئی کوشش کی' مٹے دادا ٹال گئے۔

☆---------------------☆---------------------☆

قاہرے سے تو ٹرین کو آٹھ نو بجے تک میرٹھ پہنچ جانا چاہئے تھا مگر وہ رات سوا گیارہ بجے میرٹھ پہنچی۔ اسٹیشن سے گھر کا فاصلہ بھی تقریباً آٹھ' نو کلومیٹر تھا۔ ہمیں سائیکل رکشا مل گیا۔ رکشا والا نحیم شحیم' چوڑا چکلا لڑکا تھا۔ کافی باتونی بھی تھا۔ اس نے یہ فاصلہ کافی تیزی سے طے کیا اور اتنی ہی تیزی سے میرٹھ کے سیاسی' معاشی اور معاشرتی حالات سے بھی آگاہ کرتا رہا۔ وہ مجھے پہچانتا تھا۔ سب کی خیریت بھی پوچھی۔ مبشر کے واقعے پر کافی دیر تک اظہار افسوس کرتا رہا۔ ہمارے مکان کے بارے میں بھی پوری معلومات حاصل کرلیں بلکہ ہمارا عندیہ بھی لے لیا کہ ہم اسے بیچنا چاہتے ہیں یا نہیں۔ اس زمانے میں اسٹیٹ ایجنسیاں نہیں ہوتی تھیں جس طرح رشتے کروانے والی عورتیں ہوتی تھیں اسی طرح یہ تانگے والے' سائیکل رکشا والے ہی جائیداد کی خرید و فروخت میں معاونت کیا کرتے تھے۔ ایک بات آپ نے کہہ دی' اب رات تک وہ خبر ہر میرٹھ آنے

اور ہر جانے والے کو پتا چل جاتی تھی۔ گویا یہی لوگ اشتہاری ایجنسی کا کام بھی کرتے تھے۔ بہرحال میں تمام تر توجہ سے سارے حالات سنتا رہا۔ اتنے عرصے سے باہر تھا۔ یہ گلیاں اندھیرے میں بھی بڑھ کر استقبال کرتی محسوس ہو رہی تھیں اور اس لڑکے کا پورے میرٹھ کے لہجے کی اپنائیت لئے ہوئے محسوس ہو رہا تھا۔

ہم گھر کے دروازے پر پہنچے تو شاید پونے بارہ کا عمل تھا۔ آنگن کا ایک بلب زرد روشنی سے پورے ماحول کو بوجھل کئے ہوئے تھا۔ ہم نے سائیکل رکشا والے کا کرایہ ادا کیا۔ منے دادا سفر سے تھک گئے تھے یا حالات سے مضمحل تھے۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ مجھے اندر قدموں کی چاپ سنائی دی پھر معدوم ہو گئی پھر کھٹکھٹایا۔ خالہ بی کی آواز آئی۔

"کون ہے؟"

"خالہ بی! میں ہوں ضیاء..........!" انہیں شاید یقین نہیں آیا یا وہ سمجھیں نہیں کہ کون ضیاء۔

"کون ضیاء..........! کس سے ملنا ہے..........؟"

"خالہ بی! میں دہلی سے آیا ہوں۔ ضیاء الرب..........! دروازہ کھولیں۔ میرے ساتھ منے دادا بھی ہیں"۔

"اللہ خیر!" خالہ بی کی بوکھلائی ہوئی آواز آئی پھر انہوں نے کنڈی کھولتے ہوئے اندر پکار کر بی جان کو ہماری آمد کی اطلاع دے ڈالی۔ "اے! دہلی سے ضیاء آیا ہے' اتنی رات کو"۔

بی جان کے کمرے سے باہر آنے سے پہلے ہی دروازہ کھل گیا۔ خالہ بی کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ میں نے فوراً کہا۔ "سب خیریت ہے"۔ اتنے میں بی جان اور فرحت بھی باہر آگئیں۔ دونوں پریشان تھیں۔ ہمارے چہروں پر کچھ ٹٹولتی ہوئی۔ جب انہیں اچھی طرح اطمینان ہو گیا تب ان کی آوازیں نکلیں۔ منے دادا کو دیکھ کر وہ اور حیران تھیں۔ وہ کبھی بی جان کے گھر نہیں آئے تھے۔ شاید پہلی بار یوں رہنے کے لئے آئے تھے مگر میں نے موقع ملتے ہی بی جان کو بتا دیا کہ ہم شاہی بابا سے ملاقات کے لئے آئے ہیں۔ ہر طرح خیریت ہے مگر حفظ ماتقدم کے طور پر سکون کے وقت ان سے ملنا چاہتے تھے۔ نہیں' انہیں یقین آیا یا نہیں' مگر وہ تناؤ ختم ہو گیا جو ہماری آمد سے ان کے چہروں پر چھا گیا

٭٭٭

آدھے گھنٹے بعد ہی سب ٹھیک ہو گیا۔ اماں کی بھیجی ہوئی چیزوں نے بھی کچھ اطمینان دلایا۔ عصمت آپا نے فرحت کے نام خط بھیجا تھا۔ خیر خیریت کی باتیں ہوتی رہیں۔ منے دادا سونے چلے گئے۔ خالہ بی بھی سو گئیں مگر میں' بی جان اور فرحت بڑی رات تک آنگن میں پلنگ ڈالے باتیں کرتے رہے۔ فرحت کی آنکھوں میں چمک تھی۔ اس چمک کو دیکھتے ہی مجھے طیب یاد آگیا۔ اس نے کہا تھا کہ تم دیکھنا' اس کی آنکھوں میں چراغ جل اٹھیں گے۔ ہونٹوں پر مسکان ہو گی اور لانبی لانبی پلکیں حیا کے بوجھ سے جھکی ہوں گی۔ بالکل ویسا ہی تھا مگر یہ سب کچھ طیب کا نام لئے بغیر تھا۔ میں نے قطعی اس کا کوئی ذکر کیا نہ سلام محبت پیش کیا۔

"جاؤ فرحت! تم جا کر سوؤ۔ سویرے اٹھنا ہے پھر کسلمندی ہو گی"۔ بی جان نے فرحت سے کہا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھ گئی حالانکہ وہ قطعی مجھ سے بے تکلفی سے بات نہیں کرتی تھی اور اس وقت بھی وہ کم ہی بول رہی تھی مگر پرشوق نگاہوں سے اس کا دیکھنا' پوری توجہ سے میری باتیں سننا ہی مجھے اچھا لگ رہا تھا لیکن میں بی جان کی بات سے اختلاف بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ زمانہ تو وہ تھا جب بارہ بجے تک لوگ آدھی نیند سو لیا کرتے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ اسے نیند بالکل نہیں آئے گی مگر وہ چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی بی جان کا لہجہ تشویشناک ہو گیا۔

"ضیاء! سب خیریت تو رہی نا!"

"جی بی جان! واقعی قسم سے' سب خیریت رہی" میں نے یقین دلایا۔

"لیکن یہاں خیریت نہیں رہی"۔

"کیا.......... کیا مطلب؟" میں چونک کر سیدھا ہو گیا۔ "کیا ہوا؟"

"لوگوں کو مبشرو کھائی دیتا ہے۔ اکثر نے قسم کھا کر بتایا ہے کہ وہ گلیوں میں کسی کو تلاش کرتا پھرتا ہے اور اس کی حالت بالکل ویسی ہوتی ہے جیسی مرتے وقت تھی۔ بدن ابھرا ہوا ہوتا ہے۔ خون کے قطرے ٹپک رہے ہوتے ہیں۔ بس وہ بول نہیں پاتا بلکہ عجیب سی غوں غوں کی آوازیں نکالتا ہوا دایاں ہاتھ یوں آگے کو پھیلائے جیسے کسی کو کچھ دینا چاہتا ہو' گلیوں میں لڑکھڑاتا پھرتا ہے۔ یہ صرف اسی روز ہوتا ہے جس روز وہ مرا تھا۔

مجھے یہ سن کر حیرت ہوئی کیونکہ سائیکل رکشا والے نے سارے حالات بتائے تھے۔ مبشر کا ذکر بھی کیا تھا مگر یہ نہیں کہا کہ ایسا کوئی واقعہ بھی گردش کر رہا ہے۔ "بی جان! یہ آپ سے کس نے کہا؟"

"اے! سارا محلہ بلکہ سارا میرٹھ کہہ رہا ہے"۔

میں الجھ گیا۔ بی جان کو جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھیں جو بات کا بتنگڑ بنا لیتے ہیں یا کسی واقعے کا ذکر کر کے' سنسنی پیدا کر کے اپنا کوئی شوق پورا کرتے ہیں۔

"صبح کو نکلو گے نا تم.......... خود سن لینا۔ محلے والے تو یہاں تک کہتے ہیں کہ وہ یہاں سامنے والی سڑک سے بالکل یوں آ رہا ہوتا ہے جیسے اس روز آپ کے گھر کی طرف آ رہا تھا اور یوں کسی کی طرف ہاتھ بڑھا رکھا ہوتا ہے جیسے اس روز سامنے ضیاء کھڑا تھا۔ تم خود سن لینا"۔

وہ شاید سمجھ گئیں کہ مجھے یقین نہیں آ رہا ہے۔ "نہیں! ظاہر ہے' آپ بتا رہی ہیں تو غلط تو نہیں ہوگا"۔ میں نے دھیرے سے کہا اور اپنے شک کی وجہ بھی بتا دی۔

"ہاں! تو اس نے یہ سوچ کر نہیں بتایا ہوگا کہ تمہارے ساتھ بڑے میاں تھے۔ اتنا ہولناک قصہ بچوں یا بوڑھوں کے سامنے یوں منہ کھول کر رات کے پچھلے پہر بتانا ٹھیک بھی تو نہیں تھا۔

اے! کوئی سلجھا ہوا بچہ ہوگا"۔

وہ ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ وہ کافی سلجھا ہوا بلکہ پڑھا لکھا لڑکا لگ رہا تھا۔ ممکن ہے اس نے مبشر کا ذکر یہی سوچ کے نکالا ہو پھر منے دادا کی وجہ سے گول کر کے بات پلٹ دی ہو کہ کہیں اتنی رات کو یہ خوف سے لڑھک نہ جائیں۔

"اچھا اب سو لو۔ گھنٹے دو گھنٹے بعد ہی پھر اٹھنا پڑے گا۔ میری آنکھوں میں تو جلن ہونے لگی۔ اللہ تیرا شکر ہے کہ سب خیریت ہے ورنہ تو میں بالکل ہی ہول گئی تھی"۔ بی جان یہ کہتی ہوئی سونے چلی گئیں۔ میں وہیں پلنگ پر پھیل کر لیٹ گیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

اگلے روز ہم ناشتے کے بعد اپنے گھر کی طرف چل پڑے۔ منے دادا مکان کو اندر سے دیکھنا چاہتے تھے۔ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ اندر کی حالت دیکھ لوں۔ کمرے تو بند کئے

گئے تھے۔ سامان بھی اندر تھا۔ ایک نظر ڈالنا ضروری تھا۔ اماں نے تو سختی سے تاکید کی تھی کہ وہاں جانے کی ضرورت نہیں ہے مگر منے دادا کا اور میرا خیال تھا کہ ہم کم از کم ایک نظر ضرور دیکھ لیں گے۔ کچھ ضرورت کا سامان جو لے جایا جا سکتا ہے' لے جائیں گے۔ پہلے تو ہم افراتفری میں گئے تھے پھر ایک آدھ دفعہ دادا آئے تھے مگر ہم سے کسی کو لے کر نہیں آئے تھے۔ ممکن ہے' منے دادا کو پتہ ہو کہ کیا رہ گیا اور کیا وہ لے گئے۔ یہ تجویز منے دادا ہی کی تھی کہ وہاں جانا چاہئے۔

ہم اپنے محلے میں پہنچے تو محلے والوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ منے دادا کو بھی لوگ پہچان گئے اور مجھے بھی۔ میں تو خیر کچھ عرصہ پہلے ہی ہو کر گیا تھا۔ میں اور منے دادا اپنے گھر جانے سے پہلے مبشر کے گھر گئے۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ اس کا گھر ہمارے گھر کے بالکل قریب تھا بلکہ ہمارے گھر کی شمالی دیوار اور ان کے صحن کی دیوار ایک ہی تھی۔ وہاں پہنچ کر سب سے پہلے تو یہ افسوسناک خبر سننے کو ملی کہ مبشر کے والد لمبے عرصے تک بیمار رہ کر گزشتہ مہینے مر گئے۔ اماں اور بہنیں ہیں یا مبشر کے دو چھوٹے بھائی۔ بڑا بھائی کلکتہ چلا گیا تھا۔ وہ بینک میں کام کرتا تھا۔ وہاں پوسٹنگ کی وجہ سے بیوی' بچوں کو بھی لے گیا تھا۔ چھوٹے دونوں کنوارے تھے اور اب وہی گھر سنبھالے تھے۔ یہ دونوں بھائی ہمیں نہیں ملے' کام پر گئے ہوئے تھے۔ ماں' بہنیں پردہ کرتی تھیں۔ ہم دروازے سے ہی تعزیت کر کے لوٹ آئے۔

بڑی بوا کا داماد بھی ملا۔ اس کا نام تو اس وقت مجھے یاد نہیں ہے مگر وہ ببن کہلاتا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی ببن کا رنگ پہلے سرخ ہوا' بتیسی نکل آئی پھر میں نے محسوس کیا کہ وہ ایک دم ہی فق ہو گیا تھا۔ یہ تغیر کیوں رونما ہوا' یہ مجھے اس وقت پتا چلا جب وہ منے دادا سے مصافحہ کرنے کے بعد ہم لوگوں سے کچھ فاصلے پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ ہمارے گھر کے دائیں طرف کے گھر میں رہنے والے بیگ صاحب جو منے دادا کے ہم عمر تھے اور بقول منے دادا کے ان کے پرانے دوست بھی' منے دادا کو اپنے گھر کی بیٹھک میں لے گئے۔ اس بیٹھک کا دروازہ باہر گلی میں کھلتا تھا' سامنے کے حصے میں انہوں نے اس چھوٹے سے قطعے میں گھاس پھوس لگا کر کیاریاں بنا کر چھوٹا سا باغیچہ بنا لیا تھا۔ اس کے چاروں طرف لکڑی کا جنگلا تھا' ہم اندر گئے تو بیٹھنے کے بعد میری نگاہ ببن پر پڑی جو جنگلے سے باہر ایسے کھڑا تھا کہ اسے میں صاف نظر آؤں۔ اس نے مجھے سر ہلا کر باہر آنے کا اشارہ کیا اور فوراً ہی پلٹ

گیا۔ میں اس کے اس انداز پر حیران ہو گیا۔ میری اس سے قطعی بے تکلفی نہیں تھی پھر بھی اس کے چہرے کا قلق ہوتا مجھے اکسا رہا تھا کہ پتا کروں کیا بات ہے۔

بیگ صاحب نے چائے منگوالی۔ میں اٹھ کر باہر آ گیا۔ منے دادا اور وہ بچپن کی باتیں کرنے لگے تھے۔ مجھے باہر آتا دیکھ کر بہن ایک طرف کو بڑھ گیا اور پھر اس نے مجھے قریب آنے کا اشارہ کیا۔

"کیا بات ہے بہن.........؟" میں نے قریب جا کر پوچھا۔

"بھائی! ابھی آپ اپنے گھر نہیں گئے کیا؟" اس نے ہمارے گھر کے بڑے سے گیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں! اب جائیں گے۔ مجھے تو یہ سوچ کے ہی کوفت ہو رہی ہے کہ اندر سامان دھول میں اٹا ہوا ہوگا"۔

"بھائی! وہاں مت جایئے گا"۔ اس نے کھسیائے ہوئے انداز میں کہا۔

"کیا بات ہے بہن؟" میں چونک گیا۔

"بھائی..........! وہاں مبشر رہتا ہے"۔

"کیا؟" مجھے بی جان کی بات یاد آ گئی۔ "کون مبشر؟" یہ میں نے اس لئے پوچھا کہ شاید وہ کسی اور مبشر کی بات کر رہا ہو۔

"وہی..........! جو مر گیا تھا"۔

"بہن! تم ہوش میں تو ہو نا!"

"ہاں بھائی! میں ہوش میں ہوں۔ میں نے خود اسے دیکھا تھا۔ سارے محلے نے دیکھا تھا"۔

"مگر کسی نے مجھے یہ نہیں بتایا۔ صرف تم بتا رہے ہو"۔

"کسی سے بھی پوچھ لیں بھائی! میں غلط نہیں کہہ رہا۔ وہ رات بھر گلیوں میں پھرتا تھا۔ شالی بابا نے آکر اسے آپ کے گھر میں بند کر دیا ہے"۔

پھر اس سے پہلے کہ میں کچھ اور پوچھتا یا وہ کچھ بتاتا' مجھے منے دادا نے آواز دے لی۔ بہن تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ میں منے دادا کے بلانے پر اندر چلا گیا۔ وہاں جا کر پتا چلا کہ جو بات بہن مجھے بتا گیا ہے' وہی بیگ صاحب نے منے دادا کو بتائی ہے۔ منے دادا بہت ہراساں تھے۔ وہاں جا کر بیگ صاحب نے بھی یہی بتایا کہ شالی بابا کو بلوایا گیا تب یہاں کے

لوگوں نے سکھ کا سانس لیا ورنہ راتوں کو ہر گھر کا ہر فرد جاگنے لگا تھا۔

اب گھر جانے کا سوال ہی نہیں تھا۔ بیگ صاحب نے تنبیہہ کر دی تھی کہ آپ شالی بابا سے پوچھے بغیر گھر نہ کھولیں۔

بات ٹھیک تھی۔ میں اور منے دادا فوراً ہی وہاں سے چل پڑے۔ پہلے تو سوچا تھا کہ دن بھر گھوم پھر کر لوگوں سے ملیں گے گھر کا دہلی لے جانے والا سامان نکلوائیں گے مگر اب سارے پروگرام دھرے رہ گئے تھے۔ منے دادا کو علم تھا کہ شالی بابا جمعے کی شام کو ملیں گے مگر ہم وہاں سے سیدھے اس آستانے پر پہنچے جہاں شالی بابا کا مسکن تھا۔ میں اس کے بارے میں نہیں جانتا تھا مگر منے دادا کو شاید وہ بتا چکے تھے۔

یہ میرٹھ سے کچھ باہر کا علاقہ تھا۔ ایک چھوٹا سا کچا مکان تھا جہاں باہر بہت پرانا پیپل کا درخت تھا۔ اس درخت کے گرد سیمنٹ کا پکا چبوترا بنا ہوا تھا۔ یہ چبوترا گولائی میں تھا جس کے بیچوں بیچ درخت تھا۔ یہاں ٹھنڈے پانی سے بھرے ہوئے مٹکے رکھے تھے۔ فرحت انگیز سائے کا احساس تھا۔ شالی بابا کے چھوٹے سے کچے مکان کے اوپر بھی پیپل کے درخت کی چھایا تھی۔ وہاں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ مکان اندر سے بند تھا۔ ہم یہاں تک تانگے میں آئے تھے۔ تانگا ہمیں چھوڑ کر جا چکا تھا۔

"شالی بابا اندر ہیں" دروازے کو اندر سے بند دیکھتے ہی منے دادا نے کہا۔

"مگر منے دادا! ہمارا آج یہاں آنا بیکار نہیں ہوگا؟ آپ نے کہا تھا کہ وہ جمعے کو ملیں گے"۔

"مگر میں بہت پریشان ہوں۔ میں ان سے درخواست کرنا چاہتا ہوں کہ وہ آج ہی مل لیں"۔ منے دادا نے دروازے پر دستک دیتے ہوئے کہا۔

فوراً ہی دروازہ کھل گیا۔ سامنے شالی بابا کھڑے تھے۔ ان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ "آؤ منے..........! جیسے ہی مجھے پتا چلا کہ تم میرٹھ پہنچ گئے ہو' مجھے یقین ہو گیا کہ تم کل تک صبر نہیں کر سکو گے۔ مبشر کی داستان تمہیں آج ہی یہاں لے آئے گی"۔ انہوں نے ہمیں اندر آنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اندر ایک دری' ایک کھرے پلنگ اور ایک چھوٹے سے تکیے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ دری کے ایک جانب جائے نماز بچھی تھی۔ اس کے سرہانے تسبیح اور کلام پاک لکڑی کے ایک تختے پر رکھا تھا اور یہ تختہ دیوار میں نصب تھا۔

"بیٹھو"۔

انہوں نے دری پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ہم بھی انہی کے قریب دری پر بیٹھ گئے۔ اب وہ میری طرف متوجہ ہوئے۔ "ہاں میاں! بڑا شوق تھا تمہیں لڑکیوں کی طرح گڑیا کھیلنے کا؟" میں جھینپ گیا۔ "بس شالی بابا..........! ساری دنیا کھیلتی ہے۔ میں تو عجیب گورکھ دھندے میں پھنس گیا ہوں۔ میں رہائی چاہتا ہوں بابا!"

"بیٹا! ایلن سے چھٹکارا تو اب آسان ہو گیا ہے"۔

میں چونک اٹھا۔ "کیسے بابا؟"

"تم وتسلا کو زنجیریں دے دو۔ وہ بچ سکتی ہے۔ ایلن پر تو وہ خود ہی قابو پا لے گی لیکن اس کے لئے تمہیں اپنے اوپر قابو پانا ہو گا"۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ رابرٹ' سورن سنگھ' پپاس اور جینو کو بھول جاؤ۔ وہ اپنے کئے کی سزا پا رہے ہیں۔ عطا اپنے انجام کو پہنچا۔ ان لوگوں کو تم نہیں بچا سکتے۔ زیوسا صرف اور صرف تمہارے ساتھ ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ وہ ان لوگوں کی کسی بھی قسم کی مدد کے لئے تیار ہو گی۔ بہرحال' یہ تو تم اور زیوسا ہی طے کر سکتے ہو۔ میں صرف یہ بتا دوں کہ زیوسا تمہاری ہمدرد ہے۔ اگر تم زنجیریں وتسلا کو دے دو گے تو اس پر بھی احسان کرو گے پھر ہو سکتا ہے کہ وہ تمہاری ہر قسم کی مدد کو تیار ہو جائے"۔

"زیوسا کون ہے بابا؟"

"اسے چھوڑ دو۔ بس اتنا سمجھ لو کہ ایک طاقت ہے' قوت ہے جو خدا نے تمہاری مدد کے لئے بھیج دی ہے۔ تمہیں اپنا رویہ اس کے ساتھ درست کرنا ہو گا۔ اگر اس چکر میں پڑو گے تو اور الجھ جاؤ گے۔ تم اگر بھٹکتے رہے ہو تو اس کا سبب زیوسا ہی ہے"۔

میں واقعی الجھ گیا۔ شالی بابا کے انداز سے پتا چل رہا تھا کہ وہ وضاحت کرنے سے بچنا چاہتے ہیں۔ زیوسا میرے لئے قطعی اجنبی سی چیز تھی۔ اس کا تاثر مجھ پر کچھ بہتر انداز میں ثبت نہیں ہو سکا تھا۔ میں اس سے اپنا رویہ درست اس وقت کرتا جب اسے جانتا۔ وہ نہ سامنے آئی تھی' نہ میں اسے جانتا تھا۔

"بھول جاؤ سب کچھ.......... وہ بہت جلد تم پر ظاہر ہو جائے گی"۔ شالی بابا نے یوں کہا جیسے وہ میرے ذہن میں اٹھنے والے ہر خیال کو پڑھ رہے ہوں۔

"یہ بتائیں شالی بابا کہ یہ مبشر کا کیا چکر ہے؟" منے دادا ایک دم بول پڑے۔

"کچھ نہیں میاں' وہی ایلن کا چکر ہے۔ وتسلا سب سنبھال لے گی۔ تم یہاں سے جاتے ہی سب سے پہلا کام یہی کرنا کہ وتسلا کو مطلوبہ زنجیریں دے دو۔ یہ سب چکر ختم ہو جائے گا بلکہ تم لوگ یہاں لوٹ آنا"۔

میں منے دادا کو وتسلا کے بارے میں سب کچھ بتا چکا تھا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ لوگ دوبارہ یہاں آسکیں گے؟" منے دادا خوش ہو گئے۔

"ہاں! بے فکر ہو کر آجانا۔ بس زیوسا سے ضیاء بات کر لے"۔

"کیا بات کر لوں بابا! وہ کبھی نہ میرے سامنے آئی' نہ اس نے مجھ سے بات کی۔ لوگوں کو ہراساں ہی کیا ہے اس نے"۔

"نہیں ضیاء! اس نے صرف اور صرف تمہاری مدد کی ہے بیٹا..........! یہ سب بدمعاشیاں ایلن کی تھیں جو زیوسا بن کر تمہیں پریشان کرتی رہی۔ زیوسا تو خود بے بس ہے"۔

"شالی بابا! زندگی اتنی بوجھل کبھی نہیں تھی۔ بھرا گھر چند سالوں میں خالی ہو گیا۔ یہ ہمارے لئے خوشخبری ہے کہ یہ سب واپس آسکیں گے" منے دادا نے بات کاٹ دی۔

"بابا!" میں نے الجھے ہوئے انداز میں انہیں مخاطب کیا۔

"بس ضیاء! زندگی ایک خاص ڈھب سے وقت کا ساتھ دیتی ہے۔ اچھا' برا' غم' خوشی یہ سب انسان کے ساتھ سائے کی طرح لگے رہتے ہیں۔ وہ اندر سے اگر مضبوط ہو تا جاتا ہے تو بعض اوقات باہر کی قوتیں اسے کمزور کر دیتی ہیں۔ کچھ مسائل تمہارے ساتھ ہیں لیکن وہ ایسے نہیں ہیں کہ جنہیں حل نہ کیا جا سکے۔ تم پہلے خوف کے اس مضبوط حصار سے باہر نکل آؤ۔ سچی بات یہ کہ یہ حصار تمہارے لئے اتنا تکلیف دہ نہیں ہے جتنا دوسروں کے لئے۔ میں اس کی وضاحت فی الوقت نہیں کر سکتا۔ تم پہلا کام یہی کرو کہ وتسلا سے رابطہ کرو۔ جب ایک مسئلے سے نکل آؤ تو میرے پاس چلے آنا۔ میں تمام وضاحت کر دوں گا۔ صرف اتنا خیال رکھنا کہ کوئی عورت تمہارے قریب نہ آئے۔ جب تک زیوسا' ایلن کے زیر اثر ہے' تم آزاد ہو مگر زیوسا کی آزادی کے بعد تمہیں کچھ عرصہ محتاط رہنا پڑے گا"۔

"یعنی بات پھر وہیں کی وہیں رہتی ہے بابا! میں اس تمام چکر سے آزاد ہونا چاہتا ہوں"۔ میں جھنجلا گیا۔ "مجھے زیوسا سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں الین ہی سے نہیں بلکہ زیوسا سے بھی دور رہنا چاہتا ہوں۔ انسانوں کی طرح زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ عام سی زندگی گزارنا میری خواہش ہے"۔

"بیٹا! قدم بہ قدم آدمی آگے بڑھتا ہے۔ زیوسا تمہاری محبت میں گرفتار ہو چکی ہے۔ اس لئے اس کی دسترس سے نکلنا اتنا آسان نہیں ہے۔ یاد رکھو' منفی جذبے کی نسبت مثبت جذبہ زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔ میں اسی لئے کہہ رہا ہوں۔ ویسے یہ بھی ممکن ہے کہ زیوسا تمہاری خواہش کا احترام کرتے ہوئے تمہیں چھوڑ کر چلی جائے"۔

"یہی ہونا چاہئے بابا..........!" میں نے زور دے کر کہا۔ منے دادا حیرت سے بابا کی گفتگو سن رہے تھے۔

"بس ضیاء! میں اب زیادہ دیر نہیں رک سکتا۔ میں نے بڑی مشکل سے وقت نکالا تھا۔ جب دوبارہ آؤ گے تو میں تمہیں زیادہ وقت دے سکوں گا"۔

شالی بابا نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ میں اور منے دادا مجبوراً کھڑے ہو گئے۔ ابھی ہم ان کے کمروں سے باہر بھی نہیں نکلے تھے کہ میں چونک اٹھا۔

"ضیاء..........! ضیاء..........!" ایک دبی دبی سی آواز گونج اٹھی تھی۔ میں نے چونک کر پہلے شالی بابا کی طرف دیکھا۔ ان کا رنگ سفید ہو گیا تھا۔ وہ گھبرا کر مجھے دیکھ رہے تھے۔ منے دادا بھی چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔

"جاؤ تم.........." شالی بابا نے انتہائی بے چینی سے کہا اور ہمیں تقریباً گھیر کر کمرے سے باہر لانے لگے۔ میں نے باہر جاتے جاتے ان کے کمرے کا جائزہ لیا اور پھر اس کمرے کے ایک کونے میں ایک پتلے سے دروازے پر نگاہ پڑتے ہی میں سکتے میں رہ گیا۔ وہ دونوں ہاتھوں پیروں کے بل کسی جانور کی طرح وہاں سے جھانک رہا تھا۔

"تم.......... کون ہو تم..........؟" میں بے ساختہ بول اٹھا کیونکہ آواز مجھے جانی پہچانی لگی تھی۔

"ضیاء جاؤ!" شالی بابا نے چیخ کر مجھے دھکا دیا۔

"نہیں ضیاء..........! تم نے وعدہ کیا تھا۔ مجھے بچانے کا وعدہ ضیاء..........! میں بے قصور ہوں"۔ وہ رو رہا تھا۔

اور مجھے یاد آگیا کہ یہ آواز میں نے کب اور کہاں سنی تھی۔ میں جھٹکے سے آگے بڑھا مگر شالی بابا نے مجھے پکڑ لیا۔

"ضیاء! آگے مت جانا۔ سنو' میری بات سنو"۔ وہ چیخ رہے تھے مگر مجھے لگ رہا تھا جیسے کوئی قوت مجھے اس کی طرف گھسیٹ رہی ہے پھر اچانک مجھے جھٹکا لگا۔ میں شالی بابا کی گرفت سے نکل کر اس کے سامنے دروازے پر جا گرا۔ اس کا چہرہ میرے چہرے کے اوپر چھا گیا۔ میں نے منے دادا اور شالی بابا کے چیخنے کی آواز سنی پھر لگا جیسے کمرے میں اندھیرا چھا گیا ہو۔

اندھیرا کمرے میں نہیں بلکہ میری آنکھوں میں چھایا تھا۔ وہ انتہائی ہیبت ناک تھا' آنکھیں بالکل گول تھیں' رنگ جو کبھی سنہرا رہا ہوگا اس وقت تانبے کی طرح کا تھا اور اس پر سرخ سرخ' تازہ زخموں کے نشان' ان سے نپکتا ہوا خون' پھولی ہوئی ناک' موٹے موٹے سوجے ہوئے ہونٹ جن کا گوشت کناروں سے جھڑ چکا تھا۔ وہ اتنے خشک ہو چکے تھے کہ کھال جگہ جگہ سے تڑخی ہوئی سی لگ رہی تھی۔ بالوں کی جگہ سنہرے رنگ کی موٹی موٹی بتیاں سی تھیں' میل سے چکڑی ہوئی لٹیں جو سامنے جھول رہی تھیں۔ اس کا بدن کتے جیسی ساخت میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اس کے پاس سے تعفن اٹھ رہا تھا۔ آواز عجیب سی تھی ایسی کہ سننے والے کے کانوں میں خراشیں پڑ جائیں۔ حلق چھل جائے۔ وہ میرے اوپر جھکا شاید رو رہا تھا۔ جو آواز اس کے حلق سے نکل رہی تھی وہ ایسی تھی جیسے سرکنڈوں کی جھاڑیوں سے تیز ہوا کے جھکڑ چل رہے ہوں' عجیب سرسراتی ہوئی' کھروچے ڈالتی' روتی ہوئی آواز۔

"تک.......... کون ہو تم..........؟" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا اور میں ایڑیاں زور دے کر اس کے نیچے سے سرکنے کی کوشش کرنے لگا۔

"ضیاء! میں.......... جینو ہوں۔ جینو بابا دیکھو..........! میں بے قصور ہوں ضیاء.......... مجھے بچاؤ"۔ اس نے بڑی مشکل سے یہ جملے ادا کئے لگتا تھا جیسے کوئی اس کا حلق دبا رہا ہو۔ گھونٹ رہا ہو۔

بدن پر رینگتی ہوئی چیونٹیوں کے سے احساس نے مجھے حواس باختہ کر دیا تھا مگر وہ مجھ پر جھکا ہوا تھا۔ میں اس کے نیچے سے نکل نہیں پایا تھا۔ "جینو تم!" میں حیران ہوا۔ وہ واقعی جینو تھا۔ میں اس کی آواز پہچان گیا تھا۔

اس وقت وہ پھسل کر مجھ سے دور چلا گیا۔ میں نے دیکھا کہ شالی بابا آنکھیں بند کئے کچھ پڑھ رہے تھے۔ پہلے میرا خیال تھا کہ شاید اسے میرے اوپر سے شالی بابا نے کھینچا ہے' میں ایک دم اچھل کر کھڑا ہو گیا اور یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ شالی بابا اس سے دور کھڑے کچھ پڑھ رہے تھے اور جینو......... اگر وہ جینو ہی تھا تو یوں اس پہلے ۔۔ دروازے کے اندر اتنا پھسل کر مجھ سے دور ہو رہا تھا جیسے اس کی پشت پر کھڑا کوئی اسے کھینچ کر اندر لئے جا رہا ہو لیکن اندر کوئی نہیں تھا اگر اسے کوئی کھینچ نہیں رہا تھا تو وہ کوئی نادیدہ قوت ہی ہو سکتی تھی۔ منے دادا زرد چہرہ لئے سامنے کھڑے تھے۔ وہ شاید میری طرف بڑھنا چاہتے تھے اور شالی بابا نے انہیں بازو بڑھا کر روک دیا تھا یہ میں ایسے جان پایا کہ شالی بابا کا بازو اب بھی میرے اور ان کے درمیان حائل تھا۔

جینو کی آواز میں بے پناہ کرب تھا' میں سخت حیران تھا کہ وہ یہاں کیسے پہنچا؟ شالی بابا سے اس کا کیا تعلق ہے؟ پھر مجھے شالی بابا کا جملہ یاد آ گیا جو انہوں نے مجھ سے کچھ ہی دن پہلے کہا تھا کہ مجھے رابرٹ' پپاس جینو اور سورن سنگھ کو بچانے کا خیال ذہن سے نکالنا ہو گا' میں نے چونک کر شالی بابا کو دیکھا۔ "کیا یہ واقعی شالی بابا ہیں؟" یہ عجیب سوال میرے دماغ میں شور سا مچا گیا۔ "کیا ایلین یا زیوسا ہمیں دھوکا دے رہی ہے؟"

میں اب خود کو سنبھال کر کھڑا ہو چکا تھا۔ جینو اس نیم تاریک کمرے کے وسط میں پہنچ چکا تھا۔ اس کا ہیولا مجھے نظر آ رہا تھا اور اس کی کرب میں ڈوبی آواز سنسناتے ہوئے تیروں کی طرح میری سماعت میں اتر کر زخمی کر رہی تھی۔ میں نے جینو کو جواب دینا چاہا' تسلی دینے کے لئے منہ کھولا مگر میرے حلق سے آواز نہیں نکل سکی۔ اس دوران میں دروازہ بند ہو گیا۔ اب جینو رو رہا تھا۔ میں نے چاہا کہ آگے بڑھ کر شالی بابا کو جھنجھوڑ ڈالوں ان کی محویت توڑ دوں' جو کچھ وہ پڑھ رہے ہیں' اسے بھلا دوں مگر میں انچ بھر بھی اپنی جگہ سے نہیں سرک سکا۔ میرے قدم منوں وزنی ہو کر جیسے کسی کھونٹے کی طرح زمین میں گڑ چکے تھے۔

پھر اچانک مجھے جھٹکا لگا۔ میں نارمل ہو گیا مگر اب جینو کی آواز نہیں تھی' اس کی بازگشت اب بھی میری سماعت میں گونج پیدا کر رہی تھی۔

"شالی بابا......... شالی بابا" میں نے بے اختیار پکارا۔ اس بار میرے حلق سے نکلنے والی آواز بہت تیز تھی۔ خود مجھے اپنی اونچی آواز کا احساس ہوا اور میں گڑبڑا گیا۔ "شالی بابا"

میں نے خود پر قابو پا کر انہیں پھر پکارا۔ وہ اب ساکت کھڑے تھے۔ ان کے چہرے کی تمام نسیں گہری ہو کر ابھر آئی تھیں' گردن کی رگیں بھی پھول چکی تھیں۔ آنکھیں اب بھی بند تھیں البتہ ساکت لب ایک دوسرے پر جمے ہوئے تھے۔ وہ بازو بھی گر چکا تھا جو میرے اور منے دادا کے درمیان حائل تھا۔

میں آگے بڑھنے کی کوشش میں لڑکھڑایا۔ منے دادا نے لپک کر مجھے سنبھال لیا۔

"ضیاء.........! تم......... ٹھیک ہو تا ناں؟" منے دادا کی آواز لرز رہی تھی۔

میں دادا کی بات کا جواب دیئے بغیر آگے بڑھا اور میں نے شالی بابا کو جھٹکا دیا۔ انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ سرخ تپتی ہوئی نگاہوں میں بلا کی اجنبیت تھی۔ میں نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ یوں لگا جیسے سرخ شعلوں سے بھرا آگ کا ایک طویل سمندر ہے جسے میں پار کر رہا ہوں۔ تپش کا احساس دل میں ہوا' لیکن میں یونہی کھڑا نہیں دیکھتا رہا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے ان کی آنکھوں کی رنگت بدلنے لگی اور چند ہی لمحوں میں وہ نارمل ہو گئے۔ اجنبیت ان شعلوں میں ہی کہیں بھسم ہو گئی۔ اس کی جگہ پریشانی اور تواں باختگی نے لے لی۔

"ضیاء.........! تم ٹھیک ہو۔ کوئی گزند تو نہیں پہنچائی اس نے؟" وہ مجھے یوں ٹٹولنے لگے جیسے میرے جسم پر زخموں کو تلاش کر رہے ہوں حالانکہ زخم میرے بدن پر نہیں' دل و دماغ پر لگے تھے اور دکھن بن کر پورے وجود میں پھیل رہے تھے۔

"وہ بے چارا گزند پہنچانے کے قابل ہوتا شالی بابا تو......... تو آپ میرے سامنے اپنے پیروں پر نہ کھڑے ہوتے"۔

میرے لہجے کے طنز کو انہوں نے ہی نہیں منے دادا نے بھی محسوس کر لیا۔ شالی بابا ڈھال ہو کر تخت پر بیٹھ گئے۔ ان کا سانس قابو میں نہیں تھا۔ منے دادا نے آگے بڑھ کر میرے شانے پکڑ لئے۔

"ضیاء.........!" انداز تنبیہی تھا۔

"وہ جینو تھا منے دادا......... جینو......... ابا کے گروپ کا بے حد معصوم اور بے گناہ لڑکا۔ جس کی نوجوانی انجانے میں اسی طلسم کی نذر ہو گئی ہے اور آج وہ سزا کی بدترین شکل کا شکار ہے۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ وہ یہاں قید کیا گیا ہے"۔ آخری جملہ میں نے دونوں ہاتھ تخت کے کنارے پر ٹکائے' سر جھکائے بیٹھے شالی بابا کو دیکھ کر کہا۔

شالی بابا نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ان کی نگاہوں میں لمحہ بھر کو بے بسی لہرائی......
پھر ان کے ہونٹوں پر دکھ بھری مسکراہٹ پھیلی تو میں نے سوچا' شالی بابا بہت بڑے اچ
ہیں۔

"نہیں ضیاء......! تم غلط سمجھ رہے ہو"۔ انہوں نے جیسے تڑپ کر میرے خیا
کی تردید کی۔ "جینو کو میں بڑی مشکل سے وہاں سے نکال کر لایا ہوں ورنہ...... ورنہ
شاید ڈگلس کی طرح تم اور طیب بھی اس کی درندگی کا شکار ہو چکے ہوتے"۔

جیسے بجلی سی کوندی اور میرے دماغ میں وہ سین پورے کا پورا گھوم گیا جو میں نے
ڈگلس کے قتل کی رات دیکھا تھا' وہ بھیڑیا نما' سنہری لٹیں چہرے پر ڈالے چاروں ہا
پیروں پر چلتا ہوا' خون میں لتھڑا چہرہ' ڈگلس کا ادھڑا ہوا جسم' ہاتھ کا وہ حصہ جو بھیڑیا نما
شخص چباتے چباتے چھوڑ کر اچانک کہیں غائب ہو گیا تھا' سب کچھ صاف دکھائی دینے لگے
طوفانی جھکڑ سے چل گئے دماغ میں۔

"جینو نے تم سے فون پر بات کی تھی ضیاء اور...... یہاں فون نہیں ہے۔ اس غیر
آباد علاقے میں...... میرے پاس ایسی کوئی سہولت نہیں ہے"۔ شالی بابا دھیمے لہجے میں
کہہ رہے تھے۔ جس میں سچائی بھی تھی اور شکست خوردگی بھی۔

منے دادا نے مجھے دری پر بٹھا دیا اور خود بھی قریب بیٹھ گئے تھے۔ شالی بابا اٹھے
انہوں نے ایک بڑے شیشے کے جار میں سے جو تخت کے بالکل کونے پر رکھا تھا اور اب
تک میری نگاہوں سے پوشیدہ تھا' گلاس میں پانی بھرا اور ایک گھونٹ میں اسے پی گئے
چند لمحے خاموشی سنگلاخ چٹانوں کی طرح کمرے میں سینہ تانے کھڑی رہی پھر شالی بابا کی
آواز نے اسے توڑ دیا۔

"وہ یقیناً مظلوم تھا' بے گناہ اور معصوم تھا مگر ضیاء آگ کبھی یہ نہیں دیکھتی کہ اسے
کو پکڑنے کی کوشش کرنے والا قصوروار ہے' سفاک ہے' نرم دل یا معصوم...... آگ
کی خاصیت ہے جلا دینا...... وہ بہت چھوٹے سے معصوم بچے کو بھی اسی طرح جلا دیتی
ہے جیسے شیشم کے کسی تناور بے جان درخت کو۔ پتھر کو یا کسی جانور کو...... جینو معصوم
اور بے گناہ سہی...... مگر آگ میں ہاتھ اس نے بھی ڈالا تھا' سو جلنا ہی اس کا مقدر ہے
اس کے اندر پیدا کی جانے والی سفاکی' درندگی اور خونخواری کو قابو میں رکھنا ہی بس اس کی
اور دوسرے لوگوں کی مدد ہے۔ وہ جب بے اختیاری طور پر کسی کو گزند پہنچاتا ہے' یا ا

کرنے پر مجبور ہوتا ہے' اس میں اس کے ارادے' اختیار کو دخل نہیں ہوتا۔ یہ کسی کو
گزند پہنچاتا ہے' یا ایسا کرنے پر مجبور ہوتا ہے' اس میں اس کے ارادے' اختیار کو دخل
نہیں ہوتا۔ اس بھیڑیا نما جسم کے اندر اس کا اپنا' معصوم دماغ ہے' اس کے سفاک وجود
میں اس کا ضمیر اسی طرح بے داغ ہے اس لئے وہ جس اذیت کا شکار ہو جاتا ہے' اس
اذیت سے نجات ہی اب اولین مدد ہے۔ میں...... صرف یہی کر سکتا ہوں سو کر رہا ہوں۔
میں جانتا ہوں کہ اسے ایلن کی قید سے رہائی دلا کر یہاں تک لانے میں مجھے کن کن خوف
ناک کیفیتوں سے گزرنا پڑا ہے۔ کیسی اذیتیں اٹھانا پڑی ہیں مجھے۔ اس سے زیادہ اس کی کوئی
مدد نہیں کر سکتا۔ اور کوئی بھی نہیں کر سکتا ضیاء...... نہ تم نہ زیوسا"۔

وہ جتنے نڈھال تھے' اتنا ہی سچائی سے بھرپور' ان کا لہجہ تھا۔ مجھے اپنے اندر آئے
اس طوفان کو روکنے میں کچھ وقت لگ گیا۔ جینو کی آواز کا کرب ان طوفانی جھکڑوں میں
مسلسل چکرا رہا تھا۔ میرا بس چلتا تو میں ابھی' اسی وقت اسے اپنی بانہوں میں بھر کر تسلی
دیتا۔ اس کی تمام تر ظاہری خباثت' گندگی اور درندگی کے باوجود مجھے اس پر ترس اور پیار آ
رہا تھا۔

"ضیاء......! تم جاؤ بیٹا......! اسی لئے میں نے کہا تھا کہ مجھے دیر ہو گئی ہے۔
میں جو وظیفہ پڑھ رہا ہوں' وہ جینو کے لئے ہے۔ میں اسے پرانی ہیئت میں واپس تو نہیں لا
سکوں گا مگر اسے مزید درندگی کرنے سے روک سکتا ہوں"۔

"شالی بابا! کیا ایلیا والی کوٹھی میں ڈگلس کا خون کرنے والا جینو ہی تھا؟" میں نے
اپنے خیال کی تصدیق چاہی۔

"ہاں' وہی تھا ضیاء اور تمہیں حیرت ہو گی کہ کوئی بھی خون کرنے' خون میں
لتھڑے گوشت کے ٹکڑے کھانے کے بعد وہ اپنے فرار کی ہر راہ پر قادر ہو جایا کرتا تھا۔ وہ
ایلیا کی کوٹھی کے اسی کمرے میں تھا جسے تم اور طیب مل کر بھی نہیں کھول سکے تھے اور
وہ ڈگلس کو مارنے کے بعد دروازے کے نیچے سے کسی کینچوے کی طرح رینگ کر اندر گیا
تھا"۔

"آپ کو کیسے پتا چلا تھا؟"

"جس روز مجھے زیوسا نے بتایا کہ تم خطرے میں ہو اور ایلن طاقت سے بھرپور
ہو کر تمہیں گزند پہنچانے کی تیاری کر چکی ہے' زیوسا بے بس ہے تب میں نے کوشش کی

اور تم دونوں کو دیکھا' جس رات ڈگلس مرا ہے۔ یہ اس سے ایک رات پہلے کی بات ہے۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ تم لوگوں کو کس قسم کا خطرہ درپیش ہے۔ یہ بات زیوسا بھی نہیں جان سکی تھی کہ وہ کس قسم کے حالات پیدا کرنا چاہتی ہے۔ بس اتنا جان سکی تھی کہ اس بار اس کا حملہ بھرپور انداز میں ہوگا۔ تبھی میں نے وہاں جینو کو اندر دیکھا۔ تمہاری اس سے فون پر جو باتیں ہوتی تھیں' وہ وہیں سے ہوتی تھیں مگر یہ بات نہ تمہارے علم میں تھی کہ وہ کہاں ہے' نہ خود اس کے علم میں............ وہ تمہیں پہچان بھی نہیں سکتا تھا اس لئے کہ اسے نہ تم ملے تھے نہ کسی نے تمہارا حلیہ اسے بتایا تھا۔ اگر اس روز زیوسا گھیر گھار کر ڈگلس کو وہاں نہ لاتی تو اس کا شکار تم یا طیب ہوتے"۔

ان کی آخری بات سن کر میرے بدن میں جھرجھری دوڑ گئی۔ مجھے ڈگلس کا ادھڑا ہوا بدن یاد آگیا جسے میں نے اور طیب نے بڑی مشکل سے ٹھکانے لگایا تھا۔

"ایلن اپنی ناکامی پر بل کھاتی رہی۔ میرے درمیان میں آ جانے سے اس کی راہ میں ایسی رکاوٹیں پیدا ہوگئیں جنہیں دور کرنا اس کے بس میں نہ تھا اس لئے کہ وہ مسلمانوں کی سی ایمانی طاقت سے محروم تھی بلکہ وہ تو خود اپنے مذہب پر بھی اتنا یقین نہیں رکھتی تھی کہ اس کے عقائد ہی اس میں ایمان کی طاقت کو فروغ دیتے۔ اگر اس میں کسی بھی قسم کا' یعنی اپنے عقائد کے متعلق بھی ایمان ہوتا تو شاید وہ میرے لئے ایسا تر نوالہ ثابت نہ ہوتی اور مجھ سے مقابلہ کرتی مگر بے ایمانی' سب سے بڑی کمزوری ہوتی ہے۔ جس نے مجھے حوصلہ دیا کہ وہ کمزور ہے' میرے اعتماد کی مضبوطی کچھ اور بڑھ گئی اور میں بڑی مشکلات کے بعد جینو کو اس کی قید سے نکال لایا"۔

"شالی بابا! کیا وہ ٹھیک نہیں ہو سکتا؟"

"ہو جائے گا بیٹا! خدا چاہے تو کیا نہیں ہو سکتا۔ تم بس دعا کرو"۔ ان کا انداز بات ختم کرنے جیسا تھا۔

"چلو ضیاء!" دادا بولے جو اب تک ساکت بیٹھے تھے۔ "ہمیں شالی بابا کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے"۔

"شالی بابا! میں اپنے اور گھر والوں کے سلسلے میں کافی پریشان تھا اس لئے حفظ ماتقدم کے طور پر آپ کو بتانا اور حل پوچھنا چاہتا تھا لیکن اب شاید اس کی ضرورت نہیں رہی"۔ منے دادا نے شالی بابا سے کہا۔

"ہاں ضیاء! بس تم وتسلا کے پاس چلے جانا۔ وہ جو کچھ کہتی ہے' ٹھیک کہتی ہے۔ تم اس پر مکمل اعتماد کر سکتے ہو اور ہاں سنو' زیوسا تمہاری ہمدرد ہے۔ یہ تم نہیں جانتے مگر میں جانتا ہوں کہ اس نے ہزار بار تمہاری مدد نہ صرف خود کی ہے بلکہ مجھے بھی ہر وقت اطلاع دے کر تمہیں اذیت سے بچایا ہے۔ وہ سائے کی طرح تمہارے ساتھ ہے۔ بس ایک بات............ کسی بھی عورت کے قریب مت جانا"۔ انہوں نے مجھے منہ کھولتے دیکھ کر ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا اور بولے۔ "وجہ میں بعد میں بتاؤں گا بیٹا' ہر بات' ہر عمل کا ایک خاص وقت ہوتا ہے۔ اس سے پہلے یا بعد میں کرنے سے توازن بگڑ جاتا ہے۔ وہ پتھر اپنے ساتھ رکھنا اور تعویذ گلے سے نہ اتارنا............ اور یہ میں نے............" شالی بابا نے منے دادا کو مخاطب کر کے دری پر بچھی جائے نماز کی جگہ سے دری پلٹی۔ مٹھی میں مٹی لے کر منے دادا کی طرف بڑھا دی۔ "یہ آپ میرٹھ سے جانے سے پہلے اپنی کوٹھی کی دہلیز کے آگے چھڑک دیجئے گا اور کچھ مٹی دہلی میں جا کر پورے گھر میں بکھیر دیں' بالکل دیوار کی جڑوں میں............ بچیوں کو کہہ دیں کہ جھاڑو نکالتے ہوئے کناروں پر پڑی مٹی کو بالکل نہ چھوئیں۔ انشاء اللہ سب طرح خیریت رہے گی"۔ شالی بابا اب کھڑے ہوگئے تھے اور جلدی جلدی یہ سب کہہ رہے تھے۔

ان کی نگاہیں بار بار اسی کمرے کے دروازے کی طرف اٹھ رہی تھیں جہاں جینو دوسروں کے گناہوں کی پاداش میں اذیت جھیل رہا تھا۔ میں اور منے دادا کھڑے ہوگئے۔ منے دادا نے وہ مٹی اپنے رومال میں لے کر باندھی تھی۔ ہم دونوں باہر آگئے۔

"ہم اب زیادہ دیر میرٹھ میں نہیں ٹھہریں گے ضیاء!" منے دادا نے تیز تیز چلتے ہوئے کہا۔

"جی منے دادا!" میں نے میکانکی انداز میں جواب دیا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ ہمیں تانگے یا کسی بھی سواری کے لئے بہت دور تک چلنا تھا۔ مجھے اپنی نہیں' منے دادا کی فکر تھی۔

"منے دادا............! سواری بہت دور ملے گی"۔

"کوئی بات نہیں۔ شالی بابا سے ملاقات نے میرے اندر بڑی توانائی پیدا کی ہے۔ میں اب میلوں تک پیدل چل سکتا ہوں' تم پریشان مت ہو"۔

واقعی ان کی آواز میں بھی کافی توانائی تھی۔ وہ بہت خوش تھے۔ یہ خوشی کی بات تھی کہ ہم سب ان عذابوں سے چھوٹنے والے تھے لیکن............ اس لیکن کے بعد ہی مجھے

احساس ہو گیا کہ میں.......... اکیلا میں آزاد نہیں ہوں۔ منے دادا بھی کہہ چکے تھے کہ انہیں کچھ فیصلے ایسے کرنے ہیں جو میری مایوسی کا سبب بن سکتے ہیں اور شالی بابا نے بھی مجھ پر ایک پابندی عائد کر دی تھی کہ میں فی الحال عورت سے دور ہوں۔ میں عورتوں سے کبھی بھی قریب نہیں رہا تھا۔ میں نے اب تک کسی کے بارے میں سنجیدگی سے نہیں سوچا تھا سوائے فرحت کے.......... اور تبھی مجھے پتا چل گیا کہ منے دادا نے کن فیصلوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ میرا دل گھبرانے لگا۔ میں منے دادا سے وضاحت چاہتا تھا مگر دھوپ میں اتنا طویل سفر پیدل طے کرتے ہوئے' پسینے میں شرابور منے دادا سے وضاحت طلب کرنے کا نہ موقع تھا نہ وقت.......... بس میرے اندر کوئی مجھے یہ یقین دلا رہا تھا کہ شاید فرحت سے مجھے دور رکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ گو میں اس کے بارے میں صرف سوچ ہی رکھتا تھا۔ اب تک تو اسے چھونے کا بھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ نادانستگی میں بھی میرا ایسا کوئی ارادہ نہ تھا مگر اسے اپنا لینے کا میں نہ صرف خود سے بلکہ بی جان سے بھی عہد کر چکا تھا۔

میں یہی سب کچھ سوچتا ہوا منے دادا کے ساتھ چل رہا تھا۔ منے دادا پتا نہیں کیا سوچ رہے تھے مگر اندرونی خوشی سے ان کے چہرے پر توانائی پھیلی ہوئی تھی۔ اب ہم ایک ایسی سڑک پر آ چکے تھے جو میرٹھ شہر کو سیدھی جاتی تھی اور یہاں سواری ملنے کا امکان بھی تھا۔ ہم اس سڑک پر جا کر اسی سمت چلنے لگے جس سمت چل کر میرٹھ پہنچ سکتے تھے۔ یہاں سے میرٹھ پیدل سفر کرنا منے دادا کے لئے آسان نہیں تھا۔ ہم میرٹھ سے کئی میل دور تھے مگر دھوپ میں کھڑے ہونے سے چلنا کیونکہ بہتر تھا' اس لئے چل رہے تھے۔

اس سڑک پر کچھ دور چلنے کے بعد ہی ہمیں وہ بس مل گئی جو دوسرے علاقوں سے مسافروں کو میرٹھ لے جاتی تھی۔ گو اس میں بیٹھنے کی جگہ نہیں تھی مگر ہم میرٹھ پیدل جانے سے بچ گئے۔ میرٹھ پہنچتے ہی منے دادا نے تانگا کر لیا۔ ہم پہلے سیدھے بیگ صاحب کے گھر پہنچے۔ وہ ہمیں دوبارہ دیکھ کر پریشان ہو گئے تھے مگر جب منے دادا نے شالی بابا سے ملاقات کا بتایا تو وہ خوش ہو گئے۔ وہ بھی ہمارے ساتھ ہو گئے۔ ہم اپنی کوٹھی کے دروازے پر پہنچے۔ منے دادا نے نہ صرف چوکھٹ کے کناروں میں بلکہ جہاں تک ہو سکا' وہاں تک بیرونی دیوار کی جڑوں میں بھی وہ مٹی بکھیر دی۔ آدھی بچا کر بڑی احتیاط سے رومال میں باندھ کر جیب میں رکھ لی۔ پھر بیگ صاحب کو ہدایت کر کے کہ اب ذرا مشروالے معاملے پر دھیان رکھیں' بات ختم ہوئی کہ نہیں اور جیسے بھی ہو وہاں خط لکھ دیں' ہم بی جان کے

گھر کی طرف چل پڑے۔

بی جان کھانے پر دیر سے پہنچنے پر ناراض تھیں حالانکہ ہم ڈٹ کر ناشتا کر کے نکلے تھے اور ابھی تو بھوک بھی نہیں تھی مگر انہوں نے کافی اہتمام کیا ہوا تھا شاید اسی لئے پریشان تھیں۔ ہم دونوں نہا دھو کر بیٹھے تو فرحت کھانا نکال لائی۔ اب وہ میرے بالکل سامنے بیٹھی تھی۔ مجھے اچانک شالی بابا کی بات یاد آ گئی۔ شاید یہ نفسیاتی اثر ہوتا ہے کہ آدمی کو جس چیز سے روکا جائے وہ اس کی طلب میں شدت پیدا کر لیتا ہے۔ اسی شدت نے انجانے جذبے کا روپ دھار کر میرے وجود میں ایسی انگڑائی لی کہ فرحت کو چھو لینے کی خواہش بے طرح مچل اٹھی۔ بجائے اس کے کہ میں محتاط ہو جاتا' میرا جی چاہا کہ چاندنی رات کی ٹھنڈی' میٹھی اور پُراسرار روشنی میں فرحت کے وجود کی خوشبو کو گھول کر اپنے سینے میں بھر لوں۔

عین اسی لمحے فرحت نے گھبرا کر مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں لذت آمیز خوف تھا۔ میں اسے ہی دیکھ رہا تھا' اس کی گھبراہٹ پر مجھے ہنسی آ گئی جسے میں نے بڑی مشکل سے دبایا۔ وہ جلدی سے بی جان' منے دادا اور خالہ بی کو دیکھ کر سر جھکا کے بیٹھ گئی۔ پھر بھی چین نہ آیا تو کھڑی ہو گئی۔

"کیا ہوا؟" بی جان نے پوچھا۔

"وہ.......... پانی.......... بھول گئی.......... لاتی ہوں.........." وہ چلی گئی۔ اس کی پشت پر سیاہ بالوں کی چوٹی کسی زہریلے ناگ کی طرح لہرا رہی تھی۔ جی چاہا اس کا سارا زہر اپنے لبوں سے چوس لوں۔ سرور کی کیفیت نے مجھے پور پور جکڑ لیا۔ سینے میں تلاطم سا اٹھتا محسوس ہوا۔ ہاتھ لرز کر رہ گئے اور لگا جیسے میرے اردگرد کی ہر چیز نشے میں ہے۔ میں نے ایسی کیفیت اپنے اندر محسوس نہیں کی تھی حالانکہ مونیکا کو دیکھ کر اور امیلیا کی کوٹھ میں اس حسین لڑکی کو دیکھ کر بھی کچھ ایسی ہی کیفیت سے دوچار ہوا تھا مگر اس کیفیت نے میرے بدن پر نہیں صرف دماغ پر حملہ کیا تھا مگر آج.......... آج تو میں سرور سے بے حال ہو گیا۔ شاید یہی وہ خوفناک نفسیاتی حملہ تھا جو اس پابندی کا ردعمل تھا۔ "اگر منے دادا' بی جان اور خالہ بی نہ ہوتیں تو..........؟" یہ جملہ تھا جو جانے کیوں میرے دماغ میں آیا اور میں ایک دم خوفزدہ ہو کر چونکا۔ میں نے سب کو دیکھا۔ سب کھانے میں مصروف تھے۔ فرحت اب تک پانی لے کر نہیں آئی تھی۔ بی جان میرے بے حس و حرکت ہو جانے پر

کچھ چونکیں۔

"کیا بات ہے ضیاء کھانا کیوں نہیں کھا رہے؟"

"جی.......... جی.......... نہیں.......... جی ہاں.......... کھا رہا ہوں" میں گڑبڑا گیا۔

"آجائے گی وہ.......... باؤلی ہے کسی اور کام میں لگ گئی ہو گی۔ تم شروع تو کرو"۔ یہ کہہ کر انہوں نے فرحت کو آواز دی۔ میں کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا مگر میرے کان باہر کی کسی آہٹ پر لگے رہے۔ پتا نہیں وہ کب آئی' ایسے دبے پاؤں کہ احساس ہی نہیں ہوا۔ پتا اس وقت چلا جب وہ بی جان کو میرے سامنے والے حصے میں سرکا کر خود خالہ بی کے قریب بیٹھنے لگی اور کچھ ایسے آڑی ہو کر بیٹھی کہ اس کا چہرہ خالہ بی کے کندھے سے چھپ گیا۔

جیسے بدلی چھٹ گئی ہو' چمکدار دھوپ نکل آئی ہو۔ مجھے ایسا ہی محسوس ہوا۔ میں بمز ہو گیا۔ سرور کی وہ ابر آلود قسم کی کیفیت بدل گئی تھی۔

"ہم کل چلے جائیں گے"۔ منے دادا کی بات نے مجھے چونکا دیا۔ بی جان بھی نوالہ لیتے لیتے رک گئیں۔

"یہ کیا بات ہوئی منے میاں!" بی جان نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔ "کچھ روز تو رہو"۔

"نہیں بی جان' آپ کو پتا ہے گھر پر وہاں کوئی نہیں ہے۔ رضا اور شجاع تو ایسے گئے ہیں کہ لگتا ہے واپس آنے کو ہی تیار نہیں۔ ناصر اور طاہر بھی بمبئی میں ہیں۔ ایک یہ ضیاء ہے جس کی وجہ سے ڈھارس ہے"۔ منے دادا نے جواب دیا۔

"شالی بابا سے ملاقات ہو گئی؟" بی جان نے پوچھا۔

"جی بی جان! بڑا حوصلہ ہوا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ اب سب ٹھیک ہو جائے گا' یہ لوگ واپس آسکیں گے"۔

"آئے نہیں" وہ خوشی سے اچھل پڑیں۔ "اے منے سچ کہو!"

"پوچھ لیں ضیاء سے" منے دادا مسکرائے۔

میں فرحت کے چہرے پر پھیلتی گلابیاں دیکھ رہا تھا۔ اپنا نام سن کر چونک اٹھا۔ فرحت جو روٹی لینے کو آگے سرکی تھی' فوراً خالہ بی کے پیچھے ہو گئی۔

"ہیں ضیاء؟ یہ منے میاں کیا کہہ رہے ہیں؟"

"ہاں بی جان! اور لگتا بھی ہے کہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اب یہ اماں پر منحصر ہے ان کا تو دل وہاں بہت زیادہ لگ گیا ہے"۔

"باؤلی ہے وہ تو اور عورت کا دل کیا! پانی کی طرح ہوتا ہے جس برتن میں ڈالو' اسی سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ اتنے برس ہو گئے گھر چھوڑے ہوئے۔ ہو لایا تو ہو گا ہی دل' پر کیا کرتی! دیکھ لینا' سنتے ہی پوٹلیاں باندھ لے گی۔ اے ہاں! عصمت کا بھی پر جڑا یا نہیں؟" بی جان کی تو جیسے بھوک ہی اڑ گئی۔ وہ ہاتھ جھاڑ کر پیچھے سرک گئیں۔

"ہاں! بات تو چلی تھی۔ میرا خیال ہے کہ ابھی کچھ طے نہیں ہوا۔ ہوتا تو اطلاع ہوتی" منے دادا نے پانی کا گلاس اٹھاتے ہوئے کہا۔

"جاتے ہی مجھے اطلاع کرو کہ کب آرہے ہو؟ مگر.......... وہ گھر تو.........."

اچانک بی جان کچھ کہتے کہتے رُک گئیں۔ انہوں نے کن انکھیوں سے خالہ بی اور فرحت کو دیکھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ مبشر کی وجہ سے پریشان ہو گئی ہیں۔ جہاں اتنی بات سن رکھی تھی وہاں یہ بھی سنا ہو گا کہ شالی بابا نے اس کی بھٹکتی روح کو ہمارے گھر میں قید کیا ہوا ہے۔

"نہیں بی جان! شالی بابا نے انتظام کر دیا ہے ایسا کہ اب کوئی مسئلہ نہیں ہو گا"۔ منے دادا نے گول مول جواب دے کر انہیں مطمئن کر دیا۔

بی جان نے تصدیق کرنے کو میری طرف دیکھا۔ میں نے بھی اثبات میں سرہلا دیا۔ وہ اتنی خوش ہوئیں کہ بیان نہیں کر سکتا۔ وہ خوش نہ ہوتیں تو کون ہوتا! اماں بیٹی تھیں ان کی' وہ بھی اکلوتی۔ تحسین خالہ کے دکھ نے بھی اب اماں سے محبت کا روپ دھار لیا تھا۔ وہ اماں اور ہم لوگوں کے لئے کتنی پریشان رہتی ہوں گی اس کا اندازہ تھا مجھے۔ پھر خالہ بی کی وجہ سے وہ وہاں بھی نہیں رہ سکی تھیں۔ کچھ منے دادا اور منی دادی کی وجہ سے بھی وضع داری نبھانا پڑتی تھی۔ ورنہ بیٹی کے لئے تڑپ تھی ان کے اندر وہ تو جی جان سے چاہتی تھی کہ وہ لوٹ آئیں۔ منے دادا کھانا کھانے کے بعد آرام کرنے چلے گئے۔ خالہ بی برقعہ اوڑھے باہر نکل گئیں۔ میں بی جان اور فرحت اونچی چھت والے اس ٹھنڈے کمرے میں آگئے جہاں بچپن میں' میں فرحت اور بی جان سویا کرتے تھے۔ منے دادا باہر کی بیٹھک میں جا لیٹے۔ بیرونی دیوار کے ساتھ بنا ہوا وہ کمرا جس میں بی جان کاٹھ کباڑ ڈالا کرتی تھیں اور جس کے بارے میں سنا تھا کہ وہ آسیب زدہ ہے' آج بھی بند تھا۔ ہم کمرے میں جا کر لیٹ

گئے۔ بی جان ہاتھ کا پنکھا جھلا جھلا کر سب کے بارے میں پوچھ رہی تھیں اور میں مسہری کے کونے پر سکڑی سمٹی' گلابی گلابی سی فرحت کو دیکھ دیکھ کر مسرور ہو رہا تھا۔

میرا جی چاہا کہ بی جان چپ ہو جائیں بلکہ کمرے سے ہی چلی جائیں۔ میں صرف فرحت کو دیکھتا رہا۔ آج میں اس طرح اسے پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ اس کے دمکتے ہوئے رخساروں میں گھلا ہلکا گلابی رنگ' ان پر بار بار پھسل آنے والی سیاہ لمبی لٹ مجھے لوٹے لے رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی کشش تھی۔ خوبصورت جسم' گورے گورے نرم نرم پاؤں' مخروطی انگلیوں کے درمیان براؤن گڑھے' گلابی ناخن' لرزتے ہونٹوں کے ایک کنارے پر سیاہ تل.......... میرے اندر جھکڑ سے چلنے لگے۔

فرحت میری حالت سے بے پروا بی جان کے ہاتھ سے پنکھا لے کر انہیں جھل رہی تھی۔

"اے فرحی بیٹا! میرے سر میں مہندی ہی لگا دے۔ ٹھنڈک پڑ جائے گی" بی جان نے اسے اٹھا دیا۔ مجھے لگا جیسے میں کوئی حسین منظر دیکھ رہا تھا جس پر کسی نے اچانک پردہ گرا دیا ہے۔ چونک اٹھا۔ مہندی لگانا لمبا چوڑا کام تھا ورنہ میں تو سمجھ رہا تھا کہ بی جان باتیں کرتے کرتے سو جائیں گی تو میں چپکے سے فرحت کو بتا دوں گا کہ اب اس کے بغیر زندگی فضول سی چیز لگنے لگی ہے اور یہ بھی کہ میں اماں کو لے کر آؤں گا تو سب سے پہلے تمہیں مانگ لوں گا مگر اب اس کا کوئی چانس نہیں تھا۔ گرمی میں دیر تک چلنے' اعصابی کشیدگی سے دوچار ہونے اور اب ٹھنڈک کمرے میں پلنگ پر لیٹنے سے آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ مجھے دوپہر میں سونے کی عادت نہیں ہے مگر یہ میں جانتا ہوں کہ دوپہر کی نیند کیسی نشہ آور ہوتی ہے۔

میں کب سو گیا' احساس بھی نہ ہوا مگر سوتے سوتے میں نے فرحت کی آنکھوں میں بکھرتے ستاروں سے ہزاروں باتیں کر لیں۔ جب اس کی نگاہ اٹھتی' وہ مجھے اپنی طرف دیکھتے پا کر گھبرا جاتی مگر اتنی بری بھی نہیں۔ مجھے لگا جیسے یہ ستارے میرے وجود میں ٹوٹ رہے ہوں۔ انہی خوبصورت کیفیات نے مجھے نیند کی پرسکون وادی میں پہنچا دیا۔

☆--------------☆--------------☆

میں پتا نہیں کب تک سوتا رہتا اگر کسی نے میری انگلی کو نہ چھوا ہوتا۔ میرا دل کی بی تھی جو سوتے میں چونکا گئی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ میرے سامنے فرحت کھڑی تھی۔

"ہم مجھے' شام ہو گئی۔ سنئے دادا بلا رہے ہیں"۔

"فرحی!" میں نے جلدی سے کمرے کا جائزہ لے کر اطمینان کر لیا کہ کمرے میں اس وقت کوئی نہیں ہے۔

"جی!"

"فرحی! میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ اکیلے میں........ پلیز........!"

"کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ اب ایسی کیا باتیں ہوں گی کہ........" وہ شرما گئی۔ جیسے جانتی ہو کہ وہ کیسی باتیں ہوں گی۔

میرے اندر طوفان نے کروٹ لی۔ میں نے بے اختیار اس کا ہاتھ تھام لیا پھر مجھے ہوش نہیں رہا۔ شاید میں نے اسے اپنی جانب کھینچا تھا۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹی' میز سے ٹکرا گئی۔ میز پر رکھی چیزیں بج اٹھیں۔

"کیا کرتے ہیں؟" اس نے دبے لہجے میں احتجاج کیا۔

مجھے جیسے ہوش آ گیا۔ پتا نہیں اس کے احتجاج میں کرب تھا یا بے بسی' حیرت تھی' ذرا خفگی یا شاید میرے اندر کا آدمی ہی جاگ اٹھا تھا۔ وہ جو بھی تھا' اس نے مجھے جھنجھوڑ دیا۔

"سوری........ سوری فرحت........!" میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ فرحت نے خود کو سنبھالا۔ چند لمحے مجھے غور سے دیکھا۔ میں نے شرمندگی محسوس کی۔ "فرحت! پلیز مائنڈ مت کرنا مجھے........ مجھے پتا نہیں کیا ہو گیا تھا"۔ میں نے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ "میں قابو نہیں رکھ پایا حالانکہ........ حالانکہ یقین کرو' میں بڑے مضبوط کردار کا مالک ہوں۔ فرحت........ میں عورت کا احترام کرتا ہوں۔ اسے جذبات کے طوفان میں تنکے کا سہارا نہیں سمجھتا۔ اسے کھلونا نہیں جانتا مگر تم........ تم پر اپنا حق ضرور سمجھتا ہوں۔ لیکن جانتا ہوں کہ حق کیسے حاصل کیا جاتا ہے۔ یوں چھین لینا........ پلیز فرحی........!" میں شاید معافیاں مانگ رہا تھا۔ یقین کریں' میں واقعی شرمندہ تھا۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی اپنے آپ پر کہ میں بھی ایسی کوئی چھچھوری حرکت کر سکتا ہوں؟ میں فرحت کے دل میں احترام کا نقش ابھرا ہوا تھا۔ آج محسوس ہو رہا تھا کہ میں نے اپنے اس کردار کو خود ہی ملیامیٹ کر دیا ہے۔

فرحت چپ تھی۔ میری ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ میں سر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں دیکھ لوں۔

"فرحت! میں تم سے محبت کرتا ہوں"۔ میں نے کہہ دیا کہ اس سے بہتر کوئی موقع نہیں تھا۔ اس طرح میں اپنے کردار کی صفائی بھی پیش کر سکتا تھا۔ وہ میری اسی جذباتی غلطی کو معاف بھی کر سکتی تھی۔

"کتنی دیر کردی یہ کہنے میں۔"

میں اچھل پڑا۔ فرحت کی آواز بھرائی ہوئی ضرور تھی مگر اس میں پیار ہی پیار تھا۔ ایسی کشش تھی' ایسا سرور تھا کہ میں نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔ اس کے چہرے پر شرم کے ساتھ ہی جذبات کی تمتماہٹ تھی۔ میری ساری شرمندگی' سارا افسوس' ساری مایوسی لمحے بھر میں ختم ہوگئی۔ "فرحی! تم نے مجھے معاف کر دیا؟"

"اچھا اب چلیں' بی جان اور منے دادا کیا سوچیں گے"۔ اس کے لہجے میں مٹھاس تھی۔

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ "ویسے فرحی! میں نے جو کچھ کیا' اس میں میرا قصور کم ہی تھا۔ تمہیں دیکھ کر قابو پانا بڑا مشکل ہے"۔

"اچھا چلیں"۔ وہ پلٹی۔

میں نے اس کے دوپٹے کا پلو پکڑ لیا۔ "سنو فرحی! ہم کل چلے جائیں گے۔ آج رات کچھ وقت تمہارے ساتھ اکیلا گزارنا چاہتا ہوں"۔

"یہی سب کچھ کرنے کے لئے"۔

"نہیں نہیں"۔ میں نے جلدی سے کہا۔ "وعدہ............ صرف باتیں............ تمہیں چھو کر میں فنا نہیں ہونا چاہتا۔ تھوڑا سا انتظار کرلوں گا"۔ میں نے شرارت سے کہا۔

وہ ہنسی۔ "اچھا بس' اب چلیں"۔

"پہلے بتاؤ نا!" میں نے ضد کی۔

"ٹھیک ہے' رات تو آنے دیں۔ بی جان اور منے دادا' منی بوبو کے پاس جانے کو کہہ رہے ہیں۔ آپ مت جائیے گا" اس نے شرماتے شرماتے کہا۔

"اور وہ تمہاری خالہ بی!"

"ارے بھئی! آپ مجھے پٹوا دیں گے۔ مت آئیں باہر' مجھے جانے دیں"۔ وہ لپک کر باہر نکل گئی۔

میں دھڑ سے پلنگ پر گر کر چوڑا ہو کے لیٹ گیا۔ محبت کا اظہار کتنا مشکل لگ رہا تھا اور جذبوں نے شدت اختیار کر کے اسے کتنا آسان بنا دیا تھا۔ میں نے رات کے تصور سے مسرت محسوس کی۔

"اس کی قربت بھی تو سرور انگیز ہے"۔ بے اختیار میرے منہ سے نکلا اور پھر بی جان کی آواز سن کر جلدی سے اٹھ کر آنکھیں ملنے لگا۔ وہ کمرے میں داخل ہو رہی تھیں۔

"ارے ضیا! مغرب کا وقت ہونے والا ہے پھر ساری رات الوؤں کی طرح جاگو گے۔ اٹھو بس!"

"اٹھ گیا بی جان!" میں نے ایسی شکل بنالی جیسے ابھی ابھی ہی میری آنکھ کھلی ہو۔ انگڑائی لی' منہ چلایا' چپل پیروں سے گھسیٹتا ہوا کھڑا ہوگیا۔

"رات کو منی بوبو کے گھر چلنا ہے۔ پوتا آیا تھا ان کا بلانے کو۔ سارے میرٹھ کو خبر ہوگئی کہ منے اور تم آئے ہوئے ہو۔ انہوں نے کھانے پر بلایا ہے اور بھیا! یہ نہ دہلی ہے نا بمبئی' یہاں لوگ سر شام ہی کھانا کھا لیتے ہیں۔ تم لوگوں نے اپنی عادتیں بگاڑ لی ہیں۔ دیر سے کھانا' دیر سے سونا اور دیر سے اٹھنا"۔

"بی جان! میں نہیں جاؤں گا۔ بہت تھک گیا ہوں۔ پچھلی بار مل کر تو گیا تھا"۔ میں صحن میں نکل آیا۔

"لو! کہاں مل کر گئے تھے۔ وہ تو شکایت کر رہی تھیں" وہ میرے پیچھے پیچھے تھیں۔ "اور اب تو منے میاں بھی آئے ہوئے ہیں"۔

"ہاں! تو انہیں لے جائیں۔ ارے ہاں بی جان!" میں نے ایک دم پلٹ کر انہیں روک دیا۔ پہلے پلٹ کر دیکھا تو قریب میں کہیں منے دادا تو نہیں پھر پوچھا۔ "بی جان! میں نے سنا تھا کہ منے دادا منی بوبو سے شادی کرنا چاہتے تھے"۔

"اے ہٹ" وہ ہنسیں۔ "فضول باتیں مت کر۔ ابھی سن لیں گے تو آفت آجائے گی"۔

"بتائیں نا!"

"ناراض ہو جائیں گے مجھ سے" وہ رازدارانہ انداز میں بول کر ہنسیں۔ "جتنا مجھے پتہ ہے' کسی کو نہ پتا ہوگا۔ منی جیجی تو بڑی تھیں مجھ سے۔ بس بیٹا' منی بوبو کے ابا ہی بیچ میں خان بن گئے تھے ورنہ سمجھ نیا پار لگنے ہی والی تھی۔ اب تک شادی نہ کی منی بوبو نے تو اس کا سبب یہ منے ہی ہیں"۔

"ایسا زبردست افسر!" میں حیران ہو گیا۔

"ہیں..........! کیا..........؟" بی جان نے منہ کھول دیا۔

"کچھ نہیں۔ آپ لے جائیں انہیں۔ میں کباب میں ہڈی نہیں بنوں گا۔"

وہ ہنسنے لگیں۔ "بڑے میاں سے کہو تو جانوں؟"

میں تولیہ لے کر غسل خانے چلا گیا۔ وہاں سے نکلا تو منے دادا تیار تھے۔ بی جان بھی تیار تھیں۔ فرحت کچن میں تھی۔ خالہ بی مصلے پر بیٹھی تھیں۔

"جلدی کریں آپا۔ میں بھی نماز پڑھ کر نکلوں گی"۔ بی جان نے خالہ بی کو سلام پھیرتے دیکھ کر کہا اور اپنا دوپٹہ کانوں کے پیچھے سے سر پر لپیٹ لیا۔

"تم تو اور دیر کر رہے ہو" منے دادا نے بے چینی سے کہا۔

"نہیں منے دادا! میری ہمت نہیں ہے اور میری ان لوگوں سے ایسی جان پہچان کہاں ہے' میں سوچ رہا ہوں بڑی بوا کے گھر ہو آؤں۔ اماں نے ان کی بہو کے لئے چیزیں بھجوائی تھیں' وہ دے دوں گا۔ کچھ دوستوں سے ملوں گا پھر لوٹ آؤں گا"۔

مجھے لگا منے دادا نے اطمینان کا سانس لیا ہے۔ یہ داستان میں نے زمانوں پہلے سنی تھی مگر دھیان نہیں دیا تھا۔ آج اتنے عرصے بعد منی بی بی کا ذکر سن کر مجھے سنی ہوئی تمام باتیں یاد آ گئی تھیں۔ اتنا اطمینان منے دادا کو نہیں ہوا ہو گا جتنا مجھے ہوا تھا۔ میں نے باورچی خانے کی طرف منہ کر کے فرحت کو آواز دی "فرحت چائے پیوں گا"۔

"جی لا رہی ہوں"۔ اس نے جواب دیا۔ میں گیلے بالوں میں تولیہ پھیرنے لگا' بی جان نماز شروع کر چکی تھیں۔ منے دادا بے چینی سے پلنگ پر بیٹھے پیر ہلا رہے تھے۔ خالہ بی اپنے کمرے میں جا چکی تھیں۔

"خالہ بی نہیں جا رہیں؟" میں نے سرسری انداز میں منے دادا سے پوچھا۔

"ہاں..........! شاید وہ نہیں جا رہی"۔

"کہیں اور جانا ہو گا"۔ میں زیر لب بڑبڑایا۔ "محلے کے ہر گھر میں نہ جب تک لیں نیند نہیں آتی انہیں"۔

"ایسے لوگ بڑے ہر دلعزیز ہوتے ہیں" منے دادا نے ہنس کر جواب دیا۔

بی جان نماز پڑھتے ہی برقع اوڑھ کر کھڑی ہو گئیں۔ ان دونوں کے گھر سے نکلتے ہی میں دبے پاؤں باورچی خانے کی طرف گیا۔ فرحت سالن بھون رہی تھی۔ اسے میری آ

پتا بھی نہ چلا۔ چولہے کی تپش سے اس کا گلابی چہرہ لال ہو چکا تھا۔ اس زمانے میں گیس کے چولہے نہیں تھے۔ اکثر گھروں میں کوئلے انگیٹھی میں دہکائے جاتے تھے یا پھر بغیر چھت والے حصے میں مٹی کے چولہوں میں لکڑیاں جلائی جاتی تھیں۔

فرحت انگیٹھی پر سالن بھون رہی تھی۔ اس کے اوپری ہونٹ پر پسینے کے قطرے شبنم کی طرح چمک رہے تھے۔ لگ رہا تھا جیسے انگارے پر پارہ ٹھہرا ہوا ہے۔ وہ کسی کام سے پلٹی تو مجھے دیکھ کر ڈر گئی۔

"ہوئی اللہ!" اس نے اپنا ہاتھ بے اختیار سینے پر رکھ لیا۔

میں ہنس پڑا۔ "بہت ڈرپوک ہو تم"۔

"آپ سے تو ڈر لگنے لگا ہے"۔ اس نے کھسیا کر کہا۔ "بی جان چلی گئیں کیا؟"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ آپ یہاں پہنچ گئے۔ ان کی موجودگی میں تو شاید یہ ممکن نہیں تھا"۔

"جی نہیں! ان کی موجودگی میں بھی ممکن تھا اس لئے کہ وہ خوب جانتی ہیں کہ میں نے آپ کو حاصل کرنے کا عہد انہی سے کیا ہے"۔

"کیا..........کب؟"

اس کی حیرت بتا رہی تھی کہ اسے ابھی تک کچھ علم نہیں ہو سکا حالانکہ میں سمجھا تھا کہ اسے علم ہے۔ "جب پچھلی بار آیا تھا تبھی کہہ گیا تھا کہ فرحی میری امانت ہے' اسے سنبھال کر رکھئے گا۔ اسے کچھ ہوا تو پوری دنیا کو آگ لگا دوں گا"۔

"رہنے دیں..........بس لگا چکے آگ"۔ وہ شرما بھی رہی تھی اور باتیں بھی کرنا چاہتی تھی۔

"تمہیں ابھی نہیں پتا چلے گا۔ یہ آگ جلاتی نہیں ہے' سلگاتی ہے' دھیمے دھیمے" میں نے اس کے چہرے کی تپش سے اندازہ لگا لیا کہ وہ کس آگ کی بات کر رہی ہے۔ کچھ دیر پہلے جو ہوا تھا' اس کی تپش میں اب بھی محسوس کر رہا تھا اور وہ تو عورت تھی۔ اس کے لمس نے مجھے سلگایا تھا تو تپش تو اسے بھی محسوس ہوئی ہو گی۔ "فرحی اوپر چلتے ہیں۔ چاندنی میں"۔

"اوپر چاندنی نہیں ہے' سامنے طاہر اللہ کی بلڈنگ کا بلب ہے جس کی روشنی ہماری چھت پر پڑتی ہے۔ ان کے جھروکے اسی جانب کھلتے ہیں"۔ اس نے تنبیہہ کے انداز میں

کہا۔

"کھلتے ہوں گے' چلو بس"۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ارے چھوڑیں بھئی! خالہ بی آ جائیں گی۔ مجھے سالن بھونتا ہے"۔

"فرحت پلیز! اس لمحے کا انتظار میں نے برسوں کیا ہے"۔

"سب کچھ تو کہہ چکے آپ' اب کیا ہے؟" وہ جھجک رہی تھی۔

"میں نے کہا ہے سب کچھ اور تم نے؟ تم نے کچھ بھی نہیں کہا"۔

"میں کچھ نہیں کہوں گی۔ مجھے کچھ نہیں پتا بس۔" فرحت جلدی سے باورچی خانے سے نکل کر کھلے صحن میں آ گئی۔

میں نے چائے کا کپ وہیں رکھ دیا۔ فرحت کے انکار میں اقرار کا پہلو مجھے مسرور کر رہا تھا۔ لیکن یوں سمجھئے کہ اللہ نے کرم کر دیا۔ خالہ بی باہر آ کر بیٹھ گئیں۔ انہوں نے فرحت سے کہا کہ وہ ان کے سر میں تیل ڈال دے۔ میرے سارے پروگرام دھرے رہ گئے۔ فرحت کے چہرے پر مایوسی صرف لمحہ بھر کو چھائی پھر وہ مجھے منہ چڑانے لگی۔ میرا جی چاہا کہ میں سر دیواروں سے ٹکراتا پھروں۔ خالہ بی بہت کھاگ تھیں۔ انہوں نے گھنٹا بھر سر دلوایا۔ جب تک منے دادا اور بی جان آ گئے ان کا واویلا ختم نہیں ہوا' وہ رہ رہ کر ہائے کا نعرہ لگاتی تھیں۔

بی جان اور منے دادا کی آمد نے تو میرا دماغ ہی اڑا دیا۔ آج کیا' میرٹھ سے نکلتے ہی یہ احساس ہو گیا تھا کہ جو ضیا فرحت کو بانہوں میں لے کر اس کے کانوں میں پیار بھری سرگوشیاں کرنا چاہتا تھا' وہ میں نہیں' کیا باہر سے آیا ہوا کوئی شخص تھا جس نے میرے قالب میں ڈھل کر میرے شفاف کردار کو داغ دار کر دیا تھا۔ ہاں.........! اس رات جب بی جان اور منے دادا کے علاوہ خالہ بھی سو گئیں۔ اس رات میری آنکھیں جلتی رہیں۔ نیند نہیں آئی۔ میں گھر میں پھیل جانے والے سناٹے کا منتظر تھا اور جب مجھے یقین ہو گیا کہ اب سب سو چکے ہیں تو میں دبے پاؤں اٹھا' فرحت آج بھی بی جان کے کمرے میں سو گئی تھی بس اب پلنگ الگ تھا۔ میں کمرے میں داخل ہوا۔ اس کا پاؤں ہلایا اور یہ دیکھ کر وہ جاگ گئی ہے' اسے اشارہ کرتا ہوا سیدھا چھت پر پہنچ گیا۔

انتظار کے لمحے طویل ہوتے جا رہے تھے۔ میری آنکھیں سیڑھیوں پر اور کان نیچے آہٹ پر لگے تھے۔ "شاید فرحت کی ہمت نہیں ہو رہی یا شاید بی جان اٹھ گئی ہوں"۔ میں

اپنے دل کو تسلی دیتا رہا۔ یہ خیال مجھے اچانک ہی آیا تھا کہ وہ آ بھی گئی تو میں کیا کروں گا۔ اظہار محبت میں کر چکا تھا۔ اصولی طور پر تو اتنا کافی تھا۔ اب مجھے اماں وغیرہ کو بھیج کر منگنی کا یا بیاہ کا بندوبست کرنا چاہئے تھا مگر میری بے قراری عجیب سی تھی۔ میں جو طیب کے انداز کو چھچھورپن یا لونڈھیارپن کہا کرتا تھا' خود حد سے گزر رہا تھا۔ فرحت کی آمد کے خیال ہی سے بدن میں چیونٹیاں رینگنے لگی تھیں۔

آج چاند نہیں نکلا تھا۔ وہ روشنی جسے میں چاند کی روشنی سمجھ رہا تھا' واقعی سامنے والی بلڈنگ کی پیشانی پر لگے بلب کی تھی۔ وہ بجھا تو اس چھت پر بھی تاریکی چھا گئی۔ اس اندھیرے کے ساتھ ہی میرے اندر کی بے چینی بڑھ گئی۔ کافی وقت گزر چکا تھا' فرحت نہیں آئی تھی۔ اب مجھے کوفت ہونے لگی تھی۔ صبح سویرے دہلی کے لئے نکل جانے کا پروگرام بن چکا تھا۔ پھر جانے کب آنا ہوتا۔ میں بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ آخر تنگ آ کر میں نے واپس بستر پر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ابھی میں نے قدم سیڑھیوں کی طرف بڑھایا ہی تھا کہ مجھے اپنی پشت پر آہٹ محسوس ہوئی۔ میں پلٹا تو اس نسوانی ہیولے کو دیکھ کر ٹھٹک گیا جو دبے پاؤں میری طرف بڑھ رہا تھا۔ میں خوشی سے دیوانہ وار اس کی طرف لپکا۔

"فرحت! اتنی دیر کر دی" میں نے بے اختیار اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"ہوں!" وہ یوں بولی جیسے ہنسی دبا رہی ہو۔

"میری بے قراری کا لطف لے رہی تھیں؟" میں نے محسوس کیا کہ اس کے ہاتھ ٹھنڈے ہیں' بہت سرد۔

پھر وہی دبی دبی ہنسی سنائی دی۔ اس کے پاس سے بڑی مسحور کن خوشبو آ رہی تھی۔

"ڈر لگ رہا ہے نا! ٹھنڈے ہو رہے ہیں تمہارے ہاتھ"۔

میں غیر محسوس طریقے سے اس کے قریب ہو گیا۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ فرحت نے مجھے پیچھے ہٹانے یا خود سرک جانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

"میں چاند کی کرنوں کو گواہ بنا کر تمہیں اپنانے کا وعدہ کرتا ہوں' فرحت! جو جذبہ بچپن سے میرے اور تمہارے درمیان کی دوری میں پلتا رہا' وہ محبت کا جذبہ تھا۔ اسے میں نے اب محسوس کیا ہے۔ تم بھی وعدہ کرو کہ میرے سوا کبھی کسی کے متعلق سوچو گی بھی نہیں' وعدہ کرو"۔

وہ کچھ نہیں بولی۔ "کیا مصیبت ہے یار' ذرا سی بھی روشنی نہیں ہے کہ میں تمہاری

میری آنکھوں میں ہی اقرار دیکھ سکوں۔ سنو فرحت پلیز! وعدہ کرو"۔

وہ چپ رہی مگر اس نے میرے ہاتھ کو مضبوطی سے تھام لیا اور مجھے لگا جیسے بجلی کی لہریں اس کے ہاتھ سے میری ہتھیلی میں منتقل ہو رہی ہیں۔ میں بے قابو ہوا' میں نے اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ اس کے کھلے ہوئے بال میرے چہرے اور شانوں پر بکھر رہے تھے۔ ان زہریلے ناگوں جیسی چکنی' ریشمی زلفوں کو میں نے اپنے لبوں سے چھو لیا۔ اس نے ساکت رہ کر میری حوصلہ افزائی کی۔ وہ سارے جذبے جو اس کے احتجاج کے خوف سے دبے ہوئے تھے' سر اٹھانے لگے۔ پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ مدہوشی تھی کہ مجھے میرا آپ بھلا گئی۔ طوفان تھا جو مجھے بہا کر کہیں سے کہیں لے گیا میں نے آگ کا سمندر پار کر لیا۔

☆-----------☆-----------☆

فرحت نے ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالا۔ وہ چپ چاپ میرے قریب سمٹی بیٹھی رہی۔ طوفان کا زور ٹوٹا تو احساس ہوا کہ میں نے کیا کر دیا۔ خوف آیا کہ نیچے منے دادا' نانا' بی اور بی جان ہیں۔ افسوس ہوا کہ میرے کردار کی مضبوطی ملبے کا ڈھیر بن گئی۔ شرمندگی ہوئی کہ میں طیب کی سطح سے بھی نیچے گر گیا۔ میرا وہ رعب دبدبہ' وہ وقار جو ہر ایک کی نگاہ میں میرا احترام پیدا کر دیا کرتا تھا' گویا ہوا میں تحلیل ہو چکا ہے۔ میں زمین پر رینگنے والے کسی حقیر کیڑے میں تبدیل ہو چکا ہوں۔

"فرحی! فرحی! مجھے معاف کر دو۔ میں جاتے ہی اماں کو بھیجوں گا۔ بہت جلد..........."

میں نے پیشانی پر آئے پسینے کو پونچھتے ہوئے کہا۔ فرحت نے اب بھی کوئی جواب نہیں دیا۔

"فرحت! میں......... میں بے قابو ہو گیا تھا۔ فرحت.........!"

وہ اب چپ چاپ کھڑی ہو گئی جبکہ میں گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اسی جانب الٹے قدموں بڑھنا شروع کر دیا جس جانب سے آئی تھی۔ اب مجھے خیال آیا کہ وہ اس طرف سے کیسے آئی تھی؟ سیڑھیاں تو دوسری طرف ہیں۔ وہ اب بھی اسی جانب بڑھ رہی تھی۔ "فرحی! کہاں جا رہی ہو؟ ادھر سے کیسے آئیں تم؟ رستہ ہے.........؟ سیڑھیاں ہیں کیا؟"

اس نے جواب نہیں دیا۔ میں سمجھا کوئی راستہ ہو گا تبھی تو آئی تھی۔ "سنبھل کے فرحی" اور اس نے یوں دیوار کی طرف قدم رکھا جیسے سیڑھی پر رکھا ہو۔ میں کھڑا ہو گیا' نگاہ سے اوجھل ہونے سے پہلے اس نے میری جانب ہاتھ ہلایا تو شرمندگی کا وہ احساس جو اس کی خاموشی نے شدید تر کر دیا تھا' کچھ کم ہوا۔ میں نے بوجھ کم ہوتا محسوس کیا اور جواب میں ہاتھ ہلایا۔

"گویا فرحت نے مجھے معاف کر دیا"۔ اس خیال نے مجھے کچھ بہتر تو کر دیا مگر میرا اپنا

کردار' میری برداشت' میرا اپنا اسٹائل سب کچھ بدل چکا تھا۔ اس پر مجھے پچھتاوا ہو
آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ اس زمانے میں کسی لڑکی کی طرف میلی آنکھ سے کوئی دیکھ
لیتا تھا تو لڑکی بدنام ہو جاتی تھی اور میں نے تو فرحت کے دل میں موجود شاید سار
احترام کو خاک میں ملا دیا تھا۔ اس کے جاتے ہی پھر خوف' شرمندگی اور احساس جرم
مجھے جکڑ لیا۔ میں نے فرحت ہی کے نہیں' بی جان کے اعتماد کو بھی ٹھیس پہنچائی تھی
کی عزت کو بھی بٹا لگایا تھا۔ ننھے دادا کی آنکھوں میں بھی دھول جھونکی تھی۔ اگر کسی کو
بھی ہو جاتا تو شاید قیامت آ جاتی۔

''اے خدا! مجھے معاف کر دینا'' مجھے اپنے آپ سے زیادہ فرحت کا خیال آ رہا
''میں صبح اس کا سامنا کیسے کروں گا؟'' یہ خیال مجھے پریشان کر گیا۔ میری ہمت نہ ہو
میں نیچے جا کر بستر پر لیٹوں لیکن جانا تو تھا۔ ہمت کی اور دبے پاؤں نیچے پہنچ گیا۔

بی جان کے کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ بی جان کی آواز بھی آ رہی تھی۔ م
دم ہی نکل گیا۔ لگا جیسے انہوں نے فرحت کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہے۔ جی چاہا کہ بھاگ
سے باہر چلا جاؤں اور پھر کبھی ساری زندگی ان لوگوں کا سامنا نہ کروں۔ ابھی میں یہ
نہیں کر سکا تھا کہ کیا کروں کہ اچانک بی جان کمرے سے باہر نکل آئیں۔ زمین نے م
پاؤں پکڑ لئے۔ میں جیسے پتھر کا بن گیا۔ اس دھماکے کا انتظار کرنے لگا جس کے بعد م
وجود کے' میری عزت و کردار کے چیتھڑے اڑ جاتے مگر بی جان نے گھبرائے ہوئے
میں جو کچھ کہا' اس نے مجھے اچھل جانے پر مجبور کر دیا۔ وہ کہہ رہی تھیں۔

''فرحت بخار میں بے ہوش پڑی ہے ضیا! ایک گھنٹے سے ماتھے پر پٹیاں رکھ
ہوں' ذرا بھی آرام نہیں آیا۔ ذرا پانی تو لاؤ صراحی سے''۔

یہ کہہ کر اور کٹورا میرے ہاتھ میں تھما کر وہ تو اسی تیزی سے اندر چلی
میرے کانوں میں سیٹیاں سی بجنے لگیں۔ کچھ دیر تک تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا پھر میں
کر بھاگا کیونکہ بی جان مجھے پکار رہی تھیں کہ جلدی لاؤ پانی..........میں نے صراحی سے
انڈیلا اور لرزتے ہاتھوں میں کٹورا تھامے بی جان کے کمرے میں چلا گیا۔ وہاں کا منظر
کر پھر میرے اندر طوفان سے اٹھنے لگے مگر یہ طوفان سرور آمیز نہیں تھے بلکہ ایسے
تھے جس میں آدمی کا سب کچھ بہہ جاتا ہے۔ جہاں سے نکلنے کی کوئی امید نہیں ہوتی
طوفان نہیں تھا جو اترتا ہے تو آدمی کو ہوش آ جاتا ہے بلکہ یہ وہ طوفان تھا جس کے

کے بعد آدمی اپنے ہوش کھو دیتا ہے۔ فرحت میرے سامنے بے ہوش پڑی تھی۔ خالہ بی بھی اس کے سرہانے بیٹھی تھیں۔ کچھ پڑھ پڑھ کر اس پر پھونک رہی تھیں۔ ایک تام چینی کے تسلے میں پانی تھا جس میں کپڑے کی پٹیاں تیر رہی تھیں۔ لگ رہا تھا کہ وہ جانے کب سے اس حالت میں ہے اور جانے کب سے بی جان اور خالہ بی اس کے سرہانے بیٹھی ہیں۔ میں نے آگے بڑھ کر فرحت کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ بری طرح تپ رہی تھی۔

''کب سے یہ حالت ہے؟'' میں ایسے بولا جیسے کوئی اور بولا ہو۔

''بس بستر پر لیٹی ہے۔ میں باتیں کر رہی تھی۔ کہنے لگی کہ بدن میں درد ہو رہا ہے۔ میں نے اپنے پاس بلا لیا۔ ابھی میری آنکھ لگی ہی تھی کہ مجھے لگا میرے قریب آگ دہک رہی ہے۔ اٹھ کے دیکھا تو غشی چھائی ہوئی تھی اور بخار تیز ہو چکا تھا۔ تب سے یہ حالت ہے''۔

''پھر.........وہ.........وہ کون تھی.........؟'' بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

''کون.........؟'' بی جان چونکیں۔

''نہیں.........کوئی نہیں.........'' میں گڑبڑا گیا۔ ''اب کیا کریں! یہاں ڈاکٹر ہے قریب میں کوئی؟''

''نہیں' اسپتال میں لے جانا پڑے گا''۔

''اتنی رات کو سواری کا کیا ہو گا؟'' میں بظاہر ان سے باتیں کر رہا تھا مگر حالت غیر ہو رہی تھی۔

''سویرا ہونے والا ہے'' خالہ بی بولیں۔ ''میں حکیم ابن کو لے آؤں گی''۔

''تم کہاں تھے؟'' اچانک بی جان نے چونک کر مجھے دیکھا۔

''نیند نہیں آ رہی تھی۔ چھت پر چلا گیا تھا''۔

''ہاں! جبھی تو میں کہوں' دو بار نکلی کمرے سے' تمہارے کمرے کے آگے تو منکا ڈھلا ہے۔ تمہیں پتا بھی نہ چلا سوچا پہلے تمہیں اٹھا دوں پھر خیال آیا گہری نیند میں ہو ورنہ اٹھ گئے ہوتے''۔

وہ بول رہی تھیں اور میں فرحت کی لمبی چٹیا کو دیکھ رہا تھا جو کس کے بندھی ہوئی تھی اور اس کے سر کے نیچے سے نکل پلنگ کی پٹی سے لٹک رہی تھی۔

''اس کے بال تو کھلے ہوئے تھے''۔ اس خیال نے میرے اندر سنسنی سی پھیلا دی۔

"وہ کون تھی؟ کیا وہ اس لئے چپ تھی کہ وہ.......... وہ فرحت نہیں تھی۔ میرے نیچے آنے سے دو منٹ پہلے ہی تو وہ گئی تھی"۔ میرے دماغ میں جھکڑ چلنے لگے۔ "وہ کون تھی؟؟" جیسے مجھے کسی نے ڈنک مارا۔ "وہ اس طرف سے آئی تھی جہاں سے میری معلومات کے مطابق اوپر آنے کو سیڑھیاں نہیں تھیں"۔ یہ خیال آتے ہی میں پلٹ کر چھت پر بھاگا۔ میں بے اختیار اس طرف بڑھا جہاں سے وہ آئی تھی۔ جیسے ہی میں نے نیچے جھانکا' دم بخود رہ گیا۔ وہاں سپاٹ دیوار تھی۔ کہیں پاؤں ٹکانے کی بھی جگہ نہ تھی جبکہ میں نے اترتے وقت کچھ فاصلے سے اسے دیکھا تھا اور یوں لگا تھا جیسے وہ پہلی' پھر دوسری اور پھر تیسری سیڑھی پر قدم رکھتی ہوئی دھیرے دھیرے میری آنکھوں سے اوجھل ہو رہی ہو۔

"یا خدا!" میں نے وہیں بیٹھ کر اپنا چکراتا ہوا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ "وہ.......... وہ کون تھی؟ کہاں سے آئی تھی؟ میں نے یہ کیا کر دیا؟" میں بڑبڑا رہا تھا۔

"ضیا.......... ! ضیا.......... !"

نیچے منے دادا مجھے آوازیں دے رہے تھے۔ میں نے جلدی سے خود کو سنبھالا۔ سوچنے کا کوئی لمحہ میرے پاس نہیں رہا تھا۔ یہ تو ایسا واقعہ بھی نہیں تھا کہ میں منے دادا کو رازدار بناتا۔ جو کچھ میں کر بیٹھا تھا اس جرم کے احساس نے پہلے ہی مجھے ادھ موا کر دیا تھا اور اب یہ خیال کہ وہ فرحت نہیں تھی' کوئی اور تھی' مجھے اور ہولائے دے رہا تھا۔

"ضیا.......... !"

"جی آیا منے دادا!" میں نے چہرے پر ہاتھ پھیرا جیسے میرے ہاتھ پھیرنے سے پریشانی اور خوف کے سارے تاثرات مٹ ہی تو جائیں گے۔ پھر میں تیزی سے نیچے آیا۔

"یہ وقت ہے چھت پر جانے کا۔ فرحت کی حالت دیکھی ہے!" وہ مجھے دیکھتے ہی ڈانٹنے لگے۔

"جی.......... ! جی' منے دادا! خالہ بی کہہ رہی تھیں کہ وہ حکیم کو بلا لائیں گی"۔ میں نے گڑبڑا کر جواب دیا۔

"اور تم سن کر چھت پر چلے گئے؟" انہوں نے ناراضگی سے کہا۔

"نہیں! وہ تو.......... میں تو.........."

"جاؤ!" وہ گرجے۔ "پتا کرو حکیم کا اور لے کر آؤ۔ ساری رات بچی تڑپی ہے اور تم.........."

میں تیزی سے اپنے کمرے میں گھس گیا۔ جوتے پہن کر باہر آیا۔ کپڑے تبدیل کرنے کا وقت نہیں تھا۔ خالہ بی نے مجھے پتا سمجھایا۔ یہ اگلے محلے کے گھر کا پتا تھا۔ میں گھر سے نکلا تو ملگجے اجالے میں پرندوں کے غول پرواز کر رہے تھے۔ آسمان کے کنارے سرمئی ہو چلے تھے اور قریبی مسجد سے اذان کی آواز گونج رہی تھی۔ جانے مجھے کیا ہوا کہ اذان کی آواز کانوں میں پڑتے ہی مجھ پر ہیبت طاری ہو گئی۔ دل خوف اور گناہ کے احساس سے بھر گیا۔ میں حکیم کے پاس جانے کی بجائے سیدھا مسجد کے قریب بنے حمام میں چلا گیا۔ میں نے غسل کیا' حمام ہی سے تہبند اور بنیان لے کر ایک تولیہ کندھوں پر ڈال کر سیدھا مسجد چلا گیا۔ وہاں رو رو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگی۔ صراط مستقیم پر چلنے کی تمنا کی۔ ہدایت کے لئے گڑگڑایا اور پھر حمام جا کر اپنے کپڑے پہن کر حکیم ابن کے گھر پہنچا۔ انہیں ساتھ لے کر گھر آیا تو منے دادا بے چینی سے ٹہل رہے تھے۔

"اتنی دیر کر دی تم نے؟ تم بے پروا کب سے ہو گئے!" انہوں نے کہا اور پھر حکیم ابن کو لے کر کمرے میں چلے گئے۔ میں وہیں صحن میں پڑے پلنگ پر ڈھے گیا۔

حکیم ابن نے کچھ دوائیں دیں اور چلے گئے۔ بی جان بہت پریشان تھیں۔ منے دادا بھی مضطرب تھے۔ خالہ بی مسلسل دعائیں پڑھ رہی تھیں۔ سب فرحت کے لئے پریشان تھے مگر میں.......... ! میں عجیب سی کیفیت سے دوچار تھا۔ یہ تو میں ماننے کو تیار نہیں ہوں کہ وہ جس کے ساتھ میں نے دو ڈھائی گھنٹے گزارے' جسے محسوس کیا' چھوا' جس کی خوشبو کو اپنے اندر اتار لیا' وہ کوئی ماورائی مخلوق تھی۔ وہ سو فیصد انسان تھی۔ اگر وہ فرحت نہیں تھی تو پھر کون تھی؟ یہ وہ سوال تھا جس نے مجھے ہر طرف سے بے نیاز کر دیا تھا۔ میں شرمندگی کے جس احساس سے اپنی شخصیت کو کچلا ہوا محسوس کر رہا تھا' اس سے تو مجھے آزادی مل گئی تھی مگر اب میں جس کرب سے دوچار تھا' وہ انتہا کا تھا۔

اس لڑکی کی سانسوں کی حدت اب بھی میرے اندر بسی ہوئی تھی۔ اس کے نرم و ملائم ہاتھ' اس کے خوشبودار بال' اس کی گھنگرو بجاتی سی ہنسی' یہ سو فیصد انسانی تھی۔ یہ وہ بات تھی جس پر میرا دماغ اصرار کر رہا تھا مگر وہ فرحت نہیں تھی۔ یہ بات بھی بار بار گونج رہی تھی۔ "کون تھی وہ؟" میں اتنا بے اختیار ہو گیا کہ یہ جملہ میرے منہ سے نکلا اور پاس سے گزرتے ہوئے منے دادا کے کانوں میں پڑ گیا۔

"ضیاء! کیا بات ہے..........؟ کیا.......... کوئی..........؟"

"نہیں منے دادا! وہ.......... میں نے شاید خواب دیکھا تھا"۔ میں گڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

"کوئی پریشانی والی بات تو نہیں ہے نا!" انہوں نے رازدارانہ انداز میں جھک کر پوچھا۔

"ن.......... نہیں.......... سب ٹھیک ہے۔ فرحت کیسی ہے؟ اسے ہوش آیا؟"

"ہاں' میرا خیال ہے کہ اب کچھ بہتر ہے۔ دوا کی دو خوراکیں دی ہیں۔ کچھ دیر میں اور ٹھیک ہو جائے گی۔ تم اندر جاکر بیٹھو۔ بی جان تو ہولی ہوئی ہیں"۔

وہ یہ کہتے ہوئے پانی کی ٹنکی کے پاس جا بیٹھے اور وضو کرنے لگے۔ اب آسمان پر روشنی چھانے لگی تھی۔ جو ہو چکا تھا' اس پر سوچنے کو زندگی پڑی تھی۔ کیفیت اچھی ہو یا بری' آدمی کو اکیلے ہی اس کے نشیب و فراز سے گزرنا پڑتا ہے۔ میں جس اذیت سے دوچار تھا' جس اسرار میں پھنس چکا تھا۔ منے دادا کے رازدار ہوتے ہوئے بھی انہیں کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔ میں نڈھال سا اٹھ کر اندر چلا آیا۔ فرحت کا سامنا کرنے کی جو ہمت ٹوٹی تھی وہ تو بندھ گئی کہ وہ میرے کردار کے کمزور پہلو سے ناآشنا رہی مگر اس کی قیمت چکانے میں' میں ٹوٹ پھوٹ چکا تھا۔

"آں.......... ! کون ہے.......... کون آیا ہے بی جان.......... ؟"

اچانک فرحت کی کمزور سی آواز سنائی دی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ شاید اس نے میری آہٹ سن لی تھی۔

"کون نہیں بیٹا! ضیا ہے"۔ خالہ بی نے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پیار سے جواب دیا۔

"اور کوئی نہیں آیا؟"

وہ پھر گردن کو ایک طرف ڈال کر بولی۔ اس بار اس نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی مگر شاید بخار کی شدت سے کھول نہیں پائی۔

"نہیں اور کون آتا فرحی!" بی جان نے اس کی پیشانی کا بوسہ لیا۔

"مہمان آئے تھے؟"

اب میں اس کے قریب جا بیٹھا۔ مجھے لگا جیسے وہ کسی اہم راز سے پردہ اٹھانے والی ہے۔ اور واقعی یہ راز میرے لئے کتنا اہم' کتنا سربستہ تھا' یہ تو میں ہی جانتا تھا۔ میرے اندر کی تمام قوتیں سماعت بن کر اس کی جانب نگراں ہو گئیں۔

"کوئی نہیں آیا بیٹا! اتنی رات کو کون آتا ہے؟ اب تو فجر کی اذانیں ہو رہی ہیں" بی جان کی آواز ایک دم رندھ گئی

"کون آیا تھا فرحت!" میں نے اشارے سے بی جان کو چپ کرا کے اس سے پوچھا۔

"آں.......... ! ہاں.......... ! وہ آئی تھی.......... چلی گئی.......... خوشبو.......... بلڈنگ کا بلب ہے.........."

میرا خون خشک ہو گیا۔ وہ غشی کے عالم میں جانے کیا کہہ رہی تھی' یا کیا کہنے والی تھی۔ "بی جان! آپ جاکر سو جائیں۔ خالہ بی! آپ بھی کچھ دیر لیٹ لیں۔ اس پر غشی طاری ہے۔ میں کافی سویا ہوں۔ میں بیٹھ سکتا ہوں" میں گڑبڑا کر کہہ رہا تھا۔

"نماز پڑھ لوں' نیند بھلا کیسے آئے گی" بی جان گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھتے ہوئے بولیں۔ "آپا! آپ جاکر کچھ لیٹ جائیں" آخری جملہ انہوں نے خالہ بی سے کہا تھا۔ انہیں بھی نماز پڑھنا تھی۔ غنیمت ہوا کہ ان دونوں کے کمرے سے جانے تک فرحت کچھ نہیں بولی۔ نڈھال سی پڑی رہی۔ میں نے بھی اسے نہیں چھیڑا۔ میں جان گیا تھا کہ ان لوگوں کی موجودگی میں اسے چھیڑنا خطرناک ہے۔ ان دونوں کے جاتے ہی میں نے فرحت کا بغور جائزہ لیا۔ وہ جو بھی تھی' فرحت نہیں تھی' اس لئے کہ فرحت کاٹن کے کپڑے پہنے تھی اور میں ریشمی کپڑوں سے الجھا تھا۔ فرحت کے کسی ہوئی چوٹی بندھی تھی اور اس کے بال کھلے ہوئے اور بالکل سیدھے تھے جبکہ فرحت کا بال موٹا بھی تھا اور ان میں ہلکا ہلکا خم آیا ہوا تھا۔ میں نے بے اختیار اس کا ہاتھ پکڑ کر لمس کو محسوس کرنا چاہا۔ میری حس مجھے چیخ اٹھی کہ نہیں.......... یہ وہ لمس نہیں ہے' وہ گداز نہیں ہے۔ اس لیے مجھے حیرت ہوئی یہ سوچ کر کہ میری جو حیرت انگیز بینائی تھی' جو اندھیرے میں بھی سوئی کو واضح دیکھ لیا کرتی تھی' وہ میرے کام کیوں نہ آئی! میں گھنٹوں الجھا رہا اور مجھے اس میں اور فرحت میں کوئی فرق کیوں محسوس نہیں ہوا؟

"نہیں! تمہارا ہاتھ جلتا ہے۔ مجھے نہیں چھوؤ"۔

فرحت کسمسائی۔ میں نے جلدی سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا حالانکہ وہ بالکل غلط کہہ رہی تھی۔ اس کا ہاتھ تپ رہا تھا اور میرے ہاتھ ٹھنڈے تھے۔

"فرحی! سنو' میں ضیاء ہوں۔ تم اوپر کیوں نہیں آئی تھیں؟" میں نے جھک کر اس

کے کان میں سرگوشی کی۔

"میں گر جاتی ہوں۔ چڑھ نہیں سکتی۔ خوشبو بہت تیز ہے۔ نہیں.......... میں نہ جاؤں گی اوپر.......... ڈر لگتا ہے"۔ وہ پھر بے ربط جملے بول رہی تھی اور میں انہیں سن رہا تھا۔

"میں نے بلایا تھا نا فرحت! تم آئی تھیں؟" میں نے پھر سرگوشی کی۔

"نہیں! ڈر لگتا ہے پھر.........." اس نے بہت گہرا سانس لے کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ جیسے تھک گئی ہو۔

"پھر کون آیا تھا؟ تم اور میں تھے نا.......... اوپر' چھت پر!" میں اس پر جھکا ہوا تھا۔

"کوئی آیا تھا"۔

وہ بولی اور پھر لگا جیسے سو گئی ہو۔ میں نے کئی بار ہلایا' بات کرنے کی کوشش کی مگر وہ بے خبر ہو چکی تھی۔

اس کی باتیں واضح نہیں تھیں اور اب کچھ پوچھنا بھی بیکار تھا اس لئے کہ بی جان نماز پڑھ چکی تھیں۔ منے دادا اور ان کے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں فرحت کو دیکھتا اور سوچتا رہا کہ کیا اسے ہوش میں آنے کے بعد یاد ہو گا کہ کوئی آیا تھا۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اوپر نہیں آئی اور جو بھی آئی تھی اس سے فرحت کی ملاقات ہوئی تھی۔ پھر کیا ہوا؟ وہ رات اچھی بھلی تھی تو اتنی بیمار کیسے ہو گئی' یہ جاننے کے لئے مجھے بہرحال اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنا تھا۔

"ضیاء! بوا چائے پی لو۔ ناشتا کرو گے؟" بی جان اندر آ کر بولیں۔

"نہیں بی جان! ناشتا تو نہیں کروں گا۔ بس چائے پیوں گا"۔ میں نے کھڑے ہوتے ہوئے جواب دیا۔

"سو گئی ہے..........؟"

"جی! میرا خیال ہے کہ آرام کرنے سے جلدی بہتر ہو جائے گی"۔

"ہاں! حکیم صاحب بھی کہہ گئے ہیں کہ جتنا سوئے' بہتر ہے"۔

ہم دونوں باہر آ گئے۔ منے دادا چائے پر منتظر تھے۔ انہوں نے مجھے بڑے غور سے دیکھا۔ میں نروس ہو گیا۔ احساس جرم آدمی کو کہیں کا نہیں چھوڑتا۔ لاکھ وہ دنیا کی نگاہوں سے اپنے جرم کو چھپا لے مگر وہ جو اندر بیٹھا ہے' اس جرم کی حکایتیں سناتا رہتا ہے' اس کی آواز اتنی بلند ہوتی ہے کہ لگتا ہے پوری دنیا میں گونج رہی ہے۔ سب سن رہے ہیں۔ حالانکہ یہ گونج اندر ہی رہتی ہے مگر اس گونج سے ہی تو چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگتی ہیں۔ مجرم پہچانا جاتا ہے' جھوٹ پکڑا جاتا ہے' آدمی نروس ہو جاتا ہے' یہی میری کیفیت تھی۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے رات کی پوری داستان میرے چہرے پر لکھی ہوئی ہے۔ منے دادا سب کچھ پڑھ رہے ہیں۔ میں خود پر قابو پانے کے چکر میں اور نروس ہو رہا تھا۔

"آپ ناشتا کریں' مجھے تو بالکل بھوک نہیں ہے اور پراٹھے تو یوں بھی مجھے بالکل پسند نہیں ہیں۔ ہضم ہی نہیں ہوتے"۔ میں نے بیٹھتے ہوئے کہا اور اپنے لہجے کو کافی مضبوط بنا لیا۔ لگا کہ جیسے میں اپنی کیفیت کو چھپانے میں کامیاب رہا ہوں مگر اس وقت اور بوکھلا گیا جب منے دادا نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"کون سے ناشتے اور کن پراٹھوں کی بات کر رہے ہو؟"

میں نے چونک کر پہلے انہیں پھر ان کے سامنے رکھے چائے کے سامان کو دیکھا۔ وہاں صرف چائے دانی' دودھ دان' چینی دان کے علاوہ تین چائے کی پیالیاں تھیں۔ ناشتے نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ "جی نہیں..........! وہ بی جان کہہ رہی تھیں کہ ناشتا کر لو"۔

"پراٹھے تو بٹیا فرحت ہی بنا لیتی ہے۔ وہ بھی کبھی کبھی جی چاہتا ہے اس کا' ورنہ میں اور آپا تو باسی روٹی اور رات کے سالن سے ہی ناشتا کرتے ہیں"۔ بی جان میری بات نہیں سمجھیں۔

"چائے پیو!" منے دادا نے یوں کہا جیسے کہہ رہے ہوں' ہوش میں آ جاؤ۔

میں جلدی سے جھک گیا۔ پھر مجھے نہیں پتا کہ منے دادا اور بی جان کیا باتیں کرتے رہے۔ کبھی کبھی میرا دھیان ان کی باتوں کی طرف ہو جاتا تھا ورنہ میں اپنے اندر ہی چھپا رہا۔ خود کو ٹٹولتا رہا۔ اس لڑکی کو کھوجتا رہا جس نے اتنا وقت میرے ساتھ بغیر کسی ربط کے گزار لیا تھا۔ "ایلن..........؟" اچانک مجھے اس خیال کے ساتھ ہی جھرجھری سی آ گئی۔ ایک مری ہوئی عورت کا تصور کرتے ہی مجھے ابکائی آ گئی۔ میں اٹھ گیا۔ جی خراب ہونے لگا۔ "نہیں! ایلن ایسی حرکت نہیں کر سکتی اور پھر شالی بابا نے کہا تھا کہ وہ مجھے نقصان پہنچا ہی نہیں سکتی۔ وتسلا نے بھی کہا تھا کہ وہ مجھے تو نقصان نہیں پہنچا سکتی اسی لئے مجھے پریشان کرنے کو اس نے پنجرے کا یہ حال کر دیا۔

"نہیں! اس میں اتنی ہمت نہیں کہ.......... وہ.......... پھر..........؟" میرے دماغ

میں پھر جھکڑ چلنے لگے۔ "کیا اس محلے کی کوئی لڑکی تھی؟ کیا فرحت کی کوئی دوست تھی؟ کوئی جاننے والی.........؟

"ضیاء! مشورہ دو.......... کیا کریں؟"

منے دادا کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے لمحہ بھر کو انہیں دیکھا پھر مجھے خود پر غصہ آگیا۔ میں نوعمر لڑکوں جیسی حرکتوں کا شکار تو ہوا ہی تھا۔ اپنی سوچ اور اپنی کیفیت پر بھی قابو پانے میں اسی طرح ناکام ہو رہا تھا جیسے کوئی نوعمر لڑکا...... میں نے سب کچھ ذہن سے جھٹک دیا۔ وہ جو بھی تھی' اس نے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ بلکہ مجھے تو زندگی کے سب سے حسین پہلو سے آشنا کیا تھا۔ آپ برا مت مانئے گا میری اس بات کا' اس لئے کہ انسان ان مسرور انگیز لمحوں سے ہٹ کر اور کچھ بھی نہیں ہے۔ انہی لمحوں کی تو تخلیق ہے یہ.......... یہ میرا نظریہ ہے۔ بہرحال یہ ضروری نہیں کہ میرا یہ نظریہ درست ہو اور میں اصرار بھی نہیں کروں گا کہ آپ دنیا کو' یہاں موجود رشتوں اور جذبوں کو میرے ہی نقطہ نظر سے لیں۔ ہاں' تو میں بتا رہا تھا کہ میں خالی الذہن ہو کر منے دادا کے قریب آبیٹھا۔ میرا اعتماد بحال ہو رہا تھا۔ اس لئے کہ میں نے جو کچھ کیا سو کیا' اب اپنے آپ کو سنبھال لینے کا عہد بھی کر لیا تھا۔ شاید توبہ کر لینا اسی کو کہتے ہیں اور خدا کا معاف کر دینا بھی' کہ وہی تو اعتماد بحال کرتا ہے۔ ہیجانی کیفیت سے نکال کر قوت ارادی مضبوط کرتا ہے۔

"جی منے دادا!" میں نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"کیا کریں! فرحت کو ایسی حالت میں چھوڑ کر جانا زیب تو نہیں دیتا"۔

"میرا خیال ہے کہ آج اور رک جائیں۔ یہاں بی جان اور خالہ بی ہی تو ہیں۔ منشی جی وغیرہ بھی یہاں سے چلے گئے۔ کوئی مرد نہیں۔ فرحت ٹھیک ہو جائے تو بہتر ہے"۔

"ہاں! سوچ تو میں بھی یہی رہا ہوں مگر گھر کی طرف سے بھی پریشانی ہے"۔

"وہاں کے لئے پریشان نہ ہوں کیونکہ مجھے یقین ہے' طیب اب تک وہیں ہو گا"۔

وہ چونکے۔ "نہیں.........! ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس نابنجار کی پٹائی کر دوں گا میں"۔ انہیں ایک دم غصہ آگیا۔

"اچھا ہی تو ہے منے دادا.........! ہمارے پیچھے کوئی تو ہے وہاں"۔

"تمہیں کیسے پتا کہ وہ نہیں گیا ہو گا۔ ہو سکتا ہے چلا گیا ہو!" انہوں نے نرم انداز میں اور پُرسوچ لہجے میں کہا۔

"میں اس کی طبیعت سے واقف ہوں۔ وہ روزانہ میرٹھ سے دلی جانے والی ٹرین اور ہمارے گھر پہنچنے والے وقت کا اندازہ کر کے گھر سے غائب ہو جاتا ہو گا اور پھر لوٹ آتا ہو گا۔ وہ لمبی چھٹیاں لے کر آیا تھا"۔

"بہت بے لگام ہو گیا ہے یہ لڑکا! ناصر میاں عاجز آئے ہوئے تھے"۔

"وہ چھوٹا بچہ نہیں رہا منے دادا! جوان ہے' اچھا برا جانتا ہے۔ اب ہر بات پر ٹوکنا بھی ٹھیک نہیں ہے۔ ناصر چچا اسے بالکل چھوٹے بچے کی طرح ٹریٹ کرتے ہیں۔ گھر پر ہونے والی سختی ہی اولاد کو گھر سے فرار کی راہ سجھاتی ہے"۔

انہوں نے مجھے غور سے دیکھا۔ "سمجھ دار ہو گئے ہو بہت........" وہ دھیرے سے مسکرائے۔ "اچھا! پھر.......... یعنی ہم آج روانہ نہ ہوں!"

"جی! کل چلیں گے۔ آج دوا کی کچھ خوراکیں لے کر شاید فرحت کل تک بہتر ہو جائے"۔

"اگر نہیں ہوئی تو؟" انہوں نے تشویش سے کہا۔

"تو پھر دلی لے جائیں گے۔ ایسی حالت میں نہ اسے یہاں چھوڑا جا سکتا ہے' نہ ہم لوگ مزید رک سکتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ پہلی فرصت میں وہ منحوس زنجیریں دتسلا کے حوالے کر کے ان عذابوں سے خود کو اور سب کو بچالوں گا پھر زیوسا سے بعد میں نمٹا جا سکتا ہے"۔

"ہاں! ٹھیک ہے پھر رکتے ہیں"۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ "میں کچھ دیر کو آرام کروں گا۔ تم بھی لیٹ لو"۔

"نہیں منے دادا! میں تو کافی سویا ہوں۔ بی جان اور خالہ بی کو سلا کر میں فرحت کی دیکھ بھال کر لوں گا"۔

شاید میرے لہجے میں کوئی بات تھی' یا شاید انہیں کچھ یاد آگیا تھا۔ وہ میری بات سن کر جاتے جاتے ٹھٹکے۔ پہلے تو دوسری سمت منہ کئے کھڑے رہے پھر میری طرف پلٹے تو ان کے چہرے کے تاثرات خاصے پُراسرار تھے۔ وہ میری آنکھوں میں دیکھ رہے تھے۔

"........ ضیا..........!"

"جی منے دادا؟" مجھے لگا جیسے وہ کوئی ایسی بات کرنا چاہتے ہیں جسے کرنے کی خود میں ہمت پیدا نہیں کر پا رہے۔ "کیا بات ہے؟"

"ضیاء! میں نے کہا تھا ناکہ...... ہمیں کچھ فیصلے کرنا ہوں گے' جو شاید......"
وہ پھر چپ ہو گئے۔

"جی! آپ نے کہا تھا اور میں اب تک اس الجھن میں ہوں کہ ایسے کون سے فیصلے ہیں جو میرے خلاف ہو سکتے ہیں۔ بتایئے منے دادا...... میرے اور آپ کے درمیان اب ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ آپ......"

"نہیں! میرا خیال ہے کہ...... چلو' پھر بات کریں گے۔" وہ پھر ٹالنے لگے۔

"نہیں منے دادا! پلیز' بتایئے"۔ میں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سامنے بٹھالیا۔ خالہ بی اور بی جان وہاں نہیں تھیں۔ منے دادا کے چہرے پر عجیب سی بے بسی چھا گئی۔ یوں لگا جیسے وہ جو کچھ بھی کہنے والے ہیں' وہ خود انہیں بھی پسند نہیں ہے یا ان کے بھی خلاف ہے۔ "بولئے منے دادا!"

"بیٹا! میں نے سنا تھا کہ تم فرحت سے شادی کرنا چاہتے ہو مگر...... اب......!!"

"کیا مطلب! اب کیا ہو گیا؟ دیکھیں منے دادا! میں فرحت سے اس لئے شادی کرنا چاہتا ہوں کہ وہ جس طرح تنہائی کا شکار ہے' جس طرح بے گھری کا شکار ہے' جس صدمے سے دوچار ہو چکی ہے۔ اسے بہرحال سہارا چاہئے۔ بی جان اور خالہ بھی یقیناً اس کی طرف سے پریشان ہیں۔ میں نے بی جان سے کہہ دیا تھا کہ آپ فرحت کے لئے پریشان نہ ہوں"

"مگر ضیاء بیٹا! اب شاید ایسا نہ ہو سکے"۔ انہوں نے یہ کہہ کر یوں سر جھکا لیا جیسے یوں کہہ دینا ان کا کوئی جرم ہو۔

"کیا مطلب منے دادا! کیوں نہیں ہو سکتا؟ کیا آپ کی نظر میں کوئی اور ہے۔ کیا میرے اندر کوئی ایسا عیب ہے یا فرحت میں......"

"نہیں؟" انہوں نے ہاتھ اٹھا کر مجھے آگے کہنے سے روک دیا۔ "نہیں ضیاء! نہ تم میں کوئی عیب ہے' نہ میری نظر میں کوئی اور ہے۔ اور فرحت...... وہ تو بہت پیاری بچی ہے۔ اسے بہو بنا کر تو مجھے بے حد خوشی ہو گی مگر بیٹا! تمہارا معاملہ ذرا الجھ گیا ہے۔ زیو سا......"

"زیو سا!!!" میں حیرت زدہ رہ گیا۔ "زیو سا سے اس بات کا کیا تعلق ہے؟"

"وہ...... وہ ایسا نہیں چاہتی"۔

"اس کے چاہنے نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے منے دادا' زیو سا کون سا میری رشتے دار ہے جو میری زندگی کے فیصلے کرے گی"۔

"ہم پریشانی میں پڑ سکتے ہیں ضیاء بیٹا! شالی بابا نے کہا تھا کہ وہ ضیاء سے بات کرے گی۔ میں نے اسی لئے تم سے آتے ہوئے پوچھا تھا کہ اس نے تم سے بات کی یا نہیں۔ اس نے شالی بابا سے کہا تھا کہ وہ ضیاء کو کسی اور کا نہیں ہونے دے گی"۔

اور میرے بدن میں جیسے کانٹے سے اگ آئے۔ چیونٹیاں سرسرانے لگیں۔ سنسنی سی پھیل گئی۔

"زیو سا!!" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

"ہاں بیٹا!" دادا میری کیفیت سے بے خبر کہہ رہے تھے۔ "ہم فرحت کو داؤ پر نہیں لگانا چاہتے۔ یہ بات تمہاری ماں سے ہو چکی ہے میری مگر میں بی جان کو بتانے کی ہمت نہیں پاتا۔ مجھے اندازہ ہے کہ یہ سن کر ان کی کیا کیفیت ہو گی"۔

"تو کیا وہ زیو سا تھی؟" میرے اندر پکار گونجی۔ "وہ جس نے فرحت کی جگہ خود لے لی تھی۔ وہ جس نے اپنے لمس سے میرے اندر روشنیاں بھر دی تھیں۔ وہ جس کی ہنسی مجھے نئے جہانوں میں لے گئی تھی۔ وہ جس کی خوشبو نے مجھے دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا تھا۔ خود سے بیگانہ کر دیا تھا۔ وہ زیو سا تھی؟ جو بقول شالی بابا کے' میرا سایہ بنی ہوئی تھی۔ مجھے نظروں سے نکال لیتی تھی۔ وہ زیو سا جو یونان میں سکس کی سفاک دیوی کی حیثیت سے پہچانی جاتی تھی۔ وہ اپنے تمام تر گداز کے ساتھ گھنٹوں میرے قرب سے پگھلتی رہی تھی......!!" مجھے لگا جیسے میں کسی تیز چکر کھاتے جھولے میں بیٹھا ہوں۔

"ضیاء......! ضیاء......!"

"جی......! جی......! جی منے دادا......!" میں منے دادا کی آواز پر چونک کر ہوش میں آ گیا تھا حالانکہ میرے اندر بگولے سے اب بھی گردش کر رہے تھے۔

"دیکھو' میرا خیال ہے کہ ابھی ہمیں یہ بات بی جان سے نہیں کرنا چاہئے۔ پہلے تو......"

"ابھی نہیں منے دادا! یہ بات آپ کو کبھی بھی بی جان سے نہیں کرنا چاہئے"۔ میں نے ان کی بات کاٹ دی۔ "زیو سا ایسی ہی طرم خان ہے جو جب چاہے کسی کی زندگی کے فیصلے کر سکے تو اسے میرے سامنے آ کر بتانا ہو گا کہ وہ ایسا کیوں چاہتی ہے۔ اسے یہ حق

حاصل نہیں ہے کہ وہ میری یا فرحت کی زندگی سے کھیلے۔ اب تو مجھے یہ لگ رہا ہے کہ فرحت کی یہ حالت کرنے والی بھی زیو سا ہے۔ اگر ایسا ہوا منے دادا' تو میں اسے معاف نہیں کروں گا۔ اگر فرحت کو اس نے اذیت دی ہے تو پھر اسے اپنی تباہی کے لئے تیار رہنا ہوگا۔ آپ سے ملے تو بتا دیجئے گا اسے کہ وہ چاہے کتنے ہی جال پھینکے' اپنی تمام سفاکیوں سمیت مجھ پر حملہ آور ہو' میں ہار ماننے والا نہیں۔ اپنی زندگی کو داؤ پر لگا دوں گا مگر اسے بھی نیست و نابود کر دوں گا"۔ میں غصے میں پاگل ہو کر چیخنے لگا تھا۔ ہوش تب آیا جب منے دادا نے آگے بڑھ کر میرے منہ پر اپنا چوڑا چکلا ہاتھ جما دیا۔

"ضیاء! ہوش میں آؤ۔ فرحت ٹھیک نہیں ہے' بی جان سن لیں گی۔ ضیاء........!"

میں ہوش میں آ گیا مگر شاید دیر ہو چکی تھی۔ بی جان ہولائی ہوئی کمرے سے نکل آئیں۔ "کیا ہوا ضیاء! کیا بات ہو گئی؟"

"کچھ نہیں بی جان! میں شرمندہ ہوں۔ میں منے دادا سے بات کر رہا تھا۔ بس ایسے ہی غصہ آ گیا تھا"۔

"منے میاں پر غصہ آ گیا تھا؟ ہوش میں تو ہو ضیاء!" بی جان نے حیرت سے کہا۔ ان کی تیوریوں پر بل پڑ گئے تھے۔

"ن........ نہیں بی جان! ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ........ وہ اصل میں جس کا ذکر آیا تھا' اس پر غصہ آ گیا تھا"۔

"مگر میاں! ادب لحاظ بھی کوئی چیز ہوتی ہے"۔

"سوری بی جان! معاف کر دیں"۔ میں واقعی سخت شرمندہ تھا۔

"بی جان! دراصل بات ایسی ہو گئی تھی کہ ضیاء خود پر قابو نہیں رکھ سکا ورنہ یہ اسے چھوڑ نا!" منے دادا نے انہیں بگڑا دیکھ کر میری طرف داری کی۔

"کیا ہوا بی جان؟"

یہ آواز سن کر ہم تینوں ہی چونک اٹھے۔ میں نے نگاہ اٹھائی' کمرے کے دروازے پر فرحت کھڑی تھی۔

"ارے! تم کیوں اٹھ گئیں؟ کچھ نہیں ہوا چندا........! چلو' جلدی سے لیٹو"۔ بی جان اسے کھڑا دیکھ کر سب کچھ بھول گئیں۔ اس کی طرف لپکیں۔

"کیوں؟" فرحت نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ "اب تو دن نکل آیا ہے" وہ آنگن میں پھیلی دھوپ کو دیکھ کر بولی۔

میں اس پر نگاہیں جمائے ہوئے تھا اور دیکھ چکا تھا کہ وہ بالکل صحت مند ہے۔ رات جو حالت تھی' اس کی رمق بھی نہیں تھی اس کے چہرے پر بلکہ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ خوب مزلے کی نیند لے کر ابھی ابھی سو کر اٹھی ہے' تر و تازہ اور قطعی ٹھیک ہے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ فرحت کو غفلت میں لے جانے والی زیو سا ہی تھی۔ شاید وہ میری دھمکی سے ڈر گئی تھی۔ میں نے منے دادا کی طرف دیکھا۔ وہ بھی حیرت سے فرحت کو دیکھ رہے تھے۔ میں نے ان کی طرف دیکھا تو انہوں نے بھی میری آنکھوں میں دیکھ کر جیسے میرے خیال کی تصدیق کی۔ غالباً یہی خیال انہیں بھی آیا تھا۔ بی جان خود حیران تھیں۔

"اے! چلو لیٹو"۔ انہوں نے اسے بازو سے تھام لیا۔

"بی جان! کیا کر رہی ہیں۔ آپ لوگوں نے ناشتا بھی نہیں کیا ہوگا' مجھے اٹھایا کیوں نہیں آپ نے؟"

"ایں........ بی بی! تم ٹھیک تو ہو نا! ساری رات بخار میں تپی ہو۔ حکیم ابن آکر دوا دے گئے ہیں۔ ساری رات تمہارے ماتھے پر پٹیاں رکھی ہیں ہم نے' ہم سب رات بھر جاگتے رہے ہیں اور تمہیں ناشتے کی پڑی ہے"۔

بی جان اسے زبردستی پلنگ تک لے گئیں۔ وہ حیرت سے بی جان کی باتیں سن رہی تھی۔ میں اور منے دادا بھی کمرے میں پہنچ گئے۔ میں اس کے چہرے پر نگاہیں گاڑے اس کی کیفیات کا اندازہ لگا رہا تھا۔ کئی بار اس کی نگاہیں میری نگاہوں سے ٹکرائیں مگر ان میں ایسی کوئی بات نہ تھی جو مجھے شرمندہ کرتی۔ نہ ہی ایسی کوئی بات لگ رہی تھی کہ اس نے کسی کو دیکھا تھا۔ یعنی وہ غشی میں جو کچھ کہہ رہی تھی' اس سے بھی ناواقف لگ رہی تھی۔ اسے بی جان کی باتیں سن کر حیرت ہو رہی تھی۔

"بی جان!" میں جلدی سے آگے بڑھا۔ "اب تو یہ ٹھیک ہے نا!" میں فرحت کی طرف پلٹا۔

"لاؤ' نبض دکھاؤ"۔ وہ جھجکی مگر میں نے کلائی تھام لی۔ "ٹھیک ہے بالکل"۔ میں نے ہنس کر بی جان سے کہا۔ اب خالہ بی بھی اپنے کمرے سے آ چکی تھی۔

"ہاں بی جان! میں ٹھیک ہوں"۔

"ہاں' ہاں! جاؤ تم' پراٹھے بناؤ۔ بہت بھوک لگی ہے"۔ میں نے فرحت سے کہا۔

"اے لڑکے! باؤلا ہوا ہے کیا؟" خالہ بی چڑ گئیں۔ "لو! بچی ساری رات تڑپی ہے اور اسے خاطرداریاں سوجھ رہی ہیں۔ چل فرحی بیٹا! لیٹ جا کے"۔

"نہیں خالہ بی! پتا نہیں آپ لوگ کیا باتیں کر رہے ہیں۔ میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔ ساری رات سکون سے سوئی ہوں اور بھوک تو مجھے بھی لگ رہی ہے"۔ فرحت دوپٹا ٹھیک سے اوڑھتی ہوئی کچن کی طرف بڑھ گئی۔

☆===========☆===========☆

منے دادا حیرت سے کبھی مجھے اور کبھی فرحت کو دیکھ رہے تھے۔ بی جان جلدی سے فرحت کی مدد کو چلی گئیں۔ وہ دونوں یہی سمجھ رہی تھیں کہ فرحت ہم لوگوں کے خیال سے اپنی کمزوری کو چھپا کر ہماری خاطر کرنا چاہتی ہے۔ خالہ بی تو کافی دیر بڑبڑاتی رہیں۔ میں پھر منے دادا کے پاس جا بیٹھا۔

"ضیاء! تمہیں بھی کچھ محسوس ہو رہا ہے؟"

"جی منے دادا.........! شاید زیوسا میری دھمکی سے ڈر گئی۔ میں نے کہا تھا نا کہ اگر فرحت کو کچھ ہوا تو میں اسے تباہ کر دوں گا"۔

"ہوں.........! ضیاء.........بیٹا! جذبات میں بہنے کی بجائے ہوش و حواس سے کام لے کر مسئلے کا حل نکالنا"۔

"لیکن بی جان سے ابھی آپ اس مسئلے پر کوئی بات نہیں کریں گے اور اماں سے بھی نہیں"۔

"ٹھیک ہے مگر تمہاری اماں سے تو بات ہو گئی تھی۔ ویسے انہوں نے زیادہ دلچسپی نہیں لی۔ شاید مجھے وہ غیر سنجیدہ سمجھ رہی ہیں"۔

"نہیں منے دادا! ان کی عادت ہی ایسی ہے" میں نے بات ٹال دی کیونکہ بی جان ہمارے قریب آ رہی تھیں۔

فرحت بالکل صحت مند تھی۔ سہ پہر کو حکیم ابن خود بھی آ گئے اور خاصے پھول تنے کہ ان کی دو ہی خوراکوں نے بچی کو صحت مند کر دیا۔ بی جان اور خالہ بی ان کی خاطریں کرتی رہیں۔ ان کا اعتقاد پختہ ہو رہا تھا۔ میں الجھن میں تھا مگر سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کروں۔ فرحت کو ٹھیک ٹھاک دیکھ کر منے دادا کی یہاں کی فکر ختم ہوئی تو گھر کی فکر نے انہیں گھیر لیا۔ انہوں نے شام کی ٹرین سے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ فیصلہ سن کر فرحت کے

چہرے پر تاریکی چھائی مگر سچی بات یہ ہے کہ میں اب اس معاملے کو درست کر کے آگے بڑھانا چاہتا تھا۔ اس کا مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ اس کی دانست میں وہ بے خبر سو گئی تھی اس لئے مجھ سے بات کرنے یا اوپر نہ آنے کا جواز پیش کرنے کو بے چین تھی مگر میں نے ایسا کوئی موقع دیا ہی نہیں۔

شام ہی کو ہم وہاں سے روانہ ہو گئے۔ سارے راستے ہم زیوسا، وتسلا اور جینو کی باتیں کرتے رہے۔ جینو کے بارے میں تفصیل سن کر منے دادا بھی افسردہ ہو گئے تھے مگر شالی بابا کہہ چکے تھے کہ میں اس کی مدد کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں البتہ اگر زیوسا چاہے تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔

گویا بات زیوسا سے سودے بازی کی تھی۔ یا تو میں اس سے کنارا کر لیتا یا ان سب کے لئے مدد مانگ لیتا۔ میں نے سوچا تو مجھے اندازہ ہوا کہ بقول شالی بابا کے کیوں کہ وہ میری محبت میں گرفتار ہو چکی ہے اس لئے شاید میری مدد کو تیار ہو جائے اور پھر میں رابرٹ، جینو، پپاس زیگو اور سورن سنگھ کے لئے کچھ کر سکوں۔ ادھر وہ تنبیہہ کر چکی تھی کہ میں کسی عورت کے قریب نہ جاؤں۔ فرحت کو مجھ سے دور کر کے بھی اس نے جو کھیل کھیلا تھا وہ بھی اس پر دلالت کرتا تھا کہ میں ایک حد کے بعد بے بس ہوں۔ وہ جب چاہے، مجھے حاصل کر سکتی ہے، مجھے اپنی اسی بے بسی پر طیش تھا۔ میں فرحت سے دستبردار ہونے کو بھی تیار نہیں تھا مگر سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ وہ میرے سامنے کیوں نہیں آ رہی! اسے ایسا کون سا ڈر ہے کہ وہ میرے سامنے آ کر مجھ سے بات نہیں کر رہی تھی حالانکہ وہ میرے سامنے آ چکی تھی۔ مگر اس نے یہ نہیں بتایا کہ وہ زیوسا ہے۔ کیوں.........؟ اتنی قربت پا لینے کے بعد بھی یہ گریز کیوں تھا؟

ویسے ایک بات بتاؤں؟ میرا اس سے پہلا ربط، پہلی قربت ایسی میٹھی، ایسی سرور انگیز اور اتنی گہری تھی کہ میں اس کے خیال پر اپنے اندر وہ کیفیت نہیں پا رہا تھا جو اب سے پہلے ہوتی تھی۔ بہرحال، یہ ایک سربستہ راز تھا کہ وہ میرے سامنے خم ٹھونک کر کیوں نہیں کہتی کہ میں زیوسا ہوں، اور یہ چاہتی ہوں۔

☆===========☆===========☆

سفر اس بار بلا خوف و خطر گزرا۔ ہم صبح سویرے، منہ اندھیرے گھر پہنچ گئے۔ وہاں جا کر سب سے پہلی بات تو یہ پتا چلی کہ طیب میرے کمرے میں پاؤں پسارے سو رہا ہے۔

منی دادی نے منے دادا کو ڈانٹ دیا تھا کہ اسے کچھ نہ کہیں۔ بے چارا رات گیارہ بجے کی ٹرین کے بعد تو گھر میں گھسا ہے۔ یہ سن کر منے دادا نے مسکرا کر مجھے دیکھا۔ میں اور منے دادا صحن میں ہی سو گئے۔ صبح میری آنکھ اس وقت کھلی جب میں نے اپنے قریب ہی کسی کے گھگیانے کی آواز سنی۔ آنکھیں کھولتے ہی سامنے جو منظر تھا وہ دیکھ کر میں ہنس پڑا۔ طیب ایک ہاتھ میں اٹیچی کیس اور دوسرے میں جوتے پکڑے غالباً گھر کے بیرونی دروازے تک پہنچ چکا تھا کہ منے دادا نے اسے گدی سے پکڑ لیا۔ اب وہ گھگیا رہا تھا۔

"منے دادا! میں پھسل کر گر پڑا تھا۔ پاؤں میں موچ آئی تھی اس لئے اس دن نہیں جا سکا۔ ضیاء.........! مجھے بچاؤ یار.........!"

منے دادا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اس لئے کہ طیب انہیں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ طیب کی آواز نے منی دادی اور اماں کو بھی جگا دیا۔ عصمت آپا دونوں ہاتھ کمر پر رکھے سپاٹ چہرہ لئے کھڑی تھیں۔

"ہوں.........! وہ تو اگر عصمت مجھے نہ اٹھا دیتی تو یہ نکل لیتا"۔ منے دادا نے رعب دار آواز بناتے ہوئے کہا۔

"اوہ عصمت آپا! آپ......... آپ میری دشمن ہوں گی' میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا"۔ طیب نے روتی صورت بنا کر کہا۔

"یہ سوچنا وچنا تمہارے بس کا کام نہیں ہے۔ وہ کیا کرو جو کیا جا سکے"۔ انہوں نے اپنے مخصوص سپاٹ انداز میں جواب دیا۔

"ارے بھئی! سٹھیا گئے ہیں آپ!" منی دادی نے جھپٹ کر طیب کو چھڑا لیا۔ "میں نے روکا تھا اسے۔ مجھ سے بات کریں"۔

"اب تم سے کیا بات کروں؟" منے دادا آرام سے پلنگ پر بیٹھ گئے۔ طیب بچوں کی طرح منی دادی کے کندھے سے سر ٹکائے کھڑا تھا۔

"ڈر گئے' ڈر گئے" طیب بے ساختہ بول اٹھا۔

"جوتے نیچے رکھ دو"۔ عصمت آپا نے اسے گھورا۔ وہ گڑبڑا کر جوتے پہننے لگا۔ مجھے بڑا مزہ آیا۔ طیب کے بارے میں جو کچھ میں نے کہا تھا درست ثابت ہوا۔ منے دادا کا موڈ دیکھ کر طیب جلدی سے ان کے قریب زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور بولا۔

"دادا! میں آپ سے بہت پیار کرتا ہوں۔ آپ کا ہر حکم بجا لا سکتا ہوں۔ آپ کی

خاطر جان بھی دے سکتا ہوں مگر........." وہ منے دادا کے گھٹنے پکڑے کہہ رہا تھا۔

"مگر کیا؟" اس کے چپ ہوتے ہی عصمت آپا بول اٹھیں۔

"مگر رسک تو نہیں لے سکتا نا!" وہ مسکین شکل بنا کر بولا۔

"بمبئی جانے میں کوئی رسک نہیں تھا" عصمت آپا بھی اڑ گئی تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ اس نے انہیں بہت تنگ کیا ہو گا جس کا وہ بدلہ چکا رہی تھیں۔

"تھا نا! اتنا لمبا سفر اکیلا کیسے کرتا"۔

"اب کیسے کرو گے؟" وہ ایک قدم اور بڑھ آئیں۔

"دادا! میں کہاں جاؤں دادا.........! اتنی بڑی دنیا میں کسی کے دل میں میرے لئے گنجائش نہیں ہے کیا؟" اس نے منے دادا کے گھٹنے سے سر ٹیک دیا۔

"فضول چیزوں کی گنجائش تو دنیا میں بھی نہیں ہے۔ دل تو انسانوں کے ہوتے ہیں"۔ عصمت آپا نتھنے پھلا کر بولیں۔

"اچھا بس لڑکی.........! قابو میں رہ........." منی دادی بگڑ گئیں۔ اب مجھے درمیان میں آنا پڑا ورنہ غلط ہو جاتا۔ اماں بھی آ چکی تھیں۔ انہوں نے عصمت آپا کو ناشتا بنانے بھیج دیا۔ وہ جاتے جاتے پلٹ کر بولیں۔

"یہ بندر قسم کی چیز بھجوا دیں منے دادا! یہاں بندروں کی کمی نہیں ہے"۔

اس بار طیب نے منہ کھولا مگر میں نے اپنی ہتھیلی اس کے منہ پر رکھ دی۔

☆----------☆----------☆

ابھی دن کی روشنی پوری طرح نہیں پھیلی تھی۔ اماں اور منی دادی وہیں بیٹھ کر بی جان وغیرہ کی خیریت پوچھنے لگیں۔ تبھی میں نے محسوس کیا کہ طیب پلنگ پر ٹکے میرے ہاتھ کو انگلی سے مس کر رہا ہے۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس نے مجھے آنے کا اشارہ کیا اور اٹھ گیا۔ میں اس کے پیچھے کمرے میں چلا آیا۔

"میرا پیغام پہنچا دیا تھا؟" اس نے قریب آتے ہی پوچھا۔

"کیسا پیغام؟ میں کبوتر نہیں ہوں"۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

"مذاق مت کرو یار!" وہ میرے کاندھے پر ہاتھ مار کر بولا۔

"جی! میں کبوتر ہوں کیا؟"

"بتاؤ نا! تم نے وعدہ کیا تھا"۔

"میں وعدہ نہیں نبھا سکا۔ ویسے میں نے تم سے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا"۔ میں پلنگ پر جا بیٹھا طیب کی بات سے میرا موڈ آف ہو چکا تھا۔

"یار ضیاء! تم بہت بے مروت ہو۔ میں نے تو اپنی جان کی بھی پروا نہیں کی تمہاری خاطر......... موت کے کنویں میں چھلانگ دی تھی مگر تم..........!!"

میرے ضمیر نے مجھے ملامت کی۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اس نے واقعی میری خاطر جان کی بازی لگا دی تھی اور میں نے......... میں نے اس کی چھوٹی سی خواہش بھی پوری نہیں کی۔ میں سلام محبت نہ سہی' اسے سلام تو پہنچا ہی سکتا تھا پھر طیب کو یہ بتانے کی پوزیشن میں ہوتا کہ ہاں میں نے تمہارا پیغام پہنچا دیا ہے۔ فرحت پر مجھے یقین تھا کہ اس کی نگاہوں میں' میں نے اپنے لئے ہی پسندیدگی دیکھی تھی اور اب تو میں باقاعدہ اس سے اظہار محبت بھی کر چکا تھا۔ جس کا رسپانس بھی مجھے مل چکا تھا۔

"سوری یار! کچھ ایسے مسائل میں گھر گیا تھا۔ جاتے ہی کہ یاد نہیں رہا"۔

"کیسے مسائل؟"

اور پھر میں نے بلا کم و کاست اسے سب کچھ بتا دیا۔ بس چھت والے واقعے میں' میں فرحت کے انتظار والی بات کھا گیا اور اسے یوں بیان کیا جیسے میں چھت پر سونے گیا تھا جہاں مجھ پر مدہوشی طاری ہو گئی اور پھر وہ لڑکی آ گئی۔ میں قطعی ہوش میں نہیں رہا کہ سوچوں یہ کون ہے' اور وہ مجھے طوفانوں میں لے گئی۔

"ماشاء اللہ بالغ ہو کر آئے ہو"۔ وہ چہکا۔

"میں وہاں بہت پریشان رہا طیب!" میں نے لیٹتے ہوئے کہا۔

"پھر مبشر والے معاملے کا کیا ہوا؟" طیب اب سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"شمالی بابا کی ہدایت پر عمل تو کر آئے ہیں۔ دیکھو کیا ہوتا ہے' میرا خیال ہے کہ ہفتے دو ہفتے دس دن میں دوبارہ وہاں جائیں گے"۔

"تم بمبئی کب چل رہے ہو؟"

"کیوں' مجھے نوکری سے نکلوانا ہے کیا؟"

"یار' میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں نوکری کی ضرورت ہی کیا ہے اور وہ بھی آثار قدیمہ جیسے بور محکمے میں"۔

"میں بڑی اچھی جگہ نوکری کر رہا ہوں طیب' یہ میری نااہلی تھی کہ میں نے وہاں موجود اسرار سے واقفیت حاصل نہیں کی۔ اب میں ٹھیک سے نوکری کروں گا۔ زیوسا کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کروں گا تاکہ پتا تو چلے کہ یہ یونان سے اتنی دور' یہاں آخر کیا کر رہی ہے؟"

"اپنا جوڑا تلاش کر رہی ہے۔ وہ یونانی فلسفہ نہیں سنا تم نے کہ مرد' عورت جسمانی طور پر شروع میں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے۔ دیوی دیوتاؤں سے نافرمانی پر انہیں سزا کے طور پر ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیا گیا اور کہا گیا بلکہ بددعا دی گئی کہ جاؤ' اب تم لوگ ساری زندگی اپنا وہ حصہ تلاش کرتے رہو گے جو علیحدہ کیا گیا ہے اور بھٹکتے رہو گے۔ وہ جنہیں ان ہی کا حصہ مل جاتا ہے' ان کی زندگی مثالی ہوتی ہے۔ گویا وہ دیوتا کے کرم حاصل کر لیتے ہیں اور وہ جو محفوظ نہیں رہ سکے' ساری زندگی بے جوڑ شادیاں کر کے خود بھی برباد ہوتے ہیں اور سامنے والے کو بھی برباد کرتے ہیں"۔ طیب نے دلچسپ کہانی کے طور پر بتایا۔

"بڑی معلومات ہیں تمہیں.........." میں ہنسا۔

"حالانکہ میں نہ یونان گیا ہوں' نہ کوئی دیوی مجھ پر عاشق ہوئی ہے اور نہ ہی آثار قدیمہ کے دفتر میں ملازم ہوں"۔ اس نے رعب ڈالا۔

"میرا خیال ہے' تمہیں پڑھنے پڑھانے سے بھی دلچسپی نہیں ہے پھر کیسے علم ہوا؟"

میں مطمئن تھا کہ اب اس کی ذہنی رو کا رخ تبدیل ہو چکا تھا۔

"یہ فلسفہ میں نے کسی سے سنا تھا اور گرہ میں باندھ لیا تھا۔ سب سے پہلے میں نے اسے موہنی پر اپلائی کیا۔ اسے بتایا کہ یونانی فلسفے کے مطابق میں اپنے حصے کی تلاش میں ہوں اور مجھے کچھ کچھ ایسا لگ رہا ہے کہ میں کامیاب ہونے والا ہوں' کیونکہ میرا گمشدہ حصہ تم ہو"۔ میں زور سے ہنس پڑا۔ "کیا کہا اس نے؟"

"کہنے لگی' مگر میرا گمشدہ حصہ گھر پر آرام کر رہا ہے"۔ اس نے منہ بنا کر جواب دیا مگر دوسرے ہی لمحے وہ پھر پرجوش ہو کر قریب سرک آیا اور بولا۔ "جب یہی بات میں نے جیہ سے کی تھی' تو وہ مجھے غور سے دیکھنے لگی تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہ اس بارے میں ضرور سوچے گی اور پھر ایک نہ ایک روز اس پر بھی یہ انکشاف ضرور ہو گا کہ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ اس کا گمشدہ حصہ میں ہی ہوں۔ وہ آئے گی' گھٹنوں کے بل بیٹھ جائے گی اور کہے گی' طیب دیوتا مجھ پر مہربان ہو چکے ہیں۔ میں تمام زندگی تمہارے چرنوں میں گزارنے کو آ گئی ہوں۔ جیون بھر تمہاری سیوا کروں گی اور تمہارے نام کا سیندور اپنی مانگ میں بھر کر عہد محبت نبھاؤں گی۔ تم ہی میرے پریتم ہو۔ تم ہی ہو میرے.........." وہ آنکھیں بند کر کے دونوں ہاتھ جوڑے میرے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھا تھا۔

"وہ ہندی میں کہے گی یہ سب کچھ؟" میں نے ہنس کر پوچھا مگر اس کی پوزیشن میں کوئی فرق نہیں آیا' وہ کہہ رہا تھا۔

"میں مندر میں جا کر ان گھنٹیوں کو اس وقت تک بجاتی رہوں گی میرے پریمی! جب تک بھگوان مجھے تمہارے قدموں میں نہیں لا ڈالے گا۔ میں بھگوان کے سامنے آنسو بہا کر' اس کی منتیں کر کے تمہیں حاصل کر لوں گی"۔ وہ اسی انداز میں کہہ رہا تھا۔ "میرے پریمی! میرے میت! میرے پیا.........!"

عین اسی لمحے منے دادا کمرے میں داخل ہوئے۔ پتا نہیں' انہوں نے طیب کے جملے سنے یا نہیں' اسے اس پوزیشن میں دیکھ کر وہ البتہ بھونچکے رہ گئے۔ میں گڑبڑا کر رہ گیا

مگر اس سے پہلے کہ کچھ کہتا' وہ گرجدار آواز میں بولے۔

"اس نے مذہب بھی تبدیل کر لیا ہے کیا؟"

اس آواز نے بم کا سا کام کیا۔ طیب اچھل کر ایک ہی جست میں کھڑا ہو گیا۔

"وہ.......... نہیں دادا.........! میں تو ایک فلم کی اسٹوری سنا رہا تھا۔ اس کی ہیروئن اسی طرح بیٹھ کر اپنے پریتم سے.........."

"خاموش' نانہجار.........! فلمیں بھی دیکھتا ہے اور پھر انہیں عملی طور پہ مسخروں کی سی حرکتیں کر کے سناتا بھی ہے"۔

میں چپکے سے کمرے سے باہر نکل آیا۔ مجھے یقین تھا کہ ابھی کچھ دیر بعد طیب ہاتھ میں اٹیچی لیے منہ لٹکائے باہر نکلے گا اور ناک سڑکتا ہوا باہر چلا جائے گا یا اسے منے دادا کان سے پکڑے باہر لائیں گے اور خود بیرونی دروازے تک چھوڑ کر آئیں گے۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ وہ خود بمبئی جانے والی ٹرین میں بھی بٹھا کر آئیں۔

مگر بہت دیر تک کوئی باہر نہیں آیا۔ میں جو منتظر تھا' پہلے حیران ہوا' پھر میرے تجسس نے بے چینی کا روپ دھار لیا۔ اندر کمرے کی طرف سناٹا محسوس ہو رہا تھا۔ باہر بھی کوئی نہیں تھا۔ پتا نہیں منی دادی' دادی اور اماں وغیرہ کہاں تھیں۔ دن کا وقت تھا۔ آنگن میں دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے حیرت سے چاروں طرف دیکھا پھر اٹھ کر اماں کے کمرے کی طرف چل دیا کہ شاید اماں' دادی اور عصمت آپا وغیرہ وہاں ہوں۔ میں نے جونہی دروازہ کھولا' میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

وہاں گھر کا کوئی فرد نہیں تھا یعنی.......... وہ کمرا ہی نہیں تھا بلکہ یقین کیجئے۔ وہ گھر ہی نہیں تھا۔ میں نے باہر سے جو قدم کمرے کے اندر رکھا تھا' وہ کمرا اماں کا تھا نہ میرے گھر کا۔ وہ وتسلا کا کمرا تھا۔ وہاں وہی نیم تاریکی تھی۔ جالی دار پردے سے چھن کر آتی ہوئی باہر کی ملگجی روشنی اور اس روشنی میں وتسلا اپنے چوڑے پلنگ پر اپنے بھدے جسم پر ?? لئے' آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی۔ اس کے بھدے ہونٹ برابر ہل رہے تھے۔ وہ میری آمد سے قطعی بے خبر تھی۔ وہ باخبر ہوتی بھی کیسے' میں کب اس کے پاس گیا تھا۔ میں تو ایک ?? تھا' اس سے پہلے کہ میرے منہ سے تحیر خیز یا دہشت ناک قسم کی کوئی آواز نکلتی' میں نے اپنے جسم کو پیچھے کی طرف جھٹکا دیا۔ یہ باہر نکلنے کی غیر شعوری کوشش تھی۔ میں باہر نکل گیا اور یہ دیکھ کر سخت حیران ہوا کہ میں وتسلا کے گھر کے باہر ہی تھا۔ وہی پتلی سی گلی'

وہی سڑک پر لگا لیمپ پوسٹ' وہی سر اٹھائے کھڑی چرچ کی بوسیدہ عمارت جو اتنی بوسیدگی کے باوجود پُر وقار اور پُر شکوہ تھی۔

میں چکرا کر رہ گیا۔ میں اپنے گھر میں تھا۔ اپنے کمرے سے ابھی ابھی نکلا تھا۔ لان کے کمرے میں داخل ہوا تھا پھر............؟ یہ کیسا طلسم تھا کہ میرا گھر وتسلا کے گھر میں تبدیل ہو چکا تھا۔ دن کا وقت تھا' سورج ابھی سر پر نہیں آیا تھا مگر اس کی تپش اردگرد کے ماحول کو تپائے ہوئے تھی۔ اب وہ ہی راستے تھے۔ میں وتسلا کے کمرے میں داخل ہو جاؤں اور اس کی اس طلسمی مصروفیت اور کیفیت کے ختم ہونے کا انتظار کروں یا گلی کا موڑ کاٹ کر گھر جاؤں مگر میرا دل چاہا کہ میں رکوں۔ اب کسی نہ کسی طرح پہنچ ہی گیا ہوں (ظاہر ہے اس اسرار کا بھید پانے کی خواہش نے میرے قدم روک لئے تھے) تو سب کچھ معلوم کر کے جاؤں۔ میں ایک بار پھر وتسلا کے گھر میں داخل ہو گیا۔ وہ اب بھی آنکھیں بند کئے کچھ پڑھ رہی تھی۔ اچانک اس نے اپنا بایاں ہاتھ بڑھا کر مجھے رکنے کا اشارہ کیا یوں جیسے وہ بند آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی ہو۔ مجھے دوبارہ باہر چلے جانے سے روک رہی ہو۔ میں نے وہیں رکھے ایک لکڑی کے اسٹول پر خود کو ٹکا دیا اور وتسلا کا گہری نگاہوں سے جائزہ لینے لگا۔

کمرے میں گہرا سناٹا تھا۔ ہر چیز ساکت تھی صرف وتسلا کا پھولا ہوا پیٹ' سانس کے زیر و بم سے ہل رہا تھا یا اس کے موٹے اور بھدے ہونٹ جو زندگی کی موجودگی کا بھرپور احساس بنے ہوئے تھے۔ پیٹر نہیں تھا۔ میں اس کی خیریت کے لئے بھی بے چین تھا۔ آخری بار میں نے اسے بہت بری حالت میں دیکھا تھا۔ میرے اندر بھی گہرا سناٹا چھا گیا۔ میں اس وقت نہ کچھ سوچ رہا تھا' نہ ہی کچھ سوچنے کی خواہش تھی۔ بس دیکھ رہا تھا۔ اچانک وتسلا نے آنکھیں کھول دیں۔ مجھے سامنے پا کر وہ بے ساختہ مسکرا دی یوں جیسے اس کی کوئی تمنا پوری ہو گئی ہو یا وہ مجھے ہی حاضر کرنے کا منتر پڑھ رہی ہو۔

"تم آ گیا مین!" وہ اونچے تکیے سے ٹکتے ہوئے بولی۔

"ہاں.........! کیا تم یہی عمل کر رہی تھیں؟"

"نہیں! ام پیٹر کا واسطے عمل کرتا تھا۔ تم یہاں آ جاؤ۔" اس نے بیڈ کے اس طرف اشارہ کیا جہاں جگہ تھی۔

"پیٹر کیسا ہے؟" میں نے اس کی ہدایت کو نظر انداز کر کے اسٹول ذرا قریب

سرکا لیا۔

"ٹھیک ہے' ڈونٹ وری بوائے.........! دو دن کے بعد وہ ہوا کے مافق تانگا چلائے گا۔"

وہ آج بڑے موڈ میں تھی' خوش تھی۔ اب میں سوچ رہا تھا کہ اسے بتا دوں کہ میں مسافت طے کئے بغیر یکلخت یہاں پہنچا ہوں۔ جھانکا امان کے کمرے میں تھا اور پہنچا یہاں مگر میں یہ سوچ کر چپ ہو گیا کہ ممکن ہے' وہ خوفزدہ ہو جائے۔

اس نے اپنا تکیہ درست کیا' کو لہو کو اوپر کی طرف ذرا سا سرکایا اور بولی۔

"ام انتظار کر رہا تھا۔ تم کدھر میں چلا گیا تھا؟"

"کیا تم زنجیروں والے سودے پر اب بھی تیار ہو؟" میں نے پھر اس کے سوال کو نظر انداز کر دیا۔

وہ خوش ہو گئی۔ "ہاں! کیا تم وہ لے کر آیا ہو؟"

"نہیں.........!" میں نے کہا۔ "اگر یہاں آنے کے لئے گھر سے نکلا ہوتا تو یقیناً ساتھ لے کر آتا۔"

"کیا مطلب.........؟"

"مطلب یہ کہ تم نے کبھی اچانک کسی کو کسی جگہ سے غائب ہوتے اور پھر کسی اور یعنی کسی دوسری جگہ نمودار ہوتے دیکھا ہے؟"

"ہاں' دیکھا ہے۔ کئی بار' روحوں کو یہ کمال حاصل ہے کہ وہ ایک جگہ دکھائی دیں یا غائب ہو کر کہیں اور دکھائی دینے لگیں۔"

"میں روحوں کی نہیں' انسانوں کی بات کر رہا ہوں۔"

"ہوں!!!"

وہ پہلے چونکی پھر کچھ سوچنے لگی۔ میں خاموش رہا' یہی سمجھا کہ وہ اپنے علم سے [illegible] کیا جاننا چاہ رہی ہے مگر جب وہ بولی تو میں کوفت میں مبتلا ہو گیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"ہاں! ایسا بھی ایک بار ہوا تھا۔ اس وقت ہم چھوٹا سا تھا۔ ادھر اسکول کا فنکشن تھا۔ وہاں ایک شعبدے باز آیا تھا۔ اس نے لوہے کے بڑے بڑے گولے کھائے تھے۔ منہ سے بہت سے رنگین کاغذ نکالے تھے اور پھر اچانک کھڑے کھڑے غائب ہو گیا تھا۔ سب بچے شور مچانے لگے۔ کچھ حیرت سے اور کچھ خوف سے امارا ٹیچرز لوگ بھی ڈر گئی تھیں۔

پھر وہ شعبدے باز اسٹیج پر نہیں بلکہ ہم سب کے پیچھے دکھائی دیا تھا۔ اس کے ان شعبدوں کو لوگوں نے پسند کیا تھا۔"

"وتسلا! میں کسی شعبدے باز کی بات نہیں کر رہا۔ کیونکہ میں شعبدے باز نہیں ہوں۔" میں نے جھنجلا کر جواب دیا۔ "تم سنجیدہ نہیں ہو' کہیں تم اپنے وعدے سے پھرنے کی صورت میں فضول باتوں سے مجھے بہلا تو نہیں رہیں؟"

اس نے غور سے مجھے دیکھا۔ اب وہ سنجیدہ دکھائی دے رہی تھی۔ "کیا بات ہے مسٹر ضیا! کیا کوئی سیریس قسم کا بات ہے؟"

"ہاں' اگر تم سننا پسند کرو تو؟" میں نے زہریلے لہجے میں جواب دیا۔ وہ ہمہ تن گوش ہو گئی۔ میں نے تمام معاملہ اسے کہہ سنایا۔ شالی بابا کی بات کا حوالہ بھی دیا۔ وہ خوش ہو گئی۔

"مین! وہ بابا ٹھیک بولتا ہے۔ ایک دم کریکٹ۔"

"ہاں! اب مجھے یقین ہو چکا ہے کہ شالی بابا درست کہتے ہیں۔ مجھے یقیناً وہی کرنا چاہئے جو وہ کہہ چکے ہیں مگر.......... میں وہ زنجیر تمہیں دے کر بھی زیوسا سے چھٹکارا نہیں پا سکتا۔ شالی بابا بھی اس کے آگے خود کو بے بس سمجھ رہے ہیں۔ اور تم خود اس بات کا اقرار کر چکی ہو کہ ان زنجیروں کو تمہیں دینے کے بعد صرف الین کی شیطانیوں سے مجھے پناہ مل سکے گی اور یہ پناہ تم مجھے دو گی۔ زیوسا اسی طرح مجھ پر حاوی رہے گی۔ وہ زیوسا جسے میں قطعی نہیں جانتا۔ وہ زیوسا جس نے بچپن سے مجھے اپنی گرفت میں لیا ہوا ہے۔ وہ زیوسا جو بقول اس کے' میرے عشق میں مبتلا ہو چکی ہے۔ بقول شالی بابا کے' اس نے ہزار بار میری مدد کی ہے۔ مجھے خطرات سے نکالا ہے اور وہ زیوسا جس نے میرٹھ میں مجھے دھوکا دے کر مجھ سے گھناؤنا کھیل کھیلا مگر آج تک وہی زیوسا میرے سامنے نہیں آئی' کیوں؟ جب میں زیوسا کے اسرار میں گھرا ہی رہوں گا تو الین کی شیطانیوں سے پناہ حاصل کر کے کیا کروں گا؟ اگر الین زیوسا کو قابو کرنا چاہتی ہے تو میں زنجیروں کو الین کی [illegible] دونوں ہی سے نجات کیوں نا حاصل کر لوں؟ جب بقول شالی بابا کے' جینو' چپاس' [illegible] سنگھ اور [illegible] برٹ کو اپنے کیے کی سزا بھگتنی ہی ہے۔ میں ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ ظاہر ہے کہ میں اپنے باپ' جیشرا اور ان لوگوں کو بھی ہمیشہ کے لئے کھو چکا ہوں جو زیوسا کی وجہ سے الین کے یا الین کی وجہ سے زیوسا کے شکار ہو چکے ہیں اور پھر.........."

میں چند لمحے کو سانس لینے کو رکا۔ وتسلا پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کا رنگ سفید پڑ چکا تھا۔ میں سخت غصے میں تھا۔ لہو میری کن پٹیوں پر جیسے ٹھوکریں مار رہا تھا۔ وتسلا نے غالباً کچھ کہنے کے ارادے سے تھوک نگل کر منہ کھولا ہی تھا کہ میں پھر بول اٹھا۔

"میری بات پوری نہیں ہوئی وتسلا! مجھے یہ اطلاع بھی مل چکی ہے کہ اب میری زندگی کے تمام اہم فیصلے زیوسا کرے گی۔ مجھے کسی عورت سے قریب نہیں ہونا ہے۔ مجھے کسی سے شادی نہیں کرنی ہے۔ مجھے کسی سے عشق نہیں کرنا اور جانے کیا' کیا.......... کیوں؟ وہ کون ہوتی ہے میرے بارے میں فیصلے کرنے والی۔ وہ خود کیا ہے' مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم اور سنو وتسلا! میں نہیں جانتا کہ تمہارے اس سے کیسے تعلقات ہیں مگر وہ جب بھی تمہیں ملے اسے بتا دینا کہ جس شخص کا نام ضیا ہے' وہ فولاد کا بنا ہوا ہے۔ موت کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ میں صاحب ایمان ہوں اور یقین رکھتا ہوں۔ وہ دنیا کا مضبوط ترین شخص ہوتا ہے جو صاحب ایمان ہو۔ سمجھیں تم! تم' الین اور زیوسا تینوں اپنی ڈرامے بازیاں بند کر دو ورنہ.......... ورنہ.........."

مین.........! او مین.........! پلیز بیٹھو.........! بیٹھ جاؤ.........! وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میں غصے میں کھڑا ہو چکا تھا اور پھر.......... میں اور وہ دونوں ہی چونک اٹھے۔ وہ کھڑی تھی' وہ جو معذور تھی' اٹھنے کے قابل نہیں تھی' وہ کھڑی تھی۔ اپنے موٹے' بھدے اور بدہیئت جسم کو اپنے پیروں پر اٹھائے ہوئے کھڑی تھی۔

"اوہ.........! ضیا.........! مسٹر ضیا! تم نے دیکھا.......... دیکھا تم نے.........؟" وہ اچانک خوشی سے کانپنے لگی۔ "یہ سب.......... یہ سب اسی کی وجہ سے ہے۔ اسی زیوسا کی وجہ سے۔"

میری کیفیت سے وہ بے نیاز ہو چکی تھی۔ میرے اشتعال' میرے غصے کو بھول کر وہ خوشی میں مست ہو چکی تھی۔ تب مجھے وتسلا سے بھی نفرت محسوس ہوئی۔ اس نے اس لمحے جبکہ میں سخت مشتعل تھا' انتہائی درجے کی خود غرضی سے کام لیا تھا۔ میں نے اس اسٹول کو ٹھوکر ماری جس پر چند لمحے پہلے میں بیٹھا ہوا تھا۔ وتسلا گھبرا کر مجھے دیکھنے لگی اسے فوری طور پر احساس ہو گیا کہ اس نے جو حرکت اس لمحے میں کی ہے' وہ سراسر

غلط تھی۔

"آئی ایم سوری مین..........! ریئلی سوری..........! تم بیٹھو..........! پلیز..........! تم..........! شاید معاملے کی سنگینی کو محسوس نہیں کر رہے ہو۔"

"میں معاملے کی سنگینی کو خوب سمجھ رہا ہوں میڈم وتسلا! تم اور وہ شیطانی قوتیں انسانوں کے بے وقوف بنا کر وپنے آپ کو لازوال کرنے کے خبط میں مبتلا ہو۔"

"مین! تم پوری بات سن لو۔ تم جو ہم کو بلیم کرتا ہے' ام کو موقع دو۔ پلیز ایک بار پوری بات سن لو پھر جو دل چاہے کرنا۔"

وہ گھگھیانے لگی۔ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ میرا جی تو چاہا تھا کہ اسے ایک جھٹکے سے اس جھلنگے بیڈ پر دھکا دے کر گرا دوں اور خود وہاں سے نکل آؤں مگر جانے کیا بات تھی' کس چیز کا خوف تھا جس نے میرے قدم تھام لئے تھے۔ میں وتسلا پر رعب ڈال رہا تھا' غصے میں اپنے آپ کو بہت مضبوط بھی ظاہر کر رہا تھا مگر میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ جو کچھ میرے ساتھ ہو تا رہا تھا اور جو چند لمحے پہلے ہوا تھا کہ میں بے ہوش وحواس اپنے گھر کے دالان میں تھا۔ اماں کے کمرے میں داخل ہوا تھا اور یہاں پہنچ گیا تھا۔ یہ واقعہ.......... اکیلا یہی واقعہ مجھے اندر تک جھنجھوڑ دینے کو کافی تھا۔ میں ہل چکا تھا۔ میں خوفزدہ تھا اور شاید اسی خوف سے چھٹکارا پانے کے لئے وتسلا پر چیخ رہا تھا۔ وتسلا کے ہاتھ تھامتے ہی مجھے لگا جیسے میرے اندر کہیں گھات لگائے بیٹھے خوف نے مجھے پورے کا پورا اپنی گرفت میں لے لیا ہو۔ لمحہ بھر کے لئے میری ٹانگیں کانپیں اور میں دوبارہ اسٹول پر ڈھے گیا۔

"مین! کیا تم جانتا ہے کہ زیوسا کون ہے؟"

چند لمحے مجھے غور سے دیکھتے رہنے کے بعد وتسلا نے دھیرے سے پوچھا۔

"اگر میں یہ جانتا تو اب تک اسے نیست و نابود کر چکا ہوتا۔" میں نے دانت کچکچا کر کہا۔ مگر میرے لہجے میں بے پناہ بے بسی تھی جسے شاید وتسلا نے محسوس نہیں کیا لیکن میں خود اپنی اس بے بسی پر اندر ہی اندر رو پڑا تھا۔

"دیکھو مین! ہماری باتیں غور سے سنو! ریلیکس ہو کر۔ اگر مینٹلی مینٹل ہو کر سوچو گے تو فیصلہ بھی مینٹلی مینٹل ہو کر کرے گا اور یو نو' کہ ایسا فیصلہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔ ہم سچ بولتا ہے۔ فیتھ سب سے بڑا قوت ہے مگر فیتھ کے لئے صرف ہارٹ ہی نہیں' اپنا

مائنڈ بھی پازیٹو ری ایکٹ کرتا ہو تبھی فیتھ پاور فل ہوتا ہے۔ ناؤ آر یو ریلیکسڈ؟"

میں اس کی باتیں غور سے سن رہا تھا اور واقعی اب پُرسکون تھا۔ شاید اس لئے کہ وہ بہت بول رہا تھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کے موٹے اور بھدے ہونٹوں پر آسودہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے مجھے ایسی نگاہوں سے دیکھا جس میں تشکر بھی تھا اور رحم بھی' التجا بھی تھی اور اطمینان بھی پھر شاید وہ خود کو پُرسکون کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس نے سرہانے کی ٹیبل پر رکھی بوتل میں سے گلاس بھر کر پانی پہلے مجھے دیا پھر خود پیا۔ گلاس رکھنے کے بعد وہ چند لمحے فرش کو تکتی رہی جیسے بولنے کے لئے مناسب الفاظ کا چناؤ کر رہی ہو۔

میں اس مختصر خاموشی میں بھی الجھ گیا۔ لگا جیسے بہت زیادہ وقت گزر گیا ہو۔ کھنکار کر وہ چونک اٹھی اور پھر جو کچھ اس نے مجھے بتایا' اس کا خلاصہ یہ تھا کہ دنیا کی قدیم قوموں میں جب افسوں طرازی کا دور شروع ہوا تو دو دیویوں نے خصوصی اہمیت حاصل کی جن میں اولاً "عشتار" تھی اور دوسری "اریش کی گل" عشتار موسم بہار کی نمائندہ ہے جس میں پھول کھلتے ہیں' درختوں میں کونپلیں پھوٹتی ہیں اور فصلیں لہلہاتی ہیں۔ اس کے برعکس اریش کی گل موسم سرما کی نمائندہ دیوی ہے جب درخت اور پودے اجڑ جاتے ہیں۔ ہر طرف خزاں پھیل جاتی ہے۔ زمین سے ہریالی ختم ہو جاتی ہے اور موسم کی اس تبدیلی کا اثر انسانی نفسیات پر بہت گہرا ہوتا ہے۔ انسانی کیفیات بھی تبدیل ہو کر انتشار غصے اور بیزارگی میں ڈھل جاتی ہیں۔ جب انسان زمین پر آباد ہوا اور زرعی دور میں اس نے قدم رکھا تو وہ موسمی تغیرات کے اصل اسباب سے واقف نہیں تھا۔ اس کے لئے خزاں اور بہار کی یہ آمدورفت حیرت انگیز واقعے کی حیثیت رکھتی تھی کہ اچانک ان کے لگائے ہوئے پودے مرجھا کر بے ثمر ہو جاتے اور کبھی اچانک ہی وہ لہلہا کر پھل دینے لگتے۔ چنانچہ سمجھ میں نہ آنے والی اس تبدیلی کی توجیہہ انہوں نے اس طرح کی کہ بہار' محبت اور خوشحالی کو تو حسن اور افزائش کی دیوی سے تعبیر کیا اور خزاں کو موت' ظلمات اور اشتعال کی دیوی سے۔ قدیم انسانوں کے عقیدے میں ظلمات دنیا زیر زمین واقع تھی۔ محبت اور بہار کی دیوی آسمانوں سے زمین پر اتر کر اپنا حسن' محبت اور حسین جذبات کو دور دور تک پھیلا دیا کرتی تھی اور بہار کی دیوی کے مہربان ہونے کا مطلب تھا خوشحالی' خواہ وہ نباتات میں ہوں' حیوانات میں یا انسان میں..........

یونانی دیومالا میں عشتار یعنی محبت کی دیوی ''ایفروڈتی'' ہے جبکہ اریش کی گل' زیوسا ہے۔ عشتار اصل میں اکادی اور اشوری قوموں کی تخلیق کردہ دیوی ہے جو اریش کی گل کی سگی بہن ہے۔ مصر میں: ازیس' تحوت اور حتمور ہے۔ فلسطین میں انات اور عشتروت' ایران میں شالا' اناہستا اور نانیا ہے۔ ہندوستان میں درگا' گوری' اوشا' سرسوتی اور رادھا ہے۔ عربوں میں زہرہ اور مشتری ہے جنہوں نے ہاروت اور ماروت کو اپنے دام محبت میں گرفتار کرکے اسم اعظم معلوم کرلیا تھا اور ستارہ بن کر آسمان پر چلی گئی تھیں۔

تمام قدیم داستانوں میں عشتار' ''اتو'' یعنی سورج کی سگی بہن بتائی گئی ہے۔ اریش کی گل جو یونانیوں میں زیوسا ہے' ایرانیوں میں شر کی قوتوں کے حوالے سے مذکر کی شکل میں اہرمن کے نام سے جانی جاتی ہے اور ہندوؤں میں کالی مائی ہے۔ کنعانی دیومالا میں ایل کی بیوی کا نام عاشطرہ (عشتار ہے) عاشطرہ کے بطن سے ایل کی تین اولادیں ہوئیں۔ بعل' موت اور انات! موت' جو بعل کا سگا بھائی اور اس سے سب خوف کھاتے تھے' اس نے ایک روز بعل کو ہلاک کروایا تھا۔ یہی موت' یونانیوں میں مونث کی شکل میں زیوسا کے نام سے جانا جاتا ہے اور اسی حساب سے یہاں زیوسا کی تمام تر صفات موت میں پائی جاتی ہیں۔

یہ سب کچھ مجھے وتسلا نے انگریزی میں بتایا تھا۔ میں گنگ بیٹھا اس قدیم دیومالائی داستان کو سن رہا تھا۔ وہ عقائد جو اربوں برس پہلے کے انسان نے ظاہری تبدیلیوں' موسمی تغیرات' انسانی جذبات کی تبدیلی' موت اور حیات جیسے حیرت انگیز واقعات دیکھ کر انہیں دیوتاؤں کا درجہ دے کر نام دے دیئے تھے۔ وہ آج کے جدید دور میں بھی تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ جوں کے توں موجود تھے۔

اس تمام داستان میں گو میری معلومات کے لئے بہت کچھ تھا مگر اس وقت مجھے صرف زیوسا سے دلچسپی تھی۔ زیوسا جو خزاں کی دیوی تھی' جس میں تمام تر کیفیات موت کی تھیں' تباہی کی تھیں۔

''مسٹر ضیاء!''

مجھے وتسلا نے چونکا دیا جو ساری داستان سنا کر بہت دیر بعد خاموش ہوئی تھی! اب اپنا سانس بحال کر رہی تھی۔

''ہاں!'' میں چونک اٹھا۔

''اسے میں تمہاری بند لک کہوں گی۔ تم پر عاشق ہونے والی دیوی انتہائی بدصورت ہے۔ تباہی لانے والی' نفرتوں ایسے خوفناک جذبوں سے محبت کشید کرنے والی' کیا تمہیں اندازہ ہے کہ اس کی محبت جسے وہ محبت کہتی ہے' وہ کیسا انوکھا' کیسا سفاک اور کیسا سرد جذبہ ہوگا! کتنا بدہیبت' کس قدر اذیت ناک اور تباہ کردینے والا لگاؤ۔ یسوع مسیح تم پر رحم کرے۔ مسٹر ضیاء' ایسا بہت کم ہوا ہے کہ زیوسا کسی پر عاشق ہوئی ہو اور اس نے اپنے معشوق کو اذیت نہ دی ہو۔''

''لیکن وتسلا تم اب سے پہلے مجھے یہ باور کرا چکی ہو کہ زیوسا نے مجھے کئی بار خطرات سے نکالا ہے' میری تکلیفوں کو دور کیا ہے' مجھے الین کی تباہ کاریوں سے بچایا ہے اور.........''

''ہاں مسٹر ضیا! میں نے یہ کہا تھا۔'' اس نے میری بات کاٹ کر جواب دیا۔ ''اور اب بھی اپنی بات پر اصرار کروں گی۔ اس نے ہمیشہ تمہاری مدد کی ہے' الین سے بچایا ہے اور ہزاروں ایسی تکلیفیں ہوں گی جو محض اس کی وجہ سے تم پر نہیں آئیں مگر.........''

وہ اتنا کہہ کر بڑے پراسرار انداز میں چپ ہوگئی۔ جیسے جو کہنا چاہتی ہو اس کی سنگینی کا احساس اسے اچانک ہوا ہو۔ ''مگر کیا؟'' میں اور قریب سرک آیا۔ ''بولو.........! بولو وتسلا!!''

اس نے گہرا سانس لے کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ ''مگر مسٹر ضیاء! وہ اپنے شکار کی حفاظت کے لئے ایسا کر رہی ہے۔ آئی مین کہ اس کی محبت کا مرکز تم ہو۔ اس کی محبت کتنی ہی سفاک کیوں نہ ہو' اس کے لئے تو ایک حسین جذبہ ہے اور تم اس کے اس حسین مگر سفاک جذبے کی تسکین ہو۔''

اتنا کہہ کر وہ خلاؤں میں گھورنے لگی۔ مجھے میرٹھ کی وہ رات یاد آگئی جو بہت حسین گزری تھی مگر آج وہ سب یاد کرکے میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔

''ہاں! البتہ اتنا ضرور ہے کہ تمہارے معاملے میں' میں اس میں کچھ تبدیلی محسوس کر رہی ہوں۔ کچھ لچک ہے' پراسرار سی نرمی' شاید یہ اس لئے ہے کہ تم نادانستگی میں' پہلے ہی اس سنہری لکڑی کی حفاظت کرچکے ہو۔ تم نے اسے نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی بلکہ تم نے اسے بہت سنبھال کر رکھا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اسی نرمی' تبدیلی اور لچک کا یہی ایک سبب ہوسکتا ہے۔ کیا تم میری بات سمجھ رہے ہو مین!''

''ہاں' شاید......... لیکن وتسلا! میں اس میں دلچسپی نہیں رکھتا۔ مجھے صرف اتنا بتاؤ

کہ زنجیریں تمہارے حوالے کر دینے سے میرا کیا فائدہ ہے؟ اگر زیوسا مجھ پر پھر حاوی رہے گی بلکہ میرا خیال ہے اگر میں وہ زنجیریں ایلن کی قبر تک پہنچا دوں تو ایلن بھی مجھے نقصان نہیں پہنچائے گی اور زیوسا تو اس کی قید میں جا کر یوں بھی بے بس ہو جائے گی۔ کیا خیال ہے؟" میں نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

وہ سفید ہو گئی۔ اس کی گدلی اور ویران آنکھوں میں خوف پھیل گیا۔ اس نے بے یقینی سے مجھے دیکھا جیسے میرے چہرے کے تاثرات سے میری بات کی سچائی کا اندازہ لگانا چاہ رہی ہو۔ وہ بے یقینی کی کیفیت سے نکلی تو مزید خوف زدہ ہو چکی تھی۔

"نہیں مسٹر ضیا! تم ایسا نہیں کرو گے۔"

اس کا لہجہ کھوکھلا تھا۔

"تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے مسٹر ضیاء!"

وہ ملتجی انداز میں بولی۔ "ایسا کر کے تم ایک خوفناک حرکت کرو گے۔ زیوسا ایک دیوی ہے' چاہے وہ سفاک ہو یا نفرت انگیز! اسے ایلن جیسی بدروح کے حوالے کرنا بہت بڑی تباہی کو دعوت دینا ہے۔ تم شاید سمجھ نہیں رہے۔ تم دنیا کے کسی خطے پر' کھلے آسمان کے نیچے' کہیں محفوظ نہیں رہو گے۔ اس لئے کہ زیوسا مختلف روپ میں جگہ جگہ موجود ہے۔ وہ ایلن کی گرفت یا قید میں جا کر بھی اپنی صفت نہیں بدل سکتی۔ تباہی اور موت کی تمام تر قوتیں اس کے تابع ہیں۔ پلیز.........! دیکھو' میں تمہیں سمجھا نہیں سکتی۔ میں خود کو بے بس محسوس کر رہی ہوں یا تم......... تم سمجھنا نہیں چاہتے۔ دیکھو' میری بات سنو۔"

وہ گھبرا گھبرا کر بول رہی تھی اور جانے وہ کون سی قوت تھی جو مجھے مضبوط کرتی جا رہی تھی۔ حالانکہ شاہی بابا بھی مجھے یہی مشورہ دے چکے تھے مگر میں آپ کو پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ میں کچے عقیدوں کا قائل نہیں تھا۔ مجھے لگا کہ شاہی بابا روحانیت کی اس منزل پر نہیں ہیں جس پر میں انہیں سمجھتا تھا۔ اگر زیوسا وہی تھی جس کی تفصیل میں تسلسل سے سن چکا تھا تو ان میں کہیں بھی مسلمانوں کے عقیدے کا کچا پن نہیں تھا۔ عربوں اور ایرانیوں کے عقائد میں دوسروں سے زیادہ حقیقت کا ادراک تھا مگر یہ کب کی بات ہے اور یہ کس شکل سے' کس حیثیت میں تبدیل ہو چکی ہے۔ یہ میں نہیں جانتا تھا اور جانے بغیر یقین کرنے کو تیار نہیں تھا۔

اب ست سما کردہ کالی مائی کی شکل میں میرے سامنے موجود تھی اور میں اس سے مرعوب ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اچانک میں کھڑا ہو گیا۔

"ٹھک......... کہاں جا رہے ہو.........؟"

"اپنے ایمان اور عقیدوں کی سچائی پرکھنے۔" میں نے انتہائی مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ وہ مجھے پکارتی رہ گئی اور میں نے اس کے کمرے سے باہر قدم رکھ دیا۔

☆---------------☆---------------☆

"مجھے تاریخ سے بے پناہ دلچسپی تھی منے دادا!"

یہ آواز طیب کی تھی جو دتسلا کے کمرے سے باہر قدم نکالتے ہی میرے کانوں میں پڑی تھی۔ میں اچھلا مگر فوراً ہی میں نے خود کو سنبھال لیا۔ اپنے اطراف کا جائزہ نگاہ بار گھمائے بغیر لے لیا۔ میں اپنے گھر کے آنگن میں بیچوں بیچ کھڑا تھا۔ یہاں منے دادا کے کمرے میں بچھا پلنگ صاف نظر آرہا تھا۔ طیب ان کے گھٹنے پکڑے بیٹھا تھا۔ وہ نیم دراز تھے۔ اماں کے کمرے سے سب کے باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں چند لمحے حیرت زدہ کھڑا رہا۔ اسی لمحے عصمت آپا چاول کی سینی لئے کچن سے باہر نکلیں اور یوں گزر گئیں جیسے انہوں نے مجھے دیکھا ہی نہ ہو۔ منے دادا کے دروازے پر رک کر وہ طیب کی باتیں سننے لگیں۔ طیب کہہ رہا تھا۔

"تاریخ سے دلچسپی ختم ہونے کی سب سے اہم وجہ انار کلی کو دیوار میں چنوا دینے والا واقعہ تھا منے دادا! مجھے بادشاہوں کے کردار بہت مشکوک لگے۔ شہزادہ سلیم کے باپ نے کیا کچھ نہیں کیا ہوگا' آپ خود سوچیں مگر........ شہزادے سلیم کے عشق کے معاملے میں وہ بالکل الو جیسا نکلا۔ ہر بات پر ٹوکنا' ہر بات پر اعتراض........ وہ کوئی بچہ تھا؟"

"اگر شہزادہ سلیم تمہارے جیسا تھا تو اس کے باپ نے بالکل ٹھیک کیا۔" یہ عصمت آپا تھیں جو نتھنے پھلا کر کہہ رہی تھیں۔ "وہی جو ناصر چچا کرتے ہیں تمہارے ساتھ۔"

"لیکن عصمت آپا! انار کلی کا کوئی قصور نہیں تھا۔"

"ہاں........! یہاں مجھے تم سے قطعی اختلاف نہیں ہے۔ اصل میں شہزادہ سلیم کو چنوانا چاہئے تھا۔"

منے دادا ان دونوں کی نوک جھونک سے محظوظ ہو رہے تھے اور میں یہی سوچ رہا تھا کہ میں جو بیچ آنگن میں کھڑا ہوں' کیا عصمت آپا کو دکھائی نہیں دیا؟ اس دوران جب طیب نے جب عصمت آپا کی طرف دیکھا تھا تو اسے کچھ فاصلے پر کھڑا میں بھی نظر آجانا

چاہئے تھا۔

"نہیں........! یہ غلط ہے۔ سلیم نے عشق کیا تھا اور عشق کرنا کوئی جرم نہیں ہے۔" طیب نے بلک کر احتجاج کیا۔

"تو پھر؟ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اس کا باپ دیوار میں چنوا دیا جاتا؟"

"ہاں! میرا یہی خیال ہے۔ وہ سماج کی دیوار تھا۔ دو پیار کرنے والوں کے درمیان اسے ہی دیوار کا حصہ بننا چاہئے تھا۔" طیب نے کہا۔

"اچھا چلو' منے دادا کو زیادہ مسکا لگانے کی ضرورت نہیں۔ آج تمہیں کوئی ایک ہفتہ ہو چکا ہے۔"

عصمت آپا نے گویا منے دادا کو یاد دہانی کروائی اور پُرامید نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگیں۔ اب مجھے شدت سے یہ احساس ہو رہا تھا کہ یا تو بیچ آنگن میں کھڑا کوئی درخت ہوں یا ستون۔ وہ سب میرے سامنے تھے اور مجھے نظرانداز کر رہے تھے۔ میں آگے بڑھا۔ جونہی میں نے ایک قدم بڑھایا' آپا' جو بالوں کی لمبی چوٹی کو جھٹکے سے پیچھے کر رہی تھیں' میری طرف دیکھ کر چونک اٹھیں۔

"کہاں چلے گئے تھے آپ؟"

"آں........! ہاں!" میں چونک کر آگے بڑھا۔ "کہیں نہیں' یہیں تھا۔"

"چائے لے کر سارے گھر میں پھرتی رہی........ بنا کر لاؤں؟" انہوں نے کچن کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا۔

"لے آیئے!" میں نے بوجھل لہجے میں جواب دیا اور منے دادا کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

"آؤ خیر! یوں بے بتائے کہاں چلے گئے تھے؟" منے دادا نے سرسری انداز میں پوچھا۔

"یہیں تھا منے دادا........! لیکن........ پھر بھی یہاں نہیں رہا۔"

"کیا مطلب؟" منے دادا نے حیرت سے پوچھا۔

"اس کی فیلنگس اتنی ہی پیچیدہ ہوتی ہیں منے دادا! اسے خود بھی نہیں پتا چلتا کہ کیا ہے یا کیا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج ایک انار کلی ایسی ضرور پیدا ہو چکی ہوتی جو بخوشی اس کے لئے خود کو دیوار میں چنوا لیتی۔"

"کاش! وہ انار کلی تم ہوتے!" عصمت آپا نے کچن سے ہانک لگائی۔

عصمت آپا اور طیب کی یہ نوک جھونک مجھے کچھ ایزی کر رہی تھی۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ ابھی چند لمحے جو کچھ میرے ساتھ ہوا ہے' کاش! وہ خواب ہو۔ منے دادا مجھے غور سے دیکھ رہے تھے۔ میں منے دادا سے پوچھنا چاہتا تھا کہ انہوں نے مجھے کب سے نہیں دیکھا مگر طیب کے سامنے بات کرنے کا مقصد یہی تھا کہ اسے اپنے پیچھے لگا لیتا۔

شاید منے دادا نے محسوس کر لیا کہ میں کسی الجھن میں ہوں۔ انہوں نے طیب سے کہا کہ وہ جا کر جامن لے آئے۔ یہ جامن زمینوں سے آیا کرتے تھے اور اماں نے ایک کمرے میں انہیں پھیلایا ہوا تھا تاکہ خراب نہ ہوں۔ طیب جانے لگا تو منے دادا نے کہا۔

"طیب! میرا خیال ہے' تم اچھے اچھے جامن چن کر ٹھنڈے ہونے کو رکھ دو۔ ہم شام کو کھائیں گے۔ فی الحال میں آرام کروں گا۔"

وہ چلا گیا۔ عصمت آپا اب بھی کچھ کہہ رہی تھیں مگر اب میرا ذہن الجھ گیا تھا۔ میں گزرے لمحات کو یاد کر رہا تھا۔

"ہاں ضیاء! اب بولو' کیا بات ہے؟ کچھ گڑبڑ ہے کیا؟"

میں نے ساری بات منے دادا کو بتا دی۔ "پتا نہیں' منے دادا یہ سب کچھ سچ تھا' حقیقت تھا یا خواب؟"

"تم تصدیق کر سکتے ہو۔ وتسلا سے مل لو۔"

میں نے چونک کر منے دادا کو دیکھا۔ اتنی معمولی سی بات میرے ذہن میں نہیں آئی تھی۔ "ہاں! ٹھیک ہے۔"

"مگر سنو! کیا تم واقعی وہ زنجیریں وتسلا کو نہیں دینا چاہتے؟" منے دادا نے پوچھا۔

"کیا کروں گا دے کر منے دادا؟ میرا مسئلہ وہیں کا وہیں رہے گا۔ اگر واقعی وتسلا نے جو تاریخ بتائی ہے' وہ درست ہے تو وہ مجھے کالی مائی کے مندر میں بھی مل جائے گی اور کیا آپ کے عقائد میں اس کی کوئی حیثیت ہے؟ کیا میری زندگی کا فیصلہ اب "ذات بائی" دیوی کیا کرے گی؟ مجھے تو حیرت اور افسوس ہے کہ شالی بابا نے بھی مجھے یہی مشورہ دیا ہے۔ وہ بھی زیوسا کو میرا ہمدرد سمجھ رہے ہیں۔"

"نہیں بیٹا! ان کا مطلب یہ نہیں تھا بلکہ وہ تمہیں تباہیوں سے بچانے کے لئے ایسا کہہ رہے ہیں۔ شاید وہ اس کی طاقت سے مرعوب ہوں۔"

"زیوسا بذات خود تباہی ہے اور اگر شالی بابا جیسا آدمی اس کی طاقت سے مرعوب ہو سکتا ہے تو پھر آپ عام آدمی سے کیا توقع کر سکتے ہیں؟"

"میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ کاش! عطا نے یہ سب کچھ نہ کیا ہوتا۔"

"ہمیں ماضی کو کوسنے کی بجائے سامنے کھڑے خطرے سے نمٹنے کی تدبیر کرنا چاہئے منے دادا! اور میں وتسلا سے تصدیق بھی کیوں کروں۔ آپ کہہ رہے ہیں کہ آپ نے کافی دیر سے مجھے نہیں دیکھا تھا اور میں بتا رہا ہوں کہ میرے ساتھ یہ سب ہوا۔ مجھے یوں بھی اپنے ساتھ ہونے والے کسی بھی واقعے پر اچنبھا نہیں ہوتا۔ یہ سب بھی ضرور ہوا ہوگا۔ نہیں منے دادا! مجھے کچھ اور کرنا ہوگا' کوئی اور راستہ اختیار کرنا ہوگا۔"

"کیا کرو گے؟" ان کے لہجے میں خوف تھا۔

"آپ پریشان نہ ہوں۔" میں نے انہیں تسلی دی۔

"شالی بابا کی دی ہوئی مٹی آپ نے یقیناً یہاں بھی پھیلا دی ہوگی۔ میرٹھ کی کوٹھی کے بارے میں بھی جلد ہی آپ کو رپورٹ مل جائے گی۔ آپ چاہیں تو سب کو لے کر وہاں جا سکتے ہیں۔ میں البتہ سوچ سمجھ کر ہی کوئی فیصلہ کروں گا لیکن آپ فکر نہ کریں۔ میرے لئے کوئی خطرہ اہمیت نہیں رکھتا منے دادا! موت برحق ہے' میں خندہ پیشانی سے اسے خوش آمدید کہوں گا۔ وہ اس سے زیادہ مجھے کیا نقصان پہنچا سکتی ہے؟"

"خوف موت سے نہیں ہونا چاہئے ضیاء! مگر کیا تم جینو' رابرٹ اور سورن سنگھ کو بھول گئے ہو؟ ایسی اذیت ناک زندگی موت سے بدتر ہوتی ہے۔"

"منے دادا! مجھے اپنے خدا کی رحمت سے بڑی امیدیں ہیں۔ میں نے ایسا کوئی جرم نہیں کیا اسی لئے مجھے یقین ہے کہ خدا بنا جرم کئے سزا نہیں دے سکتا۔ وہ رحیم ہے' رحمان ہے۔ قہار وہ ان لوگوں کے لئے ہے جو اپنے قہر سے دوسروں کو نقصان پہنچاتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ ان پر بھی ایک قہار موجود ہے۔ آپ اللہ پر بھروسہ رکھیں۔ اس کی رحمت اور رحمانیت سے مایوسی کفر ہے۔"

"لیکن تم کیا کرنے والے ہو ضیاء! میرا دل گھبرا رہا ہے۔"

"میں جو کچھ بھی کروں گا منے دادا! آپ کو اعتماد میں لے کر ہی کروں گا۔ فی الحال تو میرے ذہن میں کچھ نہیں ہے۔ میں سوچنا چاہتا ہوں۔"

"آپ فکر نہ کریں۔" میں نے ان کے گھٹنوں کو چھوا اور کھڑا ہو گیا۔ باہر آیا تو

عصمت آپا طیب سے جھگڑ رہی تھی۔ وہ طیب سے کہہ رہی تھی کہ اب وہ مہمان نہیں ہے اس لئے چکی سے آٹے کی بوری بھی لانا ہوگی اور بازار سے سبزی گوشت بھی اور طیب انہیں اخلاقیات کی تفصیل بتانے کی سرتوڑ کوشش کر رہا تھا کہ عرب بڑے مہمان نواز تھے اور حضور ؐ نے بھی یہی درس دیا ہے کہ میزبانی کے فرائض خوش اسلوبی سے ادا کیا کرو۔

"ہم عرب نہیں ہیں اور پھر انہوں نے کچھ نہ کچھ مہمانوں کے بارے میں بھی کہا ہے جو فی الوقت مجھے یاد نہیں ہے لیکن میں اتنا جانتی ہوں کہ تم جیسے آدمی کی میزبانی قطعی اخلاقیات سے باہر کی چیز ہے۔"

میں انہیں جھگڑتا چھوڑ کر اپنے کمرے میں آگیا۔ میں جانتا تھا کہ عصمت آپا اب بہت جلد طیب کو بمبئی بھجوا کر ہی دم لیں گی۔ انہیں طیب سے اللہ واسطے کا بیر تھا۔ میں بستر پر نیم دراز ہوگیا۔ میں سوچنا اور فیصلہ کرنا چاہتا تھا مگر میرے سامنے کوئی ایسی راہ نہیں تھی جس پر آگے بڑھنے کا پلان بناتا۔ لے دے کر شالی بابا تھے یا دتسلا۔ اب دونوں ہی کے بتائے ہوئے راستے غلط محسوس ہو رہے تھے۔ میں کسی سے مشورہ کرنا چاہتا تھا مگر کس سے کرتا' میرے راز داروں میں منے دادا تھے یا طیب۔ طیب سے کسی معقول مشورے کی توقع عبث تھی۔ منے دادا کے پاس بھی ایک شالی بابا کی شخصیت کے سوا کوئی دوسری شخصیت نہیں تھی۔

میں سوچتا رہا۔ میرے دماغ میں مسلسل انتشار پھیلا رہا۔ اماں نے کھانے کے لئے بلوایا مگر مجھے بھوک نہیں تھی۔ میں نے منع کروا دیا۔ منے دادا نے مجھے نہ خود ڈسٹرب کیا' نہ طیب کو اس طرف آنے دیا۔ میں نے تمام دوپہر اور تمام سہ پہر بند کمرے میں گزار دی۔ اب شام ہو چکی تھی اور اب بھی میں نہ تو کسی نتیجے پر پہنچا تھا اور نہ ہی اس معاملے کو ذہن سے جھٹک پا رہا تھا۔

اسی طرح رات ہوگئی۔ رات میں اماں کھانے کے لئے بلانے آئیں۔ میرے انکار پر پہلے تو تشویش میں مبتلا ہوئیں پھر مجھے ٹھیک پا کر بڑبڑائیں بھی مگر میں نے انہیں مطمئن کر کے بھیج دیا۔ منے دادا نے اب بھی مجھے ڈسٹرب نہیں کیا۔ سوچتے سوچتے جانے کب سو گیا۔

☆------------------------☆------------------------☆

وہ لال اینٹوں کی بنی ہوئی کوئی بہت پرانی عمارت تھی۔ بے حد بوسیدہ جس کے طویل و عریض صحن میں خودرو جھاڑیوں کا جنگل سا بن گیا تھا۔ ان جھاڑیوں کے پیچھے سے عمارت کا اندرونی حصہ نظر آ رہا تھا۔ اونچے اور کھلے گیٹ کے اوپر محرابیں بنی ہوئی تھیں۔ بہت چوڑی چوڑی سیڑھیاں اور اندر کا نیم تاریک حصہ مجھ سے کچھ فرلانگ کے فاصلے پر تھا اور اس درمیانی فاصلے میں وہ جھاڑیاں تھیں۔ میں یہاں تک کیسے آیا' یہ تو کچھ یاد نہیں مگر مجھے اندر تک جانا ہے' اس کا احساس نہ معلوم مجھے کس نے دلایا تھا۔ کوئی مجھے اکسا رہا تھا۔ اندر جانے کی ترغیب دے رہا تھا۔ میں نے آخری بار اپنے اطراف کا جائزہ لیا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ یہ کون سی جگہ ہے۔ اب سے پہلے میں یہاں کبھی نہیں آیا تھا ورنہ یہ جگہ مانوس ضرور لگتی۔

یہاں دور دور تک کوئی دوسری عمارت تھی' نہ پکی سڑک۔ جگہ جگہ کیکٹس (Cactus) کے پودے تھے یا جنگلی پھلوں کے درخت۔ کوئی متنفس نہیں تھا۔ اب میں نے پھر گھوم کر اس لال عمارت کی طرف دیکھا۔ یہ عمارت ایسی تھی جیسے مغل شہنشاہوں نے اسے بنایا ہو۔ کسی کا محل یا مقبرہ ٹائپ کی عمارت۔ اس وقت مجھے قطعی یہ خیال نہیں آیا کہ مجھے واپس جانا چاہئے بلکہ میں یوں تھا جیسے میں آیا ہی اسی عمارت میں جانے کے لئے ہوں۔ ذہن شل تھا اور دل میں صرف ایک ہی خیال تھا کہ مجھے اندر جانا ہے۔ میں آگے بڑھنے لگا۔ یہ وہ وقت تھا جب شام ختم ہو کر اپنا ہاتھ رات کے تاریک ہاتھ میں دے رہی ہوتی ہے اس لئے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ دن ڈھل چکا تھا یا نکلنے والا تھا۔

سوکھے پتے میرے بوٹوں کے نیچے آکر چرچرا رہے تھے اور ان کی چرچراہٹ کی آواز دور دور تک پھیل رہی تھی جس نے گہرے سناٹے کے احساس کو اور شدید کر دیا تھا۔ میں جھاڑیوں کو سامنے سے ہٹاتا' نگاہ اس عمارت کے نیم تاریخ اندرونی حصے پر جمائے آگے بڑھ رہا تھا۔ میرے ہی قدموں کی آہٹ اجنبی بن کر مجھے کسی کے تعاقب میں ہونے کا احساس دلا رہی تھی۔ میں نے کئی بار چونک چونک کر اپنے چاروں طرف دیکھا۔ اطمینان کر لینے کے بعد آگے بڑھا۔

اب میں اس عمارت کے کافی قریب پہنچ چکا تھا اس عمارت کی بیرونی دیوار کے نچلے حصے پر سیاہ کائی جمی ہوئی تھی جس کے کنارے اب بھی سبز تھے۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے کچھ عرصے پہلے تک اس عمارت کا کافی حصہ پانی میں ڈوبا رہا حالانکہ اس کے نزدیک و دور پانی'

جوہڑ' دریا یا نہر کا شائبہ تک نہ تھا۔ یہ سبز مائل سیاہ کائی عمارت کی بدصورتی میں اضافہ کر رہی تھی۔ بوسیدہ عمارت کئی ہزار برس پہلے کی لگ رہی تھی۔ اب قریب آنے پر مجھے لگ رہا تھا کہ یہ عمارت کسی پرانے مندر کی ہے۔ دیوار پر جگہ جگہ مورتیاں کھدی ہوئی تھیں۔

اب میں سیڑھیوں تک پہنچ چکا تھا۔ آثار بتا رہے تھے کہ اس اندرونی خلا پر کبھی دروازہ بنا رہا ہوگا مگر اب صرف کھڑکی کی چوکھٹ قائم تھی جس کا نچلا حصہ برابر ہو کر جگہ جگہ سے بھر چکا تھا۔ میں اس کھلے ہوئے دروازے کے عین سامنے تھا۔ اندر گہری تاریکی تھی۔ بے اختیار میرا ہاتھ جیب کی طرف بڑھ گیا۔ حسب توقع ماچس میری جیب میں تھی۔ میں نے اسے نکال کر چیک کیا۔ اس میں کافی تیلیاں تھیں۔ اندر داخل ہوتے ہوئے میں لمحہ بھر کو ٹھٹکا۔ وہ پھنکار کی آواز تھی شاید یہ میری چھٹی حس تھی جس نے مجھے خبردار کر دیا تھا۔ میں نے عجلت میں ماچس جلائی اور سیاہ ناگ کو اپنے عین سامنے دیکھ کر میں پتھر کا بن گیا۔ اگر میں نے ایک قدم بھی آگے بڑھا دیا ہوتا تو شاید میں آپ کو یہ کہانی سنانے کے لئے زندہ نہ ہوتا۔

میں نے فوری طور پر دائیں جانب چھلانگ لگائی۔ اسی دوران میں ماچس کی تیلی بجھ چکی تھی۔ اتنی دیر میں وہ سانپ بھی غائب ہو چکا تھا اور ہر غائب ہو جانے والی چیز سے انسان ڈرتا ہے۔ میں بھی خوف زدہ ہو گیا۔ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ اب بھی مجھے لوٹ جانے کا خیال نہ آیا۔ میں اگلی تیلی کی مدھم روشنی میں آگے بڑھا۔ یہ چند فٹ لمبا کوریڈور تھا۔ سامنے کا کھلا حصہ مجھے نظر آ رہا تھا جہاں شام کی ملگجی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے ایک جست لگائی اور آدھا کوریڈور عبور کر گیا۔ دوسری جست کے ساتھ ہی میں کھلے حصے میں تھا۔ وہ چھوٹا سا تاریک رستہ اور اس رستے میں پھیلا ہوا اندھیرا کھو جانے والے سانپ کی وجہ سے مجھے خوف زدہ کر رہا تھا کہ جانے وہ موذی کس کونے میں اور کس جگہ میرا منتظر ہو۔

کھلے حصے کا جائزہ لیتے ہی میں جان گیا کہ یہ قدیم مندر ہے۔ اندر کی تمام دیواریں سیاہ پڑ چکی تھیں۔ کئی جگہ تو دیواریں بھی گری ہوئی تھیں۔ اب میں باآسانی دیکھ سکتا تھا تبھی مجھے احساس ہوا کہ آج بھی میری حیرت انگیز بینائی نے میرا ساتھ دیا ورنہ ادھر ادھر ملگجی روشنی ہونے کے باوجود اس تاریک حصے میں دیکھ لینا میرے لئے قطعی مشکل نہ تھا۔

شاید میں اپنی وہ حیرت انگیز طاقت کھو چکا تھا۔

"کون ہو تم؟"

میں اچھل پڑا۔ آواز میرے انتہائی دائیں جانب سے آئی تھی۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر اس طرف دیکھا۔ کھلے حصے میں تو کوئی نہ تھا ورنہ شاید مجھے آنکھیں پھاڑنے کی ضرورت بھی نہ پڑتی مگر دائیں جانب بنے چھوٹے چھوٹے دروازوں کے دوسری طرف ویسا ہی گھپ اندھیرا تھا۔ جیسا اس کوریڈور میں تھا۔

"کک.......... کون ہے؟ کون ہے وہاں؟" میں نے دھڑکتے دل کو قابو میں کرتے ہوئے پوچھا۔

اور پھر مجھ پر سکتہ سا طاری ہو گیا.......... وہ بہت لمبا چوڑا' سیاہ رنگ کا موٹے نقوش والا آدمی تھا جس کے سر کے بال ہی نہیں بلکہ مونچھیں' داڑھی اور بھنوؤں کے بال بھی سفید تھے۔

"کیوں آئے ہو یہاں؟" وہ بھاری آواز میں بولا۔

"میں.......... پتا نہیں.......... م.........." میری سمجھ میں ہی نہ آیا کہ کیا جواب دوں۔

"آؤ پوری ایک صدی بعد کوئی اس مندر میں داخل ہوا ہے۔" وہ میرے قریب آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک عجیب سا لیمپ تھا۔ ایک چوکور شیشے کے اندر موم بتی جل رہی تھی۔

"کیا.......... ایک صدی.......... یعنی سو سال بعد!؟"

"ہاں..........!"

وہ اور قریب آ گیا۔ اب وہ بالکل میرے روبرو تھا۔

"پریشان ہو؟" اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"ہاں..........!" میں نے بے ساختہ جواب دیا تھا۔

وہ مسکرایا۔ "مجھے معلوم تھا کہ تم آؤ گے.........." وہ اتنا کہہ کر مجھے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کر کے آگے چلنے لگا۔ میں بھی اس کے پیچھے چل پڑا۔

"تم کون ہو؟" اب میرا اعتماد بحال ہو رہا تھا۔

"یہ جاننا تمہارے لئے ضروری نہیں لڑکے!" اس کے لہجے میں ناگواری تھی۔

نہ معلوم کیوں میں نے اپنی بات پر اصرار نہیں کیا۔ میں چپ چاپ اس کے پیچھے چلتا رہا۔ وہ بڑی پُر پیچ راہداریاں تھیں جہاں سے ہم گزر رہے تھے۔ چند منٹ میں ہم نے کئی موڑ کاٹے تھے۔ کلی زرد دیواروں سے بڑی ناگوار بو نکل کر مجھے بوجھل کر رہی تھی۔ اب وہ خاموش تھا۔ میں بھی خاموش تھا۔ میرے قدموں کی چاپ ان تنگ راہداریوں میں بازگشت بن کر گونج رہی تھی۔ میں نگاہیں جھکائے زمین پر پڑتے روشنی کے دائرے میں قدم بڑھا رہا تھا اور میری نگاہیں اسی غائب ہوجانے والے سانپ سے بچنے کو تیزی سے چاروں طرف گھوم رہی تھیں کہ میری نگاہ اس آدمی کے پیروں پہ جم گئی۔ اس نے صدیوں پرانے زمانے کے لکڑی کے کھڑاؤں پہنے ہوئے تھے۔ جن پہ اوپر کی جانب ایک چپل کی پٹی تھی جس میں اس نے اپنی انگلیاں پھنسا رکھی تھیں۔ کھڑاؤں تو اس زمانے میں بھی تھیں مگر ان کی یہ شکل نہیں تھی پھر اچانک میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے کہ اس کی ایڑی سے ٹکرا کر زمین سے ٹکرانے والی کھڑاؤں کی کوئی آواز نہ تھی۔ اس کے قدموں کی کوئی چاپ نہیں تھی حالانکہ وہ پیر گھسیٹ گھسیٹ کر چل رہا تھا جبکہ میں اچانک ہی محتاط ہوگیا تھا۔

"بس......... سنو!" میں ٹھٹکیا کر رک گیا۔

وہ رکا۔ میری طرف پلٹا......... اس کی آنکھیں اتنی کم روشنی میں چراغوں کی طرح چمکتی محسوس ہو رہی تھیں اور ان میں ایک عجیب سی کمینی مسکراہٹ تھی۔

"تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟" میں نے تھوک نگل کر پوچھا۔

"جہاں تمہیں ہونا چاہیے......... تمہاری جگہ پر......... تم دیوی کے مہمان ہو......... فکر مت کرو......... وہ ایک صدی سے تمہاری ہی منتظر ہے۔ آج میں بہت خوش ہوں آج میں آزاد ہوجاؤں گا......... آج وہ مجھے مالا مال کردے گی۔ میری تپسیا ویدت نہیں گئی۔ آج......... آج میں مندر میں چراغاں کروں گا۔ اس تیل سے چراغاں کروں گا جو اپنی ہی نسل کو جلا جلا کر جمع کرنے پر مجبور تھا۔ آج کے بعد مجھے یہ گھناؤنا کام نہیں کرنا پڑے گا اور میں......... میں ایک نیا جنم لے کر دنیا کی سندرتا کو پراپت کرسکوں گا۔"

وہ پتا نہیں کیا کہہ رہا تھا مگر میرا رواں رواں لرز رہا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ کچھ بہت زیادہ خوفناک ہونے والا ہے۔ میں اس کی آنکھوں کی تاب نہیں لا پا رہا تھا۔ بس

اچانک میں نے اپنے اندر جدوجہد محسوس کی۔ میرا جی چاہا کہ میں بھی پلٹوں اور ان پُر پیچ راہداریوں میں دوڑتا چلا جاؤں......... میں پلٹا' یہ سوچے بغیر کہ میں کبھی ان بھول بھلیوں سے نکل بھی پاؤں گا کہ نہیں......... ابھی میں نے قدم اٹھایا ہی تھا کہ اس سیاہ فام شخص نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کی لمبی لمبی انگلیاں چھوٹے چھوٹے سانپوں کی طرح میری کلائی میں لپٹ گئیں۔ وہی چکنی چکنی' سرسراتی ہوئی سی......... میرے حلق سے ایک خوفناک چیخ نکلی اور لگا جیسے میں کسی بہت اونچی جگہ سے نیچے پھینک دیا گیا ہوں۔

"ضیاء.........! ضیاء.........!" ایک دھیمی سی سرگوشی سنائی دی۔ میرے گرتے ہوئے بدن کو جھٹکا لگا اور میں نے آنکھیں کھول دیں۔ میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا......... وہ مجھ پر جھکی ہوئی تھی۔

☆-------------☆-----------☆

کچھ دیر تک مجھے ہوش نہ آیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے میرا ذہن دور تک پھیلے سمندر کی سطح پر تیر رہا ہے۔ دور دور تک خلا محسوس ہو رہا تھا۔ میری آنکھوں میں بھی دھند چھائی ہوئی تھی۔ ایسے میں وہ صرف ایک ہیولا محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی آواز میرے اندر ہلکورے لے رہی تھی۔ ڈوبتے ذہن کو بار بار ابھر آنے کی تلقین کرتی ہوئی پھر لگا جیسے میری پیشانی پر کسی نے اپنا ہاتھ رکھ دیا ہے۔ حرارت نے مجھے حواس بخشے۔ میں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

"ضیاء.........!"

اس بار میں نے آنکھیں پوری کھول دیں۔ وہ فرحت تھی۔ میں حیرت زدہ رہ گیا۔

"تم......... تم کب آئیں؟"

"میں کبھی تم سے دور نہیں ہوتی ضیاء!" اس نے بڑے پُر کشش لہجے میں کہا۔ اس کی آنکھوں میں واضح طور پر پیار تھا۔ ہونٹوں پہ نرم مسکراہٹ تھی۔

"تم کب آئیں؟" میں نے اپنا سوال دہرایا اور ساتھ ہی اپنے اطراف کا جائزہ لیا۔ میں اپنے کمرے میں ہی تھا۔ شاید میں نے کوئی خواب دیکھا تھا۔ میرے بدن کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ اس نے اس بار بھی میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے اپنا نرم و ملائم ہاتھ میرے چہرے پہ پھیرا اور بولی۔

"ضیاء! میں تمہیں کبھی تنہا نہیں چھوڑوں گی......... میں ہر وقت' ہر لمحہ تمہارے

پاس ہوں.......... تم کبھی پریشان مت ہونا.......... یہ پنڈت کی بے وقوفی تھی۔ اسے تمہاری اہمیت کا احساس نہیں تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ تمہارے سینے میں سوراخ کر دینے سے اسے آزادی مل جائے گی.........."

میں ہنسا کر اٹھ بیٹھا۔ اب میں پوری طرح حواسوں میں تھا اور سمجھ چکا تھا کہ میرے پاس بیٹھی لڑکی فرحت نہیں بلکہ وہ سو فیصد زیوسا ہے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ زیوسا میرے سامنے تھی۔ گو وہ فرحت کے روپ میں آئی تھی مگر اس نے خود کو چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"زیوسا!" میں نے تصدیق چاہی۔

"ہاں ضیاء! یہ میں ہوں.......... میں"

"کیا چاہتی ہو تم؟" میں نے بدن کے درد کو نظر انداز کر دیا اور اس کے روبرو بیٹھ گیا۔

"تمہاری توجہ' محبت جو تم نے مجھے شروع سے دی۔ میں اس قابل نہیں تھی ضیاء مگر تم نے میری حیثیت کو بالکل بدل کر رکھ دیا۔"

"ایسا میں نے نادانستگی میں کیا تھا زیوسا! تم واقعی اس قابل نہیں تھیں.......... اور میں.......... میں بچہ تھا۔ چمکدار چیزوں کا شیدائی.......... مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں اپنی ہی آستین میں سانپ پال رہا ہوں۔ بہرحال.......... آج تم آگئی ہو تو میں صاف صاف بات کرنا چاہتا ہوں۔ تم جو کچھ بھی ہو' جو بھی تمہارا بیک گراؤنڈ ہے' مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ ابا نے جو کچھ کیا' اسے بھگت لیا۔ رابرٹ' جینو' پپاس اور سورن سنگھ سے مجھے صرف اسی حد تک دلچسپی تھی جس حد تک کسی پرسکون شخص کو انسانیت سے ہو سکتی ہے مگر تم جانتی ہو گی کہ یہ انسانی فطرت ہے کہ جب اس پر برا وقت آتا ہے تو وہ پہلے اپنی جان بچانے کی تدابیر کرتا ہے۔ اس وقت اسے کسی دوسرے کا ہوش نہیں رہتا لہٰذا میں ان لوگوں کے بارے میں اب کسی تردد کا شکار نہیں ہوں۔ انہوں نے جو کچھ کیا' اس کی سزا بھگت رہے ہیں۔ ایلین کون تھی' وہ پراسرار کیوں تھی' کیوں ہے' کیا چاہتی ہے' مجھے اس بات سے بھی اب کوئی دلچسپی نہیں رہی.......... مجھے تم سے قطعی لگاؤ نہیں.......... تم نے میرے ساتھ جو کھیل میرٹھ میں کھیلا تھا' وہ بھی نادانستگی میں ہوا۔ اگر مجھے پتا ہوتا کہ وہ فرحت نہیں تم ہو تو یہ کبھی نہ ہوتا۔ اب تم ان زنجیروں کو لے جاؤ'

چاہو تو ایلین کو دے دو۔ چاہے دتسلا کو۔ مجھے اب کسی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ تم سمجھ گئی ہو نا میری بات کو۔"

میں نے اس کے چہرے پر پہلے کرب اور پھر طیش محسوس کیا۔ میں چپ چاپ اسے دیکھ رہا تھا۔ میں واقعی اب اس سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا.......... وہ کچھ دیر بیٹھی میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتی رہی۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ آنکھوں کے راستے کوئی گرم سیال سا میرے بدن میں اترتا ہی جا رہا ہے۔ میرے بدن میں تپش بڑھ گئی تھی۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے۔ میرا سر دھیرے دھیرے چکرانے لگا تھا مگر میں نے اپنے آپ کو ذرا بھی کمزور ثابت نہیں کیا۔ اسی طرح آنکھوں میں آنکھیں گاڑے بیٹھا رہا..........

"ضیاء! کسی بنیاد میں تبدیلی لانا کتنا کٹھن کام ہے مگر تم نے وہ کام سرانجام دیا مگر اب.......... اب تم مجھے کسی بگولے کی طرح بیچ میدان چھوڑ رہے ہو.......... جانتے ہو نا کہ بگولہ جہاں سے گزرے گا' وہاں تباہیاں بھی پھیلا سکتا ہے۔"

وہ نہ جانے کیا کہنا چاہتی تھی مگر میں بپھر گیا۔ "کیا تم مجھے دھمکی دے رہی ہو..........؟"

"نہیں!" اس نے اس بار سپاٹ بلکہ سفاک لہجے میں جواب دیا۔ "تم تو نام ہو تباہی کا' موت کا اور سفاکی کا' اس لئے کبھی ایسی دھمکی دینے کی کوشش نہ کرنا۔"

"حقیقت سے آگاہ کر رہی ہوں.......... تم جان چکے ہو کہ اس کائنات میں ابلیس میرے نام سے منسوب ہیں۔"

"میں کچھ عقائد نہیں رکھتا زیوسا!"

"یہ عقائد کچھ نہیں۔ انسان نے اسے مختلف تعبیریں دے کر اپنی پہچان کے لئے ہموار راستہ' ایک طریقہ بنا لیا ہے.......... انسان اپنے اندر ایک پوری کائنات ہوتا ہے۔ سے آگے بڑھنے' اپنے آپ کو مطمئن کرنے' اپنی ذات کو سمیٹنے کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا ہے۔ مرکزیت بنانا پڑتی ہے۔ انہوں نے ہمیشہ ایسا ہی کیا.......... یہ جانے بغیر کہ وہ اپنی محبت میں کسے الزام دے رہا ہے۔"

"تمہارا انسانوں سے تعلق ہے؟" میں نے اکھڑ لہجے میں پوچھا۔

"تمہاری حد تک۔" اس نے اداسی سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"نہیں.........! تمہیں ہر انسان سے دلچسپی ہے۔ اس کی تباہی سے' اس کی موت سے' اس کی پریشانیوں سے' لیکن تم یہاں سے چلی جاؤ......... اور کبھی لوٹ کر ادھر نہ آنا......... اور ہاں یہ بھی لیتی جاؤ......... اپنی نحوست جو تم نے ان زنجیروں اور ان کڑیوں کے ذریعے میرے خاندان میں پھیلائی تھی' میں اسے اب بالکل برداشت نہیں کر سکتا......... میں نے اپنے سرہانے رکھی الماری سے وہ زنجیریں نکال کر اس کے سامنے پھینک دیں۔

وہ کھڑی ہوئی......... اس نے ایک بھرپور نگاہ میرے سراپا پر ڈالی' اس کی نگاہ میں حسرت بھی تھی اور دکھ بھی۔

"اور سنو! یہ چولا بدل لو۔ میں فرحت کے روپ میں تمہیں کبھی دیکھنے کا خواہشمند نہیں ہوں۔ میں فرحت سے پیار کرتا ہوں۔ میں اس کی سادگی پر اس سے عقیدت رکھتا ہوں اس لئے یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ تم اس کا معصوم روپ دھارو۔"

میرے جملوں نے جانے اس پر کیسا اثر کیا کہ اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہو گیا......... اس کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے اور پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ مٹیالے رنگ کے دھوئیں میں تبدیل ہو کر میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ میں سن بیٹھا رہ گیا......... میرا ذہن ہی نہیں' جسم بھی شل ہو گیا......... میری چھٹی حس مجھے خبردار کر رہی تھی کہ اب کچھ نہ کچھ بہت غلط ہونے والا ہے۔ میں نے چاروں طرف دیکھا' وہ جاتے جاتے زنجیریں لے گئی تھی۔ مجھے ایک گونا اطمینان کا احساس بھی ہوا مگر بے چینی' گھبراہٹ میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔ میں بے سدھ پلنگ پر لیٹ گیا۔

"ضیاء!"

اچانک منے دادا کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"جی منے دادا!"

"بیٹے! خیریت تو ہے......... آج تم سارا دن کمرے سے نہیں نکلے........."

میں نے اپنا تمام قصہ انہیں سنایا وہاں سے جہاں سے میں نے اماں کے کمرے میں جھانکا تھا۔ یہاں تک جب میں نے زیوسا کو بے حیثیت کر کے چلے جانے کو کہا تھا۔ منے دادا چپ چاپ بیٹھے سب سنتے رہے۔ ان کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے۔ نگاہوں میں بڑی بے چینی تھی......... بڑا اضطراب تھا۔ میرے خاموش ہوتے ہی وہ کھڑے ہو گئے اور

کمرے میں ٹہلنے لگے.........

"منے دادا!" میں نے کچھ دیر خاموش رہ کر اپنی طرف متوجہ کیا۔

"تم نے اچھا نہیں کیا ضیاء.........! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

انہوں نے جس خوف زدہ لہجے میں جواب دیا اس نے میرا حوصلہ بھی پست کر دیا۔ میں جو پہلے ہی اپنے اندر عجیب سی پژمردگی اور خوف محسوس کر رہا تھا' مزید حواس باختہ ہو گیا مگر میں اپنے خوف کو ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا اس لئے کہ اس کا منے دادا پر کچھ اچھا اثر نہیں پڑتا اس لئے میں نے اپنے انداز کو مضبوط بنا کر کہا۔ "منے دادا! آپ کو خوش ہونا چاہئے تھا کہ میں مضبوط ایمان رکھتا ہوں۔ زیوسا کا کوئی وجود نہیں ہے۔ یہ سب ہندوؤں کی شعبدے بازی ہے اور کچھ نہیں........."

"اس دنیا میں اسرار بھرے پڑے ہیں ضیاء.........! ابھی تک یہ طے نہیں ہو پایا کہ دنیا بھر میں ہونے والے پُراسرار واقعات کا اصل محرک کیا ہے۔ ہم کائنات کے بارے میں ابھی کچھ بھی نہیں جان پائے ہیں۔ اگر یہ سب کچھ شعبدے بازی ہوتی تو عقائد کے تحفظ کے لئے قومیں تباہ نہ ہو رہی ہوتیں......... زیوسا اسی کائنات کا ایک اسرار ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم نے بہر طور تم نے یہ اچھا نہیں کیا........."

میں جھنجلا گیا۔ منے دادا میرا حوصلہ بڑھانے کی بجائے اور پست کر رہے تھے۔ "تو کیا کرتا؟" میں نے چڑ کر جواب دیا۔ "کیا اپنے آپ کو زیوسا کے حوالے کر دیتا' اسے وہ سفاک کھیل کھیلنے دیتا جو وہ برسوں سے کھیل رہی ہے؟"

"تم شالی بابا کی ہدایت پر عمل کرتے ضیاء.........! زنجیریں اسے دینے کی بجائے نسلاء کو دے کر تو دیکھتے' ہو سکتا تھا کہ تم پُرسکون زندگی گزار پاتے......... اب......... اب جانے کیا ہو......... میں خوف زدہ ہوں۔"

"کیا ہو گا اب؟" میں بپھر گیا......... "کیا کرے گی وہ؟" میں چیخ اٹھا۔ یہ میرے اندر کا انتشار تھا جو پھٹی ہوئی آواز میں ڈھل کر باہر آ رہا تھا......... منے دادا چونک اٹھے۔ انہوں نے مجھے غور سے دیکھا۔

"ضیاء!"

"جائیں......... منے دادا.........! چلے جائیں پلیز! مجھے کچھ دیر کے لئے اکیلا چھوڑ دیں۔" میں نے روہانسی آواز میں کہا۔ میرا گلا رندھ گیا تھا......... حلق نمکین ہو گیا

تھا۔ منے دادا تیزی سے باہر چلے گئے۔ میں دونوں ہاتھوں میں چکراتے ہوئے سر کو تھامے وہیں بیٹھا رہ گیا مگر پھر میں اچھل کر باہر بھاگا کیونکہ عصمت آپا کی چیخوں سے سارا گھر گونج اٹھا تھا.........

☆------------☆-----------☆

کمرے سے باہر کا منظر انتہائی خوفناک تھا۔ عصمت آپا بیچ صحن میں پڑی تڑپ رہی تھیں اور ان کے جسم پر ہزاروں سنہری مکڑیاں رینگ رہی تھیں۔ طیب' منے دادا' دادی اور منی دادی سب انتہائی کرب کے عالم میں چیخ رہے تھے......... عصمت آپا کے جسم پر میرے دیکھتے ہی دیکھتے خون کی لکیریں بننا شروع ہو گئیں اور پھر مجھے بھی جیسے ہوش ہی نہ رہا......... میں بھاگ کر عصمت آپا کے قریب بیٹھ گیا اور میں نے دونوں ہاتھوں سے ان کے جسم پر رینگنے والی مکڑیوں کو جھٹکنا شروع کر دیا۔ جبکہ طیب اور منے دادا چیخ چیخ کر مجھے ہٹ جانے کو کہہ رہے تھے مگر اس دوران میرے حلق سے مارے غصے' طیش اور غم کے عجیب و غریب آوازیں نکل رہی تھیں۔ مجھے صرف عصمت آپا کی چیخوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں ایلن کو بھی گالیاں دے رہا تھا زیوسا کو بھی اور دتسلا کو بھی۔ ایک ہنگامہ تھا' شور تھا' تہلکہ تھا جو ہمارے آنگن میں تھا مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ باہر سے کوئی پوچھنے نہیں آیا کہ کیا ہو گیا......... میں نے عصمت آپا پر نگاہیں گاڑی ہوئی تھیں۔ مجھے ان مکڑیوں نے کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔

یہ سارا ہنگامہ شاید گھنٹہ بھر جاری رہا یا اس سے بھی کچھ زیادہ عرصہ' مجھے یاد نہیں۔ یاد ہے تو صرف اتنا کہ میں نے عصمت آپا کے جسم سے ساری مکڑیاں جھاڑ دی تھیں۔ وہ زخمی ضرور تھیں' مگر ایسی نہیں جیسا مبشر تھا یا بڑی بوا۔ وہ تو زندہ ہی نہ بچے تھے۔ ان کا جسم پورا کا پورا ادھڑ چکا تھا مگر عصمت آپا کے جسم پر باریک سوراخ ہو گئے تھے جن سے خون باریک لکیروں کی صورت میں بہہ رہا تھا۔ میں نے ہسپتال لے جانا چاہا تو منے دادا نے مجھے روک دیا۔ ان کا کہنا بھی ٹھیک تھا ڈاکٹرز کو ہم کیا بتاتے۔ پہلے ہی میرٹھ کے لئے ہم خوف کی علامت بن چکے تھے' اب دہلی میں ہمارے لئے چہ میگوئیاں شروع ہو گئی تھیں۔ میرٹھ والے تو بہرحال ہمیں پشتوں سے جانتے تھے۔ دہلی میں ہزار رنگ و نسل

کے لوگ تھے۔ بات جانے کیا سے کیا بن جاتی اور پھر عصمت آپا نے مجھے تسلی دی کہ وہ اندرونی طور پر اب ایسی تکلیف محسوس نہیں کر رہی ہیں کہ تشویش ہو۔ بقول ان کے مکڑیوں کو دیکھ کر انہیں وحشت زیادہ تھی اور یہ خیال کہ اب موت سامنے صرف چند سانسوں جتنی رہ گئی ہے بے پناہ خوف زدہ کرنے والا تھا اس لئے وہ اس بری طرح چیخی تھیں۔

میں تو تھکن سے بے حال ہو کر پڑ گیا۔ طیب حکیم صاحب کو بلا لایا۔ حکیم صاحب سے انہوں نے کیا کہا' مجھے خبر نہیں مگر حکیم صاحب نے ہمیں یہ کہہ کر حیرت زدہ کر دیا کہ یہ اسکن الرجی ہے۔ انہوں نے ہرے رنگ کا ایک لیپ سا بنا کر دے دیا کہ اسے ان جگہوں پر لیپ کیا جائے جہاں سوراخ بن گئے ہیں......... کچھ دوائیں کھانے کو بھی دے دیں۔ جنہیں کھا کر عصمت آپا کو گہری نیند آ گئی۔ اماں نے ان کے زخموں پر مرہم لب دیا......... عصمت آپا تو سکون سے سو گئیں مگر سارا گھر بے پناہ پریشان تھا۔ خاص طور پر میں۔

منے دادا کے بقول زیبو سا نے محاذ سنبھال لیا تھا اور یہ اس نے چھوٹا سا نمونہ دکھایا تھا۔ یہ جنگ اس سے بھی زیادہ خوفناک شکل اختیار کر سکتی تھی۔ بات ان کی بھی ٹھیک تھی لیکن ماضی پر نگاہ ڈال کر مجھے یہ اطمینان ضرور ہو گیا تھا کہ میں جہاں موجود ہوں گا زیبو سا صرف وہاں خوف و ہراس پھیلائے گی۔ اب گھر والوں کو اس اذیت سے نجات دلانے کا صرف ایک ہی راستہ تھا کہ میں دہلی بھی چھوڑ دوں۔ میں نے منے دادا سے بات کی۔ طیب بھی ساتھ تھا اور کافی سنجیدگی سے گفتگو میں حصہ لے رہا تھا۔ وہ میری بات سے متفق تھا۔ میں نے اور طیب نے منے دادا کو بھی قائل کر لیا۔ اماں اور دادی کو سنبھالنا انہی کا کام تھا۔ انہوں نے مجھے اجازت بھی دے دی اور وتسلا کے پاس جانے کا مشورہ بھی دیا مگر اب میں آزمائی ہوئی کو اور نہیں آزمانا چاہتا تھا۔

وتسلا مجھے ڈھونگ لگ رہی تھی۔ مطلبی جادوگرنی......... میرا ذہن بالکل اجاڑ ہو گیا تھا۔ فرحت اور بی جان وغیرہ کی طرف سے بھی پریشانی ہو گئی تھی۔ زیبو سا جان گئی کہ فرحت میرے لئے کیا حیثیت رکھتی ہے' مجھے خدشہ تھا کہ وہ اسے نقصان پہنچانے کی کوشش ضرور کرے گی۔ میں نے اپنے اس خدشے کا اظہار منے دادا سے بھی کیا۔ انہوں نے تسلی دی کہ وہ ان لوگوں کو آج ہی خط لکھ کر یہاں بلوا لیں گے۔ میں نے طیب

کے ساتھ بمبئی جانے کا فیصلہ کر لیا مگر عصمت آپا کو اس حال میں چھوڑنا بھی مجھے گوارا نہ تھا۔ ہم جو کچھ کر رہے تھے' اندازے کی بناء پر کر رہے تھے۔ میں ایک دو روز رک کر انہیں صحت مند دیکھنا چاہتا تھا تاکہ اطمینان ہو جانے کے بعد جا سکوں۔

وہ دو دن میں بالکل ٹھیک ہو گئیں۔ اب انہیں خوف بھی نہیں تھا۔ شاید اس لئے کہ وہ فطری طور پر سخت طبیعت کی واقع ہوئی تھیں۔ منے دادا نے اماں اور دادی کو سمجھا دیا کہ ضیاء ایک بابا کی تلاش میں جا رہا ہے جن سے ملنے کے بعد ہم ان چکروں سے نکل آئیں گے......... پتا نہیں' وہ مطمئن ہوئیں کہ نہیں البتہ انہوں نے مجھے جانے سے نہیں روکا۔ طیب نے جلد ہی بمبئی جانے کی تیاری کر لی۔ منے دادا نے بی جان کو فوری طور پر دہلی آ جانے کے لئے لکھ دیا۔ میں نے ان سے کہہ دیا تھا کہ اگر اس بار خالہ بی جانے کی ضد کریں تو سختی سے انکار کر دیجئے گا یا پھر ان سے کہہ دیجئے گا کہ وہ اکیلی چلی جائیں فرحت اور بی جان نہیں جائیں گی۔

☆==========☆==========☆

ہم بمبئی روانہ ہوئے تو میرا ذہن بالکل خالی تھا۔ طیب بھی کسی سوچ میں غرق تھا۔ ہم نے ٹرین میں بوگی بک کرا لی تھی۔ رش بھی اتنا نہیں تھا اس لئے کوفت بھی نہیں ہو رہی تھی۔ بوگی میں صرف میں اور طیب تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا ہمیں پھر اسی کوٹھی میں جا کر رہنا چاہئے۔ میں نے طیب سے پوچھا۔ اس نے سختی سے انکار کر دیا اور سیدھا گھر چلنے کو کہا۔ میں زہرہ آپا کی ہولو طبیعت کی وجہ سے زیادہ پریشان تھا۔ طیب نے کوئی اور انتظام کرنے کا وعدہ کیا۔ میں نے آنکھیں بند کر کے خدا سے ہمت اور حوصلے کی درخواست کی۔ شالی بابا کا دیا ہوا تعویذ اب بھی میرے گلے میں تھا۔ میں نے بے خیالی میں اسے ہاتھ میں لے لیا اور مختلف دعائیں کرتا رہا۔ ہم سویرے دہلی سے نکلے تھے۔ پوری رات اور پورے دن کا سفر تھا۔ طیب بھی لیٹ کر چھت کو تک رہا تھا۔ جانے اس کے ذہن میں کیا تھا۔ اچانک وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"ضیاء!" اس نے مجھے پکارا۔

"ہوں!" میں نے آنکھیں کھول دیں۔

"ضیاء.........! میں ایک شخص کو جانتا ہوں۔ پتا نہیں' وہ کیا ہے مگر اتنا مجھے یقین ہے کہ وہ بھی پُراسرار قوتوں کا مالک ہے۔"

"کون ہے وہ؟" میں نے بے دلی سے پوچھا۔

"وہ آکا باگیا ہے۔"

"کیا؟"

"آکا باگیا۔ یہ نام ہے اس کا۔" طیب کے چہرے پر اب جوش سے سرخی پھیل چکی تھی۔

"یہ کیسا نام ہے؟ کہاں کا باشندہ ہے؟"

"یہ مجھے نہیں پتا۔ بس ہم اسٹیشن سے سیدھا اس کے پاس چلے جائیں گے۔"

یہ اچانک کہاں سے پیدا ہو گیا؟" میں نے اس کا جوش و اضطراب دیکھ کر پوچھا۔

"یہ اچانک پیدا نہیں ہوا بلکہ میں بھول چکا تھا۔ اس سے میری ملاقات ایک مندر اور مسجد کے درمیان ہوئی تھی۔"

"کیا تم نشے میں ہو یا بغیر نشے کے بہک رہے ہو؟"

"ہاں.........! نہیں.........! وہ بھنڈی بازار میں جو مسجد ہے' اس کے دوسرے کنارے پر مین روڈ پر ایک چھوٹا سا مندر بنا ہوا ہے۔ میں ایک روز مسجد سے نکل رہا تھا کہ میرا ایک دوست مل گیا جو نیپال سے آیا ہوا تھا۔ ہندو ہے۔ اسے مندر میں ناریل پھوڑنا تھا۔ میں اس کے ساتھ مندر میں جانے لگا تبھی ایک مخبوط الحواس آدمی مجھ سے ٹکرا گیا۔ اسے میرا یہ دوست جانتا تھا۔ غالباً اسے کوئی کام تھا وہ اس شخص کے ہاتھ جوڑنے لگا اور منتیں کرنے لگا کہ کچھ دیر رک جائیں۔ میں ان کے ساتھ وہاں ٹھہر گیا۔ میرا دوست چند منٹ بعد لوٹ آیا اور پھر انہیں لے کر ہم ایک ہوٹل میں بیٹھ گئے۔ وہ عجیب غلیظ سا آدمی تھا۔ اس کے شانے چوڑے گردن مضبوط اور جبڑا بھاری تھا۔ اس کی آنکھیں چھوٹی مگر بالکل سرخ تھیں۔ وہ عجیب سے لہجے میں بات کر رہا تھا۔ مجھے اس کی شخصیت بہت بری محسوس ہوئی تھی اس لئے میں الجھ رہا تھا مگر میرا دوست بے پناہ عقیدہ سے بات کر رہا تھا۔ کچھ دیر تک میں نے اسے محض اپنے دوست کی وجہ سے برداشت کیا۔ وہ بار بار مجھے دیکھتا اور مسکراتا رہا تھا پھر جب وہ جانے لگا تو مجھ سے بولا۔

"تم......... تم ظاہر کو دیکھتے ہو' باطن کو دیکھا کرو۔" پھر کچھ دیر بعد جاتے جاتے میری طرف مڑ کر بولا۔ "اس دنیا میں کسی کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ میں ان لوگوں کا ساتھ دیتا ہوں جو مجھ سے الجھ جاتے ہیں۔ تم چلے آنا۔"

میں نے برا سا منہ بنایا اور کہا تھا کہ شاید میں کبھی اس کے پاس نہ آؤں مگر ضیاء! جب وہ چلا گیا تو میرے نیپالی دوست نے اس کے بارے میں مجھے ایسی ایسی باتیں بتائیں کہ میں حیرت زدہ رہ گیا۔ خیر' میں نے اس کی باتوں کا یقین تو نہیں کیا تھا مگر جب میرے دوست کے حالات اس شخص کے مطابق صرف تین دن میں حیرت انگیز طور پر بدلے تو وہ میرے ذہن میں چپک گیا۔ میرے دوست کو مالی پریشانیاں تھیں۔ اگلے ہی روز اس کی لاٹری نکل آئی۔ اس کی چھوٹی بیٹی معذور تھی' غالباً پولیو تھا۔ وہ ایک ہفتے میں بالکل ٹھیک ہو گئی۔ ایک چھوٹی سے کمپنی میں وہ سپروائزر تھا۔ اسی کمپنی نے اسے منیجر بنا کر کینیڈا بھیج دیا۔ یہ سب کچھ صرف ایک ہفتے کے اندر اندر ہو گیا تھا۔

وہ ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔ یہ سب ہو جانے کی خوش خبری سنانے اور آکا باگیا کا شکریہ ادا کرنے کے لئے وہ جگہ جگہ مجھے لئے انہیں تلاش کرتا پھرا مگر وہ نہیں ملے۔ وہ کینیڈا چلا گیا۔ مجھے کہہ گیا کہ جب بھی آکا باگیا ملیں تو ان کا شکریہ ادا کر دوں۔ اس کے جانے کے اگلے دن ہی آکا باگیا مجھے مل گیا۔ وہ عین اسی جگہ ملا تھا جہاں ہم پہلی بار ملے تھے اور جہاں میرا دوست اور میں انہیں دونوں ڈھونڈتے پھرے تھے۔ میں نے اسے دوست کا پیغام پہنچایا تو اس نے کمال تغافل سے مجھے دیکھا تھا اور بولا تھا۔

"ضرورت نہیں ہے' میں پلٹ کر نہیں دیکھتا اور سنو! جب تم مجھے تلاش کرو گے تو میں اسی جگہ ملوں گا۔"

میں نے جواب دیا تھا کہ مجھے ایسے تماشوں سے دلچسپی نہیں ہے۔ ضیاء! حالانکہ تعجب کرو' اس کے ان شعبدوں نے اگر وہ شعبدے ہی تھے تو میرے دوست کی زندگی کی کایا پلٹ دی تھی۔ اگر تم اس کا گھر بار دیکھ لو تو یقین نہ کرو کہ یہ شخص صرف سال بھر پہلے کنگال تھا۔ اس کے گھر پر بیماریوں اور مفلسی کی نحوست برستی تھی پھر میں جلد ہی اسے بھول گیا۔ آج' ابھی ابھی مجھے اس کا خیال آ گیا۔ ضیاء! مجھے یقین ہے کہ ہم کامیاب ہو جائیں گے۔"

وہ اسی جوش و خروش سے بول رہا تھا۔ میں نے اس کی پوری بات سن تو تھی مگر یہ لگتا ہے کہ مجھے اس کی طرح کسی قسم کا یقین نہیں ہوا تھا۔

ضیاء! وہ علاقہ اسٹیشن سے اتنا دور بھی نہیں ہے۔"

"ہوں.........!" میں نے سرسری طور پر سر ہلایا۔

وہ اٹھ کر میرے پاس آبیٹھا۔ ”ضیاء! ہمیں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا نا! ہم اس معاملے کو نہ تو یونہی چھوڑ سکتے ہیں نہ کوئی حل ہے ہمارے پاس۔ تم وتسلا سے ملنا نہیں چاہتے۔ شالی بابا سے تمہارا اعتماد اٹھ گیا ہے۔ اب اسے آزمانے میں کیا حرج ہے؟“

”ہاں‘ ہرج تو کوئی نہیں ہے۔ تم جاکر مل لینا۔“

”ٹھیک ہے‘ میں پہلے ان سے پتا کرلوں گا پھر تمہیں لے چلوں گا۔“ وہ واپس اپنی سیٹ پر جا بیٹھا مگر اب اس کے چہرے سے پتا چل رہا تھا کہ وہ اگر اس وقت اس شخص سے مرعوب نہیں ہوا تھا تو اب سال بھر بعد بری طرح اس سے متاثر تھا۔ میں اب بھی کچھ نہیں سوچ رہا تھا۔ بس یوں لگ رہا تھا کہ میں نے لاشعوری طور پر خود کو حالات کے حوالے کردیا ہے۔ شاید میں حوصلہ ہار گیا تھا۔ مجھے اپنی زندگی بالکل بے مقصد اور فضول لگ رہی تھی بلکہ ایک ایسا تماشا جیسا مداری سڑکوں پر کھڑے ہوکر کرتے ہیں۔ لوگ تاسف کرتے ہیں یا تالیاں بجاکر چلے جاتے ہیں اور کچھ ہی دنوں میں ان تمام تماشوں اور شعبدوں کو بھول جاتے ہیں۔ میں نڈھال تھا۔

پھر شاید مجھے نیند آگئی تھی۔ طیب نے مجھے نہیں اٹھایا۔ سارا سفر سوتے جاگتے گزر گیا۔ ہم گیارہ بجے دن کو بمبئی پہنچے۔ میں طیب سے ہونے والی بات بالکل بھول چکا تھا اور اب سوچ رہا تھا کہ بی جان اور فرحت دہلی آجائیں گی یا نہیں۔ ممکن ہے‘ خالہ بی واویلا کریں۔ مجھے امید نہیں تھی کہ بی جان انہیں اکیلا چھوڑ کر چلی آئیں گی۔ ہم نے وہاں سے ٹیکسی لی۔ میں لاتعلقی سے بیٹھ گیا۔ میری طبیعت ابھی تک بوجھل تھی۔ کبھی مجھے ذرا سا کا خیال آتا کہ وہ اب کیا کرے گی‘ کون سا حربہ استعمال کرے گی اور کبھی خیال آتا کہ کوئی ایسا حادثہ ہو جائے کہ میری یادداشت ہی کھو جائے مگر ایسا غالباً صرف فلموں میں ہوتا ہے۔ میں جس قدر گزرتے حالات کو بھولنے کی کوشش کرتا‘ اسی قدر باتیں یاد آکر میرے اندر انتشار پھیلا دیتیں۔ مجھے نہیں پتا کہ طیب نے ٹیکسی والے سے کیا کہا۔ احساس اس وقت ہوا جب اس نے اچانک کہا۔

”ایک منٹ.........! ٹیکسی روکو!“

میں نے چونک کر دیکھا۔ یہ طیب کے گھر کا علاقہ نہیں تھا بلکہ ہم بھنڈی بازار کی مشہور بھیل پوری کی دکان کے سامنے کھڑے تھے۔

”کہاں آگئے تم؟“ میں نے طیب سے پوچھا مگر وہ ”ایک منٹ!“ کہہ کر تیزی سے

ٹیکسی سے اتر گیا۔ میں اسے دیکھنے لگا۔ وہ اس دکان کے عین سامنے کی طرف جارہا تھا۔ وہاں ایک دکان تھی جو بند تھی اور اس کے چبوترے پر ایک انتہائی غلیظ شخص سکڑا ہوا لیٹا تھا۔ اس کے کپڑے چیتھڑوں کی شکل میں اس کے جسم پر لٹک رہے تھے۔ بالوں کی لٹیں بنی ہوئی تھیں۔ وہ غالباً سویا ہوا تھا۔ طیب اس شخص کے نزدیک پہنچا اور اسے چھوا۔ وہ شخص اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں ان لوگوں سے کافی فاصلے پر تھا۔ میں نے ٹیکسی مڑوا کے اسی جانب کھڑی کروالی......... اب میں ان کے بالکل قریب تھا۔ میں نے دیکھا‘ وہ شخص مجھے گھور رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی وحشت اور چہرے پر تمتماہٹ تھی۔ مجھے جانے کیوں اس کے نقوش مانوس لگے مجھے یاد نہیں آسکا کہ میں نے اسے پہلے کب اور کہاں دیکھا ہے۔ وہ پاگل تھا‘ فقیر تھا‘ جانے کہاں کہاں پھرتا ہوگا اور کب میری نظر اس پر پڑی ہوگی۔ یہ سوچ کر میں سیدھا ہوگیا۔ اب میرے کان طیب کی آواز پر لگے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”آقا بابا! آپ نے کہا تھا ناکہ تمہیں ضرورت پڑی تو میں یہاں مل جاؤں گا۔“

”مجھے پتا تھا‘ میں یہاں اسی لئے آگیا......... کل تو اسے لے کر اندھیری آجانا......... ریل کی پٹری کے نیچے‘ ندی کی طرف......... کالے مندر میں چلے آنا......... اور اسے بتا دینا زندگی دان مانگتی ہے۔ اچھا اچھا‘ برے کے بعد آتا ہے......... مرکز سے ہٹ کر جینا محال ہوتا ہے۔ انسان کا مرکز اس کے کردار کا ستون ہوتا ہے۔ طرم خانی دھری رہ جاتی ہے۔ دیوی دیوتا طاقت استعمال کرنا جانتے ہیں۔ انسان تو بس ہاتھ پاؤں چلاتا ہے......... یا زبان چلاتا ہے.........“

اس کی باتیں بے ربط تھیں مگر مجھے پُراسرار محسوس ہورہی تھیں۔ میں نے کن انکھیوں سے دیکھا وہ میری ہی طرف دیکھ رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ ”حسن طبیعت میں غرور پیدا کرتا ہے اور غرور کردار میں خلا بنا دیتا ہے۔“

طیب کی سمجھ تو ویسے بھی موٹی تھی وہ بولا۔ ”مگر میں اسے لے کر کہاں آؤں۔ وہ زور نہیں ہے۔ پریشان ہے۔ اس کا اعتماد اٹھ گیا ہے.........“

”وہ اعتماد کرنا جانتا ہی نہیں......... خود کو عقل کل سمجھتا ہے۔ یہاں کوئی عقل کل نہیں۔ زمینوں کے نیچے بھی اسرار ہے اور آسمانوں کے اوپر بھی......... باقی سب خلا ہے......... صدیوں کا حساب رکھنا اور حساب بے لمحے گننا اور لمحوں سے پل نکال کر ہتھیلی

پر رکھنا آسان نہیں ہے مورکھ! یہ تماشا بھی نہیں ہے۔ یہ سب اعداد ہیں اور اعداد کا کھیل ہے.......... اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر تک سب ایک ہے.......... ایک دوسرے سے مل کر طاقت بنتا ہے.......... اندھیرا بذات خود اسرار ہے' روشنی بھی.......... رنگ بھی اور ہوا بھی.......... سب مربوط ہیں.......... مندروں کے اندر اور مسجدوں کے اندر' چرچ میں اور گردوارے میں کوئی چیز مختلف نہیں.......... صدیوں کا انسان ذرا سی تبدیلی پر نازاں ہے' بے حیثیت کو حیثیت دے دینا بھلا انسان کا کام ہے؟"

وہ عجیب سے انداز میں بول رہا تھا۔ اس کا کہا ہوا حرف حرف میں اپنے ذہن میں اتار رہا تھا۔ نہ معلوم کیوں مجھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ وہ یہ سب کچھ مجھے سنانے کو اونچے لہجے میں بول رہا ہے اور وہ جو کچھ بھی کہہ رہا' سب بامعنی ہے۔ وہ ایک ایسی زبان بول رہا تھا جو اس طرح کے لوگ عام طور پر نہیں بولتے۔ وہ حلیے سے کسی خاص مذہب کا پیروکار لگتا تھا' نہ چہرے سے.......... اس نے جتنی زبانوں کے الفاظ ان جملوں میں بولے تھے' وہ سب بڑی صفائی سے بولے تھے۔ لگتا تھا جیسے وہ صحیح ادائیگی سے واقف ہے۔ اب بھی طیب کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ پھر پوچھ رہا تھا۔

"آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں' ہم.......... ہمارا خاندان ایک مصیبت میں مبتلا ہیں.......... میں آپ کی مدد چاہتا ہوں.......... کیا آپ کچھ دیر میرے ساتھ گزار سکتے ہیں؟ آپ میرے ساتھ میرے گھر چلیں۔"

"طیب!"

میں نے آواز دے دی۔ وہ انتہائی بے وقوفی کی حرکت کر رہا تھا۔ ہم اسے' اس حلیے کے شخص کو لے کر گھر نہیں جا سکتے تھے۔ ناصر چچا ہمارے کان کھا جاتے' زہرہ آپا پورے گھر کو سر پر اٹھا لیتیں۔ گھر کے لوگ الگ ہم سے الجھ جاتے۔ طیب نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا اور پھر اس سے بولا۔

"آقا بابا! مجھے بتائیے۔"

اس شخص نے سر گھما کر اسے دیکھا پھر مسکرایا اور بولا۔ "تیری سمجھ میں کچھ نہیں آتا؟ اندھیری آ جانا کل۔ ریل کی پٹری کے نیچے' ندی کے پاس۔" اور اتنا کہہ کر اس نے سر کو کندھوں پہ لٹکی چادر سے ڈھانپ لیا اور سیدھا بیٹھ گیا.......... اکڑ کے.......... پھر طیب بولتا رہا مگر اسے کوئی جواب نہیں ملا اب ٹیکسی والا بھی الجھ گیا اور بولا۔

"صاب! آپ لوگ کو دیر ہے تو از جاؤ۔"

اب میں نے طیب کو آواز دی۔ وہ بڑبڑاتا ہوا چلا آیا۔ ٹیکسی میں بیٹھتے ہی بولا۔ "یار! بڑا پیچیدہ آدمی ہے۔ پتا نہیں' کیا کیا کہہ رہا تھا۔"

"مجھے پتا ہے کہ کیا کہہ رہا تھا۔" میں نے اس کی جانب دیکھ کر کہا۔ ٹیکسی والے نے ٹرن لیا اور ہم گھر کی طرف چل پڑے.......... راستے میں طیب نے بتایا کہ کل ہم اس سے ملنے اندھیری جائیں گے۔ میں نے کچھ نہیں کہا۔ وہ شخص اب میرے لئے بھی دلچسپ ہو گیا تھا۔ اس کی باتیں بڑی پُراسرار تھیں' پُرمغز تھیں.......... میں ان سے ملنا چاہتا تھا پھر اس کے نقوش جو نہ معلوم کیوں مجھے جانے پہچانے لگ رہے تھے اب کسی کانٹے کی طرح میرے ذہن میں چبھ رہے تھے۔ یہ احساس بڑھ رہا تھا کہ میں اسے جانتا ہوں' کیسے' یہ یاد نہیں تھا۔

ہم کچھ دیر بعد گھر پہنچ گئے۔ زہرہ آپا مجھے دیکھ کر حسب سابق ہولا گئیں۔ پندرہ منٹ تک صرف یہ پوچھتی رہیں کہ گھر میں سب خیریت ہے۔ میں کیوں آیا ہوں؟ عصمت آپا کیسی ہیں' فرحت اور بی جان خیریت سے ہیں کہ نہیں۔ منے دادا' منی دادی کی صحت کیسی ہے' وغیرہ وغیرہ۔ طیب نے اتنی دیر میں کئی فون کھما ڈالے تھے۔ وہ غالباً رہائش کا بندوبست کر رہا تھا۔ میں اسے صاف طور پر کہہ چکا تھا کہ میں کسی بھی حال میں ناصر چچا اور زہرہ آپا کے ساتھ نہیں رہوں گا۔ زہرہ آپا سے میں کہہ چکا تھا کہ میں دفتری کام کی وجہ سے آیا ہوں اور یہاں نہیں بلکہ دفتر کی جانب سے انتظام کئے گئے گھر یا ہوٹل میں رہوں گا۔ ناصر چچا نے لاتعلقی سے سب کچھ سن لیا۔ طیب کو لمبا چوڑا لیکچر دیا اور چلے گئے۔ ہم نے ہاتھ دھو کر کپڑے بدلے۔ طیب کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ قیام کا کوئی معقول انتظام کر چکا ہے۔

میں نے فراغت پاتے ہی طیب سے پوچھا۔ "کیا رہا؟"

"میرا ایک دوست حوالدار ہے۔ باندرے میں رہتا ہے۔ وہیں اس کی ڈیوٹی ہے۔ وہ تھانے کے احاطے میں رہتا ہے' کیونکہ اکیلا ہے اس کا ایک بنگلہ باندرے ہی میں ہے' وہاں انتظام ہو گیا ہے۔ اس کے نچلے حصے میں کوئی پروفیسر قیام پذیر ہیں۔ شام کو ہمیں وہاں جانا ہے۔ میرا دوست گوپال بھی وہیں مل جائے گا۔"

میں مطمئن ہو گیا۔ کچھ دیر آرام کرنے کے دوران میں' میں زہرہ آپا کی تسلی کراتا

رہا۔ انہیں اماں بہت یاد آرہی تھیں پھر انہوں نے جو خواب سنایا تھا اس نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ خود بہت پریشان تھیں۔ خواب میں انہوں نے عصمت آپا کو چیختے چلاتے اور تڑپتے دیکھا تھا اور ان کے جسم پر مکڑیوں کو رینگتے بھی دیکھا تھا۔ خواب سو فیصد سچا تھا مگر میں نے ہنس کر ٹال دیا۔ ان سے کیا کہتا' وہ تو غم سے ہی پاگل ہو جاتیں۔

طاہر بھائی بھی دورے سے واپس نہیں آئے تھے اس لئے ان کا وہاں جانا بھی مشکل تھا۔ میرے اطمینان دلانے سے وہ کچھ مطمئن ہو گئی تھیں مگر رہ رہ کر اماں اور عصمت آپا کا ذکر کر رہی تھیں۔ انہی باتوں سے مجھے الجھن ہوتی تھی۔ سو شام تک کا وقت جیسے تیسے گزار لیا پھر سر شام ہی ہم لوگ نکل گئے۔

طیب نے ناصر چچا کو بتا دیا تھا کہ وہ بھی میرے ساتھ رہے گا۔ انہوں نے بادل نخواستہ مان لیا تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ مجھ سے طیب کی وجہ سے زیادہ خوش نہیں ہیں۔ میں نے طیب سے کہہ دیا تھا کہ وہ واپس آجائے مگر یہ بات سن کر اس نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ ہم بانڈرے پہنچے تو وہاں ایک لمبا چوڑا' مضبوط جسم کا خوبصورت اور صحت مند نوجوان موجود تھا۔ یہی گوپال تھا۔ پڑھا لکھا اور شائستہ طبیعت کا مالک۔ اس نے میزبانی کا حق ادا کر دیا۔ گھر کی صفائی ستھرائی کر کے ایک بارہ تیرہ برس کے بچے کو ہماری خدمت پر بھی مامور کر دیا۔ وہ پینے پلانے کا شوقین تھا۔ سو اس کا انتظام بھی کیا ہوا تھا مگر میں نے معذرت کر لی۔ طیب بہت بے چین تھا۔ غالباً اس کے لئے یہ سنہری موقع تھا جو میری وجہ سے اس کے ہاتھ سے نکل رہا تھا۔

گوپال سے بڑی سیر حاصل گفتگو ہوئی۔ باتیں کرتے کرتے رات ہو گئی۔ جانے کیسے بات پُراسرار واقعات تک پہنچی اور اس نے کئی ناقابل یقین قسم کے واقعات سنا ڈالے۔ وہ ان باتوں پر یقین کرتا تھا' اس بات کی تصدیق ہو گئی تھی اور میں مطمئن بھی ہو گیا تھا کہ میری باتوں کو دیوانے کی بڑ نہیں سمجھے گا۔ طیب نے بڑے محتاط انداز میں ہمارے ساتھ ہونے والے واقعات کا بھی کچھ ذکر کر دیا تھا جسے اس نے بڑی توجہ سے سنا اور قطعی یہ ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی کہ یہ خرافات ہے بلکہ اس نے تشویش کا اظہار کیا۔ اس نے کالے علم کے ماہر جوگی بابا کا ذکر کیا اور اصرار کیا کہ ہم اس سے پہلی فرصت میں مل لیں۔ بہرحال اس گفتگو سے مجھے اس لئے اطمینان ہو گیا کہ اب اگر یہاں کوئی انہونی ہوئی بھی ہے تو اسے قائل کرنا یا ساتھ دینے پر مائل کرنا مشکل نہیں ہوگا اور یہ اچھا ہی ہوا ورنہ

شاید آج میں آپ کو یہ داستان سنانے کے لئے زندہ نہ ہوتا بلکہ گوپال ہی کے ہاتھوں گرفتار ہو کر پھانسی کے تختے تک پہنچ چکا ہوتا۔

یہ وہاں قیام کے چوتھے روز کا واقعہ ہے۔ رات کا وقت تھا۔ گوپال شراب کی بوتل شام ہی کو لے آیا تھا۔ میں نے طیب کو اس کے جانے کے بعد سختی سے کہہ دیا تھا کہ وہ اپنے آپے میں رہے' میری دوستی اور بے تکلفی کا ناجائز فائدہ نہ اٹھائے۔ یہ نہ بھولے کہ میں اس سے عمر میں بڑا ہوں اور منے دادا سے لے کر ناصر چچا اور طاہر بھائی تک کو دھوکے میں نہیں رکھ سکتا۔ نہ ان کے اعتماد کو خاک میں ملانا چاہتا ہوں۔ اس نے میری بات سن کر کئی قسم کے برے برے منہ بنائے تھے بلکہ یہ سمجھانے کی کوشش بھی کی تھی کہ ایک آدھا پیگ پینے سے کچھ نہیں ہوتا' بس وقت اچھا گزر جاتا ہے مگر پھر میرا موڈ دیکھ کر اس نے گفتگو کا موضوع ہی بدل ڈالا تھا۔

گوپال رات کو آنے کو وعدہ کر گیا تھا۔ شاید طیب کی وجہ سے وہ مجھے بھی کوئی عیاش آدمی سمجھا تھا۔ رات ساڑھے نو بجے وہ لوٹا تو میں اس کے ساتھ ایک خوب صورت اور اسمارٹ لڑکی کو دیکھ کر کافی خجل ہوا تھا۔ گوپال غالباً کہیں اور سے بھی ڈرنک کر کے آیا تھا۔ وہ لڑکی بھی نشے میں محسوس ہو رہی تھی۔ گوپال نے ہمارا تعارف کرایا تو اس نے بڑی بے تکلفی سے ہاتھ بڑھا کر مجھ سے مصافحہ کیا۔ میں نے جھجکتے ہوئے ہاتھ ملایا تھا مگر طیب پہلے ہی اپنے ہاتھ پتلون سے رگڑ رگڑ کر صاف کر چکا تھا مگر وہ لڑکی جس کا نام انیتا تھا' میرا ہاتھ تھامے کھڑی تھی۔ مجھ سے باتیں کرتی رہی اور میری تعریف بھی اس نے برملا کر دی۔ اس نے کہا تھا۔

"گوپال! تمہاری کمپنی میں اب اچھے لوگ بھی آگئے ہیں۔ مسٹر ضیاء پُرکشش اور ہینڈسم ہیں۔ میں کبھی کسی سے پہلی ملاقات میں متاثر نہیں ہوتی مگر.......... مسٹر ضیاء نے مجھے متاثر کیا ہے۔"

"جی' مجھے طیب کہتے ہیں۔ میں ضیاء کا کزن ہوں اور ہم کیونکہ ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے یہ وجاہت موروثی ہے.........." طیب نے فوراً مسکرا کر اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ ہنس پڑی۔ جان گئی کہ طیب اپنی بھی تعریف کا خواہش مند ہے۔

"جی! جی.........! لگ رہا ہے.......... اسمارٹ تو آپ بھی ہیں لیکن جو عجیب اور پُراسرار کشش ضیاء میں ہے وہ شاید ابھی پوری طرح آپ میں پیدا نہیں ہو پائی ہے شاید

بڑے ہو کر آپ بھی اتنے ہی پُرکشش ہو جائیں۔"

اس کی بات سن کر میں اور گوپال بے ساختہ ہنس پڑے۔ طیب بھنا گیا پھر اس نے سیدھے منہ انیتا سے بات نہیں کی اور انیتا بھی بات بات پر اس کا مذاق اڑاتی رہی۔ گوپال نے طیب کا بہت ریکارڈ لگایا۔

انیتا سے باتیں کرنے کے بعد جو کچھ اس کے بارے میں معلومات ہوئیں' وہ یہ تھیں کہ وہ کرسچن ہے۔ بمبئی میں رہتی ہے جبکہ اس کے والدین کا تعلق گوا سے ہے اور وہ اب بھی گوا میں رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کے چھ بہن بھائی ہیں۔ انیتا ایک پرائیویٹ کمپنی میں ملازمت کر کے ان سب کی کفالت کرتی تھی۔ اس کا باپ گوا میں ایک میڈیکل اسٹور چلاتا تھا مگر اس کی آمدنی زیادہ نہیں تھی کیونکہ وہ لوگ ایک چھوٹے سے قصبے میں رہتے ہیں۔ انیتا ہنس مکھ' پڑھی لکھی لڑکی تھی۔ اپنے پُرکشش جسم اور خوبصورتی کا اسے پورا ادراک تھا۔ ملازمت سے اس کا خرچہ پورا نہیں ہوتا تھا سو وہ اپنے چند مالدار دوستوں کو بھی وقتاً فوقتاً خوش کر کے اپنی ضروریات پوری کیا کرتی تھی۔ کمال یہ کہ اس نے یہ باتیں خود بتائی تھیں اور صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے اسے قطعی کوئی جھجک محسوس نہیں ہوئی تھی۔ جب میں نے اس کی بات سن کر اپنی بغلیں جھانکیں تو اس نے اندازہ لگا لیا کہ میں نے اس کی صاف گوئی کو مائنڈ کیا ہے جس پر اس نے مجھے جو کچھ کہا اسے سن کر میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہا........ اس نے کہا تھا۔

"مسز ضیاء! آدمی کو اپنی ضرورتیں ہر حال میں پوری کرنا پڑتی ہیں۔ اسے وہ اپنی صلاحیت سے ہی پوری کر سکتا ہے۔ میں جس قدر محنت کر سکتی ہوں' کرتی ہوں۔ مجھے ہڈ حرامی کی عادت نہیں ہے مگر دنیا کے ہر خطے میں عورت سے زیادہ کام لے کر کم معاوضہ دیا جاتا ہے۔ اب میری جو ضرورتیں تنخواہ سے پوری نہیں ہوتیں' ان کا میں کیا کروں۔ مرد میرا حق کھاتے ہیں۔ میں مردوں سے اپنا حق چھین لیتی ہوں۔ طریقہ کار وہی استعمال کرتی ہوں جسے کرنا میرے لئے آسان ہے۔ میں بندوق دکھا کر حق نہیں چھین سکتی۔ میں جھگڑا کر کے نہیں چھین سکتی۔ میرا وہی باس جو میری تنخواہ کم کر کے دیتا ہے' رات کو مجھے تنخواہ سے زیادہ رقم خوش ہو کر دیتا ہے۔ جس صلاحیت سے میں رات کو کام لیتی ہوں' اس صلاحیت سے زیادہ میں دن بھر کام کر کے بھی حاصل نہیں کر پاتی........ رہا برائی کا کانسیپٹ تو ہر شخص کی نظر میں مختلف ہے۔ جب میرے باس کو اپنی کمینگی کا احساس نہیں

ہوتا تو مجھے کیوں ہوگا؟ میں تو پھر محنت کر کے پیسا حاصل کرتی ہوں جبکہ وہ مجھ جیسی عورتوں کی محنت چراتا ہے۔ اسی سے اپنی تجوریاں بھرتا ہے........ وہ بڑا معزز ہے' بڑا معتبر ہے۔ اس کا معاشرے میں مقام ہے جبکہ میرے بارے میں لوگ غلیظ باتیں کرتے ہیں........ بہرحال میں اپنی ضروریات کسی کی مجبوری خرید کر پوری نہیں کرتی بلکہ اپنی ہی مجبوری کا سودا کرتی ہوں۔"

طیب تو ان باتوں سے شاید اس لئے خوش تھا کہ وہ اسے آسان لگ رہی تھی مگر مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ وہ سمجھدار' بااخلاق اور اعلیٰ طبیعت کی عورت ہے۔ آپ سوچیں گے کہ میں غلط تعریف کر رہا ہوں مگر سوچئے تو اس نے مجھے دھوکا دینے' خود کو شریف ظاہر کرنے یا اعلیٰ کردار کا حامل بتانے کے لئے جھوٹ نہیں بولا اور اس کی سچائی میرے دل میں اس کا احترام پیدا کر گئی۔ اس نے گوپال کے ساتھ پھر پیگ پر پیگ لنڈھانے شروع کر دیئے۔ صرف ایک مرتبہ مجھے ساتھ دینے کو کہا۔ جب میں نے معذرت کر لی تو وہ کچھ نہیں بولی بلکہ گوپال کے اصرار کرنے پر ٹوک دیا اور کہا۔

"یار! کیوں ضد کرتے ہو........ پینا برا ہے' سو ہے' ایک برے کام میں شامل ہونے کے لئے اصرار کرنا اس سے بھی بڑی برائی ہے۔"

"ہاں........! وہ تو ٹھیک ہے مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ پینے سے ایسا کون سا بھونچال آ جائے گا۔ میرا خیال ہے' ضیاء نے کبھی چکھی نہیں ہے اس لئے اس کے لطف سے واقف نہیں ہے۔"

یہ طیب تھا' میں نے اسے گھورا۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

"اچھا ہی ہے۔ ہر برائی میں لطف ہوتا ہے مگر وقتی........ ضیاء آئیڈیل قسم کا آدمی ہے۔ اگر یہ بلا تکلف پی لیتا تو میرے ذہن میں اس کا امیج شاید خراب ہو جاتا حالانکہ میں خود ڈرنک کرتی ہوں۔ ہر آدمی کو اپنی سوچ' اپنی رائے' اپنے اصول کا احترام کرنا چاہئے۔ خواہ وہ اچھے ہوں یا برے' اس سے اسے اپنی ذات کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے۔ آدمی علیحدہ کچھ ہوتا ثابت ہوتا ہے اور یہ ایک بہت اچھی بات ہے۔" انیتا نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ یہ ابھی جوان نہیں ہوا۔" طیب نے منہ بنا کر کہا۔

وہ ہنس پڑی۔ دیر تک ہنستی رہی۔ گوپال اب مکمل طور پر نشے میں تھا۔ وہ بار بار

انیتا کی طرف ہاتھ بڑھاتا جسے وہ بڑی نرمی اور غیر محسوس انداز میں ہٹا دیتی۔

"ویسے کیا واقعی آپ نے کبھی نہیں پی؟" وہ مجھ سے پوچھ رہی تھی۔

"نہیں.........! ایسا نہیں ہے کہ میں نہیں جانتا کہ شراب ہوتی کیا ہے' بلکہ میں نہیں سمجھتا کہ اسے پی کر آدمی کو کچھ حاصل ہوتا ہے۔ محض فرار' ایک ایسا کیف جو اسے کچھ دیر کے لئے اس جیتی جاگتی دنیا سے علیحدہ کر دیتا ہے پھر لوٹ کر' ہوش آنے پر اسے یہیں پہنچ جانا ہوتا ہے جن چیزوں سے وہ فرار حاصل کرتا ہے۔ وہ اب پھر یہاں موجود ہوتی ہیں۔ تب اس کے پاس کیا رہ جاتا ہے۔ وقت کے زیاں کا پچھتاوا اور بس۔"

"کریکٹ.........! ایگزیکٹ لی یہی ہوتا ہے۔" اس نے مضبوط انداز میں کہا۔

طیب للچائی ہوئی نگاہوں سے میز پر سجی شراب کی بوتل کو دیکھ رہا تھا۔ اب گوپال جھوم رہا تھا۔ بار بار انیتا کو اپنی طرف متوجہ کر رہا تھا۔ میں نے آرام کے لئے اجازت طلب کی۔ طیب نے فوراً اجازت دے دی مگر انیتا نے بیٹھنے پر اصرار کیا۔ گوپال تو صرف انیتا کی قربت کا خواہاں تھا۔ اسے دنیا و مافیہا کا ہوش نہیں تھا البتہ اس کی خاموشی سے مجھے اتنا اندازہ ہو گیا تھا کہ عام حالت میں بہت بولنے والا گوپال پی کر خاموش ہو جاتا ہے۔ میں نے انیتا سے معذرت کر لی۔ اٹھتے ہوئے طیب کو بھی آرام کا مشورہ دیا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں تنبیہہ بھی کر دی کہ وہ کوئی گڑبڑ نہ کرے۔ طیب کھسیا گیا۔ انیتا اداس ہو گئی اور بولی۔

"میں تو آپ سے مل کر بہت خوشی محسوس کر رہی ہوں۔ یہ واحد خوشی ہے جو مجھے محنت کے بغیر مل رہی ہے۔"

"خاتون! میں آپ کی ضروریات کا خیال کر کے اٹھ رہا ہوں۔ غالباً خوشی سے زیادہ دنیا میں ضرورت اہم ہے۔" نہ چاہتے ہوئے بھی جملے میں اور انداز میں طنز شامل ہو گیا جو مجھے بھی اچھا نہیں لگا۔ شدت سے احساس ہوا کہ وہ حساس لڑکی ہے' اسے ضرور دکھ ہوا ہو گا سو میں اس کی جانب دیکھے بنا کمرے سے باہر نکل گیا۔ مجھے اپنے پیچھے کسی تعاقب کا احساس نہیں ہوا حالانکہ لاشعور میں کہیں یہ توقع تھی اس لئے میں نے اپنے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر پلٹ کر دیکھا۔ وہ میری طرف ہی متوجہ تھی۔ چہرے اور آنکھوں میں سناٹے کا احساس ہوا۔ میں کمرے کے اندر داخل ہو گیا۔

یہ صاف ستھرا کمرہ تھا مگر ہوادار اور روشن نہیں تھا۔ ایک ڈبل بیڈ' دو کرسیاں

ایک چوکور اونچی سی ٹیبل اس کمرے کا کل سامان تھا۔ میری خواہش پر بیڈ کور سفید بچھایا گیا تھا۔ جس کی وجہ سے کچھ تروتازگی کا احساس ہوا تھا۔ رات کافی گزر چکی تھی۔ میں یہاں کسی قسم کی پُراسراریت محسوس نہیں کر سکا تھا اس لئے ذہن پُرسکون تھا۔ میں نے کپڑے بدلے اور سونے کے لئے لیٹ گیا۔ دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا حالانکہ طیب کے لئے دوسرا کمرہ سیٹ کیا گیا تھا پھر بھی خیال تھا کہ شاید حالات کی وجہ سے طیب کو اسی کمرے میں آنا پڑے۔

☆---------------☆---------------☆

میں جانے کب سو گیا۔ شاید رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی جب مجھے کسی نے جھنجوڑ کر جگا دیا۔ مجھے جگانے والا طیب تھا اور اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"کیا بات ہے؟" میں اچھل کر اٹھ بیٹھا۔

"وہ.....وہ رو رہی ہے۔"

"کون؟"

"انیتا!" طیب سخت مضطرب تھا۔

"کیوں؟ تم نے کوئی گڑبڑ تو نہیں کر دی۔"

"نہیں' نہیں یار! میں تو سو گیا تھا۔ وہیں.........اسی کمرے میں اور گوپال بھی وہیں بے سدھ پڑا ہے۔"

"پھر وہ کیوں رو رہی ہے؟" میں الجھ گیا۔

"تم خود پوچھ لو۔" وہ کھڑا ہو گیا۔

میں نے اٹھ کر چپل پیروں میں ڈالے ہی تھے کہ وہ دروازے تک پہنچ گئی۔ وہ اب بھی رو رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی طیب کمرے سے باہر چلا گیا۔

"آیئے' بیٹھئے!" میں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ چپ چاپ بیٹھ گئی۔ وہ بہت زیادہ نشے میں تھی۔ کرسی پر بیٹھنے سے پہلے وہ کئی جگہ لڑکھڑائی تھی۔ میں نے چاہا کہ اسے سہارا دوں مگر پھر جھجک گیا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے اسے اپنی جانب دیکھتے پا کر پوچھا۔ "آپ کیوں رو رہی ہیں؟"

"آپ کی بات پر۔" اس نے لگی لپٹی رکھے بغیر اپنی اسی خاص صاف گوئی سے کہا۔

"آئی ایم سوری! میرا مطلب آپ کو تکلیف پہنچانا نہیں تھا۔"

وہ اٹھی اور میرے قریب بیڈ پر آ بیٹھی۔ میں ذرا سا کھسک گیا مگر دوسرے ہی لمحے مجھے یوں لگا جیسے میں نے جانے کتنے پیگ چڑھا لئے ہیں۔ وہ میرے قریب سرک آئی اور میرا بدن آنچ دے اٹھا۔ وہی کیفیت طاری ہوتی چلی گئی جو میرٹھ میں چھت پر جا کر ہوئی تھی۔ میرے حواس ختم ہوتے چلے گئے اور میں جو طیب کو تنبیہہ کر کے آیا تھا' خود بہک گیا۔ کہکشاں جیسے کمرے میں اتر آئی تھی۔ رنگ و بو کا طوفان تھا۔ کیف و سرور تھا اور بیچ میں اکیلا تھا۔

ہوش آیا تو وہ بستر پر بکھری پڑی تھی۔ مجھے تو ہوش بھی اتنا ہی آیا تھا کہ احساس ہوا' میں پھر سرور کا سمندر عبور کر چکا ہوں' نہ پچھتاوے کا احساس بیدار ہوا تھا' نہ کسی قسم کی ندامت محسوس ہوئی تھی۔ بس ڈگمگاتی سی کیفیت تھی اور یہ احساس کہ اب سو جانا چاہئے۔ اس کی موجودگی میں سونا دشوار تھا' پھر طیب اور گوپال کے سامنے بات نکلنے کا ڈر اس لئے اسے کہیں اور پہنچانے کی خواہش تھی۔ میں نے اسے جگانے کی کوشش کی مگر وہ تو باقی نشے میں تھی' سو ہوں ہاں کے سوا اس کے منہ سے کچھ نہ نکلا' نہ اس کی آنکھ کھلی۔ آخر میں نے ہی اس کا پھولوں سا نازک بدن اٹھایا اور اس کے جسم سے نکلتی خوشبوؤں کے طوفان میں ڈگمگاتا کمرے سے باہر نکل آیا۔ میرے کمرے کے برابر میں بھی ایک کمرہ تھا۔ اس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے اندر جھانکا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ طیب شاید کسی دوسرے کمرے میں تھا اور گوپال یا تو جا چکا تھا یا ڈرائنگ روم میں تھا۔ میں اس لئے اس کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہ کمرہ بے حد نفاست سے سنوارا گیا تھا۔ صاف ستھرا بستر اور اس کے چاروں طرف بڑی سفید براق مچھردانی جس نے پورے بیڈ کو گھیرا ہوا تھا۔ اس کمرے میں سنگھار میز بھی تھی اور کچھ ایسی چیزیں بھی تھیں جو عام طور پر خواتین کے استعمال میں آتی ہیں۔ بہرحال ان چیزوں پر میں نے غور نہیں کیا بس ایک احساس تھا کہ یہ کسی خاتون کا کمرہ ہو گا یا رہا ہو گا۔ میں نے اسے بستر پر لٹا دیا۔ اس کے خوبصورت چہرے پر بلا کی معصومیت تھی۔ وہ بلاشبہ بے حد حسین لڑکی تھی۔ اس کے سیاہ بال جانے کب کھل گئے تھے جو بے حد خوبصورت لگ رہے تھے۔ میرا دل پھر ڈولنے لگا مگر اب میں خود پر کافی قابو حاصل کر چکا تھا اس لئے فوراً لوٹ آیا۔ اپنے کمرے میں آتے ہی میں سو گیا۔

☆-----------☆-----------☆

صبح مجھے طیب نے جگایا۔ وہ سخت ہراساں تھا۔ بوکھلایا ہوا تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے کچھ کہنا چاہا۔ وہ باہر کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ بار بار تھوک نگل رہا تھا مگر اس سے کچھ بولا نہیں جا رہا تھا۔ میں اٹھ کر باہر کی طرف لپکا۔ طیب میرے ساتھ تھا۔ ہم دونوں باہر آئے تو طیب میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اس کمرے میں لے گیا جہاں رات میں نے انیتا کو لٹایا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میری آنکھوں کے سامنے تارے ناچ گئے۔ انیتا کا گلا کٹا ہوا تھا۔ بستر خون میں تر تھا۔ اس کی وہ خوبصورتی جس نے رات مجھے بے خود کر دیا تھا اب بدصورتی میں تبدیل ہو چکی تھی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ طیب کی حالت بہت خراب تھی۔ میں نے انتہائی تیزی سے طیب کا ہاتھ تھاما اور اسے کمرے سے باہر لے آیا۔

"یہ........ یہ کیا ہوا ہے؟" میں نے طیب سے پوچھا۔

"مجھے........ مجھے نہیں پتا۔" اس نے بمشکل تمام کہا۔

"گوپال کہاں ہے؟" میں نے سرگوشی میں پوچھا۔

"وہ تو صبح ہی چلا گیا تھا۔" طیب نے فریج سے پانی کی بوتل نکالتے ہوئے کہا اور بوتل منہ سے لگا کر خالی کر ڈالی۔

"اسے انیتا کے بارے میں........"

"نہیں!" طیب نے میری بات کاٹ دی۔ "وہ سمجھا تھا کہ انیتا جا چکی ہے۔ میں بھی یہی سمجھا تھا۔ وہ تو جب دیر ہو گئی اور تم نہیں اٹھے تو میں تمہیں اٹھانے کے لئے آیا۔ تب میں نے یہ دروازہ کھلا دیکھا۔ اندر جھانکا تو........" اس نے سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"طیب........! آؤ۔ میرا دماغ بھی سن ہو چکا ہے۔ ہم ڈرائنگ روم میں بیٹھتے ہیں۔ وہ ملازم لڑکا کہاں ہے؟" میں نے اس کا ہاتھ تھام کر ڈرائنگ روم کی طرف بڑھا دیا۔

"وہ رات کو چلا گیا تھا۔ یہاں سے کچھ فاصلے پر بڑی جھونپڑیوں میں ایک اس کا گھر بھی ہے۔ گوپال نے کہا تھا کہ وہ صبح آ جائے گا۔ ہو سکتا ہے آ گیا ہو؟" پانی پی کر طیب کی حالت کچھ سنبھل گئی تھی۔

"دیکھو اسے........ اگر آ گیا ہو تو بھیج دو۔ کہہ دو کہ ہم لوگ جا رہے ہیں۔" میں سخت پریشان تھا۔ طیب چلا گیا۔ میں ڈرائنگ روم میں چلا آیا۔ یہاں رات کی

افراد تفریح کے اثرات جوں کے توں موجود تھے۔ میز پر مونگ پھلیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ دال موٹ گرے ہوئے تھے۔ شراب کی خالی بوتل قالین پر پڑی تھی۔ گلاس رکھے تھے۔ میں وہیں ایک طرف صوفے پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر میں طیب نے آ کر بتایا کہ لڑکا نہیں آیا ہے اور وہ مین دروازہ بند کر کے آیا ہے۔ نیچے جو پروفیسر رہتے تھے' وہ اکیلے تھے اور روز صبح سویرے یونیورسٹی چلے جایا کرتے تھے اس لئے نیچے بھی سناٹا تھا۔ میں نے کھڑکی سے جھانکا۔ مین گیٹ بند تھا۔

"نہیں ضیاء! گوپال ایسا کیوں کرتا اور پھر میں نے صبح اسے خود اٹھایا ہے۔ اس نے اٹھتے ہی سامنے صوفے پر دیکھ کر انیتا کے بارے میں پوچھا تھا۔ اس کے چہرے پر ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ میرا مطلب ہے کہ وہ ایسا نہیں کر سکتا۔"

"کیوں یہ خیال کیوں ہے تمہارا؟ تم بھول رہے ہو کہ وہ ایک حوالدار ہے۔ جانے کتنے قتل کئے ہوئے لوگ وہ دیکھ چکا ہے اور جانے کتنی ترکیبیں اسے آتی ہوں گی قتل کرنے کی۔ یہ بھی اس کے لئے ایسی خوفناک بات نہیں تھی کہ وہ قتل کر کے خوف زدہ اور آپے سے باہر ہو جاتا۔"

"مگر ایسا نہیں ہو سکتا۔ انیتا اس کی پرانی دوست تھی۔ وہ اسے اس لحاظ سے پسند کرتا تھا کہ وہ نہ صرف خوددار ہے' سچ بولتی ہے اور........"

"میں نہیں جانتا کہ تم اس کی حمایت کیوں کر رہے ہو؟" میں نے جھنجلا کر کہا۔ "شاید جانتے نہیں ہو کہ یہاں اکثر لوگ دوستوں کی پشت میں خنجر گھونپتے ہیں۔ اگر یہ گوپال کی پلاننگ تھی تو یقین کرو' وہ بہت ذہین آدمی ہے اور خوش قسمت بھی کہ وہ قتل کے الزام سے صاف بچ نکلے گا۔ قدرت نے اسے بہترین موقع فراہم کیا ہے۔ فی الحال یہ سوچو کہ اس لاش کا کیا کیا جائے۔"

"میں........ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ضیاء! میں کچھ نہیں سوچ سکتا۔ یہ الیپا کی کوٹھی نہیں ہے کہ ہم اسے کہیں دفن کر دیں۔ یہاں نہ تو اتنی جگہ ہے اور نہ یہاں پر ہم اکیلے ہیں۔ وہ پروفیسر زیادہ سے زیادہ دو بجے تک گھر آ جاتا ہے' پھر وہ لڑکا........ میں گوپال کو فون کروں؟"

"نہیں!" میں نے کہنے کو تو کہہ دیا مگر میں بھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تھا کہ اب کیا ہوگا۔ یہاں مجھے خیال ہی نہیں آیا کہ یہ زیوسا کی کارستانی بھی ہو سکتی ہے۔ خاص طور

پر ان حالات میں کہ وہ غم و غصے میں مبتلا ہوگئی تھی اور اس کی منشا یہی تھی کہ میں بھی عورت کے قریب نہ جاؤں۔ زیوسا کا خیال تو جب آیا‘ جب میں کافی دیر مغز کھپانے کے بعد پھر انیتا والے کمرے میں گیا کہ آخر ہمیں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ میں یہ بھی جاننا چاہتا تھا کہ اسے کس طرح قتل کیا گیا ہے۔ گزرتے وقت نے طیب کو بھی کچھ سکون بخش دیا تھا۔ گو گھبراہٹ نے اسے بھی ہلکان کر دیا تھا مگر اب وہ سوچنے سمجھنے کے قابل ہو گیا تھا۔ میں اٹھنے لگا تو وہ بھی کھڑا ہو گیا۔

ہم دونوں انیتا کے کمرے میں پہنچے۔ پورے کمرے میں سکون تھا۔ ہر چیز اپنی جگہ پر تھی مگر انیتا کی گردن الگ تھی اور خوب صورت جسم الگ۔ یہ بڑا بھیانک منظر تھا مگر میں نے خود پر قابو رکھا۔ یہ بات کم پریشان کن نہیں تھی کہ دن چڑھ چکا تھا۔ ہمارے گھر میں ایک کمرے کے اندر ایک لڑکی کی لاش پڑی تھی۔ ہم بے بس تھے‘ نہ لاش کو ٹھکانے لگا سکتے تھے اور نہ ہی اسے یوں چھوڑ سکتے تھے۔ میں یہ معاملہ گوپال کے حوالے کرنے کو ابھی تیار نہیں تھا کہ مجھے اب بھی اسی پر شک تھا۔ میں نے جھک کر غور سے انیتا کی لاش کو دیکھا اور اور یہ دیکھ کر چونک گیا کہ اس کی لاش پر پہلی نگاہ ڈالتے ہی مجھے جس بدصورتی کا احساس ہوا تھا‘ وہ احساس اب نہیں تھا۔ اس کے چہرے کی سرخی تک ویسی ہی تھی جب کہ بستر پر اس کی گردن کے قریب خون کا دریا سا بن گیا تھا۔ وہ اب بھی جیتی جاگتی‘ حسین صورت کی لڑکی تھی۔

"طیب!" میں نے دور کھڑے طیب کو پکارا۔ "ادھر آؤ۔ دیکھو‘ تمہیں کچھ محسوس نہیں ہو رہا۔"

طیب جھجکتا ہوا آگے بڑھا اور پھر میں نے اس کے چہرے پر بھی تعجب محسوس کیا۔

"ہاں..........! یہ اس وقت.........."

پھر طیب نے مجھے چونک کر دیکھا۔ "مختلف لگ رہی تھی؟" میں نے اس کا جملہ پورا کر کے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں!" اس نے تھوک نگل کر سر ہلایا۔ "مگر یہ ضیاء!" وہ اچانک ٹھٹکا۔ "یہ زیوسا.......... تو.........."

"ہاں! مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے۔" میں نے پُرسوچ انداز میں لاش کو دیکھا۔ اگر خون نہ پھیلا ہوتا تو یقین کیجئے‘ میں دھوکا کھا جاتا کہ وہ زندہ ہے۔ مر کر بھی اس کے چہرے

پر مردنی نہیں‘ زندگی تھی۔

پھر میں اچھل پڑا۔ طیب کے منہ سے عجیب سی آواز نکلی تھی۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ سر اٹھا کے چھت کو تک رہا تھا۔ بے اختیار میں نے بھی اسی جانب دیکھا۔ پوری چھت پر مکڑی کا جالا بنا تھا۔ ایک سیاہ اور بہت بڑی مکڑی اس جالے کے بیچوں بیچ بیٹھی تھی اور یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ہمیں ہی دیکھ رہی ہو۔ اس صاف ستھرے کمرے کی چھت پہ یہ جالا اتنا بھیانک لگ رہا تھا کہ طیب اچھل کر باہر بھاگ لیا۔

"زیوسا! کیا یہ تم ہو؟" میں نے دانت کچکچا کر یوں کہا جیسے وہ مکڑی ابھی بول پڑے گی مگر کمرے میں چھایا سناٹا گہرا ہو گیا پھر مجھے یوں لگا جیسے اس سناٹے میں کسی کے سانس لینے کی آواز دھیرے دھیرے ابھر رہی ہو۔ میں بے اختیار پلٹا۔ یہ آواز انیتا کی لاش کی جانب سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ مگر میرا اندازہ غلط نکلا۔ اب مجھے وہاں رکنا محال لگ رہا تھا۔ میں کمرے سے باہر آ گیا۔ اس دروازے کے لاک میں چابی لگی ہوئی تھی۔ میں نے دروازے کو لاک کیا۔ چابی نکال کر اپنی جیب میں ڈالی اور ادھر ادھر دیکھا۔ طیب نظر نہیں آیا۔ میں نے آواز دی۔ وہ ڈرائنگ روم میں تھا۔ میں وہیں چلا آیا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہ سارا جال زیوسا کا پھیلا ہوا ہے۔

"طیب چلو! میرا خیال ہے کہ تمہارے اس آکا باگیا کے پاس جانا ہی پڑے گا۔"

میری بات سن کر طیب نے چونک کر گھڑی دیکھی اور بولا۔ "ہاں ضیاء! یہ معاملہ یونہا ہاتھ پہ ہاتھ دھرے رہنے سے حل نہیں ہوگا۔ وہ کچھ نہ کچھ ضرور کریں گے۔"

میں سلیپنگ سوٹ میں تھا جب کہ طیب کپڑے بدل چکا تھا۔ میں نے کپڑے بدلے۔ طیب نے پوچھا کہ لاش کا کیا ہوگا‘ میں نے یہی کہہ دیا کہ رات کو دیکھیں گے۔ اس وقت یوں بھی کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ علاقہ گنجان تھا۔ ایلیسا کی کوٹھی کی طرح سنسان علاقہ نہیں تھا۔ لیکن ایک بات میں سوچ چکا تھا کہ اگر لاش کو ٹھکانے لگانا بھی پڑا تو ایک ہی صورت ہو سکتی ہے کہ ہمارے پاس اب بھی ایلیسا کی کوٹھی کی چابی تھی۔ طیب کار لے آتا اور ہم رات کے اندھیرے میں انیتا کی لاش وہاں لے جاتے۔ بہرحال یہ سب سوچا تو تھا مگر ابھی صورت حال واضح نہیں تھی۔ سچی بات ہے کہ ذہن ٹامک ٹوئیاں مار رہا تھا۔ مگر اس آکا باگیا سے مل کر ہی کچھ طے کرنا چاہتا تھا۔

ہم گھر سے نکلتے ہوئے کافی کنفیوز تھے۔ نکلنے سے پہلے بھی ہم نے انیتا کے کمرے

کا لاک چیک کیا تھا۔ یہ طیب نے بتایا تھا کہ گھر کی دوسری چابی گوپال کے پاس ہے' مجھے دھڑکا ہو گیا۔ اگر وہ پیچھے آ گیا تو جانے کیا ہو گا اسی لئے میں نے اس کمرے کی چابی جیب میں ڈال لی تھی۔ دن کے ساڑھے گیارہ بج چکے تھے۔ دھوپ کی تیزی نے سڑکوں پر ہلچل سی مچا دی تھی۔ ہر شخص بھاگنے کے سے انداز میں چل رہا تھا۔ ہم نے باہر آتے ہی ٹیکسی کر لی۔ اندھیری تک کا راستہ خاصا طویل تھا۔ ہم نے ریل کی پٹڑی کے برابر والی سڑک پکڑی اور پندرہ بیس منٹ میں اندھیری پہنچ گئے۔ ہمارے دائیں جانب ریل کی پٹڑی چل رہی تھی۔ اندھیری کے اسٹیشن سے چند فرلانگ آگے وہ حصہ دور ہی سے نظر آ گیا جو کہلاتا تو ندی تھا مگر سال میں صرف ماہ' دو ماہ ہی اس میں ندی بہتی تھی ورنہ تو جگہ جگہ جوہڑ سے بنے تھے۔ طیب نے ٹیکسی کنارے پر ہی رکوائی۔ میں چاروں طرف دیکھ کر اندازہ لگا رہا تھا کہ یہاں ایسی کون سی جگہ ہے جہاں وہ شخص مل سکتا ہے لیکن نزدیک و دور کوئی ایسا گھر نظر آیا نہ جھونپڑی جہاں اس کی موجودگی کا سوچ پاتا۔ طیب نے ٹیکسی والے کو کرایہ دے کر بھیج دیا۔

اب میں اور طیب ندی کی طرف چل دیئے۔ طیب بھی حیران تھا کہ یہاں آکا باگیا کہاں ملے گا۔ ندی کی ڈھلان میں اتر کر ہم بالکل اس کے کنارے پہنچ گئے مگر وہاں دور دور تک کوئی نہیں تھا۔

"واپس چلو۔ وہ کوئی ڈراما باز تھا۔" میں نے الجھ کر کہا۔ گرمی سے میری حالت بری ہو رہی تھی۔

"یار! ایسا ہو نہیں سکتا۔" طیب نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "وہ دیکھو۔" اچانک وہ چیخا۔ میں نے دیکھا۔ وہ ایک جانب اشارہ کر رہا تھا۔ میں نے اس کے اشارے پر اس طرف دیکھا۔ وہی غلیظ اور لاغر شخص ایک ٹنڈ منڈ درخت کی کھوہ میں سر نیہوڑائے بیٹھا تھا۔ ہم دونوں اس کی طرف بڑھے۔

"آکا باگیا!"

طیب نے قریب پہنچ کر اسے پکارا۔ اس نے سر اٹھا کر ہمیں نہیں دیکھا بلکہ وہ اسی انداز سے سر جھکائے جھکائے کھڑا ہو گیا اور پلٹ کر ایک طرف چل پڑا۔ ہم اس کے پیچھے تھے۔ وہ ایک چھوٹی سی چڑھائی پر چڑھ گیا۔ یہاں ایک ٹوٹی ہوئی دیوار سی تھی جو غالباً ندی کا پانی چڑھنے کی وجہ سے ان حالوں کو پہنچی تھی۔ اس دیوار کے پار ایک جھونپڑا تھا۔ وہ

اس جھونپڑے میں داخل ہو گیا۔ ہم اب بھی اس کے تعاقب میں تھے۔ وہ اندر داخل ہوتے ہی زمین پر بیٹھ گیا۔ اب اس نے سر اٹھا کر ہمیں دیکھا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور ان میں ایسی چمک تھی کہ میری ریڑھ کی ہڈی میں سرد سی لہر دوڑ گئی۔ یہ سرد لہر اس کی آنکھوں کی چمک دیکھ کر نہیں بلکہ اس احساس کی وجہ سے دوڑی تھی کہ عین اسی لمحے میری نگاہوں کے سامنے وہ چمکدار آنکھیں گھوم گئی تھیں جو میں نے خواب میں دیکھی تھیں۔ اس پنڈت کی آنکھیں جو مجھے ایک بہت پرانے کھنڈر میں یہ کہہ کر لے گیا تھا کہ آج پوری ایک صدی کے بعد تم نے اس مندر میں قدم رکھا ہے' اب میں آزاد ہو جاؤں گا۔ وہی پنڈت جس نے میری کلائی تھامی تھی تو اس کی لمبی لمبی انگلیاں سنپولیوں کی طرح میری کلائی سے لپٹ گئی تھیں اور مجھے لگا تھا جیسے میں کھائی میں گر رہا ہوں اور.......... جب میری آنکھ کھلی تھی تو زیوسا فرحت کے روپ میں میرے سامنے موجود تھی۔

میں نے سر کو جھٹک کر خود کو سنبھالا۔ اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔ پہچان کا مخصوص رنگ اس کی آنکھوں میں بھی تھا لیکن میں تذبذب کا شکار تھا۔

"آکا باگیا! ہم آ گئے ہیں۔ آپ نے بلایا تھا۔ ہم بہت پریشان ہیں۔ کیا آپ جانتے تھا کہ ہم کس.........."

"لاش چھوڑ آئے ہو؟"

وہ طیب کی بات کاٹ کر بولا تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

"جی آکا باگیا! آپ تو جانتے ہیں کہ ہم نے اسے قتل نہیں کیا۔" طیب گھگھیانے لگا۔

"اس نے کیا ہے اس کا قتل۔" اس نے اپنی پتلی سی' لمبی سی انگلی کو میری جانب اٹھاتے ہوئے انتہائی سفاکی سے کہا۔

"کک.......... کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ ہوش میں تو ہیں۔" میں بوکھلا کر بولا۔ میری نظر طیب پر پڑی۔ وہ خوف زدہ نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بے یقینی کے تاثرات بھی تھے۔ "نہیں طیب..........! یہ شخص جھوٹ بول رہا ہے۔ خدا کی قسم! میں نے قتل نہیں کیا۔" میرے پسینے چھوٹ گئے۔

"قسم مت کھا۔ مت کھا قسم۔ اس کا قاتل تو ہے۔ تو.......... تو جانتا تھا کہ اگر کسی عورت سے تعلق قائم کرے گا تو وہ زیوسا کے انتقام کی بھینٹ چڑھ جائے گی۔"

وہ چیخا مگر اب جو کچھ اس نے کہا تھا' اس نے تو میرے چھکے ہی چھڑا دیئے۔ میں اس کے بارے میں غلط فہمی کا شکار تھا۔ وہ تو بہت پہنچا ہوا آدمی تھا۔ اسے شاید اب کچھ بھی بتانے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اس بار میں گھگھیا گیا۔ اس کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

"آکا باگیا! میں زیوسا کی بات کو صرف دھمکی سمجھا تھا۔ اس نے فرحت کو نقصان تو نہیں پہنچایا تھا مگر پھر.........."

"اس کی بات اور تھی۔ وقت گزر جاتا ہے تو پیچھے اور سب کچھ چھوڑ جاتا ہے۔ اس وقت وہ تیری محبت میں ڈولی تھی اور اب......... بے وقوف ہے تو۔ زنجیریں اس کے حوالے کرنے سے بہتر تھا کہ وہ تسلا کو دے دیتا۔"

میں اور طیب آنکھیں پھاڑے اس کی بات سن رہے تھے۔ وہ چپ ہو کر' سر جھکا کر یوں بیٹھ گیا جیسے وہ اکیلا ہو۔

"آکا باگیا! ایک بے وقوفی نہیں ہوئی۔ ہزار غلطیاں ہوئی ہیں مگر میں......... میں قطعی بے قصور ہوں۔ اس چکر سے نکلنا چاہتا ہوں۔ خدا کے واسطے' میری مدد کریں۔ اب میرے اندر سکت نہیں ہے کہ.........."

تیری کوئی حیثیت ہی نہیں ہے مورکھ! پھر بھی تو اب تک زعم میں ہے۔ سکت ہوتی تو کیا کر لیتا؟ ان طاقتوں سے ٹکر لینا کھیل سمجھا ہے تو نے؟ پتا نہیں' کتنے آئے اور مٹی ہو گئے۔ کتنے اٹھے اور راکھ بن گئے۔ کتنے ابھرے اور ڈوب گئے۔ تو سمجھتا ہے' تجھ میں سکت ہوتی تو سب کچھ تیرے چٹکی بجاتے ہو جاتا ہے۔ نیکی اور بدی کی جنگ میں تو کیا کر لیتا۔ ہیں بتا!"

وہ بے طرح چیخ رہا تھا۔ اس کا انداز توہین آمیز تھا مگر اس بار میرے اندر سناٹا چھایا رہا۔ شاید کوئی اور ہوتا' کبھی بھی کوئی اس طرح مجھ سے بات کرتا تو میرے اندر اٹھنے والے بگولے مجھے واقعی قاتل بنا دیتے مگر آکا باگیا کی حیرت انگیز قوت نے مجھے پتھر کا بنا دیا تھا۔ میں اسی طرح اس کا لرزتا کانپتا گھٹنا پکڑے سر جھکائے بیٹھا رہا۔ میں نے طیب کی طرف بھی نہیں دیکھا کہ اس کی کیا حالت ہے۔

وہ خاموش ہو گیا۔ بالکل چپ......... میں نے اسے دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کیے زور زور سے سر ہلا رہا تھا پھر اچانک وہ بول اٹھا۔

"ایک صدی کے بعد......... پوری ایک صدی کے بعد آدمی آزاد ہو جاتا ہے۔ انسان کی ہیئت تبدیل ہو جاتی ہے۔" وہ بڑبڑا رہا تھا۔ "ایسے نہیں لگتا مگر بہت کچھ بدل جاتا ہے۔ طاقتیں کمزور نہیں پڑتیں' ابھر آتی ہیں' یہاں نہیں تو وہاں......... وہاں نہیں تو کہیں اور......... کسی اور شکل میں' کسی اور جذبے میں۔"

میں نے طیب کی طرف دیکھا۔ وہ بھی الجھن میں تھا۔ ابھی تک آکا باگیا نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی جو مجھے نجات کی راہ سجھاتی۔

"آکا باگیا! ہمیں ان جھمیلوں سے بچا لیں۔" طیب ان کے قریب بیٹھ گیا۔

میں آکا باگیا کے ان جملوں پر غور کر رہا تھا جو انہوں نے ادا کیے تھے۔ ان میں پوری ایک صدی گزر جانے والے جملے نے مجھے کھٹکا دیا تھا۔ یہ جملہ بھی خواب میں وہ پنڈت بول چکا تھا۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ میں نے آکا باگیا کو ہی خواب میں دیکھا تھا۔

"آکا باگیا.........!" میں نے سرگوشی کی۔ "میں آپ سے پہلے بھی مل چکا ہوں۔"

آکا باگیا نے اس جملے پر کوئی دھیان نہیں دیا حالانکہ مجھے توقع تھی کہ وہ چونک اٹھے گا۔ وہ اب پھر گہری خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں پھر اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت تھی۔

"سن! جلدی جا.........! شادی کر لے......... جلدی جا......... شادی کر لے.........."

میں اور طیب دونوں ہی اچھل پڑے۔ "کک......... کیا.........؟" میں نے بے اختیار پوچھا۔

"ہاں.........! انیتا سے شادی کر لے۔"

اب میں بری طرح اچھل پڑا۔ طیب تو جم کر رہ گیا تھا۔ "کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ وہ......... وہ مر چکی ہے اور اگر زندہ بھی ہوتی تو میں ہرگز ایسا نہ کرتا۔ میں تو........."

"ہاں.........! تو' تو......... پاگل ہے۔ تیری جان پر بنے گی تو تجھے زندگی کی قدر کا احساس بھی ہو گا۔ یوں......... یوں تو سنبھلنے والا نہیں ہے۔" انہوں نے اتنا کہہ کر میرا وہ ہاتھ جھٹک دیا جو میں اب بھی ان کے گھٹنے پر رکھے بیٹھا تھا۔

"مگر میں ایسا نہیں کر سکتا۔"

"پھر تو کچھ بھی نہیں کر سکتا۔" وہ غصے میں بھنا کر اٹھ گئے۔

"ضیاء......!" طیب نے مجھے چونکا دیا۔ "یہ کہہ رہے ہیں تو...... تو اس کا مطلب ہے کہ انیتا......"

میں بھی چونک اٹھا۔ یہ خیال تو مجھے آیا ہی نہیں تھا کہ میں ایک بہت بڑی مشکل سے نکل آیا ہوں۔ آکا باگیا کھڑے ہو چکے تھے۔

"تیری نجات اسی میں ہے مورکھ......! ورنہ تو اپنی ساری زندگی سلاخوں کے پیچھے کاٹے گا۔" انہوں نے مجھے ٹھوکر ماری اور جھونپڑی سے باہر نکل گئے۔

میں اور طیب جو ایک لمحے کو یہ سن کر ساکت رہ گئے تھے' اچانک باہر لپکے مگر باہر پھیلی دھوپ میں سناٹا تھا۔ دور دور تک کوئی بھی نہیں تھا۔ جانے وہ آکا باگیا کہاں چلا گیا تھا۔ ہم دونوں نے اسے ہر جگہ تلاش کیا۔ ندی کے کنارے' درختوں کے نیچے' اوپر' سڑک پر مگر وہ کہیں بھی نہیں تھا۔

"ضیا......! ہمیں گھر جانا چاہئے۔ میرا خیال ہے کہ تم ان کی ہدایت پر عمل کرو ورنہ جانے کیا ہو جائے۔"

"ہوں......!" میں پریشان تھا۔ "مگر انیتا سے شادی...... یہ کیسے ممکن ہے؟"

"پلیز ضیا! کیا اب بھی تمہیں آکا باگیا پر شک ہے؟"

"پہلے گھر چلو پھر سوچیں گے۔"

میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ ہم نے ٹیکسی پکڑی اور سیدھے گھر پہنچ گئے۔ نچلے حصے میں رہائش پذیر پروفیسر بھی شاید ابھی ابھی آئے تھے۔ وہ گیٹ پر ہی تھے کہ ہم پہنچ گئے۔ طیب نے میرا ان سے تعارف کرایا۔ وہ رسمی سی گفتگو کر کے اور دوبارہ ملاقات کی خواہش کا اظہار کر کے چلے گئے۔ مجھے اور طیب کو یوں بھی اوپر جانے کی جلدی تھی۔ ہم اوپر پہنچے۔ گوپال غالباً ابھی نہیں آیا تھا۔ میں سیدھا اس کمرے کی طرف لپکا جہاں ہم انیتا کی لاش کو چھوڑ کر گئے تھے۔ میں نے جیب سے چابی نکال کر اسے لاک میں گھمانا چاہا مگر محسوس کیا کہ دروازہ لاک نہیں ہے۔ میرے ہلکا سا دباؤ ڈالنے پر دروازہ بے آواز کھل گیا۔ دروازہ کھلتے ہی میں حیرت زدہ رہ گیا۔ وہاں انیتا اکیلی نہیں تھی۔

آکا باگیا اس کے قریب بیٹھا تھا۔ انیتا بے سدھ لیٹی تھی۔ دوسرا جھٹکا مجھے اس وقت لگا جب میں نے دیکھا کہ اس کی گردن ثابت ہے۔ خون کا کہیں ایک قطرہ بھی دکھائی نہیں ... بلکہ یوں لگا جیسے انیتا بے خبر سو رہی ہے۔ یہ سب دیکھ کر میری جان آئی۔ آکا باگیا

ہماری آمد سے بے خبر انیتا کے قریب آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ چہرہ تمتما رہا تھا۔ دونوں ہاتھ انیتا کے چہرے پر پھسل رہے تھے۔ جیسے کچھ ٹٹول رہے ہوں۔

میں اسی جگہ ساکت کھڑا تھا جب طیب نے دھیرے سے میری کمر کو چھوا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا' وہ چھت کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ میں نے چونک کر چھت پر دیکھا۔ وہاں نہ وہ کریہہ مکڑی تھی نہ اس کا جالا' سب کچھ ٹھیک تھا جیسے جو کچھ ہم نے اب سے پہلے دیکھا وہ کوئی بھیانک خواب تھا۔

اچانک آکا باگیا نے آنکھیں کھول دیں۔ سرخ انگارہ سی آنکھوں میں عجیب پُراسرار سی چمک تھی۔ اس کی نگاہیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

"ادھر آ!" اس نے کرخت آواز میں مجھے مخاطب کیا۔

میں قریب چلا گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے بدن سے ہلکی سی آنچ آ رہی تھی۔ جیسے میں دہکتے کوئلوں کے قریب آ گیا ہوں۔

"اس سے شادی کرنا تیری مجبوری ہے ورنہ تو عذابوں میں ایسا پھنسے گا کہ نکلنے کو راستہ نہیں مل سکے گا۔ موت نہیں آئے گی' اذیت آتی رہے گی۔ موت تو اس لمبے سفر کی منزل ہے۔ ایک اور سرائے ہے' ایک اور لمبا سفر' پھر وہاں سے بھی آگے جانا ہے۔ سب کو موت آ جائے گی تو کس بات سے گھبراتا ہے کیا فرحت ہمیشہ زندہ رہے گی؟ کیا تیرے رشتے دار حیات کے آخری کنارے تک جیتے رہیں گے نہیں' حیات تو اربوں سال سے سفر میں ہے' اسے زوال نہیں آتا' ہر مادی شے کو زوال آ جاتا ہے۔ حیات ایک سایہ دار درخت ہے جو اس کی چھاؤں میں ستا کر آگے بڑھ جاتا ہے اس کی جگہ دوسرا لے لیتا ہے۔ زندگی کا فلسفہ بہت آسان ہے اور موت کا بھی۔ اسرار ہر جگہ ہے' طاقت سب میں ہے۔ بشرطیکہ آدمی جان لے۔ جو جان لیتا ہے' وہ فلاح پاتا ہے۔ بے ترتیبی کو درست کرتا ہے مگر حیات پر حاوی نہیں ہو سکتا' یہ نظام ہے' اس سے آگے پیچھے کچھ نہیں ہے۔ سمجھا تو؟"

اس کی آواز نہ صرف یہ کہ نرم تھی بلکہ انداز میں شفقت تھی۔ وہ سمجھانے والے انداز میں بول رہا تھا' سچی بات تو یہ ہے کہ اس نے حیات و موت کا جو فلسفہ مجھے سمجھایا تھا وہ بہتے چشمے کی طرح میرے دل و دماغ میں اترتا چلا گیا تھا۔ یہی سب کچھ تو ہمارے مذہب نے بھی ہمیں سمجھایا تھا۔ مگر لوگوں نے اسے کتنا پیچیدہ بنا ڈالا تھا۔ گناہ ثواب

کی ایسی تفریق کی تھی کہ سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا کہ خدا اصل میں کیا چاہ رہا ہے۔ ایسے ایسے نظریات لوگوں نے بنا دیئے تھے کہ آدمی اصل تک پہنچنے سے پہلے ہی گورکھ دھندے میں پھنس جاتا تھا۔ اگر اسے یقین ہو جائے کہ اسے یہاں ہمیشہ نہیں رہنا۔ ہر مادی شے کو زوال ہے ارتقاء کی منزلیں بہت آگے ہیں' دنیا پر حاوی ہونا' حیات پر قادر ہونا اس کے بس کی بات نہیں تو.......... تو شاید ہر شخص موت کا انتظار کرتا اور اچھے برے کی تمیز ایسی بھی مشکل نہ تھی کہ وہ ثواب کے بکھیڑوں میں پڑ کر اصل بات فراموش کر دیتا۔ وہی اچھا ہوتا ہے جو اس کے اپنے اور ہر دوسرے کے لئے اچھا ہو۔ بس یہی ثواب ہے۔ اور ہر وہ جو اس کے اپنے اور دوسرے کے لئے برا ہو' وہ گناہ.......... اس کی باتیں مجھ پر رقت طاری کر رہی تھیں۔

"یہ.......... یہ زندہ ہے آکا باگیا؟" طیب نے مجھے سوچوں کے بھنور سے نکال لیا۔

"زندہ ہے مگر وہ زندگی کس کام کی جو جذبوں' رشتوں اور احساسات سے عاری ہو۔" وہ اسی نرمی سے بولا۔

"جذبے رشتے اور احساسات ہی تو آدمی کو گناہ پر اکساتے ہیں۔" میں سرگوشی کے سے انداز میں بولا۔

"ہاں! مگر سطحی سوچ کے آدمیوں کو۔ یوں بھی جذبوں' رشتوں اور احساسات کا رخ دینے والا آدمی ہی کے اندر بیٹھا انسان ہوتا ہے۔ کبھی باہر کا آدمی طاقت ور ہو جاتا ہے اور کبھی اندر کا انسان اور سنو! انسان کی طاقت کو مان لینا آدمی کی بہتری ہوتی ہے۔"

طیب اسے بوریت اور میں حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ میں اس سے متاثر ہو چکا تھا۔ وہ کوئی پیر فقیر' عامل یا جادوگر نہیں تھا۔ وہ عالم تھا' کائنات کے ہر علم سے واقف۔ "کسی بھی دوسرے کی قربت اس سے واقفیت پیدا کرتی ہے' پھر انسیت' تب جذبے ابھرتے ہیں' احساسات بنتے ہیں اور رشتے تشکیل پاتے ہیں۔ یہ ہے انسان اور انسانوں سے رشتوں کا فلسفہ۔ انیتا عورت ہے' لڑکی بھی تھی' اور بچی بھی' یہ ایسی اکیلی' اور اکیلا آدمی سدھ بدھ کھو دیتا ہے۔ اسے اپنا لو۔ کردار مضبوط ہو تو انسان طاقت ور ہو جاتا ہے۔ موت ڈرنے والی چیز نہیں' اپنا لینے والی چیز ہے مگر اسے مارا نہیں گیا۔ تمہیں اذیت دی گئی ہے۔ ایلن کو بھی مارا نہیں گیا تھا' اذیت دی گئی تھی۔ وتسلا مرے گی نہیں اذیت اٹھاتی رہے گی مگر وہ مر گیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ رکے گا نہیں' آگے جائے گا۔ جو گناہ سرزد ہوا' جو معاملہ

بگڑا' وہ درست بھی ہو سکتا ہے۔ یہی راز پا لیا تھا اس نے۔ تم راز پا لو گے تو اسرار عیاں ہو کر بے حیثیت ہو جائیں گے۔ اٹھو..........! زیوسا' طاقت ہے' اذیت نہیں۔ فرحت' تڑپ کو جذبہ سمجھتی ہے تم بھی۔ سب کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ نہ ہوتا تو ہر آدمی دوسرے کے بچھڑ جانے پر مرجایا کرتا۔ ایک چکر ہے چلتا رہے گا قبرستانوں کا سناٹا آدمی کے لاشعور میں تاریکی میں خوفناک ہو جاتا ہے اور بس۔ روشنی ہو تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اٹھو! بے ترتیبی کو درست کر لو۔ کوئی کسی دوسرے کی چیز لے کر سکھ نہیں پاتا' کھو دیتا ہے۔ ہر نئی صدی میں سب کچھ بدل جاتا ہے۔ ایک صدی پوری ہوئی۔ بس ہونے والی ہے۔"

وہ یوں بول رہا تھا جیسے اکیلا ہو اور حساب کتاب کر رہا ہو۔ ہم سامنے نہ ہوں۔ انیتا اسی طرح بے سدھ پڑی تھی۔ میں بت بنا اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اچانک وہ اٹھا اور تقریباً دوڑتا ہوا باہر چلا گیا۔ اس سے پہلے کہ میں اور طیب باہر نکلتے' انیتا کی کراہ نے ہم دونوں کے قدم تھام لئے۔

"اوہ..........!"

وہ لیٹے لیٹے ہی دونوں ہاتھوں میں سر تھامے تھی۔ میں نے تو ایک نگاہ اس پر ڈالی اور باہر بھاگ لیا مگر طیب باہر نہیں آیا۔ باہر اسی گہرے سناٹے نے میرا استقبال کیا۔ وہاں دور دور تک کچھ نہیں تھا۔ میرا باہر جا کر دیکھنا بے کار تھا۔ میں جانتا تھا کہ اب آکا باگیا ہاتھ نہیں آئے گا۔ میں لوٹ آیا۔ طیب انیتا کو سنبھالے بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر طیب ذرا بوکھلا گیا۔

"یہ.......... انہیں چکر آ رہے ہیں۔" طیب کچھ پیچھے سرک گیا۔

"کیسی ہیں آپ؟" میں نے جھک کر پوچھا۔

"ہوں..........!" اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ "آئی ایم سوری! شاید.......... میں شاید بہت زیادہ پی گئی تھی۔" وہ ندامت سے بولی۔

"میں اسی لئے پسند نہیں کرتا۔" میں نے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اے..........!" طیب نے مجھے کہنی ماری۔ "یہ آکا باگیا فرحت کے بارے میں کیا کہہ رہا تھا؟"

"ہوں!" میں چونک گیا۔ واقعی آکا باگیا نے فرحت کا ذکر کیا تھا گو اس کی باتیں ایسی نہ تھیں کہ طیب سمجھ سکتا مگر بہرحال اس نے جو جملہ کہا تھا' اس پر اگر طیب ذرا سا

بھی غور کر لیتا تو سب کچھ جان جاتا۔

"کچھ پوچھا ہے میں نے تم سے۔" طیب نے مجھے چونکا دیا۔

"ہاں پتا نہیں۔ میں نہیں جانتا کہ وہ کیا کہہ رہا تھا اور ہاں!" میں ذرا بوکھلا گیا تھا۔

"یہ سب باتیں اسے بتائیں کس نے؟"

"میں نے تم سے کہا تھا نا کہ وہ عامل ہے۔ بہت بڑا عامل' ہو سکتا ہے' اس کے پاس سامری جادوگر والا شیشے کا گولا ہو۔ وہ سب دیکھ لیتا ہے۔"

طیب توقع کے عین مطابق بہک گیا تھا۔

"پلیز! آپ لوگ کچھ عجیب سی باتیں نہیں کر رہے.......... یا میرا نشہ نہیں ٹوٹا؟" یہ انیتا تھی۔

"نشہ نہیں ٹوٹا تو بھی بڑا غنیمت ہے محترمہ! ورنہ آپ کی تو گردن.........!"

"طیب.........!" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "کچھ کھانے پینے کا بندوبست کرو۔ میں سخت بھوکا ہوں اور یہ بھی یقیناً بھوکی ہوں گی۔"

"یہ بھی.........!" طیب نے دانت نکال دیئے۔

"چپ رہو!" میں جھینپ گیا۔

"ٹھیک ہے ابھی تو میں کھانے پینے ہی کا نہیں پوری تقریب کا بندوبست کرنے کو تیار ہوں مگر ضیاء.........! تم اپنا وعدہ نہیں بھولنا۔" وہ کھڑا ہو گیا۔

"کیسا وعدہ؟"

"وہی فرحت والا۔ میں بھول گیا یار' آکا باگیا سے شبھ گھڑی تو نکلوا لینا۔"

میرا دل بیٹھنے لگا۔ فرحت سے دستبردار ہونا' انیتا سے شادی کرنا' فرحت کو طیب سے منسوب کرنا مجھے اپنے بس میں نہیں لگ رہا تھا۔ آکا باگیا نے قطعی نہیں بتایا تھا کہ ایسا کیسے اور کیوں کر کروں۔ اس پر اعتبار نہ کرنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ میں اس کی بات سے انحراف کرنے کی جرات بھی کھو چکا تھا کہ جو کچھ اس نے کہا تھا' اس کی گہرائی میں ڈوب کر سب کچھ پا چکا تھا اور یہ کوئی تک نہیں تھی کہ انیتا کا ہاتھ پکڑ کر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس سے درخواست کرتا کہ میں اس سے شادی کا خواہش مند ہوں یا اس سے عشق کر بیٹھا ہوں۔ جب کہ نہ شادی کی خواہش تھی نہ ہی اس سے عشق کرنے کا تقاضا کرنے کی کوشش ہی کر سکتا تھا۔

"کیا تم شبھ گھڑی نکال رہے ہو؟" طیب نے میرا کندھا ہلایا۔

"میں نے تم سے کھانے پینے کی بندوبست کا کہا تھا۔" میں جھنجلا گیا۔

"اور میں وعدہ یاد دلا رہا تھا۔" وہ کمرے سے باہر نکلتے ہوئے بولا۔

میں نے دیکھا' انیتا ابھی تک بکھری بکھری سی حالت میں بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر خجالت' کرب' تھکن سبھی کچھ تھا۔ وہ نگاہیں جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر معصومیت تھی حالانکہ ایسی سب عورتیں اکیلی تھیں جو مجبوری کی بناء پر حدیں پھلانگتی تھیں اور پھر غالباً حالات کی وجہ سے بے باکی ان کی طبیعت کا عنصر بن کر ان میں کرختگی پیدا کر دیتی تھی۔ بعض عورتوں کے چہرے پر تو کراہیت بھی پیدا ہو جاتی ہے مگر انیتا اور فرحت کے چہرے میں مجھے کچھ فرق محسوس نہیں ہوا۔ باقی سب باتیں تو دور کی بات ہے ہمارے ہاں تو عورت کا نشہ کرنا ہی اسے اپنی دنیا سے خارج کر دینے کو کافی تھا اور آکا باگیا کہہ گیا تھا کہ میں انیتا سے شادی کر لوں۔ وہ کرسچن تھی' آزاد اور بے باک تھی۔ میں تو اس کے بارے میں سوچنا تک نہیں چاہتا تھا گو وہ مجھے کردار کی مضبوط' نیک اور سچی لگی تھی اور شاید یہی وجہ تھی کہ میں اس میں معصومیت محسوس کر رہا تھا۔ بہرحال میں الجھ چکا تھا۔ بات صرف انیتا کی نہیں تھی۔ میرے معاملے میں تو فرحت کے علاوہ منے دادا' منی دادی' اماں اور بالخصوص بی جان بھی مجھ سے توقعات لگائے بیٹھی تھیں۔ فرحت کو میں کیا جواب دیتا؟ بی جان کو کیا منہ دکھاتا۔ منے دادا کا مسئلہ اس لئے نہیں تھا کہ وہ پہلے ہی مجھ سے میرے خلاف فیصلے پر بات کر چکے تھے مگر پھر طیب......... کچھ بھی تھا' طیب کو میں فرحت کے قابل نہیں سمجھتا تھا۔

"مسٹر ضیاء!" انیتا کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"جی.........! جی!"

"کیا آپ میری باتوں پر یقین کریں گے؟"

"جی.........! کیا مطلب؟"

"جو کچھ میں کہنے والی ہوں' وہ مجھے خود کو بھی اجنبی محسوس ہو رہا ہے۔ میں نہیں جانتی تھی کہ آدمی جب اچانک اپنے اندر کی تبدیلی کا کسی کو یقین دلانا چاہے تو کون سے ثبوت فراہم کر سکتا ہے' کیسے یقین دلا سکتا ہے؟ کوئی ایسا پیمانہ نہیں جو اسے سچا ثابت کر سکے۔"

"میں سچائی کو روشنی سے تعبیر کرتا ہوں مس انیتا؟ میرا ایمان ہے کہ آدمی سچ بول رہا ہو تو اس کے چہرے پر روشنی پھیل جاتی ہے' اس کے انداز' اس کی حرکات اور اس کا لہجہ اس کی سچائی پر دلالت کرتا ہے پھر............ آنکھیں............ ایک ایسی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہیں جسے جھٹلانا ضمیر کی عدالت میں ممکن نہیں ہوگا۔"

"اوہ تھینکس گاڈ!"

اس نے لمحہ بھر کو آنکھیں بند کرلیں۔ اس کے چہرے پر دھیمی سی روشن مسکراہٹ پھیل گئی جیسے اس نے سچائی کے ٹھنڈے شفاف چشمے سے بہتے پانی میں پاؤں ڈال دیئے ہوں۔

"سچائی کو جھٹلانا انسانوں کے بس کی بات نہیں ہے مس انیتا!"

"ہاں! مگر میں تو آدمیوں کے جنگل میں رہتی ہوں۔ یہاں تو اتنی تاریکی ہے کہ میں اپنے اندر کے انسان کو بھی صاف دیکھ نہیں پاتی۔"

"اگر دیکھنا چاہو تو کچھ بھی پوشیدہ نہ رہے مس انیتا۔ آپ بتائیے' کیا کہنا چاہتی ہیں۔"

اس نے پہلے مجھے غور سے دیکھا پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ میرا جی چاہا کہ میں آنکھیں جھکالوں مگر سوچا' شاید وہ ان میں بھی سچائی تلاش کر رہی ہو۔ سو اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے رہا۔

"میں............ میں مسلمان ہونا چاہتی ہوں۔"

میں اچھل پڑا۔ "جی! ہاں............! مگر کیوں؟"

"عجیب سا سوال ہے۔" اس نے ادھر ادھر دیکھ کر مضطرب انداز میں کہا۔ "یا مجھے لگ رہا ہے شاید اس لئے کہ............ میرے پاس اس سوال کا جواب اتنا واضح نہیں ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ میں آپ سے متاثر ہوکر ایسا کر رہی ہوں تو کیا آپ یقین کریں گے؟"

اب کی بار اس نے پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ میں خجل سا ہوگیا۔ "لیکن میرا خیال ہے کہ میں مسلمان کے معیار پر پورا نہیں اترتا۔ وہ مسلمان جن سے متاثر ہوکر کوئی اپنا مذہب چھوڑ دیتا ہے' وہ تو اور ہی لوگ ہوتے ہیں۔ بہرحال مجھے خوشی ہوئی۔ آپ نے ایک اچھا فیصلہ کیا ہے مگر بہتر ہوگا کہ یہ فیصلہ اسلام کے بارے میں پڑھنے کے بعد کرتیں۔ اس طرح آپ کے عقائد مضبوط ہوتے۔ آپ جان پاتیں کہ اسلام واقعی

ضابطۂ حیات ہے۔ کسی مسلمان کے اچھے یا برے ہونے سے آپ کے عقائد پر زد نہ پڑتی ورنہ میں تو بڑا گناہ گار بندہ ہوں۔ میرے لئے تو یہ بڑی سعادت ہوئی کہ آپ نے مجھ سے متاثر ہوکر یہ فیصلہ کیا ہے۔ اب شاید یہی بات' اسی سعادت کا احساس مجھے گناہوں سے بچالے۔ میں کوشش کروں گا کہ میرا یا میرے مذہب کا امیج آپ کی نگاہ میں متاثر نہ ہو۔"

"میں............ میں نے اسلام کا کافی مطالعہ کیا ہے۔" اس نے مجھے چونکا دیا۔

"جی؟"

"جی ہاں! اسے میری بدقسمتی کہہ لیں کہ ہمیشہ کوئی نہ کوئی بات ایسی ہوگئی کہ میں دنیا کے ہر مذہب سے چڑنے لگی تھی۔ میں سوچتی تھی جب آدمی کے قول و فعل میں اتنا فرق ہے تو پھر آدمی یہ یقین کیسے کرلے کہ اس آدمی کا مذہب سچا ہوگا۔"

"میں نے عرض کیا تھا کہ آدمی کا برا یا اچھا ہونے سے مذہب کا کوئی تعلق نہیں ہوتا بلکہ میرا خیال ہے کہ وہ بات کو سمجھ نہیں پاتا تبھی قول و فعل میں تضاد رکھتا ہے اگر بات اس کی سمجھ میں آگئی ہوتی تو............!

"سوری مسٹر ضیاء............! میرا دماغ بہت بوجھل ہے۔ ہم اس موضوع پر پھر گفتگو کریں گے۔ میری خواہش ہے کہ میں ان سوالوں کے جواب حاصل کرلوں جو مجھے کنفیوز کرتے ہیں۔"

"اوہ............! ہاں............! میں............ میں آپ کے لئے چائے اور کچھ کھانے کا بندوبست کرتا ہوں یہ طیب............! پتا نہیں' کہاں گیا؟" میں اٹھ کر باہر نکل گیا۔

باہر طیب اکیلا نہیں تھا۔ گوپال بھی آچکا تھا۔ میں دور ہی سے ان دونوں کو دیکھ کر سمجھ گیا تھا کہ طیب برداشت نہیں کرسکا ہے اور وہ ساری کہانی گوپال کو سناچکا ہے۔ گوپال کے چہرے پر تسخر تھا۔ بے یقینی تھی۔ مجھے خیال نہیں رہا کہ میں طیب کو منع کردیتا۔ جب سب حیرت انگیز طور پر ٹھیک ہوچکا تھا تو اسے بتانے کی ضرورت ہی نہیں تھی' یہ ضرورت اس وقت پڑتی جب ہمیں اپنی گرفتاری کا خطرہ ہوتا۔ انیتا واقعی قتل ہوچکی ہوتی۔ قتل تو ہوئی تھی مگر یہ سب جو کچھ اس مختصر سے عرصے میں ہوچکا تھا اس پر سوچنے کا موقع ہی نہ مل پایا تھا۔ سچ پوچھیں تو میری ذہنی حالت قطعی درست نہیں تھی۔ جو واقعات اب تک ہوئے تھے' یہ واقعہ ان سب سے قطعی جدا تھا۔ صرف میں نے ہی اس کی گردن کٹی ہوئی دیکھی تھی اور اب اسے ٹھیک حالت میں دیکھا تو اسے ذرا سا کی ایسی حرکت سمجھ کر

بھول چکا ہوتا جس کا مقصد صرف مجھے ہراساں کرنا ہو مگر اس کے قتل ہو جانے کی اطلاع طیب نے دی تھی۔ اب انیتا نہ صرف یہ کہ بالکل ٹھیک تھی بلکہ اب تو مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میں کسی بھیانک خواب سے جاگ اٹھا ہوں۔

"ضیاء تمہارے منع کرنے کے باوجود شاید طیب نے تمہارے سو جانے کے بعد بہت چڑھا لی۔ اس کا نشہ اب تک نہیں اترا۔" گوپال مجھے دیکھ کر مصافحے کے لئے میری طرف بڑھا۔

"دیکھو ضیاء! یہ......... یہ یقین ہی نہیں کر رہا کہ......." طیب نے کہا۔

میں نے گوپال کی نظر بچا کر اسے گھورا۔ وہ سٹپٹا گیا۔ "اسے نشے میں بہکنے کے لئے کچھ کھانے پینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یہ پرابلم اسے بچپن سے ہے۔" میں نے مسکرا کر اس سے ہاتھ ملایا۔

"ویسے انیتا ہے کہاں؟ میں تو سمجھا تھا' وہ چلی گئی ہو گی۔ اس کی ماں سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی اس کا انتظار شروع کر دیتی ہے۔ یہ بات مجھے اسی نے بتائی تھی۔"

"کیا وہ......... جانتی ہیں کہ........." میں ایسی بات پوچھنے والا تھا جو شاید مجھے نہیں پوچھنا چاہئے تھی مگر جلد ہی احساس ہو گیا کہ غلط ہے۔ "آیئے.........! میرا خیال ہے کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لئے نہیں گئیں۔" پھر میں طیب کی طرف پلٹا۔ "تم نے چائے کا بندوبست کروایا؟"

"کیوں لڑکا نہیں آیا کیا؟" گوپال چلتے چلتے رک گیا۔

"آگیا ہے۔ بنا رہا ہے۔ میں نے اسے پراٹھے بنانے کو کہا ہے۔" طیب نے جواب دیا۔

میں گوپال کو لئے اس کمرے میں داخل ہوا جہاں انیتا تھی۔ وہ کمرے میں نہیں تھی لیکن باتھ روم سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ ہم دونوں وہیں بیٹھ گئے۔ طیب ہمارے ساتھ نہیں آیا تھا۔ گوپال نے ادھر ادھر کا جائزہ لیا پھر بولا۔

"کمال ہے! یہ میرے ہی گھر کا کمرہ ہے مگر میں نے یہاں شاید دوسری بار قدم رکھا ہے۔"

"غالباً یہ کمرہ آپ کی بیوی نے سیٹ کروایا ہو گا' اپنے لئے۔" میں نے بھی کمرے کا بھرپور جائزہ لیا۔

"میں تو جی اس نعمت سے ہی محروم ہوں۔" وہ ہنسا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ میری شادی نہیں ہوئی۔ ماں کو بڑا ارمان تھا مگر اس بیچاری کے کوئی ارمان پورے نہیں ہوئے تو یہ کیسے ہوتا۔ میں تو تیار بھی ہو گیا تھا۔ اس نے کوئی لڑکی پسند کی تھی۔ میں نے دیکھے بغیر ہاں بھی کر دی تھی کہ وہ ذرا بھی دکھ محسوس نہ کرے مگر...... یار! کچھ لوگ بنتے ہی دکھ اٹھانے اور صرف دوستوں کے ارمان پورے کرنے کے لئے ہیں۔ انہوں نے ساری زندگی محنت کر کے میرے باپ کے ارمان پورے کئے۔ باپ نے منزل پائی تو دوسری شادی کر کے ہم دونوں کو چھوڑ گیا۔ پھر وہ میرے ارمانوں کو پورا کرنے میں لگ گئیں۔ میں نے کوشش کی کہ اب اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا ہوں تو اماں کے بھی ارمان پورے کر دوں۔ انہیں سکھ دیا۔ فرماں بردار رہا۔ گھر بنا کر دیا۔ جو کچھ کہا پورا کیا مگر بقول ان کے آخری ارمان مجھے آباد دیکھنے کا تھا' ان کی خواہش کے آگے سر جھکا دیا مگر یہاں موت آڑے آ گئی اور......... اب......... اب کیا کروں گا شادی کر کے۔"

اس سے پہلے کہ میں اس سے افسوس کا اظہار کرتا' وہ چونکا پھر بول اٹھا۔ "یہ طیب کیا کہہ رہا تھا میری سمجھ میں اس کی باتیں نہیں آئیں۔"

"کیسی باتیں؟" میں نے صرف یہ سوچنے کے لئے سوال کیا تھا کہ میں اسے کیا جواب دوں گا حالانکہ میں جانتا تھا کہ اس نے کیا بتایا ہو گا۔

"وہ کہہ رہا تھا کہ انیتا قتل کر دی گئی تھی۔ کوئی آکا باگیا نام کا آدمی آیا تھا۔ وہ ٹھیک ہو گئی اور......... اور کوئی پُراسرار چیز تمہارے پیچھے پڑی ہے۔ ویسے یہ نام آکا باگیا۔ میں نے کہیں اور بھی سنا ہوا ہے۔ ہوا کیا تھا؟"

"نہیں، ہوا تو کچھ بھی نہیں......... دراصل یہ تو درست ہے کہ ایک پُراسرار طاقت میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ میں اس کے بارے میں ٹھیک سے جانتا ہی نہیں' آپ کو کیا بتاؤں؟ انیتا والا معاملہ بھی......... میرا خیال ہے کہ اسی طاقت نے ہماری نظر بندی کر دی ہو گی۔ وہ بے خبر سو رہی تھی اور ہمیں لگا جیسے مر چکی ہے۔" یہ سچ ہے ایک اسے نہ سمجھا پایا تھا۔ نہ میری سمجھ میں آ رہا تھا کہ کیا بتاؤں۔

"ویسے طیب کو میں جانتا ہوں۔" وہ ہنسا۔ "یہ بہت چھوڑو۔"

عین اسی لمحے انیتا سر پر تولیہ لپیٹے باہر آ گئی۔ اس نے گوپال کو دیکھ کر خوشی کا اظہار

کیا۔

"تم گئی نہیں؟"

"ہاں! مجھے خود بھی حیرت ہے ورنہ تمہیں تو پتا ہے' میں دن نکلنے سے پہلے گھر پہنچنے کی عادی ہوں۔ پتا نہیں گوپال.........! مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے اب مجھے کہیں بھی نہیں جانا ہے۔ جیسے میں......... اپنی منزل پر پہنچ گئی ہوں۔" وہ بالکل سامنے بیٹھ گئی۔ خوشی سے اس کے چہرے پر روشنی سی پھیلی ہوئی تھی۔

"اے......... خاتون!" گوپال نے اس کے چہرے کے سامنے ہاتھ لہرایا۔

"یہ آپ کی منزل نہیں' میرا گھر ہے اور یہاں سے آپ کو ہر حال میں جانا ہے۔ ناشتا کرلیں' سامان سمیٹیں اور تو دو گیارہ ہو جائیں۔ آپ کو پتا ہے' دن کے گیارہ بج رہے ہیں اور آپ کی مما کا بلڈ پریشر اب آسمان سے باتیں کر رہا ہوگا۔"

"ہوں.........!"

وہ پُر سوچ انداز میں مجھے دیکھنے لگی۔ میں خاموش بیٹھا تھا۔ طیب ابھی تک نہیں آیا تھا۔

"سچ مجھے تو جانا پڑے گا۔ مگر تھوڑی دیر کے لئے۔ میں مما کو........."

"او بھائی.........! او محترمہ!" گوپال نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ "میں قسم کھانے کو تیار ہوں کہ یہ تمہاری منزل نہیں ہے۔ بڑے خون پسینے کی کمائی سے گھر بنوایا ہے میں نے۔ ماں جیتی رہتی تو یہاں میرے آٹھ دس بچے گھوم رہے ہوتے۔"

عین اسی لمحے طیب کمرے میں داخل ہوا۔ وہ غالباً گوپال کا جملہ سن چکا تھا۔ اس کے پیچھے وہ بچہ بھی تھا جو کام کرتا تھا۔ وہ ٹرالی لئے اندر داخل ہو رہا تھا۔

"یار! یہ شادی کرتے ہی آٹھ دس بچے کیسے ہو جاتے ہیں؟" طیب یوں پوچھ رہا تھا جیسے ریاضی کا کوئی سوال حل کروا رہا ہو۔

"شادی کرتے ہی بتاؤں گا۔" گوپال نے میز پر سے گلدان وغیرہ ہٹاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے' لیکن بھولنا نہیں۔" طیب نے اسی سنجیدگی سے جواب دیا اور ٹرالی سے چیزیں نکال کر میز پر سجانے لگا۔

میرا ذہن بالکل خاموش تھا۔ کسی سوچ کی آہٹ تھی نہ کسی تصور کی موجودگی کا احساس' یوں جیسے گہرا سناٹا چھایا ہوا ہو۔ میں نے خاموشی سے چائے پی۔ طیب اور گوپال

فضول قسم کے مذاق کرتے رہے۔ انیتا بھی ان کے ساتھ شریک تھی۔ وہ کبھی کبھی اپنی لمبی پلکیں اٹھا کر میری طرف دیکھ لیتی۔ اس کی آنکھوں میں چاہت کی گہرائی تھی۔ میں اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ یہ سوچنا بھی میرے لئے اجنبی سا تھا کہ مجھے اسی سے شادی کرنا ہے پھر ذرا دیر پہلے کا خیال آجاتا تو میں اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ محسوس کرتا کہ یہی لڑکی جو ابھی قتل ہوگئی تھی (جس کے قتل ہو جانے میں مجھے کوئی شبہ نہیں تھا) وہ اب بیٹھی چائے کا کپ تھامے طیب اور گوپال سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی ہے۔

بس ایک احساس تھا کہ کوئی بڑا طوفان آنے والا ہے۔ بہت خوفناک قسم کا۔ جس میں شاید سب کچھ بہہ جائے اور میں......... میں قطعی بے بس ہوں۔

"بھائی میاں!"

طیب نے میری آنکھوں کے آگے ہاتھ لہرایا۔ میں چونک اٹھا۔ "ہوں.........! کیا؟"

"کہاں ہو؟"

"میں......... میں تھک گیا ہوں۔" میں خالی کپ رکھ کر کھڑا ہوگیا۔ "آرام کروں گا۔" میری نگاہ انیتا پر پڑی جو مجھے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے نگاہ چرالی۔ "طیب! گھنٹا بھر کے بعد مجھے اٹھا دینا۔ شاید میں سو جاؤں۔"

پھر میں وہاں رکا نہیں۔ گوپال سے ہاتھ ملا کر' انیتا سے اجازت لے کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ میرا ارادہ سونے کا تھا مگر بستر پر لیٹتے ہی میری نیند اور تھکن غائب ہوگئی۔ ہزاروں باتیں دماغ میں گونجنے لگیں۔ بے چینی بڑھنے لگی۔ گزرا ہوا پل پل جیسے پورے وجود میں زہر بن کر دوڑنے لگا۔ فرحت کی ملتجی نگاہیں' زیوسا کے عذاب' شالی بابا کی باتیں' جنو کی درد بھری پکار' رابرٹ کی کھسیاہٹ' سورن سنگھ کا جالے میں جکڑا بدن اور اب......... انیتا کی زندگی کے وہ پل جو موت کی گود میں گزرے تھے پھر وہ پُراسرار آقا بابا......... ان سب باتوں نے میرا دماغ پھوڑے کی طرح پکا دیا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب کیا ہوگا؟ آنے والے لمحات اپنے جلو میں عذابوں کو ساتھ لائیں گے یا سکون کو.........

میں اس آقا بابا سے اپنے خدشات کا اظہار کرنا چاہتا تھا مگر وہ غائب ہو چکا تھا۔ ایک ایسا حکم صادر کر کے جسے بجا لانا میرے بس میں نہیں لگ رہا تھا۔

میں پتا نہیں' کب تک سویا اور کیسے سویا۔ شام کو طیب نے مجھے اٹھا دیا۔ ان سے

پتا چلا کہ گوپال اور انیتا جا چکے ہیں۔ میں صبح سے بھوکا تھا۔ کام کرنے والا لڑکا کم عمر تھا مگر بہت تیز تھا۔ اس نے کھانا تیار کر لیا تھا۔ وہ کھانا لایا۔ میں نے خاموشی سے کھانا کھایا۔ کھانا کھا کر میں کھڑکی میں آکھڑا ہوا۔ یہ ایک گنجان آباد علاقہ تھا۔ سامنے مصروف سڑک تھی۔ لوگ آ جا رہے تھے تبھی مجھے احساس ہوا کہ میں یہاں' یوں کیوں کھڑا ہوں۔ نوکری تقریباً چھوٹ گئی تھی اس لئے کہ میں نے پھر چھٹی کی درخواست بھیج دی تھی۔ اس بار بغیر تنخواہ کے کچھ چھٹیاں مل رہی تھیں لیکن یہ ختم ہونے کے بعد یقیناً میری نوکری کو خطرہ لاحق ہو جاتا۔ ڈیوٹی جوائن کرنے کے لئے مجھے دہلی جانا پڑتا جبکہ میں یہ سوچ کر یہاں چلا آیا تھا کہ شاید اس طرح زیوسا میرے گھر والوں کا پیچھا چھوڑ دے۔ آخری بار وہ گئی تو خاصے غصے میں تھی۔ بہرحال مجھے اپنا وجود بالکل بیکار' بے مقصد لگا۔ میں ایک ہٹا کٹا نوجوان تھا۔ مجھے تو زندگی کی رفتار کے ساتھ چلنا تھا جبکہ اب ٹھہر جانے کا احساس بڑھ رہا تھا۔ آدمی کھڑا ہو اور پل گزر رہے ہوں تو بڑا ٹھٹھرا دینے والا احساس بیدار ہوتا ہے۔ وہی احساس مجھ میں مایوسی پھیلا رہا تھا۔ طیب خاموش لیٹا میری کیفیت کو بھانپنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"میں کیا کروں یار!" میں ایک دم پلٹ کر بولا۔

"وہی جو آکا باگیا نے بتایا ہے۔" اس نے بالکل اطمینان سے جواب دیا۔ "بلکہ پہلا کام تو یہ کرو کہ منے دادا کو خط لکھ کر خیریت پتا کرو۔ خط روانہ کرنے کے بعد سنجیدگی سے انیتا کے بارے میں سوچو۔ شادی تو تمہیں کبھی نہ کبھی' کہیں نہ کہیں کرنا ہی تھی۔ میرے خیال میں میرٹھ یا دہلی میں تو کوئی ایسی لڑکی ہے نہیں جو تمہارے ساتھ زندگی گزارنے پر رضامند ہو جائے۔ تمہاری اماں کو بھی تمہاری شادی کی کوئی فکر نہیں ہے۔ ادھر میرے اماں' ابا کو بھی میری چنتا نہیں۔ تمہاری شادی ہو جائے تو میں بھی ہاتھ پاؤں ماروں مگر تمہارا معرکہ سر کرنے کے بعد.......... بلکہ میں تو سوچ رہا ہوں کہ اسی ہنگامے میں' میں منے دادا سے فرحت کی بات بھی کر لوں گا۔"

"بکواس مت کرو۔" میں ایک دم ہی الجھ کر چیخ پڑا۔

"کیا مطلب؟ اس میں بکواس کیا ہے؟" وہ سیخ پا ہو کر بولا۔

"کک.......... کچھ نہیں.......... میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔" میں نے سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"دیکھو ضیاء! تمہیں جلد از جلد فیصلہ کرنا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس سے فرق

ضرور پڑے گا ورنہ آکا باگیا پاگل نہیں ہے جو.........."

"میں انیتا سے.........."

ابھی اس نے اپنا جملہ پورا بھی نہیں کیا تھا کہ اچانک وہ لڑکا جس کا نام ریاض تھا' دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ ہم دونوں چونک اٹھے۔ اس نے دستک دیئے بغیر دھڑ سے دروازہ کھولا تھا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے اس کے چہرے پر سراسیمگی محسوس کر کے فوراً پوچھا۔

"وہ.......... بی بی آئی ہیں۔ باہر گاڑی میں.......... ان کے ساتھ.......... وہ ماں.......... وہ مر رہی ہے۔"

اس نے عجیب بے ربط جملے کہے۔ جانے وہ کیا کہہ رہا تھا اور کس کے بارے میں کہہ رہا تھا۔ یہ جانے بغیر ہم دونوں ایک ساتھ ہی باہر بھاگے۔ گیٹ کے پاس ٹیکسی کھڑی تھی۔ ٹیکسی میں انیتا تھی اور اس کی گود میں ایک ادھیڑ عمر کی عورت زخمی حالت میں پڑی تھی۔ ایک چودہ پندرہ برس کی لڑکی بیٹھی تھی جو صورت شکل سے ہی انیتا کی بہن لگ رہی تھی۔

"کیا ہوا؟" میں نے اور طیب نے ساتھ ہی پوچھا۔

"ماما کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ پلیز..........!" انیتا نے کہا' جس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں' پھر وہ رو پڑی۔

میں کچھ بھی کہے بغیر اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ریاض دروازے پر کھڑا تھا۔ طیب نے اسے دروازہ لاک کر کے گھر چلے جانے کا کہا اور ٹیکسی آگے بڑھ گئی۔ ہم ہسپتال جا رہے تھے۔ اب میں نے جائزہ لیا۔ وہ عورت بے ہوش تھی اور کافی زخمی تھی۔ راستے میں انیتا نے بتایا کہ اس کے گھر پہنچنے کے بعد اس کی ماں بازار جانے کو نکلی ہی تھی کہ اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ وہ تفصیل بتاتی رہی مگر میرا ذہن عجیب سی جکڑن کا شکار تھا۔ بے پناہ الجھا ہوا سا تھا مگر پتا نہیں' لگ رہا تھا کہ ایسا کیوں ہے؟

ہم ہسپتال پہنچے۔ ہسپتال کا عملہ انیتا کی ماں کو اسٹریچر پر ڈال کر لے گیا۔ انیتا کی بہن' ان کے ساتھ چلی گئی۔ میں اور طیب پیچھے پیچھے تھے۔ ڈاکٹرز نے فوری توجہ دی مگر جو خبر انہوں نے سنائی' وہ بہت منحوس تھی۔ انیتا کی ماں مر چکی تھی۔ انیتا اور اس کی بہن دھاڑیں مار کر رونے لگیں۔ میں اور طیب حواس باختہ ہو گئے۔ ڈاکٹرز تسلیاں دینے لگے مگر

دیکھتے ہی دیکھتے انیتا کی چھوٹی بہن بے ہوش ہوگئی۔ سب اس کی ماں کو بھول کر اسے سنبھالنے لگے۔ ڈاکٹرز نے بھی اس پر فوری توجہ دی پھر میں نے محسوس کیا کہ ڈاکٹرز پریشان ہوگئے ہیں۔ طیب انیتا کو سنبھالے تھا۔ وہ بری طرح مچل رہی تھی۔ میں نے طیب سے کہا کہ وہ انیتا کو ایمرجنسی وارڈ سے باہر لے جائے۔ ڈاکٹر سہگل نے بھی میری تائید کی۔ طیب اسے باہر لے گیا جبکہ وہ جانے کو تیار نہ تھی۔ ان دونوں کے باہر جاتے ہی ڈاکٹر سہگل نے انیتا کی بہن کو آئی سی یو میں پہنچانے کا حکم دیا۔ ذرا سی دیر میں افراتفری مچ گئی۔ میں پریشان ہوگیا۔

"مسٹر.........!"

"ضیاء!" میں نے جواباً کہا۔ "کیا بات ہے؟"

"ابھی کہہ نہیں سکتے۔ ویسے میرا خیال ہے کہ صدمے سے.......... بہرحال' میں بعد میں بتاؤں گا۔" اتنا کہہ کر وہ تیزی سے اندر چلے گئے۔ باہر سناٹا چھا گیا۔ میرے سامنے ٹیبل پر انیتا کی ماں کی لاش پڑی تھی۔ اندر ڈاکٹرز اور عملے کے دوسرے لوگ انیتا کی بہن کو چیک کر رہے تھے۔ میں بنچ پر اکیلا بیٹھا رہ گیا۔ میری نگاہیں انیتا کی ماں کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ تو گوا میں تھیں۔ رات ہی تو مجھے انیتا نے بتایا تھا کہ اس کی ماں اس کے چھ بہن بھائیوں اور باپ کے ساتھ گوا میں ہے پھر یہاں کب آئی؟ جو تفصیل وہ ٹیکسی میں طیب کو بتا رہی تھی' وہ میں نے الجھن میں سنی نہیں تھی۔ میں اسی سوچ میں تھا کہ اچانک ایمرجنسی وارڈ میں اندر کی طرف بنے آئی سی یو کا دروازہ کھلا۔ ڈاکٹر سہگل باہر آئے تو ان کے چہرے پر سنجیدگی میں چھپا درد اور کچھ حیرت سی مجھے فوراً محسوس ہوگئی۔ میں ان کی طرف لپکا۔

"مسٹر ضیاء.........! مجھے افسوس ہے.........!"

"کیا مطلب.........؟" میرا دل دھڑک اٹھا۔

"ہم اس لڑکی کو نہیں بچا سکے بلکہ......... ہمیں ایسا متوقع تھا! ہم نہیں..... تو ہمیں......... کرتے ہی مرچکی تھی۔"

"کیا.........؟" میں چیخ اٹھا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کیا ہارٹ اٹیک.........؟"

"شاید۔" انہوں نے پژمردہ انداز میں جواب دیا۔ "ایسا اس ہسپتال میں پہلی بار ہو رہا ہے کہ ماں کی موت کی تصدیق سے پہلے ہی اس کی بیٹی مرگئی ہو۔"

"میں......... یہ لڑکی کون تھی......... یہ دونوں........."

"جی.........! یہ......... میری ساس اور سالی........." بے اختیار میرے منہ سے نکلا اور میں خود ہی چپ ہو کر رہ گیا۔

"مجھے افسوس ہے۔ آپ کی بیوی کا صدمہ بہت بڑا ہوگا۔ انہیں سنبھالئے گا پلیز! میں ڈیتھ سرٹیفکیٹ بنوا دیتا ہوں۔ ویسے یہ........." اس نے انیتا کی ماں کی لاش کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ پولیس کیس ہے۔ میں نے علاقے کے تھانے فون کرکے اس ایکسیڈنٹ کی اطلاع دے دی تھی۔ وہ لوگ پہنچنے والے ہوں گے۔"

"پولیس کیس!" پیچھے سے طیب کی آواز سنائی دی۔ وہ جانے کب اندر آگیا تھا۔ "یہ کیا مصیبت ہے یار!"

"انیتا کہاں ہے؟" میں نے اس کی جھنجلاہٹ کو نظرانداز کر دیا۔

"باہر......... ڈاکٹرز نے اسے بہن کے بارے میں بھی بتا دیا ہے۔ ضیاء! حیرت ہے کہ وہ اب بالکل خاموش ہے جیسے اس کا ان دونوں سے کوئی رشتہ ہی نہ ہو۔" طیب بتا رہا تھا۔

"اکیلے رہ جانے کا احساس بھی کبھی کبھی آدمی کو پتھرا دیا کرتا ہے طیب!" میں نے دکھ سے کہا۔ یہ میرے اپنے احساسات تھے۔ گو میں نے انیتا سے شادی کا ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ یہ فیصلہ اسی آکا باگیا کا تھا مگر جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں سارے خاندان سے بچھڑ کر' فرحت سے بچھڑ کر اکیلا ہوگیا ہوں۔ میرا دنیا میں کوئی بھی نہیں رہا۔ خود انیتا بھی اپنی مجسم حیثیت میں میرے تصور میں نہیں تھی۔ صرف اکیلے پن کا کسیلا احساس تھا۔

ذرا دیر بعد ہی پولیس آفیسرز بھی آگئے۔ انہوں نے انیتا سے کچھ پوچھ گچھ کی۔ میں جلد ہی وہاں سے فارغ ہوگیا۔ ہسپتال کی ایمبولینس نے دونوں میتیں گھر پہنچا دیں۔ انیتا ایمبولینس میں تھی۔ میں اور طیب ٹیکسی لے کر پیچھے چل پڑے تھے۔ میں نے پہلی بار انیتا کے گھر میں قدم رکھا تو پتا نہیں' کیوں یہ احساس ہوا کہ میں یہاں پہلے بھی آچکا ہوں۔ ذہن پر بہت زور دینے کے باوجود کچھ یاد نہیں آیا۔ یہ تمام علاقہ کرسچن لوکیلٹی کا تھا اور مجھے یاد نہیں تھا کہ میں کبھی اس طرف آیا ہوں۔ طیب کفن دفن میں لگ گیا۔ انیتا کا چہرہ [illegible] سپاٹ تھا۔ اس نے مجھے ایک کمرے میں بٹھا دیا تھا جہاں علاقے کے کچھ اور [illegible]

آ گئے تھے۔ یہ سبھی میرے لئے اجنبی ہی تھے۔ بس اس ایک احساس کے سوا اور کوئی احساس نہیں تھا۔ گوپال آیا تب ذرا میں اس احساس کے شکنجے سے باہر آیا۔

ہمیں وہاں رات ہو گئی۔ علاقے کے لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ اب گھر میں صرف میں' طیب اور گوپال رہ گئے۔ انیتا بالکل خاموش ایک کونے میں بیٹھی تھی۔ مجھے اس پر ترس آیا۔ آکا باگیا کا فیصلہ زیادہ سنگین محسوس نہیں ہوا۔ طیب پریشان تھا کہ انیتا کو اکیلا کیسے چھوڑا جائے۔ میں نے کچھ نہیں کہا تھا۔ گوپال نے ہمت کی اور اسے گھر چلنے کو کہا۔ وہ پُرامید نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی جیسے میرے منہ سے کچھ سننا چاہتی ہو۔ میں نے پہلے نگاہ چرا لی پھر دھیرے سے افسوس کیا۔ اس کے اکیلے پن کو اذیت کہا۔ اسے ساتھ چلنے کو کہا۔ وہ فوراً تیار ہو گئی۔ اب اس کی آنکھوں میں جھلملاہٹ تھی' آنسوؤں کی بھی اور.......... غالباً خوشی کی بھی جسے اور کسی نے محسوس کیا ہو یا نہیں' میں نے محسوس کر لیا تھا۔ اچانک مجھے خیال آ گیا اور میں نے پوچھ لیا۔

"تمہاری والدہ تو گوا میں تھیں نا! پھر.......... یہ.........."

"میں گھر پہنچی ہوں تو یہ آ چکی تھیں۔ باپ انہیں گھر چھوڑ کر کہیں چلا گیا تھا۔ باقی بچوں کو بھی لے گیا۔ ایک بہن باپ کے ساتھ نہیں گئی تھی۔ شاید موت راہ بنا رہی تھی۔ وہ بازار کے لئے نکل تھیں کہ.......... میں اس وقت گھر میں تھی۔ چیخ کی آواز سنی تو باہر بھاگی۔ کار والا کچل کر فرار ہو رہا تھا۔ میں دیکھ نہیں سکی کہ.........." اس کی آواز بھرا گئی۔

"چھوڑو ضیاء..........!" طیب نے ٹوک دیا۔ "چلو!"

ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ گوپال جیپ میں تھا۔ اس نے ہمیں گھر پر چھوڑ دیا۔ رات پھر آ گئی تھی۔ میں خوفزدہ ہوا۔ آج بھی کچھ ہو سکتا تھا۔ زیوسا کی دشمنی مول لی تھی۔ جو نہ ہوتا' کم ہوتا۔ میں نے موقع ملنے پر طیب سے کہہ دیا کہ آج رات جاگنا ہے۔ کوئی نیا گل نہ کھل جائے۔ طیب کو یاد آ گیا۔ وہ سفید پڑ گیا۔

"ضیاء..........! تم.......... اس سے آج.......... اسی وقت شادی نہیں کر سکتے؟"

"کیا؟ پاگل ہوئے ہو۔" میں جھلا گیا۔ "اس بات سے شادی کا کیا تعلق؟"

"ہے۔ تم سمجھتے کیوں نہیں ہو۔ آکا باگیا نے کہا ہے تو ٹھیک ہی تو ہوگا۔"

پتا نہیں' کیوں میرے دل میں بھی یہ خواہش بڑی شدت سے ابھری اور اس

احساس کے ساتھ جیسے انیتا سے ابھی نکاح پڑھوا کر ہر مسئلے سے آزاد ہو جاؤں گا۔ میں نہیں جانتا کہ یہ میری چھٹی حس تھی کہ باہر سے رینگ آنے والا کوئی خیال.......... مگر میں بالکل طیب کے سے انداز میں سوچنے لگا۔ میں نے انیتا کو اب اس کمرے میں نہیں ٹھہرایا جہاں وہ رات ٹھہری تھی بلکہ ہم نے طیب والا کمرہ اسے دے دیا۔ میں اور طیب ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے۔ میرا خیال تھا کہ انیتا یقیناً تھک گئی ہو گی اور اب آرام کرے گی مگر جلد ہی وہ کپڑے بدل کر' منہ ہاتھ دھو کر ڈرائنگ روم میں چلی آئی۔

"آپ سوئیں نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں! چائے پیوں گی۔ آپ پئیں گے؟"

"ہاں! اگر زحمت نہ ہو تو.........." میں نے جھجک کر کہا۔

"مجھے زحمت نہیں' خوشی ہو گی۔" وہ انتہائی مشرقی قسم کی عورت لگی۔ کل میں نے اسی انیتا کو جس انداز میں باتیں کرتے' شراب پیتے اور قہقہے لگاتے دیکھا تھا' وہ آج اس سے بالکل مختلف لگ رہی تھی۔

وہ چلی گئی۔ میں سن بیٹھا دیکھتا اور سوچتا رہا۔ آپ میری کیفیت کا اندازہ نہیں کر سکتے کہ مجھے اس تمام صورت حال سے کس قدر کوفت ہو رہی تھی۔ میں ایک نہایت شریف قسم کا آدمی تھا۔ ماں باپ اور گھر کے بڑوں کا احترام کرنے والا۔ خدا پر مکمل ایمان رکھنے والا۔ نظر اونچی کرنا یا آواز اونچی کرنا میرے نزدیک غلط تھا۔ گناہ سے خوف اور نیکی سے لگاؤ تھا مگر حالات مجھے کہاں سے کہاں لے آئے تھے۔ میں کیا کیا کر چکا تھا۔ فرحت کے بارے میں پاکیزہ جذبے رکھنے کے باوجود زیوسا نے فرحت کا روپ دھار کر مجھے میری ہی نگاہوں میں ذلیل کر دیا تھا اور کل رات میں انیتا پر بھی وہی ظلم کر چکا تھا' جس کے احساس نے شاید آکا باگیا کے کئے گئے فیصلے کی سنگینی البتہ ختم کر دی تھی۔ فرحت کے بارے میں تو مجھے پتا چل چکا تھا کہ وہ جس کے ساتھ وقت گزارا تھا' فرحت نہیں تھی' زیوسا تھی مگر انیتا.......... انیتا کے ساتھ گزرے پل میرے ضمیر میں بھالے بن کر اتر گئے تھے۔ اور اب قدرت نے ایک ہی دن میں اسے بالکل اکیلا کر کے پھر میرے پاس بھیج دیا تھا۔ میں آج کوئی گناہ کرنے کو تیار نہیں تھا مگر.......... میں کل بھی کب تیار تھا؟ وہ تو ایک طوفانی کیفیت تھی جو باہر کہیں سے مجھ میں در آئی تھی اور بے قابو کر دیا کرتی تھی۔

مگر آج میں ایسا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے میں نے طیب کو تمام رات اپنے ساتھ

رکھنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ ذرا دیر بعد انیتا چائے کی ٹرے اور ہیٹیز لے آئی۔ مجھے ہیٹیز دیکھ کر ہی بھوک کا احساس ہوا۔ ہم نے چائے کے ساتھ ہی اپنی بھوک بھی مٹائی۔ اسی دوران میں کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔ کبھی کبھی میری نگاہ اٹھتی تو انیتا کی نرم نگاہوں سے ٹکرا کر پلٹ آتی۔ طیب کا سارا دھیان صرف کھانے اور پینے میں تھا۔

رات کافی گزر چکی تھی۔ طیب کپڑے بدلنے کے لئے گیا تو تنہائی میں خوف مجھے جکڑنے لگا۔ انیتا میرے سامنے تھی۔ میں نے اٹھنا چاہا۔ اس نے نگاہ اٹھا کر مجھے دیکھا اور مجھے لگا جیسے کہیں دور سے تیز آندھی آکر پوری شدت سے میرے وجود میں چکر کھانے لگی ہے۔ میں طوفانی ہواؤں کی زد میں تھا۔ دماغ چکرا رہا تھا۔ ہاتھ پیروں کی جان نکلی جارہی تھی۔ میں پوری قوت سے خود کو سنبھالنے کی کوشش کررہا تھا کہ اچانک کسی نے مجھے پکڑ لیا۔

میں نے دھندلائی ہوئی نگاہوں سے دیکھا۔ وہ طیب تھا۔ اس کے چہرے کے قریب ہی مجھے آکا باکیا کا چہرہ بھی دکھائی دے گیا۔ دھول میں اٹا' آنکھوں میں وحشت سمیٹے۔ وہ سراسیمہ سا تھا۔ وہ زور زور سے کچھ کہہ رہا تھا۔ مجھے اس کی آواز سنائی دے رہی تھی مگر الفاظ سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔ وہ طیب سے کچھ کہہ رہا تھا۔ انیتا میرے سامنے بیٹھی تھی۔ مجھے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ مجھے اس کے وجود میں ساتوں رنگ کھلتے محسوس ہورہے تھے۔ کوئی میرے اندر بیٹھا اسے دبوچ لینے کی ترغیب دے رہا تھا۔ اعصاب تیخ رہے تھے۔ طیب اور آکا باکیا کچھ کہہ رہے تھے۔

اچانک طیب میرے بالکل قریب بیٹھ گیا۔ وہ بار بار مجھ سے کچھ کہہ رہا تھا پھر وہ انیتا سے کچھ کہنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ انیتا کے سر پر اس نے کوئی کپڑا ڈال دیا تھا۔ انیتا سر جھکا کر بیٹھ گئی تھی۔

پھر مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔ بس اتنا یاد رہا کہ کمرے میں اندھیرا پھیل گیا تھا اور وہاں میں اکیلا نہیں تھا۔ کوئی میرے ساتھ تھا۔ کوئی نرم اور گرم وجود۔ پھر شاید میں سو گیا یا بے ہوش ہوگیا۔ ہوش آیا تو میں اپنے بیڈ روم میں تھا اور اکیلا نہیں تھا۔ میرے بستر پہ میرے پہلو میں انیتا موجود تھی۔ وہ کروٹ لئے تھی۔ میں گھبرا گیا۔ شاید کل کی طرح آج پھر قتل ہو چکی ہو۔ میں نے بے ساختہ طیب کو پکارا اور اچھل کر بستر سے اتر گیا۔ میری چیخ سن کر انیتا گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ ساتھ ہی طیب نے دروازہ کھول دیا۔

"کیا ہوا؟"

"کیا ہوا؟"

دونوں نے ایک ساتھ پوچھا۔ "یہ.......... یہ طیب!" مجھ سے کچھ بولا نہیں گیا۔ انیتا بستر سے اتر کر میری طرف بڑھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر پریشانی تھی جب کہ طیب پرسکون تھا بلکہ اس کے چہرے پر دھیمی سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

"آپ پریشان نہ ہوں بھابی۔"

یہ طیب تھا جو انیتا سے مخاطب تھا۔

"بھابی؟" میرے منہ سے بے اختیار نکلا اور میں پیچھے صوفے پر بیٹھتا چلا گیا۔

"بھابی! آپ چائے بنا کر لائیں۔ شاید ضیاء کی طبیعت کچھ خراب ہے۔"

اب طیب میرے اور انیتا کے درمیان میں آگیا تھا۔ میں انیتا کے چہرے پر اس جملے کا رد عمل نہیں دیکھ سکا۔ وہ کمرے سے باہر چلی گئی۔ طیب میری جانب پلٹا۔

"طیب.......... یہ یہاں.......... اور.........."

"مبارک ہو ضیاء۔ تمہاری شادی ہوگئی۔"

"کک.......... کیا؟ تم پاگل ہوگئے ہو کیا؟" میں چیخ اٹھا۔

"پلیز ضیاء! ٹیک اٹ ایزی۔ میں ابھی سب کچھ بتاتا ہوں مگر یوں واویلا نہ مچاؤ۔ ہم انیتا پر کسی قسم کی کوئی خوفناک بات ظاہر نہیں کرنا چاہتے۔ اگر رات میں نے تمہارا نکاح نہ پڑھا دیا ہوتا تو.......... تو شاید ہم دونوں.......... بلکہ تینوں یہاں نہ ہوتے اور میں وہاں جہنم میں اکیلا.......... تم دونوں کے بغیر بہت اداس ہوتا۔"

"بکواس مت کرو۔ سیدھی طرح جواب دو۔" غصے اور صدمے سے میرا بدن کانپ رہا تھا۔

"ضیاء!" اب طیب واقعی سنجیدہ ہوگیا۔ اس نے میرے بالکل سامنے بیٹھ کر کہنا شروع کیا۔ "کل رات شاید بہت خوفناک طوفان آنے والا تھا۔ تمہیں یاد ہے' ہم لوگ ڈرائنگ روم میں بیٹھے باتیں کررہے تھے؟"

"ہاں.......... پھر؟"

"پھر اچانک تمہاری کیفیت بدلنے لگی۔ انیتا تمہاری طرف متوجہ نہیں تھی مگر میں نے تمہارا چہرہ دیکھا تو.......... تو جانتے ہو مجھے کیا لگا؟" وہ مجھے غور سے دیکھنے لگا۔ پھر

بولا۔ "مجھے لگا جیسے رابرٹ میرے سامنے آگیا ہو۔"

"کک.......... کیا؟" میں نے بے ساختہ پہلے اپنے بدن کو دیکھا پھر چہرے پر ہاتھ پھیرا۔

"نہیں..........! اب سب ٹھیک ہے۔" طیب نے جلدی سے کہا۔ "میں تو شاید کچھ بھی نہ کرپاتا کہ اچانک مجھے محسوس ہوا دروازے پر کوئی ہے جو زور زور سے دروازہ پیٹ رہا تھا۔ میری نگاہ انیتا پر پڑی' وہ ایسے آنکھیں بند کئے جھوم رہی تھی جیسے نشے میں ہو یا کوئی منتر پڑھ رہی ہو۔ پھر میری نگاہ تم پر گئی تو تم اپنی ہیئت تبدیل کررہے تھے۔ تمہارا چہرہ اور بدن سکڑ رہا تھا۔ میں تمہیں سنبھالنے میں لگ گیا اور سچ مانو تو میرا جی چاہا تھا کہ تمہیں اسی حالت میں چھوڑ کر بھاگ جاؤں.......... تم.......... تم بہت خوفناک ہوگئے تھے۔ ضیاء.......... بہت خوفناک اور تبھی انیتا جھٹکا کھا کر صوفے پر گر گئی تھی۔ عجیب کراہوں کی سی آواز تھی جو اس کے لبوں سے نکل کر مجھے اور خوف زدہ کررہی تھی۔ دروازے پر جو بھی تھا' اب پوری شدت سے دروازے پر ٹکریں مار رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں دروازے کی طرف بڑھتا۔ دروازہ ایک جھٹکے سے گرا اور.......... اور آکا باگیا بھاگتا ہوا تمہارے قریب آیا۔ اس نے اپنا ہاتھ تمہاری پیشانی پر رکھ دیا اور تم جو مضطرب تھے۔ ڈول رہے تھے۔ اچانک پُرسکون ہوگئے۔ ساکت ہوگئے۔ پھر آکا باگیا نے یہی عمل انیتا کے ساتھ بھی کیا۔ وہ بھی ساکت ہوگئی۔ میں نے غور سے تمہیں دیکھا' اب تم نارمل نظر آرہے تھے۔ بس تم اپنے آپ میں نہیں تھے۔ آکا باگیا نے سب سے پہلے مجھ سے پوچھا کہ تم نکاح پڑھا سکتے ہو؟ میں جانتا تو نہیں تھا مگر اتنا پتا تھا کہ ایجاب و قبول کرنے اور اللہ' رسولؐ کی سنت کے مطابق مہر مقرر کرکے ایک دوسرے سے اقرار کروانے کو نکاح کہتے ہیں۔ میں نے آکا باگیا کو بتایا۔ اس نے فوراً نکاح پڑھانے کو کہا۔ اس وقت تک انیتا ہوش میں آچکی تھی اور خاموش بیٹھی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ تم سے نکاح پر تیار ہے۔ اس نے اقرار کرلیا۔ تب میں نے نکاح پڑھا دیا۔ نکاح پڑھاتے ہی مجھے لگا جیسے سب کچھ ٹھیک ہوگیا ہے۔ تم نے نہ صرف انیتا کو قبول کرلیا بلکہ وہ جو عجیب و غریب سی آوازیں پورے گھر میں گونج رہی تھیں' معدوم ہوگئیں۔ میں نہیں جانتا کہ وہ سب کیا تھا مگر ایک احساس تھا جو مجھے اندر سے مطمئن کررہا تھا کہ اب سب ٹھیک ہوگیا ہے۔ کوئی تباہی آتے آتے پلٹ گئی ہے۔ ضیاء! اب تم دونوں

کورٹ جاکر کاغذات بنوالو.......... انیتا اب تمہاری بیوی ہے اس لئے تمہارے بیڈ روم میں تھی۔"

طیب خاموش ہوگیا اور میرے اندر ہزاروں طوفان سے اٹھ گئے۔ انیتا میری بیوی تھی۔ ہمارا نکاح ہوگیا تھا۔ میں اس کا شوہر تھا اور فرحت..........!! اس سے میرا ہر تعلق ختم ہوچکا تھا۔ میں اسے کیا جواب دوں گا۔ منے دادا سے کیا کہوں گا؟ اماں' بی جان' خالہ بی اور دوسرے گھر والوں کا سامنا کیسے کروں گا؟ یہ وہ سوال تھے جو شور مچاتی لہروں کی طرح میرے دماغ سے ٹکرا رہے تھے۔ میں نے طیب سے بھی کہہ دیا کہ میں اتنا بڑا قدم اٹھا کر گھر والوں کا سامنا کیسے کروں گا!

"میرا خیال ہے کہ منے دادا بات کو سمجھ لیں گے۔ اور ہاں.......... آکا باگیا آج تمہیں آشیرواد دینے آئے گا۔ ضیاء' وہ تمہارے نکاح کے بعد حیرت انگیز طور پر خوش تھا۔ تم فی الحال یہاں کی سوچو۔ گھر کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ میں سب کو مطمئن کردوں گا۔ میرا تو ارادہ ہے کہ میں کل ہی روانہ ہوجاؤں مگر پہلے تم کورٹ سے ہو آؤ۔ نکاح کی قانونی حیثیت بھی تو ضروری ہے۔"

میں مزید کچھ کہنے والا تھا کہ اچانک انیتا کمرے میں داخل ہوئی۔ میری نگاہ اس کے چہرے پر پڑی۔ وہ بے حد پیاری' شرمیلی مسکراہٹ چہرے پر سجائے چائے لئے اندر آرہی تھی۔ مجھے وہ قطعی اجنبی نہیں لگی۔ بلکہ عجیب سا احساس ہوا جیسے میں اسے برسوں سے جانتا ہوں۔ بچپن سے۔ میرے ذہن کے پردے پر اس کا چھوٹا سا معصوم سا چہرہ نظر آنے لگا۔ یوں لگا جیسے ہم نے بچپن ساتھ ہی گزارا ہے۔ جلتی دوپہروں میں درختوں کے سائے میں ہم دونوں گھنٹوں بیٹھے ہیں۔ ہم نے گڑیا کھیلی ہیں۔ لمبی لمبی گلیوں میں چکر لگائے ہیں۔ یہ سب کچھ مجھے اتنا صاف نظر آرہا تھا جیسے کوئی فلم سی نگاہوں کے سامنے چل رہی ہو۔

"چائے۔" اس کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"تھینک یو۔" بے اختیار میں کہہ اٹھا۔ اس نے نگاہ اٹھا کر مجھے یوں دیکھا جیسے میں اس کی سب سے بڑی خواہش تھا اور آج وہ مجھے حاصل کرکے بہت خوش' مطمئن اور آسودہ ہے۔

وہ واقعی خوش تھی۔ یہ بات اس نے مجھے اسی شام بتا دی تھی۔ جب طیب گوہاں کو فون کررہا تھا اور میں اور انیتا باہر بنے جھولے سے لان میں کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ ایک

روز پہلے اس کی اماں اور بہن کا انتقال ہوا تھا مگر یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا ان دونوں سے کوئی رشتہ کبھی تھا ہی نہیں۔ مجھے خیال آیا مگر میں اس لئے خاموش ہو گیا کہ بے وجہ اسے یاد دلا کر غمزدہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مزے کی بات یہ تھی کہ کوئی تاسف، کوئی صدمہ یا افسوس مجھے بھی نہیں تھا۔ چند گھنٹوں میں، میں فرحت کو بھول چکا تھا۔ گھر والوں کا سامنا کرنے کا خوف بھی نہیں تھا۔ ایک سکون تھا۔ ایک سکوت تھا جو میرے اندر اطمینان بن کر پھیلا ہوا تھا۔

"میں نے اپنی زندگی میں.......... ہمیشہ صرف آپ ہی کے بارے میں سوچا تھا۔" وہ کہہ رہی تھی۔ "یہ خوف میری راتوں کی نیندیں اڑا دیتا تھا کہ آپ مجھے پتا نہیں، کبھی مل پائیں گے یا نہیں.......... میں شاید آپ سے زیادہ آغا باگیا کی ممنون رہوں گی۔"

مجھے اس کی بات سن کر حیرت ہوئی۔ وہ مجھ سے صرف تین روز پہلے ملی تھی۔ پہلی رات وہ مر چکی تھی، اس کی نیند کب اڑی؟ دوسری رات ہمارا نکاح ہو گیا اور اس وقت وہ میرے سامنے میری بیوی کی حیثیت سے بیٹھی تھی۔ وہ کن راتوں کی بات کر رہی تھی۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ پوچھتا، طیب آ گیا۔

"یار! تمہیں آج کورٹ جانا چاہئے تھا۔"

"ہاں! کل صبح وکیل کو بلوا لو۔ ہمیں کورٹ جانے کی ضرورت نہیں۔ وہ سب کچھ کر دے گا۔"

"گوپال آ رہا ہے۔ اس نے کہا ہے، دونوں سے کہو تیار رہیں۔ ہم کھانا باہر کھائیں گے۔"

میں نے انیتا کی طرف دیکھا۔ خوشی سے اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔ وہ مجھے ہی دیکھ رہی تھی۔ "ٹھیک ہے، تم تیار ہو جاؤ۔ میں چائے پی کر تیار ہو جاؤں گا۔" پھر میں طیب سے مخاطب ہوا۔ "کب تک آئے گا گوپال؟"

"گھنٹا بھر میں۔"

"اور ہاں..........! وہ آغا باگیا۔ اس نے بھی تو آنے کو کہا تھا ناں؟" مجھے یاد آ گیا۔ میں تو خود اس سے ملنا چاہتا تھا۔

"ارے ہاں یار! میں تو بھول ہی گیا۔" طیب نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔

انیتا جو کمرے کی طرف جا رہی تھی، رک گئی اور بولی۔ "وہ رات کو دیر سے آئیں

گے۔ اس وقت تک ہم واپس آ چکے ہوں گے۔" یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

میں اور طیب اسے دیکھتے رہ گئے۔ مجھے عجیب سا لگا کہ وہ اتنے وثوق سے کیسے کہہ رہی ہے۔ طیب پتا نہیں کیا سوچ رہا تھا۔ میں نے استفہامیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا تو اس کی پُرسوچ آنکھوں میں کچھ ارتعاش پیدا ہوا، پھر وہ کندھے اچکا کر رہ گیا۔

ہم نے چائے پی۔ اس دوران میں طیب نے مجھے بتایا کہ اس نے اکیلے دہلی جانے کا ارادہ ترک کر دیا ہے اور مجھے انیتا کو ساتھ لے کر اس کے ساتھ دہلی چلنا چاہئے۔ یہ تو میں بھی جانتا تھا کہ منے دادا نے فرحت کی شادی مجھ سے نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ مجھے دبے دبے انداز میں کہہ بھی چکے تھے اور غالباً اماں وغیرہ سے بھی انہوں نے بات کر لی تھی۔ ان کی طرف سے تو مجھے فکر نہیں تھی مگر میں جانتا تھا کہ یہ بات ان میں سے کسی نے بھی فرحت سے نہ کہی ہو گی۔ وہ یقیناً میرے وعدے پورے ہونے کے انتظار میں ہو گی۔ پھر بی جان.......... انہوں نے جو آس لگائی تھی، اس کا ٹوٹنا مجھ سے کب دیکھا جائے گا؟

لیکن یہ سب سوچنے کے باوجود جو کچھ ہو چکا تھا اسے سب کے سامنے تو آنا ہی تھا۔ ... کو یہ زہر پینا ہی تھا۔ بی جان کی آس کو ٹوٹنا ہی تھا، چاہے میری پوزیشن کتنی ہی ... کیوں نہ ہو جائے۔ کیا پتا، منے دادا یا اماں نے بی جان سے ذکر کر دیا ہو کہ شالی بابا ... منع کیا ہے۔ میرا دماغ سوچتے سوچتے پکنے لگا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" طیب نے مجھے چونکا دیا۔

"ہوں.......... کچھ نہیں۔" میں نے چائے کا آخری گھونٹ لے کر گہرا سانس لیا۔

"گھر کی فکر نہ کرو۔" اس نے اتنا کہہ کر پیالا منہ سے لگا لی۔ "تم تیار ہو جاؤ۔ وہ آئے گا تو گاڑی سے اترے گا بھی نہیں۔" طیب یہ کہہ کر کھڑا ہو گیا۔

"میں نہا کر کپڑے بدلتا ہوں۔ تم بھی جلدی کرو۔ ویسے ضیاء!" وہ جاتے جاتے ... گیا۔ "مجھے یوں اکیلے، چپ چاپ، سنا ٹول میں اس شادی پر ذرا بھی خوشی نہیں ہے۔ ... اور گوپال نے پروگرام بنایا ہے کہ ہم دوستوں کو پارٹی بھی دیں گے اور.......... گھر ... ہنی مون کا بھی کریں گے۔ ڈونٹ وری۔"

وہ بغیر جواب سنے چلا گیا۔ میں کچھ دیر وہیں بیٹھا اپنے اندر کے سناٹے میں کہیں ... ارتعاش، کوئی آواز، کوئی حرکت کھوجتا رہا۔ مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ کوئی تلاطم محسوس ... ہوا، حتیٰ کہ خوشی کا بھی کوئی احساس ایسا نہ تھا، جس نے میرے اندر رنگ بکھیرے

ہوں۔ ارتعاش پیدا کیا ہو یا مجھے کسی قسم کی چہل پہل کا احساس ہوا ہو۔ بس خاموشی تھی، پرسکون خاموشی۔ میں اٹھ گیا۔ میرا سامان میرے کمرے ہی میں تھا اور اس کام والے بچے ریاض نے طیب کی ہدایت پر کپڑے الماریوں میں ٹانگ دیئے تھے۔ انیتا بھی وہیں تھی۔ میں اندر داخل ہوا۔ باتھ روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ انیتا نہا چکی ہے مگر وہ کمرے میں نہیں تھی۔ شاید کسی کام سے باہر گئی ہو۔ کہاں؟ یہ میں نے نہیں سوچا۔

میرے کپڑے استری کئے الماری کے ہنڈل میں ہینگر میں لٹکے ہوئے تھے۔ میں تولیہ لے کر باتھ روم میں چلا گیا۔ نہا کر طبیعت کافی فریش ہو گئی۔ میں نے کپڑے بدلے۔ انیتا ابھی تک دکھائی نہیں دی تھی۔ میں کنگھی کر رہا تھا کہ باہر سے ہارن کی آواز سنائی دی، ساتھ ہی طیب کے پکارنے کی بھی۔ میں جلدی سے کمرے سے باہر آ گیا۔ گاڑی گیٹ سے اندر ہی کھڑی تھی۔ طیب اور انیتا گاڑی میں بیٹھے تھے۔ باہر لگے بلب میں مجھے انیتا کا چہرہ کسی گلاب کی مانند کھلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ہلکے میک اپ میں وہ غضب ڈھا رہی تھی۔ طیب ڈرائیونگ سیٹ کے برابر والی سیٹ پر براجمان تھا۔ مجھے اپنی طرف آتا دیکھ کر گوپال گاڑی سے اتر کر میرے استقبال کو آگے بڑھا۔ میرے سینے سے لگ کر اس نے مجھے مبارک باد دی۔ بہترین ڈنر کا وعدہ لیا مگر یہ بھی بتا دیا کہ آج کا ڈنر اس کی طرف سے ہے۔

میں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ انیتا نے کالے رنگ کی ساڑھی باندھی ہوئی تھی جس کے بارڈر پر سنہری نازک سی بیل بنی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ وہ ساڑھی باندھتی ہے۔ جس قدر اہتمام کیا ہوا تھا اس سے تو یوں لگ رہا تھا جیسے یہ ساڑھی اسے بری یا جہیز میں ملی ہے۔ جب کہ ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ سنہری بیل کی مناسبت سے اس نے سنہرے رنگ کی بندیا بھی لگائی ہوئی تھی۔ میرا جی چاہا کہ اسے بندیا ہٹانے کا کہہ دوں مگر یہ سوچ کر چپ رہ گیا کہ اس نے کتنی چاہت سے لگائی ہوگی اور میں پہلے ہی روز اس پر اپنی مرضی مسلط کروں گا تو یہ اچھا نہیں ہوگا۔ گاڑی چل پڑی۔ میں یہ سوچتا رہ گیا کہ انیتا نے یہ سارا اہتمام کہاں کیا؟ طیب جس بیڈ روم میں تھا وہاں آئینہ نام کی کوئی چیز اگر تھی تو صرف باتھ روم میں۔ میرے بیڈ روم میں الماری کے ایک پٹ پر آئینہ لگا تھا مگر انیتا وہاں نہیں تھی اور وہ کمرا جہاں اس نے پہلی رات گزاری تھی البتہ کسی خاتون کے کمرے کی طرح سجایا گیا تھا۔ وہاں قد آدم آئینے والی ڈریسنگ ٹیبل تھی مگر وہ کمرا تو ہم نے اسی دن لاک کر دیا تھا اور اس کی چابی ابھی تک میرے ان کپڑوں کی جیب میں تھی جو میں نے ابھی اتارے

تھے۔ پتا نہیں کیوں میں اس الجھن میں پڑ گیا۔ رہ رہ کر مجھے ایسے ہی خیالات آ رہے تھے۔ میں بار بار گوپال اور طیب کی باتوں کی طرف دھیان لگاتا مگر پھر میرا ذہن بھٹک جاتا مگر پھر میرا ذہن بھٹک کر انہی سوالات کے گرداب میں پھنس جاتا۔

طیب اور گوپال مسلسل باتوں میں مصروف تھے۔ انیتا خاموش تھی اور باہر دیکھ رہی تھی۔ ابھی تک میں نے اس سے کسی وارفتگی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اس وقت اس کی خاموشی نے مجھے احساس دلایا کہ مسائل میں' میں گرفتار ہوں۔ نکاح میرے لحاظ سے غلط ہوا ہے۔ میں اس شادی پر تیار نہیں تھا۔ خوف ناکیاں میری پشت پر ہیں' اسے کیا پتا' اس کے تو ہر انداز میں پسندیدگی کا اظہار ہو رہا تھا۔ وہ تو خوش تھی۔ ایک دم اکیلا رہ جانے کا دکھ تک بھول چکی تھی۔ اسے تو مجھ سے وارفتگی اور سپردگی کی توقع ہوگی۔ اس کا تو جی چاہ رہا ہوگا کہ میں اسے اپنی موجودگی کا احساس دلاؤں۔ اس کے کانوں میں سرگوشیاں کروں۔ خوب صورت دنوں اور حسین جذبوں کی باتیں کروں۔ شاید وہ میرے رویے سے دل برداشتہ ہے۔ اس خیال نے مجھے بے چین کر دیا۔ میں نے دھیرے سے ہاتھ بڑھا کر' اس کی گود میں رکھا ہوا ہاتھ تھام لیا اور پھر چونک اٹھا۔ اس کا ہاتھ بالکل سرد تھا۔ اس کے چہرے پر غم کا تاثر پھیلا ہوا تھا۔ آنکھوں میں اداسی بھی تھی۔

"کیا ہوا ہے تمہیں؟" میں نے چپکے سے پوچھا۔

اس نے نفی سے سر ہلایا۔ اس کے غمزدہ چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ وہ ایک دم ٹھیک ہو گئی۔ اس نے میری طرف بڑی وارفتگی سے دیکھا۔ میں نے مسکرا کر اسے اسی وارفتگی سے جواب دیا۔ اس کے ہاتھ کو تھپکا اور طیب کی طرف متوجہ ہو گیا جو گوپال کو کسی حسین عورت کی داستان سنا رہا تھا جو بقول اس کے' پیدا ہی اسی کے لئے کی گئی تھی مگر وہ حقارت سے اسے ٹھکرا کر چلا آیا تھا۔

"یار بڑے کٹھور ہو۔ تمہیں عورتوں کے ساتھ اپنے رویے کو بدلنا چاہئے"۔ گوپال ناراض ہو رہا تھا۔

"یار میں اکیلی جان............ آخر کس کس کے بارے میں سوچوں گا۔ پھر سب سے اہم بات یہ کہ میری منگیتر ہے۔ ہماری منگنی بچپن میں ہی ہو گئی تھی۔ وہ میری منتظر ہے' میری خاطر جان دینے کو بھی تیار ہے۔ اگر اسے پتا چل جائے کہ میں اس سے بے وفائی کر رہا ہوں تو کیا ہوگا۔ میں بھی اسے چاہتا ہوں۔ میں نے اس سے ہزاروں وعدے کئے ہیں۔

ان کا کیا ہو گا؟"

یہ طیب تھا جو بڑی رعونت سے بتا رہا تھا۔

"منگنی!" گوپال نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ "مگر اس دن تو تم کہہ رہے تھے کہ کم از کم منگنی ہی ہو چکی ہوتی تو میں یوں اپنے اندر خلاء محسوس نہیں کرتا"۔

"وہ تو دوسری منگنی کی بات کر رہا تھا"۔ طیب نے برجستگی سے جواب دیا۔

"میرے بھائی! پہلی منگنی سے پہلے دوسری منگنی کیسے کر سکتے ہو تم؟" میں نے ہنس کر پوچھا۔

"پہلی تو ہو چکی ہے یار! ایک تو تمہارا حافظہ بہت خراب ہے"۔ طیب نے پلٹ کر مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

"اچھا ہاں"۔ میں نے زور سے سر ہلایا۔ "میں تو تمہاری ساری منگنیاں بھولے بیٹھا ہوں۔ ویسے بائی دا وے۔ پہلی منگنی کب اور کس کے ساتھ ہوئی تھی' ذرا یاد دلائیں گے مجھے؟"

میرے انداز پر انیتا ہنس پڑی۔ وہ غالباً جان گئی تھی کہ طیب گپ مار رہا ہے۔

"کیسی باتیں کرتے ہو تم ضیاء............ بھابی"۔ طیب نے انیتا کو مخاطب کیا۔ "آپ کی ڈیوٹی ہے یہ کہ آپ نہار منہ ضیاء کو بادام کی گری کھلایا کریں گی' اور چاروں مغز بھی۔ اس سے حافظہ تیز ہوتا ہے"۔

"مگر حافظہ تیز ہونے کی صورت میں مجھے تمہاری منگنیاں' ہزاروں کی صورت میں یاد آجائیں گی"۔

"نہیں۔ اس سے حافظہ درست بھی ہوتا ہے"۔ وہ جھلا گیا۔ "پہلی ہی یاد آجائے تو بڑی بات سمجھو۔ تم نے خود تو کرائی تھی"۔

"میں نے؟"

"ہاں اور کیا...... ...... فرحت سے۔ ارے! پہلی بار جو ہم دہلی گئے تھے۔ تب۔ ارے ہاں......... میں تو بھول گیا۔ اس دن تو تم پھسل کر گر پڑے تھے۔ تمہارے سر پر چوٹ آئی تھی اور تمہاری یادداشت بھی متاثر ہوئی تھی۔ خیر تم چھوڑو"۔

طیب گھبرا گھبرا کر کہہ رہا تھا اور گوپال ہنس رہا تھا مگر میں ساکت رہ گیا تھا۔ مجھے فرحت کے ذکر پر جانے کیا ہو گیا تھا۔ دکھ کا گہرا احساس ہوا تھا۔ یہ یاد آگیا تھا کہ طیب

فرحت کو پسند کرتا ہے اور اب.......... اب اس کی طرف جانے والے تمام راستے کھلے ہوئے تھے۔ اب مجھے کوئی حق بھی نہیں پہنچتا تھا کہ میں اسے فرحت کے بارے میں سوچنے سے منع کر دوں۔

میں خاموش ہو گیا تھا۔ میری خاموشی کو انیتا نے محسوس کر لیا تھا۔ اس لئے کہ اس نے مجھے بڑے غور سے دیکھا پھر ہنس کر منہ کھڑکی کی طرف کر لیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے اس نے میری سوچ کا مذاق اڑایا ہو۔ مجھے احساس دلایا ہو کہ میں جو کچھ چاہتا تھا' حاصل نہیں کر سکا اور وہ جو کچھ چاہتی تھی' اسے حاصل ہو گیا ہے اور اب میری یہ سوچیں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ میرا دل بوجھل ہو گیا۔ وہ جو ذرا موڈ بحال ہوا تھا' چوپٹ ہو گیا' جن سوالوں کے گرداب سے مشکل سے نکلا تھا' اس میں پھر جا پھنسا۔

فرحت کا چہرہ رہ رہ کر نگاہوں میں گھومنے لگا اور اس لمحے میں نے فیصلہ کر لیا کہ انیتا کو لے کر دہلی نہیں جاؤں گا۔ طیب جا کر بتا دے گا۔ اس سے سب کا ردعمل معلوم ہونے کے بعد کوئی فیصلہ کروں گا۔ بی جان کا ردعمل جیسے مجھے معلوم تھا۔ وہ فرحت کو لے کر میرٹھ چلی جاتیں پھر گھر کے دوسرے افراد کا سامنا کرنا اتنا مشکل نہ رہتا اور کوئی ضروری بھی نہیں تھا کہ میں فرحت کا سامنا ضرور ہی کرتا۔ کتنے ہی لوگ بے وفائی کرتے ہیں۔ جان بوجھ کر دل توڑتے ہیں۔ میں نے اس سے براہ راست کوئی وعدہ بھی نہیں کیا تھا۔ مبہم سی بات تھی اور بس۔ کبھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے اپنانے کا دعویٰ نہیں کیا تھا پھر.......... میں کیوں اس قدر پریشان ہوں۔ میری مجبوری سے تو منے دادا بھی واقف ہیں اور بی جان بھی۔ شانی بابا بھی اور اماں بھی اور پھر طیب.......... جو جانتا ہے کہ میں نے شادی کس طرح کی۔ یہ بڑبولا وہاں جا کر ایک ایک تفصیل بتائے گا۔ سب سنیں گے' فرحت کو بھی پتا چلے گا پھر..........؟

اچانک گاڑی جھٹکے سے رکی۔ یہ ایک بڑا ہوٹل تھا جو روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔

"چلو اترو۔ میں گاڑی پارک کر کے آتا ہوں" گوپال نے کہا۔

ہم سب اتر گئے۔ روشنیوں کے اس طوفان میں میری نگاہ انیتا کے چہرے سے ہوتی ہوئی اس کی سیاہ خوبصورت ساڑھی پر پڑی۔ وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ ادھر ادھر کھڑے لوگوں کے ساتھ کھڑی عورتیں چونک چونک کر انیتا کو دیکھ رہی تھیں۔ مجھے اچھا لگا۔ اس کی سیاہ ساڑھی پر چھوٹے چھوٹے سے سنہری دھبے سے بنے ہوئے تھے جو

بہت کم تھے مگر بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔ میں ابھی اس کے سراپا کا پورا جائزہ بھی نہیں لے پایا تھا کہ گوپال اور طیب بھی ہمارے قریب آ گئے۔ ہم ڈائننگ ہال کی طرف مڑ گئے۔

انیتا کی چال میں بڑی تمکنت تھی۔ وہ مجھے اس وقت بالکل اجنبی سی لگ رہی تھی۔ انیتا ہونے کے باوجود انیتا نہیں لگ رہی تھی۔ پُروقار چال' چہرے پر سنجیدگی' پتلی لمبی گردن میں جھلملاتی باریک سنہری چین۔ بھرے بھرے ہوئے بازوؤں میں بلاؤز کی پھنسی ہوئی آستین۔ اونچی ایڑی کے سیاہ سینڈل۔ کٹے ہوئے بالوں کو جوڑے کی شکل میں بنایا ہوا تھا جو اس کے وقار میں اضافہ کر رہا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی۔ اس وقت وہ اتنی ہی خوبصورت لگ رہی تھی کہ مجھے اس اچانک شادی' اور افراتفری میں کیے گئے بندھن پر خوشی ہوئی۔

"یار نظر نہ لگے۔ تم دونوں کی جوڑی پورے ہوٹل میں چمک رہی ہے"۔ گوپال نے سرگوشی کی۔ "ویسے یار یہ مجھے وہ انیتا تو لگ ہی نہیں رہی جسے میں چھ برس سے جانتا ہوں"۔

"اچھا ہے۔ ضیاء اپنی بیوی کے ساتھ کسی اور کی بے تکلفی برداشت کرنے کا عادی نہیں ہے"۔ طیب نے منہ بنا کر کہا۔

"عادی"۔ گوپال رک گیا۔ "یعنی تمہارا مطلب ہے کہ وہ شادی کا' یعنی بیوی کا عادی ہے۔ اور بیوی سے بے تکلفی کا عادی نہیں۔ یعنی وہ پہلے بھی شادی شدہ ہے۔ یعنی"۔

"بس کرو یار"۔ طیب جھنجلا گیا۔ "تمہارے اس یعنی نے میرا ناک میں دم کر دیا ہے۔ مطلب صرف یہ ہے کہ یعنی سمجھو۔ یہ وہ انیتا نہیں کوئی اور انیتا ہے"۔

میں اور انیتا ہنستے رہے۔ ہم نے بڑے خوشگوار موڈ میں کھانا کھایا۔ ہنسی مذاق ہوتا رہا۔ درمیان میں عجیب بات ہوئی۔ انیتا واش روم جانے کے لئے اٹھی' چلی گئی۔ جب وہ واپس آ رہی تھی تو میری نگاہ اس کی طرف اٹھ گئی۔ وہ مجھ سے کوئی بیس قدم دور تھی مگر روشنیوں نے اس کے گرد ہالہ سا بنا رکھا تھا۔ ان روشنیوں کے درمیان اچانک میری نگاہ ان سنہرے دھبوں پر گئی۔ میں اچھل پڑا۔ چیخا۔ "انیتا..........!"

میری چیخ سن کر سب اچھل پڑے۔ انیتا جہاں تھی وہیں ساکت ہو گئی۔ گوپال اور

طیب کیا ہوا' کیا ہوا چیخنے لگے مگر میں تیر کی طرح انیتا کے قریب پہنچ گیا اور وہیں گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ کر اس کی ساڑھی کو زور زور سے جھاڑنے لگا۔ ساتھ ہی چیخ رہا تھا۔ "ہلنا نہیں.......... انیتا ہلنا نہیں"۔

تمام لوگ جو لمحہ بھر کو ساکت رہ گئے تھے' میری طرف لپکنے لگے۔ سب حیران تھے۔ مجھ سے میرے چیخنے کی وجہ پوچھ رہے تھے۔ مگر میں پاگلوں کی طرح انیتا کی ساڑھی جھاڑ رہا تھا اور چیخ رہا تھا۔ انیتا نے بڑی مضبوطی سے اپنی ساڑھی پکڑ رکھی تھی اور مجھ سے باربار کہہ رہی تھی۔

"ضیاء.......... پلیز.......... یہ کیا کر رہے ہو.......... مت کرو.......... کیا کر رہے ہو.........."

اچانک مجھے پیچھے سے کچھ لوگوں نے پکڑ لیا۔ طیب میرے سامنے آ گیا۔ "کیا ہے یار.......... یہ کیا کر رہے ہو تم؟"

اس کی آواز سے مجھے ہوش آ گیا۔ سب لوگ میرے گرد کھڑے تھے۔ انیتا کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ گوپال اور طیب کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"یہ.......... انیتا کے بدن پر.......... ساڑھی پر.......... وہ سنہری مکڑیاں.........."

مجھ سے بولا نہیں گیا۔ میں نے پھر اس کی ساڑھی پر پڑے دھبوں پر نگاہ جما دی۔

"کچھ نہیں ہے یہ.......... پینٹ ہے.......... دیکھو.........."

طیب نے چٹکی سے ایک دھبہ پکڑ کر مسلا۔ واقعی وہاں مکڑی نہیں تھی جبکہ میں نے انہیں باقاعدہ رینگتے دیکھا تھا ورنہ میری نگاہ تو انیتا کے چہرے پر تھی۔ حرکت کے احساس نے ہی میری نگاہ کا زاویہ بدلا تھا۔ میں نے ساڑھی کو دیکھا تو وہاں چھوٹی چھوٹی سنہری مکڑیاں رینگ رہی تھیں اور یہ بالکل سچ ہے۔ اور یہ بھی سچ تھا کہ طیب چٹکی میں پکڑے جسے کو دکھا رہا تھا۔ وہ پینٹ ہی تھا۔ سنہرا پینٹ.......... چاروں طرف کھڑے لوگوں کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ ہوٹل کا منیجر گوپال سے صورت حال کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ انیتا بے حد شرمندہ' سر جھکائے کھڑی تھی۔ لیکن ایسا لگا جیسے اسے غصہ ہو.......... میری حرکت پر.......... طیب مجھے سہارا دے کر کھڑا کر چکا تھا۔ لوگ جو جمع ہو گئے تھے' چہ میگوئیاں کرتے اپنی اپنی ٹیبل پر جا رہے تھے۔ گوپال منیجر سے معذرت کر رہا تھا۔ طیب مجھے لئے اپنی ٹیبل پر چلا آیا۔ پھر مجھے بیٹھنے کو کہہ کر اس نے گلاس میں پانی انڈیل کر مجھے

دیا اور خود گوپال کی طرف بڑھ گیا۔ انیتا اب میرے سامنے بیٹھ چکی تھی اور مجھے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اچانک مجھے اس کی آنکھوں میں تمسخر دکھائی دیا پھر گہری سنجیدگی.......... اس نے ذرا سا آگے کو سرک کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"ضیاء.......... اب تمہیں ایسی باتوں کا عادی ہو جانا چاہیے۔ تماشا بننے سے بہتر ہے کہ آدمی خود پر جھیل لے"۔

میں چونک اٹھا۔ وہ کیا جانتی ہے؟ کیا کہہ رہی ہے؟ کیوں کہہ رہی ہے' میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ پوچھتا' گوپال اور طیب آ گئے۔

"چلو یار! کھانا تو کھا ہی چکے ہیں۔ یہاں سب گھور گھور کر دیکھ رہے ہیں۔ کہیں اور چلتے ہیں"۔

گوپال نے کہا اور گاڑی کی چابی اٹھائی۔ غالباً وہ بل پے کر آیا تھا۔ واقعی ہمیں سب عجیب سی نگاہوں سے گھور رہے تھے۔ خاص طور پر سب کی نگاہ مجھ پر اور انیتا پر تھی۔ ہم اٹھ گئے۔ گاڑی میں بیٹھے تو انیتا کا موڈ کافی خراب لگ رہا تھا اور میں ابھی تک اس الجھن میں تھا کہ انیتا نے مجھے کن باتوں کا عادی ہو جانے کی تلقین کی ہے۔ طیب اور گوپال بھی خاموش تھے۔ ہوٹل میں ہونے والا واقعہ یقیناً تماشا بن گیا تھا مگر یہ اب بھی یقین تھا کہ مجھے دھوکا نہیں ہوا ہے۔ میں طیب کو بھی یہ یقین دلانا چاہتا تھا مگر یہ موقع نہیں تھا۔ اس طرح گوپال اور انیتا مجھے یقیناً پاگل سمجھنے لگتے۔ میں تو بار بار خود کو باور کرانے کی کوشش کر رہا تھا کہ مجھے دھوکا ہوا ہوگا' طیب ہی ٹھیک کہہ رہا ہے مگر نہیں.......... مجھے یقین تھا کہ میں دھوکا نہیں کھا سکتا۔ یہ خیال آتے ہی میں نے پھر انیتا پر نگاہ ڈالی جو کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی پھر میں نے اس کی سیاہ ساڑھی پر نگاہ کی۔ وہاں وہی دھبے سے پڑے تھے۔

میں نے اس کی نگاہ بچا کر ایک دھبے کو انگلی سے محسوس کیا اور پھر میرے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔ میں اچھلا تو نہیں' ساکت ہو گیا۔ میری انگلی کے نیچے کوئی لجلجی سی چیز تھی جو زندہ تھی اور سانس لے رہی تھی۔ یہ اچھا ہی ہوا کہ میں اچھلا نہیں ورنہ پھر تماشا بنتا۔ کم از کم انیتا اور گوپال کی نگاہ میں ضرور تماشا بن جاتا۔ مگر اب اکیلے اس بات کو ہضم کرنا بھی ایسا آسان نہیں تھا۔ میں نے دھبے پر انگلی جما دی اور پوری قوت سے اس چیز کو مسل دیا۔ انگلی پر تیلے تیلے کسی سیال کا احساس بھی ہوا۔ میں نے انگلی سیٹ سے رگڑ کر خشک کر لی اور اپنی سرد ہوتی ریڑھ کی ہڈی کو سیٹ کی پشت سے ٹیک دیا۔ کھڑکی سے باہر دیکھا۔

گاڑی سمندر سے چند گز دور' چوڑی سڑک پر پھسل رہی تھی۔ میرا جی چاہا میں گاڑی رکوا کر بھاگ جاؤں۔ اب میری ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ انیتا کی ساڑھی کی طرف دیکھوں۔

"یہاں روک دو"۔ بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

گوپال نے آئینے میں مجھے دیکھا اور پھر پلٹ کر بولا۔ "کیا بات ہے ضیاء! تمہارا رنگ کیوں سفید ہو رہا ہے؟"

یہ کہتے کہتے اس نے گاڑی سائیڈ میں کر کے روک دی۔

"میری.......... میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے"۔ گاڑی رکتے ہی میں باہر آ گیا۔ طیب بھی لپک کر اتر گیا اور میری طرف آیا۔

"کیا بات ہے ضیاء!" اس نے شاید محسوس کر لیا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ وہ میری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

"طیب! کچھ ہے.......... کسی طرح ان دونوں سے کچھ فاصلے پر چلو"۔ میں نے سرگوشی کی اور یوں ایک طرف کو بڑھ گیا جیسے مجھے ابکائی آ رہی ہو۔

انیتا بھی گھبرا کر گاڑی سے اتر رہی تھی۔ طیب نے اسے دوبارہ بٹھا دیا۔

"کیا ہو گیا ہے ضیا کو؟" وہ بڑی معصومیت سے پوچھ رہی تھی۔

"آپ پریشان نہ ہوں۔ شاید وامٹنگ ہو رہی ہے۔ کچھ ٹھنڈی ہوا لگے گی تو ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ بیٹھیں"۔

اس نے زبردستی انیتا کو گاڑی میں بٹھا دیا۔ گوپال کو وہ انیتا کی وجہ سے بٹھا آیا۔ میں اب ان لوگوں سے تقریباً پندرہ بیس قدم دور سمندر کی طرف منہ کیے کھڑا تھا۔ یہاں لگے پول سے کافی روشنی دور تک پھیل رہی تھی۔ طیب میرے قریب آ گیا۔ میں نے اسے تفصیل بتائی۔ پہلے تو وہ سنجیدہ نہیں ہوا۔ میرے بتائے ہوئے واقعے کو دماغ کا خلل ثابت کرنے کی کوشش کرتا رہا مگر جب میں نے اصرار کیا اور اپنی انگلی اس کے سامنے کی اور بتایا کہ ابھی ابھی میں نے اسے اپنی انگلی سے مسلا ہے۔ تب میری نگاہ طیب کے چہرے پر پڑی۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ چہرے پر اچانک خوف پھیل گیا تھا۔ وہ میری انگلی کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے چونک کر اپنی انگلی دیکھی اور پھر میرے منہ سے عجیب سی آواز نکلی۔ میری انگلی کی پہلی پور سنہری ہو رہی تھی۔

"یہ.......... یہ دیکھو.......... وہ اگر جینت تھا تو گیلا تو نہیں تھا نا.......... پھر..........

یہ..........؟"

"ضیاء! ویسے یہ ہو تو سکتا ہے ناکہ تمہارے رگڑنے سے پینٹ ہی پھیلا ہو۔ وہ واقعی گیلا ہو یا.......... بالکل سوکھا.......... کہ رنگ تمہاری انگلی پر لگ گیا ہو"۔ طیب میرے ساتھ ساتھ غالباً خود کو بھی تسلی دے رہا تھا۔ یقین دلا رہا تھا۔

"پتا نہیں.......... لیکن طیب! وہ زندہ تھی۔ کوئی نرم سی چیز.......... تم یقین کیوں نہیں کرتے ہو۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے تمہیں کچھ پتا ہی نہیں۔ کچھ جانتے ہی نہیں ہو تم۔ آج پہلی بار یہ سب سن رہے ہو"۔ میں جھلا گیا۔

"ضیاء! مجھے تو سچی بات ہے اب خوف آنے لگا ہے۔ یار! آکا باگیا نے تو کہا تھا کہ شادی کرلو' سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اب یہ کیا چکر چل پڑا"۔

"فراڈ تھا تمہارا وہ آکا باگیا.......... مجھے تو یہ اس کی چال لگتی ہے"۔

"نہیں یار! ایسا مت کہو۔ اس کا کیا پتا' ابھی سمندر سے نکل آئے۔ چلو' گھر چلو۔ اس نے آنے کو کہا تھا نا۔ اس سے بات کریں گے"۔

مجھے بھی یاد آگیا کہ اسے آنا تھا۔ میں تیزی سے گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ گوپال اور انیتا پریشان تھے مگر میں نے مسکرا کر انہیں تسلی دی اور ہم گھر کی طرف روانہ ہوگئے۔

"آپ.......... آپ ٹھیک نہیں ہیں کیا؟" انیتا نے بڑی دیر کے بعد پوچھا۔

"نہیں.......... میں بالکل ٹھیک ہوں"۔ میں نے خود کو نارمل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"پھر وہ.......... ہوٹل میں.......... وہ سب کیا تھا؟"

"بتاؤں گا انیتا.......... دراصل میرے ساتھ ایک مسئلہ ہے۔ تم نے تو وقت ہی نہیں دیا کہ کچھ بتاتا مگر ایسی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ تم مطمئن رہو"۔

مجھے وقتی طور پر اسے مطمئن کرنا تھا' سو کر دیا۔ اب یہ سوچنے کو بڑا وقت پڑا تھا کہ اسے کیا بتاؤں گا۔ فی الحال تو ذہن آکا باگیا' ان سنہری مکڑیوں اور موجودہ حالات میں شادی پر چکرایا ہوا تھا۔

گوپال نے گاڑی گیٹ پر روکی۔ ہم لوگ اترے۔ انیتا نے گوپال سے چائے پینے کو کہا مگر اس نے انکار کر دیا۔ کہا کہ اسے ایک ضروری کام ہے اور وہ کل ضرور شام کی چائے ہمارے ساتھ پیئے گا اور اچھا ہی ہوا کہ وہ گیٹ سے ہی چلا گیا ورنہ.......... جانے کیا

ہ۔ ہم نے جونہی باہر والا دروازہ کھولا' میں اور طیب ہی نہیں' انیتا بھی چیخ اٹھی۔

دروازہ کھولتے ہی جو کچھ دکھائی دیا' وہ سب کو خوفزدہ کر دینے کو کافی تھا۔ اس کمرے میں مدھم سا بلب جل رہا تھا جو طیب جلا چھوڑ کر گیا تھا۔ ہمارے سامنے گوشت کے ٹکڑے پڑے تھے۔ مجھے ایلیا والی کوٹھی یاد آگئی۔ یہی سب کچھ ہمارے ساتھ وہاں بھی ہوا تھا۔ میں نے سب سے پہلے انیتا کو پیچھے کیا تاکہ وہ اس خوفناک منظر کو نہ دیکھ سکے مگر وہ گوشت کے ٹکڑوں کو خون میں لت پت دیکھ چکی تھی اور اب دیوار تھامے' دوسری طرف منہ کرکے گہرے سانس لے رہی تھی۔ طیب ایک لمحے کو تو وہیں ٹھٹک گیا تھا پھر جب میں انیتا کو باہر رہنے کی تلقین کر کے اندر کی جانب بڑھا تو طیب نے بھی قدم بڑھا دیئے۔ مجھے ریاض کی فکر تھی اور تو کوئی یہاں نہ تھا۔ کسی کے آنے کا امکان تھا۔ میں اور طیب تیزی سے آگے بڑھے۔ گوشت کے ٹکڑے زیادہ نہیں تھے پھر صوفے کے پیچھے مرے ہوئے کتے کا سر نظر آیا جس نے میرے خدشات کو مسترد کرایا۔

"ادھر انیتا.......... فکر نہ کرو۔ کتا ہے۔ شاید بھیڑیا اٹھا لایا ہوگا اور اسے یہاں کھانے کی کوشش کر رہا ہوگا۔"

پتا نہیں' یہ بات میں نے انیتا کی تسلی کو کہی تھی یا اپنی تسلی کو۔ میرا دل اب بھی اندر سے دھڑک رہا تھا اور شدت سے یہ احساس ہو رہا تھا کہ یہ گھر جنگل میں نہیں کہ کوئی کسی مردہ کتے کو اٹھا لائے اور پھر دروازہ بھی لاک تھا۔ کھڑکیاں بند تھیں اور زمین سے کافی اونچی بھی تھیں۔ پچھلی طرف سے ایسا کوئی راستہ بھی نہیں تھا جہاں سے کسی کے اندر داخل ہونے کا امکان ہو۔

انیتا بہرحال سنبھل گئی۔ طیب نے بھی اطمینان کا سانس لیا مگر میں نے پورے گھر کا جائزہ لینا ضروری سمجھا۔ باقی سب خیریت تھی۔ طیب نے گوشت کے وہ ٹکڑے جھاڑو کی مدد سے اٹھا کر ڈسٹ بن میں ڈال دیئے پھر وہ ڈسٹ بن بھی گھر سے باہر رکھ آیا۔ ذرا دیر میں کمرا صاف ہو چکا تھا۔ میں نے ایئر فریشنر کا اسپرے بھی کر دیا۔ انیتا اب بھی خوفزدہ تھی اور بار بار چاروں طرف دیکھ کر پوچھ رہی تھی کہ آخر یہ مردہ کتا آیا کہاں سے؟

یہ سوال میرے دماغ میں بھی ہلچل مچائے ہوئے تھا۔ مجھے کوئی یقین دلا رہا تھا کہ یہ کسی خطرے کی دھمکی ہے مگر میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ ہاں' آکا باگیا کا ضرور منتظر تھا کہ اس کے قول کے مطابق شادی کے بعد سب کچھ ٹھیک ہو جاتا تھا' جو میرے لحاظ سے قطعی ٹھیک

نہیں ہوا تھا۔ ہوٹل میں ہونے والے واقعے نے پہلے ہی ہم سب کا موڈ چوپٹ کر دیا تھا۔ میں تو خوفزدہ ہی تھا' اس پر اس افتاد نے اور فکر مند کر دیا تھا۔ میں نے اور طیب نے کسی نہ کسی طرح انیتا کو مطمئن کر دیا تھا۔ اب وہ قدرے نارمل تھی۔

ہمیں آئے ابھی گھنٹہ بھر بھی نہیں ہوا تھا کہ اچانک بے آواز دروازہ کھول کر آکا باگیا ہمارے سامنے آ گیا۔

''اوہ' آکا باگیا! ہم آپ کا انتظار کر رہے تھے۔''

اسے دیکھ کر طیب کی باچھیں کھل اٹھیں۔ انیتا نے اسے حیرت سے دیکھا جیسے پہلی بار دیکھ رہی ہو پھر اس سے پہلے کہ وہ بیٹھتا' انیتا یہ کہہ کر اپنے کمرے میں چلی گئی کہ اسے شدید نیند آ رہی ہے۔

آکا باگیا اس کی بات پر بڑے معنی خیز انداز میں مسکرایا تھا۔ شاید طیب نے اسے مسکراتے نہ دیکھا ہو مگر میری نگاہ اس کے چہرے پر ٹکی ہوئی تھی۔ وہ فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

''ارے کیا کر رہے ہیں آپ؟'' طیب بوکھلا گیا۔ ''یہاں اوپر' صوفے پر بیٹھیں۔''

''اونچی جگہ پر بیٹھنے سے آدمی کا کردار اونچا نہیں ہو جاتا احمق!'' اس نے بے نیازی سے کہا۔

طیب اور میں اس کے قریب قالین پر بیٹھ گئے۔

''نیند سے پیار کرنے والے بے وقوف ہوتے ہیں' زندگی کے لاکھوں گھنٹے سونے میں ضائع کر دیتے ہیں۔ یہ زندگی ضائع کرنے کے لئے نہیں دی گئی' اس کا احساس نہیں ہے کسی کو۔''

اس نے صاف طور پر انیتا پر طنز کیا تھا۔ میں تو اس سے دوسری ہی باتیں کرنا چاہتا تھا اور وہ باتیں ایسی نہیں تھیں کہ انیتا کے سامنے کی جاتیں' شاید اس لئے مجھے اس کی یہ کام کی بات بھی فضول لگی۔ میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بہت سی باتیں تھیں جو مجھے پریشان کر رہی تھیں اور بالخصوص میرے سلسلے میں اتنا بڑا فیصلہ کرنے کے بعد میں ان سب باتوں کا حل چاہتا تھا اس لئے میں نے دوسری کوئی بات کئے بغیر ہوٹل میں ہونے والا اور پھر گھر آ کر کتے والا واقعہ کہہ سنایا جسے وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ طیب نے اس دوران میں قطعی مداخلت نہیں کی مگر اب میں خاموش ہوا تو طیب بول اٹھا۔

''آکا باگیا! انیتا سے شادی اسی شرط پر کی گئی تھی کہ اب کسی قسم کا چکر نہ چلے۔ آپ نے یقین دلایا تھا۔''

''ہاں' ہم نے یقین دلایا تھا۔'' اس نے سر اٹھا کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ ''مگر تو جا کر اپنے جد کو روک۔ وہ بے وقوفیاں کر رہا ہے۔''

''جد؟'' طیب حیران ہوا۔

''منے دادا؟'' میرے منہ سے سرگوشی نکلی۔ ''کیا کر رہے ہوں گے وہ؟''

''وہ وتسلا کے ہاتھوں میں کھلونا بن گیا ہے۔ فراڈ سے وہ عورت سب کچھ ہتھیا لینا چاہتی ہے۔ وہ زیوسا پر قابو پانا چاہتی ہے۔ البن کو بے بس کر دینا چاہتی ہے اور سن!''

اس نے جھٹکے سے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھیں انگارے کی طرح دہک رہی تھیں۔

''یہ شالی کے بس کا کام بھی نہیں ہے۔ تجھ سے کہا ہے نا کہ اب سب کچھ بدل جائے گا تو بس.......... بدل جائے گا۔ میں تجھے مبارک باد دینے آیا تھا۔ جا' جا کر اپنے گھر کے مردوں کو روک دے۔ کہہ دے' راکھ میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے ضرور سوچنا چاہئے کہ کہیں چنگاری بھی ہو سکتی ہے۔ زیوسا خاموش ہے۔ وہ تیری پوجا کرتی ہے۔''

''مجھے زیوسا سے کوئی دلچسپی نہیں آکا باگیا۔'' میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''نہ مجھے اس کی پرستش کی ضرورت ہے۔ میں اپنی سیدھی سادی زندگی میں لوٹ جانا چاہتا ہوں۔ انیتا سے شادی پر میں راضی نہیں تھا' یہ بات آپ جانتے ہوں گے۔ اس معاملے میں مجھ پر آپ نے اپنی مرضی مسلط کی ہے اس لئے آپ ہی اب کسی بھی پُراسرار واقعے کے ذمے دار ہوں گے۔ میں نے بہت بڑی قربانی دی ہے شاید آپ کو اس کا اندازہ نہیں۔''

اس نے میرے انداز اور میرے لہجے پر مجھے گھور کر دیکھا۔ ''اندازہ! کسے کہتے ہیں اندازہ!''

اتنا کہہ کر وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ اس کی ہنسی ہذیانی تھی۔ میں اور طیب دونوں سمجھے کہ آکا باگیا پاگل ہو گیا ہے۔ طیب تو فوراً ٹھنڈے پانی کا گلاس بھر لایا جسے اس نے سر کے اشارے سے پینے سے انکار کر دیا اور ویسے ہی ہنستا رہا۔ مجھے غصہ آ گیا۔ جی چاہا کہ اس کے بالوں کی لٹیں پکڑ کر اتنی زور سے گھماؤں کہ کھوپڑی دیوار سے ٹکرا کر چٹخ

جائے۔

عجیب سی فضا ہو گئی تھی۔ طیب سخت پریشان تھا۔ وہ شاید سمجھ رہا تھا کہ میری کھوپڑی پلٹ چکی ہے۔ بہت کنفیوز تھا۔ میں نے اسے ایسے گھور کر دیکھا جیسے اس چوئیشن کا سبب وہی ہے۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ آکا باگیا کی نظر بچا کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ بھی کیا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ٹہلنے لگا۔ اچانک آکا باگیا خاموش ہو گیا۔ اس کے پورے گھر میں گونجتے قہقہے تھے تو جیسے ایک دم سناٹا طاری ہو گیا۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ وہ سر جھکائے ساکت بیٹھا تھا۔ میں اس کے قریب آ گیا۔

"سب ٹھیک ہو گیا ہے۔" وہ اچانک بولا۔ اس بار وہ سنجیدہ تھا۔ اس کی آنکھوں کی سرخی معدوم ہو چکی تھی۔ یوں محسوس ہوا جیسے اب سے پہلے اس کی جگہ کوئی اور تھا۔

"آکا باگیا! دیوسا سے ضیاء کی جان چھوٹ گئی کیا؟" یہ طیب تھا جو اشتیاق سے پوچھ رہا تھا۔

"کسی کی کسی سے جان نہیں چھوٹتی۔ بے ترتیبی سنبھل جاتی ہے۔ سب کچھ قابو میں آ جاتا ہے اور یہ لڑکا تو خوش قسمت ہے۔ دیویاں کسی کو اتنی اہمیت نہیں دیتیں۔ صدیاں ان کے پیروں سے لپٹی ہیں، ہزاروں میں، میں آکر انہیں مسخر کرنے کی سعی کرتی ہیں۔ بڑے بڑے سورما ناکام ہو جاتے ہیں اور دیوتا انہیں پیروں تلے روند کر گزر جاتے ہیں۔ سادھو، سنت، جوگی بھٹکتے رہ جاتے ہیں یا کچلے جاتے ہیں۔ زیوسا طاقت ہے اور یہ طاقت اب اس کی دسترس میں ہے۔"

اس نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا پھر اچانک میرے سامنے جھک گیا۔ میں اس کی حرکت کو حیرت سے دیکھ رہا تھا اور یہ دیکھ کر تو میں اچھل کر پیچھے ہو گیا کہ وہ اپنی پیشانی کو میرے پیروں کے انگوٹھے پر لگانا چاہتا ہے۔

"یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟" میں نے گھبرا کر کہا۔

"مجھے آزادی چاہئے۔" اس نے میرے سامنے لمبی لمبی انگلیوں والے بڑے بڑے ہاتھ جوڑ دیئے۔ مجھے ایک بار پھر وہی خواب میں دکھائی دینے والا بوڑھا یاد آ گیا۔

"میں.......... میں.......... میں کیا کر سکتا ہوں۔ آپ کو کیسی آزادی چاہئے؟ میں سمجھا نہیں اور پھر.......... میں اس سلسلے میں بھلا کیا کر سکوں گا؟" میں بری طرح بوکھلا گیا تھا۔

"میں صدیوں سے قید ہوں۔ ایک ایسی عمارت میں جہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔ جہاں نہ موت آتی ہے نہ زندگی بلاتی ہے۔ مجھے ان دونوں میں سے کوئی بھی ایک چیز چاہئے۔ کوئی بھی.......... مگر میں یوں معلق نہیں رہنا چاہتا۔ تم ہی مجھے آزادی دلا سکتے ہو۔"

وہ پتا نہیں کیا کہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی پھر دھیرے دھیرے بڑھ رہی تھی۔ وہ منت سماجت کر رہا تھا۔ میں اور طیب دونوں اسے حیرانی سے دیکھ رہے تھے، مجھے تو یقین ہو گیا تھا کہ وہ پاگل ہو چکا ہے۔ اس کی تمام حرکتیں پاگل پن کی تعبیریں تھیں۔ میں نے اسے تاسف سے دیکھا۔

"کہہ دو لڑکے..........! کہہ دو۔"

"ضیاء! کہہ دو۔ کہنے میں کیا حرج ہے۔" یہ طیب تھا جس کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔

"پاگل ہو گئے ہو کیا؟" میں جھنجھلا گیا۔ "یہ تو شاید پاگل ہو چکا ہے مگر تم.........." میں نے بے خیالی اور جھنجھلاہٹ میں زور سے کہا۔

"ہاں! اگر میری جگہ تم ہوتے تو تم بھی پاگل ہو چکے ہوتے۔ جا کر پوچھو رابرٹ سے، جینو سے، سورن سنگھ سے اور.......... چپاس سے۔ وہ یہ بن باس کاٹ رہے ہیں۔ انہیں بھی آزاد کر دو۔ مجھے بھی۔ تم سب کچھ کر سکتے ہو۔ سب کچھ تمہارے ہاتھ میں ہے لڑکے۔"

وہ اب میرے اور قریب سرک آیا۔ اس کے بدن سے اٹھنے والے بدبو کے بھبکے میرے دماغ میں میں چڑھنے لگے۔ میں گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا مگر یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ یہ رابرٹ وغیرہ کے بارے میں کیسے جانتا ہے۔ میں نے اسے کچھ اتنا زیادہ تو بتایا ہی نہیں تھا۔

"تمہارے منہ سے نکلا ہوا ایک لفظ میرے لئے نوید ہو گا۔ کہہ دو، تمہیں آزاد کیا۔ سب کو آزاد کیا۔ یقین کرو، سب تمہیں دعائیں دیں گے۔"

میں اس کی حرکتیں دیکھ کر مزید پریشان ہو رہا تھا۔

"دیکھو، میرے تلوے دیکھو۔"

اتنا کہہ کر اس نے اپنے دونوں پیر اٹھا کر میرے سامنے کر دیئے اور میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ اس کے تلوے زخموں سے بھرے ہوئے تھے اور ان زخموں میں ہزاروں

سفید رنگ کے کیڑے کلبلا رہے تھے۔

"پیچھے ہٹو!" میں گھبرا کر اور دور ہو گیا۔

"کہہ دو ضیاء......! کہنے میں کیا ہے۔"

پھر طیب نے میرے قریب آکر سرگوشی کی۔ میں نے لمحہ بھر طیب کو دیکھا۔ پھر یہی خیال آیا کہ آکا باگیا یقیناً پاگل ہو گیا ہے' واقعی میرا ایسا کہہ دینا کون سا بوجھ ہے۔ سو میں نے ایک نظر اس کے لرزتے ہاتھوں پر ڈالی' دوسری نظر اس کے زخمی تلووں پر اور یہ سوچ کر گھن کھا گیا کہ یہ یہاں تک آیا ہے' یہاں بیٹھا ہے اور زخموں میں کیڑے پڑے ہیں۔ میرا ایک جملہ کہہ دینا میرے ہی حق میں ہے۔ وہ یقیناً یہ سن کر چلا جائے گا۔

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے...... مگر سنو! تم فوراً یہاں سے چلے جانا۔" میں نے ناگواری سے کہا۔ اب بھی مجھے یہ جملہ کہنے میں عار تھا۔ میں خود ہی شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔

"ہاں......! چلا جاؤں گا۔" وہ خوش ہو کر کھڑا ہو گیا۔ "تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ تم مجھ پر کتنا بڑا احسان کرو گے۔ کسی ذی روح کو پانچ صدیوں کے عذاب سے رہائی دینا ایسا آسان نہیں' بہت بڑا احسان ہے۔ تم بہت طاقت ور ہو چکے ہو۔ میں اپنا احسان جتانا نہیں چاہتا لڑکے' حقیقت میں میرے احسان کی کوئی اہمیت بھی نہیں ہے کہ میں نے یہ احسان خود غرضی کی بناء پر کیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ تم مجھ پر بلکہ سب پر یہ احسان ضرور کرو گے۔ ذیبو سا تباہی لاتی ہے تو اس تباہی کو سمیٹ بھی سکتی ہے اور اسے ایسا کرنے پر مجبور کرنے والا صرف ایک ہی شخص تھا اور وہ...... وہ تم ہو۔"

"تم کیا چاہتے ہو آخر اور کیا تم انیتا سے شادی کرا دینے کو اپنا احسان سمجھتے ہو۔ کیا تم نہیں جانتے کہ میں نے ایسا مجبوراً کیا ہے۔"

"ہاں......! اس لئے مجبوراً کیا ہے کہ تم ابھی اس کی طاقت سے واقف نہیں ہو۔ تم میرا احسان مانو گے اگر اپنے اندر وحساس پیدا کر لو۔ تباہیوں کو روک دینا تمہارے بس میں نہ تھا اگر تم ایسا نہ کرتے تو...... اور سنو! کبھی اپنی بیوی کو ٹوکنا نہیں۔ کبھی بھی نہیں۔ یہ راز ہے۔ اسے راز رہنے دینا۔ یہ اگر عیاں ہو گیا تو...... تو بھی بڑی تباہی آجائے گی۔"

"پھر وہی تباہی۔ تم پتا نہیں' کیا چاہتے ہو۔ اگر تباہیوں ہی کی نوید دینا تھی تو یہ قطعی

غیر ضروری تھا۔ میں پہلے ہی تباہیوں کو فیس کر رہا تھا۔" میں جھنجلا گیا۔ "اور سنو۔" میں ٹھٹک کر بولا۔ "یہ تم کس کی طاقت کا ذکر کر رہے ہو؟"

"تم مجھے اور سب کو آزاد کر دو۔ بس۔"

وہ اس بار میرے قدموں میں سر جھکا کر اور دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ میں پھر بوکھلا گیا۔

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔ تم سب آزاد ہو مگر مجھے یہ بتاؤ کہ میں کب عذابوں سے آزاد ہوں گا۔" میں نے کہا مگر اس نے میرا پورا جملہ سنا ہی نہیں۔ باہر کی طرف قلانچ بھری اور آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ میں "ارے' ارے" کہتا ہوا اس کے پیچھے لپکا مگر وہ باہر کی تاریکی میں غائب ہو چکا تھا۔ طیب میرے پیچھے ہی تھا اور اب ہونقوں کی طرح اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"دیکھا تم نے...... پتا نہیں' کیا فراڈ تھا۔ اب ہمیں بھگتنا پڑے گا۔" میں طیب پر برس پڑا۔ "نہیں ضیاء! مجھے اب بھی یقین ہے کہ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"کیا خاک ٹھیک ہو جائے گا۔" میں جھلایا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ سامنے انیتا کھڑی تھی۔ بالکل چاق و چوبند۔ مجھے حیرت ہوئی۔ وہ کہہ کر گئی تھی کہ اسے نیند آرہی ہے۔

"چلے گئے؟" اس نے ہمیں دیکھتے ہی پوچھا۔

"جی بھائی!" طیب نے جواب دیا۔

اس نے گہرا سانس لیا۔ آنکھیں پھیلا کر چاروں طرف اس طرح دیکھا جیسے وہ اس کمرے میں پہلی بار آئی ہو۔

"میرٹھ کب چلیں گے؟" اچانک انیتا نے میرے قریب بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"میرٹھ؟" میں حیران ہوا۔ "کیوں...... وہاں کیا ہے؟"

"بی جان وغیرہ۔" اس نے بڑی دل فریب مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر جواب دیا۔

"ہاں......! نہیں' وہ...... وہ لوگ تو شاید دہلی ہی میں ہوں گے۔" میں نے سرسری جواب دیا پھر طیب سے بولا۔ "تم کل سویرے ہی دہلی چلے جاؤ۔"

طیب نے سر ہلا دیا۔

"نہیں ضیاء! ہم ایک ساتھ جائیں گے۔ وہاں ہماری ضرورت ہے۔" اس نے انتہا

کر کہا۔

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ میرے خاندان سے ناواقف ہونے کے باوجود اس قدر اپنائیت اور بے تکلفی کا اظہار کیوں کر رہی ہے۔ بہرحال یہ اس کی خوبی ہی تھی ورنہ باہر کی عورتیں کب خاندانوں کو لفٹ کراتی ہیں۔ مجھے اس کے انداز سے اتنی ڈھارس ضرور ہوئی کہ وہ گھر والوں اور ہمارے درمیان پیدا ہو جانے والی خلا کو اپنے رویے سے بھر دے گی۔

طیب نے انیتا کی تائید کی۔ وہ چاہتا تھا کہ ہم سب ساتھ جائیں۔ ان دونوں کا کہنا تھا کہ حالات قابو میں آجائیں گے۔ طیب کا لہجہ تو ایسا کہتے ہوئے کچھ کھوکھلا بھی محسوس ہوا تھا مگر انیتا اتنے وثوق سے کہہ رہی تھی کہ میں بھی سوچنے پر مجبور ہو گیا پھر میں نے اسے تفصیل سے گھر والوں کے بارے میں بتایا۔ یہ بھی بتایا کہ میرا یوں شادی کرنا' خاندان والوں کے لئے بڑا سانحہ ہو گا کیوں کہ اب تک میرے بھائیوں کی بھی اتنی ہمت نہیں ہوئی تھی کہ خاندان کے بڑوں کو اعتماد میں لئے بغیر کوئی ایسا قدم اٹھائیں۔ میں نے پوری صفائی سے یہ بھی بتا دیا کہ اس شادی میں اور اس قدر عجلت میں شادی اکیلے کر لینے میں میری مرضی کا قطعی دخل نہیں تھا۔ یہ سن کر اس نے مجھ سے نہ کچھ پوچھا نہ میں نے بتانے کی کوشش کی۔ میرا خیال تھا کہ میری باتوں سے وہ دل گرفتہ ہو گی۔

"آپ فکر نہ کریں۔"

اس نے سر اٹھا کر مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا تو مجھے اس کا رویہ بہت اچھا لگا۔ اس میں سمجھوتا کرنے کی لچک تھی۔ وہ ہر قسم کے حالات کو بھگتنے کے لئے تیار تھی بلکہ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ وہ اپنے اسی رویے کی بنا پر ان سب کو بہت جلد منا لے گی۔

☆------------------☆------------------☆

ہم بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ میں نے اسے منے دادا سے لے کر عصمت آپا تک' سب کے بارے میں بتایا۔ ان کی طبیعتوں کے بارے میں بھی تفصیل سے بتایا۔ بی جان وغیرہ کے بارے میں بھی بتایا مگر فرحت کا ذکر خاص طور پر نہیں کیا' یونہی سرسری طور پر کہا کہ وہ میری واحد فرسٹ کزن ہے۔ زہرہ آپا کے بارے میں سن کر کہ وہ یہیں ہیں۔ اس نے پہلے ان سے ملاقات کی تجویز پیش کی جسے طیب نے فوراً منظور کر لیا بلکہ اس نے اسی وقت فون کر کے زہرہ آپا سے کہہ دیا کہ وہ میرے اور ایک مہمان کے ساتھ کل ان کے پاس آ رہا ہے۔ زہرہ آپا حسب عادت ہولا ہولا کر مہمان کے بارے میں پوچھتیں رہیں مگر وہ بھی پکا تھا' اس نے کہہ دیا کہ آپ کے لئے سرپرائز ہے مگر کل تک صبر کریں۔

میرا اندازہ تھا کہ زہرہ آپا خوش نہیں ہوں گی۔ انہیں سب سے پہلے یہ خیال آئے گا کہ پتا نہیں' کیسی لڑکی ہے' اماں کو دل کا دورہ پڑ جائے گا۔ منے دادا بیمار ہو جائیں گے۔ اصل میں وہ سب سے پہلے تصویر کا دوسرا رخ دیکھا کرتی تھیں۔ بات کا تاریک پہلو ان کے سامنے پہلے آتا تھا جس نے ان کی طبیعت کو ہولو قسم کا بنا دیا تھا۔ بہرحال آج میری طیب اور انیتا کی گفتگو سیر حال تھی۔ آج میں نے اسے اپنے گھر کا' اپنے خاندان کا ایک فرد سمجھ کر بات کی تھی جس کا بڑا مثبت رد عمل سامنے آیا تھا۔ اب میں مطمئن تھا اور ویسے بھی اگر مطمئن نہ بھی ہوتا تو بہرحال مجھے یہ ذکر تو طے کرنا ہی تھی۔

☆------------------☆------------------☆

اگلے روز ہم شام تک گھر پر رہے۔ دن معمول کے مطابق' سوری شاید میں غلط کہہ گیا' معمول سے ہٹ کر پُرسکون گزرا تھا۔ انیتا نے کل کی گفتگو کے بعد بڑا بستر اور خوش گوار دن گزارا۔ رات بھی اچھی گزری تھی حالانکہ مجھے ایک دوبار آکا باگیا کا خیال آیا تھا۔ مجھے یہ خیال بھی کئی بار آیا کہ انیتا نے اس سے متعلق کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ میں

نے بھی خود پر قابو رکھا' اس سے بات نہیں کی البتہ میں اور طیب صبح ناشتے کی ٹیبل پر اس کے بارے میں گفتگو کر چکے تھے۔

دوپہر میں سو گیا اور طیب گوپال کے پاس چلا گیا۔ انیتا گھر کی صفائی کروانے میں لگ گئی۔ ہم نے ڈرائنگ روم میں صبح بدبو محسوس کی تھی جو خون کی بدبو لگ رہی تھی۔ انیتا کا خیال تھا کہ رات کتے کے گوشت سے ٹپکنے والا خون فرش پر جم گیا ہو گا اس لئے بدبو ہے۔ آج وہ اس کی صفائی میں لگ گئی تھی۔ میں جی بھر کے سویا۔ شام کو اٹھا تو طیب آ چکا تھا۔ انیتا نہانے چلی گئی تھی۔ طیب نے بتایا کہ زہرہ آپا دوبارہ فون کر کے کہہ چکی ہیں کہ ہم جلدی آ جائیں۔ میں ہنس پڑا جانتا تھا کہ وہ آج سویرے سے کھانے پکانے اور صفائی کرنے میں لگی ہوں گی۔ فراغت ہوتے ہی ہمارا انتظار شروع کر دیا ہو گا اور یہ وقت ان سے کاٹے نہیں کٹ رہا ہو گا۔

"تم تیار ہو جاؤ یار! ورنہ اب گھر کے ہر فرد سے فون کروائیں گی وہ۔ ویسے ضیاء...... یہ گئی کس پر ہیں۔ عصمت تو بالکل مختلف ہے اور تمہاری اماں تو شاید کائنات کی سب سے پرسکون ہستی ہیں۔" طیب چڑ کر بولا۔

"یہ خالہ بی پر گئی ہیں۔"

"لو......! وہ تمہاری نانی کی بہن ہیں۔ ان سے کیا تعلق؟"

"خاندان کی ہیں۔ یہ طبیعت انہیں وراثت میں ملی ہے۔" میں نے کوٹ پہنتے ہوئے کہا۔

"پتا نہیں' طاہر بھائی کیسے گزارا کرتے ہیں؟" طیب نے منہ بنا کر کہا۔

اتنی دیر میں انیتا آ گئی۔ آج اس نے فیروزی رنگ کا پلین شلوار قمیض پہنا تھا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ جو ساڑھی اس نے کل باندھی تھی' اس سے تو مجھے وحشت ہونے لگتی اگر وہ وہی پہن لیتی تو...... ہم تینوں ناصر بھائی کی طرف چل پڑے۔ میں نے زہرہ آپا کے بارے میں اسے مختصراً بتا دیا تھا مبادا وہ دل گرفتہ ہو۔

وہاں پہنچ کر جب زہرہ آپا نے انیتا کو ہمارے ساتھ دیکھا تو ان کا رنگ اڑ گیا۔

"یہ...... یہ کون ہے؟ تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو۔ میرے سسرال والے کیا کہیں گے' یہاں آ کر بالکل بگڑ گئے ہو۔ لڑکیوں سے دوستیاں رکھتے ہو اور اتنی دیدہ دلیری سے اسے یہاں بھی لے آئے۔ طاہر تو میری جان کھا لیں گے۔"

وہ مجھے ایک طرف کھینچ کر جو بولنا شروع ہوئیں تو بلا وقفے کے بولتی چلی گئیں۔ طیب ان کی پشت پر کان لگائے سب سن کر دبے دبے انداز میں ہنس رہا تھا۔

انیتا شاید سمجھ رہی تھی کہ مجھے ڈانٹ پڑ رہی ہے۔ اس کے ہونٹوں کے کناروں پر مہین سی مسکراہٹ تھی اور وہ لاتعلقی ظاہر کرتے ہوئے کمرے کا جائزہ لے رہی تھی مگر کبھی کبھی کن انکھیوں سے ہماری طرف دیکھتی اور مسکرا کر پلٹ جاتی تھی۔

"آپ بول چکیں۔" زہرہ آپا کے جملوں میں وقفہ آتے ہی میں نے پوچھا۔

"تم آخر بمبئی میں ہو کیوں؟ یہاں رہے تو اور بگڑ جاؤ گے اور یہ طیب تو ہے ہی بگڑا ہوا نواب۔ تمہاری وجہ سے اب گھر کے لوگوں کو اس کے بگاڑ کا سبب بھی تم دکھائی دے رہے ہو۔ اماں الگ پریشان ہوں گی۔ سارے بیٹے انہیں چھوڑ بیٹھے ہیں۔"

آخری جملہ کہتے کہتے ان کی آنکھیں بھر آئیں۔ انہوں نے ناک سرکی اور دوپٹے کے پلو سے آنکھیں صاف کرنے لگیں۔

"بھائی جی! اللہ کے واسطے۔ ہمیں بھی کچھ بولنے دیں۔"

طیب ان کی پشت کی جانب سے سامنے آ گیا۔ اس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ میں سر کھجا رہا تھا۔ طیب نے ٹھیک کہا تھا کہ وہ سب کو پاگل کر دینے والی ہستی ہیں اور جانے طاہر بھائی کا گزارا کیسے ہوتا ہو گا۔

"تم......!" وہ ایسے چونکیں جیسے اسے پہلی بار دیکھا ہو۔ "تم کہاں سے آ گئے؟"

"میں ان دونوں کے ساتھ ہی آیا ہوں۔ آپ کو تو نظر ہی نہیں آیا ہوں گا۔ خیر......! اب جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں۔ آں...... آں بولنے کا کچھ نہیں۔" اس نے زہرہ آپا کو پھر اسٹارٹ لینے والی پوزیشن میں دیکھ کر تیزی سے کہا۔ "صرف سر کے اشارے سے امان دے دیں اور پھر پوری توجہ سے میری بات سن لیں۔"

"بھابی! آپ بیٹھیں۔" طیب نے انیتا کو اشارہ کیا مگر زہرہ آپا دھپ سے صوفے پر بیٹھ گئیں پھر محسوس کر کے کہ طیب نے انہیں نہیں انیتا کو مخاطب کیا ہے تو کچھ حیران ہوئیں۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے بھابی کہنے کا مطلب پوچھتیں' طیب جلدی سے بولا۔

"آپ میرے ساتھ آئیں۔" اب طیب نے ان کا ہاتھ تھام کر کھڑا کر دیا۔

انہوں نے جاتے جاتے مڑ کر ایک دو بار پھر انیتا کو حیرانی سے دیکھا' مجھے دیکھتے ہی ان کے چہرے کے تاثرات تیزی سے بدلے اور لگا جیسے ابھی رو دیں گی مگر رونے کا منظر

میں نہیں دیکھ سکا' اس لئے کہ طیب اس سے پہلے ہی انہیں اندر لے جاچکا تھا۔

"تم مائنڈ مت کرنا۔" میں نے جھینپ کر انیتا کی طرف دیکھا۔ "یہ تو ہونا ہی تھا۔"

"فکر نہ کریں۔ ایسے حالات میں اکثر ایسی چویشنز پیدا ہو جاتی ہیں۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا' میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔

ہم دونوں خاموشی سے باہر کان لگائے بیٹھے تھے میں جانتا تھا کہ طیب انہیں راضی کر رہا ہوگا۔ تفصیل بتا رہا ہوگا۔ وہ واحد ہستی تھیں جن کے بارے میں کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ان کا رد عمل کس بات پر کیا ہوگا مگر بات خوشی کی ہو یا غم اور دکھ کی۔ ان کا ہولانا ضروری تھا۔ کبھی وہ مارے خوشی کے ہولاتی تھیں اور کبھی مارے غم کے۔

بہت دیر تک اندر سے کوئی آواز نہ آئی۔ پتا نہیں' طاہر بھائی گھر پر تھے بھی کہ نہیں۔ ناصر چچا کی موجودگی کا بھی کوئی احساس نہیں تھا۔ اب مجھے کوفت ہونے لگی تھی۔ جی چاہ رہا تھا کہ اندر جا کر حالات کا جائزہ لوں مگر انیتا نے شاید میرا ارادہ بھانپ لیا۔

"سب ٹھیک ہے۔ بیٹھے رہیے۔"

اس نے بے ساختہ کہا' میں چونکا کہ وہ میرا ارادہ جیسے جان گئی مگر اس کی نگاہیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں' میرا خیال تھا کہ وہ اچھی قیافہ شناس بھی ہے۔

دوسرے ہی لمحے طیب اکیلا کمرے میں داخل ہوا۔

"کیا ہوا؟" میں نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔

"آدھا دریا میں سونت آیا ہوں۔ آدھا تم سونتو۔" وہ تھکے تھکے انداز میں صوفے پر بیٹھ گیا۔

"ہوا کیا' بتاؤ تو۔"

"شادی کا سنتے ہی پہلے تو مارے خوشی کے رو پڑیں پھر دکھ سے روئیں کہ اماں وغیرہ دور تھیں مگر میں تو یہیں تھی۔ ایمرجنسی میں مجھے بھی بھول گئے۔ پھر اپنے ارمان کا ماتم کیا۔ اب اماں وغیرہ کے ارمانوں کو خاک میں ملتا دیکھ کر رو رہی ہیں اور یہ دکھ بھی ہے کہ عصمت کا بیاہ ہونے تک انتظار کر لیتا تو کیا بگڑ جاتا۔"

"انیتا کے لئے کیا کہا؟"

"اتنا وقت کہاں ملا انہیں سوچنے کا۔ اب جاؤ۔ تمہارے حصے کے جوتے میں کھا آیا ہوں۔ تم صرف تسلی دے دینا۔"

اس کی باتیں سن کر انیتا مسکرا رہی تھی۔ "دلچسپ خاتون ہیں۔" وہ بولی۔

"دو دن کے لئے آپ لے جایئے۔ چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔" طیب نے جل کر جواب دیا۔

میں ہمت کر کے کھڑا ہو گیا۔ اندر گیا تو وہ کچن میں تھیں۔ بڑی تیزی سے برتن کپڑے سے صاف کر رہی تھیں۔ میں چپکے سے دروازے پر جا کر کھڑا ہوا۔ طیب نے کہا تھا کہ آدھا دریا تم سونتو مگر یہاں تو کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ بڑے جوش و خروش سے کھانے کے برتن اور چمچوں کو ترتیب سے رکھ رہی تھیں۔ چہرے پر خوشی تھی' مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اب تک سب کچھ بھول بھال گئی ہوں گی۔

"کیا پکایا ہے آپ نے؟" میں نے دھیرے سے کہا مگر وہ اچھل پڑیں۔

"آئے! ڈرا دیا مجھے۔" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔

"اتنا کیوں ڈرتی ہیں آپ؟ طاہر بھائی نہیں ہیں کیا؟" میں نے دوسرا جملہ پہلے جملے کا اثر زائل کرنے کے لئے بولا تھا۔

"ہیں تو سہی......... ذرا باہر گئے ہیں۔ اچھا تم یہاں کیوں آ گئے۔ جاؤ بیٹھو۔ میں شربت لے کر آتی ہوں۔"

میں نے موقع غنیمت جانا اور فوراً وہاں سے کھسک آیا۔ طیب کو آ کر سب بتایا تو وہ جل گیا۔

"یار! سب قسم کے عجوبے تمہارے ہی گھر میں پیدا ہوئے ہیں؟"

"نہیں! ایک ناصر چچا کے گھر میں بھی ہے۔" میں نے اس پر طنز کیا۔ انیتا ہنسنے لگی۔

اسی وقت شربت کی ٹرے اٹھائے زہرہ آپا اندر داخل ہوئیں۔ انیتا کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی ان کے تاثرات متغیر ہوئے تھے۔ میں ڈر گیا مگر پھر وہ شربت پیش کرنے لگیں۔ ذرا دیر بعد ہی وہ اس سے گھل مل کر باتیں کر رہی تھیں۔ نہ تو انہوں نے یہ پوچھا کہ آخر ایسی کیا ایمرجنسی تھی اور نہ یہ کہ انیتا ہے کون اور کہاں ملی؟ ایک معرکہ سر ہو چکا تھا۔ انیتا اس قدر بے تکلفی اور اپنائیت سے باتیں کر رہی تھی کہ انہیں ایک لمحے کو بھی اس کے بارے میں سوچنے کا موقع نہیں ملا۔ اب میرے دل کو کافی ڈھارس تھی۔ زہرہ آپا نے پُرتکلف دعوت کا انتظام کیا ہوا تھا اور میری پسندیدہ ڈشز بنائی تھیں۔

اچھا تو یہ ہوا کہ اس دوران میں نہ تو طاہر بھائی آئے' نہ ناصر چچا وغیرہ۔ زہرہ آپا بتا

چکی تھیں کہ ناصر چچا وغیرہ کل شام سے اپنے سسرال گئے ہوئے ہیں۔ غالباً کوئی تقریب وغیرہ تھی آج۔ طاہر بھائی رات کو زہرہ آپا کو لے کر جانے والے تھے۔ ہم دوپہر بھر وہیں رہے مگر شام سے پہلے لوٹ آئے۔ میں خود میں طاہر بھائی کا سامنا کرنے کی جرات نہیں پا رہا تھا۔ باؤلی زہرہ آپا تھیں' طاہر بھائی نہیں تھے۔ وہ تو خوب لتے لیتے اور ممکن ہے کہ انجا کو بھی ناپسند کرتے۔ بہرحال ہم ان کے آنے سے پہلے ہی چلے آئے۔ زہرہ آپا کو میں نے بتادیا تھا کہ ہم کل دہلی کے لئے روانہ ہو رہے ہیں۔ دہلی کے نام پر انہوں نے کئی آنسو نچھاور کر دیے۔ اماں کو لمبا چوڑا خط لکھا جو آدھے سے زیادہ انجا کی تعریف میں تھا۔ میں مطمئن ہو گیا۔ خط سے یہ پتا نہیں چل رہا تھا کہ اس شادی میں زہرہ آپا بھی نہیں تھیں۔ اور یہی بات میرے حق میں جا رہی تھی۔ میں بغیر کچھ کہے یہ ظاہر کر سکتا تھا کہ زہرہ آپا تھیں۔

اس رات ہم نے جانے کی تیاری کرلی۔ انجا پُرسکون تھی وہ زہرہ آپا سے کافی متاثر ہوئی تھی۔ اس کے بقول وہ بے حد معصوم تھیں اور یہ سچ بھی تھا مگر مجھے عصمت آپا کی فکر تھی۔ وہ اس قدر اکھڑ' منہ پھٹ اور سخت مزاج کی تھیں کہ کسی کا لحاظ کئے بغیر ہی جو منہ میں آتا تھا' کہہ جاتی تھیں۔ میں نے حفظ ماتقدم کے طور پر انجا کو اس کے بارے میں بتا کر درخواست کی تھی کہ وہ ناگوار باتوں کو سہہ لے۔ اس نے اس بار بھی مجھے تسلی دلائی تھی۔ طیب زہرہ آپا کو بتا آیا تھا کہ وہ میرے ساتھ ہے۔

☆===============☆===============☆

ایک دن اور رات کے طویل سفر کے بعد ہم لوگ دہلی پہنچ گئے۔ یہاں پہنچ کر مجھ پر گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ دل بیٹھنے لگا۔ طیب کو خود بھی گھبرایا ہوا تھا مگر مجھے پھر بھی تسلی دے رہا تھا۔

"کچھ نہیں ہوگا ضیاء! آپ یونہی گھبرا رہے ہیں۔" انجا نے کہا۔ زہرہ آپا بھی اتنی اچھی ہیں۔ آپ تو ان سے بھی گھبرا رہے تھے۔"

"ہاں یار.........! میں ہوں ناں۔ تم کیوں گھبراتے ہو۔"

طیب نے سینہ چوڑا کر کے کہا مگر جب ہم گھر کے دروازے پر پہنچے تو وہ سب سے پیچھے تھا۔

"اب کیا ہوا؟" انجا ہنسی۔

"نہیں! ہوا تو کچھ بھی نہیں۔ وہ عصمت کی عادتیں جنگلی بلی کی سی ہیں۔ وہ پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑ جاتی ہیں۔" وہ جھینپ کر بولا۔

"انہیں چھوڑو۔ تم اماں کی فکر کرو۔" میں نے ہمت کر کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے کہا۔ دروازہ طیب کے کچھ بولنے سے پہلے ہی کھل گیا۔ سامنے سپاٹ چہرہ لیے عصمت آپا کھڑی تھیں۔

"السلام علیکم!" میں نے اور انجا نے ایک ساتھ سلام کیا۔

انہوں نے وعلیکم السلام کہہ کر ایک سرسری نگاہ انجا پر ڈالی اور پلٹ گئیں پھر چونکیں' پلٹیں۔ میں نے دم سادھ لیا مگر وہ اس بار ہمیں نہیں' ہماری پشت پر کھڑے طیب کو دیکھ رہی تھیں۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"کون.........؟" طیب پلٹ کر گلی میں دیکھنے لگا۔

"ارے! تم۔" وہ تیز لہجے میں بولیں۔

"میں؟" اس نے سینے پر انگلی رکھ کر "میں" کو کھینچا۔ "اوہ! میں تو ان دونوں کو چھوڑنے آیا تھا۔"

"چھوڑ دیا؟ جاؤ۔"

"عصمت آپا!" میں نے ان کا موڈ بگڑتا دیکھ کر مداخلت کی۔

"اور تمہیں کیا کوئی ضروری کام یاد آگیا یا کوئی چیز بھول گئے تھے؟" انہوں نے طنزیہ انداز میں مجھ سے کہا۔ "اور آپ کو کس سے ملنا ہے؟" آخری جملہ عصمت آپا نے انجا کو مخاطب کر کے کہا تھا۔

"عصمت آپا! اندر آنے دیں گی؟" میں نے نرم لہجے میں کہا۔ انجا انہیں بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر نہ گھبراہٹ تھی نہ تردد۔ نہ ہی اس پر عصمت آپا کے لہجے نے کوئی اثر کیا تھا۔

عصمت آپا نے گھور کر مجھے دیکھا اس دوران میں طیب آسمان میں کچھ تلاش کرتا رہا۔ وہ کچھ دیر اسی طرح گھورتی رہیں پھر پلٹ کر اندر چلی گئیں۔

"کون ہے عصمت؟" اماں کی آواز اس کے کمرے سے آئی تھی۔

"آپ کے کھوئے ہوئے صاحب زادے آگئے ہیں۔" عصمت نے [illegible] سے

جواب دیا اور کچن میں چلی گئیں۔

"ارے کون ہے؟ ضیاء کہ رضا۔" اماں کی آواز میں بے چینی تھی۔ میرا دل بھر آیا۔ ایسی بے چینی کبھی کبھی ہی ان کے اندر پیدا ہوتی تھی۔ مجھے شدت سے احساس ہوا کہ وہ بھرے گھر میں رہنے والی' آج اپنے بچوں سے بھی جدا اور اکیلی تھیں۔ عصمت آپا کو تو تسلی دینا بھی نہیں آتی تھی۔ زہرہ آپا ہی تھیں جو ان کا دکھ برابر کا بانٹ لیا کرتی تھیں۔ گھر میں اور کسی کی موجودگی کے آثار نہیں تھے۔ میں نے انیتا کو وہیں رہنے کا اشارہ کیا اور لپک کر اندر داخل ہو گیا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی اماں کے زرد چہرے پر لمحہ بھر کو رونق پھیلی پھر انہوں نے منہ پھیر لیا۔

"اماں! ناراض ہیں؟" میں نے سلام کرنے کے بعد ان کے قریب بیٹھ کر ان کا ہاتھ تھام لیا۔ "آپ تو جانتی ہیں کہ میں کیوں گیا تھا؟"

"لیکن خط میں خیریت لکھنے سے تو کچھ نہ ہو جاتا۔" وہ ایک دم پھوٹ پڑیں۔ "ایک رضا ہی بے تعلقی کو کافی تھے۔ اتنے قریب رہتے ہوئے بھی انہیں گھر والوں کا خیال نہیں آتا۔ نہ کبھی بہن سے ملنے کی ہڑک ہوتی ہے' زہرہ نے لکھا تھا کہ وہیں سے انگلینڈ روانہ ہو گئے۔ فون کر کے فرض نبھا دیا اور بس۔ تم کہاں کی تیاری کر رہے ہو یا بڑے بھائی نے رضا کے بعد تمہیں بھی بلایا ہے؟"

وہ بولتی چلی گئیں۔ مجھے پہلی بار دونوں بھائیوں کی بے حسی کا احساس ہوا۔ رضا بھائی بمبئی میں تھے۔ نہ میرے پاس ایڈریس تھا' نہ زہرہ آپا کے پاس ورنہ میں تو ضرور جاتا۔ دہلی کے پتے پر تگی بندھی رقم بھیج کر وہ گویا تمام فرائض نبھا رہے تھے۔

"میں کہیں نہیں جا رہا اماں! اور اب کہیں بھی نہیں جاؤں گا۔"

"ہے سچ!" اماں سارے دکھ بھول گئیں۔

"جی اماں! اب میں یہیں رہوں گا لیکن اماں.........! آپ بڑے دل والی ہیں۔ آپ نے اولاد کی ہر خطا کو ہمیشہ معاف کیا ہے۔ میری غلطیوں کو بھی معاف کر دیں۔" میں نے ان کے گھٹنے پر سر رکھ دیا۔

"اچھا چھوڑو۔ یہ بتاؤ سب خیریت تو رہی ناں۔" وہ تشویش سے بولیں۔ شاید انہیں پچھلے عذاب یاد آ گئے تھے۔

"جی اماں! سب خیریت رہی اور اب مجھے یقین ہے کہ خیریت ہی رہے گی۔"

"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔"

"لیکن اماں.........! میں نے بہت بڑی قیمت چکائی ہے اس سکون کی۔"

"کیوں.........کیا ہوا؟" وہ ایک دم پریشان ہو گئیں۔ مگر ان کے اس موضوع نے آسانی پیدا کر دی۔ میں نے دھیرے دھیرے انہیں سب کچھ بتا دیا۔ انہیں اصل بات سے آگاہ کر کے ہی میں آنے والے طوفان کو روک سکتا تھا۔ میری میری باتیں سن کر ان کے چہرے پر ایک رنگ آتا رہا' ایک جاتا رہا۔ کبھی ان کی آنکھیں بھیگ جاتیں اور کبھی وہ سن بھی رہ جاتیں۔ میری شادی کر لینے والی بات سن کر تو وہ لمحہ بھر کو سکتے میں ہی رہ گئی تھیں۔

"اے میں اب بی جان کو کیا جواب دوں گی۔ ابھی جانے سے پہلے ہی تو میں نے ان سے فرحت کی بات کی تھی۔ وہ اس کے لئے بہت پریشان تھیں۔"

"بی جان وغیرہ کو جانے کیوں دیا آپ نے؟"

"بھئی! خالہ بی کہاں مانتی ہیں اور ہاں......... 'شادی کر کے بیوی کو کیا وہیں چھوڑ آئے؟"

"نہیں اماں! وہ ساتھ آئی ہے۔ میں نے ہی باہر روک دیا تھا کہ کہیں آپ........"

"بلاؤ۔ جوڑے تو آسمان پر لکھے جاتے ہیں۔ آدمی کے بس کی بات کہاں ہوتی ہے۔ جو سوچتا ہے' کب پورا ہوتا ہے۔"

اماں کا ردعمل متعجب اور لوگوں کا سا تھا جب کہ مجھے جذباتی رد عمل کی توقع تھی۔ کچھ ضرور لگی تھی مگر میرا یہ فیصلہ کہ انہیں سب کچھ سچ سچ بتا دینا چاہئے' ایک درست فیصلہ تھا۔ طیب اور انیتا باہر ہی تھے۔ عصمت آپا کی آوازیں نہیں آ رہی تھیں مگر برتن پٹخنے کی آواز برابر آ رہی تھی۔ عصمت آپا اکثر زبان کا کام برتنوں سے لیا کرتی تھیں' بالخصوص اس وقت جب کسی کو گالیاں دینے کو جی چاہے۔ میں باہر نکلا' انیتا کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ مسکرائی جیسے حالات اس کی توقع کے مطابق نکلے ہوں۔ اماں نے انیتا کو بڑے پیار سے قبول کیا۔ میں بتا چکا تھا کہ وہ اب دنیا میں اکیلی ہے اور اس کی ماں اور بہن ایک ساتھ مر چکی ہیں۔ اماں رحم دل تھیں۔ انہوں نے ہمارے سارے خدشات غلط ثابت کر دیئے۔ طیب اسے اپنا کارنامہ سمجھ رہا تھا۔ خوش تھا۔ عصمت آپا کو پتا چلا کہ انیتا میری

بیوی ہے تو انھوں نے چونک کر پہلے مجھے پھر انیتا کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ کچھ بولیں نہیں۔

ان کے ساتھ سب سے بڑا مسئلہ یہی تھا کہ ان کا چہرہ کسی تاثر کو منعکس نہیں کرتا تھا۔ کچھ پتا نہیں چلتا کہ انھیں اس خبر نے خوش کیا یا غم زدہ؟ بس اس کے بیٹھے رہ جانے کے انداز نے احساس دلایا کہ ان کے تاثرات زہرہ آپا سے مختلف نہیں۔ صرف طریقہ اظہار محبت مختلف ہے۔ انیتا نے زہرہ آپا ہی کی طرح عصمت آپا سے بھی بے تکلفی سے گفتگو کرنا چاہی تو وہ چپ چاپ اٹھ کر چلی گئیں۔ انیتا نے مائنڈ نہیں کیا۔ چند ہی لمحوں بعد وہ اماں کی ٹانگیں دبا رہی تھی۔

گھر کا ماحول بالکل بدل چکا تھا۔ اماں خوش تھیں۔ انیتا گھر بھر میں گھومتی اور ہنستی پھر رہی تھی۔ طیب اور میں خوش تھے حالانکہ حیرت ہمیں سنجیدہ رہنے پر اکسا رہی تھی۔ منے دادا اور منی دادی قرول باغ کسی سے ملنے گئے ہوئے تھے۔ اماں نے بتایا کہ شام تک لوٹ آئیں گے۔ یہاں کے ماحول اور اماں کے رویے نے مجھے بالکل ہلکا پھلکا کر دیا تھا۔ عصمت آپا کا رویہ تو سب کے ساتھ ہی ایسا تھا۔ وہ معمول کی بات تھی اس لئے میں بوجھل نہیں ہوا۔ طیب کو وہ زیادہ گھور گھور کر دیکھ رہی تھیں۔ اماں نے فوراً ہی کھانے پینے کا بندوبست کر لیا۔ وہ اور عصمت آپا کچن میں لگ گئیں۔ انیتا نے بھی ہاتھ بٹانا چاہا تو عصمت آپا نے منع کر دیا اور بولیں۔

"ہم اپنے کام خود کرنے کے عادی ہیں۔"

"یہ عادت میری بھی ہے۔" انیتا نے ان کے سرد رویے کو نظر انداز کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"حال ہی میں ڈالی ہو گی یہ عادت۔" انھوں نے سالن بھونتے ہوئے طنزیہ انداز میں جواب دیا۔

"عصمت! میرے لئے کھیر ضرور بنایئے گا۔" طیب جو ان سے ایسی ہی حرکتوں کی توقع باندھے وہیں کھڑا تھا' بول اٹھا۔

"ارے ہاں! وہ تو بنے گی۔ بھلا اتنی بڑی خوشی ہو گھر میں اور وہ بھی چپ جپاتے۔" اماں نے لہک کر کہا۔

"کون سی خوشی؟" عصمت آپا نے تیز لہجے میں پوچھا۔

"عصمت! تو زبان بند رکھ۔ یہ چھٹانک بھر کی زبان ہی فساد کی جڑ ہے۔" اماں کو
ـــہ آگیا "بھائی' بیوی لایا ہے' یہ خوشی کی بات نہیں۔"

"ہاں! ایسے لایا ہے جیسے آٹے کی تھیلی بازار سے لایا ہو۔"

میں نے گھبرا کر انیتا کی طرف دیکھا جو اماں سے مٹر کی پھلیوں کی ٹوکری لئے صحن
ـں بچھے تخت پر بیٹھ رہی تھی۔ اس نے یقیناً سن لیا ہو گا مگر اس کے چہرے سے لگ رہا تھا
ـے اس نے کچھ سنا ہی نہیں۔

"چپ رہ کم بخت!" اماں نے دانت کچکچائے۔ "اخلاق پیدا کر خود میں۔ اخلاق سے
ـہ کر کوئی خوبی نہیں۔"

"ہاں عصمت آپا! ایک سچ کی بات بتاؤں؟" طیب جلدی سے بول اٹھا۔ غالباً اسے
ـہو گا کہ عصمت کا جواب اب اور زیادہ کڑوا بھی ہو سکتا ہے۔

"تم ساری سچ کی باتیں اپنے پاس رکھو۔ میں منے دادا کا انتظار کر رہی ہوں۔ یہ
ـاری کارستانی تمہاری ہی ہو گی۔ بمبئی کی آب و ہوا خراب ہے۔"

"میں بھی ان کا انتظار کر رہا ہوں اور بمبئی کی آب و ہوا انسانیت اور کردار کی
ـونما میں معاون ہوتی ہے۔"

"میں نے بمبئی کے بہت سے انسان دیکھے ہیں۔ جو وہاں جا کر پڑ جائے' اس کے
ـدار کی جڑیں بھی کھوکھلی ہو جاتی ہیں۔" وہ برابر جواب دیئے گئیں۔

"اچھا! چپ رہ فلسفی! کام کر اپنا۔" اماں نے اس بار انھیں نوچ ہی لیا۔

"اسے چپ کرائیں۔" وہ بلبلا اٹھیں۔ "اپنے گھر میں رہنے کی عادت نہیں ہے
ـے؟ دوسروں کو پریشان کرنے پہنچ جاتا ہے۔"

اب بات میری برداشت سے باہر ہو گئی تھی۔ میں بھناتا ہوا کچن میں پہنچا۔
ـصمت آپا! آپ کی بات مذاق کی حدود سے نکل چکی ہے اگر آپ کو میرے اور انیتا کے
ـنے سے تکلیف پہنچی ہے تو.........."

وہ چپ رہیں مگر اماں بلک اٹھیں۔ "ارے! بکنے دے اسے۔ سارا دن اس پتھر کے
ـغز سر بھوڑتی ہوں۔ اس پر کسی بات کا اثر نہیں ہو گا۔ گھر بھر میں اکیلی چکراتی پھرتی
ـے پتھروں کی دیواروں سے محبت ہے اسے۔ انسانوں کی چہل پہل کھلتی ہے۔ بھرا گھر
ـنا ہونے کی سب سے زیادہ خوشی اسی کو ہے۔ مجال ہے جو کبھی کسی بہن یا بھائی کو یاد

کرکے دو آنسو بہالے۔ ہم بوڑھوں کو بھی یوں برداشت کرتی ہے کہ کونوں میں پڑے چھتوں کو تکتے رہتے ہیں۔ دو گھڑی پاس بیٹھ کر جو باتیں کرلے۔"

"ارے اماں! آپ کیوں رونے لگیں؟"

انیتا اٹھ کر کچن میں چلی آئی۔ عصمت آپا ویسے ہی سالن بھوننے لگی تھیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ "عصمت آپا بھی کیا کریں! رونق کے پسند نہیں ہوتی۔ اماں مگر جب گھر میں رہنے والے گھر کو چھوڑ گئے' پلٹ کر نہ آئے تو عصمت آپا کیا کرتیں۔ تنہائی' اکیلا پن' کڑواہٹ نہیں بھرے گا تو اور کیا ہوگا۔" پھر وہ مجھ سے بولی۔ "چلیے! آپ کہاں میدان میں اتر آئے؟ کوئی معرکہ تھوڑی ہو رہا ہے۔ طیب اور عصمت آپا باتیں کر رہے ہیں' کرنے دیں۔ چلیں اماں!" اس نے اماں کا بازو تھام لیا۔ "میں عصمت آپا کا ہاتھ بٹاتی ہوں۔ آپ آرام کریں۔" وہ اماں کو لے کر تخت پر جا بیٹھی۔ میں بھی وہیں آگیا۔ طیب بھی ماحول میں تناؤ کے خوف سے تولیہ لے کر نہانے چلا گیا۔ انیتا سر اٹھا کر دوبارہ کچن میں پہنچ گئی۔ ذرا دیر بعد عصمت آپا پیر پٹختی ہوئی باہر نکلیں اور اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

"اے ہلو بھی! یہ تو بڑی منحوس ہے۔ میں کرتی ہوں۔" اماں فوراً اٹھ کر کچن میں پہنچیں مگر انیتا نے زبردستی انہیں بٹھا دیا اور کہا کہ وہ صرف یہ بتادیں کہ کیا کیا بنے گا۔ اماں ضد کرتی رہیں مگر انیتا نے صاف طور پر کہہ دیا کہ وہ کوئی کام انہیں نہیں کرنے دے گی۔ یہ جھگڑا بڑھتا نہیں' میں نے اور طیب نے اماں کو بٹھا دیا ورنہ اماں مسلسل بڑبڑا رہی تھیں۔ عصمت آپا پھر پلٹ کر نہ آئیں۔ انیتا نے ہنستے ہنستے باتیں کرتے سارا کام کرلیا۔ مجھے بہت خوشی ہوئی اور یہ احساس بھی ہوا کہ میں نے قدم اٹھایا ہے یا جو کچھ ہو چکا ہے' وہ اتنا غلط نہیں ہوا جتنا میں سمجھ رہا ہوں۔ صرف گھنٹا بھر کے بعد ہی جب انیتا نے کھانا تیار ہو جانے کا اعلان کیا تو اماں بھونچکی رہ گئیں۔ "اے اتنی جلدی؟ بوا! پکا؟ آٹا بھی ہے نہیں کہ بس مروت میں کھڑی ہو گئیں؟"

طیب ان کی بات پر ہنس پڑا۔ ان کا انداز ہی ایسا تھا۔ انیتا بھی ہنسی۔ "کھا کر دیکھئے گا۔"

اور پھر جب کھانا دسترخوان پر لگا تو سب ہی حیران ہو گئے۔ کئی طرح کی چیزیں تیار تھیں۔ اس خوبی کا مجھے ابھی ابھی پتا چلا تھا۔ طیب اور اماں مزے لے لے کر کھا رہے تھے اور میرے دماغ میں عجیب کھد بد ہو رہی تھی۔ ایک گھنٹے کے اندر کئی چیزیں بنا لینا میری

سمجھ سے باہر تھا۔ اس بات کو شاید طیب نے بھی محسوس کرلیا تھا۔ وہ کھاتے کھاتے چونک کر بولا۔

"بھابی! ذائقہ تو خیر' کسی کے ہاتھ میں آ ہی جاتا ہے مگر آپ کے ہاتھوں میں کوئی مشین فٹ ہے کیا؟"

"اے ہاں دلہن! یہ سب اتنی جلدی کیسے بن گیا؟" اماں نے بھی حیرت سے پوچھا۔

"جلدی کہاں اماں! آپ کو بیٹے سے باتیں کرنے میں وقت کا اندازہ نہیں ہوا۔" اس کا انداز ٹالنے والا تھا۔

بہرحال انیتا نے لمحوں میں اماں کو ہاتھ میں لے لیا۔ عصمت آپا جانے کہاں جا چکی تھیں؟ مجھے فکر تھی کہ انہوں نے کھانا بھی نہیں کھایا مگر اماں نے کہہ دیا۔ "لو! وہ بوا بھوکی نہیں رہ سکتیں۔ کہیں نہ کہیں سے کچھ نہ کچھ کرکے پیٹ بھر لیتی ہیں۔ تم نہ لاؤ۔"

پھر وہ زہرہ آپا کی خیریت پوچھتی رہیں۔ انیتا سے اس کے خاندان کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ جانے اس نے کیا بتایا' مجھے پتا نہیں چل سکا کیونکہ میں تھکن محسوس کر رہا تھا۔ لیٹنے کو چلا گیا۔ اپنے کمرے میں جانے کے لئے مجھے عصمت آپا کے کمرے کے سامنے سے گزرنا پڑتا تھا۔ وہاں پہنچ کر خیال آیا کہ عصمت آپا سے بات کرلوں۔ یہ بھی ٹھیک تھا کہ ان سے کبھی کسی نے بے تکلفی اور محبت سے بات ہی نہیں کی تھی۔ وہ بچپن سے اکھڑی سی تھیں۔ منہ پھٹ تھیں۔ ان کی اسی عادت کی وجہ سے سب ان سے کتراتے رہتے تھے۔ کسی نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ کمی کیوں پیدا ہوئی؟ اماں تو انہیں پیدا کرکے بھول گئی تھیں۔ تحسین خالہ یعنی فرحت کی امی بیبیں تھیں۔ انہوں نے عصمت آپا کا خیال رکھا۔ وہ ان سے بہت محبت کرتی تھیں۔ ان کی موت کے بعد گھر کا ہر فرد ان سے الجھتا ہی رہا کہ بدتمیز ہے۔ ان کا پرابلم محبت سے محرومی تھی جو تحسین خالہ کے بعد اور گہری ہو گئی۔ پتا نہیں' اتنے برس گزرنے کے بعد آج مجھے ان باتوں کا خیال کیوں آیا تھا؟ مجھے عصمت آپا پر ترس آیا میں نے دھیرے سے ان کے کمرے کے بند دروازے کو دھکیلا۔ وہ کھلتا چلا گیا۔ عصمت آپا نیم تاریکی میں آنکھوں پر بازو رکھے لیٹی تھیں۔ میں ان کے قریب بلا آہٹ پہنچ گیا۔

"عصمت آپا!" میں نے ان کے قریب بیٹھ کر دھیرے سے انہیں پکارا۔

وہ چونک اٹھیں۔ بازو ہٹا تو ان کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ آنکھیں سرخ

ہو رہی تھیں "تم.........!!"

"آپ......... آپ رو رہی ہیں! کیوں؟ کیوں عصمت آپا؟"

"کس ناتے سوال پوچھ رہے ہو؟" انہوں نے اپنے روایتی انداز میں پوچھا۔

"بھائی ہونے کے ناتے۔" میں کچھ شرمندہ ہوگیا۔

"کیا ہمارے درمیان ناتا برقرار ہے؟ کبھی برقرار بھی رہا تھا؟" ان کی آواز لرز گئی۔

"عصمت آپا! مجھے اپنی کوتاہیوں کا احساس ہے مگر حالات آپ کے سامنے ہیں۔"

"جہاں سیلاب سے گھربار بہہ جاتے ہیں' زندہ بچے موجوں کے زیرو بم میں گم ہو جاتے ہیں۔ جہاں طوفان سب کچھ اجاڑ کر چلا جاتا ہے۔ جہاں زلزلوں سے اونچی اونچی عمارتیں گر جاتی ہیں۔ لوگ دب کر مرجاتے ہیں' وہاں بھی رشتے ناتے نہیں مرتے ضیاء! بچے کھچے رشتے ایک دوسرے کے غم بانٹنے کو اور قریب آجاتے ہیں۔ تمہارے اوپر کون سے طوفان گزرے؟ اماں کو غم ملے تو کیا حواس ختم ہوگئے تھے؟ نہیں! سب کچھ دنیا کا دیا موجود ہے مگر مجھ سے ہر ایک کا ناتا ٹوٹ چکا ہے اور ناتا کوئی تھا ہی کب؟ پہلے روز سے نہیں میں اجنبی رہی۔ کسی کو یہ خیال بھی نہیں آیا کہ باپ میرا بھی تھا۔ دادا میرا بھی تھا جو جدا ہوا۔ تحسین خالہ سے رشتہ جڑا تھا جو ٹوٹا تو میں زیادہ زخمی ہوئی کہ بالکل اکیلی رہ گئی۔ زہرہ آپا بیاہی گئیں تو دنیا سے لپٹ کر رو ئیں۔ میرا خیال انہیں بھی نہ آیا۔ بھائی گئے تو خیریت کی چٹھی بھیجتے ہوئے ایک جملہ لکھنے میں بھی بخل سے کام لیا یا شاید میں یاد ہی نہ رہی۔ ان دیواروں سے ناتا ہے سو نبھا رہی ہوں۔ میرا غم اور خوشی......... ہاں! شاید کوئی خوشی بھی ہو جسے تم لوگوں نے ان دیواروں ہی کی طرح دیکھا پھر مجھ سے کیوں توقعات باندھتے ہو؟ تم لوگوں کے ساتھ مل کر جینا چاہا تو اکیلا کردیا سب نے اور جب......... اکیلے رہنے کی عادت ڈال لی تو میری لاتعلقی کھلتی ہے۔ کیوں؟ کیوں چاہتے ہو کہ تم لوگوں کی خوشی میں خوش ہوں؟ تمہارے غم پر رو پڑوں۔ پریشانیوں میں تسلی دوں یا جاگتی رہوں۔ کیوں؟ کیوں کروں میں ایسا؟ کیوں کروں؟"

میں دم سادھے سن رہا تھا۔ وہ رو رہی تھیں مگر آواز پر پورا قابو تھا۔ آنسو اختیار سے باہر تھے مگر لہجہ دسترس میں رہا۔ وہی تند و تیز لہجہ' وہی تلخی' وہ کڑواہٹ' وہی کسیلے جملے اور زہر میں بجھے سوال۔ مجھے پتا نہیں چلا کہ کب آنکھوں کے کنارے بھیگے اور کب حلق میں نمک گھل گیا۔

"عصمت آپا!" میں بولا تو آواز اجنبی لگی۔ لہجہ ٹوٹا پھوٹا تھا۔

"جاؤ ضیاء! اماں بہت خوش ہیں۔ ان کا بیٹا آیا ہے۔ بیوی کو ساتھ لایا ہے۔ بیوی خوش ہے کہ ساس نے قبول کرلیا۔ تم خوش ہو کہ معرکہ سر ہوگیا۔ منے دادا مطمئن ہو جائیں گے۔ طیب......... طیب کو تو شاید زندگی کا طریقہ زندگی کا ادراک ہی نہیں۔ وہ بھی اکیلا محسوس ہوتا ہے مگر اسے آگہی نہیں۔ سب سے دور۔ یہاں وہاں رونقیں تلاش کرنا اس کے لئے آسان ہے کہ وہ مرد ہے۔ شاید اسی بھاگ دوڑ نے آگہی کا در بند کر رکھا ہے۔ میری طرح دیواروں کے بیچ مقید ہوتا تو اب تک یہ دیواریں گرا چکا ہوتا۔"

"عصمت آپا پلیز! جھلنی ہوگیا ہوں میں۔" میں آنسوؤں کو آنکھوں میں نہ روک پانے کی ہر کوشش کر چکا تھا۔ حلق کا نمکین ذائقہ کسیلا ہو کر اب کڑواہٹ میں تبدیل ہونے لگا تھا۔

"کیوں؟ صرف سن کر چھلنی ہوگئے۔ جو میں نے بھگتا تھا' وہ محسوس نہیں کیا تم نے؟ کیا کیا سہہ چکی ہوں۔ سوچا بھی نہیں کیا تم نے؟" وہ ایک دم اکھڑ گئیں۔

میں نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ میں نے پہلی بار عصمت آپا کو غور سے دیکھا تھا۔ ان کی باتیں پہلی بار سنی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں محرومیوں کے جنگل آج پہلی بار دیکھے تھے۔ میں نے کہا۔ "عصمت آپا! خدا کے واسطے بولتی رہیے۔ بولتی رہیے عصمت آپا! میں آپ کو روک نہیں رہا۔ اب میں کبھی آپ کو نہیں روکوں گا۔"

"درگزر کرنے اور نظر انداز کرنے میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے ضیاء! میری عادتوں' میری تلخیوں کو درگزر کرنے کی بجائے تم سب نے نظر انداز کرنا شروع کردیا تھا مجھے۔ معیار میں قید کر کے۔ میرے سائے کو باہر بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیا۔ میں تو خود اپنے آپ سے بھی کبھی نہیں مل پائی۔ جانتے ہو' کسی کو' خود اس سے جدا کرنا کتنا بڑا جرم ہے۔ بڑا گناہ کبیرہ ہے۔ کیسا خوفناک عمل ہے۔"

"عصمت آپا! مجھے اپنے جرم کا احساس ہے۔"

"وہ......... تمہاری معصوم سی' سیدھی سادی اماں! سادگی ہی سے غضب ڈھا دیتی ہیں۔ کل کہہ رہی تھیں۔ اسے عطیہ بے اولادی کے غم سہہ سہہ کر مرگئی۔ وہ گھر چمن یہاں کہاں سے آگئی؟ اللہ بھی نرالے کام کرتا ہے۔" انہوں نے اماں کے انداز میں کہا۔

"لو! اور جو کبھی کوئی یہ کہہ دیتا تو کفر کا فتویٰ دینے والی اماں ہی ہوتیں۔ یوں تو کچھ

بھی ہو جائے' یہ کہتے نہیں تھکتیں کہ اللہ کے سب کام نرالے ہوتے ہیں۔ بندہ تو اس کی حکمت کی گرد کو بھی نہیں پا سکتا۔ یہاں سارے نظریے' سارے اعتقاد خاک میں مل جاتے ہیں۔ میں عطیہ کے گھر پیدا ہو جاتی جو باپ کی ناک کٹا کر چچیرے کے ساتھ بھاگ گئی تھی پھر وہ چچیرا بھی دو سال میں ہی اسے چھوڑ کر بھاگ گیا۔ بے اولادی کا تو اسے بہانہ مل گیا ہو گا۔ خمیر تو محلّہ ملانا کا تھا۔ ایسی بے باکی کے ساتھ بھرے گھر میں گزارہ کیسے ہو گا لیکن......... اماں کو تو میرا وجود کھٹکتا ہے۔ ان کے ہاں پیدا نہ ہوتی کہ چمارن کے گھر پیدا ہو جاتی۔ ان کا خمیر تو کبھی بھی نہ کھٹکتا نا!"

"اے! کیوں اول فول بکتی ہے بچی! میری جان! میری گڑیا!"

اماں نے آ کر مجھے ہی نہیں' عصمت آپا کو بھی اچھل جانے پر مجبور کر دیا۔ وہ جانے کب سے وہاں کھڑی سن رہی تھیں۔ دوڑ کے لپٹ گئیں عصمت آپا سے۔ ان کے پیچھے انیتا اور طیب بھی تھے۔ اماں کی آنکھوں میں جھڑی پہلی بار دیکھی تھی۔ اور انیتا اور طیب کی آنکھوں میں بھی نمی تھی۔ میں بے اختیار عورتوں کی طرح رو پڑا۔ عصمت آپا سپاٹ' سرد دیوار کی طرح تنی کی تنی رہ گئیں۔ سارے جذبے جو چہرے پر بکھرے تھے' سمٹ سمٹا کر آنکھوں کے کونوں میں کہیں دبک گئے تھے۔

اماں چٹا چٹ ان کے چہرے پر پیار کر رہی تھیں اور عصمت آپا ان کی پشت پر انیتا اور طیب کو دیکھ رہی تھیں۔ میں عصمت آپا کی خاموشی برداشت نہیں کر سکا تو ان سے لپٹ گیا۔ اب اماں اور میں دونوں انہیں بانہوں میں بھرے ہوئے تھے۔

"عصمت آپا! بتائیں نا اپنے دکھ۔ اماں کو بھی بتائیں۔ ان سب کو بتائیں۔ یہ غم بانٹنے ہی تو آئے ہیں۔ چپ کیوں ہو گئیں؟ بولیں نا!"

پھر اچانک انہوں نے سر اٹھا کر چھت کو دیکھا اور ان کی دل خراش چیخیں گونجیں تو ہم سب کی آوازیں اس میں دب گئیں۔ غموں کا ریلا تھا کہ بپھرا ہوا طوفان! میں نے پتھر کو انسان میں تبدیل ہوتے ہوئے دیکھا۔ بڑا اذیت ناک عمل تھا۔ اس سے زیادہ اذیت ناک عمل تو انسان کا پتھر بنتا ہوتا ہو گا مگر وہ دکھ' وہ اذیت عصمت آپا نے اکیلے جھیل لی تھی۔ انیتا اور طیب بھی پاس چلے آئے۔ طیب اور اماں نے انہیں چپ کرانے کی کوشش کی مگر میں نے انہیں ایسا کرنے کو منع کر دیا۔

"رونے دو انہیں۔ رونے دیں اماں!"

انیتا کچھ دور دیوار سے ٹک کر دونوں ہاتھ سینے پر باندھے کھڑی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر آسودہ سی مسکراہٹ تھی۔ چہرے پر اطمینان تھا۔ یہ جلتے دہکتے لمحے گھر کے اندر حرارت دوڑا گئے۔ عصمت آپا کی آنکھ سے سارے سمندر بہہ گئے۔ تھکن نے چیخوں کا دم گھونٹ دیا۔ جسم بے جان ہو کر بستر پر گر پڑا۔ اماں کے زانوں پر سر رکھ کر سب کی موجودگی میں گہری نیند سوئیں تو میں انیتا اور طیب کو لے کر باہر چلا آیا۔ اماں کی آنکھوں کے سوتے خشک نہیں ہوئے تھے جانے کتنے لمحوں کی بے حسی یاد آئی ہو گی۔ جانے کون سے گناہ سرزد ہوئے ہوں گے۔ کون کون سے ظلم سینہ زخمی کر رہے ہوں گے۔ انہیں تو بہت زخمی ہونا تھا اور ہر زخم آنسو بن کر رستا ہے سو انہیں بھی رونا چاہیے تھا۔ شام تک اماں وہیں رہیں۔ باہر آئیں تو شاید آدھا بوجھ ڈھو آئی تھیں۔ باقی بوجھ انہیں اب سے لے کر آخری نیند تک ڈھونا تھا۔ ہم ہر ظلم کرتے ہوئے ان کی تعداد بھول جاتے ہیں اور جب حساب چکانا ہو تو راتوں کی نیندیں بھی تو اڑتی ہی ہیں کہ سود بڑھ چکا ہوتا ہے۔

☆--------------------☆--------------------☆

رات کو منے دادا اور منی دادی آ گئیں۔ مجھے دیکھ کر منے دادا چونکے۔ انیتا کو دیکھ کر سکتے میں رہ گئے۔ ان کا رد عمل وہ نہیں تھا جس کی مجھے توقع تھی۔ میں نے کچھ نہیں جتایا۔ اماں نے لمحہ ضائع کئے بغیر سب کو سنایا۔ وہ خاموش رہ گئے۔ مجھے لگا' خوش نہیں ہیں۔ انیتا حسب سابق جلدی ہی منی دادی سے بے تکلف ہو گئی مگر منے دادا نے اسے نظر انداز کر دیا۔ منی دادی نے پہلے تو ناراضگی کا اظہار کیا مگر جلد ہی انیتا نے انہیں بھی اپنا گرویدہ بنا لیا۔

رات کے کھانے کے بعد میں سیدھا منے دادا کے کمرے میں پہنچ گیا۔ وجہ سب سے بڑی تو یہ تھی کہ انہوں نے سب کے ساتھ کھانا نہیں کھایا تھا بلکہ اپنے کمرے میں ہی منگوا لیا تھا۔ دوسرے میں آکا باگیا کی بات کی تصدیق چاہتا تھا کہ اس نے کہا تھا اپنے جد کو روکو۔ وہ بے وقوفیاں کر رہا ہے۔ میں انیتا سے ان کا رویہ بھی نوٹ کر چکا تھا۔ صبح سے ماحول میں تناؤ اور خوشگواری کی جو کھینچا تانی چل رہی تھی' وہ بڑی اعصاب شکن تھی۔ اب میں اطمینان چاہتا تھا اور مجھے توقع بھی تھی مگر منے دادا کی وجہ سے تقریباً سبھی اپ سیٹ ہو گئے تھے۔ اماں نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ ٹھیک نہیں ہیں۔ انیتا بڑی کھوجتی ہوئی نگاہوں سے انہیں دیکھتی رہی تھی۔ عصمت آپا اٹھ گئی تھیں مگر خاموش تھیں البتہ ان

کے چہرے کے خدوخال میں کرختگی نہیں' نرمی تھی۔ یہ خوش آئند بات تھی۔

"کیا کر بیٹھے ہو تم؟" میرے اندر داخل ہوتے ہی منے دادا نے روکھے انداز میں پوچھا۔

"منے دادا! یہ سب کچھ میں نے نہیں کیا۔" میں ان کے قریب جا بیٹھا۔

"کیا مطلب؟" ان کی تیوریوں میں بل پڑ گئے۔

تب میں نے سارا معاملہ کہہ سنایا۔ وہ خاموشی سے سنتے رہے۔ میں نے محسوس کیا کہ آکا باگیا کے نام پر اور اس کے ذکر پر منے دادا نہ صرف یہ کہ چونکے تھے بلکہ ان کے چہرے پر ناگوار تاثرات بھی پھیل گئے تھے۔ ساری بات سن کر انہوں نے مجھے یوں دیکھا جیسے میرے بتائے ہوئے واقعات پر انہیں شک ہو۔ میں نے جھوٹ بولا ہو یا غلط سمجھا ہو لیکن میری بات مکمل ہونے تک وہ قطعی خاموش رہے۔

"آکا باگیا کے کہنے پر تم نے اتنا بڑا قدم اٹھالیا۔" انہوں نے میری بات ختم ہونے پر سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔

"میری حالت اس شخص کی سی ہے منے دادا! جو اندھیرے میں ہاتھ پاؤں چلاتا ہے۔ عصمت آپا والے واقعے کے بعد میں بہت خوفزدہ ہوں۔ میں امی' آپ کو یا اماں وغیرہ کو قطعی نہیں کھونا چاہتا۔ میں ان مکڑیوں کا وجود مٹا دینا چاہتا ہوں جو اب آپ میں سے کسی کی طرف بھی بڑھنا چاہیں۔"

"تمہارے خیال میں اس شادی سے سب کچھ ختم ہو جائے گا؟ تم نے شادی انیتا سے کی ہے' زیوسا سے نہیں۔"

"جی!"

"آکا باگیا کی باتوں سے تو یہ تاثر ملتا ہے جیسے اس نے تمہیں زیوسا سے شادی پر مجبور کیا ہے۔ انیتا کا آخر ان واقعات سے کیا کنٹرول ہے جو اس سے شادی تمہیں عذابوں سے بچاؤ کا طریقہ لگ رہی ہے۔ ضیاء! مجھے ڈر ہے کہ تم آکا باگیا کے ہاتھ میں کھلونا بن گئے ہو۔ تم تو بہت سمجھدار آدمی ہو۔ مجھے تم سے کسی بھی بے وقوفی کی توقع نہیں تھی۔ تم نے یہ نہیں سوچا کہ وہ اس شادی پر مصر کیوں تھا۔ شادی کے بعد خوش کیوں ہوا اور اگر یہ سب کچھ اس نے کسی بھی اعتبار سے تمہارے لئے بہتر کیا تھا تو وہ تم سے اپنی آزادی کا طلبگار کیوں ہوا؟ اگر وہ کسی کی قید میں تھا تو کیا وہ تم تھے یا تم ذمے دار تھے؟ قید سے

آزادی تو وہی دلا سکتا ہے نا جس نے اسے قید کیا ہو تم نے تو بقول تمہارے' اس شکل کے بوڑھے کو خواب میں دیکھا تھا۔ وہ صدیوں سے آزادی کا خواہش مند تھا۔ کیا تم جانتے ہو کہ وہ کس کی قید میں تھا؟"

میں حیرت سے منے دادا کی باتیں سن رہا تھا۔ ان کے منہ سے نکلا ہر حرف سچا تھا۔ بہت وزن تھا ان کی بات میں۔ میں نے یہ سب پوری طرح سوچا ہی کب تھا۔ کبھی کبھی جو سوال میرے دماغ میں آتے اور جاتے رہے' وہ یہی سب سوال تھے مگر میں نے ان پر توجہ ہی نہ دی تھی۔ ان سوالوں کا جواب حاصل کرنے کی تگ و دو کرتا تو شاید سب کچھ پالیتا۔

"سب سے اہم بات!" منے دادا نے کھنکار کر مجھے اپنی جانب متوجہ کیا۔ "سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس نے تم سے کہا کہ اسے......... اور سب کو آزاد کردو۔ کون سب؟ تم نے جاننے کی کوشش کی تھی؟ اس نے رابرٹ' پپاس' سورن سنگھ اور جینو پاپا کا ذکر کیا تو کیا تمہیں خیال نہیں آیا کہ وہ انہیں کیسے جانتا ہے؟ اور کیا وہ جن "سب" کی آزادی کا متمنی ہے' وہ تمہیں اور چند دوسرے لوگوں کو آزاد بھی کردے۔ زنجیریں اسے دے کر تم نے یقیناً اس کے دل میں اپنے لئے نرم گوشہ پیدا کرلیا ہوگا مگر ضیاء! سوچو تو کہ اگر کوئی موت کو پسند کرنے لگے' تباہیوں پر ترس کھانے لگے تو کیا ہوگا؟ عذابوں سے پیار کا جواب کیسے ملے گا؟ موت' زندگی کا دوسرا عکس ہے۔ یہ دونوں ایک ہی رخ پر اکٹھے کیسے ہو سکتے ہیں؟ خدا خیر کرے ضیاء! تم اگر مجھے کسی قابل سمجھ کر یہ انتہائی قدم اٹھانے سے پہلے کوئی مشورہ کرتے تو میں قطعی اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔ تم نے زنجیریں زیوسا کے حوالے کی تھیں تو اس وعدے پر کرتے کہ وہ تم سے بلکہ یہاں سے دور چلی جائے۔ وتسلا آج بھی روتی ہے۔ تم اس کی حالت دیکھو گے تو لرز اٹھو گے۔ وہ بھی زیوسا کی شکار تھی۔ شالی بابا وظائف میں لگے تھے۔ انہیں امید تھی کہ جلد ہی کوئی لائحہ عمل سامنے آجائے گا۔ تم نے......... ضیاء! تم نے جلد بازی سے کام لیا۔ کل مجھے شالی بابا سے ملنا تھا۔ مگر.........

اب میں خود میں ہمت نہیں پاتا۔ کیا منہ لے کر جاؤں گا؟ وہ میری خاطر' ہم سب کی خاطر بن باس لئے بیٹھے ہیں۔ دن رات چلے کاٹ رہے ہیں۔ انہوں نے ہماری وجہ سے ہی جینو کو قید کر رکھا ہے۔ صرف اس لئے کہ وہ ہمارے لئے مزید عذاب نہ بن سکے۔ اسے بھوکا رہتے ہوئے تقریباً مہینا ہوگیا۔ تم تصور کرسکتے ہو کہ جس شخص کے منہ کو انسانی گوشت لگ چکا ہو' اسے مہینے بھر تک بھوکا رکھنا کتنے حوصلے کی بات ہے' کہ جانے کب اس کا داؤ

چل جائے اور وہ سب کو چیر پھاڑ کر رکھ دے۔ اس کا سب سے پہلا شکار خود شالی بابا ہو سکتے ہیں۔"

منے دادا کی باتیں میرے حوصلے پست کر رہی تھیں۔ اس وقت میرے دماغ میں آکاہا گیا کی آواز یوں گونج اٹھی جیسے وہ میرے قریب ہی بیٹھا سرگوشی کر رہا ہو۔ "اپنے جد کو روکو۔ وہ بے وقوفیاں کر رہا ہے۔"

"منے دادا!" میں نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انہیں آواز دی تو انہوں نے چونک کر مجھے دیکھا یوں جیسے میرے لہجے میں ہزاروں بچھو سرسرا رہے ہوں جنہوں نے منے دادا کو ڈنک مار دیا ہو۔

"ہوں! ضیاء! کیا بات ہے؟"

"شالی بابا کیا کر رہے ہیں؟ جینو کہاں ہے اور آپ.........."

"اب ساری باتیں فضول ہیں ضیاء! دعا کرو' وہ خیریت سے ہوں۔" منے دادا نے پریشان ہو کر جواب دیا اور کمرے سے باہر چلے گئے۔

میری قطعی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور کیا چاہ رہے ہیں؟

☆ ☆ ☆

اسی رات ہم سب آنگن میں بیٹھے تھے۔ منے دادا ابھی ابھی عشاء کی نماز سے فارغ ہوئے تھے۔ جب سے میری ان سے بات ہوئی تھی' اس وقت سے وہ سخت مضطرب تھے۔ میں نے جب بھی ان سے وضاحت طلب کرنا چاہی' وہ کترا کر نکل گئے مگر ان کے اضطراب کا اضافہ ان کے اندر زلزلہ سا پیدا کئے ہوئے تھا۔ بلکہ مجھے لگ رہا تھا کہ بس وہ اب پھٹے کہ تب' بہرحال ہم سب بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ منے دادا دروازے کے قریب سے گزر رہے تھے کہ اچانک ٹھٹک اٹھے۔

"کیا وقت ہوا ہے؟" انہوں نے دروازہ کھولنے سے پہلے تیزی سے پلٹ کر مجھ سے پوچھا۔

"نو بجنے والے ہیں۔" میری بجائے طیب نے جواب دیا۔

میں منے دادا کو دیکھ رہا تھا۔ یوں لگا تھا جیسے وہ کسی کے منتظر ہوں۔

منے دادا نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا مگر پھر میں نے ان کے چہرے کا رنگ سفید ہوتے دیکھا۔ وہ دروازے کے قریب ڈھتے چلے گئے۔ ہم سب چیخ کر آگے بڑھے۔

جونہی میری نگاہ آنے والے پر پڑی' میرا منہ کھل گیا مگر آواز حلق میں ہی کہیں اٹک کر رہ گئی۔

ہاں..........! میری آواز حلق میں اٹکی رہ گئی تھی۔ اس لئے کہ شاید میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں حیرت سے چیخ پڑوں یا خوشی سے نعرہ لگاؤں۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ میرے سامنے جینو کھڑا تھا۔ ہاں وہ جینو پاپا ریکو' وہ اٹیلین لڑکا جسے میں نے جانوروں کی طرح چاروں ہاتھ پیروں پر چلتے دیکھا تھا۔ وہ جس کے منہ کو خون لگ گیا تھا۔ وہ جو فون پر رو رو کر مجھ سے مدد مانگتا تھا۔ وہ جس نے بتایا تھا کہ اس کا جسم سکڑ کر رابرٹ کے جسم کی طرح کا ہوتا جا رہا ہے۔ میں آج اسے یوں بھرپور جوان کے روپ میں کھڑا پہلی بار دیکھ رہا تھا مگر مجھے سو فیصد یقین تھا کہ یہ جینو ہی ہے۔ وہ میرے سامنے ساکت کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر تشویش اور گھبراہٹ بھی تھی۔ شاید وہ منے دادا کے گر جانے پر پریشان تھا۔ منے دادا کی طرف تو میں بھی لپکا تھا مگر جینو کو پہچانتے ہی میں دادا سے بے خبر ہو گیا تھا۔

"تم.......... تم.......... جینو ہو نا! جینو پاپا ریکو!"

"جی..........! جی! میں ہی ہوں۔"

وہ انگریزی میں بولا تھا۔

"مگر تم تو.........." منے دادا نے اب خود کو کسی حد تک سنبھال لیا تھا۔

"آپ کو کیا ہو گیا ہے؟" وہ جھک کر دادا سے پوچھنے لگا۔ اب طیب انہیں سہارا دے کر اٹھا رہا تھا۔

"تم نے.......... شالی.......... شالی کہاں ہیں؟" دادا اب بھی گھبرائے ہوئے تھے۔

"وہ تو یہاں نہیں ہیں۔ نیپال جا چکے ہیں۔ مسٹر ضیاء..........! میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔" جینو نے میرے دونوں ہاتھ تھام لئے۔ اچانک اس کی نگاہ انیتا پر پڑی۔ وہ بڑی زور سے اچھلا اور پھر ہمارے دیکھتے اس نے انیتا کے سامنے سر جھکا دیا۔

"عظیم دیوی! بے شک یہ ضیاء کا کارنامہ ہے۔ یہ اسی کا حوصلہ ہے۔ مجھے معاف کرو۔ میں تمہارا اور ضیاء صاحب کا زندگی بھر مشکور رہوں گا۔"

میں نے حیرت سے یہ منظر دیکھا تھا۔ انیتا کے چہرے پر بڑی نرم مسکراہٹ تھی۔ وہ جینو کو ایسے دیکھ رہی تھی جیسے اس کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرنا چاہتی ہو۔

"تم بے قصور ہو جینو! میں مجبور تھی ورنہ.........." انیتا نے اتنا ہی کہا تھا کہ طیب

نے اسے چونکا دیا۔

"بھابی..........! آپ.......... آپ اسے جانتی ہیں؟"

وہ بری طرح اچھل پڑی۔ "نہیں..........! کون ہو تم؟" اور پھر جینو نے حیرت سے اسے دیکھا۔ مجھے لگا جیسے لمحہ بھر کو جینو ساکت ہو گیا ہو۔ اس کی آنکھیں ابنیا کی آنکھوں میں گڑی تھیں پھر جینو کسی روبوٹ کی طرح مڑ گیا۔ نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا وہ بڑی سڑک کی طرف جانے لگا۔ میں پہلے اسے دیکھتا رہا پھر اچھل کر اس کے پیچھے بھاگا۔

"جینو..........! جینو..........! میری بات سنو جینو..........! یہ کیا ہے..........؟ کیا ہے یہ سب؟"

وہ بالکل ایسے چونکا جیسے گہری نیند سے جگا دیا گیا ہو۔ "اوہ' مسٹر ضیاء..........! تم حیرت انگیز انسان ہو۔ بہت حیرت انگیز!"

"تم کیسے ٹھیک ہو گئے؟ شالی بابا کہاں ہیں؟"

"شالی بابا کو بھول جاؤ ضیاء! وہ شخص دل میں لالچ لئے تھا۔ وہ زیوسا کی طاقت کو قابو کرنے کے عمل کر رہا تھا۔ شیطان وہیں حملہ کرتا ہے جہاں وہ کمزوری پاتا ہے۔ انہوں نے مجھے اسی لئے قید کر رکھا تھا۔ صرف اس لئے کہ زیوسا میرے ذریعے ان تک پہنچ سکے مگر وہ نہیں جانتے تھے کہ زیوسا تمہارے پاس ہے۔ ضیاء مجھے یقین ہے کہ اب وہ رابرٹ کے پاس گئے ہوں گے۔"

میں حیرت سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ شالی بابا میرے حساب سے میرے معاملے میں ناکام ضرور رہے تھے مگر وہ جو تھے اس کے بالکل برعکس ہوں گے اس کا تو مجھے گمان بھی نہیں تھا۔ جینو کو میں جس حالت میں ان کے پاس دیکھ چکا تھا' یہ راز فاش ہونے کے بعد کہ جینو کو انہوں نے قید کر رکھا ہے' جو حالت ان کی ہوئی تھی' وہ یاد آیا تو لگا جیسے جینو سچ بول رہا ہے۔ سچ ہے' شیطان اسی آہستگی سے حملہ کرتا ہے۔ ایسے ہی غیر محسوس انداز میں آدمی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے کہ نہ وہ کچھ سوچ پاتا ہے اور نہ ہی اسے سنبھلنے کا موقع ملتا ہے۔ شالی بابا بھی انسان تھے۔ وہ بھی اس شیطان کی گرفت میں آسکتے تھے۔

"ضیاء ایسا نہ ہو کہ وہ رابرٹ کو بھی اپنے شکنجے میں پھانس لے۔ جلدی کرو ضیاء! اسے تم ہی بچا سکتے ہو۔"

"میں.......... میں کیا کر سکتا ہوں جینو..........؟" میں بوکھلا گیا۔

"تم سب کچھ کر سکتے ہو ضیاء! تمہیں اپنی طاقت کا اندازہ نہیں ہے۔ جاؤ! جلدی کرو۔ دیکھو' یہ ایک نیا عذاب ہو گا۔ جو کچھ ہم نے کیا' اسے بھگت چکے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ جو کچھ ہم نے نہیں کیا' اس کی پاداش میں ہماری عمر ہی گزر جائے۔ وہ صرف رابرٹ کو ہی نہیں' سب کو اپنی دسترس میں رکھنا چاہتے ہیں۔"

میں ابھی کشمکش میں ہی تھا کہ مجھے اپنے پیچھے آہٹ محسوس ہوئی۔ جینو نے بھی میری پشت پر کسی کو دیکھا تھا۔ میں پلٹا۔ میرے سامنے منے دادا کھڑے تھے۔

"ضیاء! یہ جھوٹ بولتا ہے۔ اس نے ضرور شالی بابا کو کوئی نقصان پہنچایا ہو گا۔"

منے دادا نے ایسے لہجے میں کہا کہ میں بھونچکا ہو کر منے دادا کو دیکھنے لگا۔ "لیکن منے دادا! آپ.......... آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ جینو ہے۔ وہ جینو جو جانوروں کی سی حالت میں رہتا تھا۔ آج یہ اپنے پیروں پر کھڑا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ جھوٹ نہیں بول رہا۔ جھوٹ بولنے میں اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔"

"میں جو تم سے کہہ رہا ہوں کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے۔" وہ دھاڑے۔ میں نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ "میں اسے تباہ کر دوں گا۔ نیست و نابود کر دوں گا۔ پہلے سے بھی زیادہ بدتر حالت کو پہنچا دوں گا۔"

وہ بالکل ایسے چیخ رہے تھے جیسے آپے سے باہر ہوں۔ مجھے ان کا رویہ اور ان کی باتیں حیران کر رہی تھیں۔ انہیں تو جینو کو ٹھیک دیکھ کر خوش ہونا چاہئے تھا۔

"ضیا..........! یہ بڈھا شالی بابا کا دست راست ہے۔" جینو نے خوف زدہ سے انداز میں کہا اور الٹے پیروں مجھ سے دور ہونے لگا۔

"ہوش میں رہو جینو!" میں نے اسے ڈانٹ دیا۔ "یہ میرے دادا ہیں۔"

"نہیں..........! نہیں ضیاء! تم دھوکا کھا رہے ہو۔ نقصان اٹھاؤ گے ضیا! دھوکا ہے یہ سب۔" وہ یہ کہتا ہوا پلٹ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ میں اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

اچانک مجھے اپنے پیچھے عجیب سی آواز محسوس ہوئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ منے دادا آنکھیں بند کئے کچھ پڑھ رہے تھے۔ ان کے بوڑھے چہرے کی کھال یوں لرز رہی تھی جیسے اندر کہیں زلزلہ آیا ہوا ہو۔ "منے دادا..........!" میں نے لپک کر انہیں تھام لیا۔ میرے تھامتے ہی ایسا لگا جیسے میں نے کسی زندہ وجود کو نہ تھاما ہو بلکہ وہ صرف ایک جسم ہو' بے جان' ٹھنڈا اور بھاری۔ میں نے انہیں اٹھا لیا اور گھر کی طرف مڑا۔ جینو میری

"ہوا کیا؟ یہ لڑکا کون تھا؟"

"پتا نہیں اماں.........! میں نے تو پہلی دفعہ دیکھا ہے۔" اماں نے منہ بنا کر کہا۔ اسی وقت ہم لوگ اندر داخل ہوئے۔ اماں نے سر اٹھا کر ہمیں دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھ سے پوچھا کہ کیا ہوا۔ میں انہیں کوئی جواب نہیں دے سکا لیکن میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں پلٹ کر منے دادا کے پاس چلا جاؤں پھر بھی کوئی ان دیکھی طاقت تھی جو مجھے ایسا کرنے سے روک رہی تھی۔

"اماں! سب ٹھیک ہے۔ آپ لوگ یہاں بیٹھیں۔ منے دادا خود یہاں آئیں گے۔" یہ انیتا تھی۔

عجیب بات ہے کہ اس کا یہ جملہ جیسے آسمان سے برستا ہوا محسوس ہوا تھا۔ چاروں طرف سے اڈ کر آتا ہوا حالانکہ وہ میرے بالکل برابر میں کھڑی تھی مگر آواز جیسے بازگشت بن کر چاروں جانب کی دیواروں سے ٹکرا کر سنائی دی تھی۔ ہم سب کے سب ساکت رہ گئے۔ اس آواز کے سوا کوئی دوسری آواز سنائی نہیں دی اور انیتا کے چپ ہوتے ہی جیسے گہرا سناٹا چھا گیا۔ یہ احساس مجھے بہت دیر میں ہوا کہ انیتا کمرے سے جا چکی تھی اور وہاں کمرے میں موجود ہر شخص پتھر کا نہ بننے کے باوجود بے جان ہو کر رہ گیا ہے۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" یہ سوال میرے اندر گونجا تھا مگر جواب میں گہرا سناٹا محسوس ہوا پھر پتا نہیں' کتنا وقت گزرا۔ مجھے احساس ہی نہیں ہوا۔ احساس اس وقت ہوا جب انیتا کے ہنسنے اور بولنے کی آواز کمرے میں داخل ہوئی۔ ہم سب ہی جیسے ٹھیک ہو گئے۔ میں ایک دم دروازے کی طرف لپکا۔

سامنے دادا اور انیتا کھڑے تھے جو ادھر ہی آ رہے تھے۔ "آپ کیسے ہیں منے دادا؟" منے دادا نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ ایسے دیکھا جیسے مجھے اور دوسرے لوگوں کو پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں۔

"منے دادا! بالکل ٹھیک ہیں ضیاء لیکن اب تھوڑی سی تبدیلی کرنا پڑے گی۔ منے دادا کو وہ کمرا دے دیں جو ناصر چچا کے پاس تھا۔ منے دادا کا کمرا ہم لے لیں گے۔"

"مگر کیوں؟ یہ بہت پرانا سیٹ اپ ہے اور پھر منے دادا کو کسی اور کمرے میں چین ہی کب آتا ہے۔ سردیوں میں اکثر ان سے کہا کہ ان کے روشن دان کا شیشہ ٹوٹا ہوا ہے۔ سرد ہوا آتی ہے۔ آپ دوسرے کمرے میں شفٹ ہو جائیں مگر وہ نہیں مانے تھے۔ اب

نگاہوں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ دروازے پر طیب بالکل ساکت کھڑا تھا۔ جیسے پتھر کا بن چکا ہو۔ اماں کو احساس ہوا کہ منے دادا ٹھیک نہیں ہیں' وہ چلائیں۔

"اے طیب! دیکھ تو۔"

اور طیب جھرجھری لے کر میری طرف لپکا۔ انیتا نے بھی باہر آنے کو قدم بڑھایا ہی تھا کہ اماں نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ میں نے اور طیب نے سہارا دے کر منے دادا کو ان کے کمرے میں بستر پر لٹا دیا۔ منے دادا زندہ تھے' اس کا اندازہ میں نے ان کے جینے کے زیرو بم سے لگایا تھا۔ ان کے ہونٹ ساکت تھے مگر ان کا چہرہ بالکل سفید ہو چکا تھا۔ چہرے کے تاثرات سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی شدید اندرونی کرب میں مبتلا ہیں۔

اماں سے میں نے گھر میں داخل ہوتے ہی کہہ دیا تھا کہ آپ منی دادی کو اندر لے جائیں۔ انہیں پتا نہ چلے۔ اماں لپک کر برآمدے میں چلی گئی تھیں تاکہ وہاں بیٹھی منی دادی کو کسی بہانے اندر لے جائیں اور گھر میں واویلا نہ مچے۔ اماں بڑی ہمت والی تھیں۔ ان کی یہ خوبی رہ رہ کر سامنے آ رہی تھی۔ عصمت آپا پھر سے انسان بن چکی تھیں۔ ان کی آنکھیں نم تھیں۔ وہ بڑی بے قراری سے ہمارے ساتھ کمرے تک آئیں اور بار بار طیب سے پوچھ رہی تھیں۔

"کیا ہوا منے دادا کو؟ کیا ہوا ہے؟"

"کچھ نہیں عصمت آپا!" یہ انیتا تھی۔ "آئیے! ہم اندر چلیں۔ انہیں اکیلا چھوڑ دیں ضیاء.........!" وہ پھر میری طرف پلٹی۔ "پلیز! انہیں اکیلا چھوڑ دیں۔"

میں نے حیرت سے انیتا کو دیکھا۔ "کیسی باتیں کر رہی ہو تم؟ اس حالت میں انہیں اکیلا کیسے چھوڑا جا سکتا ہے!"

"ضیاء.........! میں آپ سے کہہ رہی ہوں ناں!" انیتا نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ وہ لمحے کا ہزارواں حصہ تھا کہ میری نگاہیں اس کی نگاہوں سے متصادم ہوئی تھیں اور میرے بدن میں چیونٹیاں سی رینگ گئی تھیں۔

پھر مجھے نہیں پتا۔ میں کمرے سے باہر نکل آیا تھا۔ میں نے سنا' وہ طیب کو بھی چلے جانے کو کہہ رہی تھی پھر شاید ہم سب ہی اس کے ساتھ اس کمرے میں آ گئے جہاں اماں منی دادی کو لئے بیٹھی تھیں۔ منی دادی اماں کے لئے پان لگا رہی تھیں اور پوچھ رہی تھیں۔

کیسے مانیں گے؟"

"آ جائے گا چین۔ اب انہیں اسی کمرے میں چین آئے گا۔ ضیاء! میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟"

اس کا آخری جملہ بن کر پھریری ہوا۔ بدن میں چیونٹیاں سی رینگیں۔ گہرا سناٹا چھا گیا اور ہم سب نے ایک ساتھ اس کی ہاں میں ہاں ملا دی۔ منے دادا کسی روبوٹ کی طرح چپ چاپ بیٹھے رہے۔ انیتا باہر چلی گئی۔ ہم سب وہیں بیٹھے تھے۔ چند ہی لمحوں میں وہ لوٹ آئی۔ اس کے لوٹتے ہی جیسے ہم میں جان پڑ گئی مگر میرے ذہن میں اب بھی گہرا سناٹا سائیں سائیں کر رہا تھا۔

"آیئے منے دادا!" انیتا نے کہا اور منے دادا کھڑے ہو گئے۔

میں ان کے پیچھے گیا۔ طیب میرے ساتھ تھا۔ اور جب ہم دونوں ان کے ساتھ ہی ناصر چچا والے کمرے میں داخل ہوئے تو میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ ناصر چچا کے جانے کے بعد سے یہ کمرا بند پڑا تھا۔ دھول اٹی ہوئی تھی۔ ان کا سامان بھی ویسے ہی بند پڑا تھا۔ کیوں کہ بمبئی جا کر انہوں نے وہیں سے سامان خرید لیا تھا حالانکہ منی دادی نے کہا بھی تھا کہ اپنا سامان لے جاؤ مگر انہوں نے انکار کر دیا تھا کہ اس پرانے کاٹھ کباڑ کا کیا کروں گا۔ اس وقت وہ سارا کاٹھ کباڑ باہر برآمدے میں ترتیب سے رکھا تھا اور وہ بھی اس حالت میں کہ بالکل صاف ستھرا تھا اور ناصر چچا والے کمرے میں منے دادا کا سامان تھا۔

"یہ...... یہ کیسے ہوا؟" میں نے انیتا سے پوچھا۔

وہ مسکرائی۔ "میں نے محلے کے بچوں کو بلا کر سب کروا لیا۔"

"مگر محلے کے بچے تو بہت منحوس ہیں۔ مجھے پان تک نہیں لا کر دیتے۔" اماں بتا نہیں کب ہمارے پیچھے چلی آئی تھیں۔

"اماں! پیار سے کچھ کہو تو بچے سب کر دیتے ہیں۔ آپ کو پان منگوانا ہو تو مجھے کہئے گا۔ انہی بچوں سے منگوا دوں گی۔ دیکھئے گا کیسے بھاگ کر لا کے دیتے ہیں۔"

میں حیران تھا مگر بس...... صرف حیران تھا' میرے ذہن میں ویسا ہی سناٹا تھا۔ نہ کوئی سوال ابھرا تھا نہ حیرت نے مجھے بے چین کیا تھا۔ طیب چپ تھا' بالکل چپ' جو میرے حساب سے خلاف فطرت تھا۔ اس کی نیچر ہی کچھ ایسی تھی۔ مگر اس وقت کوئی بھی بات معمول کے مطابق نہیں لگ رہی تھی۔ منے دادا جو جگہ بدلنے پر جز بز ہوا کرتے

تھے' اس وقت چپ چاپ بستر پر لیٹ چکے تھے۔

منے دادا کے کمرے میں خود شفٹ ہونے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا مگر انیتا نے شام تک طیب اور عصمت کے ساتھ مل کر میرے کمرے کا سامان وہاں شفٹ کر دیا اور میں خاموش بیٹھا دیکھتا رہا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے انیتا نے سارے گھر پر جادو کر دیا ہے۔ وہ سب کچھ اپنی مرضی سے کر رہی تھی۔ عصمت آپا جیسی پتھر بھی اس کے سامنے بھیگی بلی بنی ہوئی تھیں۔ طیب کی ساری شوخیاں دھری رہ گئی تھیں۔ شفٹنگ کے مرحلے کے بعد سب کچھ جیسے نارمل ہو گیا۔ سب کی جیسے کایا پلٹ گئی ہو۔ سب سے پہلے اس کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب عصمت آپا طیب پر چیخیں۔

"اب کوئی یہاں سے نہیں جائے گا اس لئے اب تم چپ چاپ سامان اٹھا کر چلتے بنو' سمجھے تم؟"

"عصمت آپا! یہ تو مجھے پتا ہے کہ ضیاء نہیں جائے گا مگر میں تو کچھ اور ہی سوچ رہا ہوں۔ اکیلے سفر کرنے کی عادت نہیں رہی ہے ناں۔"

"تو...... اب کیا ارادہ ہے؟" عصمت آپا نے بھنا کر پوچھا۔

"منی دادی کو لے کر میرٹھ جاؤں گا۔" اس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

"میرٹھ وہاں تمہارا کون ہے؟" عصمت آپا چونک اٹھیں۔

"بی جان ہیں ناں وہاں...... اور فرحت۔" اس نے یوں آسمان پر تکا جیسے وہاں نیا روشن مستقبل جگمگا رہا ہو یا کوئی خواب اڑ رہا ہو۔

"اے ہے......! ہوش میں تو ہو؟" عصمت آپا نے اس کے سامنے ہاتھ نچایا۔ "بی جان سے تمہارا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ وہ ہماری نانی ہیں' تمہاری نہیں اور دوسری بات کہ فرحت بڑی بھولی بھالی لڑکی ہے۔ میں تم جیسے آوارہ مزاجوں کے منہ سے اس کا نام بھی ناپسند نہیں کرتی۔"

"ارے......! آپ کو تو کچھ پتا ہی نہیں۔" وہ بڑا لہک کر بولا۔ "ہم جیسے لوگ خوابوں میں شہزادے کا روپ دھار کر آیا کرتے ہیں۔"

"کن بیچاروں کے خوابوں میں آیا کرتے ہیں۔ یہ نہیں بتایا! تم نے! خیر یہ میں جانتی ہوں۔ ظلوے کی ماں دو مرتبہ پوچھ چکی ہے تمہارا۔ میں بھی حیران ہوں کہ وہ کیوں پوچھ رہا ہے۔"

"ارے! وہ تو........... وہ تو اس لئے پوچھ رہی تھی کہ میں نے کہہ دیا تھا' بھئی کھلاؤں گا ٹلوے کو۔"

"لیکن ساری تیاری تو اس کی ماں نے پکڑی ہوئی ہے۔ ٹلوا تو قلی لگ گیا ہے۔ اب وہ کہیں نہیں جائے گا۔" عصمت آپا نے چاولوں کی سینی لا کر اماں کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"ارے! تم اتنا بولتی کیوں ہو؟" طیب اب جل گیا تھا۔ انیتا ہنس رہی تھی۔ منی دادی' منے دادا کے پاس تھیں۔ اماں عصمت آپا کو گھور رہی تھیں۔

"ہوکا ہے اسے بولنے کا تم خیال نہ کرنا۔" اماں اب تک عصمت آپا کو غصے سے گھور رہی تھیں۔ باچھیں پھیلا کر طیب سے کہا۔

پتا نہیں' یہ جھک جھک کب تک چلی۔ میں تھکن محسوس کر رہا تھا اس لئے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ یہ تھکن بھی عجیب سی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی' جیسے اندر برف جمی ہو۔ یاد رکھیے گا کہ اب میرا کمرا وہی تھا جو اب سے پہلے منے دادا کا تھا۔ بستر پر لیٹتے ہی مجھے لگا جیسے میں کسی تخت سے پلنگ پر رسیوں سے جکڑ دیا گیا ہوں۔ ذہن ایک دم سن ہو گیا۔ ہاتھ پاؤں بے جان ہو کر رہ گئے۔ مجھے نہیں پتا کہ میں سویا یا یونہی جاگتا رہا۔ رات دھیرے دھیرے آنگن میں اتری تو میرے حواس کام کر رہے تھے۔ باہر چہل پہل کی آوازیں آرہی تھیں پھر انیتا میرے پاس آگئی۔ اس کے کمرے میں آتے ہی وہ ٹھنڈا ٹھنڈا سا احساس ختم ہو گیا۔ میں نے اپنے آپ کو چاق و چوبند محسوس کیا۔

"اب ٹھیک ہیں نا آپ؟" انیتا نے بڑے پیار سے پوچھا۔

"ہاں انیتا! میں رابرٹ کے پاس جانا چاہتا ہوں۔ میں اسی کے لئے پریشان ہوں۔"

"ضیاء! میں آپ کو اکیلا وہاں جانے کا مشورہ نہیں دوں گی۔ جیتو جو کچھ کہہ رہا تھا' وہ درست تھا۔ شالی بابا پر شیطان حاوی ہے۔"

"مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"ایسا ہو گیا ہے ضیاء.........! سب کچھ بدل گیا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ اب کسی معاملے میں نہ پڑیں۔ میں.......... میں سب کرلوں گی۔"

"تم.......... تم کیا کر سکتی ہو؟" میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ اس کے چہرے کا اطمینان مجھے حیران کر گیا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

"آپ کی توجہ' آپ کا اعتماد حاصل ہو تو میں سب کچھ کر سکتی ہوں ضیاء!" اس نے بڑی وارفتگی سے کہا۔

"فضول باتیں نہ کرو۔" میں جھلا کر بولا۔ "یہ سب تمہارے بس کا نہیں ہے۔ تم اس بارے میں کچھ نہیں جانتیں۔" میں نے بستر سے اترتے ہوئے جواب دیا۔

میں نے نہیں دیکھا کہ میرے جملے کا کیا رد عمل تھا۔ میں کمرے سے باہر آگیا۔ انیتا میرے پیچھے تھی۔ میں طیب سے کچھ باتیں کرنا چاہتا تھا۔

طیب' اماں کے پاس کمرے میں تھا۔ میں اس کی آواز سن رہا تھا۔ میں نے انیتا سے چائے کے لئے کہا۔ وہ کچن میں چلی گئی جہاں غالباً عصمت آپا بھی تھیں کیوں کہ برتن پٹخنے کی آواز آرہی تھی۔

"بھئی ضیا! تم سنبھالو اسے۔ بھلا میں اکیلی میرٹھ کیسے جا سکتی ہوں۔ منے ابا کی طبیعت ٹھیک نہیں لگتی۔ منی ماں جان کھا لیں گی میری اور پھر اگر جانا ہے تو منی اماں جائیں اور منے ابا! میری کیا تک ہوئی؟"

"ہوا کیا ہے؟" میں سمجھ کر بھی انجان بن گیا۔ میں طیب کے چہرے کے تاثرات دیکھ چکا تھا۔ اس کا چہرہ جذبات سے تمتمایا ہوا تھا۔ آنکھوں میں ستارے بھرے تھے۔

ضیاء! میں اماں سے کہہ رہا ہوں کہ وہ بڑی ہیں۔ میرٹھ چلیں اور بی جان سے میرے لئے بات کریں۔ آخر کیا کمی ہے مجھ میں؟"

"کمی تو صرف ایک ہی ہے کہ تم انسان نہیں ہو اور ہمارے ہاں جانوروں سے شادی نہیں کی جاتی۔" عصمت آپا نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"اچھا.........! یہ ریت کب سے پڑی۔ پہلے تو سب چلتا تھا۔" طیب نے جل کر جواب دیا۔

"جب سے زہرہ آپا کو تمہارے بچا سے بیاہا ہے' آنکھیں کھل گئی ہیں ہماری۔ توبہ کرلی ہے ہم نے۔" عصمت آپا کب چوکنے والی تھیں۔

"اچھا' اب چپ رہیں۔" طیب نے بھنا کر کہا اور میری طرف متوجہ ہو گیا۔ عصمت آپا پیر پٹختی ہوئی باہر چلی گئیں۔

"ضیاء! اماں کو سمجھاؤ یار!"

"ویسے اماں ٹھیک کہہ رہی ہیں یا تو تم اپنی اماں اور ابا کو بلواؤ یا پھر منی دادی اور

منے دادا جائیں۔ اماں کی کوئی تک نہیں ہے۔"

میں نے دھیرے سے کہا ورنہ جی تو چاہ رہا تھا کہ اسے ڈانٹ کر چپ کرا دوں مگر اب میں اس کے سوا کر بھی کیا سکتا تھا۔ فرحت کے نام پر جو ہوک سی دل میں اٹھی تھی اب اس کا سرا دل کی گہرائی میں کانٹے کی طرح چبھ رہا تھا مگر اب یہ درد سہنا ہی تھا لیکن جی چاہا کہ میرٹھ چلا جاؤں۔ ایک بار اس سے معافی مانگ لوں۔ اسے بتاؤں کہ میں مجبور تھا مگر......... میں مجبور کیوں تھا؟ کیا بتاؤں گا اسے؟ اور پھر جاؤں گا کیسے؟ طیب کی بات کیسے کروں گا؟"

فرحت کے ذکر نے بوجھل کر دیا جب کہ طیب اب میرے پیچھے پڑ گیا کہ تم اماں کو تیار کرو اور میں نے کہہ دیا کہ سیدھی طرح اپنی اماں کو لکھو۔ وہ خود جائیں۔ یہ کہہ دینے کا مطلب یہ بھی تھا کہ مجھے یہی امید تھی' وہ منع کر دیں گی۔ میں نے کبھی انہیں فرحت سے سیدھے منہ بات کرتے نہیں دیکھا تھا۔ ان کی تحسین خالہ سے بھی نہیں بنتی تھی۔ وہ ہمیشہ شاکی رہیں کہ تحسین خالہ کے یہاں رہنے کی کیا تک ہے! وہ تو ابا کی اور دادا کی وجہ سے بات بڑھی نہیں تھی ورنہ وہ کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ زہر اگل دیا کرتی تھیں۔ ان سے تو اماں کی بھی نہیں بنی تھی۔ شاید اماں بھی اسی لئے اس معاملے سے لاتعلقی کا اظہار کر رہی تھیں۔ ان پر الزام آسکتا تھا کہ بیٹے کو پھنسا کر بھانجی منڈھ دی۔ طیب شاید......... بلکہ یقیناً اپنی ماں کی طبیعت سے واقف تھا۔ وہ بضد رہا کہ اماں نہیں تو منی دادی کو تیار کر لو۔ میں نے ٹال دیا کہ ضرور کوشش کروں گا۔

بات اس وقت تک آئی گئی ہو گئی۔ رات کو کھانے پر پھر تذکرہ چھڑ گیا۔ منے دادا اور منی دادی اپنے کمرے میں ہی تھے۔ انیتا نے منے دادا کو کھانا اندر ہی بھجوا دیا تھا۔ دادی بھی اندر چلی گئی تھیں۔ عصمت آپا اس لئے جلی ہوئی تھیں کہ فرحت ان کی دوست تھی۔ وہ طیب سے ہمیشہ نالاں رہتی تھیں اس لئے بھی نہیں چاہتی تھیں۔ یہ پرانا جھگڑا تھا' اس لئے میں نے درمیان میں بولنا مناسب نہیں سمجھا' دوسری وجہ انیتا تھی اور میں نہیں چاہتا تھا کہ انیتا فرحت کے سلسلے میں میری غیر معمولی دلچسپی کو محسوس کرے۔

"اماں! کیا میں آپ کا خون نہیں ہوں؟ آپ میرے لئے کچھ نہیں کر سکتیں؟"

طیب روہانسا ہو کر کہہ رہا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ سراسر اداکاری تھی۔

"بات سنو! چھچھوندر' اماں کے اپنے بہت ہیں تنگ کرنے کے لئے۔ تم جا کر اپنی

اماں کی جان کھاؤ۔ یہاں سے کوئی نہیں جائے گا۔" عصمت آپا نے سالن کا ڈونگا اس کے سامنے سے اٹھاتے ہوئے کہا۔

"تم چپ نہیں رہ سکتیں؟" اماں نے عصمت آپا کو جھڑکا۔

"اصولاً اسے چپ رہنا چاہئے۔ آپ تو مجھے ڈانٹنے کے بہانے ڈھونڈتی ہیں۔ میں نے فرحت کے لئے کچھ اور سوچ رکھا تھا' خود فرحت نے بھی کچھ نہ کچھ سوچا ہو گا مگر اب......... اب ایسا بھی کال نہیں پڑا کہ آنکھوں دیکھی مکھی نگل لی جائے۔" عصمت آپا ناراض ہو گئیں۔

مجھے لگا جیسے عصمت آپا کو سب کچھ پتا ہو۔ اس لئے کہ جب وہ یہ بات کر رہی تھیں تو ان کی نگاہیں میرے چہرے سے ہوتی ہوئی انیتا کے چہرے پر جا ٹھہریں تھیں۔ میں نے اسی لمحے انیتا کو چونکتے دیکھا۔ ممکن ہے' یہ اتفاق ہو۔ میرے دل کا چور ایسا محسوس کر رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ انیتا نے پھر میری طرف دیکھا تھا اور میں نے نگاہ نہ اٹھائی۔

"بات یہ نہیں ہے میاں! تمہاری اماں گلے پڑ جائیں گی۔ پتا نہیں' انہوں نے کیا سوچ رکھا ہے۔ ہم نفاق نہیں چاہتے۔ وہ تو کہو ہم نے کبھی موقع نہیں دیا ورنہ منی دادی کچے کانوں کی ہیں۔ ان کی باتوں میں آجائیں تو زندگی عذاب بنا کر رکھ دیں۔ ہم گھر میں بزرگوں کی موجودگی چاہتے ہیں۔ بزرگ نہ رہیں تو برکت اٹھ جاتی ہے۔ اب یہ عقیدہ تمہاری اماں کا نہیں ہے ورنہ یہ ان کے ساتھ رہ رہے ہوتے لیکن وہ کان تو بھر ہی سکتی ہیں۔ دوسری بات یہ کہ ان کو تحسین یا ان کی اولاد کبھی نہ بھائی۔ مجھے گناہ گار نہ کرو۔ وہ بن باپ ماں کی بچی ہے۔ میں تو نصیبوں جلی اس کے لئے کرنے کے قابل نہیں رہی کہ بیٹے منہ زور ہیں۔ اب نیا قضیہ میرے سر نہ منڈھو۔"

اماں کی پوری تقریر ختم ہو گئی اور سب چپ رہے۔ میرے دل پر تو جیسے الفاظ بھالے کی طرح لگ رہے تھے۔ مجھے اماں کی پوزیشن کا بھی آج پہلی مرتبہ شدت سے احساس ہوا۔ واقعی وہ تین جوان بیٹوں کی ماں تھی۔ مری ہوئی بہن کی بے سہارا بچی کو پناہ دینے کے قابل بھی نہ رہیں۔ وہ بی جان اور خالہ بی کے بوڑھے سہارے پر کتنی تنہا ہو گی۔

"اماں! میں اسے ساری دنیا سے چھپا کر رکھوں گا۔" طیب نے جذباتی انداز میں جواب دیا۔ "میں اماں کے پاس لے کر نہیں جاؤں گا۔ میں جانتا ہوں کہ وہ فرحت کو پسند نہیں کرتیں حالانکہ ہمارے خاندان میں کوئی لڑکی اس کے مقابلے کی نہیں۔ میں اسے چاہتا

ہوں اماں۔ پیار کرتا ہوں اس سے۔"

طیب نے بڑی جرأت سے کہا اور میں فق رہ گیا۔ بس دو جملے تھے اور وہ کہہ گیا سب کے سامنے۔ میں تو اکیلے میں فرحت سے ایک جملہ بھی نہ کہہ سکا تھا پھر بھی طاقتور ہونے کا دعوے دار تھا۔ ذہین ہونے پر فخر کیا کرتا تھا۔ خود کو بڑا طرم خان سمجھتا تھا مگر یہ بودا سا طیب مجھ سے زیادہ مضبوط نکلا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"میں فیصلہ کرلوں تو دنیا کی کوئی طاقت اسے نہ بدل سکتی ہے' نہ آڑے آسکتی ہے اماں! اگر آپ میں سے کوئی بھی نہیں گیا تو...... تو میں اکیلا چلا جاؤں گا۔"

وہ کھانا چھوڑ کر اٹھ گیا۔ ماحول بوجھل ہوگیا۔ عصمت آپا اسے حیرت سے تکتی چپ کی چپ رہ گئیں۔ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ انیتا نے ابھی ایک حرف بھی نہیں کہا تھا۔ وہ اسی طرح چپ چاپ کھانا کھا رہی تھی جیسے وہاں موجود نہ ہو۔

میں بار بار اسے کن انکھیوں سے دیکھتا رہا۔ سب چپ رہے۔ کھانا ختم ہوگیا۔ میں بوجھل دل لئے اپنے کمرے میں آگیا۔ اماں بھی چپ تھیں۔ عصمت آپا بھی۔ منے دادا سو رہے تھے۔ منی دادی نے بتایا کہ اب پہلے سے بہتر ہیں۔ میں ان کی طرف نہیں گیا۔ طیب کی باتوں نے مجھے خول میں بند کردیا تھا۔ فرحت کی تنہائی' بی جان کی گہری آنکھوں میں جلتی بجھتی آس' خالہ بی کا چڑچڑا پن سب مجھے یاد آتا رہا۔ پتا نہیں طیب کہاں تھا اور انیتا کیا کررہی تھی۔ میں اس رات آدھی رات تک سو نہیں سکا۔ پھر شاید مجھے نیند آگئی لیکن جب تک میں سویا نہیں' انیتا کمرے میں نہیں آئی۔ پتا نہیں کیا کرتی رہی۔ میرا دل ہی نہیں چاہا کہ جاکر دیکھوں۔ صبح اٹھا تو رات والا بوجھل پن پورے گھر پر طاری تھا۔ طیب صحن میں چپ چاپ بیٹھا نیم کے گھنے درختوں پر چڑیوں کو چہچہاتا دیکھتا رہا تھا۔ عصمت آپا کچن میں تھیں اور انیتا اماں کے پاس بیٹھی پالک کا ساگ کاٹ رہی تھی۔

"دن چڑھے تک سونا کوئی اچھی بات نہیں بیٹا! بمبئی کے طریقے اب چھوڑ دو۔" اماں نے نڈھال لہجے میں کہا۔ "رات جلدی سونے اور صبح جلدی اٹھنے کی عادت ڈالو۔"

"جی اماں......!" میں نے اور کچھ نہ کہا۔ مجھے دیکھ کر انیتا ناشتا بنانے اٹھ گئی۔ وہ اب بھی خاموش تھی۔ میں نے دیکھا اس پر شب بیداری کا کوئی اثر نہ تھا حالانکہ وہ بھی نہیں سوئی تھی۔ ممکن ہے' آدھی رات کو آکر سوگئی ہو' وہ مجھ سے پہلے کی اٹھی ہوئی تھی مگر چہرے پر ویسی ہی تازگی تھی۔ میں منہ ہاتھ دھو کر آیا تو ناشتا تیار تھا مگر میں صرف چائے

پی کر اٹھ گیا۔

"ناشتا تو کرلیں۔" انیتا نے دھیرے سے کہا۔

"نہیں! بس...... بھوک نہیں ہے۔"

"ضیاء! ادھر آؤ۔" عصمت آپا نے مجھے آواز دی۔ انیتا نے مجھے اس لمحے ایسی نگاہوں سے دیکھا کہ میں بیان نہیں کرسکتا۔ وہ نگاہیں میرے دل میں اتر گئیں۔ پتا نہیں' ایسا کیا تھا ان آنکھوں میں اور ایسی کون سی بات ہوگئی تھی کہ عصمت آپا یوں مجھے بلا رہی تھیں۔ انیتا کے انداز سے لگا جیسے اسے پتا ہو۔ کوئی خاص بات.........

میں عصمت آپا کے قریب گیا تو انہوں نے اماں اور انیتا وغیرہ کی طرف دیکھتے ہوئے ایک لفافہ چپکے سے میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"اسے کمرے میں جاکر پڑھنا۔ کسی کو پتا نہ چلے۔"

"کیا ہے یہ؟" میں نے لفافے پر نگاہ ڈالی۔ وہ میرٹھ سے آیا تھا۔ یہ دیکھتے ہی میں نے اسے جیب میں رکھ لیا اور سمجھ گیا کہ کوئی خاص بات ہے۔ عصمت آپا خط دیتے ہی مڑ کر کسی کام میں لگ گئی تھیں اور اس طرح رخ کئے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

"جاؤ!"

اور میں تیزی سے اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ جاتے جاتے میں نے انیتا کو دیکھا۔ وہ اسی انداز میں مجھے دیکھ رہی تھیں۔ میرے پسینے چھوٹ گئے۔ لگا جیسے جو بات عصمت آپا سب سے چھپا رہی ہیں' وہ اسے پتا ہے۔ اس کی نگاہوں میں التجا بھی تھی' ترحم بھی اور ایک عجیب سی تنبیہہ بھی۔ میں رکا نہیں۔ کمرے میں جاکر میں نے دروازہ بند کرلیا اور خط لے کر بیٹھ گیا خط بی جان کا تھا۔ میں نے پڑھا۔ بی جان نے لکھا تھا۔

"عصمت!

بہت سی دعائیں! امید ہے کہ تمہاری اماں اور گھر کے دوسرے افراد خیریت سے ہوں گے۔ مجھے یقین ہے کہ تم لوگ ہماری خیریت کے لئے بھی دعا گو ہو مگر بیٹا لگتا ہے ہماری طرف کے آسمانوں پر در بند ہوگئے ہیں۔ پچھلے دنوں بی آپا بہت بیمار رہیں۔ ان پر پاگل پن کا دورہ پڑا تھا اور لگتا تھا' اب کبھی بھی پہچان نہیں پائیں گی مگر اب کچھ بہتر ہیں۔ ان کا اکیلا پن ہی پاگل ہونے کا سبب تھا اور کافی تھا مگر اس بار فرحت کے اکیلے پن کا درد زیادہ رہا۔ ہم بوڑھوں کی تو اب چاپیں بھی نہیں ابھرتیں۔ فرحت کے قدموں کی آواز

اکیلی ہی گھر بھر میں گونجتی رہتی ہے۔ اس اکیلی چاپ سے خوف تو مجھے بھی آتا ہے پر میں بھی پاگل ہو گئی تو کیا ہوگا' یہ خوف ہمت دلاتا ہے اور بچی رہتی ہوں۔ محلے کا بدمعاش اب زیادہ رنگین کپڑے پہننے لگا ہے۔ زیادہ پان کھانے لگا ہے اور دن کا بڑا حصہ گلی میں گزارتا ہے۔ اس کے قہقہے بھی اب اونچے ہوتے ہیں اور پھبتیاں بھی' فرحت سہمی رہتی ہے۔ میں چوکنی رہتی ہوں مگر بی آپا' آپے سے باہر ہو جاتی ہیں۔ کل اس نے محلے کی سب سے خراب عورت کے ہاتھوں خوان بھجوایا تھا۔ جس میں خشک میووں کے ساتھ بھنا پرانا شجرہ بھی تھا جس میں جانے کس کس کے نام تھے پر اس کا اپنا نام کہیں بھی نہ تھا۔ بی آپا کو دورہ اس کے بعد ہی پڑا تھا۔ ضیاء چلنے کر نہیں۔ ان کی طرف سے فکر ہی لگی رہتی ہے۔ زمانہ یوں بھی تیز رفتار ہے۔ ہم بوڑھے ہیں' تیز چل ہی نہیں سکتے۔ ضیاء تو ماشاء اللہ جوان ہیں۔ اللہ سب بہتر کرنے والا ہے۔ اسی سے آس لگائے بیٹھے ہیں۔ اب وہ بھی نہ سنے تو کیا کریں؟ تمہارے اور ضیاء کے لئے سوئٹر بن رکھے ہیں' کوئی آتا جاتا ہوگا تو بھیجوں گی۔ منی دادی اور منے دادا کو سلام کہہ دینا۔ بڑے بھائیوں کو خط لکھو تو میرا شکوہ بھی لکھ دینا۔ ضیا کو سب کی دعا کہنا۔ اپنی اماں کو یاد دلاسکو تو بتا دینا کہ بوڑھی ماں چھٹی کی آس لگائے بیٹھی رہتی ہیں۔ اللہ پاک سب کی خیریت رکھے۔ ہم سب دعا گو ہیں۔ تمہاری بی جان۔"

بی جان کا خط دل میں آگ لگا گیا۔ ان کی تنہائی' شاید ان کے گھر میں اتنی نہ ہو جتنی مجھے دل میں محسوس ہوئی۔ انہوں نے اماں کے علاوہ مجھے بھی وعدہ یاد دلایا تھا۔ پھر جس خدشے کا اظہار کیا تھا اس سے میں بے چین ہو گیا۔ محلے کے بدمعاشوں کی نظر فرحت پر پڑ چکی تھی اور اس کی حفاظت کو کوئی بھی نہیں تھا۔ میں کیا کروں؟ یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا مگر وہاں جانا چاہتا تھا۔

میں نے فیصلہ کر لیا کہ یوں منہ چھپا کر بیٹھنے سے مسائل بڑھیں گے۔ جو ہو چکا تھا' اسے ان کی مرضی کے مطابق ٹھیک کرنا تو اب ناممکن تھا مگر جو ہونے کا خدشہ پیدا ہو گیا تھا' اسے سنبھالا جا سکتا تھا۔ طیب بہرحال محلے کے اس بدمعاش سے کہیں بہتر تھا۔ نسل [illegible] سانحہ ہوتا ہے اور اب خاندان سانحوں کا متحمل ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

میں خط لے کر اماں کے پاس پہنچ گیا۔ انہیں خط دیا۔ انہوں نے پڑھا اور بے آواز روتی رہیں۔ میں سامنے بیٹھا دل پر گرتے آنسوؤں کا شمار کرتا رہا۔ انیتا دوبار آئی اور چپ چاپ واپس چلی گئی۔ نہ میں نے خیال کیا یا اہمیت دی' نہ اس نے جتایا۔ طیب کہیں باہر گیا

ہوا تھا۔ عصمت آپا حیران تھیں کہ خط اماں کو کیوں دے دیا۔ انہوں نے تو چھپا کر دیا تھا۔

"کیا کروں میں؟" اماں نے چھوٹا سا جملہ کہا تھا مگر اس چھوٹے سے جملے کے پیچھے بڑا طوفان تھا۔ پہلے میں سمجھتا تھا عصمت آپا اماں پر گئی ہیں۔ وہ بھی اپنے زمانے میں اتنی ہی بے حس ہوں گی کہ اب سب کچھ سہہ لیتی تھیں مگر آج......... اس لمحے ایسا لگا جیسے وہ زہرہ آپا کی کاپی ہوں یا زہرہ آپا ان کی۔ ایک ایک کر کے انہوں نے ہر حرف پر آنسو بہائے۔

"تحسین اپنی قسمت فرحت کے سر منڈھ گئی۔" اماں نے روتے ہوئے کہا۔ میں نے ایک دم ہی فیصلہ کر لیا۔

"اماں! ہم میرٹھ چلتے ہیں۔"

"کیا کرلو گے وہاں جا کے؟ میرا تو منہ دکھانے کے قابل ہی نہ چھوڑا۔ خاندان میں ایک یہی تو آس ہوتی ہے کہ بیٹی کی صورت میں درد چھپا لیتا ہے' ہمارا تو دامن ہی تینوں بیٹوں نے تار تار کر دیا۔"

اماں آج دل کے پھپھولے پھوڑ رہی تھیں۔ بیٹے کی جس خوشی کو انہوں نے حالات کی وجہ سے قبول کر لیا تھا' آج وہی حالات انہیں برے لگ رہے تھے۔ وہ بھی کیا کرتیں! فرحت کا ان کے سوا اور تھا ہی کون' خالہ بی تو خیر نام کو ہی تھیں۔ بی جان ناتواں اتنی تھیں کہ خوشی ہی برداشت نہ کر پاتیں' غم سہنے کا حوصلہ کیسے کرتی ہوں گی۔ اماں رو رہی تھیں اور منہ ہی منہ میں کچھ بدبداتی بھی جا رہی تھیں۔ عصمت آپا بھی آ کر قریب بیٹھ گئیں۔ مجھے نہیں پتا کہ انیتا کیا سمجھی' کیا سوچا مگر جب اس نے آ کر کہا۔

"اماں! ہم سویرے میرٹھ چلیں گے۔"

تو میں اور اماں دونوں چونک اٹھے۔ لمحہ بھر کو اسے دیکھ کر اماں نے یہی سوچا کہ بہو ہے' سوچتی ہے کوئی مسئلہ ہے یا ماں یاد آ رہی ہیں۔ رواداری کو کہہ دیا۔ مانا بھی مقصود ہو سکتا ہے مگر میں نے اس کے ملیح چہرے پر واضح بے چینی اور دکھ کے آثار دیکھ لئے تھے۔ لگ رہا تھا جیسے وہ خط کا متن جان چکی ہے یا کہیں پڑھ چکی ہے۔ بہرحال ہمارا حوصلہ ٹوٹا مگر انیتا کے عزم نے فیصلہ مضبوط کر دیا۔ میں نے کہہ دیا تیاری کر لیں۔ جو بھی تھا' جو بھی ہوتا تھا' بہرحال ضروری تھا۔ طیب گھر واپس آیا تو یہ خبر سن کر اچھل پڑا۔

"اماں کیسے تیار ہو گئیں؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔

"میں سوچ چکا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ اس لئے کہہ دیا۔ "انیتا نے ضد کی ہے۔"

وہ رکا نہیں۔ اچھل کر قلانچیں بھرتا باہر بھاگ لیا۔ پھر شاید صحن میں کہیں انیتا مل گئی۔ اس کی آوازیں یہاں تک آرہی تھیں۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "اب ٹھگی ہیں آپ بھابی! آپ نے مجھے جیت لیا بھابی جی! ساری عمر پاؤں دھو کر پیوں گا۔"

"تم ہو ہی اسی قابل۔ لوگوں کے پاؤں دھو دھو کر پیتے رہو۔ صاف پانی تو بیمار کر ڈالے گا تمہیں۔ تمہارا تو باطن بھی ظاہر کی طرح میلا ہے۔ صفائی اثر نہیں کرے گی۔"

عصمت آپا کی آواز آرہی تھی مگر انیتا نے کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ صبح جانے کا پروگرام بن چکا تھا۔ ابھی دن تھا۔ اماں جانے کو بے چین تھیں مگر منی دادی اور منے دادا کا بھی مسئلہ تھا۔ منے دادا اب تک ساکت بستر پر پڑے تھے۔ بظاہر تو ٹھیک ہی لگ رہے تھے۔ اماں پریشان تھیں کہ دونوں کو چھوڑ کر کیسے جائیں۔ عصمت آپا نے کہا۔ "میں رہ جاتی ہوں۔" انیتا چپ رہی۔

اسی رات جب انیتا نے کہا۔ "ضیا! آپ کے ہاں تو چار شادیاں جائز ہیں نا!"

تو میں چونک اٹھا۔ "ہاں.........! مگر کیوں؟ تم کیوں پوچھ رہی ہو؟" دل اچھل کر حلق میں آگیا تھا۔

"آپ......... آپ فرحت سے شادی کرلیں۔"

"کیا؟ ہوش میں تو ہو؟"

"کیوں' ایسی کیا بات ہے؟ میں جانتی ہوں ضیا! آپ آج سے نہیں بچپن سے اسے پسند کرتے ہیں۔ آپ تو اس کا نصیب تھے مگر میں......... میں بھی آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی اس لئے میں نے......... خیر.........! یہ الگ مسئلہ ہے مگر فرحت واقعی اچھی ہے۔ وہ آپ کو دل کی گہرائیوں سے چاہتی ہے۔ اسے یہ سب جان کر بہت دکھ ہوگا مگر میں اسے منالوں گی۔ میں اسے اپنی مجبوری بتاؤں گی تو........."

"انیتا! پلیز! بس کرو۔ اسے مزید تماشا نہ بناؤ۔" میرا دل غم سے پھٹنے کو تھا کہ میں بول اٹھا۔

"ضیاء! میں نہیں جانتی تھی کہ آپ......... اس قدر وارفتگی رکھتے ہیں ورنہ جہاں میں نے اتنی صدیاں تنہا گزاری تھیں' وہاں یہ بھی........."

"صدیاں.........؟ کیا کہہ رہی ہو تم؟" میں اب چونکا۔ "دیکھو انیتا.........! میں

نے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔ بس بی جان کا دکھ اور ان کی تنہائی ہمیں احساس دلاتی تھی اور وہ اچھی لڑکی ہے۔ اسی بنیاد پر میں اسے نسبتاً پسند بھی کرتا تھا لیکن ایسا کچھ نہیں تھا کہ اب تم اپنے حواس ہی کھو دو۔ میں ہی نہیں' پوری دنیا قسمت کے آگے مجبور ہوتی ہے۔ میں نے سوچا ہے کہ طیب اسے واقعی چاہتا ہے۔ اس طرح اسے ایک اچھا شوہر اور طیب کو اچھی بیوی مل جائے گی۔ میں نے اماں سے بات کی تھی۔"

مجھے واقعی لگ رہا تھا کہ وہ پاگل ہوگئی ہے۔ وہ یقیناً خط پڑھ چکی ہوگی اور عصمت آپا نے بھی اسے کچھ نہ کچھ بتایا ہوگا ورنہ وہ تفصیل نہیں جان سکتی تھی۔ مجھے عصمت آپا پر غصہ بھی آیا۔ جب سب کچھ بتا چکی تھیں تو خط چھپا کر دینے کی کیا ضرورت تھی۔

"آپ نے اماں سے کوئی بات نہیں کی۔ جھوٹ بول کر آپ سمجھتے ہیں کہ میں بہل گئی؟" وہ دکھ سے بولی۔

میں حیران ہوگیا۔ واقعی میں نے ابھی اماں سے بات نہیں کی تھی۔ ابھی تو میں اپنے ہی دل کو مضبوط کر رہا تھا لیکن بہرحال یہ فیصلہ تو کر ہی چکا تھا۔ اس لئے پُرعزم لہجے میں کہا۔ "ممکن ہے' ابھی اماں سے بات نہ کی ہو میں نے اور مجھے ایسا اسی لئے لگا ہو کہ میں یہ فیصلہ کر چکا ہوں۔ تم پریشان مت ہو۔"

"لیکن ضیا! اگر آپ مجھے قسمت کی مجبوری سمجھ کر قبول کر رہے ہیں تو میں ایسا کبھی نہیں چاہوں گی۔ محبت میں نے پہلی مرتبہ کی تھی اس لئے اسی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایسی حرکتیں بھی کر گئی جن سے آج مجھے شرمندگی محسوس ہوتی ہے اور شدت سے احساس ہوتا ہے کہ میں نے آپ سے دھوکا کیا ہے۔"

"انیتا! تم کچھ عجیب سی باتیں کر رہی ہو۔ تم ٹھیک نہیں ہو' سو جاؤ۔ میں اماں کے پاس جا رہا ہوں۔ مجھے ان سے بات کرنی ہے مگر تم سو جانا' کچھ سوچنا نہیں اور نہ پریشان ہونا۔ میں تمہیں قسمت کی مجبوری نہیں کہہ رہا اگر تمہیں میرے جملے سے دکھ پہنچا ہے تو میں معذرت چاہتا ہوں۔ پلیز! میں بہت پریشان ہوں۔ میرے لئے نئی پریشانی پیدا نہ کرو۔"

وہ چپ چاپ لیٹ گئی۔ میں اماں کے پاس جانے کو نکلا تو راستے میں عصمت آپا مل گئیں۔

"آپ کو کیا ضرورت تھی انیتا کو سب کچھ بتانے کی؟ بلاوجہ میری پوزیشن خراب کر دی آپ نے۔"

میں نے جھنجلا کر کہا۔ "ہوش میں تو ہو.........!" وہ ایک دم اکھڑ گئیں۔ "میں بی جمالو کا کردار ادا نہیں کرتی۔ تمہیں خط سب سے چھپا کر دیا تھا۔ تم نے تو اماں کو ہی دکھا دیا۔" وہ الٹا مجھ پر گرم ہو گئیں۔

"پھر انیتا کو یہ سب کچھ کس نے بتایا؟"

"پتا نہیں ضیاء.........! مجھے ایک بات عجیب سی لگی ہے۔" وہ مجھے لئے ہوئے برآمدے میں آ گئیں۔

"کیا بات؟"

"وہ سب کچھ خود بخود جان لیتی ہے۔ کوئی جادوگرنی ہے کیا؟"

"فضول باتیں نہ کریں۔ صرف ذہین ہے۔ مجھے تو امید ہی نہیں تھی کہ وہ گھر والوں کو اس طرح ہاتھ میں لے لے گی۔"

"نہیں ضیا! کچھ نہ کچھ ہے ضرور۔ تم یقین نہ کرو مگر میں کہہ رہی ہوں۔ کوئی گڑبڑ ہے۔ منے دادا کو دیکھو۔ اب تک اسی حالت میں ہیں۔"

"لیکن ہیں تو ٹھیک۔"

"ٹھیک کسے کہتے ہو تم؟"

"میرا مطلب ہے کہ وہ بیمار نہیں ہیں۔ بس بستر پر ہیں۔ چپ ہیں' ورنہ پوری طرح صحت مند ہیں۔"

"اور وہ جینو' جو بقول تمہارے جانور کی طرح رہتا تھا۔ شالی بابا......... جن کے بارے میں وہ انکشاف کر کے گیا ہے اور اس پر منے دادا کا رویہ' اسے کیا کہو گے تم؟"

"ہاں.........! یہ سب عجیب ضرور ہے عصمت آپا! میرے ذہن میں بھی ہے مگر میں پہلے فرحت والے معاملے کو ترجیح دوں گا۔"

"اب کیا کر لو گے' وہ بوا تمہیں دوسری شادی کی اجازت دیں گی؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

اب میں انہیں کیا بتاتا کہ اس نے اجازت دے بھی دی ہے۔ میں نے کچھ نہ کہا اور اماں کے کمرے کی طرف بڑھا۔ عصمت آپا میرے ساتھ تھیں۔ جب میں نے اماں سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو وہ آپے سے باہر ہو گئیں۔

"باؤلے ہو گئے ہو تم! ان کی اماں کلاوت چڑھا چڑھا کر ادھ موئی ہو گئیں امام بارگاہ

پر' یہ کر دیا ہم نے تو دین سے بھی منکر ہو جائیں گی کہ منتیں الٹی کر دیں اور پھر تمہیں نہیں پتا' پورے خاندان سے کٹی ہوئی کیوں رہتی ہیں وہ۔ یہ نہیں معلوم تمہیں کہ اپنے فرقے سے باہر کی کوئی چیز پسند نہیں انہیں۔ طیب سے بھی یوں خائف ہیں کہ وہ ان کی باتوں پر کان نہیں دھرتا۔ کہہ دیں گی ہم نے اور ورغلانے کو شادی کر دی۔ اپنی بے سہارا بھانجی اس لئے منڈھ دی کہ جہیز کہاں سے دیتیں۔ تم نے نہ سنی ہوں یہ باتیں' میں کان بند کر کے نہیں رہتی دنیا میں۔"

"مگر اماں! یہ طیب کی خواہش ہے۔ وہ خود نمٹ لے گا۔" میں نے کہا۔

"مگر پھنسیں گے ہم سب۔"

عصمت آپا جو حیرت سے میرے فیصلے کی تفصیلات سن رہی تھیں' اب ہوش میں آ چکی تھیں۔

"اماں! ضیاء ٹھیک کہہ رہا ہے۔ کسی لفنگے کے پلے بندھنے یا اس کی بے باکی کی نذر ہونے سے تو لاکھ درجے بہتر ہے طیب۔"

"ارے! آگے پیچھے' اونچ نیچ بھی تو دیکھا کرو تم لوگ! بس منہ کھولا اور کچھ بھی کہہ دیا۔ لو.........! نہ لحاظ' نہ خیال اور طیب کون سا سکھ سے تکتے ہیں کہ کمائیں کھائیں گے اور گھر بسائیں گے۔ اب کیا میں مکھی نگل لوں؟ اور بی جان.........! وہ کیا جانتی نہیں ان کی اماں کو!"

"یہ سب ثانوی باتیں ہیں اماں! طیب اسے چاہتا ہے۔ اپنانا چاہتا ہے' یہ کافی ہے ہمارے لئے۔ وہ سول میرج بھی تو کر سکتا ہے۔"

"کیا......... کیا کر سکتا ہے؟"

"کچھ نہیں اماں! بس آپ سوچ لیں۔" میں نے صاف کہہ دیا۔ پھر آپا نے میری جگہ سنبھال لی۔ وہ طیب کی طرف داری میں اس قدر مدلل گفتگو کر رہی تھیں کہ میں حیران رہ گیا۔ بالکل نہیں لگ رہا تھا کہ یہ وہی عصمت آپا ہیں جو ہر وقت طیب کے پیچھے پڑی رہتی ہیں۔ اماں بھی بالآخر چپ ہو گئیں۔ انہیں اس "لفنگے" کی فکر زیادہ تھی جس کا ذکر بی جان نے کیا تھا۔

ابھی عصمت آپا' طیب کی طرف داری ہی کر رہی تھیں کہ طیب اندر آیا۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ دونوں کانوں کو اپنی دونوں ہتھیلیوں سے اس نے آگے کو کھڑا

کر رکھا تھا۔ میرے قریب آ کر اس نے اپنی انگلی کاٹی اور بلبلا کر رہ گیا۔ عصمت آپا اور اماں اس کی طرف متوجہ نہیں تھیں نہ انہیں پتا تھا کہ وہ اندر آیا ہے۔ میں البتہ اسے دیکھ رہا تھا اور ابھی اس کی حالت کو سمجھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ اس نے اپنی انگلی کاٹ لی اور بلک اٹھا۔ اس کے بلکنے پر اماں اور عصمت تو اچھلی تھیں ہی' میں بھی اچھل پڑا۔

"اے! کیا ہوا؟" اماں چیخیں۔

"دیکھ رہا تھا کہ یہ جو دکھائی دے رہا ہے' جو سنائی دے رہا ہے' وہ حقیقت ہے کہ خواب........" وہ اتنا کہہ کر عصمت آپا کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ اب اس نے ان کے قدموں کے قریب زمین کو ہاتھ لگا کر یوں مانگ میں پھیرا جیسے ہندو عورتیں اپنے شوہر کے قدموں کی مٹی مانگ میں بھرتی ہیں۔ اس کی اس حرکت پر میری ہنسی چھوٹ گئی مگر عصمت آپا بھنا کر کھڑی ہو گئیں۔

"تم اس قابل ہو تو نہیں .... ترس کھانا چاہئے' ثواب ملتا ہے۔ اس لئے کہہ رہی تھی۔"

اماں بھی اب اس کی حرکت کو سمجھ چکی تھیں اور اب منہ دبائے ہنس رہی تھیں۔

"آپ نے ترس نہیں کھایا ہے عصمت آپا! نہ آپ کو ثواب ملے گا۔ میں نے چلہ کاٹا تھا جو پورا ہو گیا۔ ڈیڑھ دن کا چلہ تھا۔"

"تم ضرور بڑے ہو کر شاہی بابا بنو گے۔" وہ چیخیں اور کمرے سے باہر چلی گئیں۔

"چچی اماں! میں آپ کا احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔" طیب ان کی ناراضگی سے بے پرواہ کہہ رہا تھا۔

اماں پھر اداس ہو گئیں۔ "طیب! تم تو ہم سب کو پسند ہو مگر تمہاری اماں کا کیا کریں؟ وہ ناکوں چنے چبوا دیں گی اس معصوم فرحت کو۔"

"ارے! فرحت کو ان کے ہتھے کون چڑھنے دے گا؟" پھر وہ میری طرف پلٹا۔ "ضیا! اب تم سب بے فکر ہو کر جاؤ' میں منے دادا اور منی دادی کی حفاظت کر لوں گا۔" اس نے سینہ چوڑا کرتے ہوئے کہا۔

"اے ہاں! تمہارے جانے کی کوئی تک بھی نہ ہو گی۔ اچھا! اب یہ تو بتاؤ کہ اماں باوا کو جواب کیا دو گے؟" اماں کو تشویش ہو رہی تھی۔

"بڑوں کو جواب دینا میری سرشت میں نہیں ہے چچی اماں! مجھے بلاوجہ عصمت آپا

نے بدنام کر رکھا ہے۔ میں بہت نیک اور فرماں بردار بچہ ہوں۔"

"اب زیادہ پھیلو نہیں۔" میں نے اس کی کمر پر دھپ لگایا۔

"اس میں بھائی جی کا بھی بڑا کمال ہے۔ چلہ انہوں نے ہی بتایا تھا۔ کہاں ہیں وہ؟"

وہ یہ کہتا ہوا باہر نکل گیا اور میں نے حیران ہو کر سوچا۔ انیتا دوہرا کردار ادا کر رہی ہے۔ ایک طرف مجھے کہہ رہی ہے کہ دوسری شادی کر لوں اور دوسری طرف اسے چلہ کھینچنے پر لگا دیا۔ غصہ تو آیا مگر کیا کرتا! ہونا تو وہی تھا جو طے ہو چکا تھا۔ میں اماں سے صبح تیاری کا کہہ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔

انیتا اکیلی تھی۔ طیب شاید ادھر نہیں آیا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ سوتی بن گئی۔ صاف لگ رہا تھا کہ جاگ رہی ہے مگر میرے اندر جو طوفان اٹھ رہے تھے' مجھے انہیں ٹھنڈا کرنا تھا۔ سو میں چپ چاپ لیٹ گیا۔

☆-----------☆-----------☆

سویرے ہم نے منے دادا اور منی دادی کو اپنا پروگرام بتایا۔ اماں نے عصمت آپا سے رکنے کو کہا تھا تاکہ کھانے دانے کا پرابلم نہ ہو مگر منی دادی نے کہہ دیا۔ "کیوں بچی کا دل کھٹا کرتی ہو۔ ابھی تو میرے ہاتھ پیر میں دم ہے۔" اور حیرت کی بات یہ کہ جب اماں نے انہیں طیب اور فرحت کے بارے میں بتایا تو وہ جھٹ تیار ہوگئیں کہ فوراً چلی جاؤ۔ وہ خود بھی طیب کی اماں سے جلتی تھیں' ان کو وہ پسند نہ تھیں۔ منے دادا نے بھی گہری نگاہوں سے میری طرف دیکھ کر یوں سرہلا دیا جیسے میں نے عقلمندی کا فیصلہ کیا ہو۔

"منے دادا! آپ ٹھیک ہیں نا! اگر محسوس کرتے ہیں کہ بالکل ٹھیک ہیں تو ہم جائیں گے ورنہ ایسی جلدی نہیں ہے۔" میں نے ان کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"کیا تمہاری دلہن بھی جا رہی ہے؟" انہوں نے سوال کیا۔

"جی دادا!"

"پھر ٹھیک ہے۔"

انہوں نے مطمئن ہو کر کہا اور میں نے ان کی آنکھوں میں عجیب سی چمک اور خوشی محسوس کی جسے میں کوئی عنوان دے سکا نہ معنی..........

عصمت آپا اور انیتا نے ساری تیاری منٹوں میں کرلی تھی۔ ہم سوا دس بجے والی گاڑی سے روانہ ہوگئے۔

☆------------☆------------☆

ہم رات گئے میرٹھ پہنچ گئے۔ مجھے جہاں اس کی خوشی تھی کہ بی جان ہم لوگوں کو خط کے جواب میں اتنی جلدی سامنے دیکھ کر بہت خوش ہوں گی' وہاں اس بات پر دکھ ہو رہا تھا کہ جب بات کئے بغیر انیتا کا تعارف ہوگا تو اس پر کیا گزرے گی! فرحت کا کیا حال ہوگا۔ خالہ بی پر کیا اثر ہوگا' مگر یہ وہ غم اور خوشیاں تھیں جن کا ادراک پہلے ہی ہو جاتا ہے

اور پھر اسی وجہ سے وہ بتدریج اپنی اہمیت کم کر دیتی ہیں۔ سب کے چہرے پر میرٹھ میں اترتے ہی سوچ کی پرچھائیاں سی لہرا رہی تھیں مگر میں نے دیکھا کہ انیتا ہم سب سے زیادہ گھبرا رہی ہے۔ شاید وہ اپنے طور پر اس ساری سچویشن کی ذمے دار خود کو محسوس کر رہی تھی۔

میں نے تانگا لے لیا۔ ہم گھر کے دروازے پر پہنچے تو تاریکی اور سناٹے کا راج تھا اور ان دروازوں کے باہر بھی اتنی ہی وحشت نظر آرہی تھی جتنی شاید اندر ہوگی۔ میں نے بڑی ہمت کر کے ہاتھ بڑھایا اور دروازے کا کنڈا بجا دیا۔ ہلکے سے کھٹکا کیا تھا مگر پوری گلی میں آواز گونج گئی۔ بی جان کا دروازہ کھلنے سے پہلے ہی سامنے والا دروازہ کھلا اور ایک بیس بائیس برس کا گہرے سانولے رنگ کا لمبا چوڑا لڑکا اپنے گھر سے باہر نکل آیا۔ اس کے ہونٹ پان سے سرخ ہو رہے تھے۔ بالوں میں تیل چپڑا ہوا تھا۔ ہلکے گلابی رنگ کا ساٹن کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ مجھے بی جان کا خط یاد آگیا اور کان کی لویں سلگ اٹھیں۔ وہ آواز پر کان لگائے بیٹھا تھا شاید۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ ایسے شرمایا جیسے میں بردکھوے ہی کو وہاں کھڑا ہوں پھر وہ جلدی سے گھر میں چلا گیا۔ اس کے اندر جانے کے بعد مجھے خیال آیا کہ بی جان کا دروازہ کیوں نہیں کھلا! میں نے ایک بار پھر کھٹکا دیا۔

اس بار بی جان کی آواز آئی۔ "کون ہے ذرا پیچھے ہٹ کے روشنی میں کھڑے ہو۔ دکھائی تو دو کون ہو؟"

تب مجھے احساس ہوا کہ ایک چھوٹا مدقوق سا بلب دروازے کی پیشانی پر لگا ہے۔ اماں وغیرہ دیوار کے سائے میں کھڑے تھے اور میں دروازے کی چوکھٹ سے لگا کھڑا تھا۔

"بی جان! میں ضیا ہوں۔ دروازہ کھولئے۔" میرا جملہ پورا بھی نہ ہوا تھا کہ دروازہ کھل گیا اور بی جان ایک قدم آگے آکر مجھ سے لپٹ گئیں۔ بعد میں ان کی نگاہ باقی سب پر پڑی۔ وہ جو مجھ سے لپٹ کر رونے لگی تھیں' سب کو دیکھ کر رونا بھول گئیں۔

"ارے سیدہ..........! میری بچی..........!" وہ اماں سے لپٹ پڑیں۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ سامنے والے دروازے میں جھری بنی ہوئی تھی۔ میرا خون کھول اٹھا۔ "بی جان اندر تو چلئے۔" میں ان لوگوں کو لے کر اندر چلا آیا۔ میری نگاہوں میں تشنگی جلنے لگی۔ صحن خالی تھا۔ گہرا سناٹا تھا جیسے اندر کوئی بھی نہ ہو۔

"لو' میں تو بالکل باؤلی ہوگئی۔ خوشی بھی تو خوف کی طرح ہوتی ہے۔ بوکھلا دیتی

ہے۔" بی جان نے کہا اور عصمت آپا کو لپٹائے ہوئے اندر آگئیں۔ اب تک انہوں نے انجیا پر دھیان نہیں دیا تھا پھر صحن میں روشنی بھی کم تھی۔

وہ ہمیں لے کر اندر داخل ہوئیں۔ چھت پر جانے والی سیڑھیوں پر فرحت بیٹھی تھی۔ گم صم سی.......... اکیلی.......... کسی سائے کی طرح.......... سیاہ ہیولہ لگ رہی تھی۔

"اے فرحت! دیکھو تو کون آیا ہے۔" بی جان کی آواز خوشی سے کانپ رہی تھی۔ سب ہی ساکت رہ گئے۔ سب کو شاید ایک ساتھ یہ خیال آیا تھا کہ بی جان کی خوشی کا سبب کیا ہے اور فرحت سے انجیا کس حیثیت سے ملے گی؟ اور ملے گی تو کیا ہوگا۔

"کون ہے بی جان!" نارمل سی آواز آئی۔

"اے ضیا ہے۔" بی جان کی خوشی کا سبب اب بہت واضح تھا۔ انہوں نے صرف میرا ذکر کیا تھا۔

"ضیاء..........!"

فرحت کی آواز میں لرزش تھی۔ پھر قدموں کی لڑکھڑاہٹ میں میرا دل الجھ الجھ گیا مگر نیچے اترتے ہی' ہمارے سامنے آتے ہی وہ ساکت ہوگئی۔ اس کی نگاہ ہم سب پر سے ہوتی ہوئی انجیا پر جم گئی۔

"تم..........؟"

اس لفظ میں حیرت کے ساتھ ساتھ جان پہچان بھی تھی۔ انجیا فوراً میری آڑ میں ہوگئی۔

"تم.......... کہاں چلی گئی تھیں؟" فرحت نے میرے پیچھے جھانک کر انجیا سے کہا۔

"اے! یہ کون ہے؟" اب بی جان کی نگاہ اس پر پڑی تھی۔ میں فرحت کی بات سن کر اور اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر حیران تھا۔ لگتا تھا فرحت' انجیا کو جانتی ہے۔

"بی جان! اندر تو چلیں۔ خالہ بی کیسی ہیں؟" عصمت آپا ان کا بازو پکڑ کر اندر کمرے کی طرف چل دیں۔

"اے! یہ بیگ اندر اٹھا لاؤ۔ اوس میں بھیگ جائیں گے سب۔ منوں اوس گرتی ہے رات بھر اور یہ فرحت تو شاید چڑے کی بنی ہے۔ ساری رات سیڑھیوں پر بیٹھی رہے تب بھی نہیں بھیگتی۔"

ہم سب اندر آگئے۔ خالہ بی دہشت زدہ آنکھیں لئے بستر پر چت پڑی تھیں۔

ہمیں دیکھتے ہی اٹھ بیٹھیں۔

"ضیا! ارے! کیسا بے مروت ہے تو! اتنے دن میں آیا۔ کہہ کر گیا تھا گیارہ دن میں آؤں گا۔ اے! دنوں کا حساب سالوں میں کھینچ لے گیا۔ جیسے غلیل کھینچتا تا بچپن میں۔"

خالہ بی یہ کہہ کر قہقہہ مار کر ہنسیں اور کتنی ہی دیر ہنستی چلی گئیں۔ ان کی ہنسی ایسی تھی جیسے صحرا میں ہوا کے جھکڑ چل گئے ہوں اور ریت آنکھوں کانوں میں گھسی جارہی ہو۔ سب ساکت رہ گئے۔

"تین دن ہوگئے' یہی کیفیت ہے۔" بی جان کی دھیمی سی آواز آئی۔

"اے بات سن سیدہ!"

خالہ بی نے تیز سرگوشی کی اور اماں کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ اماں بھیگی آنکھیں لئے آگے بڑھ کر ان سے لپٹ گئیں۔ "خالہ بی! ارے اتنی بے بسی میں کیوں زندہ ہو۔ کلیجہ چھلنی کرنے کے سوا تم نے کیا کیا اب تک۔"

اماں یہ کہہ کر بلک اٹھیں۔ خالہ بی پر اثر بھی نہ ہوا وہ بولیں۔ "اے! رات کو تمہارے خالو اس دیوار پر آکے بیٹھ جاتے ہیں۔ بتاؤ تو اتنے بڑھاپے میں ایسی چھچھوری حرکتیں کرتے ہیں۔ مجھے تو شرم آتی ہے۔ بچی..........! اور فرحت سے تو میں نے لاکھ مرتبہ کہا۔ بھاگ جا گھر سے۔ یہ دیواریں تو چاٹ لیں گی۔ ہمارے زمانے میں تو اور اونچی تھیں' بہت اونچی.......... آسمان کے اندر گھسی ہوئی۔ مگر اب تو بہانہ ہے ناکہ اتنی نیچی چھتیں ہیں اور اتنی نیچی دیواریں' چلو بھئی اللہ اللہ خیر سلا۔ دو دن باتیں بنیں گی' تیسرے دن کسی اور کی لونڈیا بھاگ جائے گی تو سب اس کی طرف کو رخ کرلیں گے۔ یہ بھی قصہ نمٹ جائے گا مگر یہ تو بالکل باؤلی ہے۔ یہیں مر جائے گی' میں تو صاف کہہ رہی ہوں' اسی صحن میں دفنا دوں گی۔ کون اتنی دور قبرستان کو جائے گا۔ بھئی! یہیں روٹی پکا کے' یہیں دیا جلایا کریں گے اور روٹی کھا کے سو جائیں گے۔ اسے سمجھاؤ۔ وقت گزر گیا تو دیواروں سے جلانے والے بھی نہ رہیں گے۔ میں تو چلی جاؤں گی۔ میں نہ رکنے کی۔"

خالہ بی بولے جارہی تھیں اور اماں' بی جان' عصمت آپا' حتیٰ کہ انجیا بھی روئے جارہی تھی۔ میرا دل رو رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر انہیں بانہوں میں بھینچ لیا۔ فرحت اب بھی انجیا کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے سے لگ رہا تھا جیسے وہ کچھ کہنا چاہ رہی ہے۔ اس کا دھیان خالہ بی کی طرف بالکل نہیں تھا اور باقی سب کا دھیان اس کی طرف نہیں

تھا۔

"بی جان! آپ تیار ہو جائیں۔ اب آپ یہاں قطعی نہیں رہیں گی۔" میں نے بی جان کے لرزتے وجود کو بھی سمیٹ لیا۔

"ہاں بی جان! اب نہ خالہ بی کا کوئی بہانہ چلے گا نہ کسی اور کا۔ بس یہ آخری بار کہہ رہی ہوں۔ کیوں مجھے گناہ گار کرتی ہیں۔ قبر میں عذاب اٹھاؤں گی میں۔" اماں رو رہی تھیں۔

"نہ بی بی! ایسے نہ کہو۔ اب اور جگہ نہ ہے دل میں۔ سارا تو چھدا پڑا ہے۔" بی جان نے اماں کو سینے سے لگا لیا۔

پتا نہیں، کتنی دیر میں یہ طوفان تھما۔ بی جان کو ہی خیال آیا۔ انھوں نے خالہ بی کو کوئی دوا دی جس نے انہیں جلد ہی غافل کر دیا۔

"حکیم صاحب نے کہا تھا' جب آپے سے باہر ہوں' یہ کھلا دینا۔ سوتی رہتی ہیں تو سکون رہتا ہے۔" بی جان بولیں۔ اتنی دیر میں انہیں کچھ خیال آیا۔ وہ پلٹیں۔ "یہ کس کی بچی ہے؟ عطیہ کی لگ رہی ہے۔"

"نہیں بی جان! انیتا ہے۔ عطیہ تو لندن سے لوٹی ہی نہیں۔" اماں نے گول مول سا جواب دیا۔

"ارے ہاں! میں نے تو سنا تھا' آئی ہوئی ہے۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ بمبئی میں ملی تھیں۔ کہہ رہی تھیں کہ دلی اور میرٹھ بھی جاؤں گی۔ پتا نہیں کون کہہ رہا تھا۔ اب دماغ ہی نہیں چلتا۔" بی جان نے ماتھے کو رگڑتے ہوئے کہا۔

میں انتظار میں تھا' دھماکا ہونے والا تھا' کب......... یہ انتظار تھا۔ یہی خوف سب کے چہرے پر تھا۔ طیب تو آیا نہیں تھا ورنہ شاید اس کے تاثرات سب سے مختلف ہوتے۔ فرحت اب بھی انیتا کو تک رہی تھی۔

"اچھا ہاں.........! تو کون ہے یہ؟ کیا نام بتایا؟" بی جان کو پھر یاد آیا۔

"تم اس دن آئی تو تھیں۔ کہاں چلی گئی تھیں پھر؟" یہ فرحت تھی۔ گم صم سی سپاٹ لہجے میں پوچھ رہی تھی۔ انیتا گھبرا گھبرا کر ہم سب کو دیکھ رہی تھی۔

"اے! تم جانتی ہو اسے۔ میں تو نہ پہچانی۔" بی جان پھر بول اٹھیں۔

"ہاں بی جان! اس دن جب میں بیمار ہو گئی تھی نا۔ جب ضیا آئے ہوئے تھے

وہ.........." اب فرحت نے براہ راست مجھ سے کہا۔ "آپ تھے نا اس روز' چاندنی میں.......... چھت پر.........." پھر وہ گھبرا کر چپ ہو گئی۔ شاید اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ بہت غلط بات کرنے والی تھی مگر میں.......... میری حالت اس سے بھی زیادہ خراب ہو گئی۔ مجھے وہ دن نہیں بلکہ وہ رات یاد آ گئی جب میں نے فرحت کو چھت پر بلایا تھا کہ میں اس سے اظہار کا فیصلہ کر چکا تھا تبھی وہ آئی تھی مگر وہ فرحت کب تھی۔ فرحت کے روپ میں زیو سا تھی جس نے خود کو میرے سپرد کر کے جہاں مجھے نئے سرور سے آشنا کیا تھا' وہاں میرے ضمیر میں گناہ کا بیج بھی بو دیا تھا۔ احساس جرم کو پیدا کر دیا تھا مگر وہ تو زیو سا تھی۔ اس نے اعتراف بھی کر لیا تھا اور یہ.......... یہ تو انیتا ہے۔ میں نے چونک کر انیتا کی طرف دیکھا۔ وہ زمین میں نگاہیں گاڑے کھڑی تھی اور فرحت کے چہرے پر پہچان لئے جانے کا یقین ہی یقین تھا۔

"اسے یہ کہاں؟ وہ کوئی اور ہو گی۔ یہ تو بمبئی سے آئی ہے۔" اماں نے جلدی سے کہا۔

انیتا نے جھرجھری سی لی اور مسکرانے لگی۔ اب وہ نارمل تھی۔ فرحت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرا رہی تھی۔ اس کے یقین کو متزلزل کر رہی تھی اور میں بھنور میں تھا۔ بہت سی باتیں مجھے یاد آ رہی تھیں۔ اس روز اس انجان جسم کی خوشبو' وہ خود سپردگی' وہ نشہ اور پھر انیتا سے ملاپ کی پہلی رات' اس کے جسم کی خوشبو تو اب تک میرے دماغ میں بسی ہوئی تھی۔ آج میں نے سوچا تو دونوں ایک ہی لگیں۔ مگر.......... یہ.......... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ مجھے چکر آ گیا۔ میں لڑکھڑایا تو انیتا نے جلدی سے مجھے سہارا دیا اور سرگوشی کی۔

"مجھے لگتا ہے فرحت پر بھی دورے پڑنے لگے ہیں۔"

"اے ناں! اللہ نہ کرے۔ ایسا ہو گیا تو ضیا.......... میں تو کھڑے کھڑے مر جاؤں گی۔ اسے حکیم کو تو دکھاؤ۔" اماں نے سرگوشی سن لی تھی۔

"نہیں اماں! وہ.......... وہ ٹھیک ہے۔" میں نے یقین سے بھرپور لہجے میں کہا تو انیتا کانپ اٹھی۔

"اے عصمت! بٹھاؤ تو اسے۔ جب سے کھڑی ہے' اور فرحت.......... جاؤ تم کھانے کا کچھ کرو۔ سب تھکے ہارے آئے ہیں۔" فرحت تیزی سے باہر چلی گئی۔ انیتا خود

ہی پلنگ پر ڈھے سی گئی۔

میں سیدھا باہر نکل گیا۔ فرحت کچن میں تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ "فرحت! تم جو کہہ رہی ہو' وہ سچ ہے کیا؟"

"میں........ میں جھوٹ کیوں بولوں گی؟" اس نے نگاہیں چراتے ہوئے کہا۔

"میری طرف دیکھو۔" میں نے سارے تکلفات چھوڑ کر اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔

"چھو........ چھوڑیں تو........ یہ کیا........" وہ گھبرا گئی۔

"میری بات کا جواب دو۔" میں نے سخت لہجے میں کہا تو فرحت نے چونک کر مجھے دیکھا۔

"ہوا کیا ہے آپ کو؟" وہ حیران ہو کر بولی۔ "اگر سچ بھی ہے تو اس میں آپ........"

"دھوکا ہوا ہے مجھے۔ برباد ہو گیا ہوں میں۔" میں پھٹ پڑا۔

"کک........ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

"میں بتاتی ہوں ضیا!"

اچانک مجھے اپنی پشت پر سے آواز آئی۔ یہ انیتا تھی جو سپاٹ چہرہ لئے میرے پیچھے کھڑی تھی۔

"تم........!"

"ہاں ضیا! میں........ میں........ زیوسا ہوں۔"

یہ کتنا بڑا دھماکا تھا شاید آپ جان ہی نہ سکیں۔ میرے وجود کے پرخچے اڑ گئے تھے۔ وہ میری بیوی تھی۔ میرے گھر کی' میرے خاندان کی تباہی کی ذمے دار' بابا کی قاتل' رابرٹ' جینو' سورن سنگھ' پپاس کو جس نے شدید اذیت میں مبتلا کر رکھا تھا۔ وہ جس نے بڑی بوا' تحسین خالہ اور تایا کی جان لی۔ فرحت کی ماں کی قاتل آج میری بیوی تھی۔ جس کے ساتھ میں نے اپنے ڈھیر سے دن گزار دیئے اور مجھے پتا ہی نہیں چلا۔ وہ انیتا کے روپ میں مجھے دھوکا دے گئی۔ میں نے جھپٹ کر اسے بالوں سے پکڑ لیا۔ فرحت کے منہ سے چیخ نکل گئی مگر اس نے اپنا منہ بھینچ لیا۔

"چپ رہو فرحت! تمہیں نہیں پتا یہ کون ہے۔ چپ رہو۔" پھر میں اس کی طرف پلٹا۔ "تم نے انیتا کے ساتھ کیا کیا........ جلدی بولو۔"

"وہ........ وہ! ایکسیڈنٹ میں مرگئی تھی ضیاء۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ صرف اس کا روپ اختیار کرلیا کہ تم تک پہنچنے کا ایک ہی ذریعہ تھا۔" وہ منمنائی۔

"اور........ آکا باگیا؟"

"وہ موریلا مندر کا پجاری تھا۔ صدیوں سے قید۔"

"جینو ٹھیک ہو گیا اور باقی سب؟" میں سوال پر سوال کر رہا تھا اور فرحت آنکھیں پھاڑے مجھے تک رہی تھی۔

"اور........ اور بولو........" میں نے اس کے بال کھینچ کر ایک اور جھٹکا دیا۔

"سب ٹھیک ہو گئے ہیں۔ وتسلا کو مار دیا میں نے کہ وہ نیا عذاب نازل کرنے والی تھی تم لوگوں پر۔ شالی نیپال کی پہاڑیوں سے اب کبھی واپس نہیں آئے گا۔ اس نے مینے دادا کو گرفت میں لے لیا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے انہیں بچایا ہے۔ ضیا! یقین کرو' میں تمہاری دشمن نہیں ہوں۔ تم........ فرحت سے شادی کرلو۔ میں کچھ نہیں کروں گی۔ میں........ میں تو خدمت کروں گی۔ میں فرحت کو بھی چاہتی ہوں۔ بہت پیار کرتی ہوں کہ اس نے بھی تمہارے ساتھ مل کر بچپن میں میری حفاظت کی تھی۔ میں صرف تمہارے قریب رہنا چاہتی ہوں۔"

"تم نے مجھے دھوکا دیا۔ میرے پورے خاندان کو تباہ کردیا۔ میرے باپ کو مار دیا۔" میں نے دانت کچکچا کر کہا۔

"وہ سب جھوٹ ہے جو تمہیں شالی بابا نے بتایا۔ وہ بھی جھوٹ ہے جو وتسلا نے بتایا۔ یہی دونوں تھے جو ایلین کا نام لے کر اور مجھ سے منسوب کرکے جھوٹ بولتے رہے۔ میں نے عطا کو نہیں مارا تھا' وہ خود کشی کرکے مرگیا۔ اس کا ضمیر زندہ تھا۔ اس کی موت کے بعد میں غصے میں آئی تھی۔ میں نے رابرٹ وغیرہ کو اسی لئے سزا دی تھی کہ وہ سب مردہ ضمیر تھے۔ انہوں نے ایلین جیسی معصوم لڑکی کو تباہ کرکے اذیتیں دے کر مار دیا تھا۔ وہ سب سزا کے مستحق تھے۔ ضیا یقین کرو۔ عطا میرے لئے دوست تھا اس لئے کہ اس نے وہ زنجیریں ان لوگوں سے اس لئے ہی لی تھیں کہ وہ انہیں ایلین کی قبر تک پہنچانا چاہتا تھا۔ وہ سب جھوٹے ہیں۔ خدا کے واسطے میری بات پر یقین کرو۔"

پتا نہیں اس وقت کیوں مجھے یہ احساس ہوا کہ وہ سچ بول رہی ہے۔

"تم یقین نہیں کرتے تو میں خود تمہیں دکھا دوں گی۔ میں ثابت کروں گی کہ میں

چکی ہوں۔ مجھے صرف اپنے پاس رہنے دو۔ فرحت تمہاری ہے۔ اسے اپنالو۔"

"اور اب طیب کو کیا جواب دوں گا۔" میرے دل کے اندر کہیں وہ ضیا بیٹھا تھا جو فرحت کو آج بھی اپنی ملکیت بنانا چاہتا تھا۔

"وہ چلا جائے گا بمبئی۔ اسے مونیکا مل جائے گی۔ وہ فرحت سے پیار نہیں کرتا۔ جذباتی ہے۔ اس کا ذہن پلٹ جائے گا ضیاء۔ اس کی فکر نہ کرو۔ میں ازالہ کرنے آئی ہوں۔ ازالہ کروں گی ضیاء مگر پلیز' مجھے خود سے جدا مت کرو۔"

میں نے اسے چھوڑ دیا۔ فرحت کو سختی سے منع کردیا کہ وہ کسی کو کچھ نہ کہے۔ انیتا میری شکر گزار تھی کہ میں نے کسی کو کچھ نہ بتایا۔

اور مجھے اس وقت حیرت ہوئی جب خالہ بی دیکھتے ہی دیکھتے اچھی ہو گئیں۔ مبشر کے والد نے آکر بتایا کہ حویلی پر رنگ کرا دیا گیا ہے۔ میں نے پوچھا کہ کس نے کہا تھا تو انہوں نے بتایا کہ عطا خواب میں آکر کہہ گئے تھے کہ گھر والے آرہے ہیں حویلی کو ٹھیک ٹھاک کرا دو۔ اس رات اماں نے بھی ابا کو خواب میں دیکھا اور صبح بتایا کہ وہ کہہ رہے ہیں حویلی تیار ہے' لوٹ آؤ۔ میں اسی وقت حویلی گیا۔ اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ خالی حویلی میں بھی بڑی رونق تھی۔ صاف ستھری حویلی دیکھ کر بالکل نہیں لگ رہا تھا کہ یہ اتنے عرصے سے خالی اور ویران تھی۔ اماں تو بہت خوش تھیں۔ جب میں نے انہیں وہاں لے کر چلنے کا قصد کیا سب سے زیادہ خوش بی جان تھیں۔ ابھی تک اماں اور عصمت آپا نے نہیں یہ نہیں بتایا تھا کہ انیتا میری بیوی ہے۔ وہ جب پوچھنے کی کوشش کرتیں' دوسرا ٹال جاتا اور کوئی بات نکال لیتا۔ میں اماں کو حویلی لے کر گیا تو اماں نے کہا۔

"کیا کروں ضیا! میری تو ہمت ہی نہیں ہو رہی بی جان کو کچھ بتانے کی۔ وہ یہی سمجھ رہی ہیں کہ ہم رشتے کی بات ہی کرنے آئے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا کروں۔"

"میں آج خود بات کروں گا اماں! آپ ابھی انہیں کچھ نہ بتائیں۔ بس پوچھیں تو کہہ دیں' میری بچی ہے اور کچھ نہ کہیں۔"

میں دراصل پہلے فرحت سے صاف بات کرنا چاہتا تھا۔ وہ تبھی سے گم صم تھی کہ بہرحال اسے حقیقت کا اندازہ ہو چکا تھا۔ پھر وہ ابھی پوری طرح بات سمجھی بھی نہیں تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہی ہے۔ اسی رات بلکہ شام کو میں نے فرحت کو اس کے

کمرے میں اس وقت روک لیا جب وہ نماز پڑھنے کے بعد باہر آرہی تھی۔

"مجھے تم سے بات کرنی ہے فرحت!"

"کیا بات کریں گے؟" وہ بجھے بجھے انداز میں بولی۔

"بہت سی باتیں کرنی ہیں۔"

"بہت ضروری ہے؟" وہ بہت دکھی تھی۔

"بہت ضروری ہے فرحت! کچھ دیر بیٹھ جاؤ۔"

اس نے میری طرف دیکھا پھر پلنگ پر سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ میں نے اس کے سامنے ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"جانتی ہو' انیتا کون ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ.......... اب یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"یہ بتانا بہت ضروری ہے فرحت! وہ میری بیوی ہے۔" اتنا کہہ کر میں نے اس کے چہرے پر رد عمل دیکھنا چاہا مگر وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ ویسے ہی سر جھکائے بیٹھی تھی۔

"لیکن یہ شادی میں نے حالات کی سنگینی سے بچنے کے لئے کی تھی۔ آج یہ بات کھلی ہے کہ وہ زیوسا ہے جس نے انیتا کے مرنے کے بعد اس کا روپ اختیار کرلیا۔ گویا میرے ساتھ صرف ایک روح ہے۔ وہی روح جس کی وجہ سے میرا خاندان تباہ ہوا۔ بہت سی باتیں تم زیوسا سے سن چکی ہو' سمجھ بھی گئی ہوگی مگر میں صرف اتنا بتانا چاہتا ہوں کہ مجھے یہ شادی کیسے اور کیونکر کرنا پڑی۔"

اتنا کہہ کر میں نے بمبئی میں پیش آنے والے تمام حالات اسے بتا دیئے۔ وہ چپ چاپ سنتی رہی۔

"پلیز فرحت! میرا ساتھ دو۔ میں بہت ٹوٹ چکا ہوں۔ میں.......... میں تم سے بھی اظہار نہیں کرسکا مگر فرحت! میں اپنا ہر لمحہ تمہارے نام کرنا چاہتا ہوں۔ بولو' میں بی جان سے بات کروں؟"

"کیا آپ کو یقین ہے کہ وہ انیتا کی موجودگی میں مان لیں گی؟" اس نے الٹا مجھ سے سوال کرلیا۔ "آپ یہ سب کچھ انہیں تو نہیں بتا سکتے ناں!"

"کیوں نہیں بتا سکتا؟"

"انہیں دکھ ہوگا اور وہ شاید یہ یقین بھی نہ کریں کہ یہ انیتا نہیں' زیوسا ہے۔"

"اس کی تم دونوں فکر مت کرو۔" آواز دروازے کے قریب سے آئی تھی۔ انیتا دروازے سے اندر داخل ہو رہی تھی۔

فرحت گھبرا کر کھڑی ہوگئی۔ باہر جانے لگی۔ زیوسا نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ تھام لئے اور بولی۔ "فرحت! تم عورت ہو' میرا دکھ سمجھ سکتی ہو۔ پلیز.........! مجھے غلط مت سمجھو۔ ضیاء تمہارا ہے اور تمہارا رہے گا۔ اس کے لئے میں بڑی سے بڑی قربانی دے سکتی ہوں۔ مجھے تم بھی اتنی ہی پیاری ہو جتنا خود ضیا! اس لئے کہ اس کے دل و دماغ میں تم بستی ہو۔ بی جان سے آج رات میں بات کروں گی۔"

فرحت نے سر اٹھا کر اسے دیکھا' اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ "کہتی ہو کہ میں عورت ہوں' دکھ سمجھ سکتی ہوں پھر بھی مجھ سے توقع رکھتی ہو کہ میں تمہارے راستے میں آؤں گی؟ جسے تم نے اتنی مشکلوں سے حاصل کیا ہے۔ اسے تم سے کیسے چھین لوں؟ میری فکر مت کرو زیوسا......... بس یہ سب کچھ جو ہوتا رہا اور جو ہو رہا ہے اسے.......... اسے ٹھیک کردو۔ ضیا کو عذابوں سے نجات دلا دو۔ یہی میرے لئے کافی ہے۔"

زیوسا نے آگے بڑھ کر فرحت کو سینے سے لگا لیا۔ فرحت رو دی۔ میں عجیب سی کیفیت میں مبتلا ہوگیا۔ مجھے پہلی بار زیوسا سے ہمدردی محسوس ہوئی۔ یوں تو اس نے اب تک کے حالات کی جو تفصیل بتائی تھی' اس نے میرا دل صاف کردیا تھا مگر پھر بھی میں رسک لینے کو تیار نہیں تھا۔

اسی رات میں نے وہی خواب دیکھا جو بچپن سے دیکھتا چلا آیا تھا۔ وہی قبرستان تھا۔ وہی سیاہ وین تھی اور اس میں بابا کے ساتھ دوسرے دوست بھی تھے مگر اب باقی دوست یعنی رابرٹ' پپاس زیگو' جینو بابا ریکو اور سورن سنگھ چاروں وین کے قریب کھڑے تھے۔ صرف بابا آگے بڑھے۔ میں ویسے ہی درختوں کی اوٹ سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ اچانک بابا میری طرف رخ کرکے مسکرائے اور انہوں نے اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ میں ڈرتے ڈرتے ان کے قریب پہنچا تو انہوں نے کہا۔

"ضیا بیٹا! زیوسا ٹھیک کہتی ہے۔ تم نے اسے زنجیر دے کر اچھا کیا۔ آؤ دوسری زنجیر میرے پاس ہے۔ میں رابرٹ سے لے چکا تھا۔ آؤ' ہم یہ دونوں زنجیریں ایلین کے تابوت میں رکھ دیں۔"

پھر بابا نے بڑی آسانی سے قبر کی تمام مٹی ہٹا دی۔ میرے سامنے منقش تابوت تھا۔

بابا نے جب تابوت کھولا تو سولہ سترہ سال کی معصوم سی لڑکی کی لاش اس میں رکھی تھی۔ اس نے سیاہ لباس پہنا ہوا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ سینے پر بندھے ہوئے تھے۔ بابا نے وہ دونوں زنجیریں اس کی کلائیوں میں ڈال دیں۔ ہم نے تابوت بند کردیا اور اس جگہ سے پلٹ آئے۔ بابا کہہ رہے تھے۔

"یہ سب کچھ کرنے کی تحریک سورن سنگھ نے دی تھی۔ وہ اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے ضیاء۔"

"کیا مطلب؟" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"وہ اب دنیا میں نہیں ہے۔"

"اس نے یہ سوچ کر تمہیں نہیں بتایا کہ تم اس سے بدگمان ہوجاؤ گے۔ جاؤ بیٹا! اسے ہمدردی کی ضرورت ہے۔ اسے تم سے پیار ہے' وہ بھی تمہیں نقصان نہیں پہنچائے گی۔ وہ وتسلا کی عیاریوں اور شالی کی بداعمالیوں سے جکڑی گئی تھی۔ اب سب ٹھیک ہے۔ جاؤ' خدا تمہیں خوش رکھے۔"

پھر میری آنکھ کھل گئی۔ بی جان میرے سرہانے بیٹھی رو رہی تھیں۔ میں اچھل کر اٹھ بیٹھا۔ "کک......... کیا ہوا بی جان؟"

"بیٹا! مجھے انیتا نے سب کچھ بتا دیا۔ تو کیوں دل میں لئے پھرتا رہا۔ پگلا......... میں کیا یقین نہ کرتی؟"

"اوہ' بی جان.........؟ آپ کیا......... شاید میرے ساتھ ہونے والے حادثوں پر کوئی بھی یقین نہ کرے۔"

"تو نہ کرے بیٹا! ہمیں کسی سے کیا لینا ہے؟"

"بی جان! کیا......... کیا آپ فرحت کو........." میں دانستہ چپ ہوگیا۔

"ہاں بیٹا! وہ تمہاری امانت ہے۔ اسے لے کر ہی جانا۔ مجھ سے اب یہ بوجھ ڈھویا نہیں جاتا۔"

☆--☆

اور پھر قارئین! میں نے فرحت سے شادی کرلی۔ ہم دہلی لوٹ کر آئے تو پتا چلا کہ یب بمبئی جاچکا ہے حالانکہ میں یہ سوچ کر پریشان ہوتا رہا تھا کہ طیب کو کیا جواب دوں گا یہاں آکر پتا چلا کہ ناصر چچا اور ان کی بیوی آئے تھے اور طیب کو لے گئے۔ انہوں نے

اس کی شادی کسی مونیکا نامی لڑکی سے طے کردی تھی۔ طیب یہ سن کر ایک منٹ بھی نہیں رکا اور خوشی خوشی بمبئی چلا گیا۔

انہی دنوں پاکستان بن گیا۔ میں انیتا' زیوسا' اماں' عصمت آپا اور منے دادا' منی دادی کو لے کر پاکستان میں چلا آیا۔ منے دادا اور منی دادی فرحت کو میرے ساتھ دیکھ کر حیران ضرور ہوئے تھے مگر جب میں نے انہیں بتا دیا تو وہ خاموش ہوگئے۔ منے دادا نے شالی بابا سے رابطہ توڑ لیا تھا کیونکہ بقول ان کے شالی بابا نے انہیں ایک عمل بتایا تھا جس سے انیتا مکڑی میں تبدیل ہوجاتی اور اس مکڑی کو پکڑ کر شالی بابا کے حوالے کرنا تھا۔ جب انہیں میں نے سب کچھ بتایا تو وہ یقین نہیں کر رہے تھے مگر انیتا نے اپنے عمل سے ثابت کردیا کہ وہ غلط نہیں ہے۔ جو کچھ بھی ہمارے ساتھ ہوا' اس میں سراسر و تسلا کا ہاتھ تھا۔

ہاں' تو میں بتا رہا تھا کہ ہم پاکستان چلے آئے۔ کچھ عرصے بعد ناصر چچا وغیرہ بھی سب کو لے کر پاکستان آبسے۔ اماں کا یہاں آنے کے تیسرے برس انتقال ہوگیا۔ وہ بہت بیمار رہیں اور ان کی خدمت میں انیتا نے دن رات ایک کردیئے۔ فرحت اب بھی بجھی بجھی تھی حالانکہ انیتا بہت محتاط رہتی تھی مگر پتا نہیں اسے اب کیا غم تھا کہ جو اندر ہی اندر اسے گھلا رہا تھا۔ اماں کے انتقال کے فوراً بعد ہی فرحت بیمار پڑ گئی۔ انیتا اس کی خدمت میں لگ گئی۔ عصمت آپا کی میں نے پاکستان آتے ہی ایک میجر سے شادی کروی تھی جو اسی محلے میں رہتا تھا جہاں ہم نے آکر قیام کیا تھا۔ وہ گھر عصمت آپا کو دے دیا تھا اور خود یہاں چلا آیا تھا۔ یہ مکان انیتا نے.......... سوری! اب میں اسے زیوسا کہوں گا۔ تو یہ مکان زیوسا نے پسند کیا تھا۔ منی دادی اور منے دادا بڑا عرصہ ہمارے ساتھ رہے۔ پھر ناصر چچا آکر انہیں لے گئے۔ ان کے انتقال کو بھی اب برسوں گزر چکے تھے۔ بی جان تو شاید فرحت کے بیاہنے کے انتظار میں تھیں۔ پاکستان بننے سے پہلے ہی ہم سے منہ موڑ گئیں۔ خالہ بی ان کے پیچھے ہی روانہ ہوگئیں۔ میری زندگی کا سب سے بڑا حادثہ فرحت کی موت تھی۔ ہاں..........! فرحت گھل گھل کر مرگئی حالانکہ میں نے اسے ٹوٹ کر چاہا تھا۔ ہر لمحہ اسے خوشی پہنچانے کی سعی کرتا رہا مگر.......... ممکن ہے' وہ زیوسا کو الزام دیتی ہو مگر یہ حقیقت ہے کہ زیوسا نے اپنا حق ادا کردیا۔ اس نے واقعی جو غم دیئے تھے' ان کا ازالہ کردیا تھا میرے گھر کے ہر معاملے کو سنبھالا۔ عصمت آپا کی شادی کی۔ منی دادی اور منے دادا کی خدمت کی۔ اماں کی خدمت کی' پھر فرحت کی تمام دیکھ بھال کرتی رہی۔ ایک پل کو بھی

سکھ کا سانس نہیں لیا تھا اس نے۔

آخری لمحوں میں فرحت نے مجھے بلا کر کہا تھا۔ "جانتے ہیں مجھے کیا دکھ ہے؟"

"نہیں فرحت! میں نہیں جانتا۔ پلیز' تم کیوں دکھ پال رہی ہو۔ اب کیا کمی ہے' کیا بات ہے' میں تو ہر لمحہ تمہاری نذر کرچکا ہوں۔"

"یہی دکھ ہے مجھے۔ زیوسا نے آپ سے پیار کیا' وہ کہاں سے کہاں آگئی' اس نے کتنی بڑی بڑی قربانیاں دیں اور.......... اور آپ اس سے بات تک نہیں کرتے۔ زیوسا نے مجھے کہا تھا ناکہ تم عورت ہو۔ میرا دکھ جان سکتی ہو تو ضیا.......... وہی دکھ ہے جو مجھے انیتا اور آپ کے درمیان حائل ہونے سے روکتا ہے۔ مگر آپ.......... آپ عدالت نہیں کرپاتے۔ انصاف نہیں دے پاتے۔ پلیز ضیا! اس کا خیال رکھیے گا۔ آپ کو.......... آپ کو پتا ہے کہ وہ.......... ماں بننے والی ہے؟؟"

یہ سن کر میں اچھل پڑا تھا۔ "کک.......... کیا کہہ رہی ہو تم!؟"

"ہاں! آپ نے تو اس پر نگاہ ڈالنا بھی گناہ سمجھ لیا ہے۔ وہ آپ کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ اس کو آپ کے پیار کی ضرورت ہے۔ ضیاء! اب میں.......... میں حائل نہیں رہوں گی۔ اس کا خیال رکھیے گا۔"

یہ آخری گفتگو تھی ہمارے درمیان پھر فرحت اسی رات چپکے سے ہماری راہ چھوڑ گئی۔ عجیب ہو جاتی ہے کبھی کبھی یہ عورت دیوار بن جاتی ہے اور کبھی..........

فرحت کی موت کے بعد زیوسا نے مجھے کہا تھا کہ فرحت کے جسم کو نہ دفناؤ۔ اس نے کہا کہ وہ اس کی حفاظت کرے گی مگر مجھے یہ بات بہت فضول لگی تھی۔ میں یہ تو سوچ نہیں سکتا تھا کہ وہ غم کی انتہائی حد پر ہے اس لئے ایسا کہہ رہی ہے اور پھر یہ کب ہوا ہے کہ جو مرگیا ہو' اسے گھر کے کسی کمرے میں محفوظ کرکے رکھا گیا ہو۔ یہ بات مذہب کے بھی خلاف تھی میں نے زیوسا کے اصرار کے باوجود اسے دفنا دیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے بعد زیوسا بہت غمزدہ رہنے لگی تھی۔ فرحت کی جدائی میرا سب سے بڑا غم تھا مگر زیوسا نے اسے بہت جلدی کم کردیا۔

وہ اب بھی مجھے یہ بتانے پر تیار نہ تھی کہ وہ میرے بچے کی ماں بننے والی ہے مگر اب میں جان گیا تھا۔ جب میں نے اسے کہا کہ میں یہ بات جانتا ہوں تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی اور بولی۔

"پھر ضیا! آپ نے فرحت کی باڈی کیوں نہیں رکھ لی!"

میں حیران رہ گیا۔ "اس بات سے فرحت کی باڈی کا کیا تعلق؟"

"ہے ضیا! ہے تعلق۔ میں اس کے روپ میں ساری زندگی آپ سے محبت پاتی رہتی۔ آپ کی آنکھوں کے سامنے رہتی۔"

"مگر اس کے لئے تمہیں فرحت کا روپ لینے کی ضرورت نہیں۔ تم اب بھی میرے سامنے ہو۔"

"نہیں! صرف چند دن اور ہیں ضیا! میں نے آپ کو بتایا نہیں تھا کہ میں انیتا کے جسم کو زیادہ عرصے استعمال نہیں کرسکتی۔ اس کی مدت پوری ہونے والی ہے۔ وہ کرسچن تھی جبکہ میں مسلمان ہوچکی ہوں۔ اب مجھے یہ جسم چھوڑنا ہے اور اگر مجھے وقت پر کوئی جسم نہ ملا تو میں کبھی پھر کسی کا روپ اختیار نہیں کرسکوں گی۔ تب.......... آپ کا بچہ بھی.......... کسی انسانی روپ میں نہیں آسکے گا۔"

یہ بات میرے لئے پریشان کن تھی مگر اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ زیوسا کا کہنا تھا کہ زمین کو سونپ دیئے جانے والی وہ کوئی میت استعمال نہیں کرسکتی اور وقت بہت کم ہے کہ کسی ایسی عورت کے مرنے کا انتظار کیا جاسکے جو میرے ساتھ بحیثیت بیوی کے رہ سکے اور اس کی یہ حیثیت کسی کے لئے مسئلہ پیدا نہ کرے۔ اگر زیوسا مجھے پہلے ہی یہ بات بتادیتی تو شاید میں سنجیدگی سے سوچتا مگر زیوسا کی بات بھی ٹھیک ہے کہ وہ فرحت کی زندگی میں ایسی بات کیسے کرسکتی تھی۔

تو پھر یہ ہوا کہ ایک اذیت ناک رات آئی اور زیوسا کو انیتا کا جسم چھوڑنا پڑا۔ وہ سب کی نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔ انیتا کا مردہ جسم دفنا دیا گیا۔ لوگ سمجھے میری دوسری بیوی بھی مرگئی مگر زیوسا میرے ساتھ ہے میرا ایک بیٹا بھی ہے' جسے میں تو دیکھ سکتا ہوں مگر وہ اور زیوسا.......... میرے علاوہ کسی کو دکھائی نہیں دیتے۔ لوگ مجھے خوش و خرم' ہنستا مسکراتا دیکھ کر پاگل سمجھتے ہیں۔ سوچتے ہیں کہ یکے بعد دیگرے دو بیویوں کی موت نے مجھے پاگل کردیا ہے مگر نہیں جانتے کہ زیوسا نے مجھے ہر غم سے دور کردیا ہے۔ فرحت کی موت کا صدمہ یقیناً بڑا خوفناک تھا اور ایک عرصے تک میں حواس باختہ بھی رہا تھا مگر زیوسا نے دھیرے دھیرے مجھے دکھ کے اس بھنور سے نکال لیا۔"

☆==================☆==================☆

قارئین! وہ کہانی سنا کر گہرا سانس لے کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے۔ "جی مسیحا جی! کہئے! کیسی لگی یہ طویل کہانی۔ ویسے قارئین کیا کہتے ہیں اس بارے میں؟"

"قارئین تو بہت پسند کر رہے ہیں شاہ بابا! لیکن یہ بتایئے کیا میں زیوسا سے بات بھی نہیں کرسکتی؟"

"ہوں..........! بات تو کرسکتی ہیں بلکہ میرے بیٹے سے بھی بات کرسکتی ہیں۔ مگر پلیز! ان سے کہانی نہ پوچھنے بیٹھ جایئے گا۔ دوسری بات یہ بھی کہ اگر آپ میری کہانی کو غلط یا جھوٹ سمجھ کر زیوسا سے ملنا چاہتی ہیں تو آپ اپنا اطمینان کرلیں مگر.........."

"نہیں شاہ بابا! میں قطعی اسے جھوٹ نہیں سمجھ رہی کیونکہ میں نے ابھی.......... اور شروع میں بھی زیوسا کی موجودگی کو محسوس کرلیا تھا۔ ممکن ہے دوسرے لوگ اس کی صداقت کو نہ سمجھیں۔"

"مجھے اصرار بھی نہیں ہوگا یہ تو حسنین نے آپ کو میرے پیچھے لگا دیا ورنہ میں اپنی دنیا میں مگن ہوں۔ آپ بیٹھیں' میں زیوسا کو بلا کر لاتا ہوں۔"

کچھ دیر بعد ضیا صاحب المعروف شاہ بابا کمرے میں واپس آئے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے انہوں نے اپنی گود میں کسی کو اٹھایا ہوا ہے۔ ان کا بازو ہوا میں بالکل اسی ڈھب سے مڑا ہوا تھا جیسے ہمارا بازو بچے کو گود میں لیتے ہوئے مڑا ہوتا ہے۔

"آؤ زیوسا!" انہوں نے اپنے پیچھے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا۔

میرے بدن میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ میں سخت ہراساں بھی تھی اور خود کو بہت ہمت دلا رہی تھی کیونکہ آج میرے ساتھ میری زندگی کا سب سے اہم واقعہ ہونے والا تھا۔ میں ایک ایسی ہستی سے ہمکلام ہونے والی تھی جو یونان کی دیوی کی حیثیت سے تاریخ کے صفحات پر محفوظ تھی اور ہے اور وہ نظروں سے اوجھل تھی۔ کسی نگاہ سے اوجھل ہستی سے بات کرلینے کا خیال بڑا خوفناک بھی اور بڑا ایکسائٹنگ بھی تھا۔

ضیا صاحب میرے سامنے صوفے پر بیٹھ گئے پھر ان کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ شاید میرا رنگ فق ہو رہا تھا۔ وہ چونکے۔

"آپ ڈر رہی ہیں کیا؟"

"ن.......... نہیں تو.........." میں نے تھوک نگل کر خشک حلق کو تر کرنے کی

کوشش کی۔

"زیوسا! یہ تم سے بات کرنا چاہتی ہیں۔" انہوں نے اپنے برابر میں ایسے دیکھا جیسے کسی سے مخاطب ہوں۔

"کیسی ہیں آپ؟"

ایک مترنم اور عجیب کھنکتی سی آواز نے مجھے ساکت کر دیا۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے پھر مجھے اس کی ہنسی کی آواز سنائی دی۔

"میں......... ٹھیک ہوں۔ میں......... آپ کو دیکھنا چاہتی تھی۔" بہ مشکل میرے منہ سے نکلا۔

"اس پر مجھے دسترس نہیں ہے ورنہ میں آپ کی خواہش ضرور پوری کرتی۔"

"یہ لیں سیما! ہمارے بیٹے سے ملیں۔" اتنا کہہ کر ضیا صاحب نے صوفے پر بیٹھے بیٹھے ایسے فرش کی طرف ہاتھ کئے جیسے اپنی گود سے بچے کو اتار کر قالین پر بٹھا رہے ہوں۔ "جاؤ بیٹا' آنٹی کو سلام کرو۔"

میرے بدن میں چیونٹیوں کی تعداد بڑھ گئی۔ ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ چند ہی لمحے بعد دو ننھے ننھے ہاتھوں نے میرے گھٹنے تھام لئے اور وہ ہاتھ زور دے کر یوں میرے ہاتھوں تک آئے جیسے گھٹنے چلنے والا بچہ میرے گھٹنوں پر زور دے کر کھڑا ہو گیا ہو اور میرے ہاتھ تھامنے کی کوشش کر رہا ہو۔"

یقین کیجئے' میرا دل چاہا کہ میں ایک زوردار چیخ مار کر باہر کی طرف بھاگ پڑوں مگر حسنین بھائی جو میرے ساتھ تھے مجھے گھورنے لگے اور میں نے دونوں ہاتھ بڑھا دیئے جنہیں ننھے منے ہاتھوں نے تھام لیا۔ ضیاء صاحب کی ہنسی کے علاوہ ایک اور کھنکتی ہوئی ہنسی بھی گونجی اور بڑی معصوم سی "غیں غوں' آ......... بو......... با" کی آواز بھی آئی اور بچہ قلقاری مار کر ہنس پڑا جیسے ماں باپ کا ساتھ دے رہا ہو۔

یہ آخری سطریں لکھتے ہوئے میرے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ یہ میری زندگی کا عجیب ترین لمحہ تھا۔ جسے میں کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ اس میں کال بیل کا کیا ذکر تھا جو میں نے کہانی کا عنوان رکھ دیا وہ بھی سن لیجئے کیونکہ یہ بات مجھے شروع شروع میں ضیا صاحب نے کہی تھی کہ اس کا عنوان کال بیل رکھئے گا۔ میں نے ان سے آخری ملاقات کے اختتام پر پوچھا تو

انہوں نے جواب دیا۔

"اس لئے کہ جو دائیں ہاتھ پر بنی کال بیل آپ نے دبائی تھی' صرف وہی دبانے پر آپ کی ہم سے ملاقات ہوئی ہے اور آج حسنین کو میں پہلی مرتبہ بتا رہا ہوں۔ شاید یہ اتفاق تھا کہ اس نے ہمیشہ یہی کال بیل استعمال کی ہے ورنہ بائیں جانب دوسری کال بیل ہے جو عام استعمال میں آتی ہے۔ اگر بائیں ہاتھ کی کال بیل دباتیں تو آپ کی اس فیملی سے ملاقات ہوتی جو اس گھر میں رہتی ہے۔ ہم نہ ملتے۔"

"کیا مطلب؟" میں حیران ہوئی۔ حسنین بھی بھی چونک کر انہیں دیکھنے لگے۔

"مطلب یہ کہ بی بی! آج میں ایک سو بیس برس کا ہو چکا ہوں۔ ایک سو برس پورے کرنے کے بعد ہی زیوسا کی طاقت سے میں نے اپنا جسم دوبارہ حاصل کر لیا۔ ضیاء' یعنی میں 'ضیا کے جسم کو ستر سال کی عمر میں ہی چھوڑنے پر مجبور ہو گیا تھا کیونکہ میری موت واقع ہو چکی تھی مگر زیوسا نے میرے جسم کو محفوظ کر لیا تھا۔ میں ٹھیک ایک سو برس کے بعد وہ جسم دوبارہ حاصل کر سکتا تھا۔ آج مجھے یہ جسم حاصل کئے ہوئے بارہ برس گزرے ہیں اور میں اس پر دسترس رکھتا ہوں کہ جسم کے ہوتے ہوئے بھی سب سے اپنے آپ کو مخفی رکھ سکوں۔ تو دائیں ہاتھ کی کال بیل میری فیملی سے ملا دیتی ہے اور بائیں ہاتھ کی کال بیل اس گھر میں رہنے والی دوسری فیملی سے۔ یعنی یوں سمجھ لیں کہ ہم لوگ دنیا میں نہیں ہیں۔"

میں کانپ اٹھی۔ حسنین بھائی کے چہرے پر بھی زلزلے کے سے آثار پیدا ہوئے۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ضیاء صاحب نے مسکرا کر کہا۔

"خدا حافظ حسنین! تم جب بھی ملنا چاہو' اسی کال بیل کے بجانے کے بعد مل سکتے ہو اور آپ بھی آیئے گا سیما!"

مگر ہم لوگ انہیں خدا حافظ بھی نہیں کہہ سکے کیونکہ حلق خشک تھے اور ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ ویسے مجھے یہ خیال بھی آیا تھا کہ شاید ضیا صاحب مجھ سے مذاق کر رہے ہیں۔ یہ خیال جب میں نے حسنین بھائی کو بتایا تو وہ بھی چونکے مگر اس وقت تک ہم گیٹ تک پہنچ چکے تھے۔ ہم نے پلٹ کر دیکھا۔ ضیا صاحب ہاتھ ہلا رہے تھے۔ ہم لپک کر گیٹ سے باہر آ گئے۔ حسنین بھائی نے سب سے پہلے دائیں طرف دیوار پر دیکھا۔ وہ کال بیل ٹی میں الٹی' پتوں کے پیچھے چھپی ہوئی تھی اور واقعی بائیں طرف بھی ایک کال بیل کا بٹن

تھا جو صاف ستھرا اور چمکدار تھا۔ حسنین بھائی نے بے اختیار وہ بٹن دبا دیا۔

چند ہی لمحوں بعد ایک نوجوان بیس بائیس برس کا لڑکا ہمارے سامنے تھا۔ ”جی! کس سے ملنے گا؟“

”وہ یہاں.......... ضیاء صاحب رہتے ہیں؟“ حسنین بھائی نے کہا۔

”جی! ضیاء صاحب؟ نہیں.......... تو.......... یہاں ملک اشرف محمود صاحب رہتے ہیں۔ میرے والد..........“ اور میں حسنین بھائی کا بازو پکڑ کر انہیں گھسیٹتی ہوئی گاڑی تک لے آئی۔

☆==========☆==========☆

قارئین! میں نہیں جانتی کہ اس ملاقات کے بعد مجھ میں ایسی کیا بات پیدا ہوگئی تھی کہ لوگ مجھے دیکھ کر چونک اٹھتے تھے مگر ایسا صرف تھوڑے عرصے تک رہا پھر سب نارمل ہوگیا مگر میں.......... ابھی تک نارمل نہیں ہوں۔

ختم شد